مرتب :
ڈاکٹر وہاب اشرفی
معاون :
ڈاکٹر احمد حسین آزاد
بہار میں اردو افسانہ نگاری

بہار میں اُردو افسانہ نگاری

مرتّب

پروفیسر وہاب اشرفی

معاوِن

ڈاکٹر احمد حُسین آزاد

ناشر

بہار اُردو اکادمی، پٹنہ

سنِ اشاعت : ۱۹۸۹ء

تعداد اشاعت : ایک ہزار

کتابت : محمد حنیف الہ آبادی، قمر رشیدی

مطبع : لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی ۲

قیمت : ۶۰ روپیے

ملنے کا پتہ

بہار اردو اکادمی

اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۴

گفتنی

اکادمی ایک عرصے سے یہ چاہ رہی تھی کہ بہار کے افسانہ نگاروں کا ایک وقیع مجموعہ اشاعت پذیر ہو۔ خوش قسمتی سے یہ کام بطریق احسن انجام پا رہا ہے۔ اس کتاب کو بہت پہلے چھپنا چاہیے تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ افسانہ نگاروں کی نمایندگی ہو جائے پھر بھی یہ کام بے حد مشکل ہے، انشاء اللہ دوسری اشاعت میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

میں پروفیسر وہاب اشرفی کا سپاس گذار ہوں کہ موصوف نے بے حد جانفشانی سے یہ کتاب مرتب کی، ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر احمد حسین آزاد کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے مرتب کی معاونت کی ہے۔

جناب احمد یوسف کا میں بہ طور خاص شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بعض بے حد سود مند مشورے دیئے۔

سراج الدین

ترتیب

فن کے نقیب

فن کے سفیر

نئے تیشے نئے کوہکن

ایک افسانہ اور

———※———

بہار میں اُردو افسانہ نگاری

بہار میں اُردو افسانہ نگاری کی ایک مربوط ارتقاپذیر تاریخ ہے۔ فن افسانہ کے عمومی ارتقا کی طرح بہار میں داستانیں اور منظوم قصّے لکھے گئے، پھر ناول کا عہد آیا، اس کے بعد ایسے مختصر مگر غیر مربوط نثری قصّے لکھے گئے، جنھیں افسانے کی ابتدائی صورت تو کہہ سکتے ہیں لیکن باضابطہ افسانہ کہنا غلط ہے۔ ہفتہ وار "الپنچ" کی اشاعت ۱۸۸۵ء سے شروع ہوئی۔ اس وقت تک بہار میں کئی قابل لحاظ ناول لکھے جا چکے تھے لیکن "الپنچ" سے مختصر نویسی کی ابتدا ہوئی۔ اس رسالہ میں لکھنے والوں میں مزاح نگاری کی طرف خصوصی لپک تھی مثلاً ادیب عظیم آبادی، اکبر داناپوری، ظریف دربھنگوی، دہقانی راجگیری، حکیم دسنوی بہاری، ظریف پاشاہ، زندہ دل عظیم آبادی، عرش گیاوی، ع۔غ۔ف۔ بہاری۔ سوختہ دل مظفرپوری، مائل بیتھوی، ناصح مشفق وغیرہ۔ ان میں کئی نام ایسے ہیں جن کی حیثیت "گھوسٹ رائٹرس" کی تھی۔ وہ ایک دوسرے پر پھبتیاں تو کسنا چاہتے تھے لیکن کھُل کر سامنے نہیں آنا چاہتے تھے لہٰذا "الپنچ" کے کئی ایسے ناموں کی حقیقی شخصیتوں کی تلاش کا فرض ریسرچ اسکالروں کے سر ہے —— بہر حال "الپنچ" کے قصّے افسانے نہیں تھے، شاید انشائیہ ہوں، لیکن ان نگارشات سے بات، یہ بنی کہ طویل قصہ گوئی کی جگہ مختصر قصہ نگاری کی داغ بیل پڑ گئی اور باضابطہ افسانہ نگاری کے لئے زمین ہموار ہوگئی۔ "الپنچ" کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۱۰ء میں موقوف ہوگیا۔ اس کے بعد کئی رسالے نکلے لیکن ان کی زندگی بیحد مختصر رہی مثلاً گیا سے "شہرہ آفاق" اور "بزم سخن" پٹنہ سے "بہار گزٹ اور" پٹنہ اخبار"

اور بہار شریف سے "اتحاد" وغیرہ۔ان رسالوں میں شعری ادب ہی زیادہ چھپا کیا اور وہ تیز آنچ جو "الپنچ" کی خصوصیت تھی ان میں نہیں پیدا ہو سکی۔ "الپنچ" اور "ندیم" کی اشاعت کے درمیانی وقفے میں ایک قابل ذکر رسالہ "نوید" (۱۹۲۴ء) ہے۔بہار میں اُردو افسانہ نگاری کے باب میں اس رسالہ کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے۔

کہ بہار کے اوّلیں افسانے اسی میں شائع ہوئے۔اِن میں علی محمود کا بھی ایک مختصر قصّہ ہے لیکن اسے ادب لطیف کہیۓ افسانہ کے خط وخال اس میں کم سے کم ہیں۔ بھی جانتے ہیں کہ افسانہ نگاری کا ابتدائی ماڈل ہمیں مغرب سے ملا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں "نوید" کے مدیر عبدالباری محمد ساقی عظیم آبادی نے چارلس ریڈ کے طویل افسانہ (Cloister and Hearth) کی بنیاد پر ایک افسانہ "تصویر محبت" شائع کیا۔اسے ریڈ کے افسانے کا آزاد ترجمہ بھی کہنا درست نہ ہوگا۔اس لئے کہ ساقی عظیم آبادی نے ہندوستانی معاشرے کی خوبو اس میں اس طرح ڈال دی ہے کہ اس کے طبع زاد ہونے میں شبہہ نہیں ہوتا پھر بھی اس کی حیثیت ایک ترجمہ ہی کی ہے۔بہر حال یہ ایک طویل افسانہ ہے۔ اس افسانے کی اشاعت کے بعد ہی سُرعت سے بہار میں طویل افسانے لکھے جانے لگے یا غیر ملکی زبانوں سے ترجمے کرلئے گئے۔نُصرت آروی کا طویل افسانہ "نیرنگ عشق" بھی ایک انگریزی افسانے کا ترجمہ ہے۔پہلے یہ رسالہ "فطرت" (راجگیر) میں شائع ہوا۔"سہیل" گیا نے بھی ۱۹۴۱ء میں بالاقساط چھاپا۔ نصرت آروی نے افسانہ نگاری کے ایک دوسرے رُخ کی بھی طرح ڈالی ہے۔میری مراد ان کے مشہور افسانہ "دغا باز شکاری" مطبوعہ "ندیم" گیا ۱۹۳۲ء سے ہے۔یہ ایک (Detective) (جاسوسی) افسانہ ہے۔افسانہ کی ٹوپوگرافی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی انگریزی افسانے سے ماخوذ ہے۔بہار میں افسانہ نگاری کا پہلا دور ترجمے ہی کا دور ہے ساتھ ہی ساتھ کچھ طبعزاد افسانے بھی لکھے گئے لیکن ایسے تمام کے تمام افسانے عشق ومحبت کے افسانے ہیں۔رومانی سے زیادہ عشقیہ ہیں۔کردار یک رُخے ہیں اور زیادہ تر خارجی عوامل سے بہرہ ور ہیں۔ان میں تہہ داری مفقود ہے۔بہر طور اس وقت

تک ''ندیم'' گیا کا رول شروع ہو چکا تھا۔ اس رسالے نے بہار میں اُردو افسانہ نگاری کے ارتقائی سفر میں سنگ میل کا کام سرانجام دیا ہے۔

ماہنامہ 'ندیم' میں شائع ہونے والے تمام افسانوں میں جمیل مظہری کے افسانے ''فرض کی قربان گاہ'' کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ یہ افسانہ ترجمے کے حدود کو توڑتا ہے اور اپنے عہد کے طویل طبعزاد افسانوں میں سب سے زیادہ معروف ہے۔ اس کے کردار حلیمہ، محمود اور حامد محبت کے سیل رواں کے تنکے ہیں جو ہر لحظہ بہتے ہی چلے جاتے ہیں جیسا کہ افسانے کے عنوان سے ظاہر ہے محبت کرنے والوں کو فرض کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ جانا ہے بس یہی اس افسانہ میں ہوا ہے۔ لیکن بہت مؤثر طریقے پر۔ یہ افسانہ دو قسطوں میں چھپا۔ اس کا پہلا حصّہ ''ندیم'' میں ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تو اسے قبول عام کی سند مل گئی پھر اس کی دوسری قسط ''ندیم'' کے بہار نمبر میں شائع ہوئی۔ افسانہ کی مجموعی ساخت مکتوبی ہے۔ اس طرح اسٹری تکنیک کے افسانے میں جو عیوب ہوتے ہیں وہ اس میں بھی موجود ہیں۔ کرداروں کی مثال پسندی انھیں فعّال بننے سے روکتی رہتی ہے۔ اور وہ ایک محور پر گھومتے رہتے ہیں۔ اس افسانے میں نفسیاتی اُلجھنوں کو اُبھارنے کے کتنے ہی مواقع تھے لیکن افسانہ نگار کے سامنے یہ مدّعا نہ تھا۔ نہ ہی افسانہ کا مجموعی فن اس وقت تک اتنی بلندی پر تھا کہ جمیل مظہری اس کی طرف توجہ کرتے ــــ ناکام محبت کے عُشاق گیلی لکڑیاں ہیں اور دھیرے دھیرے جلتے ہیں ان کی آگ سے کوئی شعلہ نہیں بن پاتا لیکن اس افسانے کی تکنیکی عیوب سے اس کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کئی لکھنے والے اس افسانے سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ 'قربان گاہ' کے دو لفظ کئی افسانوں کے عنوانات کا حصہ ہے۔ مثلاً زبیر احمد تمنائی نے اپنے رسالہ ''شمیم'' (پٹنہ) میں ایک افسانہ ''سماج کی قربان گاہ پر'' ۱۹۳۶ء میں چھاپا۔ ۱۹۳۷ء میں حبیب اللہ جھکٹیاوی نے ''ندیم'' میں ''قربان گاہ رسم پر ایک بھینٹ'' کے عنوان سے افسانہ شائع کیا۔ اسی سال اسی رسالہ میں سید منظر الحق قادری سونبرساوی نے اپنا افسانہ ''سوسائٹی کی قربان گاہ پر'' چھپوایا۔

اور اظہر الحق قادری کا افسانہ "قربان گاہ محبت" ۱۹۳۹ء "سہیل" میں چھپا۔ اسی افسانہ کا اثر اس زمانے کے لوگوں پر آج بھی مرتسم ہے۔ اس کی ایک مثال معین الدین دردائی کا سیاسی افسانہ "آزادی کی قربان گاہ پر" ہے جو ۱۹۶۰ء رسالہ "اشارہ" پٹنہ میں شائع ہوا۔

غرض کہ جمیل مظہری کے مذکورہ افسانے کے اثرات دور رس اور دیر پا رہے۔ لیکن انھوں نے افسانہ نگاری سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور ملک کے ایک اہم شاعر کی حیثیت سے معروف اور فعال ہیں۔ پھر بھی اُردو افسانہ نگاری کی کوئی بھی تاریخ اس افسانے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ لیکن جو افسانے جمیل مظہری کے افسانے کے اثرات کے تحت لکھے گئے وہ دھندلکے میں گُم ہیں۔ اس کی بیحد واضح وجہ یہی ہے کہ لکھنے والوں کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں تھی۔ تتبع نے ان کی اپنی راہیں محدود اور مسدود کر دیں۔ خود میر کارواں نے جب اپنی ڈگر بدل لی تو تابعین کی گمراہی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

طویل مختصر افسانہ کے اسی مخصوص دور میں عشق و عاشقی سے الگ ہو کر بھی چند لکھنے والے اُبھرے اور ڈوبے ان میں صابرہ بانو، صبر رضوی مخدوم آبادی اور سعید الحق دسنوی اور رضا آروی قابل ذکر ہیں۔ اسی دَور کے اوّل افسانہ نگار مسلم عظیم آبادی ہیں جن کا ایک طویل افسانہ "الناظر" لکھنؤ میں "محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش" کے عنوان سے شائع ہوا۔ افسانہ کے عنوان سے ایک غلط فہمی یہ ہوتی ہے کہ یہ افسانہ بھی فرض کی قربان گاہ پر کے اثرات کے تحت لکھا گیا۔ لیکن صورت واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ مسلم معاشرہ کے اعلیٰ طبقے کی ابتدائی زبوں حالی اور معاشرے کے بدلتے ہوئے رنگ پر افسانہ نگار نے توجہ کی ہے اور بلاشبہہ ایک قیمتی افسانہ سپرد قلم کیا ہے اور یہی اُردو کا باضابطہ پہلا افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ بہار میں اُردو افسانہ نگاری کے باب اوّلین کے تین اہم ناموں میں مسلم عظیم آبادی، ساقی عظیم آبادی اور جمیل مظہری ہیں۔ طویل مختصر افسانے کے اوّلین دَور کی یہ تثلیث بیحد اہم ہے۔ کہ اسی سے افسانہ نگاری کے کتنے نئے زاویے اور گوشے وضع ہوئے۔ مسلم عظیم آبادی نے تو چند مختصر افسانے بھی لکھے۔ اس طرح انھوں نے

ایک عرصہ تک افسانہ نگاری کی راہ اختیار کئے رکھی۔ یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ اگر اس طویل مختصر افسانہ نگاری کے دور کو ۱۹۴۶ء تک محیط کردیں تو چند بیحد اہم ناموں کا اضافہ ہو جائے گا۔ مثلاً ایک اہم ترین نام تو اختر اورینوی ہی کا ہے۔ دوسرا قابل ذکر نام الیاس اسلام پوری کا ہے لیکن ان کا سفر ۱۹۴۶ء کے بعد بھی جاری رہا اور مختصر افسانے کی ذیل میں ان پر الگ سے روشنی ڈالی جائے گی۔ اس لئے یہ روداد یہیں ختم ہوتی ہے۔

طویل مختصر افسانہ کی کوکھ سے مختصر افسانے نے جنم لیا۔ اور بہار کی حد تک بھی اس کے بتدریج ارتقاء کی صورت حال ہمارے سامنے ہے ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کتنے ہی اہم مختصر افسانے لکھنے والے سامنے آئے۔ یہاں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ اپنے مطالعہ کی سہولت کے لئے میں طویل مختصر افسانہ اور مختصر افسانہ میں حد فاصل قائم کر رہا ہوں۔ اس طرح اس عہد کے مختصر افسانہ نگاروں میں یا افسانہ نگاروں میں محسن عظیم آبادی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، ش مظفر پوری، جمیل احمد کندھائی پوری، الیاس اسلام پوری، اختر قادری، افسر ماہ پوری، نسیمہ سوز، ح۔م۔ اسلم عظیم آبادی، رضیہ رعنا، وغیرہ ہیں۔ اس فہرست میں انجم مانپوری نہیں ہیں۔ دراصل میں انھیں بنیادی طور پر انشائیہ نگار تسلیم کرتا ہوں۔ طنزیات مانپوری، مطائبات طنز و مزاح کی نگارشات ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے انھیں افسانہ نگار شمار کرنا سراسر تکلف ہے۔

بہر حال اُردو افسانہ نگاری کے دوسرے دَور کے کچھ نام پہلے دَور سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور کچھ تیسرے دور کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجموعی اعتبار سے بہار میں افسانہ نگاری کا دوسرا دَور ان ہی ناموں سے شروع ہوا ہے۔ اور چونکہ یہ دَور بہار میں اُردو افسانہ نگاری کا بیحد ممتاز دَور ہے اس لئے ان افسانہ نگاروں پر الگ الگ نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

مُحسن عظیم آبادی کے افسانے 'ساقی' دہلی، معاصر' پٹنہ، سہیل' گیا کے علاوہ

متعدد دوسرے رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ وہ نفسیات کے ایک ماہر اُستاد کی حیثیت سے ملک بھر میں معروف ہیں لہذا ان کے افسانوں کا ڈول اور کینڈا نفسیاتی گتھیوں سے مرتب ہوتا ہے۔ شعور ولاشعور کے نفسیاتی امور ان کے اکثر افسانوں کے تار و پود ہیں۔ اس اسکول کی افسانہ نگاری کی جو صف ممتاز مفتی اور عسکری سے بنتی ہے اُس صف میں محسن عظیم آبادی بھی ہیں۔ ان کے اکثر افسانے واقعتاً کردار کے نفسیاتی تجزیے ہیں۔ اِدھر اُردو تنقید میں تخلیقات کی آرکی ٹائپسل بحث شروع ہو چکی ہے۔ ان کے بعض افسانے اس نقطہ نظر سے بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ محسن عظیم آبادی کے مشہور افسانوں میں انوکھی مسکراہٹ سرفہرست ہے۔ گذشتہ سال اِسی نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپ گیا ہے۔ اس کا انتساب فرائڈ کے نام سے ہے۔ اس مجموعے کے نفسیاتی پس منظر سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ مجموعہ انوکھی مسکراہٹ میں چودہ افسانے ہیں۔ انوکھی مسکراہٹ، تعمیر جنوں، زہری، ردعمل، طوائف، احساس گناہ، شکست عزم، فرار، نئی ماتا، جھوٹی بھوک، لذّت آزار، باغی، ماں اور خون کا اثر —— اس مجموعے میں 'مزدور کا بیٹا' نہیں ہے۔ یہ افسانہ ترقی پسند اثرات کے تحت لکھا گیا تھا۔ وہ نفسیاتی کیفیت جو محسن عظیم آبادی کے افسانوں میں جاری وساری ہے۔ اس افسانہ کا مزاج نہیں۔ اس وجہ سے اِس افسانے کو مجموعے سے الگ رکھا گیا، محسن عظیم آبادی خود لکھتے ہیں۔

> " انوکھی مسکراہٹ صرف میرا پہلا افسانہ نہیں بلکہ میری اوّلین افسانوی کوشش ہے۔ اس کے بعد میں نے اُس دور کی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر ایک دوسرے طرز کا افسانہ 'مزدور کا بیٹا' لکھا جو اس مجموعے میں شامل نہیں ہے...... اس کے بعد میں نے اپنی ہر افسانوی تخلیق کو 'انوکھی مسکراہٹ' کے طرز پر ڈھالنے کا فیصلہ کر لیا اور بعد میں جو افسانے لکھے مواد کے اعتبار سے ان میں ایک تسلسل قائم رکھا...... "

(انوکھی مسکراہٹ صفحہ ۲)

گویا انوکھی مسکراہٹ کے تمام افسانوں کی عقبی زمین نفسیاتی امور ہیں۔ اس باب میں آل احمد سرور کی رائے نقل کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"پروفیسر محسن کے افسانوں میں فطرت انسانی کے سربستہ رازوں سے جس مشاقی اور چابک دستی سے پردہ اُٹھایا گیا ہے اس کی گہری نظر اور فنی صلاحیت دونوں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔۔۔۔"

(فلیپ، انوکھی مسکراہٹ)

اختر اورینوی بہار میں اُردو کے ممتاز ترین افسانہ نگار ہیں ـــــ انکے افسانوں پر مضامین شائع ہوئے ہیں انکے فن سے متعلق 'ساغر نو' کا ایک ضخیم خاص نمبر بھی چھپ چکا ہے۔ لیکن ان کی افسانہ نگاری کے باب میں سب سے جامع مضمون عبدالمغنی کا ہے۔ یہ مضمون 'ساغر نو' کی بھی زینت ہے اور ان کے دوسرے مجموعۂ مضامین 'جادۂ اعتدال' کے مشتملات میں بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

جس وقت اختر اورینوی نے افسانہ نگاری شروع کی، پریم چند زندہ تھے، اور ان کے پیروؤں کی ایک پوری نسل بروئے کار آچکی تھی۔ سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس اُبھر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نیاز فتحپوری کا جمالستان، اور سجاد حیدر یلدرم کا خیالستان بج چکے تھے۔ مجنوں گورکھپوری کا بیاباں بھی آچکا تھا، حجاب امتیاز علی کا کوہ قاف نمودار ہورہا تھا، سعادت حسن منٹو نے ابھی لکھنا شروع کیا تھا پھر اختر اورینوی کے لکھنا شروع کرنے کے دو تین ہی برسوں بعد کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی، اور چند سال اور بعد عصمت چغتائی بھی میدان میں آگئیں۔ اِس عہد میں احمد ندیم قاسمی بھی لکھنے لگے، اس طرح اُورینوی اُردو افسانہ نگاری کی دوسری نسل کی پہلی پشت میں وجود پذیر ہوئے"

(جادۂ اعتدال صفحہ ۱۶۰)

عبدالمغنی اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے فنی اور فکری پہلوؤں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان ہی کی صف کے ہمعصروں میں اختر اورینوی

کا پورا تقابل کرشن چندر سے ممکن ہے۔ اس لیے کہ دونوں کے تجربات وسیع اور متنوع ہیں۔ اور دونوں تفکر کے عادی ہیں۔ اور دونوں کے طرز میں شعریت پائی جاتی ہے (جادۂ اعتدال صفحہ ۱۹۰) عبدالمغنی کی بحث کا ایک دلچسپ پہلو وہ ہے جس میں انھوں نے چند جملے دوسرے اہم افسانہ نگاروں کے بارے میں قلمبند کئے ہیں۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں اس لیے اس بات پر اکتفا کروں گا کہ ان کے ہر تقابلی جملے سے بحث کا ایک واضح رُخ نکلتا ہے۔ بہرحال ان کی ترتیب یہ ہے "کہہ سکتے ہیں کہ جدید اُردو افسانہ نگاری کی صف اوّل کے عناصر اربعہ کی ترتیب یوں ہونی چاہئے کرشن، منٹو، اورینوی، بیدی۔"

میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں اس ترتیب کو یوں بدلنے پر اصرار کروں گا، منٹو، بیدی، کرشن اور اورینوی۔ شاید عبدالمغنی کے پیش نظر ان افسانہ نگاروں کی فکری دُنیا زیادہ رہی ہے "فنی پہلو کم"۔

بہرطور اختر اورینوی نے ۱۹۲۷ء سے افسانہ نگاری شروع کی، ان کی رفیقۂ حیات اور مشہور افسانہ نگار شکیلہ اختر ایک مضمون (مطبوعہ "نقوش" لاہور شخصیات نمبر ۲۰ ۱۹۵۶ء) سے معلوم ہوا کہ ان کا پہلا افسانہ "رتنا" ہے جو شائع نہیں ہوا اس کے بعد انھوں نے بدگمانی کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا جو بہارستان پٹنہ میں مئی کے شمارہ میں ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔

اب تک اختر اورینوی کے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں "منظر و پس منظر"، "کلیاں اور کانٹے" "انار کلی اور بھول بھلیاں"، "سیمنٹ اور ڈائنامیٹ" "کچلیاں اور بال جبریل" "اور سپنوں کے دیس میں"۔ یہ مجموعے تاریخی اعتبار سے اسی ترتیب سے بھی شائع ہوئے ہیں جس ترتیب سے میں نے ان کے نام لکھے ہیں۔

اختر اورینوی کے مزاج میں رومان اور حقیقت کا امتزاج ہے' یہ دونوں پہلو ان کے افسانوں میں بیش از بیش ملتے ہیں۔ فکر کی ایک وسیع دُنیا ہے جس کا تجزیہ عبدالمغنی نے اپنے متذکرہ مضمون میں بڑے مدلل طریقے پر کیا ہے۔ یہاں ان باتوں کی تکرار

غیر ضروری ہے۔ اتنی بات تو سبھی تسلیم کریں گے کہ اختر اورینوی چند اہم ترین افسانہ نگاروں میں ایک ہیں۔

اُردو کے ایک دوسرے مایہ ناز افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی ہیں۔ پریم چند کی راہ اپنانے والوں میں جن منفرد افسانہ نگاروں کے نام آتے ہیں ان میں سہیل عظیم آبادی بیحد ممتاز ہیں۔ ان کے افسانوں میں دیہات کا ماحول اپنی تمام تر جُزئیات کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ امیروں خصوصًا زمینداروں کے ٹھاٹ باٹ، ان کی تمکنت، ان کی انا اور ان کے کھوکھلے پن کو انتہائی فنکارانہ طور پر اپنے افسانوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کسانوں اور مزدوروں کے افسانوں میں ان کے رنگ و روپ اس طرح اُجاگر کیے ہیں کہ ان کی معاشرت کی خوبو ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس طرح وہ محض مزدوروں اور کسانوں کے پرستار نہیں بنتے ان کے مزاج داں بن کر ان کی کمزوریوں کے احوال بھی رقم کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی راہ فکری و فنی دونوں ہی سطح پر پریم چند کے ایک دوسرے پیرو علی عباس حسینی سے مختلف ہو جاتی ہے، اس طرح ان ہی بنیادوں پر ان کا مزاج سخت گیر ترقی پسند افسانہ نگاروں سے بھی نہیں ملتا۔ ان کی افسانہ نگاری کا ایک اور رُخ اس امر سے نکلتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اصلاح پسندی کو بھی فن کی معراج نہیں مانتے۔ وہ کرداروں کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں اور میلان طبع کو اپنی طرف سے کوئی موڑ نہیں دینا چاہتے —— ان کے مجموعے "الاؤ" اور "نئے پُرانے" کو ذہن میں رکھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سہیل عظیم آبادی کے کردار اپنی راہ چلتے ہیں، افسانہ نگار کی نہیں، یہی وہ حد فاصل ہے جو انھیں دوسرے پریم چند کے پیرؤں سے ممیز کرتی ہے اور ان کے امتیاز کا باعث ہے۔

سہیل عظیم آبادی نے ۱۹۳۰ء سے لکھنا شروع کیا ہے۔ اس طرح اختر اورینوی کی طرح ان کا رابطہ دورِ اوّل کے افسانہ نگاروں سے بھی قائم ہو جاتا ہے لیکن حیرت انگیز طریقے پر ان کے یہاں رومان یا تخیل پسندی کا دُور دُور پتہ نہیں ملتا۔ ان کے پہلے

افسانوی مجموعہ مطبوعہ ۱۹۴۲ء کے افسانے "الاؤ"، "اندھیرے اور اُجالے میں"، "دو مزدور"، "کھویا ہوا لال"، "جوار بھاٹا"، "چوکیدار"، "ٹوٹا ہوا تارہ"، "شرابی" "وہ رات"، "زنجیر تمام"، "بیچارہ"، جوانی، "پیٹ کی آگ" اور "بھوک" پڑھ جایئے، ان میں کسان اور مزدوروں کی معاشرتی زندگی کے احوال تو ملیں گے لیکن رومانی احساس معدوم ہوگا۔ مجموعہ افسانہ "نئے پُرانے" مطبوعہ ۱۹۴۴ء کی بھی یہی صورت حال ہے۔ یہ وہ امتیازی لکیر ہے جو انھیں کرشن چندر سے بھی قطعی الگ کر دیتی ہے۔ یہاں اس امر کا اعادہ کرتا چلوں کہ سہیل عظیم آبادی نے اپنے مطالعہ کا علاقہ محدود نہیں کیا ہے، وہ دیہی زندگی کے مسائل اِس طرح قلمبند کرتے ہیں کہ اُن کی جزئیات ہماری نگاہ کے سامنے ہوتی ہیں۔ اور یہ بذات خود ایک دُنیا بناتی ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے سُہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور سُدرشن سے بہت آگے ہیں۔ علی عباس حسینی گاہے گاہے رومان کی راہ پر بھٹک جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ان کی دُنیا نہیں اس لئے ان کے افسانوں کا یہ رُخ ان کی حقیقت پسندی کا پیوند بن جاتا ہے۔ علی عباس حسینی کے معروف افسانوں مثلاً "بوڑھا اور بالا"، "سکھی" اور "رفیق تنہائی" ہی کو پیش نظر رکھیے تو متذکرہ باتیں اور بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ سدرشن جزئیات پر گہری نظر نہیں رکھتے اور ان کی دُنیا بیحد محدود ہے، پھر وہ سیاست کے مرد میدان بھی بننا چاہتے ہیں جس سے ان کے افسانے نیم سیاسی بن جاتے ہیں۔ ایسے میں یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ پریم چند کے حقیقی پیرو سہیل عظیم آبادی ہی ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے وقار عظیم لکھتے ہیں:۔

> "سہیل عظیم آبادی کا ماحول بھی بہار کے دیہات اور ان کا موضوع بھی دیہاتی ہے، لیکن انھوں نے زندگی کے مشاہدے، احساس کی جذباتی شدت اور مصلحانہ انداز کو فن کی نزاکت میں اس سادگی اور خموشی سے سمویا ہے کہ انکی حکیمانہ اور مصلحانہ اور فنکارانہ حیثیت اپنے دوسرے ہمعصروں میں منفرد بن گئی ہے۔"
>
> (داستان سے افسانے تک صفحہ ۲۱۵)

اس بیان کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ سہیل کا انداز کہیں بھی مصلحانہ نہیں ہے۔ انھوں نے کہیں بھی مُصلح کے فرائض انجام دینے کی کوشش نہیں کی۔ وقار عظیم سے زبردست چوک ہوئی ہے۔ جب وہ لکھتے ہیں :۔

"علی عباس حسینی ان کے (پریم چند) کاندھے سے کاندھا ملا کر چلے اور بعض افسانہ نگاروں نے ان کی روش سے متاثر ہو کر سیاست، دیہاتی معیشت اور سرمایہ و مزدور کو اپنا خاص موضوع بنایا' اس خاص میدان میں سہیل عظیم آبادی نے اور اختر اورینوی نے جو کام کیا اس کی حیثیت ایک مستقل خدمت کی ہے۔ اختر اورینوی کے افسانوں کے دو مجموعے "منظر و پس منظر" اور "کلیاں اور کانٹے" بہار کے دیہاتوں کی اس زندگی کا مرقع ہیں جن میں سیاست اور نئے معاشی مسائل نے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا کیں ...." (داستان سے افسانے تک صفحہ ۲۱۵)

میں سمجھتا ہوں کہ اختر اورینوی اور سہیل عظیم آبادی کو افسانہ نگاری کے باب میں ایک ہی قطار میں رکھنا غلط ہے۔ دونوں کا میدان قطعی الگ الگ ہے اختر اورینوی اپنے ابتدائی دور میں نیاز فتحپوری سے متاثر رہے ہیں' پھر ان کے انکار کی دُنیا اقبال کے مطالعہ کے بعد سجی ہے۔ وہ ایک منزل میں ترقی پسندی کے ساتھ بھی چلے' لیکن یہ عرصہ بیحد مختصر ہے اور انھوں نے جلد ہی اپنی راہ بدل ڈالی۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کا ایک بڑا حصہ دیہی مسائل سے قطعی الگ ہے۔ اختر اورینوی کے ان دو مجموعوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن کا تذکرہ وقار عظیم نے کیا ہے۔

بہر طور سہیل عظیم آبادی پریم چند کے سب سے بڑے پیرو رہے ہیں لیکن ادھر ان کی افسانہ نگاری میں ایک نیا رُخ پیدا ہوا ہے۔ ان کے حالیہ افسانے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کے یہاں جنسی رَو بہت تیز ہو گئی ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا اسلوب بھی ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور اس ضمن میں کرشن چندر کی رائے ملاحظہ ہو۔

"سہیل عظیم آبادی کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے، مصنوعی اور غیر فطری مکالمے نہیں ہیں، بہاری گاؤں اور اس کے افراد کی تصویر اس فنی صناعی اور چابک دستی سے کھینچتے ہیں کہ افسانے کی دلکشی دو بالا ہو جاتی ہے غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے بہت پرہیز کرتے ہیں، اپنی تحریر میں کم گو لیکن پُر گو ہیں، بہت کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ دیتے ہیں اسے ان کے انداز تحریر کا اعجاز سمجھنا چاہیئے ———" (دیباچہ الاؤ)

اُردو افسانہ کے مجموعی ارتقائ کے لحاظ سے بھی اور بہار میں اُردو افسانے کی بتدریج ترقی کے نقطہ نظر سے بھی شکیلہ اختر کے افسانے غیر معمولی امتیازات کے حامل ہیں۔ وہ ہندوستان کی تین عظیم ترین خواتین افسانہ نگار میں سے ایک ہیں دوسری خواتین افسانہ نگار عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر ہیں۔

شکیلہ اختر نے باضابطہ افسانہ نگاری سے پہلے 'ادب لطیف' جیسے نثر پارے لکھے، شاعری بھی کی، لیکن ان کا میلان طبع افسانہ نگاری کی طرف تھا لہٰذا اِس میدان میں ایک امتیازی شان کے ساتھ آئیں اور ہنوز جلوہ فگن ہیں۔

شکیلہ اختر کا پہلا افسانہ "رحمت" ہے جو ۱۹۳۶ء میں "ادب لطیف" میں شائع ہوا تب سے وہ مسلسل لکھتی رہی ہیں۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "درپن"، "آنکھ مچولی"، "ڈاین" اور "آگ اور پتھر"۔ ان تمام مجموعوں کی دھار ایک ہی جیسی ہے ——— دراصل شکیلہ اختر کے افسانوں کا پس منظر ہماری روزمرہ کی زندگی کا نشیب و فراز ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات و کوائف کی رازداں ہیں اور انھیں بڑے سلیقے اور فنکاری سے اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں غایت درجے کی دروں بینی ہے، کہہ سکتے ہیں کہ گہری داخلیت کی بنیادوں پر ان کے کئی افسانے عصمت چغتائی کے افسانوں سے ممتاز تر ہیں۔ شکیلہ اختر 'لحاف' کی افسانہ نگار نہیں "ڈائن" کی افسانہ نگار ہیں۔ اس طرح ان کے افسانے حُسن کی دلدل میں دھنستے ہوئے معلوم نہیں ہوتے نفسیات کے افق پر اُبھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس طرح

ان دو بڑی افسانہ نگاروں کے مابین خارجیت اور داخلیت کی دیوار حائل ہے۔ عصمت چغتائی اڑوس پڑوس کی کھڑکیوں میں جھانکتی ہیں تو شکیلہ اختر دلوں کو ٹٹولنا چاہتی ہیں۔ پھر عصمت چغتائی ایک ترقی پسند موقف کے ہالے میں اسیر ہیں جب کہ شکیلہ کے پاؤں میں کوئی بیڑی نہیں، وہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھر سکتی ہیں۔ لیکن ایسی آزادی کے بعد بھی وہ قرۃ العین حیدر نہیں بن سکیں۔ شعور کی رو کے گُر سے ناواقف ہیں۔ آزادیٔ خیال کی وہ وسیع دُنیا ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے جس کی عقبی زمین میں قرۃ العین حیدر اپنے افسانوں کی دُنیا بساتی ہیں ـــــ شاید دو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کا فرق ان کی عملی دُنیا کا بھی فرق ہے، بہرحال ایسے امتیازات کے باوجود اُردو افسانے کے ارتقاء میں ان خواتین کی کارگذاریوں سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ ان کی خدمات مسلمہ ہیں۔ اور قیمتی بھی۔

شکیلہ اختر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ذات کے کرب کو وسعت دے کر اسے ہمہ گیر بنا دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہیں، اس کی ایک مثال ان کا افسانہ "آنکھ مچولی" ہے۔ اوٹو بائیوگرافیکل زمرے کا یہ افسانہ شکیلہ اختر کی اپنی کہانی بھی ہے اور اس قماش کی دوسری نامراد عورتوں کی بھی۔ یہاں داخلیت کا احاطہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور نامرادی کے احساسات ہمہ گیر بن گئے ہیں۔ لیکن جہاں اپنی ذات سے متعلق کوئی المیہ نہیں ہے وہاں بھی احساسات کی تیز آنچ محسوس کی جاسکتی ہے' پیاسی نگاہیں'' ، "آگ اور پتھر" ، " ننگی آنکھیں " ، " بھٹکی ہوئی منزل " اور کئی دوسرے افسانے میرے مطالعہ کو تقویت دیتے ہیں۔

دورِ اوّل کے افسانہ نگاروں سے اپنا رشتہ جوڑنے والے اور دوسرے دَور میں کبھی نمایاں رہنے والے ایک افسانہ نگار الیاس اسلام پوری ہیں، ان کی افسانہ نگاری کے سارے احوال یکسر فراموش کر دیئے گئے ہیں اور بہار کے حدود تک بھی یہ نام اجنبی بن جاتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ "نگار" میں ۱۹۳۵ء میں ظلم و استبداد کے خلاف ایک جنگ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے۔

ان کے افسانے "ساقی"، اور "شمیم" میں بھی چھپے۔ اور "ندیم" میں تو ان کے متعدد افسانے شائع ہوئے۔ "الہام آزادی"، "تجدید محبت"، "ڈھائی سیر چنا"، "دیوانہ" "پریم چند کی بھول بھلیاں"، "نور و ظلمت"، "چمار"، "ماڈل ویلج"، "ہیروئن" وغیرہ ۱۹۴۷ء تک متعدد رسالوں میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔

الیاس اسلام پوری کے افسانوں کی فضا جہاں یاس انگیز ہے۔ وہاں رومانی بھی ہے۔ پھر وہ حقیقت پسندی کی طرف بھی مائل ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی کوئی ایک زمین نہیں ہے۔ "چمار" اور "قرض" سے ان کی ترقی پسندی یا حقیقت پسندی کے احوال واضح ہوئے ہیں۔ اس طرح اسلام پوری کے افسانوں کا مزاج متنوع ہے۔ کہیں کہیں ان کے افسانوں میں اصلاحی پہلو بھی غالب آگیا ہے۔ میرے خیال میں "چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک راہ رو کے ساتھ" والی بات ان پر صادق آتی ہے۔ شاید اس سے ان کے فن پر ضرب لگتی ہے۔ پھر بھی ان کے اندر ایک اچھے افسانہ نگار کے تیور موجود تھے۔ افسوس اس کا ہے کہ انھوں نے افسانہ نگاری قطعی ترک کر دی لیکن ان کے افسانوں کی ادبی و تاریخی اہمیت ہے۔ ناقدان فن کو ان کے مطبوعہ افسانوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

"ندیم" اور "سہیل" گیا میں ۱۹۴۰ء کے آس پاس لکھنے والی ایک خاتون افسانہ نگار نسیمہ سوز ہیں۔ ان کے متعدد افسانے "ظالم فطرت"، "ایسا کیوں؟" "سرگوشی" "اندھیرا"، "یہ زندگی" وغیرہ ان ہی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ نسیمہ سوز پر شکیلہ اختر کے اثرات نمایاں ہیں۔ گھریلو زندگی کے نقوش ان کے افسانوں کی تار و پود ہیں۔ لیکن وہ گہرائی و گیرائی عنقا ہے جو شکیلہ اختر کے افسانوں کی مجموعی صورت حال ہے۔ نسیمہ سوز ماجرا کے کساؤ پر دھیان نہیں دیتیں۔ اس طرح ان کے افسانے جو میری نظروں سے گذرے انتہائی ڈھیلے ڈھالے ہیں۔

اسی عہد کے ایک اور افسانہ نگار جمیل احمد کندھائی پوری بھی ہیں، نئی نسل انھیں بھی فراموش کر رہی ہے اور یہ بھی ارباب فن و نقد کی توجہ کے مستحق ہیں۔ کبھی

جمیل احمد کندھائی پوری بیحد فعال افسانہ نگار رہے تھے۔ ان کی ایک حیثیت مترجم کی بھی رہی ہے۔

جمیل احمد کا افسانوی سفر ۱۹۳۴ء سے شروع ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ "فیروزہ" ۱۹۳۴ء میں "عالمگیر" میں شائع ہوا۔ پھر وہ مسلسل لکھتے رہے۔ اس طرح ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ان کا پہلا مجموعہ "آغاز و انجام" ۱۹۴۱ء میں چھپا۔ اس کے بعد "طلوع و غروب" اور "رباب شکستہ" آخری دو مجموعے طبع زاد نہیں ہیں۔

"آغاز و انجام" کے افسانوں پر ایک نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ جمیل احمد کندھائی پوری بھی اُسی راہ پر گامزن رہے ہیں جو راہ سہیل عظیم آبادی کی ہے۔ اس طرح ان کے فن کا رشتہ پریم چند اسکول کے افسانہ نگاروں سے ملتا ہے۔ مزدور و کسان اور دیہی علاقے کے مسائل ان کے افسانوں کا بھی قوام ہیں۔ ان کا فنی نصب العین حقیقت پسندی ہے۔ اور اسی نصب العین کا وہ ہر لمحہ خیال رکھتے ہیں — ترقی پسندی کے اُمور ان کے افسانوں کی دُنیا ہیں۔ اُن کا مشہور افسانہ "مزدور کا بیٹا" طبقاتی کشمکش کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ مزدوروں کے تمام تر مسائل اس افسانے میں سمو دیئے گئے ہیں۔ ان کے شب و روز کے احوال اس ایک افسانے سے مترشح ہیں۔ ان کا ایک اور افسانہ "نجات" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے افلاس کی ہیبت ناک صورت اِس افسانے سے عیاں ہیں۔ اس طرح "ملازمت" میں بیروزگاری کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ غرض کہ جمیل احمد کندھائی پوری اپنے وقت کے مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ اور اس بات میں مزدوروں اور ناداروں کے احوال پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔

یہ تو ان کے طبع زاد افسانوں کی صورت ہے لیکن ترجمے میں وہ اس حد کو پھلانگ جاتے ہیں اور ان کے ترجمے کئے ہوئے افسانوں کی دُنیا بیحد وسیع ہے۔ ان میں زندگی کے مختلف دھاروں کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس طرح حقیقت پسندی یہاں ان کا موضوع نہیں رہی ہے۔ ترجمے کی سرحد رومان اور ہیئت کے افسانوں تک پھیل گئی ہے۔

مختصر یہ کہ جمیل احمد کندھائی پوری کی کارگذاریاں تاریخی لحاظ سے اہم ہیں۔

اوّلین دور کے افسانہ نگاروں میں ایک بھولا ہوا نام اختر قادری کا بھی ہے۔ یہ ایک شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اور انھوں نے افسانہ نگاری ایک زمانے سے ترک کر رکھی ہے۔ ان کے افسانے زیادہ تر "ندیم" اور "سہیل" گیا میں چھپے ہیں۔ چند افسانے 'نیرنگ خیال' میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنا افسانوی سفر ۱۹۳۲ء سے شروع کیا اور غالباً ۱۹۴۵ء تک اس صنف سے وابستہ رہے۔ ان کے افسانے کچھ طویل بھی ہیں لیکن زیادہ تر مختصر افسانے ہیں۔ ان کے مختصر ترین افسانوں میں شاعرانہ آہنگ ہے۔ یہ افسانے دراصل ادب لطیف سے متاثر ہو کر لکھے گئے۔ "سوت" "راز محبت"، "فرض"، "نقاب"، "اہنسا"، "پٹھان کا خواب" وغیرہ باضابطہ افسانے کے حدود میں آتے ہیں۔ اختر قادری کے افسانوں میں "اہنسا" اسی لئے اہم ہے کہ قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے یہ افسانہ آج بھی ماڈل بن سکتا ہے۔

اختر قادری کے فن پر مقصدیت کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے تمام افسانے اسی رُجحان طبع یا نقطۂ نظر کے عکاس ہیں۔

افسانہ نگاری ترک کر دینے والوں میں ایک نام ح۔م۔اسلم عظیم آبادی کا بھی ہے۔ ح۔م۔اسلم عظیم آبادی دراصل ڈاکٹر سید محمد حسنین ہیں۔ لیکن انھوں نے افسانے ح۔م۔اسلم عظیم آبادی کے نام ہی سے لکھے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کا زمانہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک محیط ہے۔ گو انھوں نے صرف سات برس افسانہ نگاری کی۔ ان کی کتاب "نیل مرام" ۱۹۶۸ء کے ایڈیشن میں مذکور ہے کہ انھوں نے پہلا افسانہ "جب رات کے گیارہ بجے تھے" کے عنوان سے قلمبند کیا تھا۔ ان کا آخری افسانہ "اشتراک" تھا۔ ح۔م۔اسلم عظیم آبادی افسانہ نگار کے لحاظ سے اتنے معروف نہیں ہیں لیکن انشائیہ کی صنفی تعریف اور اس کے حدود متعیّن کرنے کے باب میں ملک بھر میں معروف ہیں۔

ایک لحاظ سے ان کے افسانوں کی ایک انفرادیت ہے۔ اس انفرادیت کی طرف بڑے خوبصورت انداز میں اختر اورینوی نے توجہ دلائی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"دنیائے اطفال اسلم کے افسانے کا کردار کوئی ادھیڑ عمر، جوان، نوجوان مرد نہیں یہ چھوٹا سا بچہ ہوتا ہے، تین چار برس کا ننھا ہیرو یا ہیروئن، جس کی بے سمجھی، ان کہی، انوکھی اور اچانک باتیں اور حرکتیں ان کے افسانے کے پلاٹ ہوتی ہیں۔"
(بہار کے نو چراغ، صفحہ ۱۴۸)

آج کل ایسے افسانوں کو انی سی ٹیشن افسانوں کے خانے میں رکھ کر ان کی نفسیاتی تحلیل کی جارہی ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے اسلم کے افسانوں کی جو اہمیت ہو جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ ان کے افسانے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ان کے نام یہ ہیں:۔

"جب رات کے گیارہ بجے تھے"، "گھائل"، "ٹیوٹر اور بچے"، "اور جب روشنی ہوئی"، "باتیں"، "دولن بھابی"، "خطوطہ" اور "اشرف"۔

بہار میں اُردو افسانہ نگاری کا بیحد معروف نام شش مظفر پوری ہے۔ لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت ہی ان کے فن کی عظمت کی حقیقی شناخت میں مانع رہی ہے۔ اور ناقدین ادب انھیں گمراہ اور معمولی فنکار جیسے تمغے سے نوانتے رہے ہیں۔ دراصل ش۔ مظفر پوری کی زود نویسی نقادوں کی نگاہ میں رہی، پھر یہ بھی ہوا کہ انھوں نے اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لئے اعلیٰ وارفع رسالوں کا انتخاب نہیں کیا۔ اوسط درجے کے رسالوں میں متواتر چھپتے رہے کچھ رسالے تو ایسے بھی تھے جن کی غایت ادبی سے زیادہ فلمی رہی تھی۔ ابتدا میں ش۔ نے اپنے امیج کی تعمیر کی طرف لاپرواہی برتی اور شہرت کو ہی کافی جانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے وہ افسانے بھی جو فنی عظمت کی انتہائی منزلوں پر تھے معمولی رسالوں میں چھپے اور نقادوں کی نظر سے اوجھل رہے۔ ایک طرف تو یہ المیہ ش۔ مظفر پوری کا ہے۔ دوسری طرف ناقدوں کا بھی ہے۔ جو معیاری ادبی رسالوں میں چھپے ہوئے غیر معیاری افسانوں میں بھی کچھ نہ کچھ عظمت تلاش کرنے کے عادی ہیں۔

ش۔ مظفر پوری کی حقیقی عظمت کی پہچان میں یہ بات بھی آڑے آتی رہی ہے۔ کہ ان کا رُجحان جنس کی طرف رہا ہے اور ان کے کئی افسانے جنسی ہیجان پیدا کرتے ہیں۔

غرض کہ ش مظفر پوری کی افسانہ نگاری کے حقیقی خط و خال سے اچھے خاصے پڑھے لوگ بھی ناواقف ہیں۔ لیکن 'ش' کی کارگذاریوں کی طرف اب توجہ کی جانے لگی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی بابت بدگمانی کے ازالے کی صورت نکل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم اور مستحسن قدم عبدالمغنی نے اُٹھایا ہے۔ وہ ان کے افسانوں اور ناولوں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ "ش" کو فحش نگار کہہ کر ٹال دینا ادبی چوک ہے۔ ان کا مضمون پہلے رسالے میں چھپا اور اب اُن کی کتاب "جادۂ اعتدال" کے محتویات میں ہے۔ وہ متذکرہ مضمون 'ش مظفر پوری کا فن' کی ابتدا اس طرح سے کرتے ہیں۔

"ش۔ مظفر پوری کا فن اُردو ادب میں معروف ہے لیکن مسلمہ نہیں۔ اس سے اُردو تنقید پر حرف آتا ہے۔ اس لئے کہ بعض ناقدوں کے قلم سے بہتیرے ایسے نام جہاں تہاں ٹپکتے رہتے ہیں جنھوں نے ہمارے ادب کو کوئی قابل لحاظ چیز ایسی نہیں دی جس کی کوئی حقیقی اہمیت ہو .... ش مظفر پوری کے متعلق ایک غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ یہ یوں کہ موصوف رسالہ بیسویں صدی' (دور اوّل) کے صفحات میں اُبھرے اور ان کی بعض کتابیں "شمع" بکڈپو نے شائع کیں۔ اِن دو حادثوں سے ادبی حلقے کو ان کی جانب سے بدگمان سمجھ لیا گیا کہ وہ جنس نگار ہیں اور سستے سنسنی خیز رومانوں کے ذریعہ نوجوانوں کے اخلاق بگاڑتے ہیں۔" (جادۂ اعتدال صفحہ ۲۹۵ تا ۲۹۶)

یہ ایک سخت گیر نقاد کی رائے ہے۔ ایسے نقاد کی جس کے متعلق بڑے اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ "اخلاقیات" کے رموز اس کے علاقے کی چیز ہیں۔

بہرحال، ش مظفر پوری نے اپنی ادبی زندگی ترجمے سے شروع کی پھر طبعزاد افسانے کی طرح راغب ہوئے۔ ان کے ابتدائی افسانے ذہن میں رکھئے تو ان کا رشتہ پہلے دور کے افسانہ نگاروں سے قائم ہو جاتا ہے۔ اس لئے سنہ ۱۹۴۰ء سے ان کے طبعزاد افسانے چھپنے لگے۔ 'دل کی کروٹ'، "باغی ادیب کا خط" "بھیک" سنہ ۱۹۴۰ء

کے افسانے ہیں۔ اور یہ افسانے "سہیل" گیا میں شائع ہوئے پھر وہ تیسرے دور یہاں تک کہ آج کے عہد کے افسانہ نگاروں کے ساتھ چل رہے ہیں۔

ش منظفر پوری کے دو مجموعے "کڑوے گھونٹ" اور "آوارہ گرد کے خطوط" قریب قریب پچیس برس پہلے شائع ہوئے۔ "کڑوے گھونٹ" کے افسانوں کو ہی نظر میں رکھئے تو "دستک" جیسا معیاری افسانہ مل جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو کے معیاری افسانوں کی اگر فہرست بنائی جائے تو اس میں "دستک" کی ایک نمایاں جگہ ہوگی۔ اس کے دوسرے افسانے مثلاً "خسارہ"، "بے زبان"، "جراثیم" وغیرہ بھی خاصے اہم ہیں۔ ان کہانیوں کو 'جنسی' نہیں کہہ سکتے یہ تو سماجی و معاشرتی زندگیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ بنگال کے قحط پر سب سے مؤثر افسانہ کرشن چندر کا "اَن داتا" ہے۔ 'بنگال کا جادو' اس بلندی تک تو نہیں پہنچتا لیکن اس المیہ پر بہت اچھا افسانہ ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ "کڑوے گھونٹ" کو بھی ناقدین ادب نے نظر انداز کر دیا ہے۔ شاید ان کی نگاہ میں "آوارہ گرد کے خطوط" کے معروف افسانے "انو آپا"، "لال بی بی"، "بند کمرہ"، "نئی آغوش" وغیرہ وغیرہ رہے ہیں۔ میں تو ان افسانوں کو بھی فحش افسانے نہیں سمجھتا ــــ فحش نگاری کس کو کہتے ہیں؟ اس باب میں خاصی بحث کی گنجائش ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ البرٹو موراویا کی 'دی وومن آف روم' کو فخر سے پڑھنے والے لوگ "ش" کو فحش نگار کہتے ہیں۔

"ش" جنس پر لکھتے ہیں تو حصول لذت کے لئے نہیں، وہ ماحول اور سماج کی تمام تر گندگیوں کو ایک فنکار کی طرح دیکھتے ہیں اور بڑے اعتماد کے ساتھ کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کر دیتے ہیں یہ جرّاحی ناپسندیدہ ہوسکتی ہے لیکن غیر ضروری نہیں۔ "آوارہ گرد کے خطوط" کا پیش لفظ "ش" کے فن کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

"...... اس کے قلم کی ہر ادا ہمارے معاشرتی اور اخلاقی زوال پر ایک حسرتناک اور تنقیدی طنز ہے۔ وہ جنسی رنگینیوں اور رومانی دل آویزیوں میں ہمارے ذہن کو اُبھار کر ان شرمناک کمزوریوں کو برہنہ کر دیتا ہے، جنھیں ہم قابل اصلاح

تصور نہیں کرتے ......"

......اس کے قلم کی نوک "سوسائٹی اور سوسائٹی" کی جنسی مغلوبیت کے اس پھوڑے کو کریدتی ہے جو کوڑھ میں منتقل ہو چکا ہے۔"

(پیش لفظ از بلقیس خاطمہ)

یہ جائزہ قطعی درست ہے اس لحاظ سے "آوارہ گرد کے خطوط" کے افسانوں کا رشتہ منٹو کے افسانوں سے ملتا ہے۔ اور "ش" کے فن کا مطالعہ اس پس منظر میں ممکن ہے۔ افسانے "حق تلفی" اور "بند کمرہ" ہی نگاہ میں ہوں اور ان کے فنی نکات کا جائزہ لیا جائے تو پھر یہ رشتہ کتنا استوار ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ "ش" کی ماجرا نگاری اور اسلوب کی انفرادیت کا عبدالمغنی نے بھرپور جائزہ لیا ہے اور ان کے مطالعہ کے نتائج حقیقت پر مبنی ہیں کہ وہ ایک صاحب اسلوب افسانہ نگار ہیں۔

بہرطور "ش" کے دوسرے افسانے مثلاً "دوسری بدنامی"، "نہ جینے دوگے نہ مرنے دوگے"، "سرد جنگ" وغیرہ نقادوں کی توجہ کے مستحق ہیں۔ میں اس بات پر یہ بحث ختم کرتا ہوں کہ "ش" ایک منفرد اور اہم افسانہ نگار ہیں، ان کا مطالعہ تعصبات سے الگ ہو کر کرنا چاہیے۔

بہار میں اُردو افسانہ نگاری کے باب میں ایک اور بھولا ہوا نام رضیہ رعنا کا ہے۔ یہ پہلے دور کی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ۱۹۳۷ء سے چھپنے لگے تھے۔ "ندیم" اور "سہیل" گیا میں ان کے افسانے اکثر شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً "پریم کا بندھن"، "احساس محبت"، "طلسم خیال" اور "شریمتی جی"۔

رضیہ رعنا کے افسانوں کی فضا رومانی ہے، لیکن کہیں اچھی خاصی نفسیاتی تحلیل بھی ملتی ہے۔ خصوصاً دیہات کی الھڑ دوشیزاؤں کی معصومیت اور ان کے گرد جہاندیدہ افراد ــــ ایسی صورت حال کی خوبصورت تصویر کشی ان کے افسانے میں ملتی ہے۔ رضیہ رعنا میں بھی ایک نفسیاتی افسانہ نگار کی تمام تر چنگاریاں موجود تھیں، افسوس کہ چنگاری شعلہ نہ بن سکی بلکہ کب کی بجھ چکی۔

دورِ اوّل سے رابطہ رکھنے والے ایک اور افسانہ نگار جو افسانہ نگار باقی نہیں
رہے لیکن باضابطہ شاعر ہیں قیصر عثمانی ہیں۔ قیصر عثمانی نے کچھ افسانے لکھے۔ ان کا پہلا
افسانہ "خیام لاہور میں" "آوارہ" کے عنوان سے ۱۹۴۰ء میں چھپا۔ پھر انھوں نے متعدد
افسانے لکھے۔ اور متعدد رسالوں میں چھپتے رہے۔ ان میں چند یہ ہیں: "پانچ انگلیاں"
"نرگس کی ساڑی" "سوراخ" "ایک کلسی ایک ہانڈہ" "مریض" وغیرہ۔ ان افسانوں
میں ایک طرف تو سماجی احوال و کوائف مرقوم ہیں تو دوسری طرف نفسیاتی تحلیل بھی
ہے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۰ء کے بعد افسانہ نگاری سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور اب
شاعرانہ حیثیت منوانے کے باب میں زیادہ سنجیدہ نظر آتے ہیں۔

بدیع مشہدی اُردو کے کبھی بہت فعال افسانہ نگار رہے ہیں۔ ان کے افسانے
۱۹۴۵ء ہی سے شائع ہونے لگے تھے، "نقاش" کلکتہ میں ان کے متعدد افسانے مثلاً
"ٹک ٹک" "آفت" "تصادم" "چسٹر" وغیرہ چھپے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں ترقی پسندی
کے عناصر ملتے ہیں۔ سماجی احوال و کوائف پر ان کی نظر رہی ہے۔ اس طرح ان کے
افسانوں میں نچلے طبقے کے دُکھ درد منعکس ہیں۔ انور عظیم نے افسانوں کا ایک
مجموعہ "دُکھتی رگیں" مرتب کیا تھا، بدیع مشہدی کا ایک افسانہ اس مجموعے میں شامل ہے۔
اب بھی گاہے گاہے ان کے افسانے اُردو رسائل میں چھپتے ہیں لیکن اب یہ
ہندی کے افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے کافی معروف ہو چکے ہیں۔ ان کے
ناول "ایک چوہے کی موت" اور "چھاکو کی واپسی" ہندی ہی میں چھپے ہیں۔ بدلتے
ہوئے حالات کے تحت شاید اُردو کی طرف سے انھیں مایوسی ہو چکی ہے۔ لیکن کیا
بدیع مشہدی ہمیشہ کے لئے اُردو سے رابطہ توڑ چکے ہیں یا توڑ سکتے ہیں؟ یہ ایک
سوال ہے، میرا خیال ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ بدیع مشہدی ہندی میں
بھی لکھتے رہیں لیکن اُن کے اُردو کے منتخب افسانوں کے ایک مجموعے کا انتظار رہے۔

اُردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں انور عظیم کی ایک حیثیت ہے اور یہ حیثیت مسلم
بھی ہے۔ اشتراک اور ترقی پسندی کے علمبردار انور عظیم مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان کا رشتہ

افسانہ نگاروں کی دوسری نسل سے تو ہے ہی لیکن ان کا رابطہ تیسری اور چوتھی نسل سے بھی ہے۔ اس طرح بھاگتے ہوئے وقت نے ان کے قدم روکے نہیں ہیں وہ مسلسل آگے بڑھتے جاتے ہیں اور افسانہ نگاری کے بدلے ہوئے تیور کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان کا سلسلہ عظیم آباد، دہلی سے ماسکو تک پھیلا ہوا ہے اس لئے ان کے تجربے وسیع بھی ہیں اور متنوع بھی۔

شعر و ادب کے ضمن میں انور عظیم کا موقف کیا رہا ہے اس کا اندازہ ان سطور سے کیجئے:

"ادب صرف حسن و عشق کی مرثیہ گوئی اور روایتی خواب اور مسک تصورات کا پرتو تو نہیں ہو سکتا۔ انگریزی سامراج کی چیرہ دستیاں، اقتصادی افلاس، سماجی انحطاط، ذہنی کم ظرفی اور سیاسی موت ...... ہر بیماری کا علاج ادیب کا فرض ہے ...... ترقی پسند ادیب و شاعر زندگی کے ان نظاروں (تحریک، انقلاب، جنگ، ہنگاموں وغیرہ) پر نظر رکھتا ہے۔ وہ ایسے وقت میں رومان کے نغمے نہیں الاپتا، وہ کسانوں اور مزدوروں کی تحریکوں کا گانا گاتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ تحریکیں سرمایہ داری کا گلا گھونٹ رہی ہیں ......" (مجموعہ افسانہ)

یہ ان کے دیباچہ کا اقتباس ہے جو انھوں نے اپنی تالیف "دھکتی رگیں" ۱۹۴۶ء میں قلمبند کیا تھا۔ اس اقتباس سے ادب و شعر کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ اس باب میں بحث کی بیحد گنجائش ہے لیکن یہاں اس کا موقع نہیں ہے مختصر یہ کہ انور عظیم ایک ترقی پسند اور اشتراکی افسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں میں اس تحریک کے لوازم بیش از بیش ملتے ہیں۔

یوں تو انور عظیم کا افسانوی سفر ۱۹۴۳ء ہی سے شروع ہوا۔ ان کے ابتدائی افسانے "ندیم" گیا اور "نقاش" کلکتہ میں چھپے۔ ان افسانوں میں "لال لال" "پھول اور کانٹے" "پرواز"، "ٹھنڈی سڑک"، "چڑیلیں" وغیرہ قابل ذکر ہیں لیکن دہلی کے سفر کے بعد ان کے فن میں بتدریج ارتقاء کی ایک صورت پائی جاتی ہے۔ انھیں ہندوستان گیر سطح پر جن ناموں کے ساتھ یاد کیا جانے لگا تھا وہ یہ ہے انتظار حسین، اے حمید،

شوکت صدیقی، دیویندر اِسّر، ضمیر الدین، خلیل احمد، ابن الحسن وغیرہ۔ ان سب کے لکھنے کا ڈھب الگ الگ تھا لیکن اپنی اپنی حیثیت سے یہ سب کے سب معروف تھے۔ انور عظیم کے چند افسانے مثلاً "اُونگھتی ڈیوڑھی"، "جاگے کھیت" اور "ڈھلان" وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جاگیردارانہ نظام کے کھوکھلے پن کی عکاسی کر رہے ہیں۔ وہ ایسے نظام کے سفاکانہ عوامل سے باخبر ہیں اور ان کی موثر تصویر کشی کر سکتے ہیں۔ متذکرہ افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وقار عظیم لکھتے ہیں۔

"انور عظیم نے معاش کے جن تضاد اور طبقاتی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا ہے اس میں ایک بلند آدرش پروپیگنڈے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لیکن جب کبھی اس آدرش میں پروپیگنڈے کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو افسانہ کی پوری فضا تکدر میں ڈوب جاتی ہے ...... (داستان سے افسانہ تک صفحہ ۲۲۳ ۱۹۶۶ء ایڈیشن)

لیکن انور عظیم کا فن بتدریج ارتقا پذیر رہا ہے اس کا اندازہ ان کے مجموعہ 'قصہ رات کا' سے ہوتا ہے۔ اس مجموعے کے سترہ افسانے ان کی عظمت کا ثبوت پیش کرتے ہیں "قصہ رات کا" "آرزدہ ستاروں کا ہجوم" "ساری رات" "درد کا ساحل کوئی نہیں" "کولبس اور کلیٹے" "دلوں کی رات" "قتل برائے قتل" "مچھلی" "سات منزلہ بھوت" "مولاڈور" "سامنا" "بلیک میلر" "ٹھنڈی سرنگ" "دھان کٹنے کے بعد" "آخری رات" اور "دلادر سنگھ" ایک نہج کے افسانے نہیں ہیں۔ ان میں سماجی گندگیوں کی عکاسی بھی ہے نئی تہذیب کے کھوکھلے پن کی تصویر بھی۔ اور کہیں کہیں عرفان ذات کی جھلکیاں بھی۔ ایسا تنوع بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔ بعض افسانوں میں فکر وفن کا حسین امتزاج بھی ہے۔ میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جو چلن ترقی پسند شاعروں میں فیض کا ہے وہی افسانہ نگاروں میں انور عظیم کا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

"فنی سرگرمی کا واحد جواز اظہار ذات کی مجبوری اور خلش ہے۔ اس جرم کا مجھے اقرار ہے۔ لیکن میں ذات کو کائنات کا کوئی مجرد کرشمہ نہیں مانتا میں اظہار ذات کو تفہیم کائنات کا تخلیقی عمل مانتا ہوں ...."

اگر وہ اپنی بات کو یہیں ختم کر دیتے تو شاید اشتراکی باقی نہیں رہتے اس پر مزید لکھتے ہیں۔

"سماج کے طلسم سے باہر ذات کا فرد کا کوئی وجود نہیں، صرف موجودات کے رشتے میں ذات کو پہچانا جاسکتا ہے ....

بہر حال ذات کی پہچان کا واسطہ جو بھی ہو ان کا فن اس تلاش میں سرگرداں ضرور ہے، اس لئے یہ سچ ہے کہ ان کے افسانے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کاوش ہیں۔ تجربوں اور مشاہدوں میں، فکر و عمل میں زندگی کی گوناگوں آویزشوں میں اپنے آپ کو پانے اور تلاش کا جواز پنہاں ہے۔ اس طرح انور عظیم کٹر قسم کے ترقی پسندوں سے یکسر الگ ہو جاتے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں کا علامتی رنگ افہام تفہیم کے پیچیدہ مراحل سے گذرنے پر مجبور ہوتا ہے لہٰذا وہ افسانوں کی ہیئتی اور تکنیکی تبدیلیوں سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ انھیں برتنے سے گریز بھی نہیں کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو کے چند بیحد ممتاز افسانہ نگاروں میں انور عظیم کی ایک نمایاں جگہ ہے۔

بہار کے اُردو افسانہ نگاروں میں ایک معروف حیثیت کلام حیدری کی بھی ہے۔ یہ ہندوستان گیر سطح پر ایک جانے اور مانے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے آس پاس سے لکھ رہے ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں عشقیہ اور رومانی آہنگ بہت تیز رہا ہے۔ پھر بھی وہ ترقی پسندی کی طرف جھک گئے۔ اس ذیل کے بھی کئی افسانے قابل مطالعہ ہیں مثلاً "رات کتنی باقی ہے" استحصال اور سفاکی کی المیہ فضا پیش کرتی ہے۔ اس طرح یہ ان کے منتخب افسانوں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ "بے نام گلیاں" اور "کھلیان اور سلاخیں" ان کے مجموعے کے اچھے افسانے ہیں۔ "کھلیان اور سلاخیں" کے بارے میں رضیہ سجاد ظہیر لکھتی ہیں۔

"..... حالات کی کتنی اچھی خاصی عکاسی، کیسی پیاری زبان عوام کا کتنا گہرا درد اور ان کی کیسی صحیح انڈر اسٹینڈنگ .... ہماری تحریک اور ہمارے ادب کو ایسے لکھنے والوں کی بڑی ضرورت ہے۔"

("بے نام گلیاں" باتیں صفحہ ۷)

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود کلام حیدری کو اپنے افسانے کے اس مجموعے کے بارے میں کوئی حُسن ظن نہیں تھا وہ لکھتے ہیں۔

"ان کہانیوں کو پیش کرتے ہوئے میں اپنے متعلق کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں کہ میری ابتدائی کوشش ہے جس کا ریکارڈ رکھنا چاہتا ہوں اگر آگے میں کہانیاں لکھنا سیکھ گیا تو میرے فن کے ارتقاء کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔۔۔۔۔۔"

(بے نام گلیاں باتیں صفحہ ۵)

اور ہوا بھی یہی کم از کم لکھنے کی حد تک کلام حیدری ترقی پسند تحریک سے الگ ہو گئے، جدید ادبی رو سے اِس حد تک متاثر ہوئے کہ ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ "صفر"، وجودی افکار، کے ذیل میں آتا ہے، "صفر" پر میرا تبصرہ شائع ہو چکا اس کی کچھ باتیں یہاں نقل کرتا ہوں۔

"..... میں اگر یہ کہوں کہ کلام حیدری Existentialist ہیں تو چونکنے کی ضرورت نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے کارل بارتھ، پال ٹیلچ، جبریل مارسل، کارل یسپرس، مارٹن ہائیڈیگر یا کیرے گار کو باضابطہ پڑھا ہے۔ انھیں اپنے افسانوں میں برت ڈالا ہے، مقصود یہ ہے کہ لمحوں کو گرفت میں لانے کی کوشش، تشکیک، نی ہیلزم، اجنبیت، قدروں کا انہدام، داخلیت، اپنی تلاش اور عقلیت کے خلاف بغاوت کا جو رُجحان 'وجودیوں' کے یہاں ملتا ہے حیرت انگیز طور پہ کلام حیدری کی افتادِ طبع بھی ہے۔

مجموعے کا نام 'صفر' ایک قسم کی نفی ہے، یہ نفی کہاں کہاں ہے یہ تو افسانوں کے جائزہ کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ اِس سے فکر کی ساخت کا ایک مجموعی اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ایسے یہ نام دو سطحوں پر کام سرانجام دیتا ہے، 'صفر' انگریزی میں باضابطہ ایک صفت ہے جس میں الفاظ 'کوڈ' بن جاتے ہیں۔ یہ کوڈ ورڈس دوسرے الفاظ کے سبسٹی ٹیوٹ بن جاتے ہیں، انگریزی میں سوئفٹ نے جرنل ٹو اسٹیلا، میں صفر کی صفت اپنائی ہے، یہ ایک طرح کی اشاراتی زبان ہے، اس طرح ایسے افسانے جو کئی سطح پر

سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کے لئے یہ نام خاصا suggestive ہے ...."

(آہنگ نمبر۱، ۶ صفحہ ۵)

اس کے بعد میں نے اس مجموعے کے متعدد افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے افسانے "صفر"، "لا"، "اسیر"، "حادثہ"، "زندانی" وجودی افکار کی نمائندگی کرتے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے، صفر دو تبصرے آہنگ نمبر۱، ۶) اور اس اعتبار سے بیحد ممتاز ہیں۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کلام حیدری کا افسانوی سفر ایک ارتقائی سفر ہے اور صفر نئے رنگ و آہنگ کے افسانوں میں نمایاں افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں تجریدی انداز زیادہ ہے اور علامتی کم، فکری سطح پر یہ وجودی افسانے بیحد اہم ہیں چنانچہ کلام حیدری جدید افسانہ نگاروں کی صف میں ایک امتیازی جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

اُردو کے چند بیحد ممتاز افسانہ نگاروں میں غیاث احمد گدی ہیں۔ معیار کی سطح کے بارے میں یہ کہنا قطعی درست ہے کہ انھیں وہ عظمت اور سربلندی حاصل ہے جو بہت کم افسانہ نگاروں کا مقدر بن سکی ہے۔ دراصل غیاث احمد گدی فن کے برتاؤ کے بارے میں بہار کی دوسری اور تیسری نسل کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ محتاط ہیں۔ انھوں نے اپنی زیادہ تخلیقات ملک کے معیاری ادبی رسالوں میں شائع کروائی ہیں۔ ان کے ہلکے پھلکے افسانے جو دوسرے اور تیسرے درجے کے رسالوں میں چھپے ہیں ان میں بھی کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی ہے۔ وہ اپنے افسانے کی نوک پلک سنوارنے کے سلسلے میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیتے ہیں اور فنکاری کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔

غیاث احمد گدی کا افسانوی سفر ۱۹۴۶ء کے آس پاس شروع ہوا ہے۔ لیکن ان کی تخلیق کی رفتار تیز نہیں رہی ہے، شاید اس کی وجہ وہ فنی احتیاط ہے جو ان کا واضح موقف بن گئی ہے۔

غیاث احمد گدی کے ابتدائی افسانوں میں "بوجھ" "کلیوں کا خون"، "کالے شاہ" "افعی" "میں اور کہانی" اور "پان" وغیرہ ہیں۔ ان افسانوں میں بھی بڑے افسانہ نگار کے

تمامتر تیور موجود ہیں۔ اس فہرست میں "افعی" جنس اور نفسیات کے علاقے کا افسانہ ہے۔ اور اپنے قوام و مواد کے اعتبار سے انوکھا ہے۔ اس کا رشتہ منٹو کی افسانوی سرشت سے ملتا ہے لیکن منٹو کے یہاں بھی وہ جرأت نہیں نظر آتی جو "افعی" کے خالق کے حصے میں ہے۔

غیاث احمد گدی کے افسانوں کا ایک مجموعہ "بابا لوگ" ۱۹۶۹ء میں ہی چھپ گیا ہے۔ اس کے مشتملات میں "بابا لوگ" "پہیہ" "منظر و پس منظر" "بائے" "ڈور وقتی جون سین" "بدصورت سیاہ صلیب" "پیاسی چڑیا" "جوہی کا پودا" اور "چاند" اور "صبح کا دامن" ہیں۔ اس مجموعے کے افسانوں کے علاوہ دوسرے مشہور افسانے یہ ہیں "خانے اور تہہ خانے" "سائے اور ہمسائے" "نا ردمی" "......اور کل" "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" اور "ڈوب جانے والا سورج"۔ خانے اور تہہ خانے" دراصل غیاث احمد گدی کے ناول کا ایک باب ہے جو ابھی زیر تصنیف ہے۔ لیکن اس باب کی حیثیت ایک مکمل افسانے کی بھی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر لطف الرحمن نے ایک گراں قدر تجزیہ شب خون جولائی اگست ۱۹۷۴ء کے مشترکہ شمارے میں شائع کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ غیاث احمد گدی کی عظمت کا راز کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ زندگی کی تمام تر تلخیوں، ناکامیوں اور حسرتوں کو اپنے افسانے میں سمیٹ لینے کی بے پناہ قدرت رکھتے ہیں۔ مجبوری و بے بسی ان کے افسانے کا مزاج بناتے ہیں۔ لیکن ان امور کو وہ براہ راست ایک مصلح یا راہبر کی طرح بلا واسطہ بیان نہیں کر دیتے ان کے اندر چھپا ہوا ایک بڑا فنکار انھیں تخلیقی مرحلے سے گذرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی باتوں کو ادبی اسرار و رموز کا دلکش پیرہن عطا کر دیتے ہیں۔ ان کا بلا واسطہ اظہار بیان انھیں راجندر سنگھ بیدی سے قریب کر دیتا ہے بلکہ بعض گوشوں میں وہ بیدی کی سرحد کو چھلانگ جاتے ہیں۔ بیدی اپنے افسانوں کا قوام غم اور جنس کے دل پذیر مرکب سے تیار کرتے ہیں ان کے یہاں بھی لاچاری اور بے بسی کی کیفیت بہت نمایاں ہے لیکن غیاث احمد گدی ایسی تلخیوں کو استعارے کے ایک واضح نظام میں پرو دیتے ہیں جزئیات نگاری دونوں ہی افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن غیاث احمد گدی کے یہاں

جزئیات بحد استعاراتی ہیں۔ یہ ایک ایسی صورت ہے جو انھیں شعراء کے صف میں کھڑا کردیتی ہے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں لیکن میں چند مثالوں پر بس کرتا ہوں جن میں تشبیہوں اور استعاروں کی بے پناہ لذت روپوش ہے۔

"پھر بابا لوگ یہ سنتے ہی کمرے میں آگئے اور بڑھے انکل کے مونڈھے کو یوں گھیر لیا جیسے اکسمس کی ننھی ننھی موم بتیاں جو بڑے سے کیک کو چاروں طرف .... کردی گئی ہوں ......" (بابا لوگ)

"بڈھا انکل جو دور آسمان کے پھیلاؤ میں چمکنے والے چاند پر کمندیں ڈال رہا تھا اپنی جگہ واپس آگیا" (بابا لوگ)

"وہ بہت روتا، دھیرے دھیرے روتا، ایسا ما پھک جیسے ٹائم پاس ہوتا ہے ......" (بابا لوگ)

"...... وہ برسوں کا بھوکا بیل ماضی کے چٹیل میدان میں حسب دستور منھ مارنے لگا شاید کوئی پودا مل جائے۔" (بابا لوگ)

"...... مگر بے بی اب کہانی نہیں مانگتا، اس پودے کے تنے موٹے ہوگئے ہیں ...... پہلے وہ کہانیوں کے جھولے میں جھولنے کے لئے کیسے مچلا کرتی تھی مگر اب خود چاہتی ہے کوئی اس کے تنے میں رسیوں کا جھولا لگا کر لمبی لمبی پینگ کھائے۔" (بابا لوگ)

"...... مگر وقت کی بوند میں جذب ہوتی ہوئی آواز اس کے پیروں سے چمٹ جاتی ہے ....." (بابا لوگ)

"..... مارگریٹ بے بی تم بھی ایک قطرہ ہو جس میں تمھاری ماں کی خوشبو رچی ہوئی ہے ....." (بابا لوگ)

"...... ٹھہر جاؤ .... ٹھہر جاؤ .... تمھارے پیچھے وقت کا بوڑھا کتا سرپٹ بھاگ رہا ہے۔" (بابا لوگ)

"....... پھر رات جو جھاگ کی طرح ماحول پر چھاگئی تھی، دھیرے دھیرے نیچے بیٹھنے لگی۔" (بابا لوگ)

"..... کمرے میں اس کی سسکیاں بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح بھر رہی تھیں ..."
(بابا لوگ)

"...... دھواں کی طرح پیچ کھائی ہوئی ایک الجھتی ہوئی آواز اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر حلق میں پھنس جاتی تھی ......" (بابا لوگ)

"...... پھر بوڑھا انکل نے چونک کر اپنی ہتھیلی کو دیکھا اور آہستہ آہستہ جیسے گلاب کی پنکھڑیوں سے شبنم چن رہا ہو..." (بابا لوگ)

"...... ادھر اطمینان سے اس امید میں پٹنے والی بھورانی کہ بعد ازاں عام شوہروں کی محبت بھی کریں گے۔"

دیکھتے دیکھتے جب دیکھا کہ کنواں کا پانی ایک دم سے تارا ہو گیا ہے تو سوچتے سوچتے وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں رہا۔" (پہیہ)

"...... اس کا چہرہ شرم سے کشمیری سیب کی طرح سرخ ہو گیا، طلوع دم سورج کی طرح پاکیزہ ......" (منظر و پس منظر)

"..... اب تک جو زندگی نیند کی آغوش میں پڑی ہوئی تھی ہوئے ہوئے جاگ رہی تھی ...." (منظر و پس منظر)

"..... ایک حسین شور پھیلنے لگا۔" (منظر و پس منظر)

"..... پھر اچانک اس معمر آدمی نے میری طرف دیکھا اور دفعتہً یوں قہقہہ لگانے لگا کہ میں نے محسوس کیا کہ گویا مکان کی ٹین والی نشیب چھت پر بہت سے پتھر گرنے لگے۔" (بابے)

"..... شاخوں کا کیا بابے ہوا نے جدھر زور دیا ادھر جھک گئی....." (بابے)

کہاں تک مثالیں دی جائیں، غیاث احمد کے افسانوں کی پوری ساخت ایسی ہی تشبیہوں سے بھری پڑی ہے۔ اس طرح ان کی باتیں خیال انگیز ہو جاتی ہیں۔ اس حد تک کہ پلاٹ سازی کا کہیں کہیں ڈھیلا پن بار گراں نہیں ہوتا۔

غیاث احمد گدی بنیادی طور پر مثال پسند ہیں۔ عفت و ناموس کا قدیم ترین تصور ان کے یہاں ملتا ہے۔ اس طرح "افعی" کو الگ رکھیے تو اکثر یہ تصور مرکزی صورت اختیار

کر لیتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ غیاث احمد گدی جانی پہچانی قدروں کے علمبردار ہیں اور بہت کم ہی متعینہ قدروں سے الگ ہوتے ہیں، کہیں کہیں ان کا آئیڈیلزم ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ ان کے بہت معروف افسانوں میں بھی یہ صورت دیکھی جاسکتی ہے جن کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں اس وقت میں محض اشارے پر اکتفا کر رہا ہوں۔

غیاث احمد گدّی کہیں فال بیک کی تکنیک اپناتے ہیں تو کہیں علامتی سطح کو چھوتے ہیں، اساطیری تلمیحات بھی ان کے علاقے کی چیز ہیں، اس لئے ان کے افسانے تروتازہ معلوم ہوتے ہیں، انتہائی جدید نقطۂ نظر سے بھی ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" اور "ناردہ منی" جدید افسانوں کی اچھی مثال ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ غیاث احمد گدّی کا فن راجندر سنگھ بیدی اور انتظار حسین کے فن کا امتزاج ہے اور اسی طرح اُن کی اُردو افسانہ نگاری میں ایک انفرادی شان ہے۔

یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ نے افسانہ نگاروں کے بارے میں اپنے پڑھنے والوں کی رائے جاننی چاہی تھی اس سلسلہ میں جو نتائج برآمد ہوئے تھے وہ اس طرح تھے۔ اوّل کرشن چندر، دوئم راجندر سنگھ بیدی، سوئم غیاث احمد گدی اور چہارم قرۃ العین حیدر ــــ ظاہر ہے کہ اس ترتیب کے بارے میں بحث کی بےحد گنجائش ہے لیکن اس سے اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ غیاث احمد گدی ہندوستان گیر پیمانے پر نہ صرف پسند کئے جاتے ہیں بلکہ ادبی وزن و وقار رکھتے ہیں۔

مشہور نقاد شکیل الرحمٰن گاہے گاہے افسانہ نگاری کی طرف بھی توجہ کرتے رہے ہیں، ایک عرصہ سے لکھتے ہیں لیکن معیاری ادبی رسالوں کی طرف رجوع نہیں کرتے اور ان کے افسانے "بیسویں صدی" دہلی ہی میں شائع ہوتے۔ "بیسویں صدی" کا اپنا ایک مزاج رہا ہے۔ ایسے میں اس کے لکھنے والوں کی ایک دُنیا ہے، رومانی، خواب آگیں۔ پھر ایسی فضا کی عکاسی کے لئے حُسن وعشق کی بالائی اُمنگیں ہی افسانہ بنتی ہیں۔ لہٰذا فن کی وہ بلندی جو آزاد ہو کر لکھنے سے حاصل ہوسکتی ہے اس پابندی سے اکثر عنقا بن جاتی ہیں۔ غالباً شکیل الرحمٰن جب تنقید کی کاوشوں سے اُوب جاتے ہیں تو اپنی تھکان مٹانے

کے لئے نیم رومانی، نیم عشقیہ افسانے لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے بہت سنجیدگی سے اس فن کی طرف رجوع نہیں کیا ہے ایسے میں ان کے علم وفضل اور ادبی سوجھ بوجھ کا پتہ ان کے افسانوں میں نہیں ملتا۔ ویسے کہیں کہیں ان کے افسانوں میں المیہ فضا اس طرح منعکس ہو جاتی ہے کہ عام قاری کے ساتھ خواص بھی اثر لے سکتے ہیں، پھر فضا بندی میں بھی ایک حد تک ہنرمندی سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانے ایک حلقہ میں خاصے پسند کئے جاتے ہیں لیکن ان کے افسانوں کا ادبی وزن و وقار مسلم نہیں ہے۔ شکیل الرحمٰن نے یہ چاہا بھی نہیں۔

شکیل الرحمٰن کے بعض افسانوں میں کشمیر کا خوبصورت ماحول ملتا ہے۔ لیکن اس باب میں بھی جزئیات نگاری سے کام نہیں لیتے۔ غرض کہ شکیل الرحمٰن افسانہ نگاری کے ضمن میں خود بہت سنجیدہ نہیں ہیں —— مجھے ان کے بعض افسانے پسند ہیں ان میں "لیڈ سلائڈ" سرفہرست ہے، دوسرے افسانے ہیں "آخری سجدہ"، "قیصر"، "گریز" اور "پتھر کی آواز" ——

بہار کے نامور افسانہ نگاروں میں زکی انور بھی ہیں، کبھی اپنی زود نویسی کے لئے بھی مشہور تھے۔ لیکن ادھر لکھنے کی رفتار سست ہوگئی ہے۔

زکی انور نے ۱۹۴۶ء ہی سے افسانے لکھنے شروع کئے 'کندن' ان کا پہلا افسانہ ہے۔ جو کلکتہ کے ایک رسالہ میں چھپا تھا۔ تب سے وہ بے تحاشا لکھتے رہے۔ معیاری وغیر معیاری رسالوں کی پرواہ نہیں کی۔ فن کی ایک خاصی بلندی تک بھی پہنچے اور وہاں سے گرے بھی، توازن اور اعتدال برقرار نہیں رکھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ زکی انور کی حیثیت معروف ہونے کے بعد بھی مسلم نہیں۔ لیکن تنقید کا تقاضا ہے کہ جہاں ان کے معمولی افسانوں کی نشاندہی کی جائے وہاں ان کے ممتاز افسانوں کا بھی جائزہ لیا جائے۔ میرا موقف تو یہ ہے کہ فنکار کی ارفع و اعلیٰ تخلیقات ہی پیش نظر رکھی جائیں اور اس کے پس منظر میں اس کا منصب متعین کیا جائے نہ کہ معمولی تخلیقات کی نشاندہی کر کے اسے ہدف ملامت بنایا جائے۔

بہر حال زکی انور کے افسانوں کی ایک فہرست میرے پیش نظر ہے مثلاً "لال پری" "کھوسٹ"، "تین سال تین دن"، "چلم"، "تھکن"، "ہنگاموں کی موت"، "رند کے رند رہے"، "عشق جو خلل نہیں"، "ایک شعلہ"، "وفا"، "آدمی کا سی نو پیس"، "ضدی"، "بات ختم ہوگئی"، "تمھارے اور ہمارے غم"، "لذت خواب سحر" وغیرہ۔

یہ چند افسانے ہیں اور مختلف رسالوں میں چھپے ہیں، دراصل زکی انور نے اتنا زیادہ لکھا ہے کہ ان کے افسانوں کی مکمل فہرست قلمبند کرنی مشکل ہے۔ لیکن ان کے چند اچھے افسانوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ جن افسانوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ان میں "چلم" اور "لذتِ خواب سحر" یقینی معیاری افسانے ہیں۔ زکی انور ان افسانوں میں جس بلندی پر پہنچے وہاں سے آگے بڑھنا ان کے لئے شاید ممکن نہ ہوسکا۔ "لذتِ خوابِ سحر" کے کرداروں میں تہہ داری ہے۔ داخلیت سے پُر یہ افسانہ اُلجھے ہوئے کردار کا عکاس ہے۔ یہاں افسانہ نگاری کی دروں بینی فن کے اعلیٰ حدود کو چھوتی ہے۔ "لذتِ خوابِ سحر" کا افسانہ نگار سطحی رومان پسندی کا شکار نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کرداروں کے داخلی احوال و کوائف کی عکاسی زکی انور کے بس کی بات بھی ہے لیکن انھوں نے یہ معیار قائم نہیں رکھا۔ عام طور سے ان کے افسانوں کی تار و پود اکہری ہوتی ہے اس حد تک کہ ان میں صرف بالائی امنگوں کی سمائی ممکن ہوتی ہے، زکی انور اپنے کرداروں کے دلوں میں نہیں اُترتے بالائی سطح پر ان پر حکم لگاکر مطمئن ہوجاتے ہیں اس لئے ان کے کسے ہوئے پلاٹ بھی زندگی کی پیچیدگیوں سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ لیکن یہ صورت واقعہ ان کے تمام افسانوں میں نہیں ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ان کے اچھے افسانے بھی ان کے کمزور افسانے میں دب کر رہ گئے ہیں۔ مکاتیب پر مشتمل افسانوں نے ان کے فن کو مزید زک پہنچایا ہے۔ دراصل مکتوبی تکنیک سے کوئی بات نہیں بنتی اور پڑھنے والوں کا سنجیدہ طبقہ سخت تکدر کا شکار ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زکی انور اپنے معیاری افسانوں کا ایک انتخاب شائع کریں تاکہ ان کی فنی عظمت کی تعین ممکن ہوسکے۔

انجم جمالی کسی زمانے میں زود نویس افسانہ نگار رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس سے لکھنا شروع کیا تب سے مسلسل لکھتے رہے لیکن گذشتہ چند برسوں سے خاموش بیٹھے ہیں۔ انھوں نے پچاس ساٹھ افسانوں سے زیادہ ہی لکھے ہوں گے لیکن انھوں نے وہ فنی عظمت حاصل نہیں کی جو اتنی مشق کے بعد حاصل ہو سکتی تھی۔ دراصل انجم جمالی زیادہ تر "نکہت" "بیسویں صدی" "چترا ویکلی" "شمع" "جام نو" اور اسی قسم کے رسالوں میں چھپتے رہنے پر بس کی۔ افسانے کے فنی نزاکتوں کو برتنے سے گریز کرتے رہے۔ اور نیم رومانی، نیم سماجی افسانے تخلیق کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی لحاظ سے ان کے افسانوں کی وہ قدر و قیمت نہیں جو ان کے ساتھ ساتھ لکھنے والوں کا مقدر بنی۔ ممکن ہے انھوں نے چند معیاری افسانے بھی لکھے ہوں لیکن ان کے افسانے اس طرح غیر معیاری رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں کہ ان کی تلاش اور ادبی قدر و قیمت کا تعین سہل نہیں ہے زود نویسی نے ان کے فن کو ضرب لگائی ہے۔ ویسے ان کے چند افسانوں کے نام میں یہاں درج کر رہا ہوں جن سے ان کے فن کی روش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"کاجل کی کوٹھری" "بازی" "رات کے طبلے" "استاد جی" "سیاہ کاغذ" "طاقت" "عورتوں کا زہر" "ریشم کی عورت" "سازش" "وفا" "میلے کی رات" وغیرہ۔

اگر انجم جمالی اپنے افسانوں کا انتخاب شائع کروا سکتے تو اردو افسانہ نگاروں میں ان کا مقام متعین کرنا ممکن ہو سکتا۔

بہار کے افسانہ نگاروں میں ل۔م۔شاہد ۱۹۴۵ء کے آس پاس سے لکھ رہے ہیں ان کے افسانوں کی تعداد خاصی ہے۔ ان کے افسانے زیادہ تر اکہرے ہوتے ہیں۔ کسی کسی افسانے میں مکالموں کی ساخت رکھی گئی۔ بعض افسانے خاصی رومانی فضا رکھتے ہیں۔ سماجی مسائل سے بھی ان کی دلچسپی رہی ہے۔ لیکن وہ فنی چابک دستی جو اتنی مشق کے بعد حاصل ہو سکتی تھی ابھی تک ان کے حصے میں نہیں آئی۔ بہرحال ان کے چند افسانوں کے عنوان یہ ہیں۔ "نیا قدم" "آواز کے سائے" "محبت دولت اور فنکار" "گھائل سپنے" "تین عورتیں ایک غم" "بات کہاں تک پہنچی" وغیرہ۔

اُردو کے ایک جانے پہچانے افسانہ نگار گروبچن سنگھ ہیں ۔ یہ ایک عرصہ سے بہار میں قیام پذیر ہیں اس لئے انھیں بہاری افسانہ نگار سمجھنا غلط نہیں ہے ۔ گروبچن سنگھ نے چند معیاری افسانے لکھے ہیں۔ انھوں نے بعض افسانوں میں طبقاتی کشمکش کو بڑے فنکارانہ طور پر سمیٹا ہے ۔ مفلسوں کے دُکھ درد سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اور انھیں اپنے افسانوں میں برت ڈالتے ہیں۔ ان کے وہ افسانے جو "تہذیب" پٹنہ میں شائع ہوئے فکر وفن کا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔ میری مُراد "بہار لُٹ گئی" اور "ہفتہ کے دن" سے ہے ۔ ان کے علاوہ ان کے بعض اچھے افسانے ماہنامہ "صنم" اور کئی دوسرے رسالے میں شائع ہوئے ۔

بہار کے اُردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک انوکھی شخصیت شفیع جاوید کی ہے ۔ یہ اپنے مخصوص اسلوب کی بنا پر تمام دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ ہیں ۔ شاید یہ قرۃ العین حیدر کی نگارشات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ اس لئے ان کی تحریر کے رنگ و آہنگ میں ایک مخصوص التزام ملتا ہے ۔ ان کے کردار بورژوائی ماحول میں سانس لیتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں کی ساخت ایک پُر تکلف فضا میں مرتب ہوتی ہے ۔ ہر جملہ اس حد تک سنبھلا ہوا کہ اس پر آورد کا گمان ہونا غیر فطری نہیں۔ غرضکہ سچ دھج کے اعتبار سے شفیع جاوید کے افسانے اپنی مثال آپ ہیں ۔ ان کے کردار سید اکاڈمک قسم کے مباحث میں مصروف نظر آتے ہیں ۔ اور افسانے کا ماحول اکتا دینے کی حد تک علمی فضا میں معلق معلوم ہوتا ہے ۔ حیرت تو یہ ہے کہ شفیع جاوید چاہے "بیسویں صدی" میں لکھیں یا "صنم" میں یا "شب خون" میں اپنا انداز بیان یکساں رکھتے ہیں ۔ ان کے افسانوں کے افراد چاہے کسی ریسٹوراں، میں یا ڈرائنگ میں ہر حال میں انٹلکچوئل بنے رہیں گے ۔ اس طرح شفیع جاوید کے افسانے بھیڑ میں گم نہیں ہوتے ۔ بلکہ انوکھے پن کی وجہ سے صاف پہچانے جاتے ہیں ۔

عصری زندگی کی پُر فریب اور پُر تصنع کیفیت شفیع جاوید کے افسانوں کے خط وخال ہیں ۔ ان کے افسانے تجرید کی سطح کو بھی چھوتے ہیں ۔ تجریدی کیفیت جدیدیت کی مرہون منت نہیں ہے میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ شفیع جاوید کی سرشت ہی میں کچھ ایسے

شاخسانے چھپے ہوئے ہیں اس لئے ان کا یہ انداز جدیدیت کی تحریک یا رُجحان سے بہت پہلے مرتب ہو چکا تھا۔

شفیع جاوید حقیقت نگار کم ہیں۔ رومان پسند زیادہ۔ مواد کے انتخاب اور برتاؤ میں رومانی ترنگ بیش از بیش ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ کیفیت ان کے پُرانے افسانے "چاند کو چھونے کا قصہ" "شیشے کا پردہ" اور "زلفوں کی رات" اور "رقص ناتمام" میں بھی ملتی ہے اور "شیشہ اور شیشہ" اور "کٹھ پُتلیاں" جیسے نئے افسانے میں بھی — غرض شفیع جاوید کی تیسری اور چوتھی پُشت کے افسانہ نگاروں میں ایک جگہ مخصوص ہے۔

بہار میں اُردو افسانہ نگاری کا ایک قابل ذکر نام ش اختر کا ہے، ش اختر بھی سنبھل کر لکھنے والے افسانہ نگاروں میں ایک ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرتی و سماجی احوال و کوائف پر نگاہ رکھی ہے۔ زندگی کے مسائل جو متوسط طبقے سے متعلق ہیں ان کے افسانوں کے موضوعات رہے ہیں۔ طریقہ کار بیانیہ رہا ہے۔ لیکن وہ تہہ داری جو ان کے ساتھ ایک آدھ لکھنے والوں کا شعار رہی ان کے یہاں نہیں ملتی — پھر بھی زندگی کے مسائل سے دلچسپی کے باعث ان کے افسانے خاصے کی چیز ہو جاتے ہیں۔

انھوں نے بھی اوّل اوّل رومان کی طرف توجہ کی، عشق و محبت کے شاخسانے ان کے افسانوں کا بھی تار و پود بنے لیکن جلد ہی زندگی کی تلخ حقیقتوں نے رومان کی ترنگوں کی جگہ لے لی۔

ش اختر ۱۹۵۵ء کے آس پاس سے لکھ رہے ہیں اور ملک کے مقتدر رسالوں میں چھپے ہیں۔ اس طرف ان کے افسانے دیکھنے میں نہیں آتے۔ بہر حال وہ افسانے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ان میں چند یہ ہیں "شانتی" "کہاسے اور کانٹے" "ہل اسٹیشن" "منزلیں" "ایسوع کے مریم" "ردعمل" "رضیہ" وغیرہ۔

بہار کے افسانہ نگاروں میں صمد حمیدی ۱۹۵۳ء کے آس پاس سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ "سماج کی چٹان" ہے انھوں نے بہت لکھا ہے۔ اس طرح ان کے افسانوں کا باضابطہ ایک مجموعہ شائع ہو سکتا ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں "ماسٹر غفور" "پربھو" "بہرے اندھے گونگے خدا" "رقص حیات" "خواب" "سناٹا" "شکستہ" "بھنگورے" "شعلہ اور

شرارے" وغیرہ۔

صمد حمیدی سماجی آرائشوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔کہیں کہیں ان کا انداز طنزیہ ہوجاتا ہے۔وہ بحیثیت افسانہ نگار اپنی شناخت کروانے کے سلسلے میں جدوجہد میں مصروف ہیں۔

طارق ندیم کبھی طارق استھانوی رہے تھے۔انھوں نے ۱۹۵۵ء سے افسانے لکھنے شروع کئے۔ابتدا میں بڑے حوصلے سے اسی میدان میں آئے لیکن بعد میں رفتار بیحد سست ہوگئی۔ان کے ابتدائی افسانوں میں "پھر کبھی سحر نہ ہوئی" "شکن در شکن" اور زیر و زبر وغیرہ ہیں

بہار کی اُردو افسانہ نگاری میں ایک قابل ذکر نام عبدالمتین کا ہے۔پہلے یہ متین صبا کے نام سے افسانے لکھتے رہے پھر متین ظہیر ہوئے لیکن بعد میں انھوں نے اپنا پورا نام لکھنا مناسب سمجھا۔

عبدالمتین کا افسانوی سفر ۱۹۵۲ء کے آس پاس سے شروع ہوا ہے۔غالباً ان کا پہلا افسانہ "چندن" ہے۔اس کے بعد وہ مختلف معیاری وغیر معیاری رسالوں میں مسلسل چھپتے رہے۔اس وقت جو ان کے افسانے ذہن میں آرہے ہیں۔ان کے نام یہ ہیں۔"رنگوں کا تعاقب" "اے خالقِ کائنات" "پیراڈوکس" "سفر" "سوال" "کائنات کی موت"

عبدالمتین کے افسانے سماجی احوال وکوائف پر مبنی ہوتے ہیں۔انھوں نے زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔اس طرح زندگی کے بعض مسائل ان کے افسانوں میں در آئے ہیں۔فن پر ان کی گرفت مضبوط رہی ہے۔ادھر انھوں نے تیزی سے لکھنا شروع کیا ہے۔اور میں سمجھتا ہوں کہ بحیثیت افسانہ نگار وہ اپنی شناخت کرانے میں جلد ہی کامیاب ہوجائیں گے ان کے امکانات روشن ہیں۔

اُردو کے ایک قابل لحاظ افسانہ نگار س۔ش۔مشہدی ہیں،انھوں نے اب اپنا نام شفیع مشہدی رکھ لیا ہے ان کے افسانے ۱۹۵۶ء کے آس پاس سے شائع ہوئے تب سے وہ مسلسل لکھ رہے ہیں۔میرا اندازہ ہے کہ مشہدی محض تجربہ برائے تجربہ کے قائل نہیں، فن کی راہوں پر بڑے عزم واستقلال سے رواں دواں ہیں۔نئی لہروں کے حسن وقبح کی شناخت

کے بغیر ان میں بہ جانا پسند نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں میں روایت کا احترام ملتا ہے۔ بغاوت پر شاید آمادہ نہیں ہیں یا رُجحان طبع اس کے منافی ہے۔ بہر حال شفیع مشہدی ایک محتاط افسانہ نگار ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے بگڑنے کا سوال نہیں اُٹھتا۔ یہ اور بات ہے کہ پُرانی راہوں پر وہ کیسی قندیل روشن کر سکیں گے یہ ایک مستقبل کی بات ہے۔ 'حسن یوسف' سے لے کر حالیہ افسانے تک ان کے ارتقا پذیر سفر کا اندازہ ہوتا ہے پھر بھی شفیع مشہدی کے کسی اہم افسانے کا انتظار ہے۔

اسی زمرے کے ایک افسانہ نگار شعیب شمس ہیں۔ ۱۹۵۹ء سے افسانوی سفر شروع کیا اور ابتدا میں خوب خوب لکھا۔ ان کے افسانے "صنم" "اشارہ" "بیسویں صدی" "شاعر" وغیرہ میں مسلسل چھپتے رہے تھے ادھر رفتار سُست ہوگئی ہے۔

شعیب شمس رومان کی راہ پہ بھی گامزن ہیں اور حقیقت نگاری سے بھی اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ اس طرح ان کے کئی افسانے نیم رومانی، نیم حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ تجربے سے دامن بچاتے ہیں اور عمومی طور پر پُرانی اور جانی پہچانی ڈگر پر رواں دواں ہیں زبان و اسلوب کے بارے میں نہایت محتاط ہیں۔ اچھی اور صاف سُتھری زبان لکھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی ان کے افسانے قابل مطالعہ بن جاتے ہیں۔ ان کے بعض افسانے ہیں" نئی تعمیر کا درد" جلتے بجھتے دیپ وغیرہ۔

اُردو افسانہ نگاروں میں دھیرے دھیرے اپنی جگہ بنانے والوں میں ایک نام الیاس احمد گدّی کا بھی ہے۔ یہ غیاث احمد گدی کے بھائی ہیں۔ اور فنّی نزاکتوں کے برتاؤ میں غیاث ہی کی طرح بیحد محتاط ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عظمت اور سربلندی جو غیاث کے مقدّر میں ہے ان کا حصّہ نہیں بنی ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں بھی فنّی رکھ رکھاؤ ہے۔ ان کے افسانوں کی المیہ فضا بیحد متاثر کرتی ہے۔ وہ سماج کی آلائشوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اور سماجی بُرائیوں کی نقاب کُشائی میں فنکارانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔۔۔ الیاس احمد گدی نے "عشق پہ زور نہیں" مطبوعہ "صنم" ۱۹۶۲ء سے لیکر "اسیری" مطبوعہ "شب خون" اپریل ۱۹۷۳ء تک اپنے فن کا ارتقائی سفر طے کیا ہے اس لئے ان کا

فن نہ جامد ہے اور نہ ہی پیچھے کی طرف مڑ رہا ہے۔ ایسے میں ان سے بہتر توقعات کئے جا سکتے ہیں۔

اسی قبیل کے ایک لکھنے والے شمیم سیفی ہیں۔ کبھی رومانی افسانے لکھتے تھے۔ لیکن اب حقیقت نگاری کی طرف مائل ہیں۔ کم لکھتے ہیں۔ اور سنبھل کر لکھتے ہیں۔ پھر بدلتے ہوئے حالات پر بھی ان کی نظر ہے۔ ایسے میں فنّی طور پر تجربوں کی منزلوں سے بھی گذرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے افسانے "قصہ ایک بوڑھے ؟ کا" اور "فرشتہ" مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

شمیم سیفی کا ایک اور وصف ان کی پاک وصاف زبان ہے۔ جن کا بیانیہ انداز بیحد سپاٹ ہے۔ محض زبان کی شیرینی کی بنیاد پر اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شمیم سیفی اپنی خاموشی توڑیں ورنہ شبہہ ہوتا ہے کہ کیا وہ افسانہ نگاری سے دستبردار ہو رہے ہیں۔

کبھی کے ایک کامیاب افسانہ نگار رفعت بلخی بھی رہے ہیں۔ ایک وقت میں انھوں نے خوب خوب افسانے لکھے گذشتہ آٹھ برسوں سے قطعی خاموش ہیں۔

رفعت بلخی نے حُسن وعشق کے افسانے کم لکھے لیکن معاشرتی، سماجی وتمدنی مسائل کو زیادہ تر اپنے افسانوں میں سمیٹا ان کے افسانوں کا ایک وصف ماجرا کا کساؤ ہے۔ یہ کچھ بھی لکھیں افسانے کے تمام اجزا ایک دوسرے ہی میں مدغم ہوں گے۔ اسی بنیاد پر ان کے افسانے خاصے کی چیز بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ تو فنّی سطح ہوئی فکر میں گہرائی اور عمق کے پیدا ہونے سے پہلے انھوں نے افسانہ نگاری ہی ترک کر دی ورنہ ان سے کافی اچھے توقعات وابستہ تھے۔

رفعت بلخی کی زبان بھی بیحد سُلجھی ہوئی رہی ہے۔ اس باب میں ان کا مزاج شمیم سیفی سے ملتا ہے۔ دونوں کے اسلوب کی یک رنگی حیرت میں ڈالتی ہے۔

رفعت بلخی کے چند افسانے جو قابل مطالعہ ہیں وہ یہ ہیں "برف اور خوشبو" "صبح ہونے تک" "زاویئے" "آخری پان" وغیرہ۔

اسی عہد کے ایک لکھنے والے محمود واجد ہیں۔ ۱۹۵۸ء سے لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں عشق و محبت کے ولولے ہیں، پھر انھوں نے رشتہ ناتوں کی اُلجھنوں پر افسانے قلمبند کئے ان کے ایسے افسانوں میں عصمت چغتائی کے اسلوب کا رنگ غالب ہے۔ لیکن صرف مواد کی حد تک۔ عصمت چغتائی کے اسلوب کا بہا دینے والا انداز نایاب ہے، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ رشتے ناتوں کے افسانے کرداروں کی بھیڑ کی وجہ سے اُکتا دینے والے ہیں۔ محمود واجد کے افسانوں میں طنز کی بھی کیفیت ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض سماجی معاملے میں ان کا رویہ بہت تلخ ہو گیا ہے۔

محمود واجد کے افسانوں کا ایک مجموعہ "خزاں کے پھول بہار کے دن" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کے چند اچھے افسانے ہیں۔ "امن کے ہاتھ" "کانچ کا گلاس" "مجبوری" "ایک ربط ناشناس" "تری آرزو بھی گلاب ہے" وغیرہ۔

اسی عہد کے ایک افسانہ نگار ہربنس سنگھ دوست ہیں۔ یوں تو ان کا وطن پنجاب ہے لیکن عہد طفلی سے بہار میں رہے اور بہار کے افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہربنس سنگھ دوست کے افسانے ترقی پسند تحریک سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ مزدوروں اور کسانوں کی زبوں حالی ان کا دُکھ درد اور ان کے مسائل ان کے افسانوں کے قوام ہیں۔ اس طرح وہ نچلی سطح کے عوام کو موضوع بناتے ہیں۔ اور زندگی کے مسائل کو ایک ترقی پسند کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ صورت ان کے مجموعہ افسانہ "گیت اور چیخ" سے بھی نمایاں ہے۔ افسانے "ایٹم بم پھٹ گیا" "برش اور رنگ" "پردھان منتری کی بیٹی" "ایک رات کی بات" وغیرہ ان کے ترقی پسند مزاج کے عکاس ہیں۔ ان کا لہجہ کہیں کہیں کرشن چندر کے لہجے کا عکس پیش کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہربنس سنگھ دوست کرشن چندر کے اسلوب سے متاثر رہے ہیں۔ ہربنس سنگھ دوست کے متذکرہ مجموعہ افسانہ کا دیباچہ سہیل عظیم آبادی نے قلمبند کیا ہے۔ ان کی کچھ باتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:۔

"...... ہربنس سنگھ دوست نے اپنے بعض افسانوں میں مزدوروں کی زندگی کے بعض دردناک پہلوؤں کی تصویر بڑی کامیابی کے ساتھ کھینچی ہیں۔ اور ہلکے ہلکے اشارے

میں بڑی صفائی کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کس طرح ہماری زندگی کو گھن کی طرح کھائے جارہا ہے اور جب تک موجودہ سرمایہ دارانہ نظام ختم نہ ہوگا ملک کی سماجی زندگی نہیں بدل سکتی۔"

بہار کی اُردو افسانہ نگاری میں ایک جانا پہچانا نام معین شاہد کا ہے۔ معین شاہد ایک عرصہ سے لکھ رہے ہیں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "کاجل اور آنسو" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس کا پیش لفظ میں نے لکھا ہے۔ معین شاہد اپنے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کہانیوں میں میں نے کون سی تکنیک اپنائی ہے۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ میں نے اپنے جذبات و احساسات کو کہانی کے روپ میں ایمانداری سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی لکھتے وقت اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا کہ میں نے جو سوچا ہے وہی قاری بھی پڑھتے وقت سوچے، میں کہانی لکھتے وقت زندگی کے جس کرب اور جس درد کی راہوں سے گذرا ہوں قاری بھی اسے محسوس کرے، اس کے دل میں بھی وہی درد پیدا ہو جو میں نے لکھتے وقت محسوس کیا ہے۔" ("احوال" کاجل اور آنسو صفحہ ۱۷)

جہاں معنی و مفاہیم کی غیر مشروط ترسیل پر اتنا زور ہو وہاں فکر کی پیچیدگی یا طرز ادا کی جدت یا نئی راہ نکالنے کی سعی کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ معین شاہد کی راہ وہی ہے جو کبھی پریم چند نے افسانوں کے لئے متعین کی تھی۔ یعنی سیدھی اور غیر پیچیدہ۔

معین شاہد نے زندگی کو ایک آورش وادی کی طرح دیکھا ہے۔ یہ آورش وادی ہر لحاظ سے معصوم بھی ہے اس لئے ان کے افسانوں میں سیدھا سادا معصوم انداز، سیدھی سادی معصوم فضا جاری و ساری ملے گی ـــــ معین شاہد نے واقعی اپنے جذبات و احساسات کو اپنے افسانوں میں بڑی ایمانداری سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کردار کے خدوخال ہر حال میں ابھرے رہتے ہیں۔ ان میں فنی طمع کاری نہیں۔

معین شاہد کے افسانے درد و کرب کے افسانے ہیں جن سے ہر لمحہ زندگی نبرد آزما ہے۔ غم کا نمایاں آہنگ معین شاہد کی تحریر کو ایک واضح شناخت دے دیتا ہے۔ اس پس منظر میں ان کے افسانوں کے خد و خال بھیڑ میں گم نہیں ہو پاتے یہ سیدھے پڑھنے والوں کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ معین شاہد کے چند مشہور افسانوں کے نام یہ ہیں "بیتل کا لوٹا" "سودا" "طاعون" "جانے والے سپاہی" "ایک لاش تین کہانیاں" "کاجل اور آنسو" "آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے" "ناسور" "رات اندھیری ہے" "انگڑائی" "آرزوؤں کا مدفن" "ایک دل لاکھ افسانے" "اے نامہ نگار و" "مقناطیس" "چھ چھ آنے" وغیرہ۔ یہ تمام افسانے "شاعر" "شمع" "مورچہ" "آستار" "کرن" "سہیل" "بہار کی خبریں" میں شائع ہو چکے ہیں۔

معین شاہد کی افسانوی دُنیا کی ایسی عمومی فضا میں ایک افسانہ "پتھر کے ہونٹ" بھی ہے آرزوؤں اور حسرتوں کی کہانی اس میں بھی پیش ہوئی ہے لیکن قدرے نئے آہنگ کے ساتھ۔ اس کے علاوہ حال ہی میں ان کا ایک جدید اور علامتی افسانہ "درد کا رشتہ" شائع ہوا ہے جس کے مطالعہ سے گمان ہوتا ہے کہ معین شاہد اگر چاہیں تو اپنے افسانوں کو فنی اور تکنیکی وقار بھی دے سکتے ہیں۔

قمر التوحید کا مطالعہ وسیع تھا انگریزی تعلیم کا پس منظر ان کے فن کی تازگی کا باعث ہے۔ پھر بھی ان کے افسانے اکاڈمک فضا میں بوجھل نہیں ہوتے۔ انھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا ان میں فنی اور تکنیکی وقار ہے۔

نئی نسل کے ایک افسانہ نگار شہاب دائروی بھی ہیں لیکن ان کی روش پرانی ہے انھوں نے نئی نسل کے شانہ بہ شانہ چلنا شاید مناسب نہیں جانا اور روایت کی شاہراہ اپنائے ہوئے ہیں وہی دُکھ درد کی کہانی۔۔ ان کے بعض قابل مطالعہ افسانے یہ ہیں۔ 'میں کیا کروں'، 'کھردرے ہاتھ'، 'دل ایک مندر'، 'رشتہ کی کڑیاں' وغیرہ۔

گذشتہ دس برسوں میں افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود اُبھری، یہ پود براہ راست جدیدیت کی تحریک سے متاثر ہے ہر نیا افسانہ نگار جدیدیت کے تصور کے کسی نہ کسی گوشے

کو اپنے افسانے میں سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک طرف تو یہ پود افسانے کے مسلمہ اقدار و معیار سے انحراف کرنے کے سلسلے میں روایتی زاویۂ نگاہ رکھنے والوں کے سامنے ہدف ملامت بنی ہوئی ہے تو دوسری طرف جدیدیت کے علمبردار انھیں بڑھاوے دے رہے ہیں۔ اور جدید طرز کے افسانوں کی ہیئتی تبدیلی اور فکری تغیر و تبدّل کو افسانے کے ارتقا کی ایک صورت مانتے ہیں، ایسے افسانہ نگار کا ایک دائرہ احساس غم، احساس الم، نا اُمیدی، خوف، احساس جُرم، احساس تنہائی وغیرہ سے مرتب ہوتا ہے۔ دروں بینی اور داخلیت ان کی فکر کی اساس ہے۔ کرب کی شدت اور نفی کی ایک فضا ایسے تمام افسانوں میں جاری و ساری ہے۔ کئی ایک افسانے مرتّب ماجرا نہیں رکھتے اور ہیرو کا بھی قدیم ترین تصوّر ٹوٹ چکا ہے زندگی کی بے بضاعتی بلکہ اس کی بے معنویت ان کا مرکزی تصوّر ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں کی سمت متعین نہیں ہے۔ یہ ڈائرکشن لیس نس ان کے افسانوں کو کسے ہوئے ماجرا سے ماورا کر دیتا ہے اور زندگی کی سیدھی لکیر انحراف کی ٹیڑھی لکیروں میں مبدل ہو جاتی ہیں۔ بلا واسطہ انداز بیان ترک کر دیا گیا ہے یعنی بیانیہ انداز ایسے افسانوں میں نہیں ملتا۔ خود کلامی کی ایک کیفیت نمایاں ہے۔ کبھی اساطیر سے مدد لی جاتی ہے تو کبھی ذاتی نشانات سے، بعض نقادوں نے یہ بھی لکھا کہ ایسے افسانے علامتی ہیں لیکن میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ایسے افسانے ان معنوں میں علامتی نہیں ہیں جن معنوں میں علامت نگار شعراء بادلیر، ملارمے، ویری پال ورلن وغیرہ ہیں۔ اس لئے کہ مغرب میں علامت نگاری فطرت کے نقوش کے خلاف علامتی اظہار ہے نہ کہ ذاتی طور پر ایک معینہ صورت کے لئے کوئی دوسری صورت اپنانے کا ــــ لیکن ایسے افسانے تجریدی یقینی ہیں، ساخت کے اعتبار سے بھی اور مواد کے لحاظ سے بھی۔

دراصل مغرب میں صنعت کے پھیلاؤ نے زندگی کو جس قدر میکانکی بنا دیا ہے وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا بورڈم اذہان پر محیط ہو چکا ہے۔ مشینی اور میکانکی زندگی سے نفرت کا اظہار مغرب میں بڑے ادبار و شعراء، نیز ناول نگار

وافسانہ نگار نے تواتر سے کرنا شروع کیا ہے' کامیو کی متھ آف سی فس' نے لایعنیت کو فروغ دیا' مارٹن ایسلن نے بعض طرز کے ڈراموں کا نام ہی ایبسرڈ رکھ دیا یہ فرد کے داخلی تجربے سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ انفرادی تجربات و مشاہدات سے۔ اسے عرفان ذات سے بھی تعبیر کیا گیا۔ سارتر کا یہ جملہ بہت معروف ہے Existance Preceeds Essence۔ ایسے میں انسانی کمزوریوں اور ان کی غیر سالمیت ادبا کا فکری محور ٹھہری۔ اس کی کتاب Being and Nothingness ماڈل بنی۔ کافکا کی نگارشات الگ محرک ثابت ہوئیں۔ مصوری میں زرے ژاں' وان گوغ' پیکاسو' چغال وغیرہ مثال بنے۔ پھر وجودی مفکرین میں سارتر کے علاوہ کرے گار' نطشے' ہسرل ہائی ڈگر' کارل ییپرس' مارسل وغیرہ نے جو فکر دی وہ ان ہی امور سے عبارت ٹھہری۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ نئی پود کے سارے افسانہ نگار متذکرہ بالا امور سے واقف ہیں اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں افسانے کے بندھے ٹکے احوال یا اصول سے انحراف کر رہے ہیں۔ لیکن بہار کی حد تک بھی اگر ان بالکل نئے افسانہ نگاروں کے افسانے ذہن میں رکھیے تو نتائج وہی سامنے آئیں گے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ایسے افسانوں کا معیار کیا ہے؟ یا ان بنیادوں پر مغرب میں لکھے جانے والے شاہکار سے ان کا تقابل ممکن ہے بھی کہ نہیں یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن پاکستان کے انور سجاد' خالدہ اصغر' اور اب احمد ہمیش بھی یا ہندوستان سطح پر مانے ہوئے افسانہ نگار سریندر پرکاش' بلراج مینرا کا مطالعہ ان ہی حدود میں ممکن ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بہار کے افسانہ نگاروں کی ایسی نئی پود میں ایک پرانے لکھنے والے احمد یوسف بھی شریک ہیں۔ احمد یوسف کبھی ترقی پسند تھے اور ان کے ایسے افسانے جو واقعتاً طبقاتی کشمکش اور استحصال کے امور کے پس منظر میں لکھے گئے تھے۔ آج بھی قیمتی ہیں لیکن انھوں نے اپنی ڈگر قطعی بدل دی ہے۔ ان کے افسانے "میرا ہی لہو" میں "میں" کی حفاظت کی ایک سعی مسلسل ملتی ہے۔ یہاں انفرادیت پر جس قدر زور دیا گیا ہے' محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں اخلاقی قدروں کے زوال کے مطالعہ کی

ایک صورت بھی نکلتی ہے۔ ان کے افسانے، تلوار کا موسم، میں قدروں کے انہدام کی تمام ترکیفیت موجود ہے۔ اجتماعیت سے انحراف کی تصویر "شہر میں کوئی نہیں" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ "تجدید جنوں" میں لمحوں کو پکڑنے کی سعیٔ مشکور یا نامشکور ملاحظہ کی جاسکتی ہے، مشینی اور صنعتی ہنگاموں کے خلاف آواز اُٹھانے کا ایک تیور ان کے افسانے "ڈوبتی اُبھرتی شام" میں دیکھا جاسکتا ہے اس طرح زندگی کی لایعنیت "روشنائی کی کشتیاں" کا موضوع بنی ہے۔

بہر حال احمد یوسف کا افسانوی سفر ۱۹۴۵ء کے آس پاس سے شروع ہوا تھا۔ ان کے ابتدائی افسانوں "سُرخ پان" "نئی راہ" "جنتا راج" وغیرہ ہیں۔ ایسے افسانوں کی فہرست طویل ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ احمد یوسف کے افسانوں کا مجموعہ "روشنائی کی کشتیاں" زیرِ طبع ہے ظاہر ہے کہ اس میں وہ افسانے نہیں ہوں گے جو ترقی پسندی کے دنوں میں لکھے گئے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان افسانوں کا بھی ایک مجموعہ چھپنا چاہیے تاکہ کلام حیدری کی طرح ان کے افسانوں کے ارتقائی سفر کا حال معلوم ہوسکے۔

نئی پود کے دوسرے اہم افسانہ نگار ظفر اوگانوی ہیں۔ انھوں نے اپنا پہلا افسانہ "مرواسی جھوٹے" لکھا ہے۔ اسی قبیل کے ایک دو افسانے اور چھپوائے۔ ان کا افسانہ "بیسویں صدی" میں بھی شائع ہوا پھر جدیدیت کی تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اور اس صف کے یقینی ایک نمایاں لکھنے والے ہیں۔ ان کے افسانوں کی عمومی تماش تجریدی ہے زندگی کی لایعنیت، لامرکزیت اور نفی کی ایک واضح صورت ان کے افسانوں میں بھی ملتی ہے ظفر اوگانوی بڑی کامیابی سے دل کی گہرائیوں میں اُترتے ہیں اور گہری داخلیت کا پتہ دیتے ہیں۔ لمحوں کو پکڑنے کی ایک سبیل ان کے یہاں بھی ملتی ہے، اس طرح ماجرا سازی میں خارجی احوال سے زیادہ داخلی کوائف کا احساس رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے ماجرا کا باہمی ربط ان ہی بنیادوں پر قائم ہے۔

ان کے بعض افسانے جو اس وقت ذہن میں آرہے ہیں ان میں "انتڑا مورس" "اہرام" "بیچ کا ورق" "پہاڑ پر ایک حادثہ" اور "اپنا رنگ" ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ ان کے افسانوں کا مجموعہ "زیچ کا ورق" جلد ہی شائع ہو رہا ہے۔
نئی پود کے نئے افسانہ نگار شوکت حیات جدیدیت کے اس محور پر اپنی افسانہ نگاری کی بساط سجاتے ہیں جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔ "ٹوٹنے بکھرنے کا المیہ" قدروں کے انہدام کا قصّہ۔ عرفان ذات پھر اس کے شعور کے حصول کے بعد احساس کم مائیگی، سب کچھ ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔ ان کا ایک امتیاز یہ ہے کہ تجربوں کی راہوں سے گذرنا چاہتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں جدیدیت کی عام روش سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی امتیاز کے کچھ پہلو اُجاگر ہو سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اندر ایک بڑا فنکار روپوش ہے۔ وہ ایک بڑے کینوس پر کام کریں تو ان کے امکانات لامحدود ہیں۔ خصوصی مطالعے کے تحت ان کے چند افسانے "آہنگ" گیا کے شمارہ اکیس میں شائع ہوئے ہیں جن سے ان کے اندر کی آنچ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ افسانے ہیں "بکسوں سے دبا آدمی" "میں تم وہ ہیں" "پنڈولم" "سبز مینڈھ پر سیاہ کبوتر" "دائرے کے دو کنارے" اور "قطبین کے بیچ ہواؤں کی زد میں"۔ شوکت حیات بلاشبہہ ایک حساس فنکار ہیں جس کا اندازہ دوسرے افسانوں سے بھی ہوتا ہے مثلاً "ہوسٹل" "سیاہ چادریں اور "انسانی ڈھانچا" "چند لمحوں کا پڑاؤ" لیٹر بکس کی تلاش، موم بتی پر رکھی ہتھیلی، کاغذ کا درخت، وغیرہ۔
اس قبیل کے لکھنے والے حسین الحق ہیں، بہت تیکھے تیور رکھتے ہیں۔ ایک آدھ افسانے میں ان کی بے باکی وقت سے بہت پہلے کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال جدیدیت کے تمام تر خط و خال ان کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ ذات کا کرب نفی کی صورت، حالات کی شکست و ریخت بھیڑ میں تنہائی کا احساس وغیرہ ان کے بھی افسانوں کا مزاج ہیں۔ آہنگ گیا کے ۲۶/۲۵ کے مشترکہ شمارے میں ان کا خصوصی مطالعہ شائع ہوا ہے۔ "کھوئی ہواؤں کی چاپ" "میری تمھاری کہانی" "بلبلہ" "اندھی دشاؤں کے سائے" "بند مٹھی کا نوحہ" اور "شکسیدہ" اس شمارے میں یہ تمام افسانے موجود ہیں۔ ان میں کئی افسانے دوسرے رسالے میں پہلے ہی چھپ چکے تھے مثلاً "سوانح حیات" "شاید" "صحرا کا سورج" ـــــ ادبی رسالوں میں حسین الحق مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان کے دوسرے افسانے جو

مجھے پسند ہیں اُن میں قابل ذکر "لخت لخت" اور "امرلتا" "خار پشت" منظر کچھ یوں ہے
حسین الحق کا مستقبل روشن ہے۔ کم وقت میں اپنی شناخت کروانے والے خوش قسمت
فنکاروں میں ایک ہیں ان کے اندر ایک اہم افسانہ نگار بننے کی تمامتر صلاحیت موجود ہے۔
نئی نسل کے افسانہ نگار علی امام کا خصوصی مطالعہ "آہنگ" گیا کے شمارہ تیرہ میں شائع
ہوچکا ہے۔ اس شمارے میں ان کے افسانے ہیں "خون رستی لکیریں"، "پچ اینڈ ونش" "حادثے"
"پگھلتی زمین پر گذرتی ہوائیں" اور "سوانح حیات" انھوں نے میں کے تعارف میں لکھا ہے۔

"..... سچ تو یہ ہے کہ میں روایت سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہوا ہوں
اور جھوٹ یہ ہے کہ بغاوت بھی الگ سے کوئی چیز ہے۔ میں جو اپنے بکھرے پن سے
پاتا ہوں اُسے اُس کے لفظوں میں ڈھال دیتا ہوں یا یوں سمجھیں کہ ڈھل جاتا ہے۔۔
---" (صفحہ ۴۶)

ان کے اسی بیان سے ان کی ذہنی روش کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے متعدد
دوسرے افسانے معیاری رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ اپنی جگہ بنانے کے
سلسلے میں جدوجہد میں مصروف ہیں۔

نئے افسانہ نگاروں میں ایک عبدالصمد بھی ہیں۔ "آہنگ" کے شمارے ۳۴ میں ان کا
خصوصی مطالعہ چھپ چکا ہے اس شمارے میں ان کے افسانے ہیں "بارہ رنگوں والا کمرہ"
"اپنی صلیب" "اوس اور کرن" "نہیں"۔ اپنے تعارف میں وہ لکھتے ہیں۔

"میں کتنی پرتوں میں نہاں ہوں اور ان پرتوں کو ہٹا کر "میں" کو خود میں دیکھنے
سے قاصر ہوں مگر خود کرتا ہوں تو مجھے اپنے اندر کہیں ماں مل جاتی ہے کہیں
باپ، کہیں اُستاد کہیں دوست، کہیں زمانہ کہیں ......" میں اس بھیڑ بھاڑ
میں۔۔ اپنی کہانیوں میں بکھر رہا ہوں یا سمٹ رہا ہوں کیا معلوم؟ (صفحہ ۶۳)

بہرحال عبدالصمد کے بعض افسانے مجھے پسند ہیں۔ روایت پر ان کی نظر ہے
اور اسے وہ رنگ و آہنگ کے ساتھ سمیٹنا چاہتے ہیں۔ ابھی ابھی ان کا ایک افسانہ
"غبار خاطر" میں "قصہ ایک رات کا" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس سے ان کے

نئے تیور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "آواز کا رنگ" شائع ہو رہا ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں ایک عشرت ظہیر بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا رنگ و آہنگ تجریدی ہے۔ یہ افسانے جدید دور کے کرب و اضطراب اور آج کے معاشرے کی گھٹن کو پیش کرتے ہیں۔ بعض افسانے شعور کی رو کی تکنیک سے متاثر ہو کر لکھے گئے اور بعض میں تحلیل نفسی کے امور ہیں۔ ان کے چند اچھے افسانے ہیں "ساعتوں کا سمندر" "ابھرتی ڈوبتی لہریں" "وہ اور میں" "رشتوں کا حصار" "کپل وستو"۔

منظر کاظمی بھی پچھلی دہائی میں ایک مخصوص اسلوب کے ساتھ نمایاں ہوئے، ان کے بعض افسانوں میں ترقی پسندی کے عناصر بھی ملتے ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں جدیدیت اور ترقی پسندی کا امتزاج ہے۔ ان کے افسانوں کی اساطیری فضا خاصے کی چیز ہوتی ہے، انھوں نے اسلامی روایات کو بھی پس منظر بنایا ہے اس طرح جدید افسانہ نگاروں میں ان کا اسلوب واضح ہے۔ ان کے بعض افسانے جو مجھے متاثر کرتے ہیں 'لکشمی ریکھا' آسمان سے گرتی ہوئی روٹیاں اور "آنکھیں" ہیں۔

اختر یوسف جدیدیت کے رجحان کے ساتھ آنے والے بہار کے چند افسانہ نگاروں میں ایک ہیں، ان کے افسانوں میں عصری زندگی کا انتشار نمایاں ہے۔ یہ انتشار ان کے فن اور فکر دونوں ہی میں نمایاں ہے ان کے افسانوں میں ارتقائی اور عضویاتی تکمیل ناپید ہوتی ہے تجرید ان کا خاصہ ہے۔ اس طرح جدیدیت کے علمبرداروں میں ان کی ایک واضح جگہ ہے۔

تجریدی سطح پر لکھنے والے افسانہ نگار نشاط قیصر، انیس، رفیع اور نسیم اختر بھی ہیں، نشاط قیصر کا فکری و فنی پہلو بہت واضح ہے، اور ان کے تیور بے حد تیکھے ہیں، انیس رفیع گاہے گاہے علامتی انداز اپناتے ہیں اور نسیم اختر بھی اس میدان میں پیچھے نہیں۔

نسیم محمد جان بہت تیزی سے لکھ رہے ہیں، اسی طرح شفق اور اخوان احمد بھی اپنی اپنی جگہ بنانے میں کوشاں ہیں۔

خواتین افسانہ نگاروں میں اعجاز شاہین، شمیم افزا قمر اور نزہت پروین تواتر سے

لکھ رہی ہیں۔ ان کی اپنی ڈگر ہے جو جدیدیت کی مرہون منت نہیں ہے ان کے افسانے انحراف کی ٹیڑھی لکیر نہیں بناتے ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں کی تیز آنچ محسوس کی جاسکتی ہے۔

افسانہ نگاروں کا ایک تفصیلی جائزہ لینے کے بعد یاد آیا کہ کچھ اور قابل ذکر افسانہ نگار اس مضمون میں شامل نہیں ہوسکے ہیں۔ ان میں کچھ پرانے لوگ بھی ہیں جیسے بدر اورنگ آبادی اور قیوم خضر۔

اس کے بعد نور الہدیٰ سید، رحمان حمیدی، مشتاق احمد نوری، شبیر احمد، ابو اللیث جاوید، اقبال عظیم اور فاروق راہب بھی ایسے افسانہ نگاروں میں ہیں جو اعتبار کا درجہ پا چکے ہیں۔

بالکل نئے لوگوں میں مشرف عالم ذوقی، اختر واصف، قاسم خورشید، رحمان شاہی اور ابو الکلام عزیزی کا ذکر بھی ضروری ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے میں نئے افسانوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جدیدیت کے اثرات کے تحت تجریدی افسانے بعض ادبی رسالوں میں تواتر سے چھپتے رہے ہیں، اور ایک مختصر مدت میں ان کا انبار لگ گیا ہے۔ لیکن ایسے افسانوں کا مستقبل کیا ہے، اس باب میں کوئی بات تیقن کے ساتھ کہنی مشکل ہے، دراصل تجریدی افسانے لکھنے کا حق بھی ان ہی کو ہے جنھوں نے روایات پر گہری نظر رکھی ہو اور ان کے مستحسن عناصر سے بے خبر نہ ہوں، لیکن تجریدی اور علامتی افسانے زیادہ تر فیشن پرستی کے اثرات کے تحت لکھے جارہے ہیں، ایسے میں کوئی قابل لحاظ کارنامہ ابھی مستقبل کی بات ہے۔ زیادہ تر نئے افسانے کی قماش انشائیہ جیسی ہوگئی ہے۔ اس امر پر اصرار کیا جارہا ہے کہ چونکہ تمام فنون کی غایت یہ ہے کہ موسیقی بن جائے یا شاعری کے زمرے میں آجائے اس لئے نئے افسانوں کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنا چاہئے۔ لیکن یہ کوئی نیا راز نہیں ہے جو آج کے افسانہ نگاروں کو معلوم ہوگیا ہے پروفیسر مسلم عظیم آبادی نے ایک عرصہ پہلے عبدالباری ساقی کے افسانہ "تصویر محبت" کی کتابی صورت میں اشاعت کی تقریب میں لکھا تھا:

"مغربی زبانوں میں فن افسانہ ترقی کی اُس منزل پر پہنچ گیا جس کی سرحد

شاعری سے جا ملی ہے ....."

ظاہر ہے کہ بہار کے پہلے افسانہ نگار کو بھی مغربی افسانوں کی ترقی یافتہ فنی صورت کی خبر تھی"۔ دوسرے اہم افسانہ نگار جنھوں نے اُردو افسانے کے ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیئے ہیں انھیں بھی مغرب میں لکھے جانے والے نئے افسانوں کی خبر ہے، لیکن انھوں نے اپنی ڈگر یکایک نہیں بدل ڈالی، ان کے افسانے فنی و فکری اعتبار سے بتدریج آگے بڑھے ہیں، ایسے ہی نئی نسل کا اچانک افسانوں کے باب میں نئے تیشے لے کر نئی کوہکنی پر کمربستہ ہو جانا ایک طرف تو جرأت کا مظاہرہ تو دوسری طرف بہت سارے سوالیہ نشانات کا شاخسانہ بھی ہے"۔ ایک بہت اہم سوال یہ ہے کہ ان میں کتنے نئے افسانہ نگار ایسے ہیں جو واقعتاً تجرید اور علامت کے حقیقی مفہوم سے بھی آشنا ہیں۔ اگر وہ سچ مچ اظہار کے لئے ایسے ہی وسیلے کو مؤثر مانتے ہیں اور اسے کامیابی سے برت بھی سکتے ہیں تو پھر انھیں اسی راستے پر گامزن رہنا چاہیے" اور اگر فی الواقعی ایسا نہیں ہے تو مستقبل یا حال کا سخت گیر نقاد انھیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

وہاب اشرفی
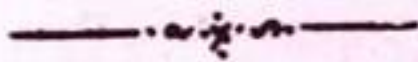
بہار کا افسانوی ادب

بہار میں اُردو افسانہ نگاری کی روایت ۱۹۰۴ء سے ملتی ہے اور علی محمود (جو سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور منشی پریم چند کے ہمعصر تھے) نہ صرف بہار کے بلکہ اُردو کے اوّلین افسانہ نگار کہے جاسکتے ہیں۔ "چھاؤں" اور "ایک پُرانی دیوار" جیسی ان کی کہانیاں جنوری اور اپریل ۱۹۰۴ء کے "مخزن" شائع ہوئی تھیں۔ لیکن علی محمود کے افسانوں کا مزاج چونکہ ادب لطیف جیسا ہے اور انھوں نے لکھا بھی بہت کم، اس وجہ سے بہار کا پہلا باضابطہ افسانہ نگار پروفیسر مسلم عظیم آبادی کو کہنا مناسب ہوگا۔ پروفیسر مسلم عظیم آبادی نے سب سے پہلے ۱۹۱۶ء میں ایک افسانہ لکھا تھا۔ جو ظفرالملک علوی کے "الناظر" لکھنؤ میں "محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش" کے عنوان سے چھپا۔ یہ رسالہ اپنے وقت کا ایک مشہور رسالہ تھا۔ اس کے بعد پروفیسر مسلم ایک عرصہ تک خاموش رہے اور دوبارہ ۱۹۳۷ء سے لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۳۷ء میں "حُسن طلب" کے عنوان سے جو افسانہ لکھا، وہ "ساقی" دہلی میں چھپا۔ اس کے بعد ماہنامہ "ساقی" میں ان کی کہانیاں ۱۹۴۳ء تک شائع ہوتی رہیں۔ اپنے افسانوں میں طنز آمیز مزاح کا سہارا لے کر انھوں نے سماجی کمزوریوں کو اُجاگر کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ پروفیسر محمد مسلم کے بعد نورالہدیٰ ندوی مرحوم کا نام آتا ہے۔ جو بہار شریف (پٹنہ) کے آس پاس کے رہنے والے اور "حور" کلکتہ کے مدیر تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء سے لکھنا شروع کیا تھا اور کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی اس دُنیا سے چل بسے اسی زمانے میں علی اکبر کاظمی بھی لندن سے واپسی پر "نگار" وغیرہ ادبی رسائل میں لکھ

رہے تھے۔ ان کے افسانوں میں طربیہ اور المیہ عناصر کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ فنی رموز سے وہ آگاہ اور اظہار بیان پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ "چند راوتی" اور "پروفیسر منصور" ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔

مذکورہ بالا ناموں کے علاوہ چند نام اور بھی ایسے ہیں۔ جو پہلے دور کے افسانہ نگاروں میں اہمیت کے حامل ہیں اور ان کے ذکر کے بغیر یہ باب نامکمل سمجھا جائے گا۔ ان ناموں میں ایک نام آفتاب حسن (ایم۔ ایس۔ سی علیگ) کا ہے جو انجمن ترقی اُردو کے رسالہ "سائنس" کے مدیر تھے اور تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۲۶ء سے انھوں نے افسانہ لکھنا شروع کیا اور اکثر ماہنامہ "ندیم" گیا میں چھپتے رہے۔ "بچا" اور "شادی" جیسی کہانیاں ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء کے "ندیم" میں آپ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ پاکستان جانے سے پہلے حیدرآباد میں ملازمت کرتے رہے۔ اس وجہ سے بہار والوں نے انھیں کم کم جانا۔ جمیل مظہری کے افسانہ "ایک سوال" "آل حسن معصومی" کے "کشتۂ انفعال" اور حنیف فائز عظیم آبادی کے "رفیق وانیس" کے تذکرے پر یہ دور ختم ہوتا ہے۔ اگر ان افسانہ نگاروں کے مزاج کا عمومی جائزہ لیجئے تو اندازہ ہوگا کہ ان کا ذہن تخیلی اور زبان شاعرانہ ہے۔ فن پر گرفت ان بزرگوں کی مضبوط نہ تھی۔ حالانکہ رومانی اور تخیلی افسانوں میں اعلیٰ ادب تخلیق کرنے کے بڑے امکانات تھے۔ چنانچہ پہلے دور کے افسانہ نگاروں میں جمیل مظہری کی اہمیت اس لئے بھی مسلم ہو جاتی ہے کہ موصوف کے طویل افسانہ "فرض کی قربان گاہ پر" کے نتائج دیر پا رہے ہیں۔ پہلے دور کے ان افسانہ نگاروں کی تاریخی ضرورت و اہمیت سے ہم انکار نہیں کر سکتے اور بہار کی افسانہ نگاری کی تاریخ میں ان کا ذکر ناگزیر ہے۔

بہار کے افسانوی ادب کا دوسرا دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۶ء تک پھیلا ہوا ہے اس دور کے سربرآوردہ افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، ڈاکٹر سید محمد محسن، جمیل احمد کندھاپوری، ڈاکٹر نصیر الدین، شبلی ابراہیمی اور الیاس اسلام پوری کے اسمار قابل ذکر ہیں۔ اس دور کا آغاز اختر اورینوی

سے ہوتا ہے۔ جن کا پہلا افسانہ ”بدگمانی“ کے عنوان سے اصغر مجیبی کی ادارت میں نکلنے والا ماہنامہ ”بہارستان“ پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ اردو ادب میں اختر اورینوی کی حیثیت ایک ایسے بلند مینار کی ہے۔ جس کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے افسانے فن اور تکنک کے مکمل نمونے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تنوع بھی ہے اور عصری تقاضوں کا احترام بھی۔ وہ ایک اچھے انشاء پرداز ہیں اور افسانوں میں ہندی الفاظ کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کو پڑھنے کے دوران محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند اور کرشن چندر کہیں آس پاس کھڑے ہیں اور یہ سر جھکائے ان کے درمیان سے گذر جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اختر اورینوی سماج کے مظالم اور سرمایہ دارانہ نظام کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور خاص طور پر متوسط طبقہ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے افسانے عموماً خالص فکری ہوتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر زندگی سے متعلق ان کے بسیط مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جونیر وکیل، ٹایپسٹ، بوڑھی ماما، سینے ٹوریم کا فقیر، سیمنٹ، پندرہ منٹ اور ایک درخت کا قتل ان کے مشہور افسانے اور فن کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ ”منظر و پس منظر“ ”سیمنٹ اور ڈائنا مائٹ“ ”کلیاں اور کانٹے“، ”انار کلی اور بھول بھلیاں“، ”سپنوں کے دیس میں“ اور ”کینچلیاں اور بال جبریل“، ان کے چھ افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔

اختر اورینوی کے ایک سال بعد سہیل عظیم آبادی نے لکھنا شروع کیا اور اب بھی لکھ رہے ہیں۔ اختر اور سہیل دونوں کے افسانوں میں متوسط طبقہ کی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں۔ لیکن سہیل کا فن اس وقت عروج پر ہوتا ہے جب ان کا قلم بہار کے دیہات اور کسانوں کو اپنی گرفت میں لاتا ہے۔ سہیل افسانہ نگاری میں پریم چند کی روایتوں کے علمبردار ہیں۔ ان کے افسانوں میں مقامی رنگ کا غلبہ ہے اور زبان میں تصنع نام کو نہیں۔ سہیل سرمایہ داری اور موجودہ نظام معاشرت سے بیزار نظر آتے ہیں۔ افسانوں میں زندگی کی ہماہمی اور پیچیدگیاں برائے نام ہی ہیں سہیل اور اختر کے درمیان جو فرق ہے۔ وہ یہی ہے کہ سہیل کی لے دھیمی ہے اور انداز

سیدھا، سادہ اور سپاٹ۔ جبکہ اختر اورینوی بلند بانگ ہی نہیں بلکہ ان کی کہانیوں میں پیچیدگی بھی ہے، رنگینی اور فور بھی۔ "الاؤ"، "نئے اور پرانے"، اور "چار چہرے" سہیل کے ایسے تین افسانوی مجموعے ہیں۔ جن میں بہار کی مجبور اور بے بس زندگی کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے بارے میں اختر اورینوی کی اس رائے کی کہ وہ کردار نگار سے زیادہ ماجرا نگار ہیں، ان کے تیسرے مجموعہ "چار چہرے" سے تردید ہو جاتی ہے۔ اختر اور سہیل سے ہماری نظر ہٹ کر شکیلہ اختر اور ڈاکٹر محمد محسن پر پڑتی ہے۔ شکیلہ اختر اوّلیت کے اعتبار سے بہار کی وہ پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں، جن کا تعلق مسلم گھرانے سے ہے ان کے افسانوں میں بہار کے متوسط مسلم گھرانوں کی ایسی تصویریں ملتی ہیں، جن کے چہروں پر مسرت کے مٹے مٹے آثار نظر آتے ہیں۔ "درپن"، "آنکھ مچولی"، "ڈائن"، "آگ اور پتھر" اور "لہو کے مول" جیسے ان کے پانچ افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ڈاکٹر محسن پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کے صدر رہ چکے ہیں۔ ان کے افسانے تحلیل نفسی پر مبنی ہیں۔ تحت الشعور اور لاشعور کی کشمکش کو بے نقاب کرنے کے فن پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں کا خاتمہ ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے۔ ان کے فلسفوں اور نفسیاتی نکتوں میں بھی افسانوی رنگینی کچھ کم نہیں۔ اس موقع پر "انوکھی مسکراہٹ"، "لذت آزار" اور "مزدور کا بیٹا" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ "انوکھی مسکراہٹ" کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر محسن اگر خود کو افسانہ نگار کی حیثیت سے باقی رکھتے تو آج وہ نفسیاتی اسکول کے عظیم ترین افسانہ نگار ہوتے ——— جمیل احمد کندھاپوری نے ۱۹۳۴ء سے لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی کہانی کا عنوان "فیروزہ" ہے جو "عالمگیر" رسالہ کے "عید قرباں نمبر" میں شائع ہوئی تھی۔ "آغاز و انجام" ان کے سات منتخب طبعزاد افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۱ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کی کہانیاں ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتی ہیں۔ غربت و امارت کا تصادم، سرمایہ داروں کے مظالم اور سماجی نابرابری وغیرہ ان کہانیوں کے موضوعات ہیں۔ پلاٹ سیدھا سادہ اور لب و لہجہ

سپاٹ قسم کا ہے۔ انھوں نے مغربی افسانوں کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور
ڈراما "ڈاک گھر" کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ رباب شکستہ، طلوع وغروب اور سفید چمگادڑ
کے نام سے ان کے مترجم مغربی افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بعد
شبلی ابراہیمی کا نام ذہن میں اُبھرتا ہے۔ جو پٹنہ ضلع کے باشندہ اور مغربی بنگال کے
کسی کالج میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور تھے۔ اس ملازمت سے علٰحدگی کے
کے بعد مجلس دستور ساز کے چیف رپورٹر ہوئے اور ۱۹۴۸ء کے آس پاس وفات پائی۔
وہ نگار اور ندیم کے قلمکار تھے۔ "راکھی" اور "جنت سے استغفار" ان کی مشہور
کہانیاں ہیں۔ ڈاکٹر نصیر الدین "ندیم" اور "ساقی" کے قلمکار تھے۔ "پردہ سیمیں" اور
"جلوۂ رنگیں" کے نام سے ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے طویل
مختصر افسانوں میں رومان اور حقیقت کا بڑا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ اس دور کے
ایک افسانہ نگار الیاس اسلام پوری ہیں جن کے یہاں مقصدیت کا فنکارانہ اظہار ملتا
ہے۔ زبان دبیان کے اعتبار سے وہ خوبصورت افسانے لکھتے ہیں طوالت کے باوجود
اُکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ کرشن چندر کی طرح الیاس اسلام پوری بھی افسانہ لکھنے
کے دوران مسائل کی گتھیاں سُلجھانے لگتے ہیں۔ لیکن فن کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے
بھی نہیں۔ "بازگشت"، "چوری" اور "بہر زمیں کہ رسیدیم" ان کے مشہور افسانے ہیں
جو نگار، ندیم اور آجکل جیسے ادبی رسائل میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۹ء کے درمیان شائع
ہوئے تھے۔ انجم مانپوری کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ ان کا نام آتے ہی ہونٹوں پر
مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ لیکن ان کے مزاح کے پیچھے بعض اوقات فنی توازن کی کمی کھٹکتی
ہے۔ ان کے مزاحیہ افسانوں میں "کرایہ کی ٹمٹم" اور "میر کلو کی گواہی" اپنی نظیر نہیں رکھتے۔
انجم مانپوری نے واقعہ نگاری سے زیادہ کردار نگاری پر اپنا زورِ قلم صرف کیا ہے۔
زبان و بیان میں مقامی رنگ نمایاں اور انگریزی الفاظ کا برمحل استعمال ملتا ہے
ان کے بیشتر افسانوں پر انشائیے کا گمان گذرتا ہے۔ اسی عہد کے افسانہ نگاروں میں
ح۔ م۔ اسلم اور اختر قادری جیسے دو نام اور ملتے ہیں۔ ح۔ م اسلم کی "دولن بھابی" اور

اختر قادری کی "پٹھان کی بیٹی" مشہور کہانیاں ہیں۔ مذکورہ ناموں کے علاوہ نسیمہ سوز،
بدیع مشہدی، شہاب چکدیوی اور شاہد انور جیسے چند نام اور بھی ایسے ہیں جن کا شمار
اسی عہد کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور جن کی کہانیاں دُکھتی رگیں مرتبہ انور عظیم
(مطبوعہ ۱۹۴۶ء) میں آپ بھی پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر نصیر الدین، شبلی ابراہیمی، الیاس اسلام پوری
ح۔م اسلم، اختر قادری، نسیمہ سوز، بدیع مشہدی، شہاب چکدیوی اور شاہد انور وغیرہ
اس عہد کے وہ افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے نہ تو زیادہ دنوں تک خود کو افسانہ نگار کی
حیثیت سے باقی رکھا اور نہ ان کے افسانوں کے نقوش ہی دیرپا ثابت ہوئے۔

تیسرا دور ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے اور جب ہم اس دور کے افسانہ نگاروں کے
جم غفیر کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہیں تو ہماری نگاہ شین مظفرپوری، ذکی انور، گربچن سنگھ، بدر
اورنگ آبادی (لالچی کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے) غیاث احمد
گدی، انور عظیم، کلام حیدری، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، احمد یوسف، شفیع جاوید، شفیع مشہدی،
قمر التوحید، وہاب اشرفی، ش اختر، شعیب شمس، الیاس احمد گدی، معین شاہد، ل۔م شاہد
اور شمس ندیم پر پڑتی ہے۔ ان میں شین مظفرپوری، ذکی انور اور وہاب اشرفی بنیادی
طور پر رومان نگار ہیں اور ان کی کہانیوں کو ہم اجمالی طور پر جمالیاتی افسانے کہہ سکتے ہیں۔
شین مظفرپوری کی پرکار سادگی لائق تحسین ہے۔ لیکن ان کی کہانیاں آج کے مزاج سے ہم آہنگ
نہیں۔ ذکی انور بھی شین مظفرپوری کی طرح بسیار نویس ہیں۔ لیکن یہاں بھی وہ بات نہیں جو
ہمارے ذہن کو جھنجھوڑ سکے۔ یہاں تک کہ خطوط کے فارم کا تجربہ بھی اپنے اندر کشش نہیں رکھتا۔

شین مظفرپوری نے ۱۹۴۷ء سے لکھنا شروع کیا اور اب بھی لکھ رہے ہیں۔ اب تک
ان کے پانچ افسانوی مجموعے دُکھتی رگیں، کڑوے گھونٹ، لڑکی جوان ہوگئی، آوارہ گرد
کے خطوط اور حلالہ، تین ناول (ہزار راتیں، چاند کا داغ، کھوٹا سکہ) اور تین ناولٹ
(فرحت، تین لڑکیاں ایک کہانی، دوسری بدنامی) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں
اخلاقی زوال، گھریلو زندگی کی ناہمواریاں، سماجی نابرابری، معاشی ناآسودگی، ہندو
مسلم فسادات اور جنسی مسائل جیسے موضوعات اور نفسیاتی عناصر بکثرت ملتے ہیں۔ ان کی

کہانیوں کا موضوعاتی تنوع ان کے مطالعہ کی وسعت، مشاہدہ کی گیرائی اور عصری آگہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ شین مظفرپوری کی اپنی سوچی سمجھی ایک راہ ہے جس پر وہ برسوں سے چل رہے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے پلاٹ میں کوئی اُلجھاؤ نہیں اور خاتمہ بالعموم تحیر خیز ہوتا ہے۔ ان کے فقرے مختصر اور چُست ہوتے ہیں۔ ان کی پرکار سادہ نثر سے ہم شاعری کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ "آوارہ گرد کے خطوط" میں شامل شین مظفرپوری کی کہانی "انو آپا" منٹو کی کہانی "بو" کی یاد دلاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ "بو" کا موضوع کچھ اور ہے اور "انو آپا" میں جنسی استحصال اور اس کے دوررس اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح "حلالہ" مجموعہ کی آخری کہانی "چہرے کی تلاش" پڑھ کر ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کہانی میں شین مظفرپوری کا لب و لہجہ اور طرزِ اظہار ان کی دوسری کہانیوں سے قدرے مختلف ہے۔

ذکی انور (مرحوم) نے ۱۹۴۵ء سے لکھنا شروع کیا۔ "کندن" کے عنوان سے ان کی پہلی کہانی ۱۹۴۵ء میں کلکتہ کے "جدید اُردو" میں شائع ہوئی۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ نقوش (لاہور)، سویرا (لاہور)، جدید اُردو (کلکتہ)، پریم، چاند (جموں)، قوم، نغمہ و نور (دہلی)، نظام (بمبئی)، شیدا (دہلی و بمبئی)، افکار (بھوپال) اور سہیل (گیا) میں اور تقسیم ہند کے بعد بھی وہ ہند و پاک کے جرائد و رسائل میں لکھتے اور چھپتے رہے۔ ان کے شائع شدہ ناولوں کی مجموعی تعداد ۲۷ ہے۔ اُردو دُنیا کو ان کے افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت کا انتظار ہے۔ "نروان" اور "نیک نامی کی واپسی" جیسی کہانیاں ان کے فن کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ وہاب اشرفی نئے نقادوں میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں لیکن یہ کسی وقت افسانہ نگار بھی رہے ہیں۔ اس میدان میں بھی ان کی لَو بہت تیز تھی اور اپنے ہمعصروں میں نمایاں تھے۔ رومانی آہنگ کے باوجود سماجی احوال و کوائف پر ان کی نظر تھی۔ ان کے بعض افسانوں میں طنز کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ان کی مشہور کہانیوں میں "گردش میں ہے آسمان"، "آخری لاش"، "مسیحا کہیں جسے" اور "مٹی کا مادھو" بہت نمایاں ہیں۔ معلوم نہیں کیوں انھوں نے افسانہ نگاری ترک کردی ہے۔ ان کا آخری افسانہ "کھویا ہوا چہرہ" رسالہ

"شب خون" میں شائع ہوا تھا۔ دہاب اشرفی کے ہمعصروں میں شعیب شمس، ہربنس سنگھ دوست، گربچن سنگھ، معین شاہد، الیاس احمد گدی، ش۔ اختر، شمس ندیم اور قمرالتوحید بھی بہت فعال افسانہ نگار رہے ہیں۔ بہار کی افسانہ نگاری کے ارتقا کی تاریخ انھیں بھی فراموش نہیں کرسکتی۔
"کاجل اور آنسو" معین شاہد کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں ان کی ۱۶ کہانیاں شامل ہیں۔ "پتھر کے ہونٹ" اس مجموعہ کی قابل توجہ کہانی ہے۔ اس کے علاوہ معین شاہد کے دو ناول ٹھوکریں (۱۹۵۲ء) اور جذبۂ دل (۱۹۵۶ء) اور ایک ناولٹ بھی "شیشۂ دل" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "پائن کاٹیج" اور "ٹکڑا" قمرالتوحید کے فن کی اور "ہفتہ کے دن"، "قبرستان کے چہرے" اور "پتے جھڑنے لگے" گربچن سنگھ کے فن کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ "زنداں کی ایک رات" کے نام سے ش۔ اختر کے افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ "مسز جون"، "ایک نقطہ اور" "یہ کیا" ش۔ اختر کی قابل ذکر کہانیاں ہیں۔ گربچن سنگھ اور ہربنس سنگھ دوست کا فن ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتا ہے۔ الیاس احمد گدی، ش۔ اختر اور قمرالتوحید آگے کی طرف گامزن اور اپنی شناخت کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان تینوں کے فن میں عصری حسیت اور روایتوں کا احترام ملتا ہے۔ شعیب شمس بنیادی طور پر رومان نگار ہیں۔ "سک رمولی" ان کے فن کا اعلیٰ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ حال ہی میں الیاس احمد گدی کے افسانوں کا مجموعہ "آدمی" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ "آدمی" اور "ستین سین" ان کے فن کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ لیکن یہ سب وہ افسانہ نگار ہیں جو درجنوں کہانیاں لکھنے کے باوجود اب تک نقادوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکے ہیں۔

کلام حیدری اور انور عظیم ترقی پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان دونوں کے یہاں تنوع اور جدت پسند رجحان بھی ملتا ہے اور ہیئتی و موضوعاتی تجربوں کا سراغ بھی۔ شفیع جاوید بہار کا وہ افسانہ نگار ہے، جس کو یہاں کے نئے چہروں کا پیشرو کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔ تجربے کرنا اور اترا اترا کر لکھنا ان کی شناخت بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ احمد یوسف کی کہانیوں کو ہم آسانی سے دو خانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ان کی ۱۹۶۰ء تک کی کہانیاں بعد کی کہانیوں کی بھیڑ میں گم ہوتی نظر آتی ہیں۔ طویل خاموشی کے بعد ان کی جو کہانیاں منظر عام پر

آئیں، وہ آج کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد شفیع جاوید اور احمد یوسف کا جب نیا چہرہ ہمارے سامنے آتا ہے تو ان کے آس پاس ہی غیاث احمد گدی کی قدآور شخصیت کھڑی نظر آتی ہے۔ غیاث احمد گدی، کلام حیدری، شفیع جاوید اور احمد یوسف وہ پرانے نام ہیں جو دوسرے نئے ناموں کے ساتھ اردو افسانے کے پیہم ارتقار کے ضامن بنتے ہیں۔

آزادی کے بعد کے افسانوی ادب کا تنقیدی جائزہ لینے کی صورت میں بڑی حد تک ہمیں گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک کے افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں چند ہی نام ہمیں اپنی طرف متوجہ کرپاتے ہیں۔ ان ناموں میں منٹو، بیدی اور انتظار حسین سرفہرست نظر آتے ہیں، جن کا سرزمین بہار سے تعلق نہیں ہے۔ ان تینوں کی اپنی ایک راہ ہے جس پر کہانی کاروں کا ایک قافلہ گامزن ہے۔ لیکن اس قافلہ میں کوئی نام بھی ایسا نہیں ملتا جس کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ وہ ان تینوں میں سے کسی کی راہ کو دور تک روشن رکھ سکے گا یا کوئی نئی راہ کھول سکے گا۔ جس پر دوسرے بھی چل سکیں۔ آزادی کے بعد کے بیشتر کہانی کاروں کے یہاں ایک ہی سر اور آوازہ یا لب و لہجہ کی چکراتی ہوئی گونج سنائی دیتی ہے۔ گھسی پٹی راہ، اُگلے ہوئے نوالے، ایسی ہم رنگی اور دم گھٹتی فضا ملتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ بیدی اور انتظار حسین کے بعد غیاث احمد گدی، انور عظیم، کلام حیدری، احمد یوسف، جاوید، بلراج مین را، سریندر پرکاش، احمد ہمیش اور انور سجاد (مؤخرالذکر چار نام بہار سے باہر کے ہیں) اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں کچھ نام تو ایسے ہیں، جن کو ہم ۱۹۶۰ سے پہلے بھی پڑھتے رہے ہیں۔ لیکن ۱۹۶۰ء سے پہلے ادب میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔ وہ اپنی جگہ ۶۰ء کے بعد ہی مخصوص کرا سکے ہیں۔ اس لئے نئے اور پرانے ناموں کو ایک ہی دھاگے میں پرو دیا گیا ہے۔ ان میں سے غیاث احمد گدی کا ''بابا لوگ'' اور ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی''، کلام حیدری کا ''بے نام گلیاں''، ''صفر'' اور ''الف لام میم''، اور انور عظیم کا ''قصہ رات کا'' کے نام سے افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔

غیاث احمد گدی نے ”بابا لوگ“ کی اشاعت کے بعد جو افسانے لکھے ہیں، ان میں عصری تقاضوں کا التزام ملتا ہے۔ ”بابا لوگ“ میں شامل کہانیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قاری کی دلچسپی اور انہماک آخر تک باقی رہتا ہے اور افسانہ پڑھ چکنے کے بعد بھی قاری کھویا کھویا رہتا ہے۔ غیاث اپنی کہانیوں کے لئے سماج کے چلتے پھرتے اور ٹوٹتے بکھرتے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں اور کرداروں کو اپنے ماحول میں اپنے طور پر جینے کی آزادی بھی وہ دیتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی کرداروں کی جگہ غیاث بھی کرشن چندر کی طرح تقریر کرنے لگتے ہیں اور یہ ایک ایسی فنی لغزش ہے جس کو آج کا نقاد نظر انداز نہیں کر سکتا۔ لیکن کرشن چندر ایسا اکثر کرتے ہیں۔ جبکہ غیاث شاذ و نادر ہی۔ غیاث حقائق کی تلخیوں کو معجون بنا کر پیش کرنے کے عادی ہیں۔ کہانی کے مواد کو لفظی گورکھ دھندوں سے بچاتے ہیں اور دو دو چار بھی نہیں کہتے۔ ان کی کہانیوں میں ۶۰ء سے قبل اور بعد دونوں عہد کے فنی لوازمات اور تقاضے کا التزام ملتا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں اور وہ اسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، جس پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں داستانی رنگ اور دیو مالائی تانے بانے ملتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی کہانیوں کو نئی کہانیاں کہنے پر ہم مجبور ہیں اور اس کی وجہ ان کا اظہار بیان، اسلوب، ترقی پسندانہ رویہ سے احتراز، داخلیت کو خارجی رنگ و روپ بخشنے کا انداز اور وہ بلیغ اشاریت ہے جو ۶۰ء کے بعد کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ ادھر وہ ہمارے معاشرہ میں پروان چڑھتے اس مذموم ترین ذوق کی طرف بھی انگلیاں اٹھا رہے ہیں، جس پر قلم اٹھاتے ہمارے ادیب ڈرتے اور یہ سوچ کر بدکتے ہیں کہ ادب تو شخصیت کے اظہار ہی کا دوسرا نام ہے۔ ان کے افسانوں میں سماج کے بیشتر وہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور سانحے ملتے ہیں جو سماج کے بڑے سانحے کا سبب بنتے ہیں۔ جذباتی رو پر قابو نہ پانے کے سبب فن مجروح ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ کمزوری غیاث کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔

”پرندہ پکڑنے والی گاڑی“، ”تج دو تج دو“، ”افعی“، ”کبوتری“ اور ”بابا لوگ“ غیاث

کی وہ کہانیاں ہیں جو فن کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

کلام حیدری بہار کے وہ فنکار ہیں، جن کی کہانیاں خود ان کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی داخلیت پر خارجی رنگ و روغن کا دلکش نقاب دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ بقول شخصے ان کے افسانے نئے انسان کے دکھ سکھ کے امین ہیں۔ اپنے مشاہدات جذبات اور محسوسات کو فن کی بھٹی میں جلا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار وہی کچھ بولتے ہیں، جو وہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کئی خانوں میں منقسم ہے۔ اس لئے ان کے تجربات اور موضوعات میں تنوع ملتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے گہرا تاثر پیدا کرنا انھیں خوب آتا ہے۔ ان کی کچھ کہانیوں میں اوہنری کی طرح چونکا دینے والا انداز بھی ملتا ہے۔ ہیئتی اعتبار سے ان کی کہانیاں کچھ زیادہ نئی نہیں۔ نئے اور پرانے کی بات عصری تقاضوں کے پیش نظر ہی کہی جاتی ہے۔ انھوں نے ۶۰ء سے پہلے اور اس کے بعد جو کہانیاں لکھی ہیں، ان کے درمیان زبان، اظہار بیان اور بڑی حد تک موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے بھی نمایاں فرق ملتا ہے۔ کلام حیدری کو ہمیشہ سے خوب سے خوب تر کی تلاش رہی ہے اور وہ عصری تقاضوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ وہ ہر نئی راہ کو دیکھتے، ٹھٹھکتے اور پھر اس پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔ موقع و محل کے اعتبار سے کھردری اور شعری زبان استعمال کرتے ہیں "بے نام گلیاں" کی اشاعت کے بعد انھوں نے غیر محسوس طور پر بہت کچھ اپنے کو بدلا ہے اور اپنی کہانیوں کو ترقی پسند مصنفین کے دائرے سے نکال کر نیا رنگ و روپ بخشنے میں بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد کی کہانیوں میں "زندانی"، "بابو"، "ادھار"، "سخی"، "کس کی کہانی" اور "قاتل" وغیرہ ان کی قابل ذکر کہانیاں ہیں۔

احمد یوسف کا تعلق افسانہ نگاروں کی اس نسل سے ہے، جو تقسیم ہند کے بعد ابھری۔ ۶۲ء سے قبل کی ان کی اچانک چپ سے ادبی دنیا ان کے تئیں مایوسی کا اظہار کرنے ہی والی تھی کہ انھوں نے ٹیلے پر چڑھ کر ایسی ہانک لگائی کہ آواز ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہند و پاک کے ایک مقبول اور عظیم

افسانہ نگار سمجھے جانے لگے۔ ۶۰ء کے بعد کی نئی کہانیوں کا کوئی بھی نمایندہ انتخاب ان کی شمولیت کے بغیر نامکمل سمجھا جائے گا۔ احمد یوسف کی کہانیاں بے چہرگی کی بھیڑ میں چہروں کی تلاش بھی ہیں اور شخصی کرب و اذیت کا دلکش اظہار بھی۔ ان کی کہانیوں میں ''ایک پرندہ نگار خانے کا''، ''تلوار کا موسم''، ''ڈوبتی ابھرتی شام'' اور ''روشنائی کی کشتیاں'' قابل ذکر نئی کہانیاں ہیں۔ احمد یوسف کا نام آتے ہی داستانی لب و لہجہ اور اظہار بیان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ان کے ساتھ ہی شبیر احمد کی تحریریں نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔ داستانی لب و لہجہ اور اظہار بیان کے اعتبار سے احمد یوسف اور شبیر احمد کی تحریروں میں بڑی مماثلت ہے۔ ویسے شبیر احمد نے ۶۵ء کے بعد لکھنا شروع کیا ہے۔ اس کے علاوہ صورتوں میں دونوں کی تحریروں میں بڑا بُعد نظر آتا ہے۔ احمد یوسف کے مطالعہ میں وسعت اور موضوعات میں تنوع ملتا ہے۔ جب کہ شبیر احمد اسلامی موضوعات پر کہانیاں لکھتے ہیں۔ شبیر احمد نے جب بھی اس دائرہ کو پھلانگنے کی کوشش کی ہے، اپنی شناخت کھو دی ہے اور ان کی اوریجنلیٹی گم ہو گئی ہے۔ احمد یوسف بھی جب داستانی لب و لہجہ اور اظہار بیان سے ہٹ کر کوئی نیا رویہ اور انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کی اصلیت اور شناخت بھیڑ میں گُم ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسے موقع پر احمد یوسف فنی توازن برقرار رکھتے ہیں۔ جب کہ شبیر احمد ڈگمگا جاتے ہیں۔ ''اعتراف'' کے نام سے شبیر احمد کے افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ''گرہ، ناخن، گرہ'' اس مجموعہ کی بہترین کہانی ہے۔ داستانی رنگ غیاث احمد گدی کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن ان کے یہاں لب و لہجہ اور اظہار بیان کی بجائے اصل کہانی سے پھوٹتی اور نکلتی کہانیاں دیومالائی کہانیوں اور داستانوں کی یاد دلاتی ہیں۔ غیاث احمد گدی اور کلام حیدری کی طرح احمد یوسف اور شبیر احمد بھی کہانیاں اس وقت لکھتے ہیں، جب لکھنے کے لیے ان کے پاس کوئی موضوع ہوتا ہے۔ ''روشنائی کی کشتیاں'' کے نام سے احمد یوسف کی کہانیوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کی کہانیوں سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے میری کتاب ''نقد آزاد'' سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

شفیع جاوید کا نام بہار کے نئے چہروں کی ترتیب میں پہلے آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ بہار کے نئے افسانہ نگاروں میں ان کو اوّلیت حاصل ہے۔ لیکن ترتیب میں ان کا نام کچھ پیچھے ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء سے پہلے اُردو افسانوں میں انھوں نے جو تجربے کئے وہ محض تجربے کی حد تک کسی بھی نئی راہ پر انھوں نے دو چار قدم بھی چلنے کے لئے اپنی آمادگی ظاہر نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ۶۰ء سے قبل جو کہانیاں انھوں نے لکھی ہیں، وہ ترقی پسند افسانوں کے دھندلکے میں گم نظر آتی ہیں۔ وہ خود اپنی بنائی ہوئی راہ پر چلنے کے لئے اس وقت آمادہ ہوئے، جب دوسرے بہت دور جا چکے تھے۔ شفیع جاوید نے مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں اور فنی اعتبار سے ان میں کچھ جھول بھی نہیں۔ بدلتے لمحوں کا ساتھ دینے کے باوجود ۶۰ء سے قبل اور بعد کی ان کی کہانیوں میں واضح فرق ملتا ہے۔ ۶۰ء سے قبل کی کہانیوں میں جو آمد کی کیفیت ملتی تھی، اس کی جگہ اب آورد اور خارجی اظہار کی جگہ داخلی اظہار نے لے لی ہے۔ اس کی وجہ شاید مسائل اور موضوعات کا انقلاب ہو۔ کیونکہ ہر موضوع اپنے لئے جُداگانہ اظہار بیان اور اسلوب کو جنم دیتا ہے۔ ۶۰ء سے پہلے کی کہانیوں کے ماحول، کردار اور پلاٹ کے بارے میں مختصراً "ہندوستانی، زندہ اور منظّم" کہا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نئے افسانوں کی پشت پر پُرانے افسانوں کا ذخیرہ نہ ہوتا تو افسانے کا نیا چہرہ طلوع نہ ہوتا۔ روایتوں سے اپنا رشتہ استوار رکھنے کے باوجود ۶۰ء کے بعد کی کہانیوں سے وحدت تاثر کے سوا دوسری تمام وحدتیں یکسر غائب نظر آتی ہیں۔ شفیع جاوید کی کچھ کہانیاں صرف تاثرات پر مبنی ہیں مگر ان میں بھی کہانی پن موجود ہے۔ اس طرح کی کہانیوں کے جملے اختصار اور جامعیت کی زندہ مثالیں ہیں۔ شفیع جاوید بند کمرے میں غور و فکر کے بعد کہانیاں لکھتے ہیں۔ وہ لفظوں سے کھیلتے نہیں اور کہانی کے بیشتر جملوں سے انھیں بڑا پیار ہوتا ہے۔ "ایپی ٹاف"، "رات کا سفر"، "اجنبی" اور "سُنی ان سُنی" کی روشنی میں ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ "دائرہ سے باہر" کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

احمد یوسف اور شفیع جاوید کے ساتھ ہی شفیع مشہدی نے بھی لکھنا شروع کیا۔ لیکن انھوں نے ہمیں اس وقت اپنی طرف متوجہ کیا جب "کرچیاں" اور "شونا رہرن" جیسی ان کی کہانیاں اشاعت پذیر ہوئیں۔ "شاخ لہو" کے نام سے حال ہی میں ان کی کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ جس میں ان کی تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ شفیع مشہدی کے اظہار کے دو دھارے ان کے مذکورہ افسانوی مجموعہ کی کہانیوں کو دو حصے میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۹۵۹ء کے بعد جب افسانہ نگاروں نے قاری کے چہرے پر بوریت اور اُکتاہٹ کے آثار کو پڑھا اور محسوس کیا تو انھیں اپنے پکوان کے پھیکے پن کا احساس ستانے لگا۔ جس کے نتیجہ میں ۱۹۶۰ء سے اُردو افسانوں میں نئے تجربے پیش ہونے لگے اور ۶۴ء کے بعد تو قاری کے مُنھ کا مزہ ہی بدل گیا۔ ادب میں تجربہ کوئی چیز نہیں۔ انٹی اسٹوری، انٹی پلاٹ، علامتی اور شعوری رو کی کہانیاں لکھنے کی روایت نئی نہیں۔ پریم چند سے انتظار حسین تک اُردو کے افسانوی ادب میں مختلف ہیئتی اور موضوعاتی تجربے ہوئے۔ لیکن یہاں تک کئے گئے تجربوں کی اہمیت مُنھ کا مزہ بدلنے سے کچھ زیادہ نہیں۔ البتہ ۶۰ء کے بعد بدلے ہوئے حالات کے نتیجہ میں ہیئتی اور موضوعاتی تجربوں کی لے نسبتاً زیادہ تیز ہوگئی اور ان تجربوں نے رجحان کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس موقع پر اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ۶۰ء سے ۶۴ء تک جو تجربے ہوئے۔ ان کا رشتہ ترسیل و ابلاغ کی حد تک روایت سے جڑا ہوا تھا۔ اس وجہ سے سب نے ان کا بلا جھجھک استقبال کیا۔ مگر ۶۵ء کے بعد اس حد کو بھی پھلانگنے کی کوشش شروع ہوگئی۔ تجریدی اور علامتی کہانیاں لکھنے کا رواج عام ہوگیا۔ ٹوٹتے، بکھرتے لمحے، تنہائی کا کرب، بے یقینی اور بے چہرگی افسانوں کے موضوع بنے۔ ان موضوعات نے نئی ہیئتوں کو جنم دیا اور آج افسانوں کے جسم پر جو لباس نظر آتے ہیں۔ وہ ۶۰ء سے پہلے کے افسانوی لباس سے میل نہیں کھاتے۔ ایسے افسانے بہار میں نسبتاً زیادہ لکھے گئے۔ بہار کے چند ایسے لکھنے والوں کے نام کچھ اس طرح ہیں۔ ظفر اوگانوی، نزہت نوری،

نسیم محمد جان، نورالہدیٰ، نشاط قیصر، شبیر احمد، منظر کاظمی، شوکت حیات، اختر یوسف، شموئل احمد، شفق، رضوان احمد، علی امام، نزہت پروین، عشرت ظہیر، حسین الحق، انیس رفیع اور سعادت شمیم۔ اگر ان ناموں کو (۱) نسیم محمد جان، منظر کاظمی، شبیر احمد، عشرت ظہیر، (۲) شفق، حسین الحق، انیس رفیع، رضوان احمد اور (۳) ظفر اوگانوی، نورالہدیٰ، نزہت پروین، نزہت نوری، نشاط قیصر، اختر یوسف، سعادت شمیم، شموئل احمد، علی امام، شوکت حیات ترتیب وار تین خانوں میں تقسیم کر کے ان کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان تین خانوں میں منقسم افسانہ نگاروں کا رشتہ ۶۰ء سے پہلے کے افسانوں سے ترتیب وار نسبتاً زیادہ ٹوٹتا گیا ہے۔ اگر ۶۰ء کے قبل کے افسانوں کو سامنے رکھ کر ان سب کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ آپ کریں گے تو اجنبیت، نامانوسیت اور ترسیل و ابلاغ کی ناکامی کا احساس بڑھتا جائیگا مجموعی طور پر ۶۰ء کے بعد کے افسانوی تجربوں کے ارتقائی سفر کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اس ترتیب کے پہلے صرف ان چار ناموں شفیع جاوید، کلام حیدری، غیاث احمد گدی اور احمد یوسف کو ترتیب وار جوڑ دینا کافی ہوگا۔ اس ترتیب کو ہم اپنے سامنے رکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ۶۰ء سے قبل کے افسانوں کی یکسانیت سے اوب کر بتدریج کس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ بہار میں لکھے گئے آج کے افسانے کل کے افسانوں سے میل نہیں کھاتے اور جب ہم شکیلہ منظفر پوری، زکی انور، کلام حیدری، نسیم محمد جان، اعجاز شاہین، شمیم صادقہ، ش۔ اختر، غیاث احمد گدی، شفیع جاوید، انیس رفیع، حسین الحق، شفق، منظر کاظمی، شبیر احمد، عشرت ظہیر، شفیع مشہدی، علی امام، احمد یوسف، ظفر اوگانوی، نزہت پروین، اختر یوسف، نشاط قیصر، نزہت نوری اور شوکت حیات کے افسانوں کا ترتیب وار مطالعہ کریں گے تو ہمیں ترسیل و ابلاغ کی ناکامی کا احساس اسی ترتیب کے ساتھ بڑھتا جائے گا۔

نئی صف میں ظفر اوگانوی دوسروں سے آگے نظر آتے ہیں۔ ۶۰ء کے بعد کی تبدیلیوں کو انھوں نے سب سے پہلے محسوس کیا اور اپنے لئے ایک ایسی راہ اختیار کی جس کو

دوسروں نے بھی پسند کیا۔ ان کا ایک مزاج بن چکا ہے اور ان کا اپنا ایک اسلوب ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔ اس طرح بہار کے نئے افسانہ نگاروں میں ان کی حیثیت نمایاں ہوگئی ہے۔ بہار کا یہ پہلا نام ہے جس کے افسانوی اسلوب اور طرزِ اظہار نے بڑی تعداد میں یہاں کے دوسرے نئے لکھنے والوں کو متاثر کیا اور افسانوں میں نئے موضوعات پیش کرنے کی ترغیب دی۔ حال ہی میں "سچ کا ورق" کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ "نیا آئینہ"، "سچ کا ورق"، "قیادت" اور "اندر کا المیہ (احرام) جیسے ان کے افسانوں کو خالدہ اصغر، انور سجاد، سریندر پرکاش، بلراج مین را اور احمد ہمیش جیسے فنکاروں کے کسی بھی افسانہ کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۶۰ء کے بعد کے ناموں میں منظر کاظمی ایک ایسا نام ہے جس کو قدروں کے توڑ پھوڑ کا شدّت سے احساس ہے۔ ان کی کہانیوں کا موضوعاتی سرچشمہ اسلامیات ہے۔ اشاریت ان کی کہانیوں کی جان ہے۔ مگر ان کے اسلوب کو ہم منفرد نہیں کہہ سکتے کہ آسمان چھوتے غبار کے ذرّے اپنی شناخت کھودیتے ہیں۔ "کانٹوں کا تاج" سیاہ غلاف اور کالے جرنیل" اور" دروازے" وغیرہ ان کے فن کی نمایندہ کہانیاں ہیں۔

نشاط قیصر موجودہ عہد کا قلمکار ہے۔ اس کی کہانیوں کا موضوع "آج" اور "آج کا فرد" ہے۔ نشاط قیصر کو اس کا علم ہے کہ نہ صرف موضوع کی کوئی اہمیت ہے اور نہ تنہا ہیئت اور اسلوب کوئی چیز ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں فرسودہ اور بعید از فہم علامتوں کا سہارا نہیں ڈھونڈتا۔ "باہر کا کمرہ" "نیا چہرہ"، "اندھیرے کا سفر" اور "گوہاٹی" وغیرہ کہانیاں ایسی ہیں۔ جن کا نہ صرف فارم جدید ہے بلکہ مواد بھی "آج" کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس قلمکار کی بیشتر کہانیاں فن کے ایسے جدید نمونے ہیں۔ جن میں جدید حسیت اور عصریت کے ساتھ کہانی پن، جامعیت اور وحدت تاثر سب کچھ موجود ہے۔ بہار کے نئے لکھنے والوں میں ظفر اوگانوی اور نزہت نوری کے بعد نشاط قیصر ہی پر ہماری نگاہ ٹھہرتی ہے حالانکہ ان کے پیچھے تخلیقات کا کوئی انبار بھی نہیں انھوں نے

قسیم سیفی، نسیم محمد جان اور شفق کے مقابلہ میں بہت کم لکھا ہے۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے، اس نے گہرا نقش چھوڑا ہے۔ شمیم سیفی، نسیم محمد جان اور شفق کا نام اس وجہ سے لیا گیا ہے کہ ان تینوں نے تعداد میں کچھ زیادہ افسانے ضرور لکھے ہیں۔ مگر ان تینوں کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے وقت ان کے افسانوں کو الگ الگ دو خانوں میں تقسیم کرنے پر ہم مجبور ہوں گے۔ جو چہرے مہرے کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے بڑی حد تک اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ یہی حال حسین الحق، عبید قمر، عبدالصمد اور انیس رفیع کے افسانوں کا بھی ہے۔ جہاں تک اسلوب اور اظہار بیان کا سوال ہے۔ اس اعتبار سے شمیم سیفی، نسیم محمد جان اور عبدالصمد کو کلام حیدری سے اور شفق، شموئل احمد، رضوان احمد، حسین الحق، عبید قمر، علی امام، انیس رفیع، عشرت ظہیر، سعادت شمیم، شمیم اختر اور شمیم قاسمی کو نشاط قیصر، اختر یوسف، شوکت حیات سے قریب پاتے ہیں۔ نزہت نوری، اختر یوسف، شوکت حیات اور نزہت پروین نے بہت کم مدت میں اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ لیکن یہ چاروں ابھی تجربوں کی زد میں ہیں اور اب تک ان کا کوئی مزاج نہیں بن پایا ہے۔ شوکت حیات کے مقابلہ میں نزہت نوری اور نزہت پروین فنّی نکات سے زیادہ آگاہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں پختگی اور اسلوب منجھا ہوا ہے۔ شوکت حیات آرٹ میں How پر اپنا سارا زور صرف کرتے ہیں اور What ان کے نزدیک کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ جب کہ نزہت نوری اور نزہت پروین کا فن How اور What کے درمیان توازن کا آئینہ دار ہے۔

رضوان احمد کے افسانوں کا مجموعہ "مسدود راہوں کے مسافر" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ کی چار کہانیاں "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے"، "مسدود راہوں کے مسافر"، "گدھ" اور "اپنے لئے ایک کہانی" بطور خاص قابل توجہ ہیں۔ مذکورہ کہانیوں میں کہانی پن بھی ہے اور وحدت تاثر بھی۔ جدید حسیت بھی ہے اور فنکاری بھی۔ ان کہانیوں کا قاری بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہے کہ رضوان احمد آج کا ایک باشعور فنکار ہے۔

اس کا مشاہدہ گہرا اور وسیع ہے۔ فنّی تقاضوں کا التزام ہی کسی تخلیق کو کامیاب بناتا ہے اور ان چاروں کہانیوں کے فنکار نے فنّی تقاضوں کا پورا پورا لحاظ کیا ہے، عصری تقاضوں کو برتا ہے۔ بے لگام جذبات اور بے چہرہ مسائل کو فنّی قالب میں ڈھالنے کی یہاں کامیاب کوششیں ملتی ہیں۔ عصری مسائل کے تاریک جنگل میں کہیں کہیں جنس کے جگنو بھی جگمگاتے ہیں۔ لیکن جگنو صفت جنس ذہنی بہاؤ پر بند نہیں باندھتے' سر ضرور اُٹھاتے ہیں۔ مگر وہ کسی طرح کی جنسی دعوت نہیں دیتے۔ جنسی خواہش کچھ غیر فطری نہیں۔ فطری خواہش کا اظہار اگر فنّی حدود میں نہ ہو تو اس اظہار کا نقص سمجھا جائے گا نہ کہ فطری خواہشوں کا۔ بادی النظر میں اس مجموعہ کی دوسری کہانیوں پر تجریدی اور شعوری رو کی کہانیوں کا گمان گذرتا ہے اور بیشتر افسانے لامرکزیت کی صلیب پر لٹکے نظر آتے ہیں۔ انتشار اور لامرکزیت رضوان احمد کی کہانیوں کی پہچان ہے۔ کہانی لکھنے کے دوران خیالات کا انتخاب اور جذبات پر قابو پانا فنّی پل صراط سے گذرنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مختلف النوع خیالات کا اجتماع اور بھانت بھانت کے جذبات کو تخلیق کے دوران چھوٹ دینا کہانی کے فن کے منافی ہے۔ اس کی وجہ سے مجموعی تاثر بگڑتا ہے اور فنکار و قاری کے درمیانی فاصلے سمٹنے کی بجائے بڑھتے ہیں۔ عصری حسیت کی پیشکش فنکار کی بیدار مغزی کا پتہ ضرور دیتی ہے لیکن اس پیشکش کے لئے بھی فنکاری بنیادی شرط ہے۔

بہار کے کچھ اور افسانہ نگار یہ ہیں۔ نشاط الایمان، محمود واجد، علی حیدر ملک، نور الہدیٰ، نسیم مظفرپوری، عابد امام زیدی، شاکر کریمی، ناز قادری، فاروق راہب، انجم مولانگری (انجمہ کے نام سے ان کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس میں آٹھ افسانے شامل ہیں)، نعیم کوثر، اقبال اختر، م۔ ق۔ خاں، عظیم اقبال، شوکت خلیل، مناظر عاشق ہرگانوی، ظہیر نیازی، نصر حمید خلش، اسلم آزاد، ابواللیث جاوید، محی الدین سبحانی، ظفر حبیب، اشرف قادری، شمیم اختر، فخرالدین عارفی، اختر واصف، مشتاق نوری، مسعود شمس، سید احمد قادری، نیاز الدین نیازی، تمنا ملک، محمود عالم

(ایم۔اے شمسی) اور حسن احمد وغیرہ۔(اس فہرست (جس میں کسی خاص ترتیب کالحاظ نہیں کیا گیا ہے) کے بعض نام ایسے ہیں جنھوں نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا اور کچھ ایسے بھی نام ہیں جو ۱۹۷۰ء یا اس کے بعد سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔پُرانے اور نئے ناموں کی اس فہرست کے بعض نام ایسے ہیں جو نئے رُجحانات اور جدید حسیت کو کم و بیش قبول کرنے اور برتنے کے باوجود روایتی بُنیادوں پر اپنے فن کی عمارت کھڑی کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور کچھ نام ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

بہار کی خواتین افسانہ نگار کارواں شکیلہ اختر کے بعد جن ناموں سے مرتب ہوتا ہے۔ وہ ہیں آنسہ نسیمہ سوز، رضیہ رعنا، س۔ق صاحبہ، بیگم عنایت الرحمٰن، عصمت آرار، اعجاز شاہین، نزہت نوری، شمیم صادقہ، نصرت آرار، شمیم افزا قمر، شاہدہ یوسف، شیریں نیازی، ذکیہ مشہدی، روشن آرا، نیر، قمر جہاں، مبینہ امام، حسن جبیں شکیل، طلعت جہاں نازش، نزہت پروین، ماہ طلعت، علویہ رحمان، طلعت فاطمہ، اشرف جہاں، حسینہ نشاط، نشاط الفاطمہ، ثریّا جبیں، عفت فاطمہ، نفیس فاطمہ عظیم آبادی، نجمہ اقبال سہسرامی، شہناز بانو، صبوحی ندیم، فرزانہ اسلم اور محمودہ اختر وغیرہ۔ خواتین افسانہ نگار کے اس کارواں میں شکیلہ اختر کے بعد عصمت آرار، اعجاز شاہین، نزہت نوری، شمیم صادقہ اور نزہت پروین جیسے چند نام ایسے ہیں، جن کے افسانے ان کے تابناک مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کس افسانہ نگار کے مقدر میں شکیلہ اختر بنتا ہے یا ان سے آگے نکلنا ہے۔

عصمت آرار اور اعجاز شاہین کے افسانوں میں نئے رُجحانات اور جدید حسّیت کے التزام کے باوجود روایتی قدروں کا احترام پایا جاتا ہے۔اعجاز شاہین کے برخلاف عصمت آرار کی کہانیوں کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔"دودھ کا جلا" "سخول"، "بابل کے گیت"، "ستارے کی موت" اور "گرد کارواں" ان کی وہ کہانیاں ہیں جو صنم، صبح نو اور کتاب جیسے ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ان کہانیوں کو

پڑھ کر عصمت آرار کے فن اور مزاج کی سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔زبان و بیان کی دلکشی کے ساتھ جابجا جامع اشاریت کہانیوں کے تاثر کو بڑھاتی ہے۔
اعجاز شاہین کی کہانیوں کا موضوع وہ زندگی ہے جس کو وہ جی چکی ہیں یا جی رہی ہیں۔زندگی کے معمولی اور چھوٹے چھوٹے واقعات جو بادی النظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے، اعجاز شاہین کی کہانیوں میں کثرت سے ملتے ہیں۔عصمت آرار کی طرح اعجاز شاہین بھی عموماً عام فہم زبان لکھتی ہیں۔لیکن بعض اشاراتی اور استعاراتی جملے دل کو چھوتے اور ذہن کو جھٹکے بھی لگاتے ہیں۔"تصور اور تصویر" کے نام سے ان کی کہانیوں کا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔اس مجموعہ میں ان کے چودہ افسانے شامل ہیں۔"آئینہ" اس مجموعہ کی نمائندہ کہانی اور ان کے فن کا بہترین نمونہ ہے۔(مزید تفصیل کے لئے میری کتاب "نقد آزاد" میں شامل مضمون "اعجاز شاہین۔ ایک فنکار" سے رجوع کیا جاسکتا ہے)۔عصمت آرار اور اعجاز شاہین سے ہٹ کر ہماری نگاہ نزہت نوری، شمیم صادقہ اور نزہت پروین جیسی ذہین اور جدید فنکاروں کا طواف کرتی ہے۔یہ تینوں تجریدی اور علامتی کہانیاں لکھتی ہیں۔عصری حسیت اور جدید اسلوب کے سبب ان تینوں کا قد بہار کی دوسری تمام خواتین افسانہ نگار سے کچھ زیادہ بلند نظر آتا ہے۔نزہت نوری نے نہ صرف یہ کہ شمیم صادقہ اور نزہت پروین سے کچھ زیادہ کہانیاں لکھی ہیں۔بلکہ ان کا فن نسبتاً زیادہ بالیدہ اور اکیڈمک (Academic) ہے۔"شیشے کا چاند"، "روشنی اور ریزے"، "سناٹا" "روپ بہروپ"، "شیرازہ"، "رات آنکھیں اور دائرے" اور "سبز نقش" وغیرہ نزہت نوری کی۔"مونا لیزا"، "یہ فاصلے شام و سحر کے" اور "روڑا"، شمیم صادقہ (ان کے افسانوں کا مجموعہ کرچیاں کے نام سے زیر طبع ہے) کی اور "اندھیرے کا سفر"سرخ نشان" "روشن اندھیرا" اور "تاش کے پتے" وغیرہ نزہت پروین کی وہ کہانیاں ہیں، جن کی روشنی میں ان تینوں کے فن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔
شکیلہ اختر اور اعجاز شاہین کے علاوہ نصرت آرار بہار کی تیسری افسانہ نگار خاتون

ہیں، جن کا افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کے مجموعہ کا نام ''درد کا رشتہ'' ہے، جس میں سولہ افسانے شامل ہیں۔ ''درد کا رشتہ'' اور ''داغ'' اس مجموعہ کی ایسی دو نمایندہ کہانیاں ہیں، جن کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نصرت آرار کردار نگار سے زیادہ ماجرا نگار ہیں۔ ان کے مجموعہ کی کوئی کہانی ایسی نہیں، جس میں زمان و مکان کا بُعد ہو، سپاٹ لب و لہجہ اور بیانیہ انداز کے باوجود ان کی کہانیاں پڑھ کر ہمارے منُھ کا مزہ نہیں بگڑتا۔ شاہدہ یوسف کی کہانیوں میں ''دل کا کیا رنگ کروں''، ''ایک کہانی دو افسانے''، ''میرے صفحے''، ''زندگی کی کتاب'' اور ''ٹیبل کے نیچے'' وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں، جن کی تہ میں عورتوں کی مخصوص نفسیات، زن و شو کے باہمی رشتے اور ان کا ادراک، سماج میں عورتوں کا استحصال اور جہیز کی لعنتوں کے خلاف ایک بُجھا بُجھا سا احتجاج ملتا ہے۔ کچھ اس طرح کی کہانیاں شمیم افزا قمر بھی لکھتی ہیں۔ ان کی پانچ کہانیاں رسالہ ''آہنگ'' گیا کے شمارہ ۵۵ میں خود نوشت تعارف کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن شاہدہ یوسف کے فن میں نسبتاً زیادہ نسائیت اور تازگی ملتی ہے۔ شکیلہ اختر، عصمت آرار، اعجاز شاہین، نزہت نوری، شمیم صادقہ اور نزہت پروین کے بعد روشن آرار ذکیہ مشہدی، سینہ امام اور شہناز بانو چار ہی ایسے نام ملتے ہیں، جن کا فنی رچاؤ اور پیشکش کی تازگی ان کے تابناک مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ ورنہ ہر ایک کے یہاں ایک ہی آواز کی ٹکراتی ہوئی گونج سُنائی دیتی ہے اور ادب میں ریاضی کے فارمولا کے بر خلاف دو جوڑ دو برابر چار نہیں بلکہ تین ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب میں شناخت تو منفرد آوازوں کی اور گنتی منفرد آوازوں کے صرف تنوع کی ہوتی ہے۔

بہار میں اُردو افسانہ نگاری کا یہ جائزہ میرے اپنے تاثرات پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے بعض افسانہ نگاروں کے باب میں میری رائے سے اختلاف بھی ممکن ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں نے جو رائے قائم کی ہے وہ میرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

احمد حسین آزاد

افسانے

فن کے نقیب

محبّت اور جاہ و ثروت کی کشمکش

(محمد مسلم عظیم آبادی)

مجھ سے چھپا دیا گیا

والد مرحوم نے میری شادی باوجود اماں جان کے اصرار کے میرے انٹرنس پاس کرنے سے پہلے نہ کی۔ اور یہ اُن کی بڑی روشن خیالی سمجھی جاتی تھی۔ میں تو تھا اُنیس ۱۹ برس کا نوعمر، مگر تاہل کی ذمہ داریوں کو کچھ نہ کچھ سمجھتا تھا لیکن ابا جان سے اختلاف کرنے کا بھی عادی نہ تھا۔ اُنھوں نے یہ دریافت کر لیا تھا کہ یوسف، میمونہ سے محبت کرتا ہے اور بس۔ اس معاملہ کا تعلق میرے ساتھ وہ اس سے زیادہ نہ سمجھتے تھے۔

میمونہ صرف خوبصورت ہی نہ تھی، بلا کی شوخ۔ مگر ساتھ ہی انتہا کی ذکی اور شاعر دل سراپا محبّت اُس کا دین تھا اور محبت اُس کا ایمان تھا۔ ہم دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے اگر میں اُس سے محبت کرتا یا وہ مجھ سے۔ تو جائے تعجب نہ تھی۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ میمونہ میری بیوی ہونے والی ہے تو میری محبت پر ایک نیا رنگ چڑھ گیا۔ وہ کون رنگ تھا؟ اس کی مثال دینا یا شرح کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ دُنیا میں ویسی کوئی چیز نہیں پاتا جس سے مثال دے کر حقیقت پر روشنی ڈالی جا سکے خدا کی مار ہو پردے پر۔ میمونہ کو مجھ سے چھپا دیا گیا۔

جاڑوں کی رات ہے ایک بجا ہوگا۔ شہر پر سنّاٹا چھایا ہوا ہے بالاخانے کا سنسان کمرہ ہے ایک مَیں ہوں اور میری شمع۔ دس بجے سے اقلیدس سامنے کھلی ہے مگر اب تک ایک شکل بھی ذہن نشین نہیں ہوئی خیالات کا ہجوم کسی طرح ذہن کو اتنی مہلت نہیں دیتا

کہ کتاب کے مطلب کو اخذ کرے۔ جانچ کے امتحان کو صرف پندرہ روز باقی ہیں۔ ایک تو کمبخت فنِ ریاضی سے دلی نفرت، اُس پر یہ ہجوم تخیلات! تخیلات کیا تھے؟ آہ یہ نہ پوچھو ؎

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں (حسرت موہانی)

اُمیدوں کا ایک ہرا بھرا باغ آنکھوں کے سامنے لہلہا رہا تھا۔ تمناؤں کے پھول کھِل رہے تھے، جن سے شامِ جاں معطر تھا۔ حسرتوں کا ایک پُر جوش دریا لہریں لے رہا تھا۔ ایک عالم تھا کہ جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھئے نور ہی نور نظر آتا تھا۔ کہیں تاریکی کا وہم بھی نہ تھا۔ کیا وہ دن بھی آئیں گے جب میمونہ میری ہوگی؟ کیا اُس کے اُبھرے اُبھرے گلابی گالوں تک میری نظروں ہی کی نہیں۔ ہونٹوں کی رسائی بھی ہوگی؟ کیا اُس خوبصورت و معطر پھول کا لذت کش صرف میرا باصرہ ہی نہیں شامہ بھی ہوگا؟

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زُلفیں پریشاں ہوگئیں (غالب)

مگر میں پروانہ وار عشق کا قائل نہیں۔ پروانہ جل مرا شمع کو خبر بھی نہ ہوئی۔ نامراد عشق، نامراد زندگی، نامراد موت۔ اوّل تو یہ ہو کیونکر۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی کسی سے سچے دل سے محبت کرے اور وہ اُس سے متاثر نہ ہو۔ اگر یہ ممکن ہے تو عاشق کی زیاں کوشی ہے۔ سعی بیہودہ ہے۔

میمونہ جب مجھ سے پردہ نہ کرتی تھی تو مجھ سے محبت رکھتی تھی۔ مگر اُس وقت اُس کی محبت کی نوعیت کیا تھی اور اب کیا ہے؟ کچھ نہیں معلوم۔ اگر وہ بھی مجھ سے ویسی ہی محبت کرتی ہو جیسی میں، تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب دُنیا میں کون ہوسکتا ہے؟

دس بجے سے ایک بجے تک انھیں تخیلات میں وقت گذر گیا۔ مگر نظر اقلیدس کی شکل پر ہی جمی رہی۔ گویا میں اتنی دیر سے اقلیدس پڑھ رہا ہوں۔ یکایک خیال آیا کہ میں پڑھ نہیں رہا ہوں۔ اور پھر شکل بنا کر "فرض کرو کہ آ ب ج ایک مثلث قائم الزاویہ ہے" شروع کیا مگر پھر

دماغ نے جواب دیا۔ کتاب اٹھا کر رکھ دی اور لکھنے لگا۔

میری پیاری میمونہ

کیوں رکھا دید سے محروم بنا کر مشتاق
آج تک کر نہ سکا حل یہ معما کوئی

گو سوسائٹی کے قانون اور ظالمانہ قانون نے تم کو میری نظروں سے دور مگر دل سے قریب تر کر دیا ہے سے

چھپائے لاکھ حُسنِ عالم آرا کو نقاب ان کا
نظر بازوں کو کب یہ مانعِ دیدار ہوتا ہے

اس پردہ کی حالت میں شاید میرا یہ خط لکھنا ناقابلِ معافی گناہ سمجھا جائے گا لیکن اگر یہ سچ ہے کہ تم میری آیندہ زندگی میں میرے رنج و راحت کی شریک بننے والی ہو تو میرا حق عقل و انصاف اور شریعتِ اسلام کی رُو سے اس سے کہیں زیادہ ہے کہ میں تمھیں ایک خط لکھوں اور تم سے اُس کا جواب چاہوں۔ تمھاری سلامت روی اور دانائی سے بھی یہی اُمید ہے کہ تم اسے روا رکھو گی جس کام کو ہمارا ایمان حق قرار دیتا ہے اُسے دُنیا کی زبردستی سے ناحق اور ناحق کو حق کیوں سمجھیں؟ دُنیا کا لحاظ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کافی ہے کہ ہم اپنے کاموں کو حتی المقدور اُس سے چھپائیں۔

بدقسمتی سے ہم لوگوں میں شادی ایک کھیل اور تماشا سمجھ لی گئی ہے۔ والدین نے اپنی مرضی سے آنکھ بند کر کے جس کی قسمت کو جس سے چاہا وابستہ کر دیا۔ اُن کا ایک بڑا ارمان نکل گیا اور خوش و مطمئن دُنیا سے سدھار گئے اب میاں بیوی میں کیسی بنتی ہے اور کیسی گذرتی ہے اُن کی بلا جانے۔

عموماً بے وقت شادی نوجوانوں کی ترقی میں سنگِ راہ ثابت ہوتی ہے مثلاً آج میں انٹرنس میں پڑھتا ہوں۔ والدین زندہ ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ شادی ہمارے مقررہ دستور العمل میں خارج نہیں ہوسکتی۔ میں عام رفتار سے بدل کر بی اے پاس کر جاؤں گا۔ لیکن وہ ایک منٹ کے لئے یہ نہیں سوچتے کہ اُن کی آمدنی آج مغتنم ہے مگر اتنی کافی نہیں

کہ ایک نئے خاندان کا بار آسانی سے اُٹھا سکیں ثانیاً اُن کی اوقات سرکاری ملازمت پر ہے، آج ہے، اگر کل نہ رہی، یا خدانخواستہ وہ خود نہ رہے تو کیا ہوگا؟ اگر شادی سے اُن کی مراد میری شادمانی ہوتی تو وہ اس تعجیل کو راہ نہیں دیتے۔ جب میرے اپنے بازو مضبوط ہو چکتے اور میں اس ذمہ داری کا بار اُٹھانے کے قابل خود ہو جاتا تو میں بے خوف وخطر شادی کر سکتا تھا۔ مگر والدین کو اپنی خوشی منظور ہے۔ جسے وہ ارمان کہتے ہیں اور جسے وہ اپنی زندگی میں نکالنا لذتِ زندگی سمجھتے ہیں مگر فرضِ پدری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

بحث ازدواج میں دوسرا مسئلہ جو میرا اصل مقصود ہے وہ طرفین کی باہمی موانست و ہم خیالی ہے۔ طرفین میں محبت ایسی ہو کہ گویا ایک دوسرے کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ پس توضیح طلب دو باتیں ٹھہریں۔ مناسب وقت۔ مناسب جوڑا۔ وقت کے اعتبار سے میں صاف محسوس کر رہا ہوں کہ یہ شادی میرے حق میں مضر ہوگی۔ رہا دوسرا سوال۔ جس سوسائٹی میں پردے کی سی مذموم رسم جاری ہو وہاں ازدواج کی یہ دوسری شرط تو کسی طرح پوری ہی نہیں ہو سکتی۔ جس حلقے میں ہمیں شادی کرنا ہے وہ قاف کی پریوں کا غول ہے غیر مرئی، جن کی آواز بھی کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اُن کی اُفتادِ طبع، تعلیم، صورت وصحت کا پتہ لگانا بہت دشوار اور محبت تو خارج از خیال ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ تم میری ماموں زاد بہن ہو۔ ایک زمانے تک ہم تم ساتھ رہے ایک دوسرے سے بہت کچھ واقف ہیں۔ اس لئے ہم دونوں کو موقع حاصل ہے کہ ایک دوسرے کے متعلق رائے قائم کر سکیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ اگر پہلی شرط کے فوت ہونے کے باعث شادی سے انکار کر لوں تو دوسرا غنیمت موقع ہاتھ سے جاتا ہے۔ انسان موقع کا منتظر ہوتا ہے موقع انسان کا منتظر نہیں ہوتا۔ مجھے تعلیم یافتہ بیوی ہمیشہ مل سکتی ہے۔ خوبصورت اور نیک سیرت بھی مل سکتی ہے مگر وہ صرف بیوی ہوگی۔ بچوں کی ماں ہوگی، گھر کی مالکہ ہوگی، وہ سب کچھ ہوگی مگر شاید وہ نہیں ہو سکتی جو تم ہو یعنی میرے دل کی مالکہ۔ کعبۂ دل کا بُت، محبت کی چیز، پرستش کی شے۔

دو شرطوں میں سے ایک مجھے حاصل نہیں تو دوسری اہم شرط ضرور حاصل ہے اس لئے میں پہلی شرط سے کیوں باز نہ آؤں ایک شخص کو ایک وقت میں میسّر نہیں آسکتے تو میں کیوں طلب لکل

فوت الکل" کا شکار بنوں!

رہی یہ بات کہ میں اب تمھاری صحیح رائے دریافت کروں۔ پردے کے قبل ہماری تمھاری دوستی کی نوعیت اور تھی اور اب اور ہونا چاہیئے۔ اُس وقت بیشک تم مجھے دوست رکھتی تھیں۔ مگر ممکن ہے کہ بحیثیت پھوپھی زاد بھائی یا دوست کے تم مجھے پسند کرسکتی ہو مگر شوہر بنانے کے لئے تمھارا معیار اور ہو تو میں صاف کہے دیتا ہوں کہ تم میرے معیار سے کہیں بلند مرتبہ رکھتی ہو۔ اب میں یہ جاننے کے لئے بے تاب ہوں کہ میں تمھارے معیار پر پورا اُترتا ہوں یا نہیں اگر اُتروں تو اپنی قسمت پر ناز کروں، نہ اُتروں تو تمھارے بھلے کو۔ ابا جان سے اختلاف کر کے یہ نسبت فوراً منقطع کرا دوں۔ خواہ مجھ پر جو کچھ گذرے خُدا کے واسطے صاف جواب دے کر ہمیں اس انتشار سے نجات دو۔ جواب میں مَیں تم سے ویسی مدلّل اور سُلجھی ہوئی تقریر کا طالب ہوں جو بعض دفعہ تم متین بن کر کہہ جایا کرتی تھیں۔ اور میں مُنھ دیکھ کر رہ جایا کرتا تھا۔

سراپا شوق۔ یوسف

میمونہ کا چھوٹا بھائی نصیر مجھ سے پڑھتا تھا میں اُس سے محبت کرتا تھا اور وہ مجھ سے لپٹا رہتا تھا۔ میں نے اُس سے قاصد کا کام لیا اور خط ملفوف کر کے اُس کی معرفت میمونہ کو بھیج دیا اور راز داری کی تاکید کر دی۔

محبت یا جاہ و ثروت؟

دوسرے روز مجھ کو جو جواب ملا وہ یہ تھا۔

منصفی ہو تو غضب نا منصفی ہو تو ستم
اُس نے میرا فیصلہ موقوف مجھ پر رکھ دیا (داغ)

میں نہ جانتی کہ آپ کو کن القاب سے خطاب کروں۔

ہم بیچاریاں کیا اور ہمارا معیار کیا؟ ماں باپ نے جس سے ہاتھ پکڑا دیا شکر و رضا کے ساتھ زندگی کاٹ دی۔ ہم بھلا معیار رکھ کر کیا کریں جب اُس سے مصرف ہی نہ لے سکیں؟

آج تک ہمیں اس کا خیال بھی نہ آیا کہ کسی معیار کی ضرورت ہے۔ یا کوئی معیار ممکن بھی ہو۔
آپ مجھ سے اپنے امتحان کی درخواست کر کے شاید اپنی تعریف سُننا چاہتے ہیں۔ آپ شاعر ہو کر میرے چہرے پر لکھے ہوئے حروف نہیں پڑھ سکے؟ میری خاموشی سے کیا کوئی صدا آپ کے کانوں تک نہ پہنچی۔ کیا آپ مجھے لب کشائی پر مجبور کر کے حُسنِ معنی کو غارت کرنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ کو یہ گوارا ہے تو یوں ہی سہی۔

معیار کی پانچ تقسیم ہو سکتی ہیں (۱) علم (۲) حُسنِ سیرت (۳) تندرستی (۴) فراغ دستی۔ (۵) شرافت خاندانی۔

(۱) علمی کمالات کے لحاظ سے آپ کا شمار خاندان کے قابلِ فخر نوجوانوں میں ہے۔ اگرچہ انگریزی آپ نے انٹرنس ہی تک پڑھی ہے مگر آیندہ ترقّی کی قوی اُمید ہے (۲) حُسنِ سیرت کے متعلق آپ کی پاکبازی، مستقل مزاجی، بلند ہمّتی اور تمام مردانہ خصائل کی تعریف کی جا سکتی ہے مگر میں سب سے زیادہ آپ کی جس چیز کی قدر کرتی ہوں وہ آپ کا گرم اور زندہ دل ہے جو نرم اور لطیف جذبات سے معمور ہے (۳) تندرستی کے متعلق ماشاء اللہ کچھ کہنا نہیں ہے۔ (۴) فراغ دستی کے لحاظ سے پھوپھا اباذی حیثیت شخص سمجھے جاتے ہیں اور خود آپ کی ذات سے بہت اُمیدیں ہیں۔ (۵) خاندان جو میرا وہ آپ کا۔ مگر میں آپ کو جس وجہ سے اچھا سمجھتی ہوں وہ ان اوصاف میں سے ایک بھی نہیں بلکہ "در ازل بود کہ پیمان محبّت بستند" اور کیا عرض کروں۔

مگر جہاں میرے بھلے کے لئے آپ نے میرا عندیہ دریافت کیا ہے وہاں میں بھی آپ کے بھلے کے لئے آپ کو اپنی عقل کے مطابق دوستانہ مشورہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ اپنی پہلی شرط سے باز آ کر اپنی دُنیاوی ترقی کو خطرے میں کیوں ڈالتے ہیں؟ میں جانتی ہوں کہ آپ کے خیالات بہت وسیع اور حوصلے بہت بلند ہیں۔ لیکن شادی کے بعد آپ جس دن سے ڈرتے ہیں اگر وہی دن آ گئے؟ اگر آپ ٹھٹھر کر رہ گئے تو محض ایک غلطی کے باعث آپ اپنی ساری زندگی ندامت و ناکامی میں گذاریں گے آپ تھوڑی دیر کے لئے اُس ممکن تصویر کو پیش نظر رکھئے جس شخص کا مقصد ہائیکورٹ کی ججی ہے وہ ایک ماتحت عدالت کے کرانی کی حیثیت سے ذلیل زندگی گذار رہا ہے

پھٹا کوٹ، ٹوٹا جوتا، بلا پھندنے کی میلی کچیلی ٹرکی ٹوپی، گمنام، بے نشان، اپنی نظر میں آپ ذلیل، فکر معاش سے چور، افکار سے قبل از وقت بال پک گئے ہیں۔ کسی کی بات اچھی نہیں معلوم ہوتی، کوئی سیدھی بات پوچھے تو جھلا کے منھ نوچنے کو دوڑتا ہے۔

میں اپنے لئے نہیں کہتی اگر مجھے آپ کی لونڈی بننے کی عزت نصیب ہوئی تو بخدا ہر حال میں خوش رہوں گی اور آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کروں گی۔ میرے دل میں کوئی ارمان نہیں صرف محبت کی طالب ہوں اور بس۔ ؎

جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو
نظر آئے خارِ ہستی۔ گُلِ نو بہار مجھ کو "نیرنگ"

میں تو آپ کے حوصلوں سے ڈرتی ہوں۔ کہیں آپ بعد کو دُنیا میں اپنے کو ناکام سمجھ کر میری ذات کو بلا نہ سمجھنے لگیں اور مجھ سے متنفر نہ ہو جائیں۔ یہ سب آج ہی سوچ سمجھ لیں۔

آپ نے صاف جواب طلب کیا تھا اور صاف عرض کیا امید ہے کہ یہ صاف گوئی اگر ناگوار ہوئی ہو تو آپ معاف فرمائیں گے۔ والسلام

ناچیز میمونہ

محبّت کی فتح

یہ میں ضرور جانتا تھا کہ میمونہ کو عام رواج سے بہت زیادہ تعلیم دی گئی ہے مگر اس خط نے اُس کے دماغ کی جس غیر معمولی تربیت کا ثبوت دیا وہ میرے وہم میں بھی نہ تھا۔ یہ خط پڑھ کر میری آنکھیں کُھل گئیں۔ اُس کی دُور اندیشی پر عش عش کرنے لگا اب وہ خیالات میں کشمکش ہونے لگی ایک طرف میمونہ کی تقریر مستقبل کی ممکن بھیانک تصویر، دوسری طرف میمونہ کی قابلیت کا مزید ثبوت۔ اور اُس کی دماغی فضیلت کا اعتراف۔ ایک ہفتے تک میں اسی اُلجھن میں رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا فیصلہ کیجئے۔ ماضی و مستقبل جو نظر سے دور ہوتے ہیں حال پر غالب نہیں آسکتے۔ مستقبل کی تصویر

فرضی تھی اور میمونہ کی تصویر واقعی نظر کے سامنے۔ زمانۂ حال میں آپ خواہ مجھ سے اتفاق کریں یا میری عقل کا فریب کہیں، یا عمر کا اقتضا یا قوتِ فیصلہ کی کمی سمجھیں۔ میں نے اپنے آپ کو خضرِ عشق کے سپرد کر دیا۔ فیصلہ کر لیا کہ مجھے سب کچھ گوارا، مگر میمونہ کو ہاتھ سے دینا نہیں گوارا۔ میری دُنیا اور میری زندگی کی خوشی و کامیابی عبارت ہے میمونہ کی ذات سے چنانچہ میں نے اسی مضمون کا خط میمونہ کو لکھ بھیجا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایک ہفتے تک جواب کے انتظار میں وہ بھی بہت بے چین رہی تھی۔

نشیب و فراز

آخر وہ دن بھی آئے کہ میمونہ میری تھی اور میں میمونہ کا۔ سارے خیالی طلسمات اب واقعی تھے وہ اُس کی نیچی نیچی نگاہیں، ہلکا ہلکا تبسّم، شوخی میں حیا، حیا میں شوخی! دل سے تمنّائیں گھبرا کر گھبرا کر نکل پڑی تھیں۔ ایک برس تک نہ مجھے دُنیا کی خبر تھی نہ اپنی۔ خُدا جانے واقعی کوئی عالم تھا! فریبِ تخیّل! آج اُسے یاد کرتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ وہ سارے واقعات کسی مادّی دُنیا کے اور خارج از ذہن تھے۔ مگر زمانہ غم اور خوشی میں تمیز نہیں کرتا، دن گذرے، راتیں کٹیں، اور چشم زدن میں وہ گھڑیاں قصّۂ ماضی بن گئیں۔

ایک برس کے بعد وہی ہوا۔ آہ وہی ہوا جس کا دھڑکا تھا! ابّا جان کا انتقال ہو گیا اور ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ ابھی میں نے ایف اے کے دوسرے ہی سال میں قدم رکھا تھا۔ بھیّا سب رجسٹرار تھے۔ ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔ چار بچے تھے جن میں سے دو اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ کیا اپنی خبر لیتے کیا ماں کی اور کیا میری۔ یہ اُن کی محض ہمّت ہی ہمّت تھی کہ مجھ سے برابر تعلیم جاری رکھنے، اور بی اے پاس کرنے کے لئے اصرار کرتے رہے مگر مجھے اُن کی جیب پر کچھ بھی بار رکھنا گوارا نہ تھا۔ میمونہ نے مجھے مشورہ دیا کہ کوئی ملازمت قبول کر لو۔ مگر اُس وقت میری آنکھوں کے سامنے میمونہ کی وہ کھڑکی کی کھوئی ہوئی تصویر پھر قائم ہوئی جسے دیکھ کر میں لرز گیا۔ نہ مجھے یہ ذلّت گوارا تھی نہ بھائی کی اہانت۔

میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دوسرے شہر میں پہنچ کر ایف۔ اے کی جماعت سال دوم میں

شریک ہو گیا۔ پرائیوٹ ٹیوشن سے مجھے عنہ۲۰ روپے ماہوار ملنے لگے جو میرے خانگی اخراجات کے لئے کسی طرح کافی نہ تھے۔

اسی سال ہماری فکروں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ خُدا نے مجھے ایک اور ہستی کا کفیل بنا دیا۔ سُنتا ہوں بچّہ اپنی ماں کے پیٹ سے رزق لے کر آتا ہے۔ اور سچّے مومن کی حیثیت سے مجھے اس پر ایمان رکھنا چاہئے۔ مگر کاد الفقر ان یکون کفرًا واقعہ کو کیا کروں۔ ایف اے کا دوسرا سال میں نے کس مصیبت سے پورا کیا ہے؛ جو کچھ میں جانتا ہوں یا میرا خُدا۔ پاس تو کرے گیا مگر ہمت نے جواب دے دیا۔ میں جب مکان جاتا تھا تو میمونہ کی جفاکشی پر گھبرا اُٹھتا تھا۔ چلّے کا جاڑا پڑ رہا ہے بچّے کو کسی طرح لپیٹ رکھا ہے مگر خود اکہرا کُرتا پہنے، سر پر باریک ململ کا صرف آنچل ڈالے سردی سے اکڑی جاتی ہے مُنہ سے کبھی نہ نکالا کہ مجھے کیا تکلیف ہے اور کیا چاہئے بشرے کی شگفتگی اور بشاشت میں کبھی فرق نہ آیا۔ ہاں یہ دیکھا کہ گلاب سی رنگت اب چنبیلی کے پھول کی طرح سفید پڑ گئی ہے۔

مجبور ہو کر میں نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی مگر یہ اسکول ماسٹری اور چالیس روپے کی تنخواہ مجھ پر بہت شاق تھی۔ میں اپنے کو بالکل ناچیز سمجھتا تھا اپنی نظر میں آپ ہلکا تھا۔ دل بیٹھا جاتا تھا میمونہ شاید اس راز سے واقف نہ تھی وہ اب خوش تھی مطمئن تھی۔ اُس کا رنگ پھر نکھر گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نکل آئی تھی۔ میں جب گھر آتا تو اپنی حیثیت کو بھول جاتا۔ میمونہ کا بچّے کو گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے بچّے کو کلکاریاں مارتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے اب میری خوشی کئی گونہ تھی۔ مگر اُسی وقت تک جب میں گھر میں ہوتا تھا جب تک گھر سے باہر نوکری پر ہوتا تھا افسردہ دل، ناخوش، مضمحل۔

ابھی چھ مہینے ملازمت کی تھی، زندگی کا ایک ڈھرّا بندھ گیا تھا ایک گونہ اطمینان حاصل ہو گیا تھا کہ وہ پیارا بچّہ جو ماں باپ کی خوشی کا سرمایہ تھا اُسے خُدا نے لے لیا، وہی جانتا ہے کہ دیا کیوں تھا۔ اور لے کیوں لیا؟ میمونہ پر اس صدمے نے جو قیامت ڈھائی اُسے وہی ماں جانتی ہے جسے ایک بچّہ کے سوا دولتِ دُنیا سے کوئی اور حصّہ نہ ملا ہو اور وہ بھی چھن گیا ہو۔

میمونہ کی دلدہی کے لیے میں ایک ماہ کی رخصت لے کر گھر آ رہا تھا مگر اُس کی حالت میں کوئی افاقہ نہ تھا۔ سوا میرے اُس کو کسی حال اور کسی صحبت میں تسکین نہ ہوتی تھی۔ مزید رخصت کی درخواست کی، منظور نہ ہوئی، ناچار ملازمت کو خیرباد کہا۔ چند مہینوں میں اختلاج سے افاقہ ہوا تو ممانی جان "میمونہ کی ماں" اُسے اپنے گھر یعنی میمونہ کے ننہال لے گئیں۔

"طول امل"

اب جو ذرا اطمینان حاصل ہوا تو نام و نمود اور جاہ و ثروت کا خیال پھر دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ ایک مشہور شہر میں پہنچ کر ایک مشہور کالج میں داخل ہوگیا۔ ساتھ ساتھ ٹیوشنوں سے، اخبار نویسی سے اور اسی قسم کے اور ذرائع سے تیس چالیس ساٹھ روپے ماہوار اور کبھی اس سے زیادہ مہیا کر لیتا تھا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک پیسہ بھی حاصل نہ کر سکتا تھا۔

میمونہ کو میری جدائی کبھی گوارا نہ تھی اور اب زیادہ ناگوار تھی۔ مگر وہ ہمیشہ میری خوشی کو اپنی خوشی پر مقدم رکھتی تھی اور کبھی اصرار اور زور کے ساتھ مجھے میرے ارادے سے روکتی نہ تھی۔ جو کچھ اُس پر گذر جاتی تھی وہ خاموشی سے جھیل لیتی تھی۔

بی اے میں داخل ہونے کے چھ ماہ بعد خدا نے میمونہ کو اُس کی کھوئی ہوئی دولت پھر بخش دی یعنی ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اُس وقت اتفاق سے کچھ زیادہ روپے میسر آگئے، جو وقت پر کام آئے۔ غرض یوں ہی دن گذرتے تھے اور یہی اوقات ہوگئی تھی۔

جب میں نے بی۔ اے پاس کر لیا تو کوئی معقول ملازمت حاصل کر سکتا تھا۔ مگر اسٹیٹ اسکالرشپ کے اعلان نے میرے دامنِ ہوس کو اور دراز کر دیا۔ ہمارے پرنسپل کی شخصیت محکمۂ تعلیم ہند میں بڑی زبردست تسلیم کی جاتی تھی اُنھیں کے ایما سے درخواست کی سعی و سفارش اور سارے مراحل اُنھوں نے خود طے کیے اور مجھے یورپ جانے کے لئے وظیفہ مل گیا۔ میں نے میمونہ کو خط لکھا۔

میری پیاری میمونہ

تم شاید یہ خبر سُننے کو پہلے سے تیار نہ ہوگی کہ مجھے یورپ میں جدید طرز پر عربی کی تکمیل کے لئے گورنمنٹ سے اسٹیٹ اسکالر شپ عطا ہوا ہے یہ محض خُدا کا فضل ہے ورنہ لوگ جانیں لڑا دیتے ہیں اور نصیب نہیں ہوتا

مگر جو رقم گورنمنٹ سے ملتی ہے وہ یورپ کے سفر کے لئے کافی سے زیادہ نہیں اب رہا یہ سوال کہ میں تمھارے لئے کیا سامان کروں؟ میں اب تک اسے حل نہیں کر سکا ہوں کئی صورتیں ذہن میں ہیں ایک صاحب سے قرض حسنہ کی اُمید ہے بہر کیف اس کے متعلق جلد کوئی فیصلہ کر کے تمھیں مطلع کروں گا۔

اب مجھے تم سے یہ دریافت کرنا ہے کہ تم اسے کیا سمجھتی ہو؟ گو میں تمھارے خیالات سے واقف ہوں مگر تمھیں کہو کہ تم ایک پچاس ساٹھ روپئے تنخواہ پانے والے کس مپرس اسکول ماسٹر یا گھِسے ہوئے پیسے کی طرح نہ چلنے والے مفلس وکیل کی بیوی بننے میں زیادہ مسرت محسوس کروگی یا ایک ڈاکٹر آف فلاسفی کی بیوی کہلانے میں۔ جس کی تنخواہ پانسو روپئے ماہوار سے شروع ہوگی؟ کیا تم اُس وقت اپنی ہمچشموں میں فخر نہ کروگی؟ کیا اُس وقت سوسائٹی کے معزز سے معزز شخص کی بیوی تم سے ملنا اپنی عزت نہ سمجھے گی۔

بیشک محبت دُنیا کی بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی دولت ہے۔ مگر میری جان جاہ و ثروت بھی دُنیا کی بہت بڑی اور جائز لذت ہے۔ اور اگر حاصل ہو سکے تو ہم لوگ اس خوشی سے کیوں محروم رہیں اور اپنی موجودہ خوشی پر اضافہ کر سکیں گے تو کیوں نہ کریں؟ محبت ایک معشوق ہے مگر سادہ عُریاں، جاہ و ثروت اُس کا لباس و زیور ہیں۔ معشوق عاشق کی نظر میں ہر حالت میں پیارا معلوم ہوتا ہے مگر لباسِ فاخرہ اور زیور سے آراستہ ہو تو کیا کہنا!

تمھارا یوسف

ہمیں صرف محبت چاہیئے

میرے سرتاج .... خدا آپ کی مرادیں پوری کرے

مجھ کو یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو یورپ جانے کے لئے سرکار سے وظیفہ ملا ہے۔ آپ کے ارمانوں کی اُس معراج پر آپ کو دل سے مبارکباد دیتی ہوں۔

بسفر رفتنت مبارک باد بسلامت روی و باز آئی

میرے متعلق آپ تردد نہ کریں۔ پانچ برس جس طرح کٹ گئے اُسی طرح یہ چند سال بھی کٹ جائیں گے۔ اگر کچھ تکلیف بھی ہوگی تو آپ کی آیندہ کامیابی کے خیال سے ہلکی ہوجائیگی اور آپ کی دوبارہ ملاقات رہا سہا رنج وغم بھلا دے گی۔

آپ نے جو سوالات مجھ سے کئے ہیں اُن کے جوابات جو کچھ میں رکھتی ہوں آپ کو پہلے سے معلوم ہیں میں کبھی عرض کرچکی ہوں اور شاید میرے طرزِ عمل سے بھی آپ کو میرے اس خیال کا عملی ثبوت مل گیا ہوگا کہ میرے لئے دس بیس۔ سو پچاس اور ہزار پانسو اُس وقت تک سب یکساں ہیں جب تک ہمارے متاعِ محبت میں کوئی کمی نہیں جب تک ہم میں پیار کرنے اور پیار کئے جانے کی یکساں قابلیت موجود ہے جب تک آپ ہماری نظر کے سامنے ہیں اور میں آپ کی۔ ؎

جو ہو مجھ سے پیار تم کو۔ جو ہو تم سے پیار مجھ کو
نظر آئے خارِ ہستی۔ گُلِ نو بہار مجھ کو (نیرنگ)

میں ہرگز ایسی تقدیر پر راضی نہیں ہوسکتی جو مجھے کل ساری دُنیاوی دولتوں کا وعدہ کرکے آج آپ کو ہم سے چھڑائے جائے۔

محبت اور جاہ و ثروت، اجتماعِ ضدّین، جاہ و ثروت بجائے اُس کے کہ محبت کا لباس و زیور ہو، اُس کے خون کا پیاسا دُشمن ہے۔ قدرتی محبت ہر تکلف و تصنّع سے پاک یعنی عُریاں ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ قدرت خود عُریاں ہے اور سچا عاشق اسی حالت کو پسند کرتا ہے خالص و معرّیٰ محبت اور جاہ و ثروت سے آراستہ محبت میں وہی فرق ہے جو ایک اصلی گُلاب، اور گُلاب کی ریشمی و زرتار تصویر میں۔ مجھ کو اصلی گلاب، خالص و عُریاں

محبت چاہیے۔ مجھے اپنا سادہ، معزا یوسف، میرا پیارا شوہر درکار ہے ڈاکٹر یوسف پی، ایچ ڈی، بیرسٹرایٹ لا وغیرہ وغیرہ کی مجھے حاجت نہیں وہ تصوّر میں مجھے نامحرم سے مرد معلوم ہوتے ہیں میں نے آج سوسائٹی کا کیا گناہ کیا ہے کہ معزز سے معزز خاتون سے آنکھیں چار نہ کرسکوں ؟ یہی نا کہ مجھے دُنیاوی دولت حاصل نہیں ؛ نہ سہی! میں کب پروا کرتی ہوں ؟ میری جوتی کو کیا پڑی ہے کہ سوسائٹی میں گھُسنے جاؤں۔ جب تک مجھے محبت کی دولت حاصل ہے۔ جب تک میرا دامنِ اخلاق صاف و بے داغ ہے میں کبھی کسی کے آگے اپنے کو حقیر نہیں سمجھ سکتی۔

آپ مجھ سے ناحق مشورہ چاہتے ہیں زندگی کے متعلق میرا نقطۂ نظر اور ہے۔ آپ کا اور آپ کی نظر کے سامنے ایک غیر محدود دُنیا اور اُس کی لامتناہی لذتیں ہیں جو دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں مگر میرے سامنے صرف ایک محدود دُنیا ہے جو غیر محدود لذت کے ساتھ۔ جو دُنیا کی ساری لذتوں پر غالب ہے، وہ ہماری محبت کی دُنیا ہے۔ ہم دونوں کی دُنیائیں جُدا جُدا ہیں آپ میری دُنیا کے مزے سے ناآشنا ہیں آپ کی دُنیا سے بے نیاز۔ لہٰذا آپ جائیں اور خوشی سے جائیں مگر خُدا کے واسطے اس پر مجھ سے صاد نہ بنوائیں۔

اگرچہ آپ کو خوشی سے رُخصت نہیں کرسکتی مگر رخصت ضرور کروں گی یہ آپ کا ارمان، آپ کا مقصد، آپ کی خوشی ہے۔ اور آپ کی خوشی میرا ارمان، میرا مقصد اور میری خوشی ہے" داؤد آداب کہتا ہے"۔

آپ کی میمونہ

اس لڑکی کا فلسفہ مجھ کو ہمیشہ عاجز ہی کرتا رہا۔ اس خط نے میری قوتِ فیصلہ میں پھر ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ خط نہ تھا فردِ قرارِ دادِ جُرم تھی، مجھ پر سرکارِ محبت سے بیوفائی، سرد مہری، سست عہدی، اور ہوسناکی کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ مجھ کو ملامت کی جارہی تھی۔ مجھ پر نفریں کر رہا تھا۔ کون ؟ میرا دل! گھبرا کر میں نے آنکھیں بند کرلیں چشمِ تصوّر کھُل گئی۔ میمونہ ایک کرسی پر اُداس بیٹھی ہے۔ میں اُس کے سامنے سر جھکائے

کھڑا ہوں، اور کہہ رہا ہوں کہ "میمونہ! تیرا الزام بجا ہے۔ میں تیری محبت کا سزاوار نہیں۔ تیرا ایسا پاک دل میرے پاس نہیں۔ پھر تیرے سے پاک جذبات مجھے کہاں سے میسر آئیں! ...... معاف کر پیاری میمونہ! مجھے یوں نہ دیکھ۔ لے میں ولایت کے خیال سے باز آیا۔ ہاں اب مُسکرا اور مجھے بیٹھنے کا حکم دے۔"

میں یکایک چونک گیا۔ تھوڑی دیر میں پھر دریائے خیال میں غوطے لگانے لگا۔ "لیکن میمونہ بھی عورت ہے۔ عورت صرف جذبات لطیف سے معمور رہتی ہے۔ اُس کا حوصلہ تنگ ہوتا ہے۔ اُس کی خوشی کا دائرہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ مرد فطرۃً اُولوالعزم ہوتا ہے اس میں کسے کلام ہوسکتا ہے کہ انسان اس کشمکش حیات میں اپنی عزیمت، ہمت اور قوۃ ارادی ہی سے غلبہ حاصل کرتا ہے؟ یہ مردانہ صفات ہیں جُرم نہیں، گناہ نہیں۔ میمونہ کا فلسفہ اگرچہ بجائے خود بہت زبردست ہے مگر عملی نہیں۔ مگر دوسروں کو وہ خیالی معلوم ہو تو ہو وہ خود اس پر عمل ہے اُس کا مقصدِ زندگی اُس کا مذہب بلکہ خود اس کی زندگی محبت ہے" میں خیالات کی اسی کشمکش میں مبتلا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔

رُخصت

مکان آیا۔ میمونہ سے اپنے ارادے کا تذبذب ظاہر کیا مگر خود اُس نے مجھے جانے کے لئے مجبور و ناچار کر دیا۔ میرے سفرِ یورپ کی خبر اب طشت از بام ہوچکی تھی۔ بھائی بھی مجھے رخصت کرنے کو مکان آگئے اور وہ میری غیر حاضری میں پچیس روپے ماہوار میمونہ کو دینے پر مصر ہوئے۔ میں کسی طرح انکار نہ کرسکا اور سوا قبول کرنے کے چارہ ہی کیا تھا۔ اور کوششیں ناکام ہوچکی تھیں۔ میمونہ کو یہ امانت بہت ناپسند تھی مگر وہ میری خاطر سب کچھ گوارا کرتی تھی۔

ماں سے رخصت ہوا۔ بھائی اور بچوں سے ملا داؤد کو پیار کیا۔ مگر میمونہ کا زرد چہرہ اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر میرا دل مَسَل گیا۔ آنکھیں چار ہونا تھیں کہ اُس کے آنسو جنھیں ضبط سے وہ آنکھوں میں چھپائے تھی۔ ایک بار ٹپک گئے۔ وہ کھڑی تھی۔ مگر تلملا کر بیٹھ گئی۔ میں نے سنبھالا۔ تھوڑی دیر میں اُس نے خود اپنے کو سنبھالا اور کہنے لگی۔ "میری خطا معاف

فرمائیے گا میں ہمیشہ آپ کی پُر حوصلہ زندگی میں خارِ دامن بنی رہی۔ آپ میری بدولت ناشاد رہے میری خطائیں معاف فرمائیے گا۔ میں نے اپنا مہر آپ کو معاف کیا!

اس وقت وہ سراپا استقلال تھی۔ آنسو خشک تھے۔ ہونٹھ اور سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میری زبان بند ہوگئی۔ حواس پراگندہ ہوگئے۔ ریل کا وقت تنگ اعزّا باہر منتظر کھڑے تھے۔ بھائی پکار رہے تھے۔ میں نے اپنے کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور اس درد سے رخصت ہوا جس کی ٹیس آج تک سینہ میں موجود ہے۔

گُلاب کا پھول

ولایت جانے کے چھ ماہ بعد ایک اور بچّے کی ولادت کی خبر آئی۔ پھر اس کے پانچ مہینوں کے بعد مجھے میمونہ کا یہ خط ملا۔ ؎

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دَم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

میرے گلشنِ محبت کی بہار!

کھوئی ہوئی دولت کا واپس ملنا آسان ہے نام ونمود اور جاہ و عزت کا حاصل کرنا سہل ہے۔ مگر جوانی کے گذرے ہوئے گھنٹوں کا واپس آنا ناممکن۔ عورت کی زندگی گلاب کا پھول ہوتی ہے۔ خوشنما مگر مختصر۔ پھول نہ کھِلنے میں کسی کا منتظر ہوتا ہے نہ کھِل کر مُرجھانے میں کسی کی خاطر دیر کر سکتا ہے نہ مُرجھائے ہوئے پھول کو کوئی طاقت کھِلا سکتی ہے جو پھول کی بہار لوٹنا چاہتا ہے وہ اُس کی شگفتگی پر نظر رکھتا ہے پھول جب تک کھِلا رہتا ہے گلدان نظر کے سامنے میز پر دھرا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کبھی دیکھنے والے کی مہلت کا انتظار نہیں کرتا۔

میری زندگی تمام ہونے کو ہے اس مختصر سی زندگی میں پھول کی طرح کھِلی تو ضرور مگر مشتاق آنکھوں سے دور، اور قدرداں ہاتھوں سے محروم۔ یہ نامرادی اور بھی قبل از وقت پژمردہ اور خشک کئے دیتی ہے۔ شادی کو آج چھ برس ہوئے مگر مشکل سے چھ مہینے بھی

مسلسل آپ کی صورت دیکھی۔ مرد ایک سر سبز سرو ہے۔ سدا بہار۔ ہمیشہ ترو تازہ۔ آپ تو اس خیال میں رہے کہ ابھی بہت وقت ہے مگر مجھے یہ ڈر کہ جب مُرجھا نہ جاؤں اور یہی ہوتا نظر آتا ہے۔

میرے پیارے شوہر! آپ کی دولت، آپ کی ثروت، آپ کی شہرت، آپ کی عزّت آپ کو مبارک! اگر میں زندہ بھی رہی تو کیا! آپ کی شادمانی و کامرانی سے لذّت اُٹھانے کی قابلیت باقی رہی نہ آپ کی شریک خوشی ہو کر آپ کی خوشی میں اضافہ کرنے کی لیاقت ؎

بعد میرے کیوں نوید وصل یار آنے کو تھی
وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں بہار آنے کو تھی

جب سے اسحاق پیدا ہوا ہے میں ایک روز بھی اچھی نہیں رہی مس بروک نے کہدیا ہے کہ زچگی کا بخار ہے اور بہت مخدوش ہے۔ بہت مخدوش ہوگئی ہوں جسم میں خون کا نام نہیں۔ آثار اچھے نہیں ہیں آپ کے تردد کے خیال سے اب تک آپ کو مطلع نہ کیا اپنی فکر نہیں، بچے تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔ داؤد کو کھانسی ہے اور اسحاق کو دودھ نہیں ملتا۔ بھیا نے دو مہینے سے روپے نہیں بھیجے ہیں اور خوب کیا نہ بھیجا، میں کب چاہتی تھی کہ بھیجیں۔ صرف یہ دُعا ہے کہ خُدا آپ کو کامیاب کرے اور بچوں کو اپنی امان میں رکھے۔ ایک آرزو اور تھی مگر وہ پوری ہونے والی نہیں۔

آرزو یہ ہے کہ نکلے دَم تمھارے سامنے
تم ہمارے سامنے ہو ہم تمھارے سامنے

آپ کی جاں نثار۔ میمونہ

یہ خط پڑھ کر فوراً بھائی کو تار دیا اور ایک مفصّل خط میں خوب دل کا بخار نکالا۔ جواب تشفّی بخش تھا۔ بھیا نے روپیہ نہ بھیجنے کا معقول عذر بتایا۔ دو گذشتہ دو آیندہ جملہ چار مہینے کے سو روپے یکمشت میمونہ کے حوالے کرنے کی کیفیت لکھی۔ میمونہ کے دوسرے مختصر خط سے بھی روپوں کی رسید اور اطمینان کا حال معلوم ہوا میں کچھ مطمئن تو ہوگیا مگر طبیعت

متردد ہوگئی وہ ذوق و شوق کامیابی کا باقی نہ رہا۔

اب کوئی سنگ راہ نہیں

میں برلن میں تھا اور پی ایچ۔ڈی کی تیاری کر رہا تھا کہ بھائی کا تار آیا۔ تار کیا آیا مجھ پر بجلی گر پڑی۔ میں بُت کی طرح بے حس و حرکت تھا۔ مجھ کو خبر نہیں۔ مجھ پر کیا کیا گذری۔ میرے قوائے ذہنی معطل ہو گئے تھے۔ کیسی ڈگری اور کہاں کی کامیابی بائیسویں روز میں اپنے غمکدے کے دروازے پر تھا۔ اماں مجھے سینے سے لگا کر رونے لگیں۔ اُن کے آنسو دلسوزی سے ضرور نکلتے تھے مگر اُن میں ہمدردی کی جھلک نہ تھی۔ ان کو میرے غم اور درد کا احساس رُلاتا تھا۔ مگر دل اُس ہمدرد کو ڈھونڈتا تھا۔ جو میمونہ کے لئے میرے ساتھ روئے۔ میرے آنسو دیکھ کر آنسو نہ بہائے۔ دُنیا میں ایسا ہمدرد کوئی نظر نہ آتا تھا۔ ہاں اُس وقت میرے بچے یاد آئے۔ پدری جوشِ محبت اگر کوئی چیز ہے تو اُس کی حس مجھے اُسی وقت ہوئی۔ بچوں کو پوچھا "معلوم ہوا کہ بھابھی اُن کو اپنے ساتھ لے گئی ہیں بھیا کا مکان اسٹیشن سے دو گھنٹے کی راہ ہے۔ میں اُسی وقت چل کھڑا ہوا۔ اب تک غم کی آگ میرے دل میں سُلگ رہی تھی۔ آنسو خشک تھے۔ بچوں پر نظر پڑنا تھی کہ تابِ ضبط نہ رہی۔ فرش پر بیٹھ گیا۔ اور بچوں کو گود میں بٹھا کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ اتنا رویا کہ عمر بھر کبھی نہ رویا ہوں گا۔ داؤد تتلا تتلا کر کہنے لگا "اماں اللہ میاں کے گھر گئی ہیں اور اب تک نہیں آئیں! اور رونے لگا۔

"آہ میمونہ! بیشک تیرا فلسفہ صحیح تھا۔ میری جاہ طلبی ہرگز اولوالعزمی نہ تھی فرض فراموشی تھی۔ حق تلفی تھی۔ ستم شعاری تھی، بے ایمانی تھی! بیشک تو گُلاب کا پھول تھی میں نے تجھے پامال کر دیا۔ تیرا شجر جوانی آبِ محبت کے بغیر سوکھ گیا۔"

رات کو بستر پر پڑا پڑا دیکھتا ہوں کہ میمونہ وہی کپڑے پہنے ہوئے کھڑی ہے جو مجھے ولایت رُخصت کرنے کے وقت پہنے تھی۔ تھرائی ہوئی آواز سے کہہ رہی ہے۔ "آپ کی خاطر میں راستہ سے ہٹ گئی" اب تامّل کیا ہے؟ جہاں چاہیں شوق سے جائیں۔ اب آپ کی

منزل میں کوئی سنگِ راہ نہیں" یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی میں گھبرا کر میمونہ میمونہ پکارنے لگا بھائی نے شانہ پکڑ کر ہلا دیا۔ آنکھیں کھلیں تو کچھ نہ تھا، ایک فرشتہ مجھ پر لعنت کر کے غائب ہو گیا۔

ع اے وائے نامُرادی! اے وائے نامرادی

دردِ محبّت

کیسا ہی شدید و قیامت خیز حادثہ ہو، ہر ایک رات کوہِ غم کی ایک چٹان سینے سے ہٹا دیتی ہے یہاں تک کہ ایک دن غم ہٹ جاتا ہے، جس سانحے کا خیال وقوع کے قبل دِل ہلا دیتا ہے، جس کا حدوث قیامت اور موت کے مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے وہ آخر کار ایک معمولی بات رہ جاتی ہے اور پھر فراموش ہوجاتی ہے، میری ماں، بھائی یا اور احباب واعزا اگر آج دس برس سے شادی شادی کی رَٹ لگا رہے ہیں تو وہ بالکل بے قصور ہیں۔ اُن کا تقاضا فطرت کا تقاضا ہے جس پر دُنیا عامل ہے۔ مگر کاش ان چارہ سازوں کو معلوم ہوتا کہ ہر مرض علاج پذیر نہیں ہوتا۔ ایسا درد بھی ہوتا ہے جسے زمانہ کبھی مٹا نہیں سکتا۔ ایسے غم بھی ہوتے ہیں جس کے لئے کوئی مرہم نہیں۔ ایسا صدمہ بھی ہوتا ہے جسے مرورِ ایام ہلکا نہیں کرسکتا! کاش یہ مُدعیانِ دوستی و دلنوازی اتنا سمجھتے کہ اس کا لطف میرے حق میں ایک ناقابلِ برداشت ستم ہے!

شادی کا ذکر؟ شرک فی المحبتہ؟ اس سے بڑھ کر محبت کی اور کیا اہانت ہوسکتی ہے؟ جس نے میری محبت میں جان نثار کر دی! کیا میں اتنا بھی نہ کروں کہ جب تک جیوں اُس کی محبت کی حرمت قائم رکھوں!

اُف ری کمبخت ہوسِ جاہ! نتیجہ آخر وہی ہوا کہ میں ایک اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں اور اُس اسسٹنٹ ماسٹری کی زندگی کو روتا ہوں جس پر اگر قناعت کرتا تو آج دُنیا میں شاد و بامُراد ہوتا۔ گھوم پھر کر وہی زندگی اختیار کرنا پڑی مگر محبت کا خون کر کے۔

وہ راتیں اور یہ راتیں

ایک وہ راتیں تھیں جو شادی کے قبل میمونہ کے دھیان میں بسر ہوتی تھیں چمنستان

امید و تمنا پیشِ نظر رہتا تھا۔ حسرتوں کا تلاطم تھا۔ ایک وہ راتیں تھیں۔ جب میں اسکول کی ملازمت کی چھٹیوں میں مکان آتا تھا اور ساری ساری رات باتوں میں گذر جاتی تھی اذان کی آواز ہم دونوں کو چونکا دیتی تھی اور دیر تک ہمیں صبح ہونے کا یقین نہ آتا تھا۔ ایک وہ راتیں تھیں جو اگرچہ ویسی پُرلطف نہ تھیں مگر آیندہ عظمت و اعزاز اور نام آوری کے خوابِ شیریں میں بسر ہوتی تھیں۔ ایک یہ راتیں ہیں! آہ یہ راتیں! اُداس، بھیانک، وحشت خیز! اگلی تمنائیں مایوسیوں سے مبدّل ہیں۔ حسرتیں مُردہ پڑی ہیں! لذّتِ شوق اور ذوقِ دیدار کی یاد تلخکام کر رہی ہے۔ جاہ و ثروت کا خیال اب خوابِ شیریں نہیں بلکہ ایک پریشان اور ہولناک وہم ہے!

اِک ٹیس سی جگر میں اُٹھتی ہے اِک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اُٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

ایک ہونہار، باحوصلہ، بلند ہمت، اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان دُنیا میں گمنام و ناکام، تلخ زندگی بسر کر رہا ہے اور صرف ایک غلطی کی بدولت! دو مختلف النوع خواہشوں میں غلطِ مبحث، جاہ و ثروت کی آرزو کی تھی تو محبت کا نام اُس وقت تک لینا نہ تھا۔ جب تک وہ پوری نہ ہو جاتی اور اگر محبت (جو کبھی وقت اور موقع نہیں دیکھتی) کے حلقہ بگوشوں میں داخل ہونا تھا تو جاہ و ثروت کا طوق گلے سے توڑ پھینکنا تھا۔ ؎

ہم خُدا خواہی و ہم دُنیائے دُوں   ایں خیال است و محال است و جنوں

آہ یہی حقیقت تھی جس کی طرف میمونہ نے اپنے شاعرانہ طرز میں مجھ کو بار بار توجہ دلائی مگر میں متنبہ نہ ہوا۔

مرحومہ کی صرف دو نشانیاں ہیں جو کسی وقت تسکین بخشتی ہیں اور کبھی بے چین کرتی ہیں۔ وہ میری اولاد ہیں۔ لڑکی تو ماں کی مجسّم تصویر ہے اور میں کسی وقت اُس کا نظر سے اُوجھل ہونا گوارا نہیں کرتا۔

آج میری عمر پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ کے درمیان ہے، مگر میں پچاس پچپن برس کا بوڑھا معلوم ہوتا ہوں اور اس بے وقت بوڑھاپے سے بدل راضی و ممنون ہوں جو مجھے روز بروز میمونہ سے قریب تر کرتا جاتا ہے۔

تصویرِ محبّت

عبدالباری محمد ساقی)

(۱)

مرشد آباد کے ضلع میں ایک قصبہ متھلا واقع ہے۔ ہندو راجاؤں کے وقت میں یہاں تجارت کی بہت بڑی منڈی تھی۔ طوفان حوادث کے تھپیڑوں نے اس کی گذشتہ عظمت و شکوہ کو بہت کچھ برباد کر دیا۔ پھر بھی بنگالہ کے دوسرے قصبوں سے یہ زیادہ آباد و سرسبز ہے۔ چند مکاتب اور پادریوں کا اسکول بھی ہے۔

موتی لال گھوش اسی قصبہ کا باشندہ تھا کپڑے کی ایک چھوٹی سی دوکان اس کی بسر اوقات کا ذریعہ تھی۔ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ گھوش بابو اپنی اِس مختصر آمدنی میں کیونکر فراغت و اطمینان سے بسر کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ گھوش بابو اور ان کی بیوی دونوں نہایت سلیقہ مند تھے۔ خُدا کے فضل سے تین لڑکے بھی تھے۔ بڑے اور منجھلے رنگون میں کسی تاجر کی دوکان پر ملازم ہو گئے تھے۔ چھوٹا لڑکا موہن نامی پادریوں کے اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ اور اپنی محنت و ذکاوت کے سبب پادری صاحب کو بہت عزیز تھا۔

بچپن سے موہن کو تصویر کشی کی طرف خاص میلان تھا۔ شفیق پادری نے اس کے فطری مذاق کی تکمیل کا تمام ضروری سامان مہیا کر دیا تھا۔ موہن ذوقِ مصوری میں روشنائی و پنسل کا محتاج نہ تھا۔ گیلی مٹّی سے بھی طرح طرح کی دلکش مورتیں بنا لینے پر قدرت تھی۔ کبھی ریشم یا مخمل کے کپڑوں پر کشیدہ کاری کے ذریعہ دیدہ زیب نقش و نگار پیدا کرتا۔

(۲)

موہن اب انٹرنس پاس کر چکا تھا۔ ایک دن گھوش بابو اپنی بیوی سے کہنے لگے کہ "موہن کب تک گھر بیٹھا رہے گا۔ ہم اب چراغِ سحری ہیں۔ آج ہیں کل نہیں۔ اب اس کو کسی روزگار

میں لگ جانا چاہیئے۔"

بیوی۔ (بات کاٹ کر) بڑے اور منجھلے کی طرح اس کو بن باس کرنے سے تو میں رہی۔ یہ لاکھ برس مجھ سے نہ ہوگا۔ یہیں کوئی نوکری مل جائے تو خیر۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ موہن دوڑا ہوا میرے پاس ایک اخبار کا کاغذ لئے ہوئے پہنچا اور کہا "کلکتہ میں سرکار کی طرف سے ایک نمائش ہونے والی ہے اس میں قلمی تصویریں اور ریشم پر گلکاریوں کے نمونے بھی طلب کئے گئے ہیں۔ بہترین تصویر کے لئے دس ہزار روپیہ کا انعام ہے۔"

گھوش بابو۔ کیا تم کو اپنی تصویریں بھیجنے کا خبط ہوا ہے۔ ایسا ہرگز نہ کرنا ایک سے ایک تصویر نمائش میں آئے گی۔ ملک کے بہترین مصوّر اپنی جودت طبع کا جوہر دکھائیں گے ــــ تمھاری تصویر کو وہاں کون پوچھے گا؟

یہ کہہ کر گھوش بابو چلے گئے لیکن یہ حوصلہ فرسا الفاظ موہن کے خرمن اُمید پر بجلی بن کر گرے ــــ وہ ایک گوشہ میں افسردہ ہو کر بیٹھ گیا ــــ ماں نے اس کی پیشانی کی شکنوں سے اس کے دلی حزن و ملال کو تاڑ لیا۔ مامتا سے مجبور ماں نے موہن کی ہر طرح دل دہی کی اور اس کو تصویریں بھیجنے پر آمادہ کیا ــــ موہن کا پژمردہ دل ماں کی حوصلہ افزا باتوں سے کھل گیا ــــ اس کا چہرہ فطری مسرّت سے چمک اُٹھا ــــ اور بے اختیار ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر بولا۔

"میری اچھی ماں تصویروں میں بیل بوٹے کاڑھنے کے لئے اعلیٰ قسم کے رنگوں کی ضرورت ہوگی۔ دس روپئے اُٹھیں گے۔ کیا تم مجھے دوگی؟

ماں فوراً کوٹھری سے دس روپیہ کا نوٹ لے آئی اور موہن کو دے کر کہا "دیکھو بیٹا گاڑھے پسینے کی کمائی کا یہ روپیہ ہے، دھیلا دھیلا کر کے جمع کیا تھا کہ عمر کے آخری حصہ میں زندگی کا سہارا ہو ایشور تم کو کامیاب کرے۔"

ماں کی اس گفتگو سے وہ بہت متاثر ہوا اور روپیہ کو واپس کرنا چاہا۔ مگر۔ ماں کے اصرار پر اُس نے لے لیا اور بازار سے ضروری سامان خرید لایا سات دنوں کی شبانہ یوم محنت

کے بعد اعلان کے مطابق تصویر تیار کر کے نہایت احتیاط سے مہتمم نمائش کے پاس بھیج دی۔

(۳)

نمائش کے افتتاح کو اب صرف دس روز رہ گئے ہیں۔ موہن کا دل نتیجہ کے انتظار میں مضطرب ہے۔ کبھی اُمید کا درخشاں خیال اُس کے چہرے کو شاداب و شگفتہ بنا دیتا ہے کبھی یاس نا اُمیدی کے ہولناک تصور سے اس کی صورت پژمردہ ہو جاتی ہے۔ اِس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ والدین کی اجازت لے کر موہن خود کلکتہ جانے کے لئے مستعد ہو گیا تاکہ نتیجہ کے انتظار کی زحمت سے محفوظ رہے اور دوسرے اُمیدواروں کی تصویروں کے حُسن و قبح کا بھی معائنہ کرے۔

موہن نے سفر کے لئے ایک کمبل، ایک مشکیزہ، ایک سفری بیگ جس میں کچھ ناشتہ اور دو جوڑے کپڑے تھے ساتھ لیا۔ ماں نے چلتے وقت دس روپیہ بھی دیدیئے تھے۔ موہن اپنی غربت کے سبب پیادہ پا ہی روانہ ہوا۔ پانچ روز کے بعد کلکتہ کے قریب پہنچ گیا۔ راستہ کی تھکن مٹانے کے لئے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ قریب ہی پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک ضعیف شخص افسردہ اور مضمحل صورت بنائے بیٹھا تھا۔ گندمی رنگ، گداز جسم، لبوں پر معصومانہ تبسم، میانہ قد کی ایک لڑکی اس کے پاس ہی کھیل رہی تھی عمر شاید تیرہ چودہ برس کی ہو۔ اگرچہ ضعیف شخص کہنہ و بوسیدہ کپڑے میں تھا لیکن اس کے چہرے سے شرافت اور خاندانی اعزاز کی تمکنت ظاہر تھی۔ موہن نے ہمدردی کے لہجہ میں ضعیف شخص کے قریب جا کر پوچھا کہ ”شاید راستہ کی ماندگی سے آپ نڈھال ہو گئے ہیں“۔

ضعیف شخص:۔ ”بیٹا صرف ماندگی ہی نہیں بلکہ بھوک کی تکلیف نے بھی مضمحل کر دیا ہے۔“

باپ کی یہ بے محابا گفتگو لڑکی کو پسند نہ آئی اُس نے باپ کے گلے میں پیار سے بانہیں ڈال کر کان میں آہستہ سے کہا ”پتا جی اجنبی آدمی ہے کیا کہے گا؟“ —— موہن نے جس کا دل دوسروں کی خدمت و محبت کے لئے بے چین رہتا تھا فوراً اپنے سفری بیگ سے ناشتہ کی چیزیں نکالیں۔

موہن:۔ آپ اس کو تناول فرما کر مجھ کو شکریہ کا موقع بخشیں۔

ضعیف شخص:۔ تمھاری اس مہربانی کا خُدا تم کو اجر دے۔

موہن:۔ کیا میں آپ کے نام جاننے کی عزت حاصل کر سکتا ہوں۔

ضعیف شخص :۔ بیٹا میرا نام اندر دیو ہے اور یہ یتیم لڑکی میری پوتی ہے اور اس کا نام سُندر ہے۔

تینوں ناشتہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں موہن پانی لانے کے لئے چلا گیا اُس کے جانے کے بعد دور سے ایک شخص گھوڑے پر آتا نظر آیا۔ گھوڑا جب قریب آیا اندر دیو اور سُندر نے اسے پہچان لیا۔ سوار بھی ان لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

سوار :۔ اندر دیو تم یہاں کہاں۔ تمھاری صورت ضعیفی وافلاس سے کیسی پژمُردہ ہو گئی ہے۔ تمھارا لبادہ بھی سفر کرتے کرتے مَیلا ہو گیا ہے۔ کہاں جانے کا ارادہ ہے۔"

اندر دیو :۔ راجہ صاحب! زندگی کا سہارا ڈھونڈھنے نکلا ہوں۔ کلکتہ میں میرے ایک عزیز رہتے ہیں وہیں جاؤں گا۔

اندر دیو کی تکلیف دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ کچھ مدد کرنے کے خیال سے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کہیں چھوٹے سکّوں کے علاوہ کوئی قیمتی سکّہ نہ نکل پڑے۔ دیر تک ہاتھ جیب ہی میں رہا۔ اس اثنار میں موہن پانی لے کر پہنچ گیا۔ موہن کی صورت دیکھ کر راجہ صاحب کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اور موہن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

راجہ :۔ یہ لونڈا کہاں سے ساتھ ہوا۔ یہ تو متھلا کے بزاز کا لڑکا ہے اس کی ذہانت کی تعریف میں نے بھی سُنی اور پادری صاحب کے گھر پر اس کو اکثر دیکھا ہے۔ پہلے اس کو اتنا بیہودہ نہ سمجھتا تھا۔ تمھارے پیچھے کب سے لگا..... اچھا رُخصت۔"

سُندر جو پاس ہی کھڑی تھی اس آخری جُملہ کے کنایہ کو کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی۔ مگر شرم اور غصّہ سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ موہن بھی راجہ کی اِس بے محل گفتگو کا مطلب سمجھ نہ سکا وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیا ایک مجبور مفلوک الحال ضعیف شخص کی خدمت کرنی کوئی گناہ ہے۔ وہ راجہ صاحب کو پہچانتا تھا۔ متھلا کے پاس ایک گاؤں ہے وہیں کا یہ رہنے والا ہے۔ بے ایمانی اور مکر کی بدولت اُس نے ایک کثیر دولت فراہم کر لی ہے۔ اور حُکّام کو دعوتیں دے کر راجہ کا خطاب بھی حاصل کر لیا ہے مشہور تو یوں ہے کہ اُس نے کسی بیوہ عورت کے لاکھوں کا سرمایہ ہضم کر لیا ہے اِس نے سچ کہا تھا کہ پادری صاحب کے یہاں اکثر موہن سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کو حیرت تھی کہ کیوں

ایسے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے وہ اسی سوچ میں تھا کہ اندر دیو نے سکون کو توڑا۔

اندر دیو: بچے خدا تم کو خوش رکھے۔ تمھاری روٹیوں سے زیادہ تمھاری محبت واخلاص نے مجھ کو تازہ دم کر دیا۔ اچھا اب چلو شہر تک ساتھ چلیں۔

یہ کہہ کر تینوں نے اپنا مختصر سامان درست کیا اور روانہ ہو گئے۔ کلکتہ شہر میں جب داخل ہوئے اندر دیو نے موہن کو مخاطب کر کے کہا۔ "بیٹا اب ہم اس طرف جائیں گے اور تم کو اس طرف جانا چاہیے۔ یہاں سے ایک میل پر نمائش گاہ کی تعمیر ہوئی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

موہن ان سے رخصت ہو کر نمائش کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ دور نکل جانے کے بعد اُس کو خیال آیا کہ اُس نے ان کا پتہ نہ پوچھا۔ کہاں گھر ہے؟ کہاں جائیں گے؟ پھر ملاقات ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اپنی اس غلطی پر موہن کو بہت افسوس ہوا۔

نمائش کے قریب پہنچ کر ایک وسیع و سربفلک عمارت کے دروازہ پر ایک تختی نظر آئی جس پر "مہتمم نمائش" لکھا ہوا تھا۔ وہ اس دروازے کے پاس رُک گیا۔ موہن کے پاس مہتمم نمائش کا دعوت نامہ موجود تھا۔ آدمیوں کی کثرت اتنی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے وہ اسی انتظار میں کھڑا رہا کہ بھیڑ چھٹ لے تو اندر جائے مگر لوگوں کی کثرت بڑھتی ہی گئی۔ ناچار آدمیوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا کسی طرح دروازہ کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں سُندر اور اس کا باپ نظر آیا۔ موہن نے بے تابانہ سُندر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "تم کیسے آئیں؟ اچھا ہوا آگئیں۔ کیا تم کو اپنے رشتہ دار کا مکان نہ ملا؟

سُندر:۔ (معصومانہ سادگی سے) نہیں اُن کا مکان تو ملا مگر وہ باہر گئے ہوئے تھے ملازموں نے ہم لوگوں کو نہیں پہچانا وہ بھی شاید یہیں آئے ہیں۔ (اندر دیو سے) دیکھو ان سے ملاقات ہو گئی۔

موہن نے اپنا ٹکٹ دکھلا کر اندر دیو اور سُندر کو ساتھ لے کر جانا چاہا مگر دربان نے یہ کہہ کر روک دیا کہ آپ تنہا جا سکتے ہیں غیر متعلق لوگوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔

موہن:۔ دعوتی رقعہ میں ہم کو تین آدمیوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہے۔

دربان:۔ یہ دونوں تمھارے ساتھی نہیں ہیں۔ یہ تو ابھی ملے ہیں۔

موہن :- اگر یہ لوگ جانے نہ پائیں گے تو ہم بھی نہ جائیں گے۔

دربان :- کیا کریں مجبوری ہے۔

سُندر :- آپ ہم لوگوں کے لئے ناحق تکلیف نہ کریں۔

موہن نے سُندر کا جواب دیئے بغیر بہ آواز بلند مہتمم کو پکارنا شروع کیا۔ غُل سُن کر اندر سے ایک شخص آیا اور اس نے شور و ہنگامہ کی وجہ پوچھی۔

موہن :- عالی جناب! میرا نام موہن ولد موتی لال گھوش ہے میں نے چند تصویریں نمائش میں بھیجی ہیں میرے نام مہتمم نمائش کا ایک دعوتی رقعہ بھی ہے۔ آپ کا دربان میرے دو ساتھیوں کو جانے نہیں دیتا۔

نو وارد :- آپ کے ساتھی کہاں ہیں۔ اُن کو لے کر آپ اندر تشریف لائیں ــــ (دربان سے) بیوقوف، نالائق، خبردار جو آیندہ ایسی حرکت ہوئی۔ سُندر، اندر دیو اور موہن اندر داخل ہوئے۔ مہتمم نے نہایت محبت سے ان لوگوں کا خیر مقدم کیا۔ اور ایک آراستہ کمرہ ان لوگوں کے قیام کو دیا۔

(۴)

سفر کی کسل و ماندگی سے تینوں مضمحل تھے۔ خوب گہری نیند سوئے۔ دوسرے روز سورج کی کرنوں نے خواب شیریں سے بیدار کیا۔ موہن نمائش دیکھنے کے لئے بے چین تھا۔ اندر دیو اپنی پیری کے سبب ساتھ نہ جا سکا مگر سُندر کو جانے کی اجازت دے دی۔ موہن اور سُندر سب سے پہلے نمائش کے اس حصہ پر پہنچے جہاں قلمی تصویریں تھیں۔ ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھا۔ ایک سے ایک دلکش اور دلفریب تصویر دیکھنے کے بعد موہن کی پیشانی پر یاس کی شکن نمودار ہو گئی۔ سُندر جو ابھی تک ایک خاص تصویر کو حیرت انگیز انہماک سے دیکھنے میں مصروف تھی۔ موہن سے پوچھا کہ "یہ تصویر کس نے بھیجی ہے۔"

موہن :- کیوں۔

سُندر :- یہ تصویر مجھے بیحد پسند آئی غالباً اسی کو پہلا انعام ملے گا۔

موہن :- یہی تصویر تو میں نے بھیجی ہے لیکن ان بے شمار دلفریب تصویروں کے

مقابلہ میں میری تصویر کا سبقت لے جانا ناممکن ہے۔شاید تم نے اور تصویروں کو اچھی طرح نہ دیکھا۔نہ میرے پاس تصویر کشی کے ضروری سامان تھے نہ رنگ و روغن کے لئے دام۔پھر یہ اپنے نفس کا فریب نہیں تو اور کیا تھا۔کہ میں اتنی عظیم الشان نمائش میں جہاں سارے ملک کے ماہرین فن اپنے کمال و مشق کا معجز نما نمونہ پیش کرنے والے ہوں باوجود غایت بے سروسامانی کے بھی میں نے اپنی ناکارہ تصویر مقابلہ کے لئے بھیجی ہے۔ ناکامی سے نہیں ڈرتا مگر اپنی حقیر بساط اور اس کے مقابلہ کی جسارت پر شرمندہ ضرور ہوں۔

سُندر:۔آپ شکستہ خاطر نہ ہوں۔آپ کی تصویر دوسری تصویروں سے زیبائش و دلفریبی اور حُسن میں کسی طرح کم نہیں۔بلکہ ایک اعتبار سے اس کو صاف ترجیح حاصل ہے۔اس میں قدرتی حُسن و تناسب اور ایک خاص طرح کی دلکشی ہے۔جو کسی اور میں نہیں ہے۔

موہن:۔خاص طرح کی دلکشی کیا ہے؟ شاید یہ تمھارا حُسن ظن ہے۔

سُندر:۔اس تصویر میں زندگی ہے۔گویائی ہے۔سادگی ہے۔اور فطرت کا اصلی حُسن زندگی کی گویائی اور سادگی ہی میں ہے مس صاحبہ بھی جن سے میں نے تعلیم پائی ہے ہمیشہ کہتی تھیں کہ قدرتی حُسن زیور و آرائش کا محتاج نہیں ہے۔

موہن:۔کاش نمائش کے افسر کے پاس بھی یہی دو آنکھیں ہوتیں جن سے تم دیکھ رہی ہو اور اس کی طبیعت کا میلان بھی وہی ہوتا جو تمھاری مس صاحبہ کا ہے۔

سُندر نے شرما کر گردن نیچی کر لی چونکہ دیر ہو چکی تھی اس لئے نمائش کے باقی حصّوں کا دیکھنا دوسرے روز پر اُٹھا رکھا اور قیام گاہ پر دونوں واپس آئے۔

سُندر کو دیکھتے ہی ضعیف اندر دیو نے کہا "بٹیا دیکھو یہ تمھارے چچا آشو کمار گھوش کے منیجر ہیں۔یہ ہمیں بُلانے آئے ہیں۔انھیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کل شب کو یہیں موجود تھے اور ہم دونوں کو دیکھا بھی تھا مگر کسی مصلحت سے اس وقت ملاقات کرنی مناسب نہ سمجھا۔

سُندر:۔مصلحت کیا ہے؟ جب کل شب کو انھوں نے دیکھا تھا تو اسی وقت ملنا چاہئے تھا۔شاید ہمارے پھٹے پُرانے کپڑوں کے سبب ملنے میں شرم آئی ہو۔کل جب کہ ہم پر

بیکسی کا عالم تھا۔ اجنبی دیس نہ مونس نہ ہمدم نہ کوئی غمخوار تھا تو مجھے پوچھا تک نہیں اور ایک عزیز سے ملنا مصلحت کے خلاف سمجھا گیا مگر ایک غیر شخص جو خود بھی ہماری ہی طرح غریب الوطن اور بہت زیادہ آسودہ حال بھی نہیں مہربانی و محبت سے ہماری خبرگیری کو مستعد ہو گیا۔

اندر دیو:۔ تم نے ابھی زمانہ نہیں دیکھا ہے۔ دُنیا کی نگاہ میں غُربت ایک عیب ہے۔ انسانیت کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ کوئی شخص اس سے رسم و ارتباط نہیں رکھنا چاہتا ہے جس کا دامن غُربت کی گندگیوں سے ملوث ہو۔ دُنیا کی کوئی مصیبت غربت سے زیادہ سنگین نہیں۔ ایک شرابی جس کی زندگی صرف جام و مینا کی پرستش میں گذری ہو اس کا خیر مقدم تپاک و محبت سے کیا جاتا ہے اگر زر و جواہر کے انبار اس کے پاس ہوں۔ ایک چور مکار اور عیاش جس کی لغزشیں اور کمزوریاں نہ صرف عادت بلکہ فطرت بن گئی ہوں جس کی ریاکاریوں اور دست درازیوں سے امن و سلامتی میں نقص و خلل پیدا ہو گیا ہو جس کے گناہوں کے شمار و حساب کے لئے ہمارے فرضی اعداد ناکافی ہوں اس نیلگوں آسمان کے نیچے اس کو بھی تمکنت و اعزاز کی جگہ مل سکتی ہے اگر اس کے پاس تمول اور دولت کی فراوانی ہو۔ نقرئی اور طلائی سکے اس کے عیوب و نقائص کو محاسن بن کر چمکائیں گے۔ اور میں، تم اور تمام دُنیا اس کو عظمت و عزت کی نگاہ سے دیکھے گی۔

سُندر:۔ (طفلانہ غصہ سے) آپ ایسا کریں۔ دُنیا اس کو شہرت و عظمت کے آسمان پر چڑھائے میں ایسا نہیں کر سکتی آشو چچا کی یہ حرکت ہرگز اچھی نہیں۔ یہ ان کی اخلاقی کمزوری تھی اور اب کے گھر جانا ان کی اس اخلاقی لغزش کی تائید ہوگی اگر رشتہ و برادری کی بندھن اتنے کمزور دھاگوں سے بندھی ہے تو بلا شبہ اس کا توڑنا ہی بہتر ہے۔

اندر دیو:۔ نادانی کی باتیں نہ کرو۔ اس آخری سہارے کو بھی اپنے بچپن اور ہٹ سے توڑنے کی کوشش نہ کرو اب سوائے آشو گھوش کے کون ہے جو اس مصیبت اور بے کسی میں کام آئے گا۔ جب اُس نے خود بلایا ہے تو جانا ہی مناسب ہے۔ ذرا سوچو تو اس ضد کا کیا نتیجہ ہوگا؟

سُندر :- دادا گھبرائیے نہیں۔ میں نے اچھی خاصی تعلیم پائی ہے۔ سلائی کے کام بھی جانتی ہوں۔ پھر یہ علم و ہنر کس دن کام آئیں گے۔ میں آج ہی کوئی کام ڈھونڈھ نکالتی ہوں جس میں کچھ پیسے پیدا ہوں۔ مس صاحبہ کے سفارشی خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ کسی زنانہ مدرسہ میں دس پندرہ روپیہ کی جگہ مل گئی تو نان شبینہ کی محتاجی تو دور ہو جائیگی آپ کو تکلیف نہ ہونے دوں گی۔ اب تک میں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی تھی۔ چچا کی اعانت پر بھروسہ کئے ہوئے تھی۔ مگر اب ضرورت نے مجبور کر دیا کہ اپنی قوت بازو سے اپنی تنگدستی کا مداوا کروں۔

اندر دیو نے سُندر کی ضد کے آگے سر جُھکا دیا اور آشوکمار گھوش کے منیجر کو کچھ معمولی بہانہ کر کے واپس کرنا چاہا مگر سُندر نے صاف کہدیا کہ بہانہ کی کیا ضرورت ہے کہہ دیجئے کہ:-

سر پہ احسان لیں امیروں کا ہم غریبوں کا یہ دماغ نہیں

موہن کے دل پر سُندر کے اُن شگفتہ خیالات کا جو اس نے نمائش گاہ میں تصویروں کے متعلق ظاہر کئے تھے اب تک اثر باقی تھا۔ دوسری مرتبہ پھر سُندر کی زبان سے آشوکمار گھوش کے متعلق حکیمانہ اور خود دارانہ گفتگو سُننے کا اتفاق ہوا وہ حیران تھا کہ کیوں کر ایک دیہاتی لڑکی علم و حکمت کی روشنی سے اتنی بہرہ اندوز ہوئی۔

(۵)

موہن کو آج کلکتہ آئے تیسرا دن ہے۔ آج ہی نمائش کی چیزوں کے مقابلہ کا فیصلہ ہے موہن نتیجہ کے انتظار میں بے چین ہے۔ کبھی اُمید کی دھندلی روشنی اس کو بشاش کر دیتی ہے۔ کبھی یاس کی تاریکی میں اس کا چین اور سکون گُم ہو جاتا ہے۔ اسی اُمید و بیم میں غلطاں و پیچاں موہن ٹھیک نو بجے نمائش گاہ کے اس حصہ میں پہنچا جہاں تقسیم انعامات کے لئے خیمہ نصب تھا۔ خیمہ میں حکام و عمائد شہر موجود تھے۔ دس کا گھنٹہ بجتے ہی سکریٹری نے نمائش کی روئداد سُنائی پھر صدر نے کامیاب اُمیدواروں کے نام سُنائے۔ شعبۂ تصویر کا جب وقت پہنچا فرط اضطراب سے موہن پر یاس و نا اُمیدی کی اُداسی چھا گئی۔ سانس زور سے چلنے لگی۔ عین اُسی وقت صدر نے موہن کا نام لیا اور کہا کہ پہلا انعام ساڑھے سات ہزار

روپیہ کا موہن کو ملے گا نیز نواب مُرشد آباد نے ایک طلائی تمغہ اور دو ہزار روپیہ نقد دینے کا وعدہ فرمایا ہے ـــــ موہن نے اس مسرت بخش مژدہ کو سُنا مگر وفورِ انبساط سے اس کو غش آگیا ـــــ مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ فوراً ہوش آور دوا سونگھائی گئی اور اپنی قیامگاہ پر بھیج دیا گیا ـــــ موہن کو اس حالت میں دیکھ کر سُندر نہایت پریشان ہوئی ـــــ فوراً سرہانے بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگی ـــــ لوگوں سے اسے موہن کی کامیابی کا حال معلوم ہوا۔ اپنے رفیق سفر بلکہ ہمدرد میزبان کی کامیابی کا مژدۂ جاں بخش سُن کر اس کا چہرہ جوش مسرت سے تمتما اُٹھا۔ موہن کو بھی ہوش آچکا تھا۔ سرہانے سُندر کو دیکھ کر متعجب ہوگیا۔ سُندر نے اس کی پریشانی کو تاڑ لیا اور کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کی طبیعت کچھ مضمحل ہوگئی تھی۔ اس لئے یہاں بھیج دیئے گئے تھے۔ اب سکون ہو چلا ہے۔

(٦)

چاہیئے تھا کہ موہن کامیابی کی خوشی میں اپنے دور اُفتادہ اور سراپا انتظار والدین کو شریک کرنے کے لئے فرصت کے پہلے موقع پر اپنے گھر لوٹ جاتا مگر اُس نے سُندر کو بے پناہ چھوڑ کر جانا پسند نہ کیا۔ سُندر کو ساتھ لے جانا بھی دُشوار تھا اوّل تو خود سُندر کی غیرت اس کو گوارہ نہ کرتی اور اگر کسی طرح وہ راضی بھی ہوگئی تو خود موہن کے لئے والدین کی مرضی اور اجازت کے بغیر سُندر کو اپنے گھر ساتھ لے جانا غیر ممکن تھا کیونکہ گھر پر موہن کی بھی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی۔ ہزاروں تدبیریں خیال میں آئیں مگر کسی کو بھی قابلِ عمل نہ پایا ـــــ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ سُندر آگئی۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی خوشی کے آثار دیکھ کر موہن کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ سُندر نے خود کہا "آج میں زنانہ مشن اسکول کی بڑی مس صاحبہ سے ملنے گئی تھی۔ سیتل پور مشن اسکول کی مس صاحبہ کے سفارشی خطوط کام آگئے۔

موہن :۔ (بات کاٹ کر) سیتل پور جو متھلا سے دو میل کے فاصلہ پر ہے جہاں کا وہ راجا راستہ میں ملا تھا؟

سُندر :۔ ہاں وہی۔ پہلے یہاں کی روداد تو سُن لیجئے۔

موہن :۔ معاف کرنا۔ کہو پھر کیا ہوا۔

سُندر :۔ ساٹھ روپیہ ماہوار کی ایک اُستانی کی جگہ خالی ہے۔ مس صاحبہ کا اصرار ہے کہ سر دست اس کو قبول کر لو۔

موہن :۔ اچھا تو ہے۔

سُندر :۔ میں نے بھی اس کو غنیمت جان کر زبان دے دی ہے۔ کل وہاں اُٹھ جاؤں گی۔ دادا ابھی وہیں رہیں گے۔

موہن :۔ کل ؟ کیا کل ہی چلی جاؤ گی۔؟

سُندر :۔ ہاں کل ہی۔ کیونکہ آپ بھی اس مہمان خانہ میں کل ہی تک ٹھہرنے کے مجاز ہیں۔

موہن :۔ کیا میں اس کی اُمید کر سکتا ہوں کہ تم اپنی حالت سے کبھی کبھی مطلع کیا کرو گی ؟ مجھے نہایت شرمندگی ہے کہ اپنی لاچاری کے سبب تمھارے لئے کچھ نہ کر سکا۔ بلکہ تم نے خود ہی دوڑ دھوپ کر کے اپنے لئے کسی قدر مناسب سامان کر لیا۔

سُندر :۔ آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ کے احسان سے میں ہرگز سبک دوش نہیں ہو سکتی۔ ہم یہاں بے پناہ تھے۔ اپنے عزیز تک نے ہماری غُربت کے سبب آنکھیں چُرائیں۔ مگر آپ کے شریف دل نے دو پردیسوں کو دس بارہ دنوں تک صرف پناہ ہی نہ دی بلکہ آرام و آسائش پہنچانے کا کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ مجھ کو وہ وقت یاد ہے جب کہ دربان نے مجھ کو اور میرے دادا کو روک دیا اور آپ یہ کہہ کر ساتھ لے گئے کہ "یہ دونوں میرے خاص آدمی ہیں" کیا اس احسان کو کبھی بھول سکتی ہوں۔

موہن :۔ تمھاری فلسفیانہ گفتگو کا تو میں پہلے ہی دن قائل ہو چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھاری عمر سے تمھاری عقل کا صحیح اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ میں خوش ہوں کہ تمھاری نیازمندی کا فخر حاصل ہوا۔ ہاں خوب یاد آیا تم نے اب تک اپنے گھر کا پتہ نہ بتایا۔

سُندر :۔ ہم غریبوں کا نام و نشان کیا۔؟

موہن :- کیا میں اس لائق نہیں ہوں کہ مجھ سے اپنا صحیح تعارف کرایا جائے۔

سُندر :- آپ خفا نہ ہوں۔ مجھ کو اپنا پتہ نشان بتانے سے انکار نہیں ہے اور پھر آپ جیسے ہمدرد سے اس کو پوشیدہ کیوں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس آسمان کے نیچے میرا اپنا کوئی گھر نہیں۔ کبھی تھا مگر اب نہیں۔ اگر کوئی ٹھکانا ہوتا تو اس طرح دربدر روزی کی تلاش میں کیوں ماری ماری پھرتی — میری داستان اتنی درد انگیز ہے کہ آپ کو سُنا کر ملول کرنا نہ چاہتی تھی مگر آپ نے چھیڑا ہے تو سُنئے۔ سیتل پور میرا وطن ہے۔ میرے باپ مرشد آباد کے فروغ یافتہ وکیل تھے۔ میری عمر جب دس برس کی تھی وہ یکایک نمونیائے عارضہ میں مبتلا ہو گئے۔ چند روز ذی فراش رہ کر ایک یتیم لڑکی جس کو آپ دیکھ رہے ہیں اور ایک بیوہ (میری ماں) کو چھوڑ کر چل بسے۔ میری ماں کے پاس لاکھ روپیہ نقد اور زیورات تھے۔ ہنومان رائے جو اَب راجہ موہن کہلا رہا ہے اوّل درجہ کا مفسد اور بدمعاش ہے اُس نے ایک شب کو میرے گھر میں نقب دے کر سارا اندوختہ اُڑا لیا۔ اور اب اسی دولت کے ذریعہ اُس نے راجہ کا خطاب بھی حاصل کر لیا — میری ماں کے لئے یہ صدمہ جاں گُسل ہوا۔ اور قلب کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ کچھ دنوں تک دادا نے کسی طرح میری پرورش کی مگر آخر رہنے کا مکان بھی مجبور ہو کر علٰحدہ کرنا پڑا جب یہ بھی طے ہو چکا تو افلاس و غُربت سے تنگ آ کر پردیس کی راہ لی۔ یہ میری مختصر داستان تھی۔ اِس میں کیا دھرا تھا جو میں چھپاتی البتہ یہ گوارا نہ تھا کہ ہر جگہ والدین کا نام و نشان لے کر ان کی شرافت و عزت پر بٹہ لگاتی۔ کہئے آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟

موہن :- انشاء اللہ تمھاری مشکلات کم ہو جائیں گی۔ تم عورت ہو کر جس ضبط و استقلال سے دُنیا کے مصائب کا مقابلہ کر رہی ہو — وہ بلاشبہ مردوں کے لئے ایک سبق ہے۔

(۷)

موہن گھر پہنچ گیا۔ اُس کو اُمید تھی کہ والدین اُس کی کامیابی پر دلی مسرت کا اظہار کریں گے۔ اور ایسا ہی ہوا مگر چند دنوں کے بعد ہی اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کا باپ موتی لال گھوش کچھ رنجیدہ ہے۔ ایک روز جبکہ موہن اکیلا بیٹھا تھا اس کی ماں نے دو خطوط لا کر دیئے۔ ایک ذرا لانبا تھا جس پر کئی مہریں لگی تھیں۔ شکل و صورت سے ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ سرکاری دفتر سے آیا ہے۔ دوسرا معمولی مروّجہ لفافہ تھا۔ پہلا لفافہ کھول کر پڑھا کلکتہ کے سرکاری میوزیم (عجائب خانہ) سے آیا تھا۔ اس میں لکھا تھا عجائب خانہ میں ایک اعلیٰ درجہ کے نقاش کی جگہ خالی ہے۔ تنخواہ دو سو روپیہ سے سات سو روپے تک ہوگی۔

ہدایت :۔ "بحالت منظوری ایک ہفتہ کے اندر جواب آنا چاہیے۔"

موہن نے کئی بار خط کو پڑھا — لفافہ کے پتہ کو بھی بغور دیکھا کہ کہیں یہ دوسرے شخص کا خط تو نہیں اُس کو بار بار شبہہ ہوتا تھا کہ یہ اس کا خط نہیں ہے۔ ڈاکیہ نے غلطی سے یہاں دے دیا ہے۔ مگر لفافہ پر اسی کا پتہ تھا بلکہ اس پر مکان موتی لال گھوش لکھا تھا۔ آخر بہت دیر کے بعد اس کو یقین آیا کہ اسی کو یہ ملازمت ملی ہے قاعدہ ہے کہ غیر متوقع کامیابی کی خوشی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ موہن کو اس کی بے انتہا مسرت ہوئی۔

اُس کی ماں نے جو دیر سے خط کا مضمون سُننے کے لیے منتظر کھڑی تھی جب یہ مسرت بخش خبر سُنی تو فرطِ انبساط سے موہن کو گلے لگالیا اور خوب دُعائیں دیں۔ اور کہا "بیٹا" خدا نے ہم لوگوں کے دن پھیرے ہیں۔ غریب کی دُعائیں دل سے نکلی ہوئی کبھی بے کار نہیں جاتیں۔

دوسرے لفافہ کو بھی موہن نے کھولا۔ اس کا مضمون حسب ذیل تھا:۔

کلکتہ زنانہ مشن اسکول

مورخہ ۶ر دسمبر

موہن بھائی! تسلیم

میرا تبادلہ سیتل پور زنانہ برہمو مشن اسکول میں ہوگیا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ سے اکثر ملاقات ہوگی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر وہاں پہونچ جاؤں گی۔ دادا دُعا کہتے ہیں اور آپ سے ملنے کے متمنّی ہیں۔

آپ کی بہن

"سُندر"

موہن اس خط کو پڑھ رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ ماں نے

اس کی پریشانی کو محسوس کر لیا اور پوچھا کس کا خط ہے؟

موہن :۔ (خط کو جیب میں رکھ کر) ایک ملاقاتی ہے۔

ماں :۔ آخر اس ملاقاتی کا نام بھی سنوں۔

موہن :۔ کلکتہ جاتے ہوئے راستہ میں سیتل پور کے ایک شخص اندر دیو نامی اور اسکی پوتی سُندر سے ملاقات ہوئی۔ کبھی ان کا زمانہ بھی بہت اچھا تھا اب فلک کے ستائے ہوئے تلاش روزگار میں کلکتہ جا رہے تھے سُندر نے اچھی خاصی تعلیم پائی ہے۔ ہنرمند اور سلیقہ شعار ہے۔ کلکتہ میں زنانہ مشن اسکول میں اُستانی کی جگہ مل گئی ہے سُنا ہے کہ کسی راجہ نے مکر و فریب سے ان کی ساری دولت چھین لی۔ یہ لوگ بہت واجب الرحم ہیں۔

(۸)

سُندر :۔ سیتل پور کے برہمو زنانہ اسکول کے کمرہ میں تنہا بیٹھی ہے اور کسی خیال میں مستغرق ہے۔ صورت سے پریشانی اور تفکرات نمایاں ہے۔ کبھی خود بخود کہنے لگتی ہے کہ "موہن شریف آدمی ہے۔ اس نے خط کا جواب نہ دیا ممکن ہے کسی اُلجھن میں مبتلا ہو ــــ مگر یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ ہمیں بھول جائے ــــ سُندر اسی خیال میں غرق تھی کہ اس کی دایہ نے آکر کہا ایک شخص بابو موہن لال گھوش ملنے آئے ہیں۔" سُندر اس نام کو سُن کر خود بخود شرما گئی اور اپنی نگاہیں نیچی کر کے بولی "بلا لو" پھر کچھ سوچ کر خود ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور موہن کو لے آئی۔ اور معمولی مزاج پُرسی کے بعد سُندر نے شکایت کی کہ آپ نے تو خود ہی ایفائے عہد کیا۔ میں ہمیشہ آپ کے خط کی منتظر رہی۔ دادا بھی برابر آپ کو یاد کرتے تھے۔ پرسوں سے وہ یکایک جاڑا بخار میں مبتلا ہوگئے۔ دو ہی دن میں کچھ ایسے مضمحل ہوگئے کہ اُٹھنے بیٹھنے کی بھی صلاحیت نہ رہی۔ بات چیت کرنی بھی مشکل ہوگئی ــــ اسپتال کے ڈاکٹر کی دوا ہو رہی ہے مگر اس ضعف کے عالم میں اکثر آپ کا نام زبان پر آیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ ابھی آنکھ لگی ہے دیکھئے کھانسنے کی آواز آرہی ہے شاید جاگ گئے ــــ چلئے وہیں بیٹھیں۔

کو.....ن..... ہے؟

موہن :- جی میں ہوں موہن - آپ زیادہ بولنے کی کوشش نہ کیجئے - آپ کو تکلیف ہوگی -

اندر دیو :- (مایوسی کے لہجہ میں) تکلیف! تکلیف! اب تکلیف کے ختم ہونے کا وقت قریب آرہا ہے - (رُک رُک کر) خوب ہوا کہ تم آ گئے -

موہن :- آپ گھبرائیں نہیں - انشاءاللہ آپ بہت جلد چُست و چاق ہو جائینگے

اندر دیو :- (بات کاٹ کر) نہیں بیٹا اب تو تسلیوں پر یقین کرنے کی بھی مہلت نہیں -

سُندر! سُندر کہاں ہے - قریب آ - رو رو کے اپنی جان کو ہلکان کرنے سے کیا حاصل؟ یہ وقت سب پر آنے والا ہے - موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں - آہ! اب تجھے تسکین اور ہمدردی کے دو الفاظ بھی کہنے والا نہ رہے گا - موہن! تم بھی قریب آجاؤ - دیکھو انسان کا اصلی جوہر چھپ نہیں سکتا - تمہارے سلوک تمہارے شریفانہ خصائل نے میرے دل میں اُنس اور گرویدگی پیدا کر دی ہے - اب تم سے ایک آخری التجا ہے کہ - سندر ستم زدہ بدقسمت سُندر ایک بدبخت مگر مظلوم خاندان ...... کی ..... یادگار ہے - نسبی شرافت میں کسی ..... سے ..... کم نہیں اپنی لیاقت تعلیم اور ہنر کے اعتبار سے ...... (اب ضعف زیادہ طاری ہے) بھی ایک گراں مایہ لعل ہے ..... حلق میں ..... کانٹے پڑ گئے - اِس مصیبت کی ماری مگر شریف اور نیک لڑکی کو تمہاری امانت میں سونپتا ہوں اگر تمھیں اپنی کنیز بنانے میں کوئی عذر ہو تو ..... کوئی مناسب بر تلا ... ش (ہچکی آتی ہے اور روح پرواز کر گئی)

سُندر اور موہن شدت غم اور فرط الم سے پتھر کی طرح ساکن اور بے حس و حرکت ہو گئے - چند منٹ کے بعد ہوش آیا تو آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں سے جاری ہو گیا -

(۹)

دو روز گذر گئے -

سُندر کی میگوں آنکھیں رونے سے اور بھی سُرخ ہو گئیں - سر کے بال پریشان

ومنتشر۔ رُخسار لال اور پلکیں آنسوؤں سے ڈھل کر کالی ہوگئیں۔ موہن، محبت کی ستم ظریفیوں سے ناواقف موہن اپنے دل میں ایک نئی کیفیت بلکہ تکلیف مگر لذت آمیز تکلیف محسوس کرتا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سُندر کو بھی اب موہن سے باتیں کرنے میں تکلف ہوتا تھا۔ دونوں کے کانوں میں وہ گفتگو گونج رہی تھی جو بطور وصیت اندردیو نے بسترِ مرگ پر کی تھی۔

سُندر اور موہن کی رفاقت نے جس طرح جلد" دوستی" کی شکل اختیار کرلی اُس سے زیادہ جلد" دوستی" نے محبت کا جامہ پہن لیا۔ اس جانکاہ غم نے سُندر کو ہمدرد اور غمگسار موہن کا رہین منت بنا دیا۔ اور سُندر کی بیکسی اور آشفتہ حالی نے موہن کے جذبۂ محبت کو حرکت دی۔ اکثر محبتوں کی ابتدا" غم انگیز واقعات" ہی سے ہوتی ہے۔

سُندر مدرسہ کے کسی ضروری کاغذ کے مطالعہ میں مصروف تھی کہ موہن نے اس کو مخاطب کر کے کہا۔" مجھے یہاں آئے آٹھ دن ہوگئے اگرچہ تمھیں تنہا چھوڑ کر اور خاص کر اس وقت تو جی نہیں چاہتا مگر خوف ہے کہ زیادہ دیر کرنے سے کوئی قباحت نہ پیش ہوجائے۔ سرکاری ملازمت میں پابندی اوقات نہایت ضروری ہے۔ انشاءاللہ میں فرصت لے کر بہت جلد آنے کی کوشش کروں گا۔

سُندر:۔ میں آپ کو روک نہیں سکتی۔ میری خواہش اور آپ کی ضرورت دو مختلف مسائل ہیں۔ آپ کی ضرورت کو اپنی خواہش پر مقدم کرنا ضروری ہے دیکھیے پہلے کی طرح بھول نہ جائیے گا۔

موہن:۔ (سُندر کی نرم انگلیوں کو اپنے ہاتھ میں دبا کر) اب میں اگر بھولنا بھی چاہوں تو شاید نہ بھول سکوں۔

سُندر نے شرما کر سر نیچا کر لیا۔ یہ طوفان محبت کی پیش رَو ہوا تھی جو دو زندگیوں کے سکون وقرار میں زلزلہ پیدا کر دینے کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

(۱۰)

موہن کو کلکتہ آئے ایک مہینہ ہوگیا اپنے فن سے اُس نے دفتر کے حکام کو بہت جلد

گرویدہ کرلیا۔ جتنی اچھی تصویریں، بلاک، نقشے آتے تھے وہی موہن کو دیئے جاتے تھے میوزیم (عجائب خانہ) میں طرح طرح کے سنگی بُت، ٹوٹے ہوئے پتھر اور دیگر عجائبات آتے تھے ان کی تصویریں محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ اس کام کو جس حُسن و کمال کے ساتھ موہن نے انجام دیا وہ اس سے ظاہر ہے کہ مقررہ وقت سے پہلے اس کا تقرر مستقل ہوگیا۔

موہن ایک تو قدرتاً خاموش اور سکون پسند آدمی تھا۔ استقلال انجماد کی حد تک تھا۔ یہ خموشی سکون اور جمود اس کے فطری مذاق مصوری کے عین مطابق تھا۔ مگر اس مرتبہ اُس کے سکون میں زلزلہ اور استقلال میں اضطراب تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کے سکون و اطمینان میں کیوں فرق آگیا کیوں رہ رہ کر سیتل پور جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ اِس خواہش کی خود ہی یوں توجیہ کرلیتا کہ سُندر کی ناگہانی مصیبت اور بیکسی نے اس کے دل میں ہمدردی کی لہر دوڑا دی ہے اور اِس توجیہ سے وہ قدرے مطمئن ہوجاتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کا دل اِس غلط توجیہ کو یکسر صحیح تسلیم کرنے سے مجبور رہتا اور پھر اس کی پریشانی اور سراسیمگی پہلے سے دوچند ہوجاتی ہے اسی انتشار کے عالم میں اس نے سُندر کو ایک خط لکھا۔

کلکتہ۔ مورخہ ۱۴ فروری

سُندر! خوش رہو۔

پرماتما کی کرپا سے بخیریت ہوں۔ دو ہفتہ سے تمھاری کوئی چٹھی نہیں آئی ہے اپنی خیریت سے جلد مطلع کرو۔ تمھاری ایک تصویر تیار ہوئی ہے محض خیال سے کام لے کر تصویر بنانا نہایت دُشوار ہے مگر اسکے سوا میرے لئے کیا چارہ تھا۔ اگر یہ کہنے کی اجازت ہو تو کہوں کہ ایک بات تم میں اور تصویر میں بلاشبہہ مشترک ہے۔ تم خط کا جواب نہیں دیتیں اور یہ باتوں کا جواب نہیں دیتی۔ شاید میں عنقریب آؤں — تمھارا

موہن

(۱۱)

موہن کو خط لکھے ایک ہفتہ گذر گیا مگر اب تک جواب نہ آیا۔ سُندر کی اس غیرمعمولی

خاموشی کی وجہ سمجھنے سے وہ قاصر تھا۔ البتہ کبھی یہ شبہہ ہوتا کہ ڈاک میں اس کا خط تلف ہوگیا۔ مگر یہ بھی زیادہ تشفی بخش نہ تھا۔ کیونکہ اِس کے دو خط سُندر کو بحفاظت مل گئے تھے پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ تیسرا خط اِس کو نہ ملے۔ اس کی بیتابی بڑھتی گئی۔ اور کوئی معقول وجہ تسکین کی نظر نہ آئی گھر کے خط آتے تھے اور وہ ان کا معمولی جواب دے دیتا۔ اسی طرح ایک مہینہ گذر گیا مگر سُندر کا خط نہ آنا تھا نہ آیا۔ کبھی یہ وسوسہ ہوتا کہ کہیں نصیب دُشمناں سُندر کی طبیعت کچھ ناساز تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو رخصت لے کر جانا چاہئے مگر پھر یہ بھی خیال ہوتا کہ وہ خفا ہوگئی ہے یا کسی وجہ سے مراسم دیرینہ کو اب رکھنا نہیں چاہتی۔ ایسی حالت میں موہن کا سیتل پور پہنچنا اور بھی نامناسب ہوگا۔

موہن عجیب کشمکش میں تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ دفتر وہ اب بھی جاتا تھا۔ مگر صرف اس لئے کہ دفتر میں چند گھنٹوں کی مشغولیت کے سبب تکلیف وغم کی گرانباری سے بے خبر رہتا۔ نقاشی یا مصوری سکون و اطمینان کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ موہن کے کام اب خراب ہونے لگے تھے۔ غفلت و بے توجہی کی ابتدا تھی اس لئے کوئی کچھ نہ بولا۔ مگر کب تک۔؟ حاکم نے موہن کو بُلا کر ملائمت سے کام کی طرف توجہ دلائی وہ سُنتا تھا مگر تعمیل سے مجبور تھا۔

(۱۲)

پورے دو مہینہ کے بعد سُندر کا ایک ملفوف خط پہنچا۔ موہن پر نا اُمیدی اس قدر طاری تھی کہ چند مرتبہ الٹ پلٹ کر خط کو دیکھتا رہا کہ فی الحقیقت یہ سُندر ہی نے بھیجا ہے یا کسی اور نے۔ جب اضطراب کی بیخودی سے ہُشیار ہوا لفافہ چاک کیا۔ اس میں دو خط نظر پڑے۔ ایک طویل اور دوسرا نسبتہً مختصر تھا۔ پہلا اس کے باپ کا تھا دوسرا سُندر کا تھا۔ پہلے سُندر کے خط کو کھول کر پڑھا۔

کرم گستر!

تسلیم عرض ہے

آپ کے کئی خطوط متواتر پہنچے۔ لطف فرمائی کا شکریہ۔ میں دو خط کے جواب بھیج

چکی ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں نے یک بیک خط وکتابت کیوں موقوف کر دی۔ اور آپ کے آخری خط کا جواب کیوں نہ دیا۔ جواب نہ دینا معمولی اخلاق سے بھی بعید ہے اور پھر ایسی حالت میں کہ جبکہ آپکے احسان وکرم سے گردن جھکی ہو۔ لیکن آپ کے والد کے خط نے میرے دماغ کے پرخچے اُڑا دیئے ان کے خط کے بعد میں نے آپ ہی کی بہتری کے خیال سے مراسم کو موقوف کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ میرے اور آپ کے تعلقات کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے مجھ کو جو کچھ لکھا ہے اس کا کیا گلہ کروں؟ میں بدقسمت ایسی ننگ خاندان نکلی کہ ایسے کریہہ الفاظ اپنے والدین کی شان میں سُنتی ہوں۔ اور یہ سب اپنے ہی کرتوتوں کا نتیجہ۔ آہ۔ افلاس وتنگدستی شرافت کو بھی کھوتی ہے۔

اب میرے خیال میں مناسب یہی ہے کہ آپ اور میں ایک دوسرے کو بھلانے کی کوشش کریں۔ اگرچہ میرے لئے نہایت دُشوار ہوگا۔ میں آپ کو کیوں کر بھول جاؤں؟ کیا آپ کے تمام احسانات فراموش کر دوں آپ کی مخلصانہ ہمدردی اور اعانت کیسر دماغ سے مٹا دوں میں اس ناشکری کے لئے تیار نہیں ہوسکتی مگر اس کے لئے کوشش کرنی ہی ہوگی۔ حالانکہ یہ بھی سخت مشکل ہے کہ تمام مراسم وتعلقات کی ظاہری شکلیں مٹا دی جائیں۔

آپ میرے اس خیال پر رنجیدہ ہوں گے اور مجھ پر احسان فراموشی کا اور نہ معلوم کیا کیا الزام دیں گے لیکن یاد رکھیئے کہ ہمارے مراسم کو ان کچے دھاگوں کی نمائشی بندھن سے آزاد ہونا چاہیئے۔ دل کی گہرائیوں کا احتساب ومعائنہ ناممکن ہے۔ میں آپ کی قدر کرتی تھی اور اب بھی کروں گی آپ کی محبت نہ بھولی ہوں نہ بُھلاؤں گی مگر .... بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے والد کی مرضی ومنشار کے خلاف کوئی کام نہ کریں۔ والدین کی اطاعت سعادت عظمیٰ ہے آپ خوش نصیب ہیں کہ اس سعادت سے متمتع ہونے کا موقع حاصل ہے۔

میری زندگی کے دستور العمل میں اب بھی کوئی فرق نہ آئے گا۔ سنتیا کی لونڈی بن کر جیوں گی۔ آپ یقین کیجئے کہ میں اپنی زندگی کو کبھی اس طرح نہ گذاروں گی کہ آپ کو سُن کر تکلیف ہو۔ اُمید ہے کہ آپ اپنی برادرانہ محبت سے محروم نہ کیجئے گا۔

تصویر پہنچی، کس مُنھ سے شکریہ ادا کروں۔ وہاں نوازشوں کا انبار، اور یہاں صرف ایک زبان اظہارِ تشکر کے لئے آپ کی جودت و ذکاوت کی داد نہ دینی ظلم ہوگا۔ تصویر کا ہر حصہ آپ کے کمال کی تصویر ہے مگر میں یہ کہنے کی اجازت چاہتی ہوں کہ تصویر اپنے اصل موضوع سے بہت دور ہو گئی کہیں پرے سے یہ میری تصویر نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ آپ کے کمال صنعت کی "تصویر" ہو سکتی ہے اور ہے۔ اس جہت سے اور صرف اس جہت سے مجھے پسند آئی۔ آپ کا یہ کہنا کہ مجھ میں اور تصویر میں "خاموشی" قدر مشترک ہے آپ کے شاعر ہونے کی دلیل ہے اور کیوں نہ ہو، مصوّر اور شاعر میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ شاعر اپنے "حسیات لطیف" کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور مصوّر اپنے "نظارۂ جمال" کو رنگ اور روشنائی کے ذریعہ چند اُلٹی سیدھی لکیروں میں ظاہر کرتا ہے۔

معاف کیجئے گا خط بہت طویل ہو گیا مگر چونکہ یہ آخری خط ہے اس لئے ایسا ہونا ضروری ہے۔ آخر میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ جو کچھ آپ کے والد نے مجھ کو لکھا ہے اس کا مجھے ذرہ بھی ملال نہیں۔ وہ بزرگ ہیں۔ ان کو جو غلط خبریں ملی ہیں یا پہنچائی گئی ہیں وہی غلط فہمی کی موجب ہیں۔ آپ بھی براہ کرم اس کا خیال نہ کریں! اور ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جو میری طرف سے اِن کے دل میں بدگمانیوں کے بڑھنے کا سبب ہو۔

میری دست بستہ التجا ہے کہ اطاعت والدین کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھ سے راہ و رسم موقوف کر دیں۔ آپ کی

سُندر

موہن شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ مگر وفور رنج کے سبب کچھ نہ سمجھ سکا۔ کئی بار پڑھا۔ جتنا زیادہ پڑھتا گیا اس کی پریشانی بڑھتی گئی۔ غصہ میں باپ کے خط کو جو سُندر کو بھیجا گیا تھا پڑھا۔

سُندر!

مجھے کئی آدمیوں سے تمھاری شکایتیں پہنچیں مگر برداشت کیا۔ اب مجبور ہو کر تم کو لکھتا ہوں کہ میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دو وہ ابھی بھولا بھالا ہے، کمسن دُنیا کے سرد و گرم

سے نا آشنا ہے ...... محبت کے جال کہیں اور ڈالو۔ موہن غریب اور غریب پسر ہے تمہاری شرافت تو اسی سے عیاں ہے کہ تنہا کلکتہ میں انگریزوں کے اسکول میں رہیں۔ تمہارے لئے سب جائز ہے کسی کا خوف ہے نہ شرم جو جی چاہے کرو۔

میں نے موہن کو خود کہنا چاہا مگر وہ ملازمت پر چلا گیا اس لئے نہ کہہ سکا۔ اور خط و کتابت کے ذریعہ اس کی فہمائش زیادہ سود مند نہ ہوگی۔ مگر میں تم کو جتا دیتا ہوں کہ اگر موہن سے تم نے ملنا ترک نہ کیا تو تمہارے لئے سخت بُرا ہے۔ اور یہ بھی صاف کہہ دیتا ہوں کہ تمہاری جیسی "بہو" اگر اس گھر میں آئی تو میں موہن کا پھر تا قیامت مُنہ نہ دیکھوں گا۔

راقم

موتی لال گھوش

موہن دونوں خط کو پڑھ کر دم بخود ہو گیا وہ سمجھ گیا کہ یہ سب فتنہ اسی کمبخت راجا کا اُٹھایا ہوا ہے۔ اور اسی لئے اس کا باپ کچھ رنجیدہ تھا مگر اب کیا کرنا چاہیئے۔ باپ کے خط نے موہن کی اُمیدوں کو خاک میں ملا دیا۔ وہ نہایت شرمندہ تھا کہ اس کی وجہ سے سُندر کو نہایت تلخ باتیں سُننی پڑیں۔ ساری رات جاگ کر گزار دی علی الصباح ایک خط باپ کو اور دوسرا سُندر کو اور ایک ملازمت سے استعفا کا تیار کیا۔

پتا جی! بندگی عرض ہے۔

آپ نے جو کچھ سُندر کو لکھا ہے وہ نہایت نامناسب تھا۔ آپ اُس کمبخت راجا کے بہکانے میں آ گئے۔ آپ کو پہلے تحقیق کر لینی چاہیئے تھی۔ ایک شریف عورت کو اس طرح خطاب کرنا نہ چاہیئے تھا۔ تیر کا زخم مندمل ہو سکتا ہے مگر زبان و قلم سے نکلے ہوئے نشتر ایسا کاری زخم لگاتے ہیں جس کا مرہم نہیں۔ میں سُندر کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک ممتاز خاندان کی شریف لڑکی ہے جو بدقسمتی سے بلکہ اسی راجا کی ستائی ہوئی ہے۔ مصیبت کے دنوں کو جھیل رہی ہے۔ اس کے مرحوم دادا نے مرنے کے وقت مجھ سے سُندر کے ازدواج کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اور میں نے انکار نہ کیا میرا عدم انکار بلاشبہ ایجاب کی دلیل ہے۔ اب جب کہ آپ اس تعلق سے اس قدر متنفر ہیں تو صرف یہی کر سکتا ہوں کہ استعفا دے کر

جنگل میں جاکر ریاضت الٰہی میں بقیہ عمر صرف کر دوں۔

آپ کا نالائق بیٹا

موہن

موہن کا خط سُندر کے نام

از کلکتہ

اچھی سُندر! خوش رہو۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھیں کیا لکھوں۔ ابھی والد کو بھی خط لکھ دیا ہے اور اب تمھیں صرف یہی اطلاع دیتا ہوں کہ میں نے آج استعفا داخل کر دیا۔ اور منظور بھی ہو گیا۔ اب زندگی میں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں، دُنیا، جہاں طرح طرح کی پریشانیوں میں انسان اُلجھا ہوا ہے۔ جہاں انسان کی سادہ زندگی بھی بدگمانیوں سے بچ نہیں سکتی۔ جہاں اخلاص وانس کو شکوک بلکہ مذموم نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسی دُنیا میں زندگی بسر کرنا میرے لئے نہایت مشکل ہے۔ جنگل یا سنسان پہاڑ کی وادی میں آبادی سے دور پرماتما کے گیان میں زندگی کو گذارنا ثواب کا کام ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، اہل و عیال یہ سب جنجال ہیں جس میں اُلجھ کر انسان اپنے بھگوان کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ اس موقع پر یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ میں تزویج و ازدواج کے متعلق یہ قطعی رائے قائم کرلی کہ یہ انسان کے لئے بھاری زنجیر ہے جس سے اپنے کو محفوظ رکھنا ضروری ہے اور اسی پر میرا عمل رہے گا۔ میں کہاں جاؤں گا؟ کہاں رہوں گا؟ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

تم سے آخری مرتبہ رخصت ہونے کے قبل اس امر کی معافی مانگنا ضروری ہے کہ میری وجہ سے تم کو نہایت ناگوار باتیں سُننی پڑیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان باتوں کی مجھ کو بیحد تکلیف پہنچی ہے اور تم سے نہایت شرمندہ ہوں۔

تمھارا

موہن

(۱۳)

موہن کو سنیاس ترک لذات اور رہبانیت کے اختیار کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوئی۔ وہ فطرت سے سکون پسند دل و دماغ لے کر آیا تھا اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ بے حس تھا یا واقعات و حوادث کے اثرات قبول کرنے کا۔ اس کا دل عادی تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی زبان پر صرف سکوت کی مہر تھی مگر اس کی آنکھیں قدرت کے دلکش مناظر سے سیراب ہوتیں۔ کان لحن و نغمہ کی شیرینی سے لذت اندوز ہوتے اور دل کی گہرائی میں خاموش سطح سے نیچے جذبات کی موجیں جوش زن ہوتیں۔

موہن نے اپنے مسکن کے لئے مقام تجویز کرنے میں دیر نہ کی۔ سُندر بن کا جنگل اپنی وسعت اور دلکشی میں مشہور ہے۔ سُندر بن میں گھنے درختوں کے سایہ میں اس نے اپنا مسکن بنایا۔ درختوں کے قدرتی چشموں کے صاف اور شیریں پانی پر اس کی زندگی تھی اور اس کو اس میں وہ لذت ملتی جو دُنیا کے پُر تکلف اور قیمتی مکانوں میں بھی نہ ملی تھی۔

(۱۴)

موہن کا خیال تھا کہ جنگل اور تنہائی کی زندگی میں وہ سُندر کو بھول جائے گا اور خُدا کی محبت میں اپنا غم غلط کر سکے گا اس میں شک نہیں کہ یکسوئی اور دُنیا کے ہنگاموں سے دوری نے اس کے دل کو سُندر کے دل آویز حُسن سے "جمال حُسن آفریں" کی طرف پھیر دیا تھا۔ مگر اس کا دل اب بھی سُندر کے محاسن جمیلہ کی جلوہ گاہ تھا۔ کیونکہ سُندر میں وہ حُسن آفریں کے کمال صنعت کو دیکھتا تھا۔

مہینے اور کئی برس گذر گئے مگر موہن کی خاموش زندگی میں فرق نہ آیا۔ پانچ برس کی طویل مدت منٹوں اور لمحوں کی طرح گذر گئی اور موہن اپنے تصوّر کی پُر امن زندگی کی لذّتوں میں سرشار رہے۔ البتہ اس کے تصوّر میں یہ کمال ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ سُندر کی تصویر اس کی بند آنکھوں کے سامنے ہوتی اور اس کا خاموش تکلم موہن کے لئے سامعہ نوازی کا عجیب فرحت انگیز سامان پیدا کرتا۔

---

(۱۵)

ایک سہانی شام کو موہن چشمہ کے کنارے شفق آلود آسمان کے دلفریب منظر کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک نوجوان پاس سے گذرا اور قریب ہی چشمہ کے کنارے چلّوؤں سے اپنی پیاس بُجھا کر بیٹھ گیا۔ موہن حیرت میں تھا کہ اس سنسان جنگل میں جہاں پانچ برس کی طویل مدت میں بھی کسی انسان پر نظر نہ پڑی۔ آج یہ کون نوجوان بھول پڑا ۔ سورج کی کرن رفتہ رفتہ غائب ہو چکی تھی رات کی تاریکی اور اس کے ساتھ جنگل کا بھیانک سماں مسلط ہو رہا تھا۔ موہن نے از راہ شفقت اجنبی نوجوان سے کہا۔

"تم اس خوفناک جنگل میں تنہا کیسے آئے۔؟ تمہارے اور ساتھی کہاں ہیں۔ شاید کہیں پاس ہی ہیں۔"

نوجوان :۔ نہیں تو مَیں تنہا ہوں میرا کوئی ساتھی نہیں۔ میں ایک غریب ستم زدہ انسان ہوں۔ اسی طرح جنگل جنگل مارا پھرتا ہوں — آج عرصہ دراز کے بعد ایک انسان کی صورت نظر آئی۔ بلکہ آپ کو یہاں تنہا دیکھ کر مجھ کو خود حیرت ہوئی۔

موہن :۔ نہیں حیرت کی تو کوئی بات نہیں۔ شہر کے ہنگاموں سے دور تنہائی اور ویرانی میں انسان خُدا کی یاد زیادہ شغف اور انہماک سے کر سکتا ہے۔ اگر تم کو تکلیف نہ ہو تو آج میری جھونپڑی میں بسر کرو۔

نوجوان :۔ آپ کی باتوں میں عجیب گرویدگی ہے۔ انکار کرنے کی مجال نہیں بلکہ یہ شکریہ کا موقع ہے کہ آپ جیسے خُدا ترس زاہد کے فیض صحبت کی سعادت نصیب ہوگی۔

(۱۶)

جنگل کی قدرتی سادہ غذا کا جب دَور ختم ہو چکا پھر یہی گفتگو چھڑ گئی

نوجوان :۔ آپ یہاں کب سے ہیں ؟

موہن :۔ میں تو ایک عرصہ سے یہاں ہوں۔

نوجوان :۔ آپ کی زبان نہایت صاف اور شُستہ ہے۔ آپ کسی شریف تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی غم انگیز واقعہ نے آپ کو اس زندگی کے

اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ غالباً اس سوال کا مجھ کو حق نہ تھا اور میں اس سوء ادبی کی معافی چاہتا ہوں۔ مگر بے ساختہ یہ خیال دل میں پیدا ہوا۔

موہن :۔ نہیں اس سوال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے اچھی خاصی تعلیم پائی تھی۔ مگر یکایک دنیا کے شر انگیز تعلقات سے جی اُچٹ گیا (چاچا؟) اور اب ایک عرصہ سے یہیں رہتا ہوں۔

نوجوان اس گفتگو سے متاثر ہو رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے بس ہو رہا ہے مگر ضبط و تحمل سے سنتا رہا۔

آپ کا اصلی مکان کہاں ہے اور کتنے سال سے آپ یہاں ہیں۔

موہن :۔ دیکھتا ہوں کہ تم کو کد ہو گئی ہے نوجوانوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ کرید کرید کر پوچھتے ہیں مگر میری گذشتہ زندگی میں تمہیں کوئی لطف نہ آئے گا۔ صرف مہمان کی خاطر شکنی کے خیال سے دُہراتا ہوں دیکھو کس زور شور سے بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی کوند رہی ہے۔ اگر پانی برسا تو غضب ہو جائے گا کہ یہ کمزور جھونپڑی بارش کی زد کو نہ روک سکے گی خیر خدا کے کاموں میں ہمیں کیا دخل ہے۔

نوجوان :۔ آپ شاید بھول گئے ہیں میں نے کچھ پوچھا تھا۔

موہن :۔ نوجوان کے پیہم اصرار سے مجبور ہو گیا اور اپنی ناکام زندگی کے اوراق پارینہ کو دُہرانے میں مصروف ہو گیا۔ نوجوان سراپا محو تھا۔ کبھی خود بخود شرما جاتا اور نگاہیں نیچی کر لیتا۔ اس کا چہرہ شرم و حیا سے تمتما اُٹھتا۔ سانس زور سے چلنے لگتی خیریت تھی کہ موہن اپنے افسانہ میں اس قدر محو تھا کہ اس نے نوجوان کی غیر معمولی پریشانیوں کو محسوس نہ کیا۔ جب وہ چُپ ہو گیا۔ نوجوان نے پھر ایک سوال کیا۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ماں باپ بھائی بہن اولاد اعزا و اقارب سے علیحدہ رہنا بلکہ دُنیا میں رہ کر دُنیا کے تعلقات سے آزاد ہونا منشائے فطرت ہے اور خالق کی خوشنودی حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے؟

موہن :۔ ہاں ایسا ہی ہے۔ دُنیا کی فریب کاریوں میں انسان اپنے خالق کو

بھول جاتا ہے۔مال و دولت کی محبت اس کو خُدا کی یاد سے غافل رکھتی ہے۔ اگر اس سے نجات ملی تو اعزا و اقارب اہل وعیال کی بھاری زنجیر میں جکڑ جاتا ہے اور ہزاروں گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے دُنیا کے علائق سے دور، تنہائی اور یک سوئی کی زندگی اختیار کرنا ضروری ہے۔

نوجوان :۔ لیکن اگر یہی منشائے تخلیق ہے تو انسان کو خُدا نے اس علائق کی ایک کرٹری کیوں بنا دیا اور اہل وعیال کے رشتوں سے کیوں پیوست کیا۔

موہن :۔ ہمیں اس کے کاموں کی وجہ دریافت کرنے کا کوئی حق نہیں۔

نوجوان :۔ یہ جواب تشفی بخش نہیں وجہ دریافت کرنے کا حق تو نہیں مگر تخلیق کا منشار سمجھنا تو فرض ہے۔اگر رہبانیت منشائے قدرت ہوتا تو بنی نوع انسان کی تخلیق کا کوئی دوسرا ذریعہ ہوتا۔قدرت نے جو قوتیں ہم کو دی ہیں وہ استعمال کے لئے دی ہیں ہم قدرت کے ایک خاموش آلہ ہیں۔ہم کو چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔ہاتھ پاؤں ناک کان وغیرہ سب کسی خاص ضرورت کو پورا کرنے کو ملے ہیں۔اگر ہم ہاتھ سے کام نہ لیں اور اس کو کسی حد تک بیکار رکھیں تو بلاشبہ قدرت اس کو بے حس بنا دے گی یہ قدرت کا خاموش انتقام ہے۔جس چیز کا ہم مصرف نہ لیں گے تو قدرت واپس لے لیتی ہے اسی طرح ہم کسی چیز سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لیں تو بلاشبہ وہ چیز جلد خراب ہو کر بیکار ہو جائے گی۔یہی بیکار ہو جانا قدرت کا خاموش انتقام یا بخشی ہوئی طاقت کو واپس لینا ہے۔

موہن :۔ تمھاری باتوں میں عجب دلآویزی ہے۔تمھاری ذہانت قابل رشک ہے۔کوئی بڑی سے بڑی دلیل میرے استقلال اور عزم میں فرق نہ پیدا کر سکے گی مگر دیکھتا ہوں کہ آج تمھاری مدلّل گفتگو میرے عزم کے سنگی ستون میں رخنہ پیدا کر رہی ہے۔

نوجوان :۔ آپ براہ کرم شرمندہ نہ کیجئے۔میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر میرا خیال کسی حد تک قابل غور ہے تو آپ اپنی موجودہ زندگی کے متعلق پھر غور کیجئے کہ آپ جس کی خوشنودی کے لئے یہ کر رہے ہیں کہیں اس کی مرضی کے خلاف تو نہیں۔

موہن :- کہے جاؤ میں شوق سے سُن رہا ہوں ۔ خُدا جانے تمھاری تقریر میں کہاں کا جادو ہے کہ طبیعت سُننے کے لئے مجبور ہو رہی ہے ۔

نوجوان :- ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ انسانی اعمال کی یہی دو حدیں ہیں یا کامل انقطاع تعلّق یا یکسر محویت ۔ ہمیں ان دونوں حدود سے دور رہنا چاہیئے توسط و اعتدال فطرت کا منشا ہے اور ہماری فلاح اسی میں مضمر ہے ۔ کیا خُدا کی یہی مرضی ہو سکتی ہے کہ آپ اس عورت کو چھوڑ دیں تعلقات یکسر منقطع کر دیں جس نے نو ماہ طرح طرح کی مصیبتوں کو سہہ کر عیش و آرام کو ترک کر کے پیٹ میں رکھا ہو جس نے تم کو گوشت کے لوتھڑے سے ایک تندرست انسان بنایا اسی طرح اور بھی تعلّقات ہیں ۔

موہن :- مانا کہ یہ سب دلائل درست ہیں مگر کیا میرا دل اس کو قبول کر سکتا ہے اُس دُنیا میں پھر واپس جاؤں جہاں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں ۔ اگر سُندر مل سکتی تو البتہ پھر ایک بار دُنیا میں از سرِ نو داخل ہوتا ۔ مگر والدین کا اپنی ضد سے باز آنا تقریباً ناممکن ہے ۔ اگر بفرضِ محال وہ راضی بھی ہوئے تو ان کی رضامندی اب کس کام کی ۔ کیا سُندر اب تک میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی آہ اس کا یقین نہیں آتا ۔ میرے لئے اب اس دُنیا میں کوئی دلچسپی نہ رہی بلکہ زندگی کی مسرتیں تلخیوں سے بدل چکیں ۔ تمھاری دلیل صحیح ۔ تمھارے براہین قطعی درست مگر اس کو کیا کروں کہ دل قبول نہیں کرتا ۔

نوجوان :- شاید میری تقریر کا بُرا اثر ہو رہا ہے ۔ ایام گذشتہ کی یاد آپ کو تکلیف دے رہی ہے ۔ آپ کے احساس بیدار ہو گئے ہیں ۔ آنکھوں میں چمک اور بیخودی پیدا ہے ۔ معاف کیجئے گا ۔ میں ہی آپ کی کلفت کا باعث ہوا ۔

موہن :- تکلیف کیسی ؟ میں تو تمھارا ممنون ہوں کہ آج تمھاری تقریر نے اس زخم کو ہرا کر دیا جس کی ہر ٹیس زندگی کا نشاط اور جس کا ناسور ہونا میری حیات کا ماحصل ہے کاش اس لذّت سے تم واقف ہوتے جو زخموں کے اندمال میں نہیں بلکہ ٹانکوں کے ٹوٹنے میں مضمر ہے تم یہ نہ سمجھنا کہ ان پانچ برس کی مدّت میں ..... طویل مُدّت میں ۔ میں سُندر کو بھول گیا ۔ ہرگز نہیں وہ بھلائے جانے کی چیز ہی نہیں البتہ اب زبان پر اس کا نام کم آتا

ہے مگر دل پر اس کی تصویر کندہ ہوگئی ہے ...... (سنبھل کر) میں کہاں سے کہاں جا پڑا۔ اچھا تمہیں گانا بھی آتا ہے کیا اچھا ہوتا تم اگر اس خاموش جنگل میں کوئی نغمہ چھیڑ دیتے۔

نوجوان :- مجھ کو گانا تو نہیں آتا البتہ کچھ یوں ہی سا جی بہلا لیتا ہوں۔ شاید آپ کو لطف نہ ملے گا۔

موہن :- نہیں تمہاری آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو گانا آتا ہے کچھ سناؤ۔

نوجوان :- آپ کے ارشاد کی تعمیل میں کچھ عذر نہیں۔

بدل گئے نیناں ..... بدل گئے نیناں

چنھت ناہیں .... بدل گئے نیناں

نوجوان کی سریلی آواز پھر گیت کا موضوع خود اتنا دلکش تھا کہ دونوں پر کیفیت طاری ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹوٹے ہوئے ساز سے نغمہ مجروح نغمہ غمزدہ نکل رہا ہے۔ موہن کی عجیب حالت تھی۔ آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ مستانہ وار جھومنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ نوجوان کی آواز میں اتنی دلکشی کہاں سے آئی۔ اس نے اکثر سندر کو بھی گاتے سنا تھا اور اس نے جب پہلی مرتبہ نوجوان کو گاتے سنا تھا یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ بہشتی نغمہ ہے جن کا مقابلہ صرف حوریں اور وہ بھی منتخب حوریں کر سکتی ہیں اور یہ بھی کچھ ضروری نہیں ہے اس کو حیرت تھی کہ وہی لحن وہی حلاوت وہی دلربائی آج اس نوجوان میں محسوس کر رہا ہے یہ کیوں؟ جسم سے جان نکلنے کے لئے بیتاب ہوتی جاتی ہے کیا وہی لحن اس نغمہ میں بھی سمایا ہے؟

نوجوان اپنے نغمہ سے مست ہو رہا تھا۔ خود بخود کھڑا ہوگیا اور جھومنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگل کی ہر چیز نغمہ سے متاثر ہو رہی ہے۔ پتے جھوم رہے تھے۔ ہوا نغمہ کی مستی کی مایہ دار بنی ہوئی تھی۔ موہن خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے کان نغمہ کے سرور سے سرشار ہو رہے تھے۔ آنکھوں سے بےخودی کی کیفیت ٹپک رہی تھی۔ مگر اس کی روح کہیں اور تھی۔ نوجوان سے ضبط نہ ہو سکا تحمل کی آخری حد پہنچ گئی وہ یک بیک چلا اٹھا موہن! موہن اور غش کھا کر گر پڑا۔

موہن چونک گیا اس کے حواس بھی مجتمع نہ ہوئے تھے کہ نوجوان کو بیہوش دیکھا فوراً

منھ پر پانی چھڑکا اور بغور دیکھنے لگا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ نوجوان فی الحقیقت ایک دوشیزہ نازنین ہے۔ وہ غور کر رہا تھا اور حیرت بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ اس کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اجنبی عورت نہیں ہے بلکہ سُندر ہی ہے۔ سندر کو کچھ ہوش ہو چلا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو سرہانے موہن کو دیکھا۔ نسوانی حیا سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر موہن نے پکارنا شروع کیا۔ سُندر! سُندر! کیسی ہو؟

سُندر:۔ جی اچھی ہوں۔

موہن:۔ آؤ اُٹھو مصیبت کے ایام گزر گئے۔ اِسی جنگل میں جو تمھارے ہی نام سے موسوم ہے (سُندر بن) زندگی کے بقیہ ایام بسر کریں۔ سُندر کا ہاتھ موہن کے ہاتھ میں تھا۔ گویا محبت کا دائمی پیمان مکمل ہو رہا تھا۔ بکھری ہوئی سیاہ زُلفیں دوشیزگی کی صباحت پر پردہ ڈالے تھیں — موہن اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ کہہ گیا جس کا زبان سے ادا کرنا مشکل تھا۔ سُندر بھی آنکھوں ہی سے سُن رہی تھی اور بول رہی تھی — یہ تزویج کی رسم رسمی الفاظ اور قیود سے بے نیاز انجام پذیر ہوئی۔

چندراوتی

(علی اکبر کاظمی)

رات کو دو بجے مجھے فرصت ہوئی اور بغیر پروف شیٹ پاس کرکے میں نے اُور کوٹ پہنا۔ ٹوپی، چھڑی ہاتھ میں لی اور سگریٹ جلاتا ہوا مورننگ اسٹار کے دفتر سے چورنگی پر نکل آیا۔

یوں تو ۲۶ر دسمبر کو کلکتہ میں ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے۔ لیکن میرے لئے یہ دن بہت انہماک کا تھا۔ اور متحدہ مسلم کانفرنس کے جلسے میں (جو ایک تباہ ہونے والی قوم کی بداخلاقیوں کا بہترین نمونہ تھا) صبح کو تین گھنٹے کامل ضائع کرنے کے بعد واپس آیا تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور چیف اڈیٹر کی آواز سُنائی دی۔

"احسن مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آج کی گھوڑ دوڑ میں وائسرائے کپ کے لئے شہریار کی کامیابی کے آثار اچھے ہیں۔ لیکن چونکہ گھوڑا نیا ہے اور نہایت مخفی طور پر تیار کیا گیا ہے۔ اس لئے نہ لوگوں کو حقیقت کا علم ہے اور نہ سر احسان الزماں کچھ بتاتے ہیں۔ تم تو ان کے پاس آتے جاتے ہو۔ اگر کچھ دریافت کرسکو تو کل گھوڑ دوڑ کی خبروں کے ساتھ اس کا اضافہ بہت دلچسپ ہوگا۔" میں نے کہا "دیکھئے کوشش کرتا ہوں" کہہ کر ٹیلیفون رکھ دیا۔ کانفرنس کی رپورٹ ختم کرکے نیوز اڈیٹر کو دے آیا۔ اور ٹیکسی لے کر سیدھا زمان پیلس پہنچا۔ لیکن سر احسان باہر جا چکے تھے۔ اس لئے مجھے ناکامیاب واپس ہونا پڑا۔

میرے نوکر نے دروازہ کھولا۔ اور کوٹ، ٹوپی اور چھڑی لے کر آنکھیں ملتے ہوئے کہنے لگا "حضور، دو گھنٹے ہوئے سر احسان الزماں نے ٹیلیفون کیا تھا فرمایا تھا کہ جب آپ واپس آئیں تو انھیں خبر کر دیجئے گا۔ وہ منتظر رہیں گے۔" میں نے "اچھا" کہہ کر نشست کے کمرہ میں جا کر ٹیلیفون پر ۶۵۵، پارک، زمان پیلس کا نمبر مانگا اور ایک لمحے میں سر احسان دوسری طرف بولتے ہوئے سُنائی دیئے۔

"جی ہاں، ابھی ابھی واپس،...... ہاں صبح حاضر ہوا ...... شہر یار کی کامیابی ...... حضور دعوت ...... ضرور ...... کیا فرمایا ...... کل گیارہ بجے ...... بہتر ضرور حاضر ہوں گا ...... کیا فرمایا ...... رانی چند راوتی ...... نہیں ابھی تک تو ...... آج صرف پیڈک کے قریب دیکھا تھا ...... ضرور ضرور ...... آپیرا ہاؤس ...... ہاں ہاں ...... ضرور حاضر ہوں گا ...... شکریہ ...... تسلیم" ــــ ٹیلیفون رکھ کر میں دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ کل گیارہ بجے شب کو سر احسان الزماں نے مجھے شب کے کھانے پر بلایا تھا اور مہارانی چند راوتی ان کی خاص مہمان ہونے کو تھیں۔ مہارانی صاحبہ کل آپیرا ہاؤس میں نو بجے سے گانے والی تھیں اور اس کے بعد زمان پیلس میں دعوت تھی لیکن میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر سر احسان اور رانی چند راوتی کا کیا جوڑ کہ پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور مورننگ اسٹار کے چیف اڈیٹر کی آواز آئی "احسن، دیر سے تمھارا نمبر مانگ رہا ہوں لیکن جب جواب ملا "مشغول" آسن سول کے آگے پنجاب میل اک مال گاڑی سے ٹکرا گئی ہے۔ چار بجے ریلیف ٹرین جائے گی۔ تم مہربانی کر کے تھوڑی دیر دم لے کر ہوڑہ چلے جاؤ۔ ابھی کسی اور اخبار کو خبر نہیں ہے" "بہت بہتر" کہہ کر میں نے ٹیلیفون پٹک دیا۔ کمبخت، یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ ابھی تو تھکا ماندہ گھر آیا تھا اور ابھی یہ حکم کہ بر دوان جاؤ۔ اخبار کے نامہ نگاروں کی زندگی بھی اک عذاب ہوتی ہے۔

میں نے دوسرے دن دس بجے واپس آکر غسل کیا۔ خدمت گار نے "ڈنر سوٹ" پلنگ پر پھیلا دیا تھا۔ کپڑے بدل کر میں ٹہلتا ہوا آپیرا ہاؤس کو روانہ ہو گیا۔ راہ میں سوچنے لگا کہ آخر سر احسان الزماں جیسے معزز بیرسٹر نے جن کی عورتوں سے نفرت ہر ایک کو معلوم تھی۔ مہارانی چند راوتی اور اُن کے ساتھ اور پھر کئی عورتوں کو کیوں اپنے گھر بلایا تھا۔ جہاں تک مجھے علم تھا۔ سر احسان کی بیوی زندہ نہ تھیں اور آج تک انھوں نے عورت کی اپنے گھر دعوت نہ کی تھی۔ اور عموماً ایسے جلسوں اور ایسی دعوتوں میں کم جایا کرتے تھے جہاں عورتیں ہوتی تھیں۔ پھر ابتدا بھی ہوئی تو مہارانی چند راوتی سے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مہارانی صاحبہ وسط ہند کے ایک اوسط درجہ کی ریاست فتح پور کے راجا کی بیوی

تھیں ـ مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ یہ مہاراجہ فتح پور کی چوتھی بیوی تھیں یا گیارھویں۔
مدت تک یہ حرم سرا میں ایک گمنام زندگی بسر کرتی رہیں۔ غالباً ان کے وجود کا مہاراجا
کے چند خاص ملازمین کے علاوہ کسی اور کو علم بھی نہ تھا۔ مہاراجہ فتح پور جب ایک وفد
کے ساتھ انگلینڈ جانے لگے تو معیت کے لئے انھیں کا انتخاب ہوا۔ اور بمبئی پہنچ کر مہارانی
کا بےنقاب ہونا تھا کہ ان کے حُسن و جمال کا شہرہ دور دور پہنچ گیا۔ اب تو جس اخبار
اور جس میگزین کو اُٹھا کر دیکھو ان کے حالات اور ان کی تصویروں سے بھرے نظر آتے
تھے۔ کہیں مہارانی جی پوجا کر رہی ہیں تو کہیں ستار بجا رہی ہیں۔ کہیں پر شیر کا شکار ہو رہا
ہے تو کہیں نیزہ بازی کی مشق ہو رہی ہے۔

یورپ پہنچ کر ان کا اور بھی شہرہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب وہ مونٹے کارلو پہنچی
ہیں تو ان کی شہرت سے سارا یورپ گونج رہا تھا۔

نیس اور مونٹے کارلو بحر روم کے کنارے دو ایسی جگہیں ہیں جہاں ساری دُنیا کے
دولت مند سیر و تفریح کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ جہاں دُنیا کی حسین ترین عورتوں کا اجتماع ہوتا
ہے اور جن میں سے ہر ایک لاکھوں کے زیور سے لدی ہوتی ہے لیکن اس حسین مجمع میں
بھی مہارانی چندرا وتی گل سرسبد کی طرح سب سے الگ نظر آتی تھی۔ اُس زمانہ میں روسی
شاہی خاندان کے جواہرات بک رہے تھے اور یورپ اور امریکہ کے کروڑ پتی بڑھ بڑھ کر قیمت
لگا رہے تھے۔ مگر مہاراجا فتحپور نے اتنے دام لگا دیئے کہ امریکہ کے کروڑپتی تاجروں کے چھکے
چھوٹ گئے۔ اگر ان تاجروں نے مٹی کے تیل، سُوّر کے گوشت اور دیا سلائیاں بنا کر اور
بیچ کر دولت کمائی تھی تو فتحپور کے مہاراجانے سیکڑوں برس کے جمع کئے ہوئے خزانے ترکہ
میں پائے تھے۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ اس ایک خریداری کے بعد فتحپور میں ملازمین کو کئی مہینے
تنخواہ نہ ملی۔ بہت سی کمپنیوں کے بِل ادا نہ ہو سکے۔ رعایا پر ٹیکس دو چند ہو گیا اور پھر بھی مہاراجا صاحب
کو نج کی جائداد کا نصف حصّہ رہن کر دینا پڑا۔

جب مہارانی صاحبہ لندن پہنچیں تو رٹز ہوٹل کے اُن کمروں میں اُتریں، جن میں
یا تو چارلی چیپلین، ڈگلس فیربینک، میری پکفورڈ جیسی ہستیاں قیام کرتی ہیں۔ یا سابق

شاہ اسپین اور سابق شاہ ایران جیسے بے فکر اور آزاد بادشاہ ٹھہرا کرتے تھے۔ خاصہ کے کمروں کے علاوہ، احباب، مصاحبین اور ملازمین کے لئے مہاراجہ نے کارلٹن ہوٹل کی پوری ایک منزل کرائے پر لے رکھی تھی۔ لندن کے انتہائی رونق اور چہل پہل کا زمانہ تھا۔ شہزادی ویلز شادی کے بعد پہلے پہل مارل برا ہاؤس میں مقیم ہو کر سوسائٹی کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ دن کو قصر بکنگھم یا رانا لے میں پولو کے شاندار میچ ہوا کرتے تھے۔ ایسکٹ کی گھوڑ دوڑ اور ہنلے کی کشتی رانی میں جانا ضرور تھا۔ شب کو دعوتیں تھیں اور پھر رقص کے جلسے۔ تھیٹر تھے اور اُن کے بعد نائیٹ کلب میں صبح کے چار پانچ بجے تک جام شراب کے دور اور مستانہ وار ناچ۔ سارا لندن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور ہر جلسہ اور ہر تقریب میں مہارانی موجود رہتی تھیں۔

ایک شب جرمن سفارت میں کھانا تھا۔ کسی بات پر مہاراجہ فتح پور اور کونٹ موسکو وچ، روس کے قدیمی شاہی خاندان کے ایک رُکن سے کچھ بحث ہو گئی مہاراجہ نے کچھ سخت کہا اور کونٹ نے شراب کا گلاس ان کے مُنہ پر کھینچ مارا۔ دوسری شب کو رچمنڈ پارک میں پوشیدگی سے کونٹ اور مہاراجہ میں (ڈویل) جنگ ہوئی۔ اور دونوں ایک دوسرے کی گولی کھا کر گرے اور مر گئے۔

فتح پور میں مہاراجہ کمار کی نابالغی کی وجہ سے ریجنسی قائم ہو گئی۔ ریاست کا انتظام مجلس انتظامیہ کے سپرد ہو گیا، جس کے صدر ایک انگریز مقرر ہوئے۔ اخراجات میں کمی ہونے لگی۔ دوڑ کے گھوڑے، کتے اور موٹریں نیلام ہونے لگیں۔ زائد ملازم برخاست کر دیئے گئے مہارانیوں کے گذارے کے لئے مختصر سی تنخواہیں مقرر ہو گئیں اور ایسی عورتیں جنھیں مہاراجہ نے شادی بغیر محل میں ڈال رکھا تھا کچھ دے دلا کر ریاست سے نکال دی گئیں۔ چندراوتی کا بھی یہی حشر ہوا۔ ریاست کے جواہرات فوراً وزیر ہند کے حکم سے چھین لئے گئے اور چند ہی دنوں میں یہ غریب عسرت کی زندگی بسر کرنے لگی۔ مگر مہاراجہ اور کونٹ کی موت نے ان کی کافی شہرت کر دی تھی۔ ہر اخبار اور ہر میگزین میں ان کے حالات اور ان کی تصویریں چھپتی تھیں۔ اخبار والوں نے ہزاروں روپے دے کر من گھڑت افسانے اور خیالی قصّے ان کے ناموں سے چھاپے۔ صابن، منجن اور سُرمہ مستی والوں نے بھی بڑی

رقمیں خرچ کرکے سندیں حاصل کیں۔ ناگن کے سے لہرائے ہوئے بالوں اور موتی کے سے صاف دانتوں کی تصویریں لی گئیں۔ لیکن وہ عورت جس نے ہزاروں، لاکھوں اپنی ادنیٰ ادنیٰ خواہش پر لٹائے ہوں۔ جس نے اپنی آرائش اور آرام پر دولت پانی کی طرح بہائی ہو۔ وہ کب تک اس طرح کی بے مزہ زندگی بسر کرسکتی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں رولینڈ لاسکی جو امریکہ اور یوروپ کے کئی کئی بڑے بڑے تھیٹروں کا مالک تھا۔ اپنے خاص ہوائی جہاز پر لندن آیا۔ اور ایک بڑی رقم دینے کا وعدہ کرکے دو سال کے لئے ان سے معاہدہ کرالیا کہ ہفتہ میں دو روز مہارانی اسٹیج پر جاکر ناچیں اور گائیں گی۔

اخباری تشہیر بھی وہ جادو ہے کہ معاذاللہ۔ اب تو جس شہر میں مہارانی گانے والی ہوتیں، وہاں ہفتوں بلکہ مہینوں پہلے سے شہر کے ہر مشہور اور ممتاز مقام پر ان کی قد آدم تصویروں کے اشتہار ہوتے۔ کہیں پر ان کی ہندوستانی زندگی کا منظر ہوتا۔ کہیں یوروپ کے سفر کے مرقعے۔ اور کہیں مہاراجہ اور کوئنٹ سے گولی چلتی دکھائی جاتی۔ غرض اشتہار کے ذریعہ سے لوگوں میں ایک خاص شوق اور ایک خاص ہیجان اور بے چینی پیدا کی جاتی۔ ہفتوں پہلے سے شہر کے لوگ سوائے اس کے کسی اور مضمون پر گفتگو ہی نہ کرتے تھے۔ مہارانی کے آنے سے بہت پہلے تھیٹر کے کل ٹکٹ بک چکے ہوتے۔ قبل سے کسی ایک جگہ دو ایک دن سے زیادہ قیام کا ارادہ ظاہر نہ کیا جاتا۔ لیکن اگر پبلک میں مزید شوق دیکھا جاتا تو دو ایک دن اور بھی ٹھہر جاتیں۔ ایک کے بدلے دو تین تماشے ہوتے۔ ٹکٹ کے دام دوگنے تگنے کردیئے جاتے الغرض لاسکی نے مہارانی کے ذریعہ سے اور مہارانی نے لاسکی کے ذریعہ سے کافی دولت حاصل کی۔

دو برس کے بعد جب لاسکی کے معاہدہ کی مدت ختم ہوئی تو امریکہ اور یوروپ کے تھیٹر والوں میں لاگ ہوگئی۔ لیکن چندراوتی نے چونکہ اتنے دنوں میں اچھی طرح دُنیا دیکھ لی تھی اور وہ اپنے حُسن کی جادوگری اور اپنی جوانی کی مقناطیسی قوت سے آگاہ تھیں۔ اس لئے خود انھوں نے براہ راست اپنا کاروبار شروع کیا۔ اور خود اپنے انتظام سے رقص و جمال کے تماشے دکھانے لگیں۔ مغربی رئیسوں کو بھی آنے جانے کا موقع دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھن برسنے لگا

اور دولت کی انتہا نہ رہی۔ پانچ سال تک مہارانی یوروپ، امریکہ، جاپان اور چین کے دورے کرتی ہوئی ہندوستان آئیں اور بمبئی میں صرف ایک شب گانے کے بعد آج کلکتہ کے آپیرا ہاؤس میں وائسرائے اور اُمرائے ہند کے سامنے نغمہ زن ہونے والی تھیں۔

میں انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا آپیرا ہاؤس پہنچ گیا۔ سامنے فوج کا پہرہ تھا۔ مورننگ اسٹار کے نامہ نگار ہونے کی وجہ سے مجھے ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہال میں رستم جی منیجر ملے اور اُنھیں کے ساتھ میں بھی ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ سارا تھیٹر جواہرات سے جگمگا رہا تھا۔ وائسرائے اور گورنر کے علاوہ بہت سے اُمراء جمع تھے۔ اسٹیج پر مہارانی گا رہی تھیں۔ ہندوستان کا ہر باجا اکٹھا کیا گیا تھا۔ ان کی وردیاں زرق برق تھیں۔ ان کے آگے بیس پچیس حسین کمسن عورتوں کا مجمع تھا اور ان کے جھرمٹ میں مہارانی ناچ ناچ کر اور بھاؤ بتا بتا کر گا رہی تھیں۔ ان کے لباس اور ان کے زیورات کا حال بیان کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ گو ریاست فتح پور کے دیئے ہوئے جواہرات چھن گئے تھے لیکن فتحپور جیسے بیسوں والیان ریاست اور مغربی لارڈ اور کروڑپتی تاجروں کے دیئے ہوئے جواہرات مہارانی کے جسم پر چمک رہے تھے۔ ان کا حُسن اب بھی باقی تھا۔ جسم میں ابھی تک چھریرا پن موجود اور انداز رعنائی میں ابھی تک جادو بھرا تھا مالکوس گا رہی تھیں اور اس پانچ سروں کی راگنی میں وہ باتیں پیدا کر رہی تھیں کہ انگریز بھی سر دُھن رہے تھے اور لیڈیاں بھی موسیقی سے متاثر ہو کر پاؤں پٹک رہی تھیں۔ مالکوس کے بعد ایک انگریزی گانا شروع ہوا جو دادرا کے طرز پر بندھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کہروا ناچ نے مجمع کے ہر فرد کو آپے سے باہر کر دیا تھا۔ سب سازندے تھے۔ صرف میاں مراد علی پٹنہ والے کی سارنگی بج رہی تھی۔ ان کا جے پوری صافہ، گلابی کمخواب کی شیروانی گلے میں اور موٹی طلائی زنجیر سازندوں میں انھیں ممتاز بنائے ہوئے تھی۔ ان کے سیاہ گلپھے اور گھنی مونچھ اور بھرتان کی ہر لپیٹ اور تاروں پر اُنگلیوں کی ہر سوت کے ساتھ ان کے سر کا ہلنا اور ہر کن اور مرکی پر ان کے مُنھ کا بننا بگڑنا بہت پُرلطف منظر تھا۔ میاں ریاض بھی آہستہ آہستہ ٹھیکا دیئے جا رہے تھے اور جب بایاں دبنے لگتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑا کبوتر بول رہا ہے

اور دل میں ایک خاص گدگدی سی معلوم ہوتی تھی۔ غضب کا سماں تھا۔ رقص کے اختتام پر تحسین کا ہنگامہ تالیوں کا شور رہا۔ مہارانی ایک عجیب انداز دلربائی سے سر جھکائے کھڑی رہنے کے بعد اسٹیج سے اتر کر وائسرائے کے سامنے گئیں۔ جنھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ مبارکباد دی اور پھر رخصت ہوئے۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ میں بھی باہر نکل آیا اور ٹیکسی لے کر زمان پیلس پہنچا۔

زمان پیلس دولھن کی طرح سجا ہوا تھا۔ باغ کے ہر ہر درخت کی ڈالیوں اور روش کے کنارے کنارے جھاڑیوں میں قمقمے روشن تھے۔ سر احسان مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ میرے پہنچتے ہی مہارانی چند راوتی اپنی بہت بڑی ہسپانو سوئزا، سوہارس پاور کی موٹر پر تشریف لائیں۔ یہ گاڑی انھوں نے خاص اپنی فرمائش سے بنوائی تھی اور خالص چاندی کی تھی۔ دروازوں کے دستے سونے کے تھے۔ اس گاڑی کی تصویریں میں کئی بار دیکھ چکا تھا مگر اس وقت جو اسے دیکھنے کا موقع ملا تو میں حیران رہ گیا۔

جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو تمام مہمان جمع تھے۔ جن میں مسٹر جیمس فریزر چیف جسٹس سر چارلس فرگوسن پولس کمشنر۔ جنرل سر ہنری اسٹوارٹ بنگال کی فوجوں کے افسر اعلیٰ۔ جسٹس کمار ناتھ بنرجی وائس چانسلر۔ نواب محسن علی آف براج پور۔ کرنل چانسلر پرنسپل میڈیکل کالج۔ راجہ سر ندر ناتھ سین صدر مجلس سونارامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میرے والد سر احسان الزماں کے منشی تھے اور ان کے انتقال کے بعد سر احسان ہی نے مجھے تعلیم دلوائی تھی۔ کیمبرج بھیجا تھا۔ صحافت کی تعلیم دلوائی تھی اور انھیں کی سفارش سے سوزنگ اسٹار جیسے معزز انگریزی اخبار کا نامہ نگار ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی اولاد کی طرح جانتے تھے اور مجھے پیلس کی ہر دعوت اور ہر تقریب میں بلایا کرتے تھے۔

زماں پیلس کا ڈرائنگ روم کلکتہ کا سب سے عمدہ اور آراستہ کمرہ۔ یورپ کے متعدد رسالوں میں اس کے فوٹو نکل چکے تھے۔ اس کمرہ کی قلمی تصویریں اس کے ایرانی قالین سیکڑوں برس کے قدیم چینی کے گلدان اور کھلونے۔ ہاتھی دانت کے مجسمے اور سامان آرائش ایسی چیزیں تھیں جو دنیا میں نایاب تھیں اور جنھیں دیکھے بغیر کوئی امریکن سیاح کلکتہ سے چلا نہیں جاتا تھا۔

مہارانی کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی دوسرے مہمانوں نے ان کے گرد جھرمٹ کرلیا۔ سر احسان نے ایک ایک سے تعارف کرایا اور سبھوں نے اپنی خوش قسمتی کا اظہار کیا۔ مہارانی کی اعلیٰ موسیقی اور بہترین رقص کا ہر شخص معترف تھا۔ اور ہر شخص کی زبان سے واہ واہ اور سبحان اللہ نکل رہا تھا۔ خادم نے مودّب لفظوں میں خاصہ چُنے جانے کی اطلاع کی۔ سر احسان نے مہارانی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور وہ مسکراتی ہوئی ان کے بازو پر سہارا دے کر کھانے کے کمرہ کی طرف بڑھیں۔ چھپی ہوئی فہرست ہم سبھوں کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ جس میں میز کے گرد ہر ایک کی مخصوص جگہ بنی ہوئی تھی اور ایک ساتھ جانے والے مرد عورت کے نام لکھے تھے۔ ہر ایک اپنی لیڈی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیچھے ہولیا۔ میں راجا کمار ناتھ کے ساتھ سبھوں کے عقب میں تھا۔

زمان پیلس کے کھانے کے کمرہ کے بلوریں میز اور بلوریں کُرسیاں بوہیمیا کے شاہی محل کی تھیں۔ جنگ عظیم کے بعد جب اس خاندان سے تخت چھن گیا اور شاہزادے آوارہ وطن ہوگئے تو سر احسان نے ایک ایجنٹ کے ذریعہ سے اسے ایک کثیر رقم دے کر حاصل کیا تھا۔ دور سے انگریزی باجوں کی دلکش آواز آنے لگی اور کھانا شروع ہوا۔ ہر شخص ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ لیکن سبھوں کی نظر مہارانی کی طرف تھی اور سب انھیں کی باتیں سُننے کے مشتاق تھے۔ کھانا ختم ہونے کے بعد سر احسان کھڑے ہوگئے۔ گفتگو بند ہوگئی۔ اور ہر شخص ان کی طرف مخاطب ہو کر ہمہ تن گوش ہوگیا۔ سر احسان نے آہستہ آہستہ رُک رُک کر اپنی تقریر شروع کی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کسی جذبے کو روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اُن کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں اور وہ رہ رہ کر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے جا رہے تھے۔

"میرے عزیز دوستو! یہ کوئی سیاسی مجمع تو ہے نہیں۔ صرف میرے چند خاص احباب کی محبت ہے۔ جنھوں نے میری ناچیز دعوت قبول کر کے مجھے ممنون ہونے کا موقع دیا ہے۔ آج میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں، مجھے زیبا ہے۔ کیونکہ فخر جہاں، بلبل ہندوستان مہارانی چندراوتی صاحبہ نے میرے گھر آ کر مجھے دُنیا کا سب سے خوش قسمت شخص بنا دیا ہے۔

حضرات! آپ میں سے کون ایسا ہے جو برسوں سے مہارانی کے دیکھنے کا متمنی نہ تھا اور میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ سے مہارانی کی جو تصویر ہم نے اپنے دلوں میں کھینچی تھی۔ اُس سے انھیں کہیں بڑھ کر پایا۔ دوستو! آخر جادو ہے کیا؟ جادو نام ہے حسن کا۔ آواز کا اور دولت کا۔ اور اگر دُنیا اور آجکل کی روشن خیال اور ترقی یافتہ دُنیا میں کوئی سچا جادوگر ہے۔ یا یہ کیوں نہ کہوں کہ جو خود مجسّم جادو ہے وہ ہماری مہارانی صاحبہ ہیں۔ ان کا دلرُبا حُسن وجمال، ان کا دلکش ترنم، ان کی بے پایاں دولت اگر جادو نہیں تو کیا ہے۔ (تحسین کے پُرزور نعروں اور گونجتی ہوئی تالیوں نے اس مدح سرائی کی تائید کی۔ مہارانی شرم سے سر جُھکائے اپنی انگوٹھیوں سے کھیل رہی تھیں۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔

"حضرات! میں ڈرتا ہوں کہ آپ نے ان جملوں کو شاعرانہ تخئیل سمجھا ہو۔ مگر مجھے بتائیے کہ ہندوستان میں زہرہ بائی اور بی حیدر سے لے کر بی گوہر اور بی نور جہاں تک اور کالکا بندا دین سے بی چودھرائن تک کون ایسا تھا اور ہے، جس کے رقص و سرود میں وہ اثر ہو، جو مہارانی کے ناچ گانے میں ہے، اور یوروپ میں مدام یا دالدوا اور مدام لاپاکودا، ٹٹرازینی اور گھیلی کرسی یا ڈیم کلارابٹ، ان میں سے کون ہے جو ہماری مہارانی کا مقابلہ کر سکے۔ نہیں، دوستو میں سچ کہتا ہوں کہ مہارانی کے کمال پر ہندوستان جتنا بھی ناز کرے بجا ہے۔ اور مغربی مہذب قومیں ان کی جتنی عزت کریں، کم ہے" (تحسین کا شور)

سر احسان اتنا کہہ کر خموش ہو گئے۔ پانی کا ایک گھونٹ پی کر چہرہ کا پسینہ پونچھا اور اب جو اپنی تقریر کا سلسلہ شروع کیا تو بہت دھیمی آواز میں اور اس طرح جیسے اپنی کسی بات پر نادم ہوں۔

"لیکن میرے دوستو! مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ مجھ جیسے زاہد خشک کو رقص و سرود سے کیا تعلق۔ تو سُنئے، آج میں اپنے اس راز کو ظاہر کرتا ہوں جو آج پندرہ سال سے میرے دل میں پنہاں ہے۔ اور اس وقت میں اس مہر کو توڑنے کھڑا ہوا ہوں جو میرے لبوں پر ایک مدت سے لگی ہوئی ہے۔"

اتنا کہہ کر سر احسان بیٹھ گئے۔ اور سارے مہمان کسی غیر معمولی اثر سے متاثر ہو کر ان کی طرف جھک گئے۔ میں نے دیکھا کہ مہارانی گھبرا گھبرا کر متاثر ہو کر ان کی طرف دیکھتی اور کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن چپ رہ جاتی تھیں۔ ان کا گلاب سا چہرہ افسردہ ہو گیا تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک رہے تھے۔ سر احسان نے پانی کا ایک گھونٹ پیا اور بیٹھے ہی بیٹھے کہنا شروع کیا۔ کمرہ میں سناٹا تھا ہماری سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ خادم کمرہ سے باہر چلے گئے تھے۔

"دوستو! آج سے پندرہ سال قبل میں شہر گیا میں ضلع کا ایک معمولی بیرسٹر تھا چھوٹی جگہ تھی۔ وکیلوں کا زور تھا۔ میرا اپنا آبائی مکان تھا۔ مختصر سی جائداد بھی تھی۔ سادہ زندگی تھی۔ خوشی کے ساتھ سفید پوشی سے کٹی جاتی تھی۔ میری شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ لیکن میری بیوی کا شادی کے دو سال بعد انتقال ہو گیا تھا۔ صرف ایک لڑکا تھا۔" ـــــ سر احسان کچھ دیر کے لئے پھر چپ ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ مہارانی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ سانس چڑھ رہی تھی اور آنکھوں سے خوف کی جھلک نمودار تھی۔ سر احسان کی آواز اور بھی دھیمی تھی اور گویا وہ ہمارے سوا کسی دوسرے کو مخاطب کر رہے تھے یا اپنے دل سے بول رہے تھے۔

"میرے بچے نے میرے ماں باپ کے ساتھ پٹنہ میں پرورش پائی تھی۔ وہیں پڑھ بھی رہا تھا۔ صرف چھٹیوں میں میرے پاس چلا آیا کرتا تھا۔ اب جوانی کا آغاز تھا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں۔ بی اے کا امتحان دے کر میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اُس کی دل بستگی کے لئے گراموفون منگا دیا تھا۔ ناول خرید دئے تھے۔ گھوڑا لے دیا تھا۔ غرض اس کی دلجوئی میں ہر طرح کوشاں تھا اور اس پر اپنی جان فدا کرنے کو ہر طرح موجود تھا۔ اس وقت یہ اپنی ماں سے بہت مشابہ تھا اور جب میں اسے دیکھتا تھا تو اس کی ماں کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی۔" (باوجود ضبط سر احسان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور ہر شخص ان کی یہ حالت دیکھ کر بہت متاسف تھا)

"ایک روز میں ایک سنگین مقدمہ میں مشورہ کے لئے کہیں گیا ہوا تھا۔ دیر ہو گئی

رات کے بارہ بجے واپس آیا اور سو رہا۔ دو بجے ہوں گے کہ ایک جگر خراش چیخ کی آواز آئی اور بے قراری کے ساتھ تڑپ کر میں مکان کے اُس طرف دوڑا، جہاں میرا بچہ سویا کرتا تھا۔ لالٹین دھیمی جل رہی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر دیکھا کہ میرا بچہ پلنگ کے کنارے بیٹھا دونوں ہاتھوں سے کلیجہ کو سنبھالے جھکا ہوا خون تھوک رہا ہے۔ یہ دیکھ بے قراری اور بیتابی سے ایک دل ہلا دینے والے کرب کے ساتھ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کی حالت پوچھی اور اُس نے رُک رُک کر ہچکیاں لے لے کر اپنا دُکھڑا سُنایا۔ میں نے خادم کو جگایا۔ ڈاکٹر کے گھر بھیجا۔ مگر بھلا دو بجے رات کو ڈاکٹر جلدی کیا آسکتے تھے، دیر ہوئی۔ میں سر پیٹتا رہ گیا اور میرے بچے نے میری گود میں تڑپ کر جان دے دی۔" (سر احسان کے ہچکیاں بندھی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے)

"دوستو۔ اب میرے لئے کیا باقی رہ گیا تھا۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیری تھی اور زندگی برباد۔ ایک مدّت تک میری حالت دیوانوں کی سی رہی۔ سخت علیل ہوگیا تبدیل آب و ہوا کے لئے یورپ چلا گیا۔ ڈیڑھ سال کے بعد جب گیا واپس آیا تو ہر ہر کونہ میں خون کے دھبے نظر آنے لگے۔ رہ رہ کر جگر خراش چیخ کی آواز سُنائی دینے لگی۔ گھر کاٹے کھاتا تھا۔ میں نے اسے بیچ کر اس کی قیمت یتیم خانہ کو بھیج دی اور کلکتہ آکر پریکٹس شروع کی۔ خدا نے میری زبان میں اثر دیا۔ کام اچھا چلنے لگا۔ مقدمات نکلنے لگے اور دو تین سال میں ایک مشہور اور نامی بیرسٹر ہوگیا۔"

سبھوں نے سمجھا کہ یہ دُکھ بھری داستان ختم ہوگئی۔ مگر گو میں سر احسان کی تقریر کا ایک ایک لفظ سُن رہا تھا، میری نظر مہارانی کے چہرہ پر تھی۔ ایک عجیب انتشار اور گھبراہٹ کا عالم تھا۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ رنگت زرد پڑگئی تھی۔ سر احسان نے پھر شروع کیا۔

"حضرات! آپ یہ سُننے کے منتظر ہوں گے کہ آخر میرے بچے کو ہو کیا گیا تھا۔

"میرے دوستو، گیا میں میرا مکان اُس سڑک پر تھا جو چوک کے پشت پر

واقع ہے۔ میرے مکان کے سامنے مُنّا نامی ایک طوائف رہتی تھی اور اُس کی ایک لڑکی تھی تارہ ...." سر احسان کی زبان سے یہ نام نکلا ہی تھا کہ مہارانی کے مُنہ سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی ۔" نواب صاحب ......" شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ لیکن سر احسان نے ہاتھ کے اشارے سے چُپ رہنے کو کہا۔

"دوستو، جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا تھا، تارہ اُن دنوں جوان ہو رہی تھی اس کے حُسن کے چرچے ہونے لگے تھے۔ ذہین اور طبیعت دار تھی۔ اچھا گانے لگی تھی۔ مجرے شروع ہو گئے تھے اور دو ایک ریاستوں میں بھی ہو آئی تھی۔ میرا بچّہ اپنے شباب کے آغاز میں اس پر عاشق ہو گیا وہ مجھ سے چھپ چھپ کر اس کے گھر جانے لگا۔ مگر اُس کے گھر پچھم کے کسی راجہ کا ملازم آیا ہوا تھا۔ تارہ کی ماں نے اسے آنے جانے سے منع کیا۔ مجھے مطلع کر دینے کی دھمکی دی۔ مگر کمسن بچّہ اور وہ بھی پہلا عشق، تارہ بھی اس کی طرف ملتفت تھی۔ آخر ایک دن ماں بیٹی میں بحث ہو گئی۔ ماں نے عشق کی آزمائش کے لئے تارہ سے فرمائش کی کہ وہ میرے بچّے کو شراب پلائے۔ دوسری رات جب میرا بچّہ گیا تو تارہ نے شراب بڑھائی۔ اس نے انکار کیا۔ لیکن جب تارہ نے یہ کہا کہ ماں نے عشق کی یہی آزمائش رکھی ہے تو اس نے پی لی۔ دوستو! ممکن ہے کہ تارہ کو نہ معلوم ہو کہ اس شراب میں کیا ملا تھا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس شراب نے چند گھنٹوں میں مجھ سے میرے جگر کے ٹکڑے کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے جُدا کر دیا۔

"دوستو! دم توڑتے ہوئے بچّے نے مجھ سے دو وعدے لئے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس کی اس طرح کی موت کی کسی کو خبر نہ دوں گا۔ میرا بچّہ بڑا غیور تھا اسے عزّت کا بڑا خیال تھا اور مرتے وقت بھی یہی خیال تھا کہ خاندان کے نام پر دھبّہ نہ لگے۔ اور دوسری یہ فرمائش تھی کہ میں اپنی بیوی کے زیورات تارہ کو دے دوں کیونکہ وہ تارہ سے ان کا وعدہ کر چکا تھا۔"

"میرے عزیز دوستو، پہلی فرمائش میں نے آج تک پوری کی۔ لیکن دوسری فرمائش کے لئے جب میں نے پورنی سے واپس آ کر سُنا اور تارہ کو دریافت کیا تو

معلوم ہوا کہ وہ دونوں اس کے مرتے ہی شہر سے کہیں اور مقام پر چلی گئی تھیں۔ میں نے بڑی کوشش کی مگر پتہ نہ چلا۔"

(سر احسان پھر چپ ہو گئے اور میں نے دیکھا کہ چیف جسٹس اور پولیس کمشنر متوحش نظر آرہے تھے)

"دوستو۔ میری داستان ختم ہو گئی۔ صرف چند کلمے اور ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے میں ایک مقدمہ میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک رات جی گھبرایا تو تھیٹر چلا گیا۔ مگر آپ میری حیرت کا اندازہ نہیں کر سکتے، جب میں نے دیکھا کہ وہی تارہ اسٹیج پر کھڑی گا رہی تھی۔ مزید احتیاط کے لیے میں نے اپنا کارڈ بھیجا اور ان کے ڈریسنگ روم میں ان سے ملاقات کی۔ یہ مجھے بالکل پہچان نہ سکی۔ کیونکہ میرا نام بدلا ہوا تھا۔ پہلے داڑھی نہ تھی اور اب سفید داڑھی ہے۔ بہر حال مجھے یقین ہو گیا کہ تارہ یہی ہے۔ حضرات میں اتنی مدت کے بعد آج اپنے بیٹے کی قاتلہ سے بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ دل میں ہزاروں طرح کے جذبے پیدا ہو رہے تھے۔ بچے کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔ خون کے دھبے ہر طرف نظر آرہے تھے۔ تارہ کا گلا گھونٹنے کو بے قرار ہو رہا تھا....

......" ابھی سر احسان نے اپنا جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ مہارانی غش کر گئیں۔ ہم سب اُن کی طرف دوڑے۔ مگر سر احسان نے ہمیں اپنے مقام پہ بیٹھے رہنے کو کہا۔

"دوستو! کیا اب اس کے کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ تارہ کون تھی۔ آپ کی اور ہماری مہارانی چندراوتی۔"

ہم سبھوں کا حیرت سے عجیب عالم تھا "کہاں فتحپور کی مہارانی اور کہاں گیا کی ایک طوائف۔"

مہارانی غش سے چونک رہی تھیں "سر احسان، نواب صاحب رحم۔ خُدا جانتا ہے میں زہر سے واقف نہ تھی۔ میری ماں نے مجھے بھی دھوکا دیا تھا۔

سر احسان نے مسکرا کر کہا "بیوی ہر چند مجھے آپ کے بے قصور ہونے کا یقین ہے مگر میں بھی آپ کا دیکھنا گوارا نہ کرتا اگر مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا نہ ہوتا۔

سر احسان نے اُٹھ کر گھنٹی بجائی اور ایک بوڑھا خادم لکڑی کا ایک پُرانا صندوقچہ لے آیا۔ سر احسان نے اسے کھول کر چاندی سونے کے معمولی معمولی پُرانے اور میلے زیور نکالے اور ایک ایک کر کے مہارانی کو پہنانے لگے۔ ہم سب ساکت متحیر بیٹھے دیکھ رہے تھے مہارانی کی خوفزدہ آنکھیں سر احسان کے ہاتھوں کی ہر گردش کو گھوم گھوم کر دیکھ رہی تھیں۔ مہارانی کے جسم پر قیمتی جواہرات کے ساتھ یہ بھدے گہنے عجیب طرح کے معلوم ہو رہے تھے۔

سر احسان کے گھنٹی بجانے پر اُسی بوڑھے خادم نے الماری کھول کر شراب کی ایک بوتل نکالی اور سر احسان کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ سر احسان نے اپنا گلاس بھر لیا اور کھڑے ہو کر کہنے لگے۔

"میرے معزز دوستو۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ اتنی دیر تک میری پُرغم داستان سُنتے رہے۔ مگر آج کی صحبت غنیمت تھی اور مجھے آپ کو اس کا شاہد بنانا تھا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ رہ گیا مہارانی چند راوتی کا فیصلہ وہ خُدا کے ہاتھ میں ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ اب مجھے دُنیا میں زندہ رہنے کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر سر احسان نے ہماری طرف سر تسلیم خم کیا اور اپنے گلاس کی شراب دفعتہً پی گئے اور ساتھ ہی جھوم کر گر پڑے کرنیل چانسلر نے دوڑ کر ان کی نبض ہاتھ میں لے لی مگر طائر روح جسم سے پرواز کر چکی تھی۔ ہم سب پریشانی کے عالم میں سر احسان کے گرد کھڑے تھے کہ مہارانی بھی چیخ کر گریں۔ چیف جسٹس نے دوڑ کر سنبھالا مگر وہ بھی دم توڑ رہی تھیں اور زہر آلود شراب کی باقی نصف بوتل بھی خالی ہو چکی تھی۔

فرض کی قربان گاہ پر

(جمیل مظہری)

دو بھولے بھالے حسین بچے گھر کی انگنائی میں کھیل رہے تھے۔ کھیل رہے تھے اور گھروندے بنا رہے تھے —— بنا رہے تھے اور توڑ رہے تھے۔ چھوٹے کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی کپکڑے کی ایک خوبصورت گڑیا —— معصوم جذبات کا کھلونا —— نابالغ ذوق نظر کے لئے ایک حسین دھوکا —— بڑے کے مضبوط پنجوں نے چھوٹے کے کمزور ہاتھوں سے وہ گڑیا چھین لی اور لے بھاگا۔ گڑیا چھن گئی بغیر کسی عذر کے ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں چلی گئی گڑیا کے سینے میں تو دل ہوتا نہیں اور رہوتا بھی ہو تو زبان نہیں ہوتی کہ اپنی رائے ظاہر کرے کہ کس کے ہاتھ میں رہوں گی۔ جو چھین لیتا ہے اس کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ خود اُسے اُٹھاکر پھینک نہ دے —— اور اگر ٹوٹ جائے ؟ تو بقول غالب "اور بازار سے لے آئیے" —— جو چیز کہ بازار میں کوڑیوں کے مول ملتی ہو اس کی قیمت ؟ —— ہاں تو گڑیا چھن گئی جس کے ہاتھ سے چھن گئی اس نے فریاد کی غل مچایا اور گھر میں جتنے کان تھے ان سب کو اپنی مظلومی کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لوگ دوڑے معصوم نزاع نے سنگین مقدمے کی شکل اختیار کی ججوں نے فیصلہ یہ کیا کہ گڑیا اسی کی ہے جس کے ہاتھ میں ہے دوسرے کے لئے دوسری منگوادی جائے —— ایک گڑیا کے لئے دو کمسن بھائیوں میں یہ نوک جھونک دیکھنے والوں کے لئے تماشا ہو کر رہ گئی لیکن زمانہ کی گرم رفتاری نے بہت جلد انھیں دکھلا دیا کہ یہ تماشہ تماشہ نہ تھا فطرت کا ایک استعارہ تھا۔ مجاز کی تاریکیوں سے ڈھکی ہوئی ایک حقیقت تھی۔ تلخ حقیقت

فطرت جس کی "زبان حال" سے ایک کہانی کہہ رہی تھی۔ ایک ہونے والی کہانی۔ قضا و قدر کا فیصلہ جس کی بنیاد پر ایک افسانہ مرتب کر رہا تھا۔

ایک عجیب افسانہ

(۱)

صبح آفرینش کی پہلی کرن پھوٹی تھی کہ زمین کے سینے پر جو سورج سے الگ ہو کر ایک مستقل سیارہ بن چکی تھی۔ ضرورت محسوس کی گئی ایک ایسی مخلوق کی جو مقاصد فطرت کی کارفرمائی کر سکے ——— ارادے نے صورت پکڑی "جبریت" نے جسم اختیار کیا۔ التہاب و حرارت نے روپ بدلا ——— مرد کی تخلیق ہوئی ——— اور فطرت کا یہ شاہکار اوّلین زمین کے سینے پر خوش خرامیاں کرنے لگا۔ فضائے بسیط نے مہمان عزیز کے استقبال کے لئے اپنی گود پھیلا دی ——— پھولوں سے بھری ہوئی گود۔ لیکن پھولوں کی خوشبو اس کے مشام روح کو آسودگی نہ پہنچا سکی۔ ستاروں نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر کچھ اشارے کئے۔ چاند کی روشنی نے دور سے بلائیں لیں۔ بجلی نے ابر کے پردے سے جھانک کر ادائیں دکھلائیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے احساسات لذّت کو لطف اندوز نہ کر سکا مہمان خانے میں چیز بھی اپنے مطلب کی نہ دیکھ کر مہمان کا جی گھبرانے لگا ——— فطرت کی پیشانی پر بل پڑ گئے ——— فکر کے بل۔ "شاہکار ابھی نامکمل ہے" ——— ارادے نے دوسری کروٹ لی دوسرے شاہکار کے لئے جو پہلے شاہکار کو مکمل کر دے۔ کائنات کی ہر چیز نے اپنی لطافتیں پیش کیں لطافتوں کا رس نچوڑا گیا۔ اور رعنائی اور کبریائیت کے امتزاج کے ساتھ ایک مجسمہ تیار ہوا ——— یہ عورت تھی ——— جو دفعتاً آسمان کی بلندی سے شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹی ——— مرد کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے دیکھا کہ کائنات پر ایک نیا رنگ پھر گیا ہے ——— ہر چیز میں ایک نئی زندگی دوڑ رہی ہے۔ پھولوں کی خوشبو اب معلوم ہونے لگی۔ بجلی کی ادائیں اب بہت ہی پیاری نظر آنے لگیں۔ ستاروں کی چشمک میں مزا ملنے لگا۔ ان کے اشارے اب سمجھ میں

آنے لگے ــــــ یہ عورت تھی جس نے دُنیا کو مرد کے لئے مزے دار اور پُرکیف بنا دیا۔ یہ عورت تھی مرد نے جسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اپنی خود داری کھو دی اور برابر کھوتا رہا۔ ذوق نظر نے مرکز ڈھونڈھ لیا ــــــ جذبہ پرستش کو کھلونا مل گیا ــــــ پیشانی میں جتنے سجدے تھے سب ایک ایک کر کے اس کے قدموں پر بکھیر دیئے اور بنانے والا مُنہ دیکھتا رہ گیا ــــــ غرض دل کی یہ ملکہ اپنے حدود سے باہر نکل کر مرد کے دماغ پر بھی قابض ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن متمدن دُنیا نے اصولی حیثیت سے اس کی ہستی کو مرد سے جُداگانہ کوئی مستقل چیز کبھی تسلیم نہ کیا۔ اس کا جواب یہ کہ عورت تخلیق ہوئی مرد کی دلچسپی کے لئے مرد عورت کے لئے نہیں بنا۔ یہی وہ تخیل ہے جس نے ہمیشہ کے لئے مرد کی افضلیت کو عورت پر مسلم کر دیا ــــــ "عورت کھیلنے کے لئے بنائی گئی ہے"۔ اس لئے بنائی گئی ہے کہ مرد کی ضرورتیں اس سے کھیلتی رہیں اس کو اس سے بحث کیا کہ کھیلنے والا کون ہے؟ ہاتھ کس کا ہے؟ لیکن یہ صنعت گری فطرت کی تھی کہ اس نے کھلونے کو بناتے وقت اس کے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی رکھ دیا۔ ایک ننھا سا دھڑکتا ہوا دل جو مرد کی طرح دھڑکتا ہے مرد ہی کی طرح خواہش کرتا ہے کچھ چاہتا کچھ نہیں چاہتا۔ اگر رکھنا ہی تھا تو دل کی جگہ پتھر کا ایک ٹکڑا رکھ دیا ہوتا۔ اور اگر پتھر کے ٹکڑے سے وہ افعال طبعی پورے نہ ہو سکتے تھے تو پتھر کا ٹکڑا نہ سہی ایک ایسا "نیم بیدار دل" سہی جو صرف دھڑک سکتا بول نہ سکتا۔ جو صرف جواب دے سکتا سوال نہ کر سکتا ــــ ہاں تو فطرت کی اس خطرناک غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرد اور عورت کی آبادی میں دلوں کی ٹکر شروع ہو گئی۔ ایک کے غرور نے دوسرے کے غرور کو جھکانا چاہا۔ ایک کی خواہش نے دوسرے کی خواہش کو نگل جانا چاہا۔ فتنوں نے کروٹ لی۔ ہنگاموں نے سر اٹھایا، تعلق کی زنجیریں اور جماعت کا نظام بکھرنے لگا۔ یہ دیکھ کر متمدن حکیم نے "فطرت نابینا" کی اس خطرناک غلطی کی تصحیح کی ضرورت محسوس کی اور عورت کے دل کو لوریاں دی جانے لگیں۔ لوریاں لوریاں پہ لوریاں یہاں تک کہ وہ سو گیا۔ گہری نیند سو گیا۔ تمدن جدید کچھ سوچ کر سوئے فتنوں کو جگا رہا ہے اور وہ جاگتے جا رہے ہیں۔ کل پوری طرح جاگ جائینگے اور اپنے تمام طوفان کیساتھ جاگ جائیں گے

پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کی اس معاشرت کا شیرازہ کیونکر بندھا رہتا ہے اور خانہ داری کی زندگی کے وہ گھروندے جو آپ نے بنا رکھے ہیں کیونکر بنے رہتے ہیں۔ تمدن قدیم نے عورت کے دل کو تو سُلا دیا اور مرد کے دل کو ضرورت سے زیادہ بیدار کر دیا۔ انصاف کا تقاضا یہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دُنیا کو چین جیسا چاہئے تھا کبھی نہ ملا۔ دل کسی کا بھی ہو نیند اس کے لئے بہر حال بہتر ہے۔ گوشت کا یہ دھڑکتا ہوا لوتھڑا اپنے افعال طبعی کے لحاظ سے معاشرتی زندگی کے لئے ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا رہا ہے۔ جنھوں نے اس کی پرورش کی انھوں نے ہمیشہ اس کو اپنے اور اپنے ماحول کے لئے ایک مصیبت پایا۔ تمدن کی ارتقا اور معاشرت کی خیریت بس اسی پر مبنی ہے کہ یہ "لعنت متحرک" سرکش ہونے سے پہلے کچل دی جائے۔ آپ اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن میں تو یہی سمجھتی آئی ہوں اگر نہ سمجھتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود کی آغوش کو اپنی کنواری امنگوں کی بہشت سمجھنے کے باوجود چپکے سے اس کے بڑے بھائی حامد کی آغوش میں چلی جاتی اور زندگی کے بہترین حصے کو اس کے پہلو میں سو کر اس خندہ پیشانی کے ساتھ بسر کر جاتی جیسے واقعی میرے سینے میں دل نہ تھا۔ سلیمہ نے دل اور دل میں جذبات رکھنے کے باوجود رواج کے حکم اور سماج کے فیصلے کے سامنے گردن جھکا دی اور اس کے فیصلے کی لاج رکھنے کے لئے عمر بھر ان زنجیروں کا احترام کرتی رہی جو اس کے پاؤں میں ڈال دی گئی تھیں اب دیکھنا یہ ہے کہ سماج کے پاس سلیمہ کے لئے کیا ہے۔ گو سلیمہ خود نہیں جانتی کہ اس کی قربانیوں کا معاوضہ کیا ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ وہ عورت جو عمر بھر اپنے دل کی سرکش ترین طاقتوں سے جہاد نفس برپا کئے رہی اب اپنے جذبات پر فتح پا لینے کے بعد اپنی تمناؤں کا خوں بہا کیا طلب کر سکتی ہے۔

(۲)

یہ سطریں اس وقت قلمبند کر رہی ہوں جب جوانی کی بہار خزاں ہو رہی ہے۔ سہرے کے پھول مرجھا چکے ہیں —— قسمت نے سہاگ کی وہ نعمت بھی چھین لی ہے جو

عورت کے لئے سب سے بڑا بل ہے ـــــ طوفان کا زور کم ہو چلا ہے لیکن محمود کی محبت کی سلگائی ہوئی چنگاری اب تک سلگ رہی ہے اور میری روح اس کی دھیمی آنچ سے پھنکی جا رہی ہے۔ گھلی جا رہی ہے موم کی اس بتی کی طرح جو نصف سے زیادہ جل چکی ہو۔

مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا اور بس ـــــ ایک آخری ہچکی اور شمع کی داستان شب ـــــ ہمیشہ کے لئے ختم۔

یہ چند اوراق جو آنسوؤں کے دھبوں سے داغدار ہیں زمانے کے ہاتھ میں اس وقت پہنچیں گے جب زمانہ میرے وجود کے بوجھ کو موت کی آغوش میں پھینک چکا ہوگا۔ میں نہ ہوں گی لیکن میری رام کہانی سننے اور سمجھنے کے لئے میری بہت سی ایسی بہنیں موجود ہوں گی جنھوں نے میری ہی طرح عمر بھر اپنے دل سے لڑائی باندھ رکھی ہوگی۔ وہ میرے جذبات کو پوری طرح سمجھیں گی اور میری قربانیوں کی منہ مانگی داد دیں گی۔ اور کیوں نہ دیں گی جب کہ وہ ان طوفانوں سے اچھی طرح واقف ہیں جو عورت کے دل میں اٹھتے رہتے ہیں۔ اس عورت کے دل میں جس کی "فطرت" کو پابندیوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہو ـــــ یہ اوراق انھیں بہنوں کے نام معنون ہیں ـــــ ہمدردی کے آنسوؤں کی چند بوندیں اور بس ـــــ میری زندگی بھر کی مشقتوں کا اجر ہیں اور قسم ہے اس خدا کی جو میرے دل کی ہر ہر جنبش کا نگراں رہا ہے کہ میں اس اجر کی مستحق بھی ہوں۔

(۳)

یہ چند سطریں جو غیر ارادی طور پر قلم کی زبان سے ٹپک گئی ہیں انھیں میری داستان حیات کا مقدمہ سمجھئے۔ رہی داستان تو آگ اور لکڑی کی داستان کی درازی ہی کتنی؟ بس یوں سمجھئے کہ آگ لگی۔ تیل چھڑکا گیا اور لکڑی دیکھتے دیکھتے راکھ کا ڈھیر ہوگئی۔ ایک ایسا راکھ کا ڈھیر جو اپنے سینے میں بہت سی چنگاریاں چھپائے ہو۔ اس استعارے میں مجھے لکڑی فرض کر لیجئے لیکن یہ نہیں کہہ سکتی کہ آگ کس کو کہوں محمود کی محبت کو یا

اس رشتہ ازدواج کو جو حامد کے دامن اور میرے آنچل کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ بہرحال نتیجہ جلنا تھا جلی اور بُری طرح جُھلس کر رہ گئی۔ تصور کا ہاتھ جب کتاب زندگی کے پچھلے اوراق اُلٹتا ہے تو مجھے ماضی کے دھندلکے میں ایک تصویر نظر آتی ہے —— مٹی مٹی سی —— گھر کی انگنائی امرود کا درخت اور اس کے سائے میں ایک گھروندا جس میں دو بچے (میں اور محمود) کھیل رہے ہیں۔ زندگی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ بڑی سنجیدگی کے ساتھ۔ خانہ داری کے لوازمات پھیلے ہیں۔ گھر بن رہا ہے۔ میاں، بیوی کو جھڑک رہا ہے اور بیوی میاں کو —— پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھو تو کچھ نہیں۔ چند قہقہے اور کھیل کا خاتمہ —— یہ تھا ہمارا روزانہ کا کھیل جو اب دیکھتی ہوں تو واقعی کھیل ہو کر رہ گیا ہے —— حامد ہم دونوں سے عمر میں کچھ بڑا تھا اس لئے وہ ہم سے پہلے مکتب میں بٹھلا دیا گیا تھا۔ مکتب سے جب اُسے چھٹی ملتی تو سیدھا ایک حملہ آور کی طرح ہماری مملکت میں گھس آتا۔ اور اس کے چنگیز خانی حملوں سے ہمارے گھروندے کی چھوٹی سی دُنیا میں تراہ تراہ مچ جاتا —— خانہ داری کا نظام برہم ہو جاتا۔ محمود الگ چیختا میں الگ بسورتی، یہ بھی سچ پوچھئے تو ایک ہونے والی بات تھی۔ قسمت جس کی طرف رہ رہ کر اشارہ کر رہی تھی آگے چل کر نتیجے نے بتلا دیا کہ حامد کی مداخلت نے واقعی ہمیں وہ کھیل کھیلنے نہ دیا جسے ہم جوان ہو کر بھی کھیلنا چاہتے تھے۔

(۴)

بچپن اور بچپن کے بعد جوانی زندگی کی دوسری منزل ہے —— لیکن اس منزل کو طے کرنے میں مدت ہی کتنی صرف ہوتی ہے؟ بس ایک جھپکی —— اس کے بعد ؏

کھلی جو آنکھ تو دیکھا کہ وہ بہار نہ تھی

ہاں تو آنکھیں کھلیں اور آنکھوں کے کھلتے ہی اپنی حقیقت نظر آئی اور اپنی حقیقت کو دیکھ کر محمود کی نگاہوں کو پہچانا۔ حامد اس منزل میں البتہ ہمارے ساتھ نہ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ جوان ہونے سے کچھ پہلے ہی میں اس سے چھپائی جانے لگی تھی اور یہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیوں؟ محمود سے کوئی پردہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا محمود سے ربط بڑھتا گیا اور

ہم لوگ غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے ہوتے گئے۔ وہی اگنائی وہی امرود کا درخت لیکن اب اس کی چھاؤں میں گھر بھر کی نظریں بچا کر ایک دوسرے ہی قسم کا کھیل کھیلا جانے لگا ـــــ جوانی کا وہ کھیل جو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھیلا جاتا ـــــ وہ کھیل جس کی بساط پر پانسو کی جگہ دل پھینکے جاتے ـــــ وہ کھیل جس کی جیت اور ہار دونوں ہی لذت سے خالی نہیں۔

برسات کا موسم تھا ساون کی جھڑیں برس کر کھل چکی تھیں اور مناظر قدرت پر ایک ایسی "خوبصورت اُداسی" طاری تھی جیسے کوئی حسین عورت رو دھو کر چُپ ہو جائے۔ شام ہو رہی تھی ـــــ وہ شام جو میری زندگی کی تمام شاموں میں منتخب کہے جانے کی مستحق ہے۔ گھر میں سوائے بوڑھی باورچن کے کوئی نہ تھا ـــــ امی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ موسم کی ہوائیں دل کو گدگدا رہی تھیں۔ اور میں اکیلی پلنگڑی پر بیٹھی پھولوں کا ہار گوندھ رہی تھی۔ غرض قضا و قدر کا ہاتھ وہ تمام حالات جمع کر رہا تھا جن کے بعد غالب کا یہ شعر پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے ؎

دلم بہ سبحہ و سجادہ درو الرزد ۔۔۔ کہ دزدِ مرحلہ بیدار و پارسا خفتہ است

ہاں تو میں پلنگڑی پر بیٹھی ہار گوندھ رہی تھی ـــــ کہ "محمود میاں" آئے اور پائینتی کے کنارے بیٹھ گئے میں ہار گوندھتی رہی اور وہ شعر پڑھتے رہے۔ ؎

یہ محویت نہیں بالکل کھلی بے اعتنائی ہے ۔۔۔ ہم آئے تھے زرا تم مسکرا دیتے تو کیا ہوتا

میں مسکرا دی "اس زحمت کا شکریہ" انھوں نے کہا "پھولوں کا کلیجہ کب تک چھیدا جائے گا ـــــ پھولوں کے علاوہ اور لوگوں کے پاس بھی تو کلیجے ہیں"۔ "اس میں تو بقول ایک سچے آدمی کے چھلنی کی طرح ستر چھید ہو چکے ہیں مزید سوراخ کی گنجائش کہاں"۔ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ وہ لاجواب ہو گئے۔ لیکن انھیں فضول بکواس کرنے کی بیماری تھی اور اس کا دورہ شروع ہو چکا تھا۔

"یہ آج نظر کی سوئی سے کیوں کام نہیں لیا جاتا" اس کے جواب میں بھی میں نے نظر کی سوئی سے کام نہ لیا۔

"مجھے ڈر ہے کہ بیکار رہنے سے زنگ آلود نہ ہوجائے" غرض زبان کی قینچی چلتی رہی۔ میں نے سوالات کا سلسلہ توڑنے کے لئے نظر اُٹھاکر باورچی خانے کی طرف دیکھا اور ان کی کلائی میں آہستہ سے سوئی چبھودی ——— یہ انجکشن کارگر ثابت ہوا اور وہ یہ سمجھ کر کہ باورچی خانے میں کوئی لاش سانس لے رہی ہے کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگئے ——— لیکن کب تک؟

"ہاں تو یہ ہار کس کے لئے گوندھا جارہا ہے آج تو اختر بھی نہیں ہیں" ——— یہ سوال نہ تھا بلکہ جواب تھا میری ایک خاص حرکت کا جوان کی سمجھ میں نہ آسکی تھی۔ بات یہ تھی کہ ایک دن اسی طرح میں ہار گوندھ رہی تھی اور انھیں کے لئے گوندھ رہی تھی ایک ایسے عالم محویت میں کہ کلیوں کے ساتھ اس ہار میں میرا دل بھی گُندھ گیا ہو تو تعجب نہیں۔ یہاں تک کہ جس کا تصور تھا وہ خود آگیا۔ محمود کے ساتھ میرے چچازاد بھائی اختر بھی تھے ——— میں نے ہار پورا کرکے محمود کی طرف دیکھا۔ دیکھا اور پھر دیکھا ——— مسکرائی اور ہار اختر بھیا کی گردن میں ڈال دیا۔ محمود کا چہرہ غُصّے سے سُرخ ہوگیا

جہاں تک عورت کی ادا فہمی کا تعلق ہے مرد ہمیشہ سے غبی ثابت ہوا ہے۔ محمود بھی میری اور میرے دل کی کیفیتوں کا مطالعہ نہ کرسکے۔ کئی دن تک مُنہ تھتھائے رہے ——— آج بے چارے کئی دنوں کے بعد بھرے ہوئے دل کو خالی کرنے کا موقع ملا تھا۔ بہرکیف آج میں نے اپنے بیوقوف دوست کے روٹھے ہوئے دل سے صلح کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جلدی جلدی ہار ختم کیا اور ختم کرکے ایک شرمیلی ادا کے ساتھ ان کی طرف جُھکی۔ محمود نے میرے ارادے کو تاڑ کر گردن بڑھائی اور مجھے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا لیکن آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ قصور سرزد ہوگیا جس کے بعد کم از کم ہونٹوں کو تو کنوارا نہیں کہا جاسکتا ——— یہ تھا میرا پہلا اور آخری گناہ ——— جس کا میرے ارادے سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا پانی کا بہاؤ سے۔ بہرحال جو نہ ہونا چاہیئے تھا وہ ہوگیا۔ اور صرف اس لئے ہوا کہ میرا دل اس وقت تک اپنی "فطرت اصلی" پر تھا ——— اس کے بعد احساس گناہ نے خود میرے دماغ کی اس رگ کو

چھیڑ دیا جو نیکی اور بدی میں تمیز کرتی ہے ـــــ اور میں نے اپنی حالت پر غور کرنا شروع کیا ـــــ عقل نے روشنی دکھلائی اور مجھے نظر آنے لگا کہ میں جس راستہ پر چل رہی ہوں وہ راستہ مجھے کسی حال میں منزل تک نہیں پہنچا سکتا ـــــ مجھے مستقبل قریب میں "حامد کی بیوی" بننا ہے اور میں "محمود کی محبوبہ" بنتی جا رہی ہوں۔ آخر کار اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر میں نے اپنے دل کو محمود کی طرف سے برانگیختہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی شخصیت پر بے رحمانہ نقادی شروع کی۔ اور اس کی صورت و سیرت میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نقائص نکالنے لگی لیکن دل جو اس کا ہو چکا تھا ہمیشہ میری تردید کرتا رہا۔ طبیعت کو ادھر سے بھلانے کی غرض سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا ـــــ کتابوں نے میرے دل کو کس حد تک بہلایا یہ نہیں کہہ سکتی لیکن کتب بینی کا فائدہ اس حد تک ضرور ہوا کہ ان سے میرے دماغ کو وسعت اور میرے ارادوں کو قوت ملنے لگی چنانچہ آئندہ زندگی میں میں نے اپنی فطرت سے جو جنگ چھیڑ رکھی تھی ان میں میری کامیابی ان کتابوں ہی کی رہینِ منّت ہے۔ ہاں تو میں محمودؔ سے اب پرے رہنے لگی تھی محمود لاکھ مرد سہی لیکن اب اتنا بھی غبی نہ تھا کہ میرے اُچٹتے ہوئے تیور کو نہ تاڑ لیتا ـــــ میری بے رُخی نے آہستہ آہستہ اس کو بھی خود داری سکھلائی اور اس نے میرے پاس آنا اور بیٹھنا بالکل ترک کر دیا۔ بھولے بھٹکے کبھی سامنا ہو جاتا تو اس کی روٹھی ہوئی نگاہیں مجھے "غدّار" "بیوفا" "ستمگر" "حرافہ" غرض نہ جانے کیا کیا کہا کرتیں جس کے جواب میں میری آنکھیں اسے فلسفۂ معاشرت پر ایک مبسوط خطبہ سُنانے کی کوشش کرتیں ـــــ لیکن وہ شخص جو میری آنکھوں کی معمولی گفتگو بھی سمجھنے سے معذور رہا ہو "خطبہ" کیا خاک سمجھتا۔ غرض دن گذرتے گئے اور میری جوانی اس گھٹا کی طرح بھرپور ہوتی گئی، ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی جس کے لئے کافی ہو۔ دل کبھی کبھی محمود کو ضرور ڈھونڈتا کیوں ڈھونڈتا یہ بھی سُن لیجئے۔ مجھے محمود سے زیادہ اس کی خوش آمد عزیز تھی ـــــ یہ ہے عورت کی فطرت کا وہ کمزور پہلو جو تُند و تیز ہواؤں میں ہمیشہ غیر متوازن ہوتا رہا ہے ـــــ وہ دُکھتی ہوئی رگ جس کو پکڑ لینے

کے بعد اس کے غرور کو سجدہ کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا —— میں جھوٹ کیوں بولوں میرے دل میں بھی یہ جذبہ ہر عورت کی طرح تمام جذبات لطیفہ سے زیادہ قوی تھا کہ "کوئی میرے حُسن کی داد دیتا رہے" محمود نے میرے اس جذبے کی پذیرائی کی تھی اور میرے سامعہ کو اپنی چٹپٹی گفتگو کی ایسی چاٹ دے رکھی تھی کہ میں باوجود کوشش کے بھی اس سے بہت دنوں تک دور نہ رہ سکی —— کچھ محمود ہی پر منحصر نہیں ہر وہ شخص جو سب سے پہلے میرے حُسن کی داد دیتا میں شاید اسی کی ہو جاتی —— یہ ہیں میری جوانی کی وہ کمزوریاں جن کے لئے آج میں اپنے ضمیر سے برابر معافی مانگتی رہتی ہوں۔

(۵)

یادش بخیر محبت جب اپنے پینگ بڑھا رہی تھی تو ایک دن میں نے سرسری طور پر محمود سے کہا تھا "دیکھتے نہیں کہ تمھارے بھیّا کی ذات میرے تمھارے درمیان میں ایک دیوار کی طرح حائل ہو جانے والی ہے پھر کس اُمید پر بڑھتے آرہے ہو؟" محمود نے اس کے جواب میں سر ہلا کر کہا "یہ نہیں ہونے دوں گا" اس جملے سے ایک ایسا عزم راسخ ٹپک رہا تھا کہ مجھے دھوکا ہوا کہ اس کے جسم میں لوہے کے عناصر غیر معمولی طور پر زیادہ ہیں لیکن وقت نے آکر یہ ثابت کر دیا کہ یہ خوبصورت ہاتھ پاؤں کا خوبصورت مجسمہ کچھ نہ تھا مگر بالو کا ایک تودا —— ہاں تو امتحان کی گھڑی جب آئی تو اس بالو کے تودے نے اپنی ماں سے اپنی خواہش کا اظہار نہ معلوم کن لفظوں میں کیا کہ ادھر سے جواب ملا "توبہ کرو چھوکرے سلیمہ تجھ سے عمر میں کئی مہینے بڑی ہے" اس کے بعد ہماری چچیا ساس نے جو اپنے چھوٹوں سے بھی مذاق کرنے میں بے باک تھیں۔ اس خواہش پر یوں تبصرہ فرمایا "اے تو اس میں کیا حرج ہے سلیمہ تمھیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے تو بھاوج بنا کے پیار کر لینا بھائی ہی کی تو چیز ہے کوئی غیر تھوڑے ہی لئے جاتا ہے۔ غرض میری قسمت کا فیصلہ ہنسی ہنسی میں اُڑ گیا اور محمود کی ہمت مفلس کے مکان کی طرح اس معمولی جھٹکے سے ایسی گری کہ پھر نہ اُٹھی —— ہاں تو سُن لیا نہ آپ نے کہ محمود کی خواہش کس بنا پر ٹھکرائی گئی —— صرف اس لئے کہ میں اس سے عمر میں کئی مہینے بڑی تھی لیکن وہ کئی

مہینے کیا کئی برس بلکہ کئی جگ بھی بڑا ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا میں اس سے بلا تامل تھی کر دی جا سکتی تھی اس لئے کہ مرد! کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ساٹھ برس کا بھی ہو تو پروا نہیں "ساٹھا پاٹھا" مشہور ہے ـــــــ دُنیا میں یہی ہوتا رہا ہے سُنتی ہوں کہ فالج ہاتھ پاؤں کے علاوہ زبان پر بھی گرا کرتا ہے لیکن آج تک میں نے کسی مولوی ـــــ کی زبان پر اس مادّے کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا ـــــ نہ جانے خُدا کا عذاب آج کل کس فکر میں خموش ہے۔

(۶)

چاہتی ہوں کہ آپ کو اپنی کہانی سُناؤں لیکن کیا کروں کہ اثنائے گفتگو میں ان بہت سے پھوڑوں میں سے ایک نہ ایک پھوڑا بہہ اُٹھتا ہے جو میرے دل میں پرورش پا رہے ہیں اور میرا لہو پی پی کر جی رہے ہیں ہاں تو وہ وقت آ گیا دل جس کے تصور سے گُھلا جا رہا تھا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد میں مایوں بٹھلائی گئی اور ایک ہفتہ تک اس حوالات میں دُنیا کی کُھلی ہوئی فضا سے دور رکھی گئی۔ اس "کال کوٹھری" میں جسے قید از دواج کی تمہید سمجھئے مردوں کی صورت جہاں ہوا کے جھونکوں اور سورج کی روشنی کے علاوہ ہر چیز کا گذر تھا یہاں تک کہ محمود کی آواز بھی کبھی کبھی آ کر دل کو ٹکر لگا جاتی تھی ـــــ گیتوں کے ذریعے سے مجھے آئندہ زندگی کے مراحل سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میرا دماغ دل سے جنگ کرنے میں مصروف تھا کیا خاک سمجھتی۔ جب گیتوں کی گونج ڈھول کی کھناکھن کے ساتھ بلند ہوتی تو میرا سامعہ کبھی کبھی چونک پڑتا اور میں ایسا محسوس کرنے لگتی جیسے سارا کنبہ میری میّت پر بین کر رہا ہو۔ غرض اس گھماگھمی میں وہ تاریخ بھی آ گئی جسے عدالت کی اصطلاح میں پیشی کی تاریخ کہہ سکتے ہیں مجھے سُرخ جوڑا پہنایا گیا ناک میں نتھ جو ہندوستان میں سُہاگ کی علامت سمجھی جاتی ہے ڈالی گئی۔ اس کے بعد چند سہاگنوں کی حراست میں پردے کے پاس لا بٹھائی گئی قاضی صاحب آئے اور آتے ہی یہ سوال کیا۔ "کیوں بیٹی کیا تم مجھے اپنا وکیل مقرر کرتی ہو کہ تمہارا نکاح پچاس ہزار روپئے سکّہ رائج الوقت اور پانچ دینار سُرخ رقم موجل پر حامد کے ساتھ پڑھ دوں۔" کہئے اس سوال کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہئے تھا؟ ـــــــ نہیں؟ ایک گھر گرہست آشرم کی بیٹی جسے بچپن سے لے کر جوانی تک فرض کی کٹھ پتلی بننے کی تعلیم دی گئی ہو یہ کیونکر کہہ سکتی تھی۔ کیا میرے لئے قانون معاشرت بدل دیا جاتا یا وہ طریقہ از دواج منسوخ کر دیا جاتا جس کی برکت

سے ہمارے ملک کی اہلی زندگیاں ہمیشہ سے پُرامن رہتی آئی ہیں —— پھر میں نے اپنے گردوپیش نظر کی میری ممانیاں، چچیاں، پھوپھیاں، ماں اور خالائیں جو اس وقت مجھے گھیرے ہوئے بیٹھی ہیں کیا ان کے لئے بھی ایک ایسا ہی وقت نہیں آیا تھا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے دل میں بھی میری ہی طرح کوئی کھٹک موجود نہ ہو۔ آخر انھوں نے دل پر کیوں کر قابو پالیا! اور کس طرح اہلی زندگی کے مراحل کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل رہی ہیں —— تو کیا میرا نفس ان کے نفس کے مقابلہ میں کسی طرح کمزور ہے —— اس خیال سے میرے غرور کو چوٹ لگی اور میں نے پورے استقلال کے ساتھ قاضی صاحب کو جواب میں ہاں کہہ دی —— قاضی صاحب چلے گئے۔ اس کے بعد رسم ہے کہ لڑکیاں رونے لگتی ہیں —— اس خیال سے کہ وہ گھر جس گھر میں پل کر جوان ہوئی آج سے میرے لئے اجنبی ہو گیا مہمان کی طرح بلائی جاؤں گی اور مہمان کی طرح رخصت کر دی جاؤں گی۔ یہ احساس جُدائی رونے کے لئے کم نہیں ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور رستا ہوا زخم بھی نہ پھوٹ بہتا ہو۔ بہر کیف مجھے بھی رونا چاہئے تھا گو میری سسرال میکے کی دیوار سے لگی ہوئی تھی اور میرے لئے جُدائی کا کوئی سوال نہ تھا لیکن رسم بہرحال رسم ہے میں بھی روئی۔ محمود کی محبّت کی اتھاہ ندی آنسوؤں کی کیا کمی ہو سکتی تھی —— روئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی —— یہاں تک کہ میرا گریبان اور امی کا آنچل دونوں بھیگ گیا۔

(۷)

اب میں نے زندگی کی اس منزل میں قدم رکھا ہے جہاں پہنچ کر زندگی کے مسلسل امتحانات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ امتحانات جن کے لئے عورت ماں کی گود سے سدھائی جاتی ہے —— اس کے باوجود لوگ شادی کے پہلے سال کو جوانی کی بھری ہوئی گھٹاؤں کے برسنے کا موسم کہتے ہیں —— لیکن یہ بھری برسات کا موسم میرے دل کی اس بستی کے لئے جس میں جاڑے کی سرد ہوائیں چل رہی تھیں کیا کیف انگیز ثابت ہوتا۔ ابر گھر کر آئے برسے اور برس کر کھُل گئے لیکن برف کے وہ تودے جو میرے دل کر دجمے ہوئے تھے نہ پگھلنا تھا نہ پگھلے —— جھوٹ کیوں بولوں میرا جسم رہنے کو رہا حامد کے پہلو میں لیکن تصورات محمود کی

آغوش کا خواب دیکھا کئے —— یہ تھا میری ازدواجی زندگی کا پہلا سال۔

یہ کہنا بھول گئی کہ رخصتی کے دسویں دن میں نے محمود کی طرف دیکھا تو اس کا خوبصورت چہرہ کمھلایا ہوا تھا اس کنول کی طرح جسے تالاب سے نکلے ہوئے کئی دن ہو چکے ہوں یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی —— ایک ایسی "شریر خوشی" ہوئی جو فاتح کے دل میں مفتوح کو اپنے قدموں پر روندا ہوا دیکھ کر ہوتی ہے۔ میں اپنے نکاح کے وقت محمود کے "قلندرانہ سکوت" سے کچھ کبیدہ سی ہو گئی تھی میرا خیال تھا کہ اگر محمود کو مجھ سے سچی محبت ہو گی تو وہ کسی تیسری شخصیت کو ہمارے درمیان آنے نہ دے گا۔ اور تمام احتجاجی مظاہروں کے بعد وہ جارحانہ کارروائیوں پر بھی اتر آنے میں دریغ نہ کرے گا۔ یہ تھی میری توقع جس کے بالکل ہی خلاف وہ اپنی پہلی کوشش کے بعد اس چراغ کی طرح جس میں تیل نہ ہو بھڑک کر خاموش ہو گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ ان نوجوانوں میں سے ہے جو پھولوں سے تو کھیلنا چاہتے ہیں لیکن انگاروں سے کھیلتے ہوئے ڈرتے ہیں —— اور جن کا نظریہ یہ ہے کہ ؎

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے   جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے

آج جو اس کا اُترا ہوا چہرہ نظر پڑا تو مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اس کا دل اب تک میرے لئے رو رہا ہے۔ لیکن یہ خوشی ایک لمحے سے زیادہ نہ رہ سکی پھر جو نظر اُٹھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں میری اس مسرت پر تنقید کر رہی ہیں" —— میرا دل دُکھنے لگا۔ "آخر یہ کونسا خوشی کا موقع تھا۔ کہیں میرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ نہ کھل گئی ہو۔ محمود نے مجھے کیا سمجھا ہو گا؟ کیا میرے چہرے پر اس بے چینی کے کوئی آثار نہیں دیکھے جس نے میری سہاگ کی راتوں کو سوگوار بنا رکھا ہے"۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنی خلوت میں آئینے کے پاس دوڑی گئی تاکہ اس سے پوچھوں کہ کیا میرا چہرہ میرے دل کا ساتھ نہیں دے رہا ہے؟ آئینے نے کہا "نہیں" —— آئینہ عورت کی طرح جھوٹا نہیں ہوتا کہ دل میں کچھ اور منہ پر کچھ —— اس کے جواب سے مجھے تکلیف بھی پہنچی اور خوشی بھی ہوئی تکلیف اس لئے کہ "دل کا حال" محمود پر ظاہر نہ ہو سکا اور خوشی اس لئے کہ "حامد سے میں اپنے دل کا چور چھپانے میں کامیاب ہوں" —— میں نے مسہری پر لیٹ کر

دل کی اُلجھنوں کو اخبار میں بہلانے کی کوشش کی ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ میرا چھوٹا بھائی دوڑتا ہوا آیا "باجی! یہ کتاب محمود بھیّا نے دی ہے۔" محمود بھیا اور کتاب ـــــ دل دھڑکنے لگا ـــــ کتاب کھول کر دیکھی تو وہ اس خط کا لفافہ ثابت ہوئی۔

۷۸۶

مجھے بہت جلد بھول جانے والی سلیمہ ـــــ خوش ہو اور خوش رہو اگر بچپن کی محبّت اور دوشیزگی کے وعدے سہاگ کی سیج پر بھی پہنچ کر یاد رہتے ہوں تو میں تمھیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں محمود ہوں ـــــ تمھارے گھروندے کا ساتھی ـــــ محمود ـــــ جس سے تم نے ایک بار نہیں بارہا جاڑے کی سناٹی راتوں میں۔ دھڑکتے ہوئے دل اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ "میں تمھاری ہوں" کیونکر انکار کروگی؟ ستاروں کی کھلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا ـــــ ہوا کے جھونکوں نے سُنا ہے۔ فطرت کے مناظر گواہ ہیں۔ فضا کا سکوت گواہ ہے امرود کا درخت گواہ ہے۔ وہ امرود کا درخت جس کی چھاؤں میں میرا اور تمھارا دل جوان ہوا۔ گھر کی وہ انگنائی گواہ ہے جس کی خاک ہمارے معصوم آنسوؤں کے بہت سے قطروں کو جذب کر چکی ہے ـــــ کیونکر انکار کروگی سلیمہ! جھوٹ بولوگی؟ تمھاری آنکھیں تمھیں جھٹلادیں گی۔ تمھارا حافظہ تم پر ملامت کرے گا۔ تمھارا ضمیر تم سے روٹھ جائے گا ـــــ قسم ہے محبت کے ان خاموش پیغاموں کی جو آنکھوں کی زبان سے بھیجے اور دل کے کانوں سے سُنے گئے کہ یہ دُنیا اور اس کی تمام رعنائیاں بیوفا ہیں ـــــ چکور کہتا ہے کہ چاند بیوفا ہے پاس بُلاتا ہوں اور دور رہتا ہے دن کہتا ہے کہ رات بیوفا ہے پیچھا کرتا ہوں اور بھاگی جاتی ہے۔ بُلبل کہتی ہے کہ پھول بے وفا ہیں مجھ سے جُدا ہو کر بھی گلچیں کی ٹوکری میں ہنستے رہتے ہیں ـــــ اور محمود کہتا ہے کہ سلیمہ بیوفا ہے دوسرے کی آغوش میں پہنچ کر بھی خوش نظر آتی ہے۔ سلیمہ بیوفا ہے۔ ہاں سلیمہ بیوفا ہے ـــــ بُرا نہ ماننا آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں انھیں حیرت زدہ آنکھوں سے تمھیں پھول کی طرح کھلا ہوا دیکھ چکا ہوں ـــــ کیا اب بھی کہوگی کہ تم اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہو ـــــ خُدا کرے نہ ہو ـــــ تم کیوں انکار کرو میرا دل خود میرے مشاہدے

کو جھٹلا رہا ہے اور تمھیں بیوفا سمجھنے پر راضی نہیں ہوتا ہے

اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتی کئی تاویل خیالات چلی جاتی ہے

خُدا کرے کہ میری تاویلات صحیح ہوں اور تم اب تک وہی سلیمہ ہو جو آج سے کچھ دنوں پہلے تھیں، لیکن ان دلیلوں کو کیونکر سمجھاؤں جو تمھارے خلاف میرے شکوک کا ساتھ دے رہی ہیں بیشک تم مجبور تھیں کہ تمھارا نکاح کر دیا گیا لیکن کیا اقرار کے وقت قسمت کا پانسہ تمھارے ہاتھ میں نہ تھا تمھاری ایک "نہیں" مستقبل کا نقشہ بدل سکتی تھی ایک انکار بزرگوں کا فیصلہ اور فیصلے کا رُخ پھیر سکتی تھی۔ تمھاری ایک خموشی —— ایک طویل خموشی قاضی صاحب کو واپس لوٹ جانے پر مجبور کر سکتی تھی لیکن تم نے میرے دل پر رحم نہ کیا، خُدا بھی تمھارے دل پر رحم نہ کرے گا —— یہ مَیں یہ کیا کہہ گیا سلیمہ معاف کرنا پیاری میں اب دیوانہ ہوں اس بُری طرح کہ اب کچھ دنوں میں زنجیروں کی ضرورت ہوگی ——

کاش ہم تم یورپ کے آزاد ممالک میں جنم لئے ہوتے۔ ہندوستان غلام ہے اس لئے یہاں کے ہر رواج میں غلامی کی تخئیل ہے —— یہ بدبخت فطرت کو بھی بیڑیاں پہنانا چاہتا ہے۔ نکل چلو پیاری نکل چلو حیوانوں کی اس بستی سے —— روحوں کے اس قبرستان سے زندگی کے اس دوزخ سے دور —— بہت دور —— ایک ایسی دُنیا میں جہاں محبت مصلحت کی غلام نہ ہو —— جہاں حُسن وعشق میں اجنبیت نہ ہو —— جہاں درد و درماں میں بیگانگی نہ ہو —— جہاں شوق کے لئے رواج کے کٹہرے نہ ہوں جہاں فکر کے لئے قانون کا پہرا نہ ہو —— جہاں شمع کو ہوائیں نہ ستاتی ہوں۔ جہاں زندگی کو موت نہ دھمکاتی ہو —— جہاں دریا بہتے ہوں اور موجوں کی زنجیر پاؤں میں پھندے نہ ڈالتی ہو۔ جہاں شبنم روتی ہو اور پھول اس کے گریۂ بے اختیار کی ہنسی نہ اُڑاتے ہوں۔ جہاں نغمے فضا میں گونجتے ہوں اور ہوا کے جھونکے انھیں چُرا نہ لے جاتے ہوں —— ایک ایسی معصوم دُنیا میں۔ بھاگ چلو سلیمہ بھاگ چلو توڑ دو ان رواج کی زنجیروں کو جو تمھارے پاؤں میں زبردستی پہنائی گئی ہیں —— ثابت کر دو کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی زنجیروں کو نہیں پوج سکتی۔

ہاں تو سلیمہ بولو کیا کہتی ہو؟ میں نے صرف تمہارے لئے سارے کنبے سے ترک تعلق کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ دیکھیں اب تم میرے لئے کیا کرتی ہو ـــــــ اگر تم میرے اس خطرناک ارادے میں حصہ لے سکتی ہو تو پھر کچھ دیر نہیں آج بلکہ ابھی اسی شام کو ہمارے افسانۂ محبت کا وہ دلچسپ باب شروع ہو سکتا ہے۔ شعر و موسیقی کی زبان میں جس کا عنوان "بسنت کا موسم ہے۔" ؎

چہ خوش است یاد دیک دل سرحرف باز کردن گلۂ گذشتہ سخنے دراز کردن

اثرِ عتاب بُردن ز دلے ہم اندک اندک بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

میرے پاس روپے نہیں سچے دوست ہیں اور کچھ نہ ہو جب بھی محبت کرنے کیلئے تندرست ہاتھ پاؤں ہیں۔ میں تمہیں ہر طرح خوش رکھ سکتا ہوں اور اس دُنیا سے اتنی دور لے جا سکتا ہوں جہاں سوسائٹی کی آواز تو کیا قانون کا تازیانہ بھی ہمارا سُراغ نہیں لگا سکتا۔ ہاں تو بولو میرے دل کی ملکہ کیا کہتی ہو ـــــــ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم محبت کے قانون کا کتنا احترام کرتی ہو یاد رہے سلیمہ کہ محبت تمہارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ پہلی اور آخری بار اگر تم میں میرا ساتھ دینے کی طاقت نہیں تو صرف لکھ بھیجو کہ میں اپنی قسمت پر قانع ہو کر جنگلوں کی طرف نکل جاؤں ـــــــ کیونکہ یہ زنجیروں سے بھری ہوئی دُنیا اب مجھے کاٹے کھا رہی ہے ـــــــ بس اور کچھ نہیں۔

اپنی لیلیٰ کا مجنوں

"محمود"

خط کی ابتدائی سطریں میرے لئے کافی رقت انگیز تھیں جی چاہا کہ ان کے جواب میں ایک ایسا خط لکھوں جس میں اپنے دل کی گرمیوں کو کھول کر رکھ دوں لیکن جوں جوں آگے بڑھتی گئی "غصہ" تاسف کی جگہ لیتا گیا ـــــــ "نکل چلو سلیمہ" کیا محمود نے مجھے بازاری عورت سمجھ رکھا ہے۔ یہی فرمائش کرنی تھی تو کسی بازاری عورت سے محبت کیوں نہ کی تھی۔ اس خط کے جواب میں ایک ایسی تحریر جانی چاہئے کہ جو اسے مایوس کر دے قطعی مایوس۔ آگ پر تیل چھڑکنے کا وقت اب ختم ہو چکا پانی ڈالنے کی ضرورت ہے ـــــــ یہ سوچ کر

میں نے قلم اُٹھایا ـــــ خط تیار تھا۔

۸۶ء

میرے بھولے محمود ـــــ خوش رہو ـــــ خوش رہنے کی کوشش کرو کیونکہ اس دُنیا میں کوئی شخص خوش رہنے کی کوشش کئے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ فطرت کا کارخانہ ہی یہی ہے۔

چناں نماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

تُم نے مجھے بیوفا لکھا ہے لیکن میں خوش ہوں کہ تم نے بہت جلد حقیقت کو پہچان لیا ـــــ دلوں کا حال وہی جاننے والا جانتا ہے جو دلوں کی رفتار گن رہا ہے۔ مجھ میں وفا ہے یا نہیں یہ بجائے خود ایک سوال ہے لیکن اس کا مجھے خود اعتراف ہے کہ میں نے تمھاری محبت کے ساتھ وفا نہیں کی۔ کیوں نہیں کی؟ اس لئے نہیں کی کہ میں ایک سنجیدہ فکر کے بعد اس سچائی تک پہنچی کہ تم سے وفا کرنا بہت سے لوگوں سے بیوفائی کئے بغیر ممکن نہیں ـــــ اور میری عقل سلیم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک کے ساتھ بیوفائی کرنا بہت سے لوگوں کے ساتھ بیوفائی کرنے سے بہتر ہے۔ ماں کے ساتھ بیوفائی۔ کُنبے کے ساتھ بیوفائی۔ خاندانی روایات کے ساتھ بیوفائی۔ معاشرت کے قانون کے ساتھ بیوفائی ـــــ اور صرف تمھارے ساتھ وفا؟ ـــــ تو کیا دل صرف تمھارے ہی پاس تھا ـــــ تم کہو گے یہ محبّت کے قانون کے ساتھ کُھلی ہوئی بغاوت ہے ـــــ ہو سکتی ہے ـــــ یوں سمجھ لو کہ میری محبت اس حد تک نہیں پہنچی تھی جہاں پہنچ کر عقل دل کی لونڈی بن جاتی ہے۔ اگر محبّت اسی کا نام ہے کہ اپنی خواہش کے لئے دُنیا کی خواہش کو ٹھکرایا جائے۔ اپنے جذبات کی آسودگی کے لئے کُنبے بھر کے جذبات کو ٹھیس لگائی جائے تو خُدارا بتاؤ کہ خود غرضی کسے کہتے ہیں؟ اگر حد سے بڑھی ہوئی خود غرضی جُرم ہے تو پھر حد سے گزرا ہوا عشق کیوں جُرم نہ ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جُرم کی تاریخ ایسے لوگوں کے ناموں سے کیوں خالی ہے جو جذبات کی رَو میں حدود سے باہر نکل گئے ہوں۔

ہاں تو اب اپنے خط کا جواب سُنو تم لکھتے ہو کہ کاش ہم تم آزاد ممالک میں ہوتے

بیشک اگر ہوتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں انتخاب کر کے گرجا کی محراب کے نیچے کھڑے ہو جاتے اور بڑی آسانی کے ساتھ میاں بیوی بن جاتے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ دل کی تشنگی بجھ جانے کے بعد رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے غیر متعلق نہ ہو جاتے عشق میری نظر میں عناصر کا ایک ہیجان ہے۔ اعصاب کی ایک کمزوری ہے نفس کی ایک خواہش دل کا ایک مطالبہ ہے اور دل کی فطرت یہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنی موجودہ حالت سے اُکتا جاتا ہے۔ سیر ہو جاتا ہے۔ غیر مطمئن ہو جاتا ہے بچوں کی طرح اپنے کھلونوں کو پھینک کر نئے کھلونوں کی آرزو کرتا ہے۔ جب دل کی فطرت یہ ہے تو مشرق اگر اپنے قانون ازدواج میں اس کی خواہشوں کی رعایت نہیں کرتا تو زمانہ اس سے کیوں تیوریاں چڑھائے ——— تم کہتے ہو کہ یہ بدبخت فطرت کو بیڑیاں پہنانا چاہتا ہے۔ تم شاعر آدمی زنجیروں کا فلسفہ کیا خاک سمجھو گے۔ کاش تمہارے پاس دھڑکتے ہوئے دل کے علاوہ ایک سوچنے والا دماغ بھی ہوتا تو تم دیکھتے کہ مشرق کے فلسفۂ ازدواج میں کہاں تک سچائی ہے۔ میرے بیوقوف دوست مشرق مغرب کی طرح مزدوروں کا ملک نہیں بلکہ فلسفیوں۔ پیغمبروں اور جوگیوں کی بستی ہے، یہاں ازدواج کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ دو محبت کرنے والے دلوں کو ان کی خواہش کا احترام کر کے ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ دو دلوں دو اجنبی دلوں کو ازدواج کے رشتے میں جکڑ کر ایک دوسرے سے محبت کرنے پر مجبور کیا جائے ——— اور جنھوں نے انسانی خواہشات کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی کامیابی نفس کو مجبور کرنے میں ہے نہ کہ مطلق العنان چھوڑ دینے میں ہے۔ شادی نام ہے معاشرتی قیود کی سنہری زنجیروں کا ——— اور ظاہر ہے کہ ایک دل آزادی جس کی "فطرت اوّل" ہو بغیر کسی معقول تربیت کے قید خانے کی بندشوں میں لذت نہیں پا سکتا۔ فرض کرو کہ دو دل ایک دوسرے کے لئے بھوکے ہیں اور سماج ان کی بھوک کی رعایت کر کے انھیں ان کی مطلوبہ غذا دیتا ہے ——— لیکن کیا تمہارا فلسفہ یقین دلاتا ہے کہ وہ آگے چل کر اور نہ چاہیں گے ——— کیوں نہ چاہیں گے جب کہ "ندرت پرستی" ان کا خاصہ

طبعی ہے اور سوسائٹی نے شروع ہی میں ان کے ذوق کی رعایت کر کے ان کی لذت پسندی کا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ دو جملوں میں یہ سمجھو کہ مغرب کی معاشرت دل کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور مشرق کی تہذیب اپنے طریقہ ازدواج سے دلوں کو قناعت سکھلاتی ہے۔ یہاں پر اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رواج کو کیا حق حاصل ہے کہ شادی کے معاملے میں انتخاب کے حق کو جو فریقین کا فطری حق ہے فریقین سے چھین کر ان کے بزرگوں کو دے دے۔ کنبے کو دے دے۔ سوسائٹی کو دے دے۔ تو سنو انتخاب کا حق نوجوان جوڑوں کو دینا ننھے بچے کے ہاتھ میں چھری دے دینے کے برابر ہے۔ نوجوانی میں انتخاب کی نظر سطح پر لوٹ کر رہ جاتی ہے۔ جلد اور ہڈیوں سے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کرتی۔ دور کیوں جاؤ خود اپنی آنکھوں سے پوچھو کہ اس نے میری طرف کبھی اس ارادے سے بھی دیکھا ہے؟ دیکھنا تو درکنار سینے کے اندر کی حقیقتیں کبھی اتفاق سے نظر بھی آجاتی ہیں تو نئے عشق کے حوالے طرح دے جاتے ہیں کیوں نہیں؟ مطلب تو صرف لطف اندوزی سے ہے اور وہ بہر حال حاصل ہے ——— روح میلی ہے تو ہو صورت تو اجلی ہے آیا سمجھ میں کچھ؟ یہی وجہ ہے کہ مغرب سے لے کر مشرق تک "کورٹ شپ" والی شادیاں عموماً اپنے مقصد میں ناکام رہتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ "آنکھ کا نشہ" جوں جوں کم ہوتا جاتا ہے اور "دل کی پیاس" جوں جوں بجھتی جاتی ہے۔ نگاہیں نقاد ہوتی جاتی ہیں یہاں تک کہ تنقید کی روشنی اور تجربے کے اجالے میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی کمزوریاں نظر آنے لگتی ہیں ——— نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعلقات کی زنجیریں اگر بیچ سے ٹوٹ نہیں جاتی ہیں تو کم از کم ڈھیلی ضرور ہو جاتی ہیں۔ ہاں تو یہی وہ صدیوں کا تجربہ ہے جس کی بنا پر ہمارے ملک نے انتخاب کا حق بزرگوں کے اور کنبے والوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تجربہ اور ان کی پختہ مغزی اس کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے کہ کون لڑکا کس لڑکی کے لئے ہے اور کون لڑکی کس لڑکے کے لئے ہے اب رہا یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی جہالت سے اپنے لڑکے لڑکیوں کو اندھا دھند کنوئیں میں جھونک دے تو قصور اس کا ہے کہ اس نے حق کو ناجائز طور پر استعمال کیا ——— اصول کو کیوں برا کہا جائے۔ اب تو سمجھ میں آگیا کہ "یہ بدبخت

ملک فطرت کو کیوں بیڑیاں پہناتا ہے" ——— یہ ہے ہمارا نظریۂ ازدواج جس نے
ہمارے ملک کی ۹۰ فیصدی "متاہل زندگیوں" کو خوشگوار اور کامیاب بنا رکھا ہے
اب رہی یہ ناگوار حقیقت کہ اس نظریہ کے ماتحت تھوڑے سے "خواہش زدہ" دل فرض
کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتے ہیں تو چڑھ جائیں۔ اس میں کیا مضائقہ ہے
اکثریت تو چین سے ہے ——— اس کے مقابلہ میں ذرا عینک لگا کر اپنے یورپ کے
آزاد ممالک "کو دیکھو" ان غلامان فطرت" کو دیکھو کہ "فطرت" کے ہاتھوں ان کے
نظام معاشرت کی بندھن کس بُری طرح کھلی جا رہی ہیں ——— اب تو نہ کہو گے کہ
یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں "جوش عشق" میں وہ حرکت کر جاتی جس کے بعد کُنبے
کی شرافت ہمیشہ کے لئے سوسائٹی کے سامنے اپنی گردن نیچی کر لیتی ——— سوچو تو کہ
میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہو کر نکاح کے وقت انکار کر جاتی تو اس میرے انکار کا نتیجہ
جماعت کی ذہنیت پر کیا مرتّب ہوتا ——— کیا میری اس بے باکی کے بعد "شرفا"
کو اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا حوصلہ ہوتا ——— تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ
میری ایک نفسانی خواہش کی بدولت قوم و ملک کی بہت سی معصوم بچّیاں علم کی
نعمت سے محروم رہ جاتیں ——— خُدا تمھیں سوچنے والا دماغ عطا کرے تم مجھے
ایک ایسی دُنیا میں بُلا رہے ہو جو کم از کم اس خلائے بسیط میں کہیں آباد نہیں ———
شاعر کے خواب میں آباد ہو تو ہو ——— تمھارے دماغ کی پرورش اور تمھارے
ذہنیت کی تعمیر ان افسانوں نے کی ہیں جو "روح" کو "دل" کا غلام بنانے کی جدوجہد
کر رہے ہیں اس لئے تم میری اور اپنی محبت کو بھی افسانہ بنانا چاہتے ہو اور خود
اس کا ہیرو بننے کے لئے بے چین ہو۔ یہی نہیں بلکہ مجھے بھی دعوت دے رہے ہو کہ
میں "گھرست مندر" کی چار دیواری سے نکل کر افسانے میں "ہیروئن" کا کام کروں
——— کس طرح کا افسانہ؟ اسی طرح کا ایک افسانہ جیسے عورت اور مرد کی
گمراہیاں آئے دن بناتی رہتی ہیں ——— وہی ہجر و وصال کی فرسودہ داستان
جسے ادب کی زبان اور ادیب کا قلم نت نئی رنگینیوں کے ساتھ دُہراتا رہتا ہے۔ وہی

"نگاہ اور دل" کی پرانی کہانی جسے موسیقی فضا میں بلند کرتی رہتی ہیں۔ اُچھالتی رہتی ہے۔ کیا کہوں کہ کیسی کہانی؟ ایک عورت ایک نوجوان مرد کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ شوق کی پیاس بجھانے کے موقعے نہیں ملتے اس لئے معاشرتی حدود سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس کے بعد مرد بیوفائی کرتا ہے عورت خودکشی کرتی ہے یا بازار حُسن کی رونق بن جاتی ہے ـــــ سُنتے سُنتے اور پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا گئی جی نہیں چاہتا کہ ایک ایسی بے مزہ اور فرسودہ داستان میں ایک اور کا اضافہ کروں۔ بنانی ہی ہے تو ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں جو آنکھوں میں سُرمہ اور دماغ کو روشنی دے۔ ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں جو مغرب کی بیٹیوں پر یہ حقیقت روشن کردے کہ مشرق کی بیٹیاں کیا کرسکتی ہیں۔ ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں کہ دُنیا حیرت کی اُنگلیاں دانتوں میں دبائے دیکھتی رہ جائے کہ ایک عورت ایک جوان عورت۔ محبت نے جس کے سہاگ کی سیج میں کانٹے بو دیئے تھے ان کانٹوں کی سیج پر زندگی کی آخری شام تک اسی طرح سویا کی اس خندہ پیشانی سے سویا کی جیسے اس کا جسم گوشت و خون کا بنا ہوا نہ تھا ـــــ ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں کہ اونچے گھرانے کی بلند نظر لڑکی نے اپنے محبت بھرے دل کو نفس کشی کی سل پر رکھ فرض کے بٹے سے اس طرح کچل دیا جیسے وہ دل نہ تھا گوشت کا ایک معمولی ٹکڑا تھا جو قصاب کی دوکان سے منگوایا گیا تھا ـــــ تم گھبراؤ نہیں میں بھی ایک افسانہ مرتب کر رہی ہوں لیکن اس طرح کا ـــــ محمود! چکی چلتی ہے اور چلتی رہے گی ـــــ اس کا کام دانوں کو پیس کر مفید سے مفید تر بنا دینا ہے۔ کوئی بیوقوف دانہ اگر اپنے پسنے کی شکایت کرے تو یہ اس کی بے بصری ہے کاش اس کے پاس چکی چلانے والوں کی بصیرت ہوتی۔ محمود! میں وہ دانہ ہوں جس کے پاس اتفاق سے بصیرت کی آنکھیں ہیں ـــــ پس رہی ہوں۔ لیکن اپنی حالت پر مغرور ہوں ـــــ یہ سمجھ کر مغرور ہوں ـــــ کہ کام آ رہی ہوں ـــــ برباد نہیں ہو رہی ہوں۔ "نکل چلو پیاری سلیمہ نکل چلو" کاش یہ لکھنے سے پہلے تمھارے قلم پر فالج گر پڑتا۔ حافظ نے شاید تمھارے کانوں میں پھونک دیا ہے کہ

من از آں حُسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بیروں آرد زلیخا را

لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی ایک بیٹی نے "ایرانی شاعر" کے اس نظریہ کی تردید کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے ـــــ اور خُدا نے چاہا تو زمانے کی آنکھیں دیکھ لیں گی "سلیمہ" نے "حافظ" کو جھٹلا دیا۔ محمود! سُن لے کہ تیرا حُسن میری نظر میں کسی طرح یوسف کے "حُسن روز افزوں" سے کم نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک مصر کی عورت تھی جو اپنے یوسف کے لئے "پردۂ عصمت" سے نکل کھڑی ہوئی اور میں ایک ہندوستان کی لڑکی ہوں جو عشق کے ساتھ فرض کی ڈوری کو بھی مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے گی۔

تمھاری طرز تحریر سے یہ بو آتی ہے کہ تم خواہ مخواہ جنون کو دعوت دے کر اپنے پاس بُلانا چاہتے ہو۔ اگر ہو تو تعجب نہیں اس لئے کہ بچپن سے لے کر جوانی تک تم ایک ایسا لٹریچر پڑھتے آئے ہو جو دردؔ کی شاعری سے لے کر غالبؔ تک علانیہ ڈنکے کی چوٹ جنون کو ہوشیاری پر ترجیح دیتا آیا ہے۔ کیا اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ لکھتے ہو کہ "اب کچھ دنوں میں زنجیر کی ضرورت ہوگی" خُدا مبارک کرے، یہ وہ گہنا ہے جس کو تم سے پہلے تمھارے بہت سے بھائی پہن چکے ہیں۔ لیکن خُدا کے لئے اس گہنے کو اُتار کر جوش جنوں میں صحرا کی راہ نہ لینا ورنہ یاد رہے کہ محبت کا قانون تمھیں ماخوذ کرے گا اور میں انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر تم پر بیوفائی کی فرد جرم قائم کروں گی ـــــ راسخؔ کی زبان سے ؎

قیس پھرتا جو رہا دشت میں دیوانہ تھا — اس کو لیلا ہی کے دروازے پہ مرجانا تھا

کہو شاعر ہو ـــــ کھسیانی ہنسی نہ ہنسو ـــــ اس شعر کا کیا جواب ہے۔ ہاں تو یہ سمجھ لو کہ لیلیٰ کے دروازے پر رہو گے تو لیلیٰ کی آواز سُن سکو گے۔ لیلیٰ کی ایک جھلک تو دیکھ سکو گے۔ لیلیٰ کی کوئی خدمت تو کر سکو گے۔ پاک محبت کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔ کیا تمھاری آنکھیں مجھے روزانہ کئی بار دیکھ لینے پر قناعت نہیں کر سکتیں کیا محبت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز سے تم محبت کرو وہ قانونی حیثیت سے تمھاری ملک بھی ہو ـــــ یہ تو ملکیت کا وہی جذبۂ قدیم ہے "گڑیا خوبصورت ہے مجھے ملنی چاہئے

حامد بھیا کو کیوں مل گئی"—— میں تو اسی میں خوش ہوں کہ قسمت نے تم کو مجھ سے چھین لیا اور چھین کر بھی مجھ سے قریب ہی رکھا۔ پاک محبت کو (گو پاک محبت اس آب وگل کی دُنیا میں قطعاً ممکن نہیں) جوں توں کرکے نباکجھانے کے لئے دیور بھاوج کا رشتہ کیا کم ہے؟ میں ہندوستانی عورت ہوں اس لئے میری تخئیل اور میرا مذاق دونوں ہندی ادب سے متاثر ہے —— میرے لئے دیور بھاوج کا رشتہ بجائے خود عاشق اور معشوق کے رشتے سے کم مزیدار نہیں ہے کیا تم نے وہ گیت نہیں سُنا ہے

دیور وا چھینے مورا ہار

تصور تو کرو کیسی حسین زندگی ہے کیسا مزیدار کھیل ہے۔ پاکیزہ بھی اور پُر کیف بھی۔ پھر پُرانے زمانے کو بھول کر بالکل بھول کر نئے رشتے کے ماتحت کیوں نہ ہم تم بھی عمر بھر یہی کھیل کھیلتے رہیں۔ کھیلتے رہیں چُھلیں کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ بُڑھاپا آکر دلوں کے دروازے بند کردے۔ اس کے علاوہ میری ایک آرزو ہے۔ "آرزو" لفظ کی اہمیت پر غور کرو —— اگر تم واقعی وفا کے مُدّعی ہو تو میری ہر آرزو کا احترام، عملی احترام تمہارا عاشقانہ فرض ہے۔ اچھا تو وہ یہ کہ تم جلد سے جلد اپنی زندگی کا شریک ڈھونڈھ لو —— ڈھونڈھ لو باغ میں ہر طرف پھول ہی پھول ہیں غور سے دیکھو کسی نہ کسی پھول پر تمہارا نام بھی ضرور لکھا ہوگا۔

"جوانی دیوانی" مشہور ہے اس عمر میں اس قسم کے جذباتی دورے کوئی عجیب چیز نہیں ہیں۔ خُدا وہ دن کرے کہ چاند سی دُلہن بیاہ کرکے گھر میں لاؤ —— دُنیا اُجالی ہوجائے گی۔ اور جوانی کے وہ بخارات جو دماغ پر چڑھ کر تمھیں ایسے خواب دکھلا رہے ہیں جن کی کوئی تعبیر نہیں جب گھٹا بن کر برس جائیں گے تو پھر میں پوچھوں گی کہ تم کہاں تھے؟

محمود! آنکھیں کھولو! پھر کہتی ہوں اور نہایت سنجیدگی سے کہتی ہوں کہ جو راہ تم اختیار کر رہے ہو وہ بخط راست ظلمات کو گئی ہوئی ہے —— چھوڑ دو اس راہ کو۔ نتیجے کی روشنی کا انتظار نہ کرو —— کیونکہ یہ اس وقت نمودار ہوتی

ہے جب آدمی پوری طرح گم ہو چکتا ہے ـــــ بس اور کیا کہوں زیادہ ۔
"داغ دل اور ماتم فراق"

راقمہ :۔ تمھاری لیلیٰ

خط کتاب میں رکھ کر محمود کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد دل کو تو دھڑکنے کی عادت ہی ہو گئی تھی اس نے پھر دھڑکنا شروع کیا ـــــ یہ سوچ کر کہ کہیں محمود مجھ سے مایوس ہو کر سچ مچ جنگلوں کی راہ نہ لے۔ کئی دن تک انھیں اندیشوں میں اُلجھی رہی ـــــ تیسرے دن محمود کی صورت نظر آئی ـــــ تیوریوں کا چڑھاؤ کم ہو چکا تھا لیکن افسردگی پہلے سے زیادہ تھی۔ محبت نے کہا کہ دوڑ کے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کی بلائیں لے لوں ـــــ لیکن کیا کرتی جی مسوس کر رہ گئی ـــــ چوتھے دن رات کے کوئی دس بجے بھائی نے کھانے پر بلایا آئے تو عالم ہی دوسرا تھا۔ چہرے پر جیسے کسی نے سُرخی مَل دی ہو۔ آنکھیں چڑھی ہوئی لال لال ڈورے قدم میں لغزش چال میں ایک طرح کی بے اختیاری بھائی ان کے سر جھکائے کھانا کھا رہے تھے۔ انھوں نے ان کی حالت پر غور نہ کیا میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا ـــــ اور دیر تک دیکھتی رہی "آج اس خُدا کے بندے کو کیا ہو گیا ہے" ـــــ بھائی ان کے جب کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں گئے تو میں نے آہستہ سے پوچھا "یہ کیا حال ہے؟" کہنے لگے ؎

عقل تو دردِ سرِ تست بہ مئے سودا کُن   کہ بلا ہر چہ رود بر سرِ عاقل بہ رود

یہ شعر پڑھا اور جوٹھا ہاتھ لئے لڑکھڑاتے ہوئے باہر چلے گئے ـــــ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی ـــــ اس کے بعد ان کی حالت پہ چند آنسو ـــــ آج اس کہانی کو یہیں پہ ختم سمجھئے گو شمع اور رات دونوں میری عمر کی طرح آدھی باقی ہیں لیکن میرا فرض مجھے پکار رہا ہے ـــــ چھوٹا بچہ سوتے سوتے جاگ اُٹھا ہے۔

"لذّت آزار"

(محمد محسن)

"ماں سُندری بُوا نے لوٹا پٹخ کر پچکا دیا" رجھنی دوڑتی ہوئی ماں کے پاس آکر شکایت کرنے لگی۔

"مُلا تو اس مال جادی کو۔ ای تو میرا گھر ناس کر دے گی"۔

سُندری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ کنوئیں سے برتن مانجھ کر واپس آرہی تھی۔ برتنوں کو تلے اوپر بٹھا کر اس نے سر کے اوپر رکھ لیا تھا۔ رجھنی ساتھ تھی۔ چلنے میں سُندری کے کاندھے سے آنچل سرک کر زمین پر لوٹنے لگا۔ رجھنی اُسے پکڑ کر گھوڑے کی لگام کی طرح کھینچنے لگی۔ کھینچا تانی میں لوٹا کھسک کر زمین پر آرہا۔ سُندری کو چچی سے اُس دن بڑی مار کھانی پڑی۔ اپنے قصور سے زیادہ بے گناہ، رجھنی کا نام لگانے پر۔

سُندری ۶ سال کی تھی کہ اس کی ماں نے مرتے وقت اسے چچی کو سونپ دیا تھا جب سے وہ چچی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس عورت کے اپنے کئی بچے تھے۔ اور ان کے رہتے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ سُندری کی پرورش کا بار بلا معاوضہ اپنے سر لیتی۔ بچوں کے کپڑے دھونا۔ ان کے کھانے کے برتن صاف کرنا اور پھر ان کی جھڑکیاں۔ ان کی بے سبب مار پیٹ کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا۔ انھیں خدمتوں کی بدولت سُندری کو دو وقت کھانا مل رہا تھا۔ ان کے انجام دہی میں ایک ذرا کوتاہی سُندری کو مار اور جھڑکیوں کے علاوہ فاقہ کی سختی برداشت کرنے پر مجبور کر دیتی۔

پڑوس والے کہتے کہ سُندری گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت ہے۔ سُندری کی چچی کو ان کی یہ بات کبھی اچھی نہ لگتی۔ وہ ہمیشہ سُندری کے مقابلہ میں اپنی بیٹی کی خوش سلیقگی اس کی فرزانگی، اس کا بھولا پن اور موہنی صورت کا ذکر کرنے لگتی اسے ایسا

محسوس ہوتا کہ سُندری کی یتیمی پر رحم کھا کر یہ لوگ اس کی تعریفیں کرتے تھے۔" اور پھر وہ حسد سے بھی تو ایسی باتیں کرتے تھے۔ فقیر زادی سُندری سے انھیں کس بات پر ڈاہ ہوتا" اُسے سُندری سے نفرت سی پیدا ہو جاتی۔ آخر پڑوس والوں کی اس ناانصافی کا بدلہ تو اُسے کسی سے لینا ہی تھا۔ وہ سُندری کے قصور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتی اور اسے سزا و ملامت کا نشانہ بنا کر اپنے دل کا بخار ہلکا کرتی۔ سندری کے لئے سب سے سنگین سزا پیٹ کی مار ہوا کرتی۔ اس کی چچی دن دن بھر اس کا کھانا بند کر دیا کرتی۔ یہی سزا سُندری کے لئے حقیقی طور پر صبر آزما ہوا کرتی ورنہ وہ جھڑکی اور مار کی تو کب سے عادی ہو چکی تھی جس طرح ہر صبح اس کی نظریں سورج کی کرنوں سے دوچار ہوتیں۔ اسی طرح اس کا کوئی دن لعن و طعن کی باتوں، گالیوں اور تھپڑ سے خالی نہ جاتا تھا۔ سورج کی کرنوں ہی کی طرح اس کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بلکہ بسا اوقات تو یہ مار اور جھڑکیاں اس کے لئے نوید جاں بخش بن جاتی تھیں۔ وہ ان کی مشتاق سی رہتی جس دن اس کی چچی کا غصہ سر ہو جاتا اور اسے اپنے ہاتھ اور زبان کی کارکردگی پر اعتماد نہ رہتا وہ خموشی سے دو دو وقت سُندری کا کھانا بند کر دیتی۔ سُندری کوئی قصور کرتی تو چچی کی گالیوں اور مار کی بے چینی سے منتظر رہتی اور اگر کبھی وہ اُن سے محروم رہ جاتی تو پیٹ کی مار کے تصوّر سے اس کے جسم کا سارا خون خشک ہو جاتا۔ اُف! دو دو وقت کا فاقہ! گھر کے سارے لوگ اس کی نظروں کے سامنے بھر بھر پیٹ کھاتے ہوتے۔ وہ ان کے آگے کھانے کی چیزیں لا کر رکھتی۔ جوٹھے برتن صاف کرتی۔ لیکن بچا کھچا کھانا اُسے دکھا کر گلی کے کُتّوں کو نذر کر دیا جاتا۔ وہ پیٹ کی آگ پر پانی اُنڈیل کر رہ جاتی۔ اس سزا کے تصوّر سے وہ کانپ اُٹھتی تھی۔ "چچی اُسے مار مار کر ادھ موا کر دیتی لیکن بچا کھچا کھانا تو دے دیتی" رفتہ رفتہ سُندری کو چچی کی مار اور جھڑکیوں سے اُنس سا ہوتا جارہا تھا۔ انھیں کی بدولت تو اُسے کھانا ملتا تھا! ان کی خاطر اکثر اس سے کچھ نہ کچھ بھول چوک ہو جاتی۔ کوئی نہ کوئی ہلکا سا قصور۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے بغیر اُسے آسودگی نہ میسّر ہوتی تھی۔ جیسے کسی کو شراب پی کر گلیوں میں روندے جانے کی عادت پڑ جاتی ہو۔

سُندری کا چچیرا بھائی جھکو ماں کا اکلوتا تھا۔ اس کی پرورش گلی کے کتوں کی طرح آزاد اور بے پروا ہو رہی تھی۔ گھر والوں کی مجال نہ تھی کہ اس کی کوئی ممکن خواہش رد کی جائے۔ وہ جس کو چاہتا مار بیٹھتا۔ جس سے چاہتا اس کے منہ کا نوالا چھین کر ہڑپ کر جاتا اس کی باز پرس کوئی نہ کر سکتا تھا۔ خصوصاً سُندری تو اس کی مشق ناز کے لئے وقف تھی۔ دوسرے بچوں کی شکایتیں کم از کم جھکو کی ماں کے چہرہ پر شکن پیدا کر دیتی تھی۔ لیکن سُندری کی تو مجال نہ تھی کہ لب تک ہلا سکے۔

دوسری خدمتوں کے علاوہ سُندری کو اکثر پہروں جاگ کر جھکو کے پاؤں بھی دابنا ہوتا تھا۔ ایک ذرا اس کی آنکھیں جھپکیں کہ جھکو کی گالیاں اور بے پناہ چٹکی اُسے بیدار کر دیتی۔

ایک شب سُندری حسب معمول جھکو کا پاؤں داب رہی تھی۔ گھر کے سارے لوگ سو چکے تھے۔ سُندری کو بھی نیند آ رہی تھی۔ لیکن جھکو ابھی تک سویا نہ تھا اور جبتک نیند اُسے بے دست و پا نہ کر دیتی سُندری کو پیر دابتے رہنا تھا۔ پاؤں دابتے دابتے سُندری یکبارگی اونگھ کر زمین پر گر پڑی جھکو کو نیند آیا ہی چاہتی تھی۔ آہٹ پا کر وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا اور سُندری کا ہاتھ جھٹکے سے اپنی طرف کھینچ کر مروڑنے لگا۔ پھر اس نے اس زور سے اس کی چٹکی لی کہ سندری مچل کر رہ گئی۔ جھکو نے اس پر بس نہ کی اس نے سُندری کو ایک ایسی لات لگائی کہ وہ چت ہو کر زمین پر گر گئی۔ جھکو اپنی خشمگیں نگاہیں سُندری کے بکھرے ہوئے اعضاء پر جمائے تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اسے پہلی بار سُندری کے شباب کی خبر ملی۔ اس کے بہیمیہ جذبات اکبارگی جاگ اُٹھے اور وہ بھوکے شیر کی طرح سُندری پر ٹوٹ پڑا۔ سُندری اضطراری طور پر مدافعت کی کوشش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ جھکو نے اپنے آہنی بازوؤں کی مدد سے اُسے زیر کر لیا اور اس زور سے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا کہ سندری کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں۔ سُندری بے قابو ہو گئی اور جھکو کی ہوسناکی نے اُسے پہلی بار ایک نہایت جاں گسل لیکن لذت مآب تجربہ سے آشنا کیا۔

جھکو اسی طرح سُندری کے شباب پر چھاپے مارتا رہا۔ اس کے ہر اقدام میں ویسی ہی خشونت اور سخت گیری ہوتی۔ جیسے پھول کو پاؤں تلے روندنے کے بعد اُسے پلٹ کر اُٹھا لیا جائے۔

سُندری پوری جوان ہو چکی تھی لیکن جھکو کی ماں کو ابھی تک اس کے بیاہ کا خیال نہ ہوا تھا۔ شاید اس کی خدمت گزاری سے فائدہ اُٹھانے کی خواہش اس کی چچی کو اس کا سوچ نہ پیدا ہونے دیتی تھی ہمسایہ والیاں اُسے ٹوکتیں تو یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ "اس کے بیاہ کے سوچ میں تو ہم کو رات بھر نیند نہیں آتی۔ مگر ہم کیا کریں۔ کہیں سے بات بھی تو آئے۔ لڑکے کا معاملہ ہوتا تو اپنے سے کہیں پیغام بھیجتے۔ کہیں لڑکی والے بھی بات چلاتے ہیں؟" کچھ دنوں تک تو اس جواب سے کام چلتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ محلہ والیوں کو شک ہو گیا کہ جھکو کی ماں سُندری کو اپنے گھر کے کام کاج کے لئے بٹھائے رکھنا چاہتی ہے۔ جھکو کی ماں کو راہ چلتے طعنے ملنے لگے "ہاں رے پرائے کی بیٹی کا تو کو پھکر کیا۔ مپھت کی لونڈی مل گئی ہے۔ چلی جائے گی تو گھر کا کام کون سنبھالے گا۔"

جھکو کی ماں اگر سُندری کا بیاہ نہ کرتی تو کوئی اس کا کر ہی کیا سکتا تھا۔ کوئی تھانہ پولیس کی بات تو تھی نہیں کہ جھکو کی ماں کو مجبور ہو جانا پڑتا۔ پھر سُندری اس کی بھتیجی تھی محلہ والیوں کو کیا سُندری کا بیاہ ہو یا نہ ہو۔ وہ بن بیاہی رہ کر ان کے بھات پر تھوڑا ہی گزارہ کر رہی تھی؟ پھر اس طرح کے خیالات جھکو کی ماں کے دماغ میں پیدا نہ ہوتے تھے۔ اور اُسے محلہ والوں کی بات پر کان دھرنا ہی تھا۔ لیکن واقعی ننگی بچی سُندری سے بیاہ کرنے پر کون آمادہ ہوتا۔ جھکو کی ماں بیاہ کا خرچ اُٹھانے کو تیار نہ تھی۔ اُسے اپنی بیٹی کے بیاہ کا بھی تو خیال تھا۔ گھر میں جو کچھ تھوڑا بہت پسماندہ تھا اس نے بیٹی کے بیاہ کے لئے الگ رکھ چھوڑا تھا۔ ایک جگہ سے بات بھی آئی تو لڑکے والوں نے پہلے ہی سے دان جہیز کی تفصیل دریافت کرنی شروع کر دی۔ جھکو کی ماں نے صاف کہہ دیا کہ وہ ایک تنکا بھی جہیز میں نہیں دے سکتی۔ "گھر کا بھات کھلا کھلا کر پوس دیا۔ اب کیا اس کے پیچھے گھر بار بیچ کر بھیک مانگتے پھریں؟" بے گہنا زیور کی بہو لے جا کر ناک کٹوانے کو تیار کون ہوتا؟ بات وہیں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد پھر کہیں سے

کوئی پیام نہ آیا۔ لیکن محلہ والیوں کے اعتراض کی بوچھار بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اپنی صفائی پیش کرتے کرتے جھکو کی ماں کے ناک میں دم آگیا۔ آخر تنگ آ کر اس نے چپکے چپکے ایک بات پکی کر لی۔ لڑکا دو آبا تھا۔ پاس کے گاؤں میں کھیت باری بھی رہی تھی۔ لیکن سب کچھ شراب کے پیچھے تباہ کر چکا تھا۔ اب قلیل تنخواہ پر ایک چھاپہ خانہ میں کام کرتا تھا اور کمائی کا بیشتر حصہ شراب کی نذر کر دیتا۔

جمائی سُندری کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا۔ سُندری کی زندگی میں اس اہم تغیر نے بھی کوئی فرق پیدا نہ کیا۔ اسی طرح دن بھر کا کام کرنا۔ چولھا پھونکنا۔ برتن مانجھنا۔ پھر رات گئے تک جمائی کے بدن دابنا اور اس کی گالیوں اور لاتوں کی تواضع قبول کرنا۔ جمائی جب شراب کے نشہ میں گھر آتا اور اس کی تکا بوٹی کر کے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا تو اُسے جھکو کی دست درازیاں یاد آ جاتیں۔ وہ اسی طرح پوری طاقت سے مدافعت کی کوشش کرتی اور اسی طرح وحشیانہ حملوں کے مقابلہ میں زیر ہو کر بے بس ہو جاتی۔ انجام کار اسی لذت گیر لیکن اذیت آب تجربہ کی سرشاری!

جمائی ایک رات بہت زیادہ شراب پی کر واپس آ رہا تھا راستہ میں اُسے بے موقع ٹھوکر لگی۔ سر میں سخت چوٹ آئی اور چند دن بیمار رہ کر مر گیا۔

جمائی کی موت کے بعد سندری کی زندگی میں اور زیادہ دشواریاں پیدا ہو گئیں مسلسل فاقوں کی تکلیف سے وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اور اس کا گورا رنگ اس کے چپکے ہوئے گالوں پہ کفن کی سی منحوس بے رونقی پیدا کر رہا تھا۔ اس کی رس بھری آنکھوں کی تابانی ناپید ہو گئی تھی اور ان کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔ جیسے مفلسی کھنڈر کے سوراخ سے جھانک رہی ہو۔ سُندری اس تکلیف و مصیبت کی زندگی سے جلد نجات نہ پا چکی ہوتی، اگر مینسا نے اسے بمبئی لے جا کر ایک نئی دُنیا میں داخل نہ کر دیا ہوتا۔

سُندری اب ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہی تھی جہاں عورت کا حُسن اور اس کے عضار کی دل آویزی اُسے انسانیت کی ایک مجبور و مرہون توجہ شخصیت باقی نہیں رہنے دیتی اور اس کی مٹھی میں مرد کی تقدیر ڈال دیتی ہے۔ جیسے پہاڑی مزدوروں کے پاؤں تلے روندے ہوئے

کر وٹن کو سنہرے گملے کی آب و تاب کسی لکھ پتی کی قیمتی توجہ پر چھاپا مارنے کے قابل بنا دیتی ہو۔ سندری اس نئے عالم میں بڑی تیزی سے منازل طے کر رہی تھی اس کی تقدیر کروٹ لے رہی تھی۔ جیسے کسی بنجر اور اُجاڑ زمین کے نیچے سے خزانہ نکل آئے۔ اس کے گلے کی فطری موسیقیت کو اُستاد کی فنکارانہ تعلیم نے بہت جلد چار چاند لگا دیئے اور اس کے نغمے کی مقناطیس بمبئی کے اونچے اونچے محلوں سے زر و جواہر کے انبار کھینچنے لگی سُندری کی شہرت فلمی دُنیا میں بھی پہنچ گئی اور ایک ممتاز فلم کمپنی نے اس کی فطری ودیعتوں کا خزانہ لوٹنے کے لئے اُسے ایک بڑی تنخواہ پر رکھ لیا۔

سُندری بہت کم عرصہ میں ہندوستان کی مشہور ترین ایکٹرس میں شمار کی جانے لگی۔ اس کے چہرہ کی فنکارانہ تراش اس کے گندمی رنگ کی قیامت خیز ملاحت اس کے اعضا کا ملکوتی تناسب، اس کے انداز کی سحر آگیں کرشمہ سازی۔ اس کی لوچ دار آواز کی بانسری ان ساری خصوصیتوں کے بعد اس کی باکمال اداکاری! شاید کسی فلم اسٹار کے اندر ان ساری دل آویزیوں کے سامان یکجا بہم ہوتے ہوں گے۔ وہ جس وقت فلم کے پردہ پر نمودار ہوتی تو معلوم ہوتا کہ انسانی دماغ کے نازک ترین شہکاروں میں جان پڑ گئی ہے جیسے غیر مرئی تصورات کو گوشت و پوست کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہو فلمی دُنیا میں اُسے کوئی سُندری کے نام سے نہ جانتا تھا۔ وہ مس اندرا دیوی تھی جس سے دو باتیں کرنے کی تمنا معصوم سے معصوم دلوں میں بھی کروٹ لینے لگتی۔

سُندری کی گھناؤنی شخصیت مس اندرا کے روپ میں اپنے اندر سوسائٹی کے ارمانوں کی دُنیا بسائے ہوئے تھی فلمی دُنیا میں قدم رکھنے سے پہلے وہ صرف اوباش اُمراء اور غیر متمدن تجار کی توجہ کا مرکز تھی۔ لیکن اب اس کی صحبت کے چند لمحے ترقی یافتہ اور باوقار شخصیتوں کے لئے بھی باعث ناز تصور کئے جاتے تھے۔ وہ کبھی نئے شہر میں چلی جاتی تو اسٹیشنوں پر تماشا بینوں کا ویسا ہی ہجوم ہوتا جیسے سڑک کی برقی روشنی کے گرد پتنگوں کی یورش۔ فلم پرستاروں کے رومان خیز مراسلات کی بارش ہوتی رہتی۔ قلوپطرہ کا روایتی نقشہ الفاظ کے کینوس پر کھینچ کر

اس کے حُسن کے مقابلہ میں نیچا ثابت کیا جاتا۔ اس کی آواز کی دلکشی کو ایک حیات آفریں معجزہ کا نام دیا جاتا۔ اس کی لاثانی اداکاری فدائے فن کے اعلیٰ شاہکار کی حریف بتائی جاتی۔ سُندری رفتہ رفتہ ان اصطلاحات کے معنی سمجھنے لگی تھی۔ فلمستان میں قدم رکھنے کے بعد اس نے کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ لیکن ان خطوط سے اُسے کوئی دلچسپی نہ پیدا ہوتی وہ انھیں پڑھتے ہی ردی کے ٹوکرے میں پھینک دیتی جیسے وہ اس کے لئے مفہوم نہ رکھتے ہوں اس لئے نہیں کہ وہ ان کی کثرت و عمومیت سے اُکتا گئی تھی ان میں بعض خطوط ایسے بھی ہوتے جن کی رومان انگیزی کی قسم کھائی جا سکتی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سُندری کی روح کا کوئی تار بھی ان سے مرتعش نہ ہوتا تھا۔

اونچے اونچے عہدوں اور بڑی بڑی پوزیشن کے لوگ سُندری کی ملاقات کو آتے اس کی خوبصورتی اور فلمی صلاحیتوں کی پُرخلوص داد دیتے بعض اس کے حُسن کی قربان گاہ پر اپنی زندگی نچھاور کرنے کے لئے سربکف نظر آتے اور اپنا سب کچھ اس کے قدموں پر بھینٹ چڑھانے کا مدعا ظاہر کرتے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سُندری پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا جیسے وہ ایک بے جان پتلا ہو فلم کے اسٹیج پر اس بجلی کی طرح تھرکتی ہوئی تیتری کو یوں بے حس و حرکت دیکھ کر انھیں سخت حیرانی ہوتی۔ اس کی روح کے لطیف رومانی تار کو متحرک کرنے کے لئے وہ نت نئے طریقے عمل میں لاتے لیکن ان کی ہر کوشش بے اثر ہوتی اور وہ عجیب پشیمانی اور تعجب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے وہ سمجھنے لگتے کہ ان کی باتیں سُندری کو ناگوار خاطر ہو رہی ہیں اور وہ خموش ہو جاتے پھر دونوں طرف کی خموشی فضا کو مکدّر بنا کر انھیں آمادہ رخصت کر دیتی۔ لیکن انھیں جرأت نہ ہوتی کہ اس بے اعتنائی اور عدم توجہ کا سبب سُندری سے دریافت کر سکیں رفتہ رفتہ سُندری کے اس انوکھے انداز کا چرچا کافی پھیل گیا اور اس کی غیر فلمی زندگی کا جمود اور بے کیفی فلم پرستاروں کے لئے ایک معمہ بن گئی۔

سُندری ایک فلم کمپنی کے ساتھ نیا کنٹریکٹ کر کے بمبئی سے کلکتہ منتقل ہو گئی۔ کمپنی کے منیجر نے بڑی جان توڑ کوشش سے سُندری کو حاصل کیا تھا۔ سُندری کو راضی کر کے

منیجر نے کمپنی کے لئے اپنی بے لوث پُرخلوص خدمت کا ثبوت دیا تھا۔لیکن حقیقت میں منیجر کو سُندری سے محبت ہو گئی تھی کمپنی کی رونق بڑھے یا نہ بڑھے دراصل وہ اپنے دل کی دُنیا روشن کرنا چاہتا تھا۔

منیجر رفتہ رفتہ سُندری سے بے تکلف ہوتا جا رہا تھا جس روز سے سُندری نے کمپنی میں قدم رکھا تھا منیجر کے دل کی آرزوئیں اپنے اظہار کے لئے مچل رہی تھیں لیکن سُندری کا حُسن اس کی مقبولیت فلمی دُنیا میں اس کی پوزیشن یہ ساری باتیں منیجر میں عرض مدعا کی جراُت نہ پیدا ہونے دیتی تھیں۔

منیجر نے ایک شب سُندری کو کھانے پر مدعو کیا۔سُندری وقت مقررہ پر پہنچ گئی منیجر نے خلوت کا فائدہ اُٹھانے کی غرض سے کسی اور کو نہ بُلایا تھا باغ کے صحن میں پُرتکلف کھانوں سے میز سجی ہوئی تھی سُندری منیجر کے روبرو بیٹھی تھی چاندنی کا سفید جال فضا پر پھیلا ہوا تھا۔اوائل اپریل کی خمار آلود ہوا نشہ کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔

منیجر جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا۔تمناؤں کے اُٹھتے ہوئے طوفان نے اس کے دل کی حرکت تیز کر دی تھی کھانے کے درمیان وہ اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ رہا تھا لیکن مطلب کی گفتگو شروع کرنے کی اُسے جراُت نہ ہوتی تھی۔چاندنی کے پس منظر میں سُندری کا حُسن اور نکھرا جا رہا تھا منیجر پر رُعب سا طاری تھا۔آخر اس نے ہمت کر کے زبان کھولی۔

"اندرا دیوی آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ سے ایک بات کہوں۔"

"شوق سے کہئے" اندرا نے جواب دیا۔

"آپ بُرا تو نہ مانیں گی"منیجر نے رُکتے رُکتے سوال کیا۔

"میں نے آپ کو پہلی بار نئی دُلھن میں دیکھا۔اُف آپ مجھے کسی قدر خوبصورت لگی تھیں۔لیکن آپ حقیقت میں جتنی خوبصورت ہیں فلم میں اس کا ٹکڑا بھی نہیں معلوم ہوتیں۔اپنی کمپنی کی کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں آ گئی ہیں اور خصوصاً میری تو......"

اس کی زبان رُک گئی اس نے سُندری کی طرف دیکھا سُندری کے چہرہ پر کسی تاثر کا نشان نہ تھا منیجر شرمندہ سا ہو گیا۔

"آپ رُک کیوں گئے! کچھ بول رہے تھے نا" سُندری نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔

"شاید آپ میری باتوں سے ناراض ہو جائیں؟"

"آپ بولئے بھی تو" سُندری نے جیسے چڑھ کر جواب دیا۔

"میں آپ کو تصویر میں دیکھ کر آپ کا بن گیا تھا اور اس روز سے آرزومند تھا کہ اپنی محبت کے اثر سے آپ کو اپنا لوں۔ اندرا دیوی میں اپنا سب کچھ آپ پر قربان کرنے کو تیار ہوں" منیجر نے جذبہ سے متاثر لہجہ میں کہا۔

سُندری کا چہرہ اب تک بے اثر تھا۔ جیسے اس نے پوری بات سُنی ہی نہ ہو۔

"سندری دیوی کیا آپ میری درخواست قبول کریں گی" منیجر نے سندری پر ملتجیانہ نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

سُندری خاموش رہی کھانا ختم ہو چکا تھا۔ منیجر نے وارفتگی کے عالم میں اپنی کرسی سُندری کے نزدیک سرکائی۔ سندری نے اپنے جسم کو ایک طرف جھکا کر اضطراری طور پر اپنا عُریاں مونڈھا منیجر کے قریب کر دیا۔

"سُندری دیوی آپ میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں؟" منیجر نے بے چینی سے سوال کیا۔

سُندری پھر بھی خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے مظلومی اور لاچاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ اُستاد کی ناگزیر تادیب کا منتظر ہو۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے سانس کی رفتار مدھم ہو رہی تھی سُندری کی اس کیفیت پر منیجر کو سخت تعجب ہو رہا تھا۔ اسے توقع تھی کہ سُندری جو اسٹیج پر بجلی کی طرح کودتی ہوئی اس کی درخواست کا جواب ایک فردوسی اور رومان پرور انداز میں دے گی۔ اسے ڈر ہونے لگا کہ شاید اس کی گفتگو سُندری کو ناگوار گذر رہی تھی۔ لیکن وہ شوق و جذبہ سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے پھر ہمت کر کے سُندری کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

"سُندری دیوی" اس نے جذبات سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

سُندری نے اس کی طرف نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ اس کی نگاہیں خشمگیں معلوم ہوتی

تھیں۔ جیسے کسی مجبور کو اپنی بے بسی پر غصہ آجائے۔ منیجر گھبرا گیا۔ سُندری اس کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے وہ منیجر کی جانب سے کسی اقدام کی منتظر ہو۔ لیکن منیجر کی نگاہیں اس کی نظروں سے دوچار ہونے کی تاب نہ لاسکیں۔ اور اس کی پلکیں اضطراری طور پر جُھک گئیں۔ سُندری کی انگلیاں یکبارگی منیجر کے گلے پر بجیں۔ منیجر طمانچہ کھا کر اور حیران ہوگیا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سُندری سے ایسے برتاؤ کی اُسے کبھی بھی توقع نہ تھی۔ وہ سہم گیا۔ اور نظریں نیچی کیے رُکتے رُکتے بولا۔

"سندری دیوی مجھے معاف کیجیے۔ مجھے بڑی غلط فہمی ہوئی۔"

اس کے چہرہ سے ندامت اور پشیمانی ظاہر ہو رہی تھی۔ سندری بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کُرسی سے اُٹھ گئی۔ اس نے ٹیبل کلاتھ کا کونا اپنی طرف زور سے کھینچا۔ ٹیبل پر رکھی ہوئی پلیٹیں چکنا چور ہوگئیں۔ سُندری غصہ سے ہانپ رہی تھی۔ منیجر سہما ہوا کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سندری نے پھر اس کی طرف نگاہیں کیں۔ ان میں غصہ کے ساتھ التجا بھی شامل تھی۔ منیجر کچھ سمجھ نہ سکا اور مبہوت سا کُرسی پر بیٹھا رہا۔ سُندری کرسیوں سے ٹکراتی غضب ناک طور پر قدم بڑھاتی ہوئی منیجر کے مکان سے نکل آئی۔

ایک درخت کا قتل

(ڈاکٹر اختر اورینوی)

ایک کوارٹر کے پہلو میں ایک بہت ہی اونچا، مضبوط، گھنیرا اور خوبصورت درخت تھا۔ شہر کے مشہور باغ کو بڑی بدسلیقی سے کاٹ کاٹ کر بے ربط اور بدوضع کوارٹر کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ بے ہنگم، نہ ناک درست نہ نقشہ۔ صرف ایک کوارٹر اسی چھتنار اور بلند و بالا درخت کی وجہ سے بہت بھلا لگتا تھا، ہرا بھرا، سایہ دار ماحول کے بے کیف سپاٹ پن اور بدآہنگی کو دور کرنے والا گہری جڑیں، سڈول، بھاری بھرکم، اونچا تنا، پھیلی ہوئی صحت مند شاخیں، سرسبز کونپلیں، سندر ہرے بولتے ہوئے پتّے۔ اس پیڑ کی سربلندی کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا اور آسمان کی طرف نظریں اٹھ جاتی تھیں۔ دل میں بڑا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا جس مٹّی سے ایسا وشال درخت اُگے وہ مقدس محسوس ہوتی تھی۔ اس پُرانے باغ کے نہ جانے کتنے خوبصورت اور پھل دار درخت کاٹ کر پھینک دیئے گئے ہوں گے۔ آم، لیچی، جامن، امرود اور شریفے کے پیڑ۔ اُفتادہ زمینوں اور بنجر قطعوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن نہ جانے کس جبلّت کی تسکین کے لئے یہی حسین باغ قتل گاہ بنایا گیا۔

اس برباد باغ کی ایک تاریخ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاہی وقت کا باغ تھا۔ ایک فراخ دل نواب نے اپنے جگری دوست ایک مہاراجہ کو تحفتہً یہ باغ پیش کیا تھا۔ انھیں دنوں ایک کامل فقیر باغ کے ایک گوشے میں دھونی رما بیٹھا۔ مہاراجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اسے نیک شگون سمجھا اور پہلو میں ایک قطعہ آراضی بھی شاہ صاحب کو دے دی۔ آج بھی اس احاطے میں قبریں موجود ہیں۔ خُدا رسیدہ فقیر کا سالانہ عُرس ہند و مسلمان سب دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ جس عظیم الشان درخت کا ذکر

ہے۔شاہ صاحب کی قبر پر سایہ کئے ہوئے تھا۔جیسے چتر لگانے کی سعادت حاصل کر رہا ہو
لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ درخت بھی متبرک ہے اور اس خطّے کی خاک پاک ہے جب
انگریزوں کا رواج ہوا تو لفٹننٹ گورنر بہادر نے سخت دباؤ ڈال کر یہ باغ مہاراجہ
سے اونے پونے خرید لیا۔یہیں سرکار بہادر کی کوٹھی بنی مگر باغ کا بڑا حصہ قائم رہا
اور وقت پر پھل دیتا رہا۔قبریں رفتہ رفتہ منہدم ہوگئیں اور ان کے نشانات بھی مٹتے گئے
لیکن پیر صاحب کی قبر جیسی تھی ویسی ہی رہی۔

۱۸۵۷ء کے ناکامیاب ہندوستانی انقلاب کے بعد اسی باغ میں کئی مجاہدوں کو
سولی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔انگریزی راج محل خون اور گوشت کے گارے سے تعمیر ہوا۔
اس وشال پیڑ نے یہ خونیں ڈرامہ دیکھا تھا۔

خلقت کہتی ہے کہ اس عجیب درخت کی خونِ شہدا سے آبیاری ہوتی رہی ہے
یہی وجہ ہے کہ اگر درخت کے پتّے یا شاخیں کوئی توڑتا تو ان سے سُرخ خون ٹپکنے لگتا
تھا۔اس وجہ سے جب نئے کوارٹر باغ کے درختوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے جانے لگے تو
کسی بڑھئی کی جرأت نہ ہو سکی کہ اس متبرک زندہ جاوید درخت پر آرا چلائے۔

یہ درخت عجوبہ روزگار تھا۔اس کا نام کوئی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا۔کوئی
کچھ کہتا اور کوئی کچھ۔نہ پھول نہ پھل۔مگر ہریالی و شادابی نینن سُکھ اور سکونِ دل و جان
یہ بھی مشہور تھا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے پہلے پھول لگتے تھے۔اس بات کی شہرت بھی تھی کہ
فرنگیوں کی حکومت کے بعد تین چار بڑے خوشبودار پھول کھلے اور لال لال پھل آئے اور
نہ فرنگیوں کو بڑا تعجب ہوا، ادھر سالوں سے کسی نے پھول دیکھے نہ پھل کاٹے۔شہر بھر
میں ایسا کوئی پیڑ نہ تھا۔ریاست اور ملک بھر میں لاثانی اور فرد ہو تو عجب نہیں۔مجھے
اس درخت کے وقار سے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ وہ آندھیوں اور طوفان کو
آڑے گا۔وہ ہمارا سپر تھا، سہارا تھا، سپہ سالار تھا، مربّی تھا، ہمسایہ تھا، ساتھی تھا،
دوست اور غمگسار تھا۔وہ قطب نما تھا۔ایک عظیم و رفیع علامت تھا۔پورے احاطے کی انفرادیت
اس سے قائم تھی۔میں پہروں اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ہر موسم میں اُس کی الگ بہار تھی۔صبح،

دوپہر، شام جب دیکھئے وہ دلکش تھا۔ چاندنی راتوں میں اُس کا حُسن دیدنی تھا۔ اندھیری راتوں میں وہ ایک بلند و بالا اور قوی جاگتا ہوا سنتری دکھائی دیتا تھا اور اس کی حفاظت میں ہم سب لوگ سُکھ کی نیند سوتے تھے۔ اس کی خاموش ہمکلامی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کبھی تو میں یہ محسوس کرتا کہ اس درخت کا بیج میرے دل میں ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ انکرائے گا اور ایک عظیم و سرفراز شجر بن جائے گا۔

اس شاداب درخت کو کاٹ کر گرانے کی برسوں سے کوششیں ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کی تقدیس جاننے والے بڑھئی اور مزدور اسے کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ درخت کی رگوں میں لال لہو تیرتا ہے اور اُس کا سایہ پیر صاحب کی خدمت گزاری کرتا ہے۔ وہ قبر کے کنارے جیتے جاگتے پاسبان کی طرح چوکس کھڑا تھا۔ کبھی کوئی ٹھیکہ دار دور کے شہروں سے مزدور لاکر اس پاک پیڑ کو کاٹ کے اِس کی لکڑیاں بیچ کر نفع کمانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ دیکھا گیا کہ درخت کے کسی تنے یا شاخ پر تیر چلاتے ہی سُرخ عرق ٹپکنے لگتا اور کارندوں پر دہشت طاری ہو جاتی اور کام رُک جاتا۔ ایک بار کوئی کلھاڑا چلانے والا درخت کی کسی اونچی شاخ سے گر کر مر گیا۔ کبھی کوئی مزدور خطرناک طور پر بیمار پڑ جاتا۔

غرض یہ کہ حیات اور رحمت کا علمبردار درخت فضا کی رفعتوں پر لہلہاتا رہا اور اس کا ماحول امن کا گہوارہ بنا رہا اُسے دیکھ کر تسکتی اور شانتی کا احساس ہوتا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں نہ جانے کہاں سے ایک سخت دل اور بے باک ٹھیکہ دار کو انجان اور ڈھیٹ کارندے مل گئے اور ایک نئی ترکیب سے اس شاندار پیڑ کا قتل شروع ہوا۔ بڑے بڑے لانبے اور موٹے رسّوں سے اس درخت پر پھانسیاں بنائی گئیں۔ بالائی پتلی پتلی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر پھانسی پر چڑھایا جانے لگا۔ پھر بڑے تنوں کی باری آئی اور اُنھیں آرے سے کاٹ کاٹ کر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ کئی مزدور کٹے ہوئے تنوں کو آہستہ آہستہ جھلاتے ہوئے زمین پر لے آئے۔ یہ اہتمام اس لئے تھا کہ کوارٹروں کو نقصان نہ پہنچے۔ یہ پیڑ جڑ کے پاس سے گرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا وقار و جلال لرزہ پیدا کرتا تھا۔ اس میں زمین کا جاں بخش رس تھا، بلند آسمان کی کرنوں کی روشنی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی

شادابی تھی۔

پندرہ دنوں تک اسی درخت کو پھانسی دی جاتی رہی۔ عضو بہ عضو لال لال عرق بہتا رہا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد خون کے چکتوں کی طرح جم جاتا۔ اس کے عرق کا رنگ ببول کے گوند کی طرح پیلا نہ تھا۔ کوارٹروں کی نالیوں میں لال لوتھڑے کیچڑ کے ساتھ مل کر بہہ رہے تھے۔

اچانک کئی مزدور بیمار پڑ گئے اور کئی موٹے موٹے رسّے پارہ ہو گئے۔ پندرہ دنوں کے لئے کام رُک گیا لانبے لانبے بالوں اور چڑھی ہوئی آنکھوں والے ٹھیکیدار کو بڑی تشویش ہوئی۔ محلے کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں۔ اور پیر صاحب کی کرامات کے چرچے ہونے لگے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ یہ اونچا درخت کٹے تو وہ اپنے کوارٹروں کے چھوٹے چھوٹے احاطوں میں مولی، گوبھی، آلو اور چقندر اُگا کر کچھ پیسے حاصل کریں۔ اس عظیم درخت کی قلم رو میں مولی اور چقندر کہاں اُگ سکتے تھے۔ ہاں امن، سکون، طمانیت، راحت اور حُسن کی نشو و نما ہوتی رہتی تھی اور چین کی برکھا برستی رہتی تھی۔ کام پھر شروع ہو گیا۔ درخت کے بڑے موٹے تنے کٹنے لگے، کئی تنوں سے جہازی رسے کئی سمتوں میں باندھے جاتے تھے اور ان کے سرے درجنوں مزدور زمین پر کھڑے تن کر پکڑے رہتے تھے، درختوں کے تنوں پر کلہاڑے اور آرے۔ سے تیز دست مزدور اس کے جوڑ بند کاٹتے جاتے تھے اور مضبوط رسّوں سے باندھ کر انھیں آہستہ آہستہ جھلا جھلا زمین پر کوارٹروں سے بچا بچا کر گرایا جاتا تھا۔ دور سے ایسا لگتا تھا جیسے گٹھیلے بدن کے پہلوانوں کو پھانسی دی جا رہی ہے اور ان کی جسیم لاشیں زمین پر پڑی ہیں۔ روزانہ دو ہی تین تنے کاٹے جا سکتے تھے۔ اور انھیں نیچے لانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ رسّے کئی پہلوؤں سے باندھے جاتے تھے اور کئی سمتوں سے کھینچے جاتے تھے اور مرکزی رسّے کو ڈھیلے ڈھیلے ڈھیل دے کر اس حساب سے دیو قامت تنوں کے ٹکڑوں کو کوارٹروں کی چھتوں اور دیواروں سے بچا بچا کر زمین پر گرایا جاتا تھا۔ کہ ان پر ضرب نہ پڑے پھر بھی زور کا دھماکہ ہوتا تھا اور در و دیوار لرز جاتے تھے۔

چند دنوں میں جیتے جاگتے شاداب اور مسرّت بار درخت کا عضو عضو کاٹ ڈالا گیا جیسے پہلے لوگوں کو صلیب پر چڑھانے کے بعد ان کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ میرا ذہن مہینے بھر تک سولی پر چڑھتا رہا اور میرے دل کو صلیب دی جاتی رہی۔

اب ایک محیط رُعب دار جڑیلا تنا اور اُسی سے نکلے ہوئے دو ثانوی تنوں کے ٹکڑے بے برگ و بار بے دم ہو کر رہ گئے۔ اوپر کے دونوں تنوں سے بندھے رستے جھول رہے تھے۔ ایک صبح میں اپنے احاطہ میں ٹہل رہا تھا میری نظر اُس ٹھنٹھ درخت پر پڑی۔ زمین پر تنوں کی لاشیں بے سدھ بکھری پڑی تھیں۔ بہت سے تنے اور شاخیں ٹھیکہ دار بیل گاڑیوں سے لے جا چکا تھا اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے ایک دیو قامت غلیل ہے اس کا عظیم دوشاخہ آسمان تک بلند ہونا چاہتا تھا اور مہیب دستہ دھرتی کے ہاتھوں میں ہے اور اب لچکتی شاہی دھرتی کٹے ہوئے تنے کے چھوٹے چھوٹے ٹونوں کو چھوٹی پہ جما کر شست باندھے گی۔ اور قاتلوں پہ بھرپور نشانہ لگائے گی۔

ایک روز دوشاخہ بھی کاٹ دیا گیا۔ مگر گرتے گرتے دوشاخہ کے ایک بازو نے ایک کوارٹر کی دیوار سے ٹکرا کر اُسے شق کر دیا اور دوسرے بازو نے دوسرے کوارٹر کی گیراج کی چھت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

نہ جانے کیوں مہینوں قتل و غارت کا کام پھر ٹھیکیدار نے روک دیا۔ اور وسطی جڑیلا تنا دیوار سے اٹکی ہوئی لاش کی طرح کھڑا رہا۔ ہفتوں یہ دردناک تنا مقتول امن و شادابی کی علامت بن کر میرے دل میں تیرِ نیم کش کی طرح پیوست رہا۔ اور دوشاخ کے دونوں بازو کسی عظیم ٹوٹی ہوئی بیساکھی کے بالائی حصوں کے مانند اس سر و تن بریدہ درخت کی لاش کے سامنے زمین پر پڑے رہے۔ بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے ختم ہو گئے اور اساڑھ آ گیا۔ وقفے وقفے سے بادل کے ٹکڑے آئے اور کچھ چھڑکاؤ ہوتا رہا۔ ایک صبح روح پرور معجزہ رونما ہوا اُسے دیکھ کر، ہم سب خوشی سے لہلہا اُٹھے چند ہی دنوں بعد ٹھیکہ دار پھر نمودار ہوا اور درخت کے وسطی تنے پر مزدوروں کو آرا چلانے کے لئے آمادہ کیا۔ پہلے کلہاڑیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ ہم چوکنا ہو گئے اور بھاگتے ہوئے مقتول درخت

کی طرف دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ درخت کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔

ہم لوگوں نے ٹھیکہ دار اور عملوں سے پُرزور احتجاج کیا اور اُنھیں صاف صاف کہدیا کہ جڑ والا تنا ہرگز نہیں کٹے گا۔ جو زمین پر تنوں کے گرے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ انھیں چاہو تو اُٹھا کر لے جاؤ۔ جڑ میں اب ہرگز ہاتھ نہیں لگانے دیا جائے گا۔ تند و تیز مجادلے کے بعد ٹھیکہ دار اور اُس کی ذرّیت دفع ہوئی۔ اور دوسرے دن وہ لوگ تنوں کے افتادہ ٹکڑے لاد کر لے گئے۔

مجروح جریدہ تنا صبر، استقلال، اطمینان اور اُمید کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اس کے بالائی پہلو میں سرسبز، نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور کوارٹر کی چھتوں سے اونچی چند نئی ہری بھری شاخیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

وہ رحمت نشان درخت مر کر پھر جی اُٹھا تھا۔

۲
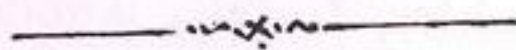
ڈو مزدور

(سہیل عظیم آبادی)

چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی چینی کا ایک بڑا سا کارخانہ تھا۔اسٹیشن اور کارخانہ کے درمیان کچی سڑک پر پھوس کی ایک جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کے دروازے پر ایک تختی لٹکی تھی، جس پر لکھا تھا "گرم چائے" جھونپڑی کے اندر مٹی کا ایک چبوترہ تھا، میز کرسی کے بدلے تاڑ کے پتوں کی چٹائی تھی۔ چبوترے پر دو تین میلی اور ادھ ٹوٹی پیالیاں رکھی تھیں، اور دو تین میلی کچیلی دیگچیاں۔ہوٹل کی ٹٹی والی دیوار۔چبوترے کے علاوہ سامنے سڑک پر کیچڑ سے ذرا ہٹ کر ایک مریل سا کتا بیٹھا تھا ——— مزدوروں کا ہوٹل اور کیسا ہوتا۔

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی، بوڑھا ہوٹل والا جس کی ایک آنکھ "ماتا میا" کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ جلدی جلدی پانی گرم کرنے کی فکر میں تھا، کبھی وہ میلی سی دیگچی کو چولھے سے اُتار کر پنکھا جھلتا، اور کبھی دیگچی کو چولھے پر رکھ کر۔ کوئلہ کچا تھا اس لئے ساری جھونپڑی دھوئیں سے بھری تھی۔بوڑھا کبھی کبھی بیتابی کے ساتھ سڑک پر دور تک نگاہ دوڑاتا۔ پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔اب تک نہیں آئی حرمجادی۔

بوڑھا تھک گیا۔ پنکھے کو الگ رکھتے ہوئے اس نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! بڑھاپے میں ہی سب دُکھ لکھا تھا۔

اتنے میں ایک بوڑھی عورت ٹوکری میں کوئلہ لئے ہوئے آئی۔بوڑھے نے اس کو غصہ بھری نظروں سے دیکھا، لیکن آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔بوڑھی عورت نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"تمھیں تو گُستا ہی آتا رہتا ہے۔سب کام بھلے اپنے ہی کر لو۔"

بوڑھے نے کہا۔

"ارے جمّن کی ماں! تم تو بے بھول ہی بگڑ جاتی ہو۔ دیکھو نہیں سب کے آنے کا بیلا (وقت) ہو گیا۔

بوڑھی عورت مُنہ پُھلا کر ایک طرف چُپ چاپ بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے جلدی جلدی چولھے پر کوئلہ رکھا اور زور زور سے پنکھا جھلنے لگا۔ آنچ اچھی ہو گئی تو بوڑھا جلدی جلدی پیالیاں دھونے لگا۔ اتنے میں کارخانے کا "بمبا" بجا، مزدوروں کو چھٹی ہو گئی۔ اور وہ سب کارخانے سے نکلے ــــــ جیسے رات بھر کی بند مرغیاں صبح کو ڈربہ کھلنے پر۔

بوڑھا پھر گھبرا کر اُٹھا۔ پیالیوں کو چبوترے پر رکھ کر چولھے کو دیکھنے لگا۔ چولھے میں آنچ ٹھیک تھی۔ مگر اس سے اُسے تشفّی نہ ہوئی۔ اس نے کہا۔

"ارے جمّن کی ماں ذرا پنکھا تو جھل۔"

بوڑھی عورت اسی طرح مُنہ لٹکائے بیٹھی رہی۔ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہٹی۔ بوڑھے کو غصّہ آ گیا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

معلوم ہوتا ہے، جیسے ہم ہی اکیلے کھاتے ہیں۔ پگلی!! اس کو کوئی غرض ہی نہیں، آج میری آنکھ بند ہو جائے تو کل ہی پتہ چل جائے، کوئی بھیک تو دے ہی نہیں اس چال سے "بوڑا ہی، کہیں کی۔ جا ہم بھی ــــــ"

اتنے میں چند مزدور ہوٹل میں آ گئے۔ بوڑھے نے بکنا بالکل بند کر دیا۔ فوراً آنے والوں کی طرف مخاطب ہو گیا اور لگا آپ ہی آپ بولنے، جیسے وہ باری باری سب کی باتوں کا جواب دے رہا ہے۔

آج تو ایسی اچھی روٹی پکی ہے کہ واہ رے واہ۔ اور بھاجی تو ایسی ہے کہ کھا کر جی خوش ہو جائے۔ اُس کو کھا کر آدمی گھنٹوں کیا ہفتوں مزا نہیں بھول سکتا۔ بیٹھو بھائی بیٹھو، سب کو دیتے ہیں۔ ذرا چائے کا پانی ہو رہا ہے۔"

بوڑھا پھر آنے والے مزدوروں کی طرف مخاطب ہوا اور سب سے پوچھنے

لگا۔ ”تمھیں کیا چاہئے؟ تمھیں کیا چاہئے؟“

پھر کسی کو روٹی بھاجی، کسی کو بھات دال۔ کسی کو گوشت روٹی ——— جس نے جو مانگا اُسے دیا۔ اُداس جھونپڑی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، کچھ دیر تک چہل پہل رہی۔ پھر ایک کے بعد دوسرا اُٹھ کر چلا گیا۔ صرف تین چار مزدور رہ گئے بوڑھے نے سب سے کہا۔

”بیٹھو بھائی بیٹھو! ابھی چائے دیتے ہیں“

اُس نے دیگچی میں چائے کی پتی ڈال دی۔ پانی چولھے پر کھولتا رہا۔ بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

”آج تو وہ چائے پلائیں گے کہ بس رے بس۔ جب ہم میکلیں صاحب کے یہاں تھے بھائی۔ تو ایک صاحب آیا۔ پارٹی تھا بڑا پارٹی۔ ہاں بہت سے صاحب لوگ آئے۔ میم صاحب بھی۔ بڑا دعوت میں ہمارے پکائے کھانے کی صاحب لوگوں نے بہت تعریف کیا اور صاحب نے دس روپیہ انعام دیا....

ایک جوان مزدور بولا۔

”ارے بوڑھے میاں دو جلدی چائے، تم بکتے ہو“

بوڑھا بولا۔

”ہاں بابو ابھی دیتے ہیں“

دوسرا مزدور، جس کی عمر چالیس سے زیادہ تھی۔ بولا۔

’ارے بلاقی! تیرا جبان بہت کھراب ہوگیا ہے“

بلاقی نے جواب دیا۔ ”نہیں جمرو بھائی! بوڑھا بہت بکتا ہے“

بلاقی بالکل جوان تھا۔ بالکل کالا اور ہٹا کٹا۔ سر میں انگریزی بال اور ٹیڑھی مانگ۔ تیل سے سر کے بال چمک رہے تھے۔ بوڑھے نے سب کو چائے بنا کر دی۔ ضمیر نے بلاقی سے کہا

”ارے کھانساماں جی تیرے باپ کی عمر سے جادے ہی ہیں۔ ان کو ایسا کہتا ہے“

"نہیں جمرو بھائی یہ تو کھیل کی بات ہے۔ بڑے میاں اپنے ہی آدمی ہیں۔"
ضمیر بولا۔

"نہیں۔ تیرا جبان کھراب ہے ہی۔ اچھا کل بابو سے کاہے کو لڑ رہا تھا۔"
بلاقی نے شکایت کے طور پر کہا۔

"سالے نے پھر گیرحاجر بنا دیا جمرو بھائی! بڑا کھچڑا ہے سالا۔"

"ارے گالی کاہے کو بکتا ہے۔ کوئی فائدہ ہوگا اس سے ـــــــ بابو سے لڑ کر۔"
بلاقی نے چائے کی پیالی اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو اس سالے کو کیا ملے گا؟ سیٹھ باپ ہے اس کا۔ اسی کو تو سارا دھن مل جائے گا۔ پانچ منٹ دیر ہوا اور سالے نے گیرحاجر کر دیا۔"

"اس بیچارے کا تو کام ہی یہی ہے۔ لڑائی بُری بات ہے۔ کھوسامد برامد سے آدمی کو کام نکالنا چاہئے بلاقی۔"

تم بھی جمرو بھائی کیسی بات کرتے ہو۔ کھوسامد کاہے کی۔ بھیک تھوڑے دیتا ہے سالا۔ اب کی بدماسی کرے گا تو دیں گے دو چھیٹ۔"
ضمیر نے بلاقی سے چڑ کر کہا۔

"ارے پاگل مت بن، بات سمجھا کر۔"
بلاقی نے تن کر کہا۔

"ارے بھیا! جو جی میں آئے کہہ لو، یونین نہیں ہے یہاں، نہیں تو تین چار دن کی ہڑتال میں ہوش آجاتا سب کو۔"
ضمیر کو ذرا غصہ آگیا۔ وہ بولا۔

"پھجول یونین یونین بکتا ہے۔ گریب کو وہاں بھی کوئی نہیں پوچھتا ابے ہم کھُد یونین کے مارے بیٹھے ہیں۔ دیکھ ـــ ہم کو ساٹھ روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ ہڑتال ہوا، یونین والے بھاگ گئے۔ سب سالے تو نوکر ہو گئے۔ ہم کو دیکھ اب بیس روپیہ مہینہ پر سر مار رہے ہیں۔ مصیبت میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا ہے۔ ابے اب کوئی

یونین والا پوچھنے بھی نہیں آتا ۔ چھ مہینہ بھوک مر مر کے کاٹا ہے۔"
بُلاقی نے بہادرانہ شان سے جواب دیا۔
"بس اتنے ہی میں ٹھنڈے ہو گئے، کا ہے کو گئے تھے یونین میں تب۔ ہم کہیں
سُنو ـــــ مل میں جب ہڑتال ہوا، تو ہم بھی تھے، وہاں لڑائی ہو گئی۔ پولیس
نے ہم لوگ کے سکریٹری پر لاٹھی چلایا۔ ہم جھٹ سے لاٹھی روک کر سپاہی کو دو پھیٹ
مارا! جانو بھیا! کا ہوا!! ہم گرپتار ہو گیا۔ سپاہی سالا نے ـــــ ہم کو تھانہ میں کھوب
مارا اور چھ مہینہ جیل ہو گیا۔ سمے آنے سے پھانسی سے بھی نہ بھاگے گا۔ مگر اپنا حک
واسطے لڑیں گے جرور۔ اور سب مجور بھائی کو مل کر لڑنا چاہئے ـــــ"
ضمیر چُپ چاپ سُنتا رہا۔ جیسے کوئی بیوقوف آدمی کسی عقلمند کی بات سُنتا ہو۔
بُلاقی اس شان سے بولتا رہا۔ جیسے وہ کسی عظیم الشان مجمع کو مخاطب کر کے تقریر
کر رہا ہو۔ جب بُلاقی بول چکا تو ضمیر نے کہا۔
"بول لو بھیا! ابھی جوان ہو۔ کوئی فکر نہیں، آجاد ہو۔ دو چار بال بچہ ہوتا
تو معلوم ہوتا ـــــ"
بُلاقی اسی جوش میں بولا۔
"یہ گلت ہے۔ جیتا رہے تو دیکھ لینا ـــــ"
بوڑھے ہوٹل والے کی عورت اب تک اسی طرح مُنہ پھیلائے بیٹھی تھی۔ کبھی
زہر بھری نظروں سے بوڑھے کو دیکھتی اور کبھی بڑ بڑاتی۔ بوڑھا ہوٹل والا جلدی جلدی
جھوٹے برتن دھو رہا تھا ـــــ اور آپ ہی آپ بڑ بڑاتا جا رہا تھا۔ ضمیر اور
بلاقی دونوں ہی چُپ چاپ اپنی اپنی چائے ختم کر رہے تھے۔ آخر دونوں کی چائے
ختم ہو گئی۔ بُلاقی نے پوچھا۔
"اور چائے پیو گے۔ جمرو بھیا!"
"نہیں ـــــ"
ضمیر نے جواب دیا۔ بُلاقی نے پیالی رکھ کر جیب سے ایک ٹین کی ڈبیہ نکالی۔

اس سے بیڑی نکال کر ضمیر کو دی۔ ایک اپنے ہونٹوں میں دبا کر چولھے سے آگ لے کر جلانے لگا۔ بوڑھی عورت بڑبڑانے لگی۔ مگر اس نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ بُلاقی، بیڑی جلانے کے بعد ڈبیہ پر لگے ہوئے، چھوٹے سے شیشے میں دیکھ کر انگلیوں سے بال سنوارنے لگا۔ اور بال سنوارتے ہوئے بولا۔

"بڑے میاں! جمرو بھائی کا ناستہ چائے میرا حساب میں لکھیو —"

اتنا کہہ کر وہ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ بولا۔

"اچھا سلام جمرو بھیا!"

پھر داہنے ہاتھ سے بالوں کو دُرست کرتا، اور موٹی آواز میں "مرے مولا بلا لو مدینہ مجھے" گاتا ہوا ایک طرف روانہ ہوگیا۔ بوڑھے ہوٹل والے نے ضمیر سے نصیحت کے انداز میں کہا۔

"کس بوڑاہے سے بولتے ہو بھیا"

بڑھیا بیٹھی بیٹھی بول اُٹھی۔

"ہی ہے کھراب، لونڈا پگلا معلوم ہوتا ہے۔"

بُلاقی کے گانے کی دھیمی دھیمی آواز اب تک جھونپڑی میں آرہی تھی۔

ڈائن

(شکیلہ اختر)

"ہائے توبہ!" پلنگ پر بیٹھی ہوئی تینوں بہنوں کی نگاہیں ایک ساتھ اوپر اُٹھ گئیں، "یہ جو صبح ہی صبح ایسی مکروہ صورت پر نظر پڑی ہے تو اب اللہ جانے سارا دن کیسا کٹے گا۔" چھوٹی بہن شہنو مُنہ ہی مُنہ میں بُدبُدائی۔ چکنی سی لاٹھی کے سہارے بائیں پہلو پر جُھکی ہوئی ایک بُڑھیا عجیب بے ڈھنگی چال سے چلتی ہوئی برآمدے کے نیچے پائے سے لگ کر کھڑی ہو گئی پسینے سے شرابور اور سڑی ہوئی مچھلی کی باس سے بسی ہوئی۔ کسی مریل ٹٹو کی طرح وہ مُنہ پھاڑے ہوئے ہانپنے لگی۔ اور اس طرح سے ہانپتے ہوئے اس کا کالا بھوت چہرہ اور بھیانک لگ رہا تھا۔ اصلی کوبرا بوٹ پالش۔ "ایمان سے باجی کہئے تو کہیں پر سے بھی یہ آدمی لگ رہی ہے؟" اور شہنو گھر کے بچوں کو بُلانے کے لئے تلاش کرنے لگی "ممی نمی کہاں ہو سب؟" اور ممی نمی جیسے ہی کمرے سے چہکتے ہوئے نکلے تھے کہ ان کی چیخیں نکل گئیں۔ سُنہرے سُنہرے بالوں کے گچھوں میں سہما ہوا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ اور وہ چیخنے لگے۔ "امی! بھوت۔ امی! بھوت" اور شہنو کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑے جا رہے تھے مگر یہ تماشا مجھلی بہن رُوشی کو بے حد خراب لگا۔ بھلا یہ صبح ہی صبح اپنا حسین چہرہ لے کے آ گئی ہے، تو اسی کی طرح ہم لوگ بھی بیکار بیٹھے ہوئے ہیں کیا؟ گھر بھر کا ناشتہ اور چائے ابھی پڑا ہوا ہے۔ راج منڈہ سب کے سب الگ سر پر سوار ہیں۔ اور لو۔ اس پر سے یہ بُڑھیا بھی نہ جانے کاہے کو پہنچ گئی ہے۔ "بی بی مچھلی کے دام۔ دام باقی ہے۔ ادھی ٹالا ایلی ہے۔ اگارہ آنہ پیسہ۔ اور پہلے کے سوا گُور وپیہ۔" بڑی مشکل سے مُنہ پھاڑ کے وہ اتنی سی بات بول سکی تھی "کیا؟ پیسہ باقی ہے تیرا۔ کب کا! خانداری کے جھنجھٹ سے ایک تو ایسے ہی دماغ خراب ہو رہا ہے اور

اس پر سے نہ مچھلی۔ نہ مچھلی کی دُم، اور دے دوان کو گیارہ آنے اور سوا روپے۔ روشی زور سے جھلا اُٹھی، جھوٹی ایک دم سے۔ گیارہ آنے میں سے آٹھ آنے تو اسی روز دوپہر کو شہلا نے آنچل میں سے کھول کر دیئے تھے؟ اب تین آنے ہی چاہیے نہ؟ یہ گیارہ آنہ پورا کا پورا کہاں سے بن گیا؟ اور جب بڑھیا نے کچھ کہنے کو مُنہ پھاڑا تو اس کے سیاہ رنگ کے چمڑے میں سُرخ زبان لال لال ہونٹ اور پیلے پیلے دانت، جھلک اُٹھے،" سوا گو روپیہ! او تو ہے نا! اور تین آنہ اِگارہ آنہ میں کے۔" بولتے وقت اس کی آنکھوں کی پتلیاں بڑی تیزی سے گردش کر رہی تھیں روشی نے اپنی گود کی بچّی کو آنچل سے ڈھانپ لیا۔ اللہ کیسے دیدے گھما گھما کر بول رہی ہے۔ ہائے اللہ دے بھی دیجئے نا۔ بچّے سب الگ رو رہے ہیں۔" برآمدے میں دُھلی ہوئی چاندنی کا فرش بچھاتے ہوئے سبرتی چھوکری بڑی سرگوشی میں شیریں سے بولی۔"

جانتے نہیں ہیں سب ارے یہ ڈائن ہے ڈائن! اللہ قسم پکّی ڈائن ہے۔ میرے محلّہ میں کوئی بولے ہے اِس سے! باپ رے! دیکھتے ہی دیکھتے کلیجہ بھون کے کھا جا ہے" اور ننھی شیریں حیرت سے اس کا مُنہ تکنے لگی۔ ڈائن! ڈائن کون ہوتی ہے۔" اور روشی کو صبح ہی صبح اِس سے حساب کتاب کرنا بے حد بُرا لگ رہا تھا بچّے سب کمرہ میں گھسے بُڑھیا کے ڈر سے اب تک رو رہے تھے۔ شیریں اور روحی اپنی معصوم نگاہوں سے بُڑھیا کو گھورتی ہوئی ڈائن کا مطلب سمجھنا چاہتی تھیں۔ اور ناشتہ تھا کہ الگ ٹھنڈا ہوا جا رہا تھا انڈوں کے آملیٹ اور نیم برشت تک تلا چکے تھے اور ایسا ٹھنڈا پالا۔ وہ کوئی گت کا بھی رہا ہوگا۔ شہنو نے غصّہ کی ایک نگاہ ڈالی۔" تو اور رات رہتے کیوں نہ آئی تھی نہ کھانا نہ پینا، لے کے بیٹھے بیٹھے تیرا حساب کرتے رہیں۔" اور یہ تو نمک حرام ہے۔ شہنو بولو۔ اپنی رعیّت ہو کے مالک سے حساب کتاب کرنے آئی ہے۔" کتابن دائی چُنتے ہوئے دسترخوان پر پنکھا جھلتے ہوئے وہیں پر سے بولی۔ اور بُڑھیا مارے غصّہ کے بلبلا اُٹھی کہ دیکھو تو اتنا دن جو وہ پیسہ چھوڑے ہوئے تھی تو مالک کا گھر سمجھ کے نا؟ اور اب اس پر سے کوئی نمک حرام بنا رہا ہے اور کوئی کچھ! وہ چیکتی ہوئی

سیڑھی پر دھرنا دے کے بیٹھ رہی جیسے آج ستیہ گرہ کے ارادہ سے ہی آئی تھی۔اور بچوں کے آنسو تھے کہ اب تک بہتے ہی جا رہے تھے۔"امّی اب نہ روئیں گے۔ امی اس کو بھگا دیجئے۔" اور ننھی ممی دونوں کے دونوں سبز رنگ کے کواڑوں کے پیچھے اپنی آنکھوں کو موندے کھڑے چیخ رہے تھے۔"ہاں! ہاں رے نمک حرام نہیں تو اور کیا۔ بڑی بچاری! جیسے کھا جائیں گے اس کا پیسہ لے کے! اپنی رعیت ہو کے۔ مُنہ سے بولی کیسے نکال رہی ہے۔ توبہ! اچھی! لاج بھی نہ لگے۔ بھلا تین آنہ پیسہ بھی کوئی چیز ہے۔" کتابن کی چلتی ہوئی زبان کو روکنا آسان کام نہ تھا، اور بُڑھیا سسک سسک کر رونے لگی۔" ہائے رام۔ ہائے بس تین آنے، اور سوا گو روپیہ کدھر گیل۔" اس کے گرد درجن بھر نوکرانیاں جمع ہو گئی تھیں۔ اور دیکھو تو جی اس کی ناک پر اُجلا اُجلا سا دانہ جیسا کیا ہے۔ روحی نے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے شیریں کو چپکے سے کہا۔" ارے بھئی یہ کلیجہ بھون کے جو کھا جاتی ہے۔ اسی لئے ایسا ایسا دانہ نکل آتا ہوگا۔ شیریں کو شیرتنی نے آہستہ سے ٹھوکا دیا۔ اجی چُپ بھی رہو۔ سن لیگی تو بس شام تک چھٹی ہو جاؤ گی۔ تم کا جانو اس کو۔؟"

اور بڑھیا کا رُکا ہوا سیلاب آخر باندھ توڑ کر بہہ نکلا۔ کالا چہرہ اور بھی چمک اُٹھا آنکھوں کی سفیدی بڑھ گئی۔ اور ہونٹوں کے پاس پلپلاتے ہوئے گوشت تیزی سے ہلنے لگے۔ اور وہ کہنے لگی کہ تم کھاؤ پیو اور بھرے پیٹ کا ڈکار لے لے کے خوب بولو۔ مگر جس کا پیٹ جلے ہے وہی نہ جانے کہ دو دن کے فاقے کے بعد تین آنہ پیسہ اور اس پر سے سوا روپیہ بھلا باقی، کتنی بڑی دولت ہے۔ پھر وہ اپنا پیسہ آخر کاہے چھوڑے گی۔ وہ آسامی تھی، رعیت تھی تو مالک راجہ ہو کر کیوں نہیں دیکھتے کہ اپنی مچھوائن دو دن سے دانہ دانہ کے بنا ترس رہی ہے۔ اور وہ کسی کا بھیک بھی تو نہیں مانگ رہی ہے۔ اپنا پیسہ لُٹا کے کوئی دیکھ تو لے۔" وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی اور اس کی یہ بدتمیزی کی بک بک سُنتے سُنتے تینوں بہنوں کو سچ مچ میں غصّہ آنے لگا۔" سردار! فیضو! سب کے سب کھڑے تماشا کیا دیکھ رہے ہو؟ لو یہ تین آنہ پیسہ۔ جلدی نکالو اس کو۔ روشنی دودھ کے دیگچے میں سے ملائی نکالتے نکالتے پیسے پھینک کر بولی۔ اپنی طرح ہم لوگ کو بھی فقیرنی سمجھے ہوئے ہے۔" مگر

سردار اور فیضو آگے بڑھنے کی بجائے اور بھی پیچھے ہٹ گئے۔" باپ رے۔ ڈائن ہے ڈائن"۔ اور بڑھیا نے حریصانہ طور سے پیسوں کو سمیٹتے ہوئے گھور کر شہنو کو دیکھا۔" اور او سوا گو روپیہ۔؟" جوہیا، حسیناں، بدمیاں سب کی سب چھوکری فرشوں، کمروں اور فرنیچروں کو جھاڑتے، پونچھتے چھوڑ چھاڑ کر بڑھیا کے گرد میلا سا لگا کر کھڑی ہو گئیں۔

"اتن بر مالک کے دربار میں جہاں ہاتھی جھولے۔ موٹر رہے ہواں ہم نی بھوک مرن" بڑھیا فلسفیانہ انداز میں اپنی آنکھوں کو نیم وا کر کے سرہلاتی ہوئی بڑی حسرت سے بولی۔ سالہا سال کے منوں من چاول ہمیشہ سے یہی پچھوائن کوٹ چھانٹ کر اپنے ہاتھوں سے زمینداروں کے گھروں میں سینتی رہی تھی۔

اس طرح سے ان لوگوں کی زندگی کے چھ مہینے ذرا کھا کھا کر چاولوں کی کٹائی پر گذر جاتے تھے۔ پھر جن کے گھروں میں مردوں کی صورت رہی وہ تو مچھلی وچھلی پکڑ کر آرام سے رہ لیتے مگر جس بے چاری کا کوئی نہیں ہوتا اس کو تو کٹنی پر کے چاولوں کے بعد سون کے کنارے ریتوں کے بس ٹیلے ہی نظر آتے تھے۔ کبھی کہیں مزدوری مل گئی مگر وہ بھی روز روز کہاں اور کس کو ملتی تھی! نکہت نے شہنو کو ٹھوکا دیا۔" توبہ! غریب ہے دے بھی دو۔ سمجھو! خیرات کر رہے ہیں!" ہاں خیرات! وہ سمجھے گی بھی کہ خیرات کیا بلا ہے۔ اور یہ شوخی تو دیکھو۔ مانگ کیسے رہی ہے۔ جیسے جمع جتھار رکھا ہوا ہے اس کا سوا گو روپیہ۔ جھوٹی کہیں کی۔ مکار اور یہ غصہ کی بات بھی تھی کہ نہ تو کوئی ناشتہ کر رہا تھا نہ چائے۔ بیچ میں ایک کالی سی بڑھیا بیٹھی بک بک کر رہی تھی۔ اور ایک جھمیلا تھا کہ لگا ہوا تھا۔

اور جوہیا، حسینا اور بدمیاں چپکے چپکے ڈائن کے قصے دہرا رہی تھیں کلیجہ، دل اور دماغ بس یہی تو کھا کھا کر کے رہتی ہیں سب۔ نانی کہتی تھی کہ کلن میاں کا لڑکا امرود کھاتا چلا جا رہا تھا کہ بغیچہ والی ڈائن نے جیسے ہی ٹوکا رہ دیا کا کھا ہے رے؟ بس وہ لڑکا دیکھتے دیکھتے مرغی کی طرح چھٹپٹ چھٹپٹ کر کے ختم ہو گیا۔" اور ان کی گرویں میں شبرتی ملتی ہوئی بولی۔ بیکارے روشنی بو بو، اس کے منھ لگ

رہی ہیں۔ ارے ابھی کتنا دن ہوا ہے چھ ہی مہینہ نہ کہ اس گھر میں مالکینی بیچاری کچلے
جانے سے کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ اور اب جو کچھ ہو ہو جائے تو اور مصیبت۔
توبہ سوا روپیہ بھی کوئی دولت ہے۔ ارے ایمان سے تو لوگ انجان ہیں۔ میرے
محلّے میں سب لوگ اس کے سایہ تک سے بچ کے نکلے ہیں۔ اور یہ سُنتے ہی تینوں چھوکریوں
کے چہروں پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں" ہائے رام۔ بڑا دیر ہوئے لا۔ دیدا نہ ہم را کے سوا گو
روپیہ۔" بُڑھیا ایک بار جھنجھلا کر زور سے بولی۔" اب میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔
روی زور سے چیخی۔ ارے بھائی کوئی پوچھے تو اس سے۔ کیسا روپیہ، کب کا روپیہ؟
بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی جس کا پیسہ گھٹا اونچی کوٹھی دیکھ کر پہنچ گئے۔ کب کا باقی
ہے؟ کس کے ہاتھ کا باقی ہے کوئی پتہ نہیں۔" نکہت ہنس پڑی۔" اللہ توبہ کیسا ہنگامہ
مچا رکھا ہے آپ لوگوں نے۔ سوا روپیہ نہ ہوا دُنیا بھر کی دولت ہو گئی، کوئی سُنے بھی
تو کیا کہے۔ اچھّے ہیں اس گھر کے لوگ لیجئے میں ہی دے دیتی ہوں۔" شہنو کے دل کا
پھپھولا رستے رستے آخر پھوٹ بہا۔" رہنے دیجئے اپنا روپیہ۔ یہ سوا روپیہ کا قصہ تھوڑا ہی
ہے۔ دیکھ نہیں رہی ہیں کہ کیسی کیسی بدتمیزی کرتی جا رہی ہے یہ بُڑھیا، کب اس گھر سے
کس کو کیا کچھ نہیں ملا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ بھوکی ہوں، کھانا دو، پیسہ دو۔
مگر جب یہ حساب کرنے پر تُلی ہے تو میں بھی حساب کر کے ہی رہوں گی۔ بڑی حساب والی
بنتی ہے۔" تو بتا نہ دے کہ کب کا باقی ہے۔ کس کے ہاتھ میں دئے تھا" مار گھنٹہ بھر سے
بک بک کئے جا رہی ہے۔" روشنی چڑچڑا کر بولی۔" سوا گو روپیہ مجھلی کے۔ بُڑھیا کا ڈوبتا
ہوا سر نیچے لٹک گیا۔ اور اس کی مدھم ہوتی ہوئی آواز ایسی لگی جیسے ہوا بھری ہوئی
گُڑیا میں سے اب ساری ہوا باہر نکلتی جا رہی ہے۔

" ارے یہ سوا روپیہ۔ سوا روپیہ تو چار گھنٹے سے سُن رہے ہیں۔ مگر کس کو دیئے
ہے اور کس کے ہاتھ کا باقی ہے۔" کتابن کو بُڑھیا کی ادھ مچی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے
ہوئے شاید رحم آ گیا تھا۔

" او جو ہمرے دیور کی بیوہ ہے نے! اوہی کے ہاتھ کے باکی ہے! ڈیڑھ سیر مچھلی

کے دام۔" بڑھیا رُک رُک کر بولی۔

"اب آئی ہے باتیں بنانے چھوٹی۔ مکّار کہیں کی۔ جا تو فیضو بلا کے لے تو آ اس کے دیور کی بیوی کو۔" شہنو اس حسابی بڑھیا کا حساب پورا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اور یہ سنتے ہی بڑھیا سیڑھی کے اوپر پایہ سے لگ کر اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ جیسے وہ آج دودھ کا دودھ پانی کا پانی ایک کر کے اٹھے گی۔ گھر کے لوگوں کو بڑھیا کی بک بک سے تھوڑی دیر کے لئے نجات مل گئی تھی۔ سب کے سب دسترخوان پر جھک پڑیں۔ مگر شہنو کا جی ناشتہ کرنے میں نہ لگ رہا تھا۔ اور اس پر سے فیضو کی ماں اور کتابن سلگتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکے جا رہی تھیں۔ ارے بیگم صاحبہ کے نہ رہنے سے ایسی حالت ہے کے۔ اور کیا؟ نہیں تو اتنی مجال تھی کہ منہ لگ کے بولتی جائے سب لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ مالک تو گھر کے جھنجھٹ میں پڑتے نہیں۔ بھئی سب کو خوب سناؤ، ہونہہ۔ روپے! ایسے تھا تو منھ کھول کے مانگ لیتی۔ کہ بھوکے ہیں۔ کچھ پیسہ دے دو، تھوڑا غلّہ دے دو۔

اور اب تو میں بھی حساب ہی کر کے دوں گی۔ بدتمیز کتنی ہے۔ بولنے کا شعور تک نہیں ہے۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ مالک سے کس طرح بولا جاتا ہے۔ امی جان کے نہ رہنے سے جیسے ہم لوگ راہی ہو گئے ہیں۔" شہنو کے زخمی دل پر ایک چوٹ لگی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

"ہم لوگوں کو کبھی ان لوگوں سے واسطہ بھی پڑتا تھا؟ امی جان کے پاس آتی رہتی تھیں سب، مگر اب امی بے چاری کے بعد نہ جانے کتنے گھروں میں فاقہ ہو رہا ہوگا۔ کیسے کیسے چھپا کے سب کو دیتی تھیں۔" نکہت کے آنسو ٹپک پڑے۔

نکہت کو روتا ہوا دیکھ کر روشی نے اپنا پوزیشن صاف کرنا چاہا تو بھئی یہاں لینے دینے کا کچھ قصّہ تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو اپنے جی سے گڑھا ہوا ہے۔ ایک حساب لئے بیٹھی ہے۔ اچھا تم ہی بتاؤ نا کب کی ہے۔ سوا روپیہ کی مچھلی۔ ؟ تم کو یاد ہے؟ پھر یہ فضول سی بات لے کر بیکار ہی اتنی دیر سے بک بک کر رہی ہے۔

چائے پیتے پیتے نکہت اُداس ہوگئی۔"آج ناشتہ چائے سب کا سب خراب ہوگیا اور اس پر سے جی بھی کیسا لگ رہا ہے کہ سب کوئی تو کھا پی رہے ہیں۔ مگر یہ بے چاری بُڑھیا جانے کب سے بھوکی ہوگی اور کیسی لگ رہی ہے۔ جیسے کوئی آدمی نہیں جانور بیٹھا ہوا ہے۔

"تو وہ جو اپنی بڑھیا بڑھیا ساڑیاں بکسوں میں سینتے ہوئی ہو، انہیں کے جھنڈے بنالو اور کہتی پھرو۔ انقلاب زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔" شہنو چڑھ کر بولی۔ جلی بُھنی شہنو کو نکہت دیر سے چھیڑتی بھی جارہی تھی۔"ایک جھنڈا ہی نکالنے سے بہت بڑا کام ہوتا ہے کیا۔ ارے یہ تو ایک انسانیت ہے۔ آج ہم بھی تو ویسے ہی آدمی ہیں۔ جیسی یہ بیچاری بڑھیا۔ اور بخالت! دُنیا کی بدترین چیز ہے۔ بس اتنا یاد رکھو گی۔" نکہت ہنس پڑی۔

"بخالت! بخالت کون کر رہا ہے۔ یہ نہیں دیکھ رہی ہو کہ یہ ڈائن جیسی بُڑھیا کتنی دیر سے بدتمیزی کر رہی ہے۔ تم کو کیا ہے۔ تم بیٹھی بیٹھی تماشا دیکھو تماشا۔" روشی نے شہنو کی پُشت پناہی کی۔

چائے ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فیضو بُڑھیا کی دیورانی کو لے کر آگیا یہ غربت زدہ بے کسی کی دوسری تصویر تھی۔ تیز آنکھیں مگر روئی روئی سی۔ وہ پُرانی مچھوائن تھی اور بچپن کی جانی پہچانی ہوئی۔ بہت ہی چھوٹے سے قد والی بُڑھیا مگر تنا ہوا چہرہ۔ کالے چمڑے کے اندر سے زردی پھوٹ رہی تھی۔ اور وہ آکر سیدھی روشی کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی۔"بڑا مصیبت ہے بیٹی۔ بڑا دُکھ۔ نا دن چین اور نا رات چین۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نئی مصیبت یہ تھی کہ سون ندی میں سیلاب کا پانی چڑھ گیا تھا۔ سارے لوگ بہہ بہہ کر آتی ہوئی لکڑیوں کو نکال رہے تھے۔ اس کا بیٹا بھی دو ملاحوں کے ساتھ کشتی پر بیچ دھارے میں سے بڑی بڑی قیمتی لکڑیاں پکڑنے کو گیا دو روز قسمت ساتھ دیتی رہی مگر تیسرے روز پانی کے ریلے سے پوری کشتی اُلٹ گئی۔ ایسے سیلاب میں جان کی اُمید ہی کس کو تھی۔ مگر وہ تو خدا کی مہربانی تھی جو سب کے سب تیراکو تھے جو تیر تیر کر نکل آئے۔ اس کا بیٹا ٹانگ توڑا کر لایا گیا ہے۔ بے چارے کے گھٹنا کی چکری ہی

اپنی جگہ سے ہٹ کر چور چور ہو گئی ہے اور اب نہ دوا ہے اور نہ دارو، گھر میں ایک پیسہ خرچی کو بھی نہیں ہے۔ اسی لیے اس نے اپنی جٹھانی کو بھیجا تھا کہ میرے ہاتھ کا باقی سوا روپیہ مانگ کر لاوے۔

"ہاں ہاں اب پوچھ لا۔ اب پوچھ لا" مری ہوئی بڑھیا میں جیسے جان سی پڑ گئی اس کا کالا بھوت سا رنگ اچانک دمک اُٹھا۔ اور وہ اپنی پوری آنکھوں کو کھول کر سب کو گھورنے لگی۔

"باپ رے باپ۔ تو نتیجہ ہو گیل۔ پیسہ تورا۔ اور اوکر پھل ملے لا ہم رہے۔" بڑھیا نے دانت پیستے ہوئے اپنی دیورانی کو دیکھا۔

"تو بتا! کب لی گئی تھی تجھ سے مچھلی۔ کس نے لی تھی؟ کتنے دن ہوا؟" شہنو نے سلجھتے ہوئے لہجے میں آہستگی سے پوچھا۔ چھوکریوں اور دائیوں کا ہجوم بڑے انہماک سے فیصلے کا منتظر تھا۔

فیضو اور سردار بھی باہر کا کام چھوڑ کر کھڑے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت کھلائی بوا سالن اور سبزیوں سے بھرا ہوا تھیلا لئے ہوئے بازار سے آئیں۔

ہائے یہ میلا کیسا؟ کھلائی بوا ہانپتی ہوئی پاس آکر بولی۔" ارے کا ہو رہا ہے جی! ہم کوئی مکدمہ اکدمہ کرنے لا آئی ہے کا؟ وہ حیرت سے سب کا منہ تکنے لگی۔ کھلائی بوا اس گھر کی پرانی آدمی تھیں۔ اور گھر میں ان کی عزت اس لئے زیادہ تھی کہ وہ بیگم صاحب کی جہیز میں آئی تھیں اور سارے بچے انھیں کے ہاتھوں پلے تھے۔

"نا بوا۔ کچھو نا ادھر مچھلی کے پیسہ باکی ہے۔" دوسری مچھوائن نے اپنی تیز نگاہوں سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اینٹھی باتوں سے کام نہ چلے گا۔

ہاں کھلائی بوا۔ تم ہی بتاؤ نا! سوا روپیہ کی ڈیڑھ سیر مچھلی کب لی گئی تھی؟ تو یہ چار گھنٹہ سے ناک میں دم آ گیا ہے، روشی کا جی اب اس قصہ سے بیحد گھبرا گیا تھا۔

کب؟ کب لیا گیا ہے؟ میرے کو یاد نا ہے! کھلائی بوا پایہ سے آڑ لے کر بیٹھی ہوئی بولی۔

اور نکہت نے سوا روپیہ اپنے بیگ سے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیا۔ "لے بھئی لے۔ ختم بھی کر یہ قصّہ۔" اور بڑھیا نے اپنی گھسی کالی کالی دراریں پڑی انگلیوں سے بڑے حریصانہ طور پر پیسوں کو سمیٹ کر مٹھی میں داب لیا۔

"ہاں تو اب بتانا کس کو دے ئے تھا۔ مچھلی اور کب دے گئی تھی۔" شہنو چڑچڑی آواز میں بولی۔

"آٹھ مہینہ ہوا بیٹی۔ پٹنہ جانے سے پہلے اپنی مالکنی کے پاس ڈیڑھ سیر کے مچھلی دے گیلی ہل۔ او گھڑی کھلائی بوا بھی رہلن" مچھوائن روتی ہوئی آواز میں بولی "ہائے او ہی ہاتھ سے پیسو لیتی ہل بھگوان"۔ اور سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"امی کے ہاتھ کا باقی تھا شہنو اور روشی ایک ساتھ بڑی حسرت سے بولی۔ اور نکہت کے منھ سے ایک لمبی ٹھنڈی سی سانس بے اختیار نکل گئی۔ کھلائی بوا نے بھی ایک لمبی سی ہونکار بھری۔" ہاں ہاں میرے ہی سامنے اس اُسارے پر تو ہائے اس جگہ پر بوبو بے چاری نے مچھلی لیا تھا۔" کھلائی بوا نے بچپن، جوانی اور تھوڑے دنوں تک بڑھاپا بھی ساتھ گذرا تھا۔ اور اب اس تنہائی میں ان کے منھ سے بے اختیار آہیں نکل جاتی تھیں۔ گھر بھر پر ایک غمگین تاثر چھایا ہوا تھا اور سب کے چہرے نیچے جھک گئے۔

بڑھیا اپنی جگہ پر اونگھتے اونگھتے گردن ہلا کر ایک بار جیسے چونک پڑی، آئیں کا؟ اور اس کے سیاہ چہرے پر لال رنگ کے دھبے دار ہونٹ مکروہ طور پر اور پھیل گئے۔ میلے کپڑوں میں پلپلاتے ہوئے سیاہ چمڑوں کی گٹھری کھسکتی کھسکتی روشی کے ذرا نزدیک پہونچ گئی اور تینوں بہنوں نے سڑی مچھلی کی بساند سے بدحواس ہو کر اپنی اپنی ناکوں پر چپکے سے اُنگلیاں، اخبار اور آنچل رکھ لئے اور بڑھیا کا وہی بھیانک منھ ایک بار پھر کھل گیا۔ کا؟ مالکنی کے ہاتھ کے باکی؟ اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے روشی کے پلنگ پر بڑے احترام سے پیسہ رکھ دیا۔ نا بیٹی نا۔ ہائے اب دوسر کے ہاتھ سے ان کر باکی

پیسہ نا تو لیب اور نا لیوے دیب۔ ہائے ہمر مالکنی تو ہمر مائی باپ رہے لا۔" بڑھیا کا منھ بے کسانہ طور پر پھٹ گیا اور اس کے سیاہ چہرے کی جھریوں میں چپ چپاتے ہوئے آنسو پھیل گئے۔ بڑھیا نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور کر اپنی دیورانی کی حریص نظروں کو دیکھا جو ایک ٹک سے پلنگ پر دھرے ہوئے پیسوں کو تک رہی تھی۔" ای سوا گو روپیہ سے دن نا کٹ جائی۔" اس نے اپنی دیورانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ گھر کے لوگوں نے ہزار جتن کئے کہ وہ کسی طرح سے پیسے لے لے۔ مگر بڑھیا کسی طرح سے بھی پیسہ چھونے کی روادار نہ ہوئی اور جس طرح سے وہ ڈگمگاتی ہوئی خالی ہاتھ آئی تھی اسی طرح سے بائیں پہلو پر جھکی لاٹھی کے سہارے چلتی ہوئی وہ گھر سے باہر نکل گئی۔ گھر کے سارے لوگ اس کو حیرت سے دیکھتے رہے۔" پگلی ہے سالی پگلی۔" فیضو نے قہقہہ لگایا۔ مگر جو بیا اس کے جاتے ہی کھل کر ذرا زور سے بولی۔ ڈائن تھی جی اللہ قسم! پکی ڈائن۔" اور روشی نے اپنی گود کی بچی کو چمکارتے ہوئے سوچا۔ کیا وہ سچ مچ ڈائن تھی؟ ۔ ڈائن ۔؟"

بازگشت

(الیاس اسلام پوری)

(۱)

شمیم روز ابھی میٹرک میں تھی کہ مسٹر امتیاز علی کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنی تمناؤں کی تکمیل نہ دیکھ سکے جو اکثر و بیشتر ان کی خاموش اور پُرسکون زندگی میں بھی ایک ہیجان کی سی کیفیت پیدا کر کے انھیں بے چین ہو جانے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

مسٹر امتیاز فطرتاً سکون پسند واقع ہوئے تھے۔ شہری زندگی کو کبھی پسندیدگی کی نظر سے انھوں نے نہیں دیکھا۔ کاروبار کی مجبوریوں کے علاوہ شہر کے وہ تمام ہنگامے جنھیں اس کی رونق سمجھا جاتا ہے۔ ان کے لئے بالکل بے معنی تھے۔ اسی لئے اپنے اس دورِ حیات میں جب انسان کاروبار کی اُلجھنوں سے کنارہ کش ہو کر آرام و سکون کی احتیاج زیادہ شدت سے محسوس کرنے لگتا ہے۔ اپنے قیام کے لئے سلیم پور کا انتخاب کیا اور زندگی کے باقی ایام وہیں بسر کر دیئے۔

مسٹر امتیاز کا خاندان کوئی بڑا خاندان نہ تھا۔ ولایت میں ایک انگریز خاتون سے انھوں نے شادی کی تھی اور شمیم روز ان کی تنہا اولاد تھی۔ یہی بچّی تھی جس کی فکر کبھی کبھی کچھ دن اور زندہ رہنے کی تمنا ان کے دل میں پیدا کر دیتی۔ ورنہ ان کی بے نیازیوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کی موت بھی ان کی زندگی سے کسی طرح کم بے فکری کی نہیں ہو سکتی۔ مسٹر امتیاز کے انتقال کے تھوڑے ہی دنوں بعد ان کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا۔

مسٹر امتیاز کی قبر بستی سے پو تھائی میل کے فصل پر اس جگہ بنوائی گئی تھی جہاں سے دریا بھی بہت قریب تھا اور جنگل کا کنارہ بھی۔ اور جہاں پہنچ کر انسان کا بیک وقت

ان تمام مناظر سے متاثر ہو کر ایک خاص کیفیت میں مبتلا ہو جانا بڑی حد تک ناگزیر تھا۔ قبر کے چاروں طرف ایک چھوٹا سا چمن لگا دیا گیا تھا اور اسے چہار دیواری سے گھیر کر محفوظ کر دیا گیا تھا۔ ان کی بیوی کی قبر بھی وہیں بنوائی گئی تھی۔

باپ اور ماں دونوں کے انتقال کے بعد شمیم نے اپنا تعلیمی سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھا اور میٹرک کے امتحان کے بعد ہی اپنی بوڑھی دادی کے ساتھ جو ابھی زندہ تھیں، سلیم پور میں رہنے لگی۔ شمیم کی فطرت باپ پر واقع ہوئی تھی۔ اس لئے سلیم پور کی دیہاتی زندگی میں اسے کسی لطف کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

مس شمیم روز اپنے نام اور خون کی طرح حُسن وجمال کا ایک ایسا مرکب مجسمہ تھی کہ جس میں ہندوستانی اور انگریزی حسن وجمال کی تمام خوبیاں چُن چُن کر اکٹھی کر دی گئی ہوں —— بالوں کی افعیت، چہرہ کی صباحت، آنکھوں کی سیاہی اور غزالیت، کمر کا لوچ اور خرام کی نزاکتیں مجموعی حیثیت سے ایسی چیزیں نہ تھیں کہ کوئی دیکھے اور نظر جذب ہو کر نہ رہ جائے...... جسمانی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ دماغی اعتبار سے بھی وہ کچھ کم نازک کہے جانے کی مستحق نہ تھی۔ وہ حد درجہ ذکی الحس واقع ہوئی تھی۔ اور غور و فکر کی بڑی حد تک عادی۔ اسی کا شاید نتیجہ تھا کہ وہ اکثر انسانی ہنگاموں سے کنارہ اپنے اوقات جنگل اور ویرانے کی سیر میں بسر کر دیتی۔......

سلیم پور کا جنگل آس پاس میں بہت مشہور تھا۔ اسے جن بھوت اور خبیث روحوں کا مسکن بتایا جاتا۔ کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا شب کے وقت جنگل میں پڑ گیا تو اس کا بچ کر نکل آنا محال تھا...... روز پر یہ تمام افواہیں کوئی اثر پیدا نہ کر سکیں۔ شام کو جنگل کی سیر اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اکثر اسے بہت دیر ہو جاتی اور بہت بہت رات گئے تک واپس نہ آتی۔ وہ اس دریا کے کنارہ تک پہنچ جاتی جو جنگل کے بہت گھنے حصے سے ہو کر بہتا تھا اور بہت کم آدمی دن کے وقت بھی وہاں تک جانے کی ہمت کر پاتے تھے۔ دریا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر چڑھ کر فطرت کے گوناگوں مناظر سے لطف حاصل کرتی...... شب کی ایسی گھڑیوں میں جب انسانی دُنیا

نیند کے غلاف میں لپٹی سوئی ہوتی ہے اور دُنیا کے آباد حصے ساکت و جامد ہوتے ہیں
جنگل کی روحیں بیدار ہوتی ہیں اور اس وقت وہاں کے پتے پتے سے زندگی کا ثبوت ملتا
ہے۔ روز کرہ آسمانی کی پُرسکون حرکت اور جنگل کے پر خروش جمود سے بیحد متاثر ہوتی
اور قدرت کی قوت تخلیق پر غور کرتی ہوئی کھو جاتی۔ اکثر اس کے دماغ کو یہ سوال بیحد
پریشان کرتا کہ اس وسیع کائنات میں انسان کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے ....
شب کی ابتدائی گھڑیوں کا بڑا حصہ وہ انھیں محویتوں میں بسر کر دیتی اور اسے خبر بھی
نہیں ہوتی تا آنکہ جنگل کا کوئی غیر معمولی خروش یا کسی خرگوش کے بہت پاس سے سوکھے
پتوں میں سے ہوکر گذرنے کی کھڑکھڑاہٹ اسے چونکا دیتی۔ اور تب وہ گھر کی طرف
روانہ ہوتی ــــ یہ تھے روز کے معمولات جنھیں دیکھ کر اس کی دادی اوّل اول تو بہت
گھبرائی اور اسے روکنا بھی چاہا۔ لیکن روز کو ان کے ترک پر آمادہ نہ پاکر بالآخر خاموش ہوگئی۔

ایک شب روز جب جنگل سے پلٹ رہی تھی تو بالکل غیر ارادی طور پر اس راہ پر
لگ گئی جس میں اس کے والدین کا مقبرہ تھا۔ دن کے وقت روز کبھی کبھی اس راہ سے
گزری تھی ــــ خودرو جھاڑیاں بڑھ کر چہار دیواری کو تقریباً چھپا چکی تھیں۔ دیوار کی
قلعی سیاہ ہوگئی تھی۔ خرگوش کے مسکن، گلہریوں کا آزادی سے اِدھر اُدھر دوڑنا اور
پرندوں کے بکثرت بکھرے ہوئے پر اس کی کافی شہادت تھے کہ برسوں سے بہت کم انسانی
قدم وہاں تک پہنچ سکے ہیں ــــ مقبرہ کے قریب پہنچ کر شمیم چونک سی پڑی۔ والدین
کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی اور وہ بے اختیار مقبرہ میں داخل ہوگئی۔ مقبرہ میں اس کے
سامنے ایک ایسا منظر تھا کہ وہ حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی ــــ ایک نوجوان صحنِ مقبرہ
میں ٹہل رہا تھا اور کبھی کبھی کوئی پھول جھاڑی سے توڑ کر اس کی ڈنٹھل کو انگوٹھے اور
شہادت کی انگلی کے سہارے تیزی سے چکر دینے لگتا ــــ شمیم کے دماغ میں ایک
ایک کر کے وہ تمام خیالات گردش کرنے لگے جو جنگل کے بھوت پریت کے متعلق دیہاتیوں
میں بہت مشہور تھے۔ تھوڑی دیر تک ساکت و جامد دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس کی
فطری بے خوفی نے ہمّت بڑھائی اور تجسس حقیقت کی خواہش نے اسے آگے بڑھ کر

دریافت حال پر مجبور کر دیا۔ نوجوان کچھ ایسا محو تھا کہ روز کے پاؤں کی آہٹ اسے نہ چونکا سکی اور نہیں معلوم اور کتنا عرصہ اسی عالم میں بسر کر دیتا اگر روز کے سوال اسے ہوشیار ہو جانے پر مجبور نہ کر دیتے۔ "آپ کون ہیں اور اتنی رات گئے تک یہاں کیا کر رہے ہیں؟" روز نے جلد جلد یہ سوال کئے۔

"میرا نام افضال ہے" —— نوجوان نے چونک کر جواب دیا اور پھر ایک نسوانی شکل کو سامنے دیکھ کر وہ تمام نشانات جو عموماً نتیجہ ہوتے ہیں احساس شرم و ندامت کے اس کے چہرہ پر پوری طرح ابھر آئے۔ گرچہ شمیم چاند کی ہلکی روشنی میں انھیں محسوس نہ کر سکی۔

"اور آپ اب تک یہاں کر کیا رہے ہیں؟" روز نے دوبارہ پوچھا۔

"فطرت کا مطالعہ" افضال نے کچھ ایسے انداز میں جواب دیا جس سے اس کی قلبی کیفیات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا اور بآسانی یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ الفاظ اس کے منھ سے بالکل غیر ارادی طور پر نکل گئے ہیں۔

"فطر...... رت ...... کا مطالعہ" روز نے رک رک کر یہ الفاظ دہرائے اور پھر مڑی اور روانہ ہو گئی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہو گیا تھا کہ افضال پوری طرح سنبھل بھی نہ سکا تھا کہ پردہ بدل گیا۔ وہ یہ بھی نہیں جان سکا کہ کس سے ہمکلام تھا.... دیہاتیوں کے افسانے ایک بار اس کے ذہن کو بھی دعوتِ فکر دینے لگے۔

(۲)

افضال کا وطن تھا تو سلیم پور ہی لیکن حصول تعلیم کے سلسلہ میں وہ برابر باہر رہا۔ چھٹیوں میں وہ اکثر سلیم پور آتا لیکن زیادہ قیام کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس لئے افضال اور شمیم روز ایک دوسرے سے صورت آشنا نہ تھے۔ افضال جب ایم۔ اے میں پہنچا تو گرمیوں کی طویل فرصت گذارنے کو سلیم پور چلا آیا۔

افضال یونیورسٹی میں ہمیشہ اول آتا تھا۔ اس لئے یونیورسٹی نے فلسفہ تخلیق پر

ایک مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی جو دوسری یونیورسٹیوں کے ایسے ہی ممتاز طلبہ کے مقابلہ میں اسے پڑھنا تھا۔ بہترین مضمون کے لئے انعام بھی مقرر ہوا تھا۔ افضال سمجھتا تھا کہ اس کی آیندہ زندگی کی کامگاریوں کا کسی حد تک انحصار اسی پر ہے۔ اس لئے وہ اپنی پوری صلاحیت اور کاوش خرچ کر ڈالنا چاہتا تھا۔ شاید یہ بھی ایک سبب رہا ہو کہ فرصت کے اوقات کے لئے افضال نے سلیم پور کے پُرسکون اور خاموش ماحول کا انتخاب کیا۔

سلیم پور پہنچ کر وہاں کے جنگل اور پہاڑ کے دلچسپ مناظر نے اپنی طرف افضال کو متوجہ کر لیا۔ اسے یہاں فطرت بڑی حد تک بے نقاب نظر آتی تھی اور اس کے اصلی خد و خال افضال کی نظروں کو ایسا بھاتے کہ وہ ایک خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا۔ اسی لئے اسے اکثر جنگلوں میں گھومتے ہوئے دیکھا جاتا یا کبھی کبھی روز کے والدین کے مقبرہ میں ......

افضال میں ساخت کے لحاظ سے وہ سب کچھ تھا جو ایک مرد کو حسین کہے جانے کے قابل بنا دیتا ہے لیکن اس کے سڈول چہرہ پر ایسے آثار کی بھی کمی نہ تھی جو نتیجہ ہوتے ہیں یا تو رکھ رکھاؤ میں لاپروائی کے یا پھر انتہائی غور و خوض اور دماغی کاوشوں کے۔ اسی لئے اس میں وہ شئے تو نہ تھی جسے دیکھ کر رُخسار کو گلاب کہہ کر بھی مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اسے بدصورت کہنا بھی نگاہیں گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔

افضال اب بھی قبرستان جاتا ہے۔ کبھی کبھی متوقع نظروں سے دروازہ کی طرف تاک بھی لیتا ہے۔ پھر کبھی کبھی جنگلی جانوروں سے جھاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ اسے سنبھل کر بیٹھ جانے پر مجبور بھی کر دیتی ہے لیکن ایک ہفتہ گذر گیا اور کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوا۔ ایک ہفتہ کے بعد ایک روز جب افضال اسی طرح مقبرہ میں اپنے افکار میں محو تھا کہ روز آئی اور آتے ہی بولی "شکر ہے آپ موجود ہیں۔"

"میں تو روز ہی یہاں رہتا ہوں۔" افضال نے جواب دیا۔

روز :۔ "میں آج بہت سویرے جنگل سے واپس آگئی کہ اگر آپ مل گئے تو آپ سے گفتگو کر کے آپ کے خیالات سے کچھ فائدہ حاصل کروں۔"

افضال :۔ "میرے خیالات سے فائدہ! .... آپ کو ان کے متعلق کیا علم؟ ہاں، معاف کیجئے گا میں اب تک آپ سے واقف نہیں اور اس روز آپ نے اس کا بھی موقع نہیں دیا کہ پوچھ لیتا کہ مجھے کس سے شرف کلام حاصل تھا۔"

روز :۔ "میرا نام شمیم روز ہے ....."

"بس کیجئے اس سے زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں۔" افضال نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے نام سے بخوبی واقف ہوں، لیکن کبھی ملاقات کا فخر حاصل نہ کر سکا تھا .... میں یہاں بہت کم رہتا ہوں ......"

روز :۔ "افضال صاحب اس روز کی گفتگو سے میں یہ اندازہ کر سکی ہوں کہ فطرت اور اس کی بوقلمونیاں آپ کے لئے کافی طور پر جاذب توجہ رہی ہیں۔ میں آپ سے آج اسی نوع کی گفتگو کرنے آئی ہوں۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ آپ کے خیالات سے فائدہ اُٹھاؤں گی .... لیکن افضال صاحب! فطرت کا مطالعہ کس درجہ خطرناک شئے ہے اور آپ اس میں کیوں دلچسپی لیتے ہیں۔ بتائیے تو یہ لانہایت کائنات جس کی حقیقت کا احساس بھی ایک آدم خور دیو کے وجود سے کم نہیں ــــ یہ نیلا آسمان اور اس کی بے شمار دُنیائیں، آسمان کے یہ خلا اور ان کا عمق جو سیاہ دیو کی طرح مُنہ کھولے ہر طرف نظر آ رہے ہیں اور جو دُنیا کے بڑے سے بڑے سمندر کی خُدا جانے کتنی تعداد بیک وقت اپنے اندر غرق کر سکتے ہیں۔ کیسے خوفناک مناظر ہیں۔ ان تمام چیزوں کے مقابلہ میں انسان؟...... ایک کیڑے سے بدرجہا کمتر۔ کاش یہ آسمان حقیقتاً اسی طرح ہوتا جو وہ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ یہ ستارے جو آسمان میں ہر طرف ہیرے کی طرح جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کاش یہ صرف اس لئے وضع ہوئے ہوتے کہ ہماری تاریک راتوں کو منور کر سکیں لیکن انسانی دماغ کے فشار کا اندازہ کیجئے۔ جب یہ راز کُھل چکا ہے کہ آسمان صرف فریب نظر ہے اور اس کی گہرائیاں لانہایت۔ آفتاب کروڑوں میل دور ہے اور اس سے کئی کئی

گنے زیادہ فصل پر ایک ایک ستارہ، پھر کائنات کی یہ تمام عظمتیں مقدر ہو چکی ہیں فنا کے لئے۔ جانے کتنے ستارے اپنی روشنی کھو چکے اور باقی جو ہیں ان کا بھی انجام وہی ہونے کو ہے۔ ہر طرف ایک ہلاکت ہے جس نے کائنات کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ لیا ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ ہماری بے بسی کی کوئی انتہا بھی ہے افضال صاحب؟ اور کیا یہ زندگی جیئے جانے کے قابل ہو سکتی ہے؟ معاف کیجئے گا میرے اظہار خیال میں ممکن ہے کوئی تسلسل نہ پایا جاتا ہو لیکن مجھے اُمید ہے کہ میرے جذبات کا اندازہ یقیناً آپ کر سکے ہوں گے۔"

افضال:۔ "آپ خطرناک حد تک ذہین ہیں مس شمیم! کاش آپ اپنی ذہانت کسی دوسرے مفید مشغلہ پر خرچ کرتیں۔ اور اگر یہ آپ کے لئے ایسا ہی ناگزیر ہے تو آپ اس پر غور کیجئے مگر بالکل دوسرے زاویہ نگاہ سے۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہیں یہ غور و فکر اور یہ کاوش دماغ آپ کو حد درجہ متشائم کیفیتوں میں مبتلا نہ کر دیں اور مبادا یہ زندگی آپ کے لئے اس درجہ دوبھر ہو جائے کہ آپ اس کے ترک پر آمادہ ہو جائیں...... ہر چیز کا مائل بہ فنا ہونا آپ کے لئے کیوں انتشار کا سبب بن گیا ہے۔ جب یہ زندگی ہی آپ کی سعی و کاوش کا نتیجہ نہیں۔ جب آپ کی تخلیق ہی منت کش ہے دوسرے طاقت کی تو پھر عبدیت کے سوا کسی اور شئے کی آپ کیوں توقع کریں۔...... مس روز کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ عبودیت میں کیسے کیسے لذائذ پنہاں ہیں تمام عمر کسی کی پرستش میں گذار دینا کیسی دلکش بات ہے........ سچ ہے آپ اسے کیا سمجھیں جو وضع ہوتی ہو صرف پرستش کرانے کے لئے ——— معاف کیجئے گا آپ سے میری مراد آپ کی جنس ہے کوئی خاص ذات نہیں۔" یہ کہتے کہتے افضال نے کن انکھیوں سے روز کی طرف دیکھا...

...... اور روز جواب تک افضال کی گفتگو بڑے غور سے سُن رہی تھی اس کے آخری جملوں سے چونک سی گئی اور اس کے رُخسار یکا یک بہت سُرخ ہو گئے......

"یہ سب سچ ہے افضال صاحب!" بالآخر روز بولی "لیکن ان خیالی مسرتوں سے کب تک دل کو بہلایا جا سکتا ہے۔ ہماری مجبوریاں اور محکومیاں ایسی نہیں جنھیں آسانی سے فراموش

کیا جا سکے۔ فلسفہ اور شاعری کی دُنیا سے الگ ہو کر گفتگو کیجئے اور دیکھئے کون سی شئے انسانی زندگی میں دلچسپی کا سامان بن سکتی ہے۔ پھر حیات انسانی کی یہ تمام بے آب و گیاہیاں ہم پر کیوں مسلط کر دی گئیں۔ قدرت کو اس جبر کا کیا حق تھا ——— زندگی نام ہے جبر دوام کا اور آپ کہتے ہیں اس پر ماتم کرنے کا بھی حق انسان کو نہیں۔

افضال :۔ "آپ نے پھر وہی غلطی کی ہے مس روز۔ مسرت و رنج، ابتہاج والم، سرور وغم یہ سب محض اعتباری اور اضافی چیزیں ہیں اور پھر جب آپ کی محکومی مقدر اور حقیقت بن چکی ہے تو اس طرح کلیجہ خون کر کر کے آپ کیا فائدہ حاصل کر سکتی ہیں۔ انسان کا متشائم کیفیتوں میں مبتلا ہو جانا حقیقتاً اس کی موت کے مترادف ہے۔ آپ اپنی مسرتیں خود حاصل کرنا سیکھ لیجئے۔ فطرت کسی کے لئے بخیل نہیں ——— طلوع و غروب کی رنگینیاں، برگ و گل کی شادابیاں، ماہ و فلک کی رعنائیاں اور موج و بحر کی بے تابیاں ان میں سے کون سی شئے ضائع ہونے والی ہے اور کون ہے جو آپ کو ان سے اکتساب لذت سے روک دے؟ آخر آپ کی بیچارگیوں کے پہلو بہ پہلو یہ جو اختیارات عقل و شعور آپ کو حاصل ہیں انھیں فطرت کی لایعنی ودیعت کیوں سمجھے بیٹھی ہیں؟ ——— آپ جانتی ہیں سمندر میں بیک لمحہ ساری دُنیا کو غرق کر دینے کی اہلیت موجود ہے لیکن آپ ایک جہاز پر چڑھ کر اس کے سینہ کو چیرتی ہوئی زبردستی اس سے لطف سیر و سفر حاصل کر لیتی ہیں ——— مس روز اگر آپ کی تخلیق کسی کی عبودیت کے لئے ہوتی ہے تو کائنات پر حکومت کرنا بھی آپ کے سوا کسی دوسرے کا حق نہیں"

روز :۔ "آپ کی گفتگو حد درجہ دلچسپ ہے افضال صاحب! افسوس رات زیادہ ہو چکی ہے۔ ورنہ ابھی اور اس سے لطف اندوز ہوتی۔" یہ کہتی ہوئی روز روانہ ہوئی اور افضال خاموش دیر تک اس کی طرف تکتا رہا۔ شب کی باقی گھڑیاں دونوں کی بہت بے چینی میں گذریں۔ دونوں کا دماغ جس چیز کو سوچ رہا تھا وہ ان کی گفتگو کا موضوع نہ تھا بلکہ ایک دوسرے کا وجود تھا۔

(۲)

مس شمیم روز اور افضال تقریباً روزانہ شام کو ملتے رہے اور ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے گئے یہاں تک کہ تکلف کے تمام حجابات آہستہ آہستہ اٹھ گئے اور ان کے درمیان اب ایسی کوئی شے باقی نہ رہی تھی جس کی موجودگی میں ایک عورت کسی اجنبی کے سامنے آنچل سنبھال لینے پر مجبور ہوجاتی ہے اور اس کی نگاہیں بے اختیار جھک جاتی ہیں۔

چاند کی پندرہویں تاریخ تھی۔ ابھی چاند طلوع نہیں ہوا تھا۔ افضال جنگل کی سیر کو نکل چکا تھا۔ جنگل میں ابھی بالکل سکوت تھا اور جو کچھ آثار حیات پائے جاتے تھے وہ جگنوؤں کا اِدھر اُدھر جھاڑیوں میں چمکنا تھا۔ جنگل کی ابتدا میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور وسط میں بڑے بڑے تناور درخت شب کے تاریک غلاف میں لپٹ کر بالکل آسمانی محراب کی شکل میں انسانی نگاہوں کے سامنے تھے۔ پھر ان جگنوؤں کا بکثرت اِدھر اُدھر چمکنا ثوابت اور شہاب ثاقب کے ایسے دلچسپ نظارے تھے جو ایک بار تو آنکھوں کو دھوکا دے دینے میں یقینی کامیاب ہوجاتے تھے ــــــ افضال آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا جا رہا تھا ــــــ چاند طلوع ہو رہا تھا اور اسی اعتبار سے جنگل منور ــــــ رات کی ایسی ساعت میں جب قدم قدم پر خوف و دہشت کا تسلط ہوتا ہے افضال بہت اطمینان سے آگے بڑھ رہا تھا ــــــ اس کے دماغ کو شاید اس کی فرصت ہی نہ تھی کہ ایک خاص فکر کے سوا کچھ اور سوچ سکے ــــــ ۔ آخرکار وہ اس ٹیلہ کے قریب پہنچ گیا جو دریا کے کنارے واقع تھا۔ دور سے اس نے دیکھا کہ ٹیلہ پر ایک نسوانی تصویر دریا کی طرف رُخ کئے ہوئے ایک محویت کے عالم میں کھڑی ہے۔ ایسی محویت کہ ساری کا آنچل ڈھلک کر زمین پر گر گیا ہے اور اسے فکر نہیں۔ افضال ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کوئی جل پری دُنیا کی سیر کو دریا سے نکل پڑی ہے یا وینس ایک بار پھر انسانی جسم اختیار کر کے دُنیا والوں سے نذرانہ عبودیت وصول کرنے کو آسمان سے نیچے اُتر آئی ہے اور افضال کے لئے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ جنگل کے اس غیر معمولی خروش کو

کیا سمجھے 'محویت جلوہ'، یا 'خراج بندگی' خود اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا کہ اپنی جبیں اس کے سامنے جُھکا دے ...... افضال سمجھ چکا تھا کہ یہ دیوی کون تھی۔ روز کے سوا کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ ایسی گھڑی میں جنگل کے اس حصّے میں اطمینان کے چند لمحے بھی بسر کر سکے۔ افضال بے اختیار ہو رہا تھا لیکن اس لطف نظارہ سے چند لمحے اور اپنے دل و جگر کو محظوظ کرتا رہا۔ پھر افضال آگے بڑھا اور ٹھٹکا۔ ٹھٹکا اور آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ روز کے وہ بہت نزدیک آگیا۔ روز بھی اسے دیکھ چکی تھی۔ اس کی تمام حرکتوں کا بغور مطالعہ کرتی رہی اور جب افضال کو اپنے سے بہت قریب پایا تو بولی "آیئے افضال صاحب! میں نے آپ کو دور ہی سے پہچان لیا تھا اور اسی توقع میں یہاں کھڑی رہی کہ تھوڑی دیر میں آپ یہاں آجائیں گے۔"

افضال:۔ "آپ اس وقت تک یہاں موجود ہیں" دریا میں ایک مچھلی زور سے اُچھلی اور غائب ہو گئی۔

روز:۔ معاف کرنا افضال! آج میں تم سے بہت بے تکلف ہونا چاہتی ہوں اور چاہتی ہوں تم بھی مجھے اسی طرح مخاطب کرو۔ افضال تم ہی نے مجھے سبق دیا ہے کہ قدرت سے اپنی مسرتیں چھین لوں ..... لیکن افضال! دیکھو دریا کس تیزی سے رواں ہے۔ ٹھیک ہماری عمر رواں کی طرح۔ اس میں کبھی کبھی ایک مچھلی اُچھل کر اس کی روانگی میں ایک اختلال تو ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن ہماری روانگی حیات میں یہ بھی ممکن نہیں۔ قدرت کو ادنیٰ سا اختلال بھی گوارا نہیں۔ زندگی کی یہ موجیں ہمیں مستقل تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں۔ اور ہمیں ہاتھ پاؤں مارنے کی اجازت نہیں۔"

افضال:۔ "آخر تمہارا مقصد کیا ہے؟ روز تم کب تک ان اُلجھنوں میں گرفتار رہنا پسند کرو گی۔ تم بڑی اہلیت کی خاتون ہو۔ روز میں چاہتا ہوں تم ہر شئے کو دیکھو صرف اس نظر سے کہ وہ تمہارے ہی لئے وضع ہوئی ہے۔ تم گلاب کو دیکھو اور اس کی نکہتوں سے اپنے مشام کو بسا لو۔ تمہیں یہ دیکھنے کی حاجت نہیں کہ پھول کبھی مُرجھاتے بھی ہیں۔ تم شفق کو دیکھو اور محسوس کرو کہ اس کی تخلیق ہی ہوئی

ہے تمھاری چشمِ نگاہ کی سیرابی کے لئے ......"

"بس کرو افضال!" روز بات کاٹتے ہوئے بولی "اب مجھ میں زیادہ سُننے کی تاب نہیں۔ اور نہ ان فرضی داستانوں سے دل کی تسکین ممکن ہے۔ کائنات کی حکومت تو بڑی چیز ہے۔ یہاں اپنے دل پر بھی اختیار باقی نہیں اور کیا معلوم اپنی مجبوریوں میں ایک کا اور اضافہ میں نے نہیں کر لیا ہے — تم مجھے بے حیا یا جو جی چاہے کہہ لو افضال! لیکن میں یہاں یہ ارادہ کر کے آئی ہوں کہ آج تم سے صاف صاف کہہ دوں گی ...... میں تمھیں بُری طرح چاہنے لگ گئی ہوں افضال!" یہ کہتے کہتے روز بے اختیار ہوگئی اور سسکیاں بھرتی ہوئی افضال کی آغوش میں گر پڑی۔

افضال اپنے ریشمی رومال سے روز کے آنسو جذب کرتے ہوئے بولا۔

"دُنیا کا مقابلہ کم ہمتی سے کرنا اپنی تباہی کو دعوت دینا ہے روز! اور اس باب میں تو تمھاری پریشانیوں کی کوئی وجہ بھی مجھے نظر نہیں آئی۔ میں بھی تمھاری صحبتوں سے کم متاثر نہیں اور اگر آج تم یہ پردہ نہ اُٹھا دیتیں تو سب کچھ مجھے کرنا پڑتا۔ تم نے تو اس طرح مجھ پر ایک بڑا احسان کیا ہے روز...... میں ان تمام مناظر فطرت کو جن سے اہلِ عالم سرور و لذت حاصل کرتے ہیں۔ اس چکور کو جو چاند کی طرف اُڑنے کو اپنے بازو پھیلا چکا ہے۔ جھیل کے اس کنول کو جو کسی کے لئے اپنی آغوش وا کر چکا ہے ..... گواہ بناتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ میں صرف تمھارا ہوں اور میری زندگی پر صرف تمھارا تصرّف ہوگا"

روز :- مجھے یقین نہیں آتا افضال کہ فطرت میرے لئے یکایک اتنا سخی ہو جائیگی"

روز یہ کہہ رہی تھی کہ پاس کے درخت سے ایک اُلّو کے بولنے کی کرخت آواز نے دونوں کو چونکا دیا "رات بہت زیادہ آگئی" روز نے کہا اور دونوں رخصت ہوئے۔

(۳)

نصیر میاں ایک آزاد فطرت کے انسان تھے۔ وہ زندگی کو محض زندگی کے لئے گذارنا

چاہتے تھے۔ان کے یہاں زندگی بذات خود گناہ کی تلافی تھی۔اس لئے خوف عقبیٰ اور حرص فردوس کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔فرائض اور پابندیاں محض انسانی دماغ کی اختراع تھیں اور کسی کے لئے جان دینے کا مفہوم کبھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا...... نصیر میاں کے یہ عقائد ان کی معاشرت پر پوری طرح اثر انداز تھے۔

نصیر میاں کا مکان ایک دیہات میں روز کے مکان سے صرف دو میل کے فصل پر تھا۔وہ زمیندار تھے اور خاندانی روایات کے مطابق معمولی نوشت وخواند سے آگے بڑھنے کی انھیں احتیاج نہ تھی۔ روز سے وہ اتنا دور نہ تھے کہ اس کا پُر افگندہ نقاب حُسن ان کی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتا۔پھر یہ بھی محال تھا کہ ان کی فطرت اس کے لئے کچھ کرنے پر مجبور نہ کر دیتی۔انھوں نے روز کا پیچھا کیا اور بُری طرح پیچھا کیا۔ وہ تکلیفیں اُٹھانا جانتے نہ تھے لیکن روز کے لئے جنگل جنگل مارے پھرنا بھی گوارا کر لیا۔

روز جس ظرف کی عورت تھی ناممکن تھا کہ نصیر میاں کی طرف سے قبولیت کا کوئی جذبہ اس کے قلب میں پیدا ہو سکے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی وہ ان کی فطرت کے تمام رجحانات کو سمجھنے میں پوری طرح کامیاب ہوگئی اور پھر ان کی طرف سے ایک نفرت کا جذبہ بالکل لازمی طور پر اس کے دل میں پیدا ہوگیا۔اس نے نصیر میاں سے ملنا ترک نہیں کیا۔شاید ان کی بے چینیوں کا تماشا دیکھنے کے لئے یا اس بلّی کی طرح جو اپنے شکار سے کچھ دیر کھیلتے رہنا گوارا کر لیتی ہے۔ وہ ان سے اسی طرح کھیلتی رہی اور نصیر میاں کو نا اُمید ہو ہو کر بھی اُمیدیں قائم کرنی پڑیں......

(۵)

افضال کا مضمون بہت کامیاب رہا۔اور اسے یونیورسٹی کی طرف سے انعام بھی ملا۔ایم۔اے میں بھی اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ حکومت کی طرف سے یورپ جاکر مزید تعلیم کے لئے وظیفہ کی منظوری کا بھی اعلان ہوا۔افضال ان تمام کامرانیوں کی خبر اوّلین فرصت میں روز کو کرنا چاہتا تھا اس لئے نتیجہ کے اعلان کے بعد ہی وہ سلیم پور

آگیا اور روز سے مل کر مژدہ سُنا دیا۔

روز:۔ آپ کی کامیابیاں مبارک ہوں .... یورپ کی تیاریاں کب ہیں؟" روز کے لئے افضال کی کامیابیوں سے زیادہ کوئی دوسری شے مسرت کی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کے الفاظ اور لب ولہجہ کسی غیر معمولی کیفیت کے اظہار کے لئے بالکل کافی نہ تھے۔ ان میں مسرت کی ان فراوانیوں کا پتہ نہ تھا جو یکبارگی سارے جسم میں کہربائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اس وقت الفاظ بھی بہت تیزی سے ادا ہونے لگتے ہیں .... روز آخر عورت تھی۔ کبھی کبھی مغلوب ہو جانا حیرتناک امر نہیں ہو سکتا ـــــ افضال سے جُدائی کے خیال نے تھوڑی دیر کے لئے اسے بے چین کر دیا .... لیکن وہ جلد ہی ان کیفیتوں پر غالب آگئی۔

افضال:۔ یورپ کی تیاریاں؟ .... کبھی بھی نہیں؟

"کیوں"؟ روز نے سخت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا "خُدا کے لئے پہیلیاں نہ بجھواؤ، صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کیا مطلب ہے افضال!"

افضال:۔ "صاف صاف سُننا چاہتی ہو روز تو سنو۔ مجھے وظیفہ کی پرواہ نہیں۔ اس سے بڑا انعام مجھے پہلے ہی مل چکا ہے اور وہ تم ہو۔

روز:۔ تم میری زندگی پر چھا چکی ہو اور اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہئے .... میں تم سے جُدا نہیں ہو سکتا روز!"

روز:۔ تم نے پھر وہی شاعری شروع کر دی۔ ان چیزوں کا تذکرہ مادّی دُنیا میں فضول ہے افضال! اور پھر یورپ جانے سے ہماری محبت کس طرح متاثر ہو سکتی ہے یہ وقت حصول عروج کا ہے اور اگر تم نے اسے محض میری خاطر ضائع کر دیا تو میرا ضمیر اسے کیونکر برداشت کر سکے گا۔

افضال:۔ پورے چار برس کے لئے تمھیں چھوڑ دوں! یہ میرے لئے محال ہے۔ تم میرے دل کو کیا جانو روز۔ میں سب کچھ تمھارے لئے قربان کر سکتا ہوں۔"

روز:۔ سب سچ ہے افضال! لیکن اس کے تو معنی یہی ہیں کہ میں نے صرف اس لئے

تم سے محبت کی کہ تمھیں تباہ ہوتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور طرفہ یہ کہ اس کا سبب بھی میں ہی بنوں۔ دُنیا کیا کہے گی اور خود میں کیوں کر گوارا کر سکوں گی۔..."

روز ابھی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ افضال یہ کہتا ہوا روانہ ہوگیا کہ "میں کسی قیمت پر اپنے دل کا خون گوارا نہیں کرسکتا۔"

روزنہ جذبات کے اعتبار سے ایک طوفان میں مبتلا ہوگئی تھی۔ ہزار سوچنے پر بھی وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ کیا کرے۔ آنکھوں کا نم اور چہرے کا اُتار چڑھاؤ اس کے دلی موج و تلاطم کے کافی آئینہ دار تھے۔ وہ تمام تمام شب جاگ کر کسی فیصلہ پر پہنچ جانا چاہتی تھی لیکن پہنچ نہیں پاتی تھی۔ اگر ایک طرف اس کی محبت اور نسائیت اُسے تسکین دے کر خاموش ہوجانے پر اصرار کرتے تھے تو دوسری طرف اس کا خلوص یہ کبھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھا کہ افضال کی ترقیوں میں سدِّراہ بن جائے۔ ایک ہفتہ اس کشمکش میں بسر ہوگیا۔ بالآخر اس کے قلب و دماغ نے اسے ایک فیصلہ پر پہنچا دیا —— وہ اپنا سب کچھ افضال کی محبت کے بھینٹ چڑھا دے گی —— وہ خود اپنے فیصلے سے کانپ گئی —— افضال سے اس نے بارہا منتیں کیں کہ وہ یورپ کی روانگی پر رضامند ہوجائے لیکن اس میں کسی تبدیلی کا امکان نہ پاکر مجبور ہوگئی کہ دُنیا کو اپنا فیصلہ سُنا دے —— ٹھیک اس شام کو جس کی دوسری صبح کو افضال غیر جانے والا تھا بستی میں یکایک یہ خبر مشہور ہوئی کہ مس شمیم روز اور نصیر میاں سلسلہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں۔

افضال پر اس خبر کا جو کچھ اثر ہوا اس کی تشریح ممکن نہیں۔ اس کی جو حالت ہوئی وہ کسی مار گزیدہ کی بھی نہیں ہوگی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو جان دے کر چھٹکارا حاصل کرلیتا۔ لیکن افضال معمولی قلب و جگر کا انسان نہ تھا پھر بھی اپنی المناکیوں کو چھپانے کے لئے اسے یہی مناسب معلوم ہوا کہ جلد سے جلد سلیم پور سے روانہ ہوجائے۔

(۶)

پیارے افضال!

مجھے معلوم ہے تم مجھ سے اس طرز تخاطب کے حق کو بھی چھین لینا چاہو گے لیکن میں اسے اپنے ہاتھ سے دینا تو گوارا نہیں کر سکتی!...... تمھارے لئے میری بیوفائی کافی حجت بن سکتی ہے لیکن میرے دل کے لئے؟........ افضال! تمھیں مجھ سے وجہ شکایت کیا ہے۔ یہی نا کہ میں نے اپنا جسم ایک دوسرے شخص کے ہاتھ، ہاں ایسے شخص کے ہاتھ جسے میں خود نفرت کی نگاہ سے دیکھتی رہی تھی فروخت کر دیا ہے...... باور کرو مجھے یہ سوداگراں نہیں معلوم ہوتا............ روح اب بھی آزاد ہے ـــــ تمھیں یاد ہونا چاہیے افضال! اپنا وہ جملہ "تمھیں کیا خبر کسی کی پرستش کرتے ہوئے گذر جانا کیسی دلکش بات ہے۔" اور یہ کہتے کہتے تم نے میرے ساتھ میری تمام جنس کو نااہل قرار دے دیا تھا لیکن پیارے! اس عملی امتحان میں غور تو کرو کون قابل الزام ٹھہرا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن تمھاری راہ میں کانٹا بننا کیسے گوارا ہوتا۔ چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ اپنے کو تمھاری راہ سے ہٹا لوں افضال! اس طرح میں تم سے بے وفائی کے گناہ کا ارتکاب تو کر سکتی تھی لیکن تمھیں تباہ کر دینے کا عذاب میری روح کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔
.... افضال مجھے اچھی طرح معلوم ہے میری ان باتوں کی تاویل تم جس جس طرح کرو گے لیکن مجھے اب اس کی پرواہ نہیں۔ میری محبت اب ان تمام مدارج سے گذر چکی ہے جن میں صرف روحانی پرستش کے علاوہ جسم و بدن کا ادنیٰ سا تعلق بھی باقی رہ جاتا ہے میری روح محبت کی اس منزل میں ہے جہاں پہنچ کر وہ حشر سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے اور اسی لئے میں تمھیں باور کرانا چاہتی ہوں کہ میری اس تحریر کو اظہار معذرت متصور نہ کرو۔ فقط

ایک بے وفا
شمیم

ولایت میں افضال کے قیام کو دو برس گذر گئے اور کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ سوائے روز کی مندرجہ بالا تحریر کے جو اسے ابتدا ہی میں مل گئی تھی لیکن افضال کے جذبات اس درجہ برانگیختہ تھے کہ روز کی تحریر پہچان کر اس نے اسے پڑھنا بھی گوارا نہیں کیا اور اسے بکس میں بند کر کے شاید فراموش بھی کر چکا تھا اس دو برس کے قیام نے افضال کے زخموں میں اندمال پیدا کر دیا اور وہ اپنے ماضی کے فراموش کرنے میں بڑی حد تک، کامیاب بھی ہو گیا۔ کبھی کبھی ایک ٹیس کی کیفیت وہ ضرور محسوس کرتا اور شاید دو برس کے مزید قیام میں اسے اس سے بھی نجات حاصل ہو جاتی۔ اگر اسے نصیر میاں کی موت کی خبر ایک بار پھر بے چین ہو جانے پر مجبور نہ کر دیتی —— نصیر میاں کی بے اعتدالیاں بڑھتی گئیں اور آخر کار وہ دق کے شکار ہو کر شہر کے اسپتال میں مرے۔ افضال کے سامنے ماضی کے تمام نقوش ایک ایک کر کے آنے لگے اور روز کے لئے ایک ہمدردی کا جذبہ اس کے دل میں موجزن ہو گیا۔ اسے روز کا خط بھی یاد آ گیا اور اسے بکس سے نکال کر پڑھنے لگا —— افضال کی آنکھ سے آنسوؤں کے قطرے ٹپکے اور زمین میں جذب ہو گئے۔

(۷)

افضال اپنی تعلیم ختم کر کے سلیم پور واپس آ گیا۔ پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد روز کی ملاقات کو روانہ ہوا۔

شام ہو چکی تھی۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ افضال کی آنکھوں کے سامنے جنگل کی اس شام کا منظر تھا جس میں افضال اور روز نے پہلی دفعہ محبت کے عہد و پیمان کئے تھے۔ جنگل اندھیرا تھا اور جگنو اسی طرح اِدھر اُدھر چمک رہے تھے۔ افضال نے ایک سرد آہ کھینچی اور بولا "فطرت کتنی بے نیاز ہے۔ میری زمین اور آسمان سب بدل گئے۔ لیکن فطرت ذرہ برابر متاثر نہیں......" افضال جذبات سے بے اختیار ہو گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ کس ارادہ سے نکلا تھا اور بالکل غیر ارادی طور پر

جنگل کی طرف چل پڑا ۔۔۔۔ ایک ایک ذرّہ اسے گذشتہ عہد محبت کی تفصیل سُنا سُنا کر اور زیادہ بیتاب بنا رہا تھا اور افضال ان بے تابیوں کو سینہ میں دبائے آگے بڑھ رہا تھا۔ راہ میں مقبرہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی افضال اپنی محبت کے اس اوّلین آثار کو دیکھنے مقبرہ میں داخل ہو گیا۔

روز سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کا دو برس کا بچّہ زمین پر کھیل رہا تھا۔

"روز!" افضال کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"افضال! ...... آخر ......" روز چیخ پڑی۔

تھوڑی دیر دونوں بالکل ساکت و جامد ایک دوسرے کو تکتے رہے .... ماہتاب طلوع ہو رہا تھا۔

"افضال!" روز بولی۔ "تم مجھے بھول چکے ہو۔ مجھے اس کی شکایت کا کوئی حق نہیں۔ تمھیں یہی کرنا چاہئے تھا۔ میں تمھارے لئے کچھ نہیں افضال! .... ایک بے وفا کی کوئی کیوں پرواہ کرے۔" روز بے اختیار پھوٹ پڑی۔ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن جذبات کی فراوانی نے زبان بند کر دی۔

افضال:۔ "ان باتوں کا اب تذکرہ نہ کرو روز!"

"افضال" روز نے کہا "کیا کہتے ہو! تم بدل چکے ہو۔ زمانہ بدل چکا ہے یہاں تک کہ میں خود بدل چکی ہوں۔ ان حقیقتوں پر پردہ ڈالنا کیسے ممکن ہے افضال!"

افضال:۔ "کون کہتا ہے میں بدل چکا ہوں روز! میں صرف تمھارے ساتھ زندگی گذارنے آیا ہوں روز!"

روز کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور بیہوش ہو کر گر پڑی .... بچّہ رونے لگا "آؤ میرے پاس آجاؤ۔ میں تمھیں پیار کروں گا بیٹا!" افضال بچے کو بہلانے لگا۔

روز کی غشی کو جذبات کے ہیجان کا نتیجہ سمجھ کر افضال کو گھبراہٹ نہیں

ہوئی —— رُخسار کی سُرخی آہستہ آہستہ روئی کے گالے کی سی سفیدی میں تبدیل ہوتی گئی اور پھر یہ سفیدی بڑھتے بڑھتے کان، ناک اور پیشانی پر پھیل گئی ....
یہ دیکھ کر افضال سخت پریشان ہوگیا —— "روز، روز"! اس کے بازو جھنجھوڑتے ہوئے ——— برسوں کا ٹوٹا ہوا دل اس طوفان مسرت کی تاب نہ لا سکا۔

——·×·——
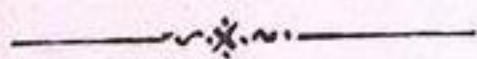
اہنسا

(اختر قادری)

منشی امیرالدین اور لالہ ہرگو بند میں یارانہ اور برادرانہ شروع تو اس زمانہ سے ہوا تھا جب دونوں مولوی صاحب سے کریما پڑھتے تھے۔ لیکن بچپن گیا، جوانی ختم ہوئی پیری آئی، صاحب اولاد اور اہل معاش ہوگئے پھر بھی ادھر مولوی صاحب نماز اور تلاوت سے فارغ ہوئے ادھر لالہ جی نے اشنان اور سورج دیوتا کی پوجا ختم کی پھر گھنٹوں دیکھئے کہ املی کے درخت کے نیچے دونوں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ہر آنے والے جانے والے سے ہندو ہو یا مسلمان دو باتیں ضرور ہو جاتیں۔ کسی سے بھائی کا رشتہ تھا تو کوئی بھانجا بھتیجا تھا۔ غرض یہی نہیں کہ صرف ان دونوں میں مراسم تھے، بلکہ بستی اور جوار کے کل لوگوں میں بھائی چارا تھا۔ مذہب اور دھرم میں سب پکے تھے۔ ایسے کہ اگر ان لوگوں کی حالت سے موازنہ کیا جائے تو آج کے مسلمان نہ مسلمان نظر آئیں نہ ہندو، ہندو ـــــ لیکن آپس میں میل جول ایسا تھا کہ کسی نے کبھی ہندو مسلمان میں فرق جانا نہ انم ذات اور اچھوت کا جھگڑا سنا۔ شادی میں، تقریبات میں ایک دوسرے کے ہاں نیوتہ ضرور بھیجتا۔ دکھ مصیبت میں سب شریک حال ہوتے۔

خیر یہ باتیں تو بیچ میں آپڑیں کہنا صرف یہ تھا کہ منشی جی اور لالہ جی کی دوستی پرانی تھی۔ بچپن میں شروع ہوئی جوانی میں نبھی بڑھاپے میں بھی دونوں ایک جان دو قالب تھے۔

(۲)

زندگی دھوپ کی چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اتفاق کہیئے یا رضائے الٰہی کہ ایک

صبح لالہ جی پوجا پاٹ سے فرصت کر کے املی کے نیچے پہنچے تو منشی جی کو نہ پاکر ان کے گھر کی طرف بڑھے۔ تشویش تھی کہ خلاف معمول انھوں نے دیر کیوں کی اتنے میں سامنے سے منشی جی کا چھوٹا لڑکا نسیم آتا ہوا دکھائی دیا۔ آتے ہی اس نے سلام کیا لالہ جی نے مسکرا کر کہا ــــ "جیتے رہو بیٹا!" پھر پوچھا ــــ تمہارے بادا جان کہاں ہیں؟" لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا چچاجی! ابا بیمار ہو گئے ہیں۔ ہم آپ کو بلانے جارہے تھے" ــــ لالہ جی نے لڑکے کو گھبرایا ہوا پاکر محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا اور یہ بولتے ہوئے ساتھ ہوئے ــــ چلو بیٹا! ہم جا ہی رہے تھے! ــــ لیکن تم گھبراتے کیوں ہو؟ ــــ آدمی بیمار بھی ہوتا ہے۔ اچھا بھی ہوتا ہے ــــ پچھلے بدھ کو میری بھی طبیعت خراب ہو گئی تھی اب اچھا ہوں۔ تمہارے ابا بھی اچھے ہو جائیں گے" ــــ غرض اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے دونوں منشی کے گھر پہنچے ــــ

منشی جی کو گردہ کا مرض تھا۔ اکثر دورہ ہوتا تھا۔ لیکن اب کی دورہ سخت تھا۔ ایسا سخت کہ بیچارے جان بر نہ ہو سکے۔ مرنے سے قبل منشی جی نے روتے ہوئے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اور بولے ہم اب رخصت ہو رہے ہیں۔ سب لوگوں سے اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں افسوس نعیم ــــ (منشی جی کا بڑا لڑکا جو تعلیم حاصل کرنے کلکتہ گیا ہوا تھا) سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ لوگ میرے بچوں کا خیال رکھیں گے۔ خدا بھلے کام کا بھلا اجر دیتا ہے۔"

کمرے میں منشی جی کی برادری کے لوگ بھی تھے۔ اور دوسرے بستی والے بھی۔ لالہ جی نے روتے ہوئے یہ کہکر نسیم کو گود میں اٹھا لیا ــــ " بھائی! آپ کے بچے میرے بچے ہیں آپ کی عدم موجودگی میں اپنے جیتے جی انہیں کوئی تکلیف محسوس نہ ہونے دوں گا ــــ "

منشی جی نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا ــــ کچھ بولنا چاہتے تھے لیکن۔ ایک ہچکی آئی اور موت نے ہمیشہ کیلئے مہر خاموش لگا دی۔

موت کا نام ہی بھیانک ہے ۔ انسان غیر کے مرنے کی خبر سنتا ہے تو دل بھر آتا ہے پھر گھر کے سرپرست کے اُٹھ جانے پر منشی جی کے اہل و عیال کو جتنا غم ہوا ہو گا محتاج بیان نہیں ۔ لالہ جی جہاں دیدہ بزرگ تھے ۔ سمجھتے تھے کہ باپ کی موت کی خبر ایک ایسے بیٹے کیلئے جس نے ابھی زمانہ کا سرد و گرم نہ دیکھا ہو کیا چیز ہوتی ہے وہ پریشان تھے کہ نعیم کو یہ دل شکن خبر کس طرح پہنچائی جائے پہلے یہ خیال ہوا کہ خود جا کر لائیں لیکن انھیں نسیم کی دلجوئی بھی کرنی تھی ۔ اس لئے یہ خیال ترک کرنا پڑا ۔ سوچا کہ منشی جی کے چچازاد بھائی کو بھیجا جائے لیکن یہ بات بھی کسی وجہ سے مناسب نہ معلوم ہوئی ۔ آخر میں انھوں نے اپنے لڑکے کو جو نعیم کے ساتھ کلکتہ ہی میں اسکول میں پڑھتا تھا لکھ بھیجا کہ نعیم کو یہ خبر دے کہ امیر بھائی بیمار ہیں اور انھیں ساتھ لیکر مکان چلا آئے ۔ غرض نعیم مکان آئے ۔ باپ کی موت کی خبر سنی اور گریہ و زاری شروع کی ۔ لالہ جی نے تسکین و تسلی دی ۔ غم غلط کیا ۔

"— دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے ۔ بڑے بڑے نبی ، ولی اور اوتاروں کو بھی ایک دن موت کا سامنا کرنا ہی پڑا ہے ۔ رونے سے کیا حاصل خود بھی ہلکان ہونا ہے اور مرنے والے کی روح کو بھی دکھ پہنچانا ہے ۔ بیٹا صبر کرو ۔ اور ایسے کام کرو جن تمہارے باپ کو دوسری دنیا میں چین پڑے "۔ یہ تھی ان کی نصیحت ۔ کچھ دنوں کے اندر اور دوسری ضروری چیزیں وافر جمع ہو چکی تھیں ۔ جگ میں بھی اب زیادہ دیر نہ تھی ۔ اس طرف چند دنوں سے کتھا وز کہی جاتی تھی ۔ اس لئے جاتریوں کا ہجوم ہر وقت رہتا تھا ۔ اتوار کی صبح تھی کم از کم سات ہزار آدمی جمع ہو چکے تھے ۔ لیکن ابھی آنے والوں کا تانتا بندھا تھا عورتیں ، بچے ، جوان بوڑھے سب کے سب اس سعادت میں شرکت کے لئے پروانہ وار آرہے تھے ۔ اب جگ میں تین گھنٹے سے زیادہ دیر نہ تھی ۔ کچھ لوگ ندی میں اشنان کر رہے تھے ۔ کچھ بیٹھے ہوئے کلجگ کی برائیوں پر تبصرہ کر رہے تھے کہ اتنے میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ مہاتما جی جگ کے بارے میں کچھ کہیں گے ۔ لوگ تیزی سے کٹیا کے قریب جمع ہوئے ۔ ہر شخص مہاتما کے درشن کو بیتاب اور ان کے بچن سننے کو گوش بر آواز تھا ۔

سادھوجی کٹیا کے باہر آئے۔ در پر کھڑے ہوئے ایک نگاہ غلط انداز مشتاق مجمع پر ڈالی اور اپدیش شروع کیا۔

——— بھارت کے سپوتو! یہ کلجگ ہے کلجگ۔ منش پاپ کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔ بوڑھا، جواں مرد، استری سب کے سب پاپی اور اپکاری ہو گئے ہیں۔ دیوتاؤں کو ہندو جاتی کے دھرم سے بڑا دکھ ہو رہا ہے۔ اندر مہاراج اور برہماجی تو اتنے رنجیدہ ہیں کہ سنسار کو "پرلے" کر دینے پر تیار تھے۔ لیکن شیوجی نے تم لوگوں کے لئے بڑا کشٹ اٹھا کر انھیں راضی کیا ہے کہ کچھ دن اور چھما کریں ہمارے گروجی کو شیو مہاراج نے اپنا درشن دیا اور دیوتاؤں کے کرودھ کا حال سنا کر کہا کہ اصل پوجا منش جاتی کی سیوا ہے۔ تم کسی طرح بھارت نواسیوں کو پاپ سے چھڑاؤ۔ ورنہ ایکے گرہینا کے دن ایسا بھوں کمپ ہوگا کہ سب کا وارا نیارا ہو جائے گا۔ بروں کے ساتھ اچھے بھی برباد ہو جائیں گے۔ جانتے ہو آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے ہم کو ہمارے گرو مہاراج نے آپ لوگوں کی سیوا کے لئے بھیجا ہے۔ نہیں تو ہم سادھوسنتوں کو منش کے جھمیلوں سے کیا کام اب تھوڑی دیر میں یگیہ شروع کر دینا ہے۔ آپ لوگ دیوتاؤں سے اپنے پاپ کی چھما مانگیں اور سچا وچن دیں کہ "ہے پرماتما اب سے ہم لوگ دھرم کی سیوا کریں گے۔ پاپ سے بچیں گے۔ اہنسا نہ کریں گے۔ اور پوجا پاٹ میں تن من سے لگے رہیں گے ———"

اتنا کہکر سادھوجی رک گئے۔ اور مجمع کا جائزہ لینے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ لوگ ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اور انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ہم اگر پاپ سے باز نہ آئے۔ اور سچے دل سے توبہ نہ کی تو گرہن کی رات زلزلہ سے دنیا میں قیامت برپا ہو جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجمع پر سخت ہراس چھایا ہوا تھا۔ ہر فرد بشر کا چہرہ آنے والے عذاب کے خوف سے فق ہو رہا تھا۔ اور یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ سادھوجی کے اپدیش نے جادو کا اثر کیا تھا۔ اس کے بعد سادھوجی نے پھر تقریر شروع کی۔

"——— ہاں تو سمجھے! کہنا یہ ہے کہ اس جگ کو دیکھنے کے لئے تمام دیوتا آئیں گے

ایسا نہ ہو کہ ہم میں سے کوئی آدمی بھی پاپ کا کام کرے۔ ورنہ ساری محنت برباد ہو جائیگی۔ اور سب کے سب مٹی میں مل جائیں گے۔ اور دیکھو، بھگوان نے صرف منش ہی کو پیدا نہیں کیا ہے۔ جیو رکھنے والا منش ہو یا پکھیرو۔ کتا ہو یا بکرا۔ سب کو اس نے بنایا ہے۔ اور بھگوان کے نزدیک سب سے بڑا پاپ جیو ہتیا ہے۔ تم لوگ اس کا خیال رکھنا کہ کم سے کم اس وقت سے لیکر یگیہ کے سمے تک نہ خود کسی جیو کو ستاؤ نہ کسی اور کو جیو ہتیا کرنے دو۔ اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو یگیہ کرنا بیکار ہے۔ بھلا سوچو تو یگیہ میں دیوتا آئیں گے وہ دیکھیں گے کہ ادھر تو پراتھنا کیا جا رہا ہے کہ "ہے پرماتما! اب کے بھر چھما کرو۔ پھر ہم پاپ سے بچیں گے اور دھرم پر چلیں گے اور ادھر لوگ جیو ہتیا کر رہے ہیں۔" ایسے میں وہ نشچے یہی سمجھیں گے کہ اب یہ منش لوگ دیوتاؤں کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ میری نظر کے سامنے جیو ہتیا ہو رہی ہے اور جھوٹ بول رہے ہیں کہ دھرم پالن کریں گے۔ بس ہمکو جو کہنا تھا کہہ دیا اب تم جانو اور تمہارا کام۔"

یہ کہہ کر سادھو جی کٹیا میں واپس جانا ہی چاہتے تھے کہ ایک اجنبی نے آگے بڑھ کر ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مگر مہاراج آج مسلمان جاتی کا تیوہار ہے اور وہ لوگ اب تھوڑی دیر میں بلدان دیں گے۔ دوسرے دھرم والوں پر کیا اختیار ہے؟ ——"

ابھی وہ اپنی پوری بات بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کہ سادھو جی نے غصہ سے گرجتے ہوئے کہا۔

"—— مسلمان جاتی بلدان دیگی —— دوسرے دھرم والوں پر کیا اختیار ہے؟ اے بھائی اپنا دھرم بچاؤ۔ ورنہ سانجھ سے یہاں کوئی نہ ہوگا۔ سب کا ستیاناس ہو جائیگا۔ اگر تم جیو ہتیا روک نہیں سکتے تو پھر اس سے بڑا پاپ اور کیا ہے؟ —— اچھا جو تمہارے من میں آوے کرو۔ ہمارا کام سمجھانا تھا۔ اگر تم جیو ہتیا روک نہیں سکتے ہو تو ہم بیکار یگیہ کیوں کریں ——"

یہ کہہ کر سادھو جی خاموش ہو گئے۔ معتقدین نے فوراً یہ شور مچایا کہ سادھو جی یگیہ

کے لئے تیار ہو جائیں۔ جس طرح بھی ہوگا جیو ہتیا روک دی جائے گی۔ مجمع نے بلوائیوں کا رنگ اختیار کر لیا اور ہر شخص اس بات پر تل گیا کہ قربانی روک دی جائے۔ خواہ اس میں خون خرابہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہری ابتدا میں سادھو جی کی ناصحانہ تقریر سے متاثر ضرور ہو رہا تھا۔ لیکن جب انھوں نے جیو ہتیا کا مسئلہ چھیڑا اور جانوروں کی جان بچانے کے لئے انسانوں کے قتل و غارت کی طرف اشارہ کیا تو وہ گھبرایا اس نے لوگوں کو بہت سمجھایا کہ سادھو جی کی یہ رائے غلط ہے۔ "ہر آدمی اپنے کئے کا پھل پاتا ہے۔ جو بھلا کریگا بھلا پائے گا۔ جو بُرا کرے گا برا پائے گا۔ مسلمان کی گمراہی سے ہندو پر کوئی عذاب نہ آئے گا۔" لیکن مجمع مشتعل ہو چکا تھا اس کی باتیں نقارخانہ میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئیں۔

بقرعید کا دن تھا۔ مسلمان یگیہ کی تیاریوں سے آگاہ تھے۔ لیکن انھیں اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ تیاریاں ان کی بربادیوں کی تمہید ہیں۔ انھیں کسی بدگمانی کی کوئی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ اب تک آپس کے تعلقات نہایت ہی خوشگوار تھے۔ الغرض حالات سے غافل مسلمان تیوہار کی خوشیوں میں مصروف تھے آٹھ بجے صبح کا وقت تھا۔ لوگ حسب حیثیت اچھے لباس پہن کر نماز کے لئے عیدگاہ جا رہے تھے۔ ہری نے جب دیکھا کہ اب مجمع پر قابو پانا مشکل ہے۔ تو وہ بیحد متردد ہو گیا۔ تیزی سے نعیم کے پاس آیا اور تمام واقعات کی اسے خبر دی نعیم اور ہری نے ملکر دفاعی اور مصالحانہ تدبیر پر غور کرنا شروع کیا۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کیا کیا جائے۔ اگر صرف یگیہ کے وقت تک قربانی سے منع کیا جاتا تو خیر مسلمان کچھ ایثار کرتے۔ بقرعید کے دن کے بدلے۔ دوسرے یا تیسرے دن اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔ کیونکہ قربانی کے لئے تین دنوں کی اجازت ہے۔ لیکن یہاں حساب کچھ اور تھا۔ آخر کار صلاح ٹھہری کہ سب سے پہلے پولیس کو خبر دی جائے اور جہاں تک ممکن ہو سکے نعیم مسلمانوں کو اور ہری ہندوؤں کو سمجھائے۔ نعیم نے مسلمانوں کو اس پریشان کن خبر کی اطلاع اس وقت دی جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے نماز شروع ہو گئی پہلی رکعت ختم ہو چکی تھی کہ دور سے شور و غل کی آواز سنائی دی رفتہ رفتہ یہ آواز بڑھتی گئی یہاں تک کہ مسلمانوں نے جب سلام پھیرا تو مجمع مہابیر جی

کی جے کے نعرے لگاتا ہوا۔ مسجد کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہزاروں کا گروہ تھا۔ مسلمانوں کو عجب پریشانی کا سامنا تھا۔ بعض لوگ مسجد سے باہر آئے اور آرزو منت کر کے لوگوں کو سمجھانے لگے۔ جو سنجیدہ تھے وہ کچھ دھیمے ہو گئے۔ لیکن اتنے میں دو آدمیوں میں لاٹھی کا وار چل گیا۔ ہری اور نعیم بیچ میں آگئے۔ دونوں نے چوٹیں کھائیں۔ لیکن مشتعل مجمع میں جب وار چل جاتا ہے تو پھر آسانی سے کہاں رکتا ہے۔ الغرض فساد شروع ہو گیا۔ فریقین کے کافی آدمی مجروح ہو چکے تھے۔ کہ اتنے میں پولیس آگئی۔ اور کسی طرح مجمع منتشر ہوا۔ بلوائیوں کی ایک بڑی تعداد گرفتار ہو گئی۔ مجروحین پاس کے ایک اسپتال میں داخل کئے گئے۔ ہمالیہ باشی سادھو بھی گرفتار ہوئے۔

صبح سویرے تھانہ پر انگریز ایس پی تحقیقات کے لئے آئے سادھو جی سے انھوں نے تنہائی میں کچھ باتیں کیں۔ اور ان کا نام بلوائیوں کی فہرست سے کاٹ کر انھیں چھوڑ دیا۔ باقی ملزموں پر متعدد دفعات کے تحت فوجداری کی سنگین کارروائی شروع ہو گئی۔

لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ آخر سادھو جی کیوں چھوڑ دئے گئے۔ لیکن ایک وطن دوست نے انکشاف کیا کہ یہ حضرت بدیسی حکومت کے ایک ایجنٹ تھے جنہوں نے محض آپس کے تعلقات کو بگاڑنے کے لئے سادھو کا سوانگ بھرا تھا۔

لالہ جی اس واقعہ کے دوسرے ہی دن کاشی جی سے واپس آئے اس سانحہ کی خبر سے انھیں بہت دکھ ہوا، بالآخر انھیں کی کوشش سے، سارے مقدمات اٹھا لئے گئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصفیہ ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد لالہ جی کچھ زیادہ دن نہ بچے، لیکن جب تک زندہ رہے۔ جب کبھی انم ذات اور اچھوت یا ہندو مسلم کشیدگی کی خبر سنتے تو بیچین ہو جاتے اور حسرت سے کہتے کہ

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں

●

انمول

(شین ۔ مظفر پوری)

آسمان بپھرا ہوا تھا۔ زمین سہمی ہوئی تھی۔

کھیتوں کی سخت مٹی میں اس طرح دراڑیں پڑ گئی تھیں جیسے زمین آہیں بھر رہی ہو۔ دن کے سورج کے پاس شعلوں کی لپک کے سوا کچھ نہ تھا۔ رات کے تاروں کی آنکھوں میں شبنم کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ تپتی ہوئی زمین کی سانسوں کی گرمی بھاپ بن بن کر دراڑوں سے نکلتی رہتی۔ تالاب اور کنوؤں کی طرح کسانوں کے چہرے بھی سوکھ چکے تھے۔ گھر خالی اور کھیت ویران پڑے تھے۔ دلوں میں دہشت اور آنکھوں میں وحشت بھری تھی۔ برساتی ندیاں منھ پھاڑے ایک ایک بوند کو ترس رہی تھیں بعض پہاڑی ندیاں جل تھل ہو رہی تھیں مگر کسان ان کے پانی کو چلو میں اٹھا اٹھا کر کھیتوں کو سیراب نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ کھیتوں کی سطح ندیوں کے دھارے سے اتنی اونچی تھی کہ ان کے پانی کو کام میں لانا کسانوں کے بس میں نہیں تھا۔ 'سبز انقلاب' کی بشارت دینے والے سرکاری منصوبے ابھی کاغذ ہی پر سیاہ انقلاب برپا کئے ہوئے تھے۔ مایوس کسان ندیوں کے اونچے کناروں پر کھڑے ہو کر حسرت کی ایک نگاہ رواں دواں پانی پر ڈالتے اور دوسری نگاہ پیاسے کھیتوں پر، اور پھر بے بسی کی ایک نظر آسمان کی طرف اٹھاتے تو دل سے آہ نکل جاتی۔ انھوں نے اپنے ادھ مرے مویشیوں کو بھی کھونٹے سے آزاد کر دیا تھا، جو رات دن اِدھر اُدھر زمین چاٹتے پھرتے تھے۔

حکومت کی طفل تسلیوں کے باوجود قحط شروع ہو چکا تھا۔ کہیں فاقہ کشی اور کہیں نیم فاقہ کشی کا دَور دورہ تھا۔ ابھی مہاجن سے قرض اور بازار سے غلّہ مل رہا تھا ——— سونے کے مول ہی سہی۔ مگر جن کا سارا اثاثہ ختم ہو چکا تھا، ان کے لئے قحط ہی قحط تھا۔

ادھر اُدھر لوٹ مار کی واردا تیں بھی ہونے لگی تھیں بھیک منگوں کی تعداد کا کوئی شمار نہیں رہ گیا تھا۔ خودکشی اور فاقوں سے مرنے کی خبریں بھی آنے لگی تھیں۔ بھوکوں اور ننگوں کے قافلے دیہات سے شہروں کا رُخ کر رہے تھے۔ مگر سرکار ابھی اسی چھان بین اور بحث میں اُلجھی ہوئی تھی کہ قحط کا عالم ہے یا نہیں ہے۔ ریلیف کے ذرائع اور وسائل کا حساب لگانے کے لئے وہ ماہرین کی کمیٹیاں بنانے میں مشغول تھی۔ حکومت بار بار اعلان کر رہی تھی کہ ایک آدمی کو بھی بھوکا نہیں مرنے دیں گے اور جو لوگ فاقوں سے مر رہے تھے ان کے بارے میں سرکاری ماہرین سمجھا رہے تھے کہ وہ فلاں فلاں مرض سے مرے ہیں ریلیف کے بٹوارے کی زرخیز فصل کی آمد آمد پر ریلیف بانٹنے والے سرکاری عملے کے گھروں میں گھی کے چراغ جل اُٹھے تھے۔ غلّے کے بیوپاریوں کے چہرے کی سُرخی چمک اُٹھی تھی ـــــ مُنھ سے خون لگے انجینئروں اور ٹھیکے داروں کے دِلوں میں لڈّو پھوٹ رہے تھے۔ مایوسی اور موت کا سایہ صرف ان چہروں پر کانپ رہا تھا جو جمہوریت میں عوام اور بادشاہت میں رعایا کہے جاتے ہیں ـــــ وہ محنت کش لوگ جن کا پسینہ بادشاہت اور جمہوریت دونوں میں ٹکے سیر بکتا ہے۔ ان میں سے بہت سے احمق لوگ اس مسیحا کا انتظار کر رہے تھے جس کو ووٹ دے کر انھوں نے اسمبلی یا پارلیمنٹ میں بھیجا تھا۔

ایسے ہی حالات میں انوکھی کے باپ جمّن میاں نے جھٹ پٹ اس کی شادی کر دی۔ یہ بے وقت کی شہنائی گاؤں والوں کو کچھ بُری بھی لگی ـــــ مگر جمّن بیوقوف نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر کیا، اور ٹھیک ہی کیا، ورنہ اس کی بیٹی ابھی نہ جانے کب تک کنواری بیٹھی رہتی۔ کیوں کہ نہ نَو من تیل ہوتا نہ رادھا ناچتی۔ جمّن میاں نے دو باتیں سوچیں۔ ایک تو یہ کہ قحط کی آڑ میں کچھ خرچ کئے بغیر لڑکی کے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے دوسری یہ کہ قحط سالی میں ایک نفر کے خرچ سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔ گاؤں ہی کی تو بات تھی۔ لڑکی کو اس محلّے سے بس اس محلّے کو بھیج دینا تھا لڑکے والے بھی اس بات کو مان گئے۔

لیکن ایک ہی ہفتے بعد سُسرال والے انوکھی کو باپ کے ہاں دھر گئے۔ وجہ کچھ نہیں بتائی۔ ان لوگوں کو چُپ چاپ دیکھ کر جمّن میاں اور اس کی بیوی کو کچھ گڑ بڑ کا شک

گزرا۔ مگر انوکھی خوش تھی، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جمن میاں کو ایک اور پریشانی یہ تھی کہ گھر کا اثاثہ ختم ہوچکا تھا اور نیم فاقہ کشی کا دَور چل رہا تھا۔ چار نفر تو یوں ہی موجود تھے ـــــ میاں بیوی اور انوکھی سے چھوٹے دو بچے۔ اس پر اب پانچویں انوکھی بھی آمری تھی۔ بس کوئی دن جاتا تھا کہ چولھا نہ جلنے کی نوبت بھی آجائے۔

سرکاری ریلیف کی صرف خبریں مل رہی تھیں جو لوگ زیادہ نادار تھے وہ گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ گاؤں میں بکریاں اور مُرغیاں تک ختم ہوچکی تھیں۔ گایوں اور بھینسوں کے تھن سُوکھ گئے تھے ماؤں کے دودھ کے سوتے بھی خشک ہو رہے تھے ـــــ سوکھے سوکھے مریل بچے رو رو کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ماں باپ کا ناک میں دم کئے ہوئے تھے۔ ایسے میں انوکھی کے آمرنے سے جمن میاں کا حوصلہ اور بھی ٹوٹ گیا مگر جب سُسرال والے اس کو چُپ چاپ اس طرح سے ڈال گئے تھے تو بھگتنا ہی تھا پہلے دن سب چُپ چُپ رہے نہ کسی نے انوکھی سے کچھ پوچھا نہ کچھ کہا۔ دوسرے دن ایک بات کانوں کان انوکھی کی ماں تک بھی پہنچی۔ انوکھی کی ساس نے کسی عورت کو بتایا تھا کہ بہو پر جن کا سایہ ہے، اس جی کے جنجال کو تو رکھنے سے رہے۔ جہاں کی ہے وہیں کی ہوکر رہے گی اس بات پر بے چاری انوکھی کی ماں کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی، بات کچھ جی کو لگتی ہوئی تھی۔ انوکھی تھی بھی بلا کی خوب صورت انسان ہو یا جن، کسی کی بھی بُری نظر اس پر پڑ سکتی تھی جوان ہوئی تو اور بھی گلاب کے پھول کی طرح نکھر آئی کتنے ہی نوجوانوں کی بُری نظر اُٹھی، غریبی میں بھی ایسی نکھری رہتی کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہوجائے۔ پھر اگر کوئی عاشق مزاج جن بھی اس پر مرمٹا ہو تو کیا عجب۔ مگر شادی سے پہلے تو کبھی ایسی کوئی بات دیکھنے میں نہ آئی۔

رات کو ماں نے اکیلے میں انوکھی سے کچھ پوچھا اور جو کچھ انوکھی نے بتایا اس پر ماں کو اتنا غصّہ آیا کہ اس نے انوکھی کے تڑسے تھپیڑ جڑ دیا "مُردار! ارے دُنیا میں یہی ہوتا ہے، نامراد! ستیاناس ہو تیرا۔ ارے کُتیا وہ تو تیرا شوہر ہے نا۔ میاں بیوی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" ماں نے اور بھی بہت کچھ کہا۔ مگر انوکھی کچھ ایسے خیالوں میں کھو گئی کہ ماں کی باتوں پر

پورا دھیان نہ دے سکی۔ ماں کو یقین ہو گیا کہ جن وِن کا سایہ نہیں، بلکہ یہ تو لڑکی کے دماغ کی خرابی تھی۔ وہ پیچ و تاب کھاتی رہی اور انوکھی محسوس کرتی رہی کہ ضرور اس سے کوئی سنگین غلطی سرزد ہوئی تھی، ورنہ ماں کو اتنا غصہ ہرگز نہ آتا۔

ماں سوچنے لگی کہ داماد کو اپنے ہاں بُلا کر غلطی کی معافی تلافی کرا دے گی۔ اگر جمن میاں کو اس بات کا پتہ چل جاتا تو وہ جل بھن کر کباب ہو جاتا۔ وہ بے چارہ فکر سے یوں ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ کیوں کہ اس رات گھر کا چولھا ٹھنڈا پڑا تھا۔ اب ایک سوال یہ بھی تھا کہ اگر داماد کو گھر بُلایا گیا تو وہ کھائے گا کیا۔ ماں اندر ہی اندر بیٹی پر کُڑھتی رہی غضب کر دیا تھا اس انوکھی کی بچی نے۔

انوکھی واقعی بڑی انوکھی لڑکی تھی —— اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ کچھ مغرور بھی تھی۔ کسی لڑکے یا لڑکی کو خاطر میں لاتی ہی نہ تھی۔ اس کی نگاہ میں گاؤں کی کسی لڑکی کی کوئی قیمت تھی ہی نہیں —— اپنی جس بات پر انوکھی کو ناز تھا، وہ اس کے دل میں تھی۔ دراصل اس کو اپنی عصمت اور پاک دامنی کی خوشبو پر غرور تھا، کیوں کہ اس کے خیال میں گاؤں کی کسی کنواری لڑکی کے اندر یہ خوشبو باقی نہیں رہی تھی۔ سب کے بارے میں وہ کچھ نہ کچھ کچّی پکّی باتیں جانتی تھی۔ اس بات پر اس کا ایمان تھا کہ جس لڑکی میں عصمت کی خوشبو نہ ہو، وہ مٹی ہے۔ یہ خوشبو وہ صرف اپنے اندر پاتی تھی۔ اور اس خوشبو کی حفاظت وہ جان دے کر بھی کرنا چاہتی تھی۔ کتنے ہی لڑکوں نے اس پر ڈورے ڈالے محبت کی ایک نگاہ کے لئے کیا کیا جتن کئے، مگر بھلا وہ کہاں ناک پر مکھی بیٹھنے دیتی۔ پھر بھی دل ہی تو تھا۔ وہ بھی جوانی کے شہد میں ڈوبا ہوا دل کبھی کبھی کسی اچھے لڑکے پر اس کا اپنا دل بھی آیا۔ بلکہ ایک بار ایک لڑکا اس کو پسند آگیا تو اس پر اتنی سی مہربانی بھی کر گزری کہ ایک بار رات کے اندھیرے میں اس سے دھک دھک کرتے کلیجے کے ساتھ ملی اور اس کے پہلو میں بیٹھی بھی رہی۔ لیکن جب باتوں باتوں میں لڑکے کے ہاتھوں اور ہونٹوں نے شوخی کرنا چاہی تو وہ بدک اُٹھی اور اُچھل کر اس طرح الگ ہو گئی جیسے سانپ پر پاؤں پڑ گیا ہو۔ اپنے آپ پر وہ لعنت بھیجنے لگی —— کیا ایک ذرا سی حیوانی خواہش کی خاطر

وہ اپنا سب سے قیمتی جوہر قربان کر دے؟ پھر وہ کس بات پر اتنا ناز اور غرور کر سکے گی؟ پھر تو وہ بھی مٹی ہو جائے گی۔ اس کا غرور ایک نئی توانائی کے ساتھ اس پر غالب آ گیا۔ اپنے عاشق کو مایوس اور دل شکستہ چھوڑ کر کچھ کہے بغیر وہ گھر کی طرف بھاگ گئی۔ اس کے بعد لڑکے نے کبھی اس سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ کبھی سامنا ہوا بھی تو ایسی نظر سے دیکھ کر رہ گیا جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ انوکھی کو ایک آدھ بار اپنے مایوس اور دل شکستہ عاشق پر ترس بھی آیا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ اپنے غرور کو وہ کسی قیمت پر خاک میں نہیں ملا سکتی تھی۔ مگر اس بات کو سوچ سوچ کر وہ کبھی کبھی پریشان ہو جایا کرتی کہ آخر تو کوئی اس کو ہاتھ لگائے گا، کبھی تو اس کی شادی ہوگی۔ مگر پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتی کہ یہ کیا ضرور ہے کہ شادی میں وہ ایک بات نہ ہو تو میاں بیوی ہی نہ کہلائیں۔ دیکھا جائے گا۔

عصمت اور پاک دامنی کے اس انوکھے تصور کو سینے سے لگائے انوکھی اپنے اُجلے دامن پر فرشتوں کو نماز پڑھواتی رہی۔ آخر وہ رات بھی آ ہی گئی جب وہ اپنے آبگینہ کے ٹوٹنے کا خطرہ لئے سہاگ کے کمرے میں سہمی سہمی داخل ہوئی۔ دل میں ارمان تو بہت تھے مگر وہ اتنی بڑی قربانی دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ سہاگ کی سیج پر وہ شرم سے نہیں، بلکہ خطرے کے خوف سے جھجکتی رہی۔ جب دولھا کے ہاتھ اور ہونٹ اس کی طرف بیتابانہ بڑھے تو وہ اُلجھی ہوئی سانسوں کے ساتھ تڑپ کر بستر سے اس طرح الگ ہو گئی جیسے ننگے بدن پر چھپکلی گر گئی ہو۔ پھر ذرا ہی دیر میں ایسی دھینگا مشتی ہوئی جیسے کوئی غنڈا کسی سرکش لڑکی کی عصمت دری کرنے کے لئے وحشی بن چکا ہو۔ جب انوکھی کے کس بل ٹوٹ ٹوٹ گئے تو وہ رو پڑی۔ "نہیں ——— ہرگز نہیں ——— اگر تم نے نہیں چھوڑا تو شور مچا دونگی ——— شور مچا دوں گی۔"

آواز اتنی اونچی تھی کہ رات کے سناٹے میں بند کمرے سے باہر بھی سُنی جا سکتی تھی۔ جب شوہر کو ڈر لگا کہ یہ نامراد واقعی شور مچا کر ذلیل کر دے گی تو اس پر لعنت بھیج کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ انوکھی کو یہ سکون تو ہوا کہ بہت بڑا خطرہ ٹل گیا تو ساتھ ہی یہ احساس بھی ستانے لگا کہ جو کچھ ہوا، نہیں ہونا چاہئے تھا۔

بات اتنی نازک تھی کہ دولھا اتنی جلد کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ کافی دیر گذرنے پر وہ بوجھل قدموں اور لہولہان دل کے ساتھ کمرے میں واپس آگیا۔ پلنگ پر انوکھی، سہمی، دُبکی پڑی تھی۔ وہ ایک چٹائی ڈال کر الگ پڑ گیا۔ انوکھی نے پچھتاوے کے لہجے میں ہولے سے دولھا کو منانا چاہا" اے جی، وہاں کیوں لیٹ گئے ناراض ہوگئے کیا، بُرا مان گئے ہو؟"

دولھا کا جی چاہا کہ حرّافہ کے مُنھ پر جوتا مار دے وہ پھر پھسپھسائی "یہاں آجاؤ۔ بس شرط یہ ہے کہ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ میرا مطلب ہے ......"

اب تو دولھا کا جی چاہا کہ کمبخت کا ٹینٹوا ہی دبا دے۔

رات گزر گئی۔ نیند دونوں میں سے کسی کو نہ آئی۔ صبح کو دولھا کا مُنھ لٹکا ہوا اور دولھن کا جی ڈرا ہوا تھا۔ مگر گھر میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ دُلھن کی اسی طرح آؤ بھگت ہوتی رہی۔

دوسری رات پھر وہی ماجرا ہوا۔ انوکھی خاموش بے حس اور بے بس سی بنی رہی۔ اس نے شور مچانے کی دھمکی بھی نہیں دی۔ شاید اس کے اندر دُنیا کے دستور اور شوہر کے حق کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ مگر جب دولھا کے ہاتھ اور ہونٹ اس کی طرف بڑھے تو وہ رو پڑی، جیسے بکرا قصاب کی چُھری تلے آگیا ہو بڑی بیچارگی اور کرب کے ساتھ فریاد کرنے لگی۔ "اس طرح مجھے مٹّی کرنے سے اچھا تھا کہ تم مجھے ذبح ہی کر دیتے۔"

دولھا کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ اس نے کچھ کہے بغیر مُنھ پھیر کر کروٹ بدل لی۔

تیسری رات نہ دولھا نے کوئی پہل کی نہ انوکھی نے کوئی شہ دی۔ البتہ دونوں بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ضرور کرتے رہے۔ دولھا باتوں باتوں میں ٹٹولنے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر یہ راز کیا ہے۔ انوکھی بڑے فخر کے ساتھ اپنی عصمت کے آبگینہ کو مرتے دم تک بچائے رکھنے کے عہد کا ذکر کر کے داد لینے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک سوال کے جواب میں انوکھی نے کہا" جب کوئی مرد مجھے ہاتھ لگاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ میری روح نکل بھاگنے کے لئے حلق میں آگئی ہے۔"

دولھا چونک پڑا "کیا کہا؟ ___ کوئی مرد؟" اس نے "کوئی" پر خاص زور دیا "کیا پہلے بھی کبھی تمھارے ساتھ ایسا ہوا ہے؟"

"ہاں" انوکھی نے جھجکے بغیر کہا" صرف ایک بار۔ اس کے بعد میں مرد کے سائے سے بھی اس طرح ڈرنے لگی جیسے کوئی ڈاکو اور قاتل سے ڈرتا ہے۔"

انوکھی نے ایک لڑکے کے ساتھ اندھیری رات میں گزرا ہوا وہ واقعہ سُنا دیا۔ شوہر کے دل پر اور بھی چُھری چل گئی۔ اس معاملے میں مرد بہت زیادہ حساس اور شکّی ہوتا ہے اس کو یقین ہو گیا کہ انوکھی نے پوری بات میں سے کچھ حصّہ چُھپا بھی لیا ہے۔ جس عورت کا پہلے سے ہی عاشق موجود ہو اس کو بھلا شوہر سے کیوں دلچسپی ہونے لگی۔ مگر پھر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ اگر انوکھی کو کچھ چھپانا ہی ہوتا تو وہ اس واقعہ کا سرے سے ذکر ہی کیوں کرتی۔ کسی نے دیکھا سُنا تو تھا نہیں۔

اس نے محض کُریدنے کے لئے پوچھ لیا: "جب ایسا تھا تم نے شادی ہی کیوں کی؟"
انوکھی نے فوراً کہا "میں نے کب کی؟ وہ تو ماں باپ نے کر دی ہے۔ ویسے بھی مجھے ایک شوہر چاہیے ہر عورت کا ایک شوہر ہوتا ہے۔"

دولھا چڑ گیا۔ گویا انوکھی نے محض خانہ پُری کے لئے شادی کی تھی۔ بڑی کوفت کے ساتھ اُس نے پوچھا "لیکن شوہر اُلّو کا پٹھا کیا تمھارا اچار ڈالے گا؟"

"نہیں، شوہر تو مجھ پر فخر کرے گا کہ اُس کی بیوی کیسی اچھوتی اور انمول ہے۔"

دولھا کا جی چاہا کہ بدذات کا مُنھ نوچ لے بگڑ کر بولا "لعنت ہے ایسے اُلّو شوہر پر اور ہزار بار لعنت ہے ایسی پاک دامن بیوی پر۔ چُپ چاپ سو جاؤ۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو؟" انوکھی نے نرم ہو کر خوشامد شروع کی " میں تو تمھاری لونڈی ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اس صدمے سے میرا دم چھوٹ جائے تو یوں ہی سہی!"

دولہا ڈر گیا کہ کمبخت کہیں سچ مچ ہی نہ مرجائے۔ واہ ماں باپ نے بھی کیا خوب پھنسایا تھا! قسمت نے شاید ہی کسی سے ایسا سنگین مذاق کیا ہو۔

چوتھے دن دولہا نے اشاروں اشاروں میں انوکھی کے بارے میں اپنی ماں کو بتادیا۔ ساس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی مگر انوکھی کا تو اس قسم کے خیال ہی سے دل ڈوبنے لگتا تھا۔ بات بنی نہیں۔ دوتین دن کے اندر ہی ساس کو یقین کر لینا پڑا کہ بہو پر جن کا سایہ تھا جو اس کو مرد کی طرف سے بدکائے ہوا تھا۔ تھک ہار کر اس نے چپ چاپ اس کو میکے بھجوا دیا۔ لیکن انوکھی کی ماں نے اصل بھید معلوم کرکے سر پیٹ لیا۔ اس بے وقوف لڑکی نے ایسے قحط کے دور میں سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا تھا۔

انوکھی کی ماں دوسرے دن معافی تلافی کے لئے داماد کو گھر نہ بلوا سکی۔ دوپہر ہوتے ہوتے اس کے ذہن سے یہ بات ہی نکل گئی، کیوں کہ گھر کا چولھا رات ہی سے ٹھنڈا پڑا تھا۔ بچے بھوک سے بلکنے لگے تھے۔ جمن میاں بھنا بھنا کر بار بار گھر سے نکلتا اور پھر منھ لٹکائے واپس آجاتا— خالی ہاتھ چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئی۔

شام ہوئی۔ رات بھی گزر گئی۔ گاؤں میں دو موتیں فاقہ کشی سے ہو چکی تھیں۔ صبح ہوئی تو ایک گھر میں تیسری لاش بھی پائی گئی۔ کئی آدمی دم توڑنے کے قریب تھے۔ ان خبروں نے اور بھی ہوش اڑا دئے تھے۔ جمن میاں اور اس کی بیوی کے چہرے پر وحشت ناچنے لگی تھی۔ کبھی وہ بچوں کو دیکھتے، کبھی گھر کے در و دیوار اور ادھر ادھر لڑھکے ہوئے خالی برتنوں پر نظر پڑتی، کوئی مویشی بھی نہیں بچا تھا جس کو ذبح کر ڈالتے پانی پی پی کر کوئی کب تک جینے کا ڈھونگ رچائے اور بچے؟ —— ان بیچاروں نے تو مایوس ہو کر رونا اور بلکنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ سوکھے چہروں اور دھنسی دھنسی، خشک اور ویران آنکھوں میں موت کی ناچتی ہوئی پرچھائیاں لئے ٹکر ٹکر ماں باپ کو دیکھے جا رہے تھے۔ بھوک سے نڈھال تو میاں بیوی بھی ہو رہے تھے۔

پورے گاؤں میں یہاں سے وہاں تک ایک بھیانک سناٹا طاری تھا جیسے شام

کو کسی ویرانے میں قبرستان ہوا کرتا ہے۔ زندگی کے آثار ناپید تھے موت ہر طرف ننگی ناچتی پھر رہی تھی۔ کوئی چلتا پھرتا نظر بھی آجاتا تو ایسا لگتا کہ مُردہ چل رہا ہے۔

فاقہ کے تیسرے دن انوکھی پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ وہ کھُلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ اس کے پیارے پیارے بھائی بہن اس کے کلیجے کی ٹھنڈک لمحہ بہ لمحہ زندگی سے دُور اور موت سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ مہاجن نے اپنی ڈیوڑھی اور محلہ کے دُکاندار نے اپنی دُکان بند کر دی تھی۔ خوش حال لوگ لُوٹ مار کے ڈر سے اپنی اپنی حویلیوں میں بند ہوگئے تھے۔ قدرت اور حکومت دونوں نے غریبوں اور ناداروں کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ جنھیں جینے کا حوصلہ تھا وہ ریلیف کا انتظار کر رہے تھے جن کی اُمیدیں دم توڑ چکی تھیں وہ مرنے کی تمنا کر رہے تھے اور جنھیں جینا اور مرنا برابر کا مشکل نظر آتا تھا وہ شہر کی طرف بھاگنے لگے تھے —— اس اُمید میں کہ زندگی اور موت میں سے کوئی ایک چیز بھی انھیں کہیں جا کر مل جائے۔

یکایک مایوسی اور نا اُمیدی کے گھٹاٹوپ اندھیارے میں روشنی کی ایک مدھم سی کرن جھلملائی۔ انوکھی کے دل سے ایک آواز نکلی جس کی گونج اس کے دماغ کے گنبد میں بھر گئی۔ ایک نام —— سکندر، گاؤں کے خوش حال مودی کا لڑکا انوکھی کا وہ مایوس عاشق جس سے ایک بار رات کے اندھیرے میں وہ ملی تھی، اور جس کی تمنا کا خون کر کے اس نے فخر محسوس کیا تھا۔ اس کی یاد آتے ہی انوکھی کی آنکھوں میں زندگی کی رمق پیدا ہوگئی۔ بڑی دیر کی کشمکش کے بعد انوکھی نے جی کڑا کر کے ایک فیصلہ کر لیا —— ایک ایسا فیصلہ جسے کرتے ہوئے وہ کانپ کانپ گئی۔ مگر ماں باپ اور بھائی بہن کی جان بچانے کو وہ وہ سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔

دن ڈھل چکا تھا، مگر جھلسانے والی لُو ابھی تک چل رہی تھی۔ گھر میں سب ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے —— اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا —— لیکن انوکھی کو اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔ وہ چپکے سے گھر سے نکل کر سکندر کی دوکان کی طرف چل پڑی۔

سکندر کا مودی خانہ کئی دن سے بند پڑا تھا۔ دُکان کا مال گھر میں منتقل کر دیا گیا تھا تاکہ لُوٹنے والوں کے ہاتھ کچھ آ نہ سکے۔ انوکھی دُکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں، مگر کہیں کوئی نہ تھا۔ دُکان کے قریب ہی ایک اونچے گھورے پر ایک مُردہ کتا پڑا تھا جس کی سڑاند کبھی کبھی فضا میں بھبک اٹھتی تھی۔ پھر ایک طرف سے چند مریل آدمی ایک جنازہ اُٹھائے جاتے ہوئے دکھائی پڑے۔ مُردہ ویسے ہی میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ جنازہ گزر گیا تو پھر سناٹا ہو گیا

کافی دیر گزر جانے پر اکتاہٹ اور مایوسی کے عالم میں انوکھی لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ سکندر بغل میں سوکھی لکڑیوں کا چھوٹا سا گٹھر دبائے باہر سے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ آنکھیں چار ہوئیں تو انوکھی کے خشک، پپڑی جمے ہونٹوں نے مُسکرانے کی ایک مُردہ سی کوشش کی، دو تین دن کے فاقہ زدہ چہرے پر زندگی کی ایک ہلکی سی لہر تھرتھرائی اس مری مری مسکراہٹ کو انوکھی نے بار بار دُہرایا۔ جب سکندر بالکل قریب آگیا تو انوکھی کی آنکھیں خفت اور ندامت سے جُھک گئیں۔

سکندر نے نہایت روکھے پن سے گویا ڈپٹ کر پوچھا "کیا ہے؟"

انوکھی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ نہ جانے انوکھی کی خشک آنکھوں میں آنسو کہاں سے آگئے۔ زبان سے کچھ کہنے کی بجائے وہ سکندر کو اشارے سے بُلاتی ہوئی دیوار کی اوٹ میں چلی گئی، جہاں دو پچھواڑوں کی دیواروں کے درمیان گلی سی بن گئی تھی۔ سکندر لکڑی کا گٹھر دُکان کے اوسارے میں ڈال کر اس کے قریب گیا تو انوکھی سرک کر اس طرح اس کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی کہ وہ بوکھلا گیا۔

سکندر نے اسی روکھے پن سے مگر ذرا نرم آواز میں پوچھا "کہو کیا ہے؟"

انوکھی نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے کو اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے دباتے ہوئے گردن بڑھا کر جھجکتے جھجکتے کوئی بات سکندر کے کان میں کہی۔ سکندر کے چہرے کا رنگ یک دم بدل گیا، جیسے کوئی کڑوی کسیلی چیز حلق میں آگئی ہو۔ اس نے پوری سختی سے انکار کیا "نہیں، ہرگز نہیں۔ سودا کرنے آئی ہے، ذلیل کہیں کی! مجھے گاہک بنانے آئی ہے!

بے شرم!"

انوکھی اس کا مُنھ تکنے لگی۔ اسی لمحہ وہ واقعی خود کو ذلیل اور حقیر محسوس کر رہی تھی۔ ایک ایسی سستی اور بے کار چیز جو ایک مٹھی اناج کے عوض میں مہنگی ہو۔ ذرا دیر چُپ رہ کر سکندر نے پھر کہا "میں تیری خوشبو کا عاشق تھا، تیری لاش کا خریدار نہیں ہوں۔ آج ایک مٹھی اناج کے بدلے تجھے کوئی بھی ہاتھ لگا سکتا ہے۔"

کسی اور بات کا انتظار کیے بغیر سکندر وہاں سے چل دیا اور انوکھی ہکّا بکّا رہ گئی۔

ہاں وہ ایک لاش ہی تو تھی!

آدھی رات سے کچھ پہلے، جب کہیں سے کسی کُتّے کے رونے کی آواز آرہی تھی اور انوکھی کی ماں بچّوں کی جان بچانے کے لئے چاول کی بھوسی میں نمک ڈال کر اُبال رہی تھی تو کھلے دروازے سے ایک سایہ آنگن میں داخل ہوا۔ سب ڈر گئے، مگر سایہ فوراً ہی بول پڑا "میں سکندر ہوں جمّن چچا۔ لوگوں کی آنکھ بچا کر آیا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی سکندر نے ایک بھری ہوئی بوری سر سے اُتار کر زمین پر رکھی۔ "اس میں چاول اور آٹا ہے۔ کچھ اور سامان لے کر ابھی آتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا سکندر اُلٹے پاؤں باہر نکل گیا۔

انوکھی کے سوا کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جمّن میاں اور اس کی بیوی اس رحمت کے فرشتے کو دُعائیں دینے لگے۔ انوکھی اپنے مایوس عاشق کی چوٹ کی تاب نہ لا سکی وہ محسوس کرنے لگی جیسے اس کا سودا ہو چکا ہو اور وہ لُٹ چکی ہو، اس کو چاہے سکندر نے ہاتھ نہ لگایا ہو، مگر وہ تو مٹّی ہو ہی چکی تھی، اب کیا دھرا تھا اس کے پاس۔ رات کے سنّاٹے میں وہ اپنے مایوس شوہر کے گھر کی طرف چل پڑی۔

دُولنؔ بھابی

(ح ۔ م ۔ اسلم عظیم آبادی)

"میاں بندرے سے کام ہے —— ان کو جا کے بلا لاؤ ۔ ۔ ۔ ۔" پھر وہ لہجہ کی لذت میں ڈوبتے ہوئے ہی والہانہ یہ گیت گنگنانے لگا۔ چھوٹے سے کمرے میں اس کی باریک آواز کی بجتی ہوئی لطیف گونج اسے محسوس کرا رہی تھی کہ وہ بالکل عورتوں جیسا گا رہا تھا، درمیان میں رگھا رگھا کر ہوئے گیت کی لئے میں وہ ویسا ہی نغمہ پیدا کر رہا تھا۔ ٹائمس ویکلی سے پھاڑا ہوا ورق اس کے سامنے پڑا تھا اور وہ اس سے نکالی ہوئی تصویر کو تک رہا تھا۔ رسالہ کے صفحہ سے لال پیلی نیلی رنگوں والی تصویر اس نے بہت احتیاط سے نکالی تھی۔ یہ ایک حسین لڑکی کی پوری فوٹو تھی جو ساری کی جدید تر روش میں ملبوس، غالباً مشرقی حسن و وضع کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ دھانی رنگ پر گہرا فالسئی رنگ کا چوڑا حاشیہ لڑکی کے پیروں سے اوپر اٹھتا ہوا اس کے جسم پر ایک نیلے سانپ جیسا لپٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں شرگیں تھے اور یہ بڑی بڑی آنکھیں بڑی نزاکت سے آنچل کا ایک کونہ پکڑے زریں تک رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر تصویر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھالیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز بھی ذرا اونچی ہو گئی —— "ہاں ان کو ۔ ۔ ۔ ۔ جا کے ۔ ۔ ۔ ۔ بلا ۔ ۔ ۔ ۔ لاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ میاں بندرے سے کا ۔ ۔ ۔ ۔ م ہے، ان کو جا کے ۔ ۔ ۔ ۔" پورا گیت تو اس کو یاد نہ تھا اس لئے وہ صرف اس ٹکڑے کو بار بار طرح طرح سے گانے لگا۔ کبھی "کام" کو خوب کھینچتا اور کبھی "بلا لاؤ" کے درمیان ہلکا سا وقفہ دے کر "کام" رگھانے لگتا۔ اس طرح وہ پورے گیت کا مزہ لے رہا تھا۔ بہت ہی سرشار اور وارفتہ

ہو کر۔ اس کی مخلوط گویائی اور بصارت مشترکہ طور پر اس کے دل و دماغ میں ایک واحد اور مکمل تصویر قائم کر رہی تھی اور وہ تھی " دولن بھابی!" کی ——— " دولن بھابی" گاتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا " ٹھیک دولن بھابی کی فوٹو ہے یہ . . . . ویسا ہی چہرہ، اتنی ہی اونچی، ویسی ہی گلابی ناخن والی انگلیاں ——— خالی ایک بات، ایک بات نہیں ہے اس میں . . . . " اور پیش نگاہ تصویر سے علیٰحدہ ہوتے ہوئے اور اس رات کو یاد کرنے لگا۔ جب موم بتیوں کے دھندلکے میں اس کی دولن بھابی کو زیوروں اور پھولوں سے خوب سنوار بنا کر عورتیں انہیں ہولے ہولے چال چلا رہی تھیں ——— اس رات دولن بھابی کی پیشانی پر کیسے اچھے اچھے چاند تارے اور طرح طرح کے ٹیکے لگے تھے۔ گورے گورے چہرے پر ان کے سیاہ ہونٹ اور وہ چمک دار ٹیکے کتنے بھلے لگتے تھے۔ دولن بھابی سر جھکائے چپ چاپ بالکل آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ اور موم بتی کی روشنی میں گوٹوں سے کیسی کیسی روشنی نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی چوڑی بلند پیشانی پر خالی تارے ہی لگے ہیں، ننھے ننھے تارے جو بالکل آسمانی ستاروں جیسا جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چھوٹی آپا۔ بھن جان، ممی جان اور عمرانہ باجی اور بڑی پھوپی اور خالہ جان اور گھر کی سب لوگ دولن بھابی کے دونوں جانب ہاتھوں میں لانبی لانبی اصلی موم بتیاں لئے تھیں اور ان کی ہلکی ہلکی روشنی میں دولن بھابی اتنے سارے ڈھیر سے گہنے اور پھولوں کا زیور پہنے بالکل خالدہ کی گڑیا معلوم ہو رہی تھیں! ——— اپنے ہاتھ کی تصویر اسے ایک دم چوتھی کی دولن بھابی نظر آ رہی تھی ——— اس کی نگاہیں تصویر پر گڑی تھیں اور تصور میں کھویا وہ چال چلانے والا گیت گا گا کر اس رات کے منظر کو دیکھتا ہوا انتہائی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ " جوڑا لال پہنے ان کو جا ...... کے ...... بلا لاؤ .... " لال جوڑا کہتے ہی اس کو یکایک خیال ہوا کہ تصویر میں ساری کا رنگ تو دولن بھابی کی ساری جیسا نہ تھا۔ ان کی ساری تو حیدر بھیا کے ہاف پینٹ جیسی بالکل نیلی تھی۔ جس پر بڑے بڑے چوڑے چکلے بہت سے چمکیلے پتے بنے تھے۔ ساری سے بہت اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ جس کی مہک بھی ان کے ہاتھوں کی مہندی جیسی تھی۔ گاتے

نگا نے لمحہ بھر کے لئے پھر وہ یکایک رُک گیا اور زور کی ایک سانس لے کر منہ میں زبان کو پھیرتے ہوئے پھر گنگنانے لگا۔ مگر اس بار اس کی آواز اُبھر نہ سکی۔ جیسے اس کی گویائی تصور میں ڈوب گئی ہو اور ساری توجہ باصرہ سے ہمکنار ہو رہی ہو۔ وہ پھر سوچنے لگا۔

"دولن بھابی۔ رات آپ کا پیر خوب دُکھا ہوگا" دوسرے دن جب صبح سویرے وہ ان کے کمرے میں گیا تھا تو اس نے دولن بھابی سے یہی پوچھا تھا "کتنی دیر میں آپ اُسارے سے اپنے کمرے میں گئیں؟" تصویر گرچہ اب تک ویسی ہی اس کے ہاتھوں میں اس کی نگاہوں سے لگی تھی، مگر دور ذہن میں وہ ایک دوسری تصویر دیکھ رہا تھا اور چپ دم بخود اس میں مزہ لے رہا تھا۔

"ہاں ننھے بھائی! تمام رات پیر میں درد رہا" انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ پھر یہ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے مہندی لگے ہاتھوں سے اس کے دونوں رُخساروں کو چومتی ہوئی بولی تھیں "اور تم ذرا پوچھنے بھی نہ آئے۔ آئیں ننھے؟"

اس وقت دولن بھابی کے بازوؤں کی پُرکیف خوشبو اور ان کے ہاتھوں کی نرم و سرد لمس سے کچھ دیر کے لئے اس کی عجیب طرح کی کیفیت ہو گئی تھی۔ وہ ادھ کھلے ہونٹوں سے دولن بھابی کے چہرے پر پانی کے ان چھوٹے چھوٹے قطروں کو دیکھنے لگا تھا، جو آہستہ آہستہ ان کے گورے چہرے سے سرکتے ہوئے ان کے پیازی شلوکے پر گر رہے تھے۔ دولن بھابی فوراً ہی مُنہ ہاتھ دھوکر واپس آئی تھیں اور اب ان کی پیشانی پر رات والے چاند تارے موجود نہ تھے۔ دُھلے ہوئے خوبصورت چہرے پر یہ بوندیں اسے بے حد پیاری لگ رہی تھیں اور وہ انھیں غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بھابی جان کے ہاتھ جب اس کے رُخساروں سے الگ ہوگئے تھے، ننھے قطرے چہرے سے ٹوٹ چکے تھے اور ان کے ہاتھوں کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اس کے کانوں سے آ لگی تھی تو اس نے کہا تھا "جی اور بھیّا جان جو تھے" یہ دولن بھابی کی شکایت کا جواب تھا اور اس کی اپنی شکایتیں بھی "ہاں تمہارے بھیّا جان تو تمام دن یہاں گھسے رہتے ہیں" یہ

کہتے ہوئے دولن بھابی کا چہرہ ہلکا سا گلابی ہو گیا تھا۔ جیسے ننھے کی آنکھوں نے خود بھی دیکھ لیا تھا یہ بالکل چپ ہو گیا تھا کہ اس کا کیا جواب دے۔ دولن بھابی ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔ بھیا جان سچ مچ بہت دیر تک ان کے کمرے میں رہتے تھے کبھی مسہری پر لیٹے ہوتے اور پاس ہی دولن بھابی مسکراتی رہتیں لیٹے ہوئے بھیا جان کی آنکھیں دولن بھابی کے چہرے سے اس طرح لگی رہتیں جیسے رجو ماموں کیرم کھیلتے ہوئے اکثر بورڈ پر لال رنگ والی گوٹی کو دیکھا کرتے ـــــ کبھی بھیا جان کمرے میں ان چیزوں کو درست کرتے ہوتے جنھیں ان کے جانے کے بعد بہن جان، عمرانہ باجی اور چھوٹی آپا وغیرہ خواہ مخواہ اُٹھا کر اِدھر سے اُدھر رکھ دیا کرتیں مثلاً سنگار میز پر انڈہ جیسی ترشی ہوئی سنہرے فریم والی تصویر جسے یہ ہمیشہ تھوڑا کج کرکے گلدان کے نزدیک رکھتے یا پھر مسہری کے پاس جو ایک چھوٹا سا ٹیبل تھا ـــــ اس پر اچھی اچھی جلد والی کئی کتابیں قرینہ سے سجی ہوئی رکھی ہوتیں۔ انھیں عمرانہ باجی اور بہن جان ہمیشہ اُٹھا اُٹھا کر ایک ذرا دیکھتیں اور پھر اِدھر اُدھر ڈال دیتیں۔ جب بھیا جان کمرے میں واپس آتے تو ان گری پڑی اونچی نیچی کتابوں اور بے قرینہ رکھی ہوئی تصویر کو دیکھ کر تھوڑا غصہ ہو جاتے۔ اور خفا ہو کر کچھ بولتے جاتے اور پھر انھیں ٹھیک کرنے لگتے۔ پر ایسا کم ہوتا تھا، اکثر ہا اس نے دیکھا تھا کہ بھیا جان اس کی دولن بھابی کے پاس بیٹھے ہوتے اور بہت ہی مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ یہ اتنی ہی میٹھی، اتنی ہی ملائم اور اتنی ہی پیار بھرے انداز میں آرزو کی ماں بھی کھیلتی شاہینہ سے اسی طرح کی باتیں کرتیں پر آرزو کی ماں کی باتیں تو بس ایک ہی طرح کی ہوتی تھیں "میری سونا ہے ...... کہ ہیرا ہے ......کہ چاند ہے ......کہ جگنو ہے ...... کہ ......" اسے کبھی حیرت بھی ہوتی کہ اتنی بڑی شاہینہ چاند یا جگنو کیونکر ہو سکتی ہے۔ جگنو تو اس نے دیکھا ہی نہ تھا، پر شاہینہ اس کے سامنے چاند جیسی کبھی اونچی یا چمکیلی نظر نہ آتی تھی۔ اور سوچتے سوچتے جب آرزو کی ماں کی یہ مکرر آوازیں پھر اس کانوں میں آتیں تو وہ اندر ہی اندر ان کی اس بے مطلب بات پر بگڑ جاتا۔

"ایک دم طوطا ہیں یہ طوطا۔ خالی ایک بات بکتی رہتی ہیں"، غصہ میں وہ اتنا کہتا ہوا ادھر سے گذر جاتا پر بھیّا جان کی باتیں؟ — ؟ اس نے ایک بار ان کو سمجھنے کی کوشش کی تو ان ڈھیر سی میٹھی نرم اور پیار بھری باتوں میں اس کو صرف یہ چند الفاظ سمجھ میں آئے — خوبصورت آنکھیں ...... ترشے ہوئے لب ...."

دولن بھابی بھیّا جان کی ان باتوں سے کبھی تو بالکل شرما جاتیں اور کبھی جواب میں صرف ایک دو لفظ بول دیتیں اور اس پر بھیّا جان جلدی سے دو انگلیوں سے ان کی ٹھڈی پکڑ لیتے اور دولن بھابی کا ہلکا سا ایک پیار کر لیتے! — ننھے کو یکایک سہری سی لگی اور اس نے جلدی سے مُنھ کا لعاب سانس کے ساتھ پی لیا پھر وہ یکایک اس تصویر کو فرش کی دری کے نیچے چھپا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

سامنے صحن سے گذر کر امرود کے درخت کے پاس دولن بھابی کا کمرہ اس وقت بھی بند تھا۔ گویا اب بھی بھیّا جان موجود تھے۔ ان کے کمرے کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے اس نے صحن میں ایک غیر ارادی چکّر لگا کر دالان کا رُخ کیا، جہاں بہت سے لوگ تھے۔ اُسے خود بھی خیال نہ تھا کہ وہ وہاں کیوں جا رہا ہے۔ دالان میں عمرانہ باجی، ممی جان، بہن جان، فہمیدہ اور چند دوسری لڑکیاں اور عورتیں سوئی پڑی تھیں۔ ممی جان اور عمرانہ باجی سبھوں سے الگ شیشے والی الماری کے پاس ایک پلنگ پر لیٹی تھیں۔ یہ آپس میں اس طرح بات چیت کر رہی تھیں، جیسے یہ ہنیا سے اس وقت کیا کرتا جب ہنیا اس کے ساتھ والے کھیل میں شریک نہ ہوتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی اس کے ساتھ کھیلتی اور ہنیا "نا ننھے میاں" بڑی دُلہن بگڑیں گی — تب کہہ کر خواہ مخواہ نا رضامندی کا اظہار کر دیتی۔ وہ ہنیا کو طرح طرح سے بہلا پھُسلا کر آمادہ کرتا "اچھا بھائی نہیں تے" پہلے وہ عاجزی سے رس بھرے لہجہ میں کہتا۔ ہنیا اسے دیکھنے لگی۔ "جاؤ ہنیا تو ہم بھی تم سے نا بولے ہیں"۔ نہ بولے جانے کا خیال ہنیا کو تیار کرا ہی دیتا۔ کیونکہ جس دن ہنیا نہ بولے جانے کا خیال دلانے کے باوجود کسی کھیل میں شرکت نہ کرتی اس دن کا اس کا بہت نقصان ہوتا، مثلاً اس دن شام کو نہ چپکے سے اسے ننھے میاں کے

ناشتے کے جیم لگے ہوئے بسکٹ ملتے اور نہ اس مٹھائی کا ٹکڑا ملتا جس کا شکر لگا ہوا ناریل چاکلیٹ جیسا مزیدار ہوتا تھا۔ وہ چیزیں یاد آتے ہی کچھ دیر بعد ہینا من جاتی اور ان کا وہی پرانا کھیل شروع ہو جاتا۔ ہینا سگریٹ کے خالی ڈبہ میں چپ چاپ سے پانی بھر لاتی۔ یہ سرکی کے ٹوٹے قلم سے مٹی کوڑ کوڑ کر جمع کرتا۔ آنکھیں بچا کر صحن باغ سے مالتی، صنوبر اور جوہی کی ننھی ننھی ڈالیاں توڑی جاتیں، ردی ٹوکری سے پھٹے ہوئے پوسٹ کارڈ اور موٹے کاغذ ڈھونڈے جاتے اور دونوں دوپہر کو گھر کے کسی گوشہ میں مکان، باغ اور تالاب کی تعمیر میں منہمک ہو جاتے۔ نقشہ بنتا، دیواریں اُٹھتیں، چھاؤنی ہوتی اور اگر بڑی بھابی یا آرزو کی ماں کی نظر ان کی اس خاموش پُر سکون سُکھ بھری زندگی پر پڑ جاتی تو بے فکر زندگی کے باقی کھیل وہیں ختم ہو جاتے۔ ورنہ پھر گھر دروازہ کی تعمیر کے بعد ہینا کو کوٹھیا ٹھکرے اور دوسرے لوازمات دے کر گھر سے وابستہ کر دیا جاتا۔ ننھا پپیتا کی سوکھی ڈنٹھل اپنے ہاتھ میں لے کر ٹھکری کے گول گول بنائے ہوئے چند پیسے اوپر والی چھوٹی سی جیب میں بھر کر پیٹ کی فکر میں باہر نکل جاتا۔ چیزیں آتیں، سودے آتے، کھانا پکتا۔ دونوں اکٹھے ہوتے، کھاتے اور نرم نرم سرگوشیاں شروع ہو جاتیں —— بالکل اسی طرح کی سرگوشیاں ممی جان اور عمرانہ باجی میں ہو رہی تھیں۔ "توبہ بڑی گندی ہیں آپ۔" عمرانہ باجی نے مسکرا کر مُنھ پھیر لیا۔ "اللہ رے" ممی جان نے کہا "اچھا ہم بھی دیکھیں گے۔" ننھا کھڑا ان کی باتیں سُنتا رہا۔

"اچھا دیکھئے گا نا" عمرانہ باجی نے جواب دیا۔ پھر یہ اسے دیکھ کر بولیں "ننھے میاں کل تمھاری دولہن بھابی اپنے گھر جا رہی ہیں" —— "ہش" عمرانہ باجی کی یہ بات اس وقت اس کو ذرا بھی اچھی نہ لگی۔ انھوں نے کیوں کہا۔ کون سی اچھی بات تھی یہ! ایسی ہی باتوں سے تو وہ بھابی جان سے بگڑا رہتا ہے۔ بھیّا جان کی شادی میں جب بھی کے لئے نئے نئے کپڑے اور جوتے آ رہے تھے تو اماں کے پاس بیٹھی ہوئی بڑی بھابی نے اس سے کہا تھا "ننھے میاں، انعام کی شادی میں تمھارے لئے

جوتہ اور کپڑا نہ آئے گا۔"

اس وقت بھابی جان کی یہ بات اس کو کتنی بُری لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انعام بھیا خود ہی اس کی قمیص کے لئے مہین مہین سوراخوں والا زرد کپڑا خرید کر لا چکے ہیں اور ابّا نے اسے وہ جوتا لا دینے کا وعدہ کر دیا تھا، جس کی ننھی سی گول کڑی کھینچتے ہی جوتے میں دانتوں جیسی لوہے کی سلائیاں لگ جاتی تھیں۔ پھر خواہ مخواہ ان کو یہ بات بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس وقت اس کے جی میں آیا تھا کہ وہ بھابی جان کا خوب زور سے مُنھ چڑھا کر بھاگ جائے۔ اب یہ عمرانہ باجی کی بات...... سچ مچ بالکل چڑھانے والی ہی تو تھی یہ اس نے سوچا۔

ان کی بات سُنی ان سُنی کرتا ہوا وہ دالان میں دو چار قدم یوں ہی گھومنے لگا۔ فرش پر سوئی ہوئی عفت کی ناک میں سُرخ رنگ کا بیسر دیکھ دیکھ کر اس کو دولن بھابی کی وہ انگوٹھیاں یاد آئیں۔ جن پر سُرخ اور نیلا چمکدار پالش لگا تھا اور جن کے ہر طرف ننھی ننھی گول گول کڑیاں تھیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے گھنگھروں پروئے تھے۔ دولن بھابی کے ہاتھ ہلتے اور انگوٹھیوں سے پیاری پیاری "جھن جھن" کی آوازیں نکلتی ایک بار جب وہ دولن بھابی کے کمرے میں گیا تھا تو ان کے تمام زیورات چھاپی تکیہ کے پاس رکھے تھے، وہ انگوٹھیاں بھی اسی جگہ تھیں۔ اس نے ایک انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہلا ہلا کر خوب بجایا تھا۔ پھر جب دولن بھابی دوسرے کمرے سے مُنھ دھو کر رو پہلے چاندوں والی عنابی ساری پہن کر آئی تھیں تو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنا دی تھی۔ اتنی سی انگلی میں ان کی انگوٹھی اسے بالکل ڈھیلی ہو رہی تھی۔ دولن بھابی نے اُسے دیکھتے ہوئے ایکبارگی زور سے اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی اُنگلیوں کو چوم لیا تھا۔ "میرا پیارا ننھا بھائی"۔ انھوں نے کہا تھا "کتنا میٹھا پیارا ہے" اور اس وقت اس کے گال کا ایک ننھا سا پیار بھی لے لیا تھا انھوں نے...... اس واقعہ کی یاد کے ساتھ اسے بڑی بے اطمینانی محسوس ہوئی اور اپنے ماتھے کو ہاتھوں سے پوچھتے ہوئے وہ ان لوگوں کی بات چیت میں شریک ہوئے بغیر

دالان سے خاموش باہر نکل آیا۔

دوسرے کمرے میں بڑے بڑے صندوقوں کے پاس جہاں نعمت خانہ میں دادی اماں کا بونٹ پھولا کرتا تھا، شاہینہ مہین جال والے سبز ٹاپے میں سو رہی تھی۔ بڑی بھابی کی یہ چھوٹی سی بچی اس کو بڑی محبوب تھی۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا اور اس کی لامعلوم مسرتوں اور کھلونوں میں بے تکلف شریک ہو جاتا۔ پر آرزو کی ماں جس کی صورت اس کو سب سے خراب اور گندی لگتی تھی، ہمیشہ اُسے ان مواقع سے ڈانٹ کر الگ کر دیتیں اور اسی وجہ سے وہ ان سے بالکل نفرت کرتا تھا۔ "بس اے میاں تو" وہ اسے دیکھتے ہی ہر ایک سے اس کی جھوٹی شکایت کرنے لگتیں۔ "سوتے لڑکے کا مُنھ چوما نہ باپ خوش نہ ماں خوش" حالانکہ اس نے کبھی بھی سوئی یا چپ شاہینہ کو جان کر نہ رُلایا تھا۔ اس کا پیار ایسا تھا ہی نہیں۔ وہ تو صرف جُھک کر بہت آہستہ سے شاہینہ کے ملائم رُخساروں کو گردن ہلا ہلا کر اپنے نتھنوں سے سونگھا کرتا۔ جب اس کے نتھنے اور شاہینہ کے رُخسار آپس میں خوب سٹ جاتے تو اس کو بڑا اچھا معلوم ہوتا اور اسی کیف پرور لذت سے سرشار وہ اپنی گردن کو اور بھی ہلانے لگتا۔ بس یہی اس کا پیار تھا۔ نہ اس میں شاہینہ کے گلے پر تھوک لگتے اور نہ دانت کے نشان اُگتے۔ ہاں جب اس کا پیار ختم ہو جاتا تو اس جگہ شاہینہ کے نرم گالوں پر اسے ہلکی ہلکی سی لالی نظر آتی، جسے وہ آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے چھو کر مٹانے کی کوشش کرتا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے شاہینہ کے رُخسار کے وہ ننھے ننھے سُنہرے بال دکھائی دیتے جو اتنے نرم ہوتے کہ اس کا جی چاہتا کہ وہ انھیں بس چھوتا ہی رہے۔ اب چپ شاہینہ نہ جانے کیوں آہستہ آہستہ مُنھ بلکا کر رونا شروع کر دیتی۔ آرزو کی ماں دور ہی سے شور مچاتیں بڑی بھابی فوراً ہی ڈانٹتیں۔ اس وقت ان کا چہرہ اچھا نہ ہوتا، اور تب گوشمالی کے خوف سے اُداس دل کے ساتھ ہلکی چالوں سے یہ فوراً وہاں سے کھسک آتا ——— بھابی جان سے اس کی بیزاری کی یہ بھی ایک معقول وجہ تھی۔ ان کا خواہ مخواہ اسے تنگ کرنا اور شاہینہ کے پاس

جانے سے روکنا، ان دونوں باتوں کی وجہ سے بھابی جان اس کو اتنی اچھی نہ لگتی تھیں۔ سبز ٹاپے کی چھت سے لٹکتی ہوئی کپڑے اور روئی کی رنگ برنگ چڑیاں ساکت تھیں۔ اس کے جی میں آیا کہ ٹاپہ کو اُٹھا کر ذرا شاہینہ کو دیکھ لے، ٹاپہ ہلنے سے چڑیاں بھی ہلنے لگیں گی اور وہ شاہینہ کا پیار بھی کرے گا۔ پر شاہینہ کے پاس ہی چھوٹے سے کھٹولا پر پھیلی ہوئی سوئی آرزو کی ماں دکھائی دیں، اور وہ ہچکچا گیا۔ دو چار قدم چل کر اس کے پیر رُک گئے، اس نے شاہینہ کو دیکھا پھر اپنی پیشانی کے زیریں حصہ اور ناک کو سکیڑتا ہوا وہ اس جگہ سے واپس مُڑ گیا۔

اب آخر وہ کہاں جائے۔ کیا کرے۔ یوں ہی چلتے چلتے وہ سوچنے لگا۔ "دولن بھابی صبح کو اپنے گھر چلی جائے گی" عمرانہ باجی کی بات اسے یاد آگئی اور دولن بھابی کے چلے جانے کا خیال اُبھر گیا —— بیچاری دولن بھابی —— کتنا جلدی چلی جائے گی یہ —— پہلے آئی تھیں تو اتنا جلدی چلی گئیں۔ پھر اتنا دن بعد آئیں تو پھر چلی گئیں .... یہ جانا آنا کا ہے ہے۔ بڑی بھابی تو یہاں کتنا سا دن تک برابر رہتی ہیں .... پھر دولن بھابی اِتنا جلد کیوں چلی جائیں گی —— دولن بھابی کا جلد چلا جانا اور بڑی بھابی کے بہت دن رہنے کا مسئلہ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا۔ وہ جتنا اس بات پر غور کرتا اسی قدر اس ابہام پر اس کا غصہ بڑھنے لگتا —— اور ان کو کوئی آدمی روکتا بھی نہیں —— یہ سوچ کر اسے اور پریشانی ہو رہی تھی —— پہلی بار جب جانے لگیں تو بھی کسی نے کچھ نہ کہا اور آج بھی اِتنا جلدی جا رہی ہیں اور کوئی منع نہیں کرتا —— اس کا چھوٹا سا جوتا زمین پر بے انداز قدموں کے ساتھ اب قدرے وزن سمیت پڑ رہا تھا، جیسے وہ بہت غصہ میں تمام لال چیونٹیوں کو پیروں سے مسل مسل کر مار رہا ہو، گویا اس نے ان کا کچھ بگاڑا بھی نہ ہو اور انھوں نے اس کی پھلّی یا گردن میں چمٹ کر بلا قصور بہت زور سے کاٹ لیا ہو، بالکل ویسے ہی بھاری مسلتی ہوئی چالوں سے گھر میں کسی کے دولن بھابی کو نہ روکنے پر بگڑتا ہوا وہ اٹ پٹا تنگ چل رہا تھا —— پھوپھی اماں دولن بھابی

کے جانے کے بعد ہی جا رہی تھیں تو سب لوگوں نے ان کو روکا تھا۔ امّاں، بڑی بوبو، ممی جان، خالہ اماں، چھوٹی باجی، بھابی جان تمام نے ان کو کتنا روکا تھا۔ اماں نے کہا تھا کہ آخر ایسا بھی کیا آنا۔ اگر جانا ضروری ہی ہے تو دولہن کی چوتھی کے بعد چلی جانا.... اور کتنی طرح سے پھوپی اماں کو سب لوگوں نے روکا تھا......

پر دولن بھابی......؟ دولن بھابی کو لوگ کیوں نہیں روکتے؟ اس کے دل نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"شبراتن؟ شبراتن؟" تونت کے نیچے ٹنگے ہوئے طوطا نے کہا ــــــ "بول، کا ـــــ شبراتن؟ ـــــ شبراتن؟؟ ـــــ کا" دادی اماں کے بعد گھر میں طوطا کا یہی سب سے زیادہ خیال کرتا تھا جس دن دادی اماں کے بار بار آواز دینے کے بعد بھی شبراتن طوطا کو یونٹ دینا بھول جاتی تو یاد آتے ہی یہ خود نعمت خانہ سے یونٹ کی چھوٹی ٹوکری لانے دوڑ جاتا۔ ہر روز دادی اماں کے لئے پھلائے ہوئے یونٹ تر کپڑے سے ڈھانک کر ٹوکری میں رکھ دیئے جاتے۔ دوسرے یا تیسرے دن بونٹوں سے انکرا پھوٹ جاتا اور دادی اماں بڑے بڑے انکرے والے بونٹ ہر دن ناشتہ میں کھایا کرتیں۔ یہ ٹوکری لاکر دادی اماں کو 'دے دیتا'، اور خود فرش کے نیچے سے وہ مچیا اُٹھا لاتا، جس پر بیٹھ کر دادی اماں وضو بنایا کرتی تھیں۔ مچیا بہت چھوٹی سی تھی اور اس کے گھٹنوں اتنا اونچی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے مچیا اُٹھاتے ہوئے یہ اُسے لے جاکر تونت کے نیچے رکھ دیتا۔ پھر دوڑ کر دادی اماں کے نکالے ہوئے بونٹ اپنی مٹھی میں لے آتا اور مچیا پر چڑھ کر اطمینان سے مٹھی کا سارا بونٹ طوطا کی کٹوری میں ڈال دیتا۔ اس کے پنجڑے میں ہاتھ ڈالتے ہی طوطا اپنے دیدے بدلتے ہوئے پیالی کے پاس چلا آتا۔ پنجڑے میں اگرچہ ننھی کی انگلیاں اس کی چونچ کے پاس ہی ہوتیں۔ مگر طوطا کبھی ان پر حملہ نہ کرتا۔ اسی طرح طوطا کو ناشتہ یا کھانا اسی کے ہاتھوں ملا کرتا۔ طوطا اس سے بہت مانوس ہوگیا تھا۔ جب یہ اسے بولنے کو کہتا طوطا کچھ نہ بولتا صرف بہت خاموشی سے اس کی

باتیں سنتا رہتا۔ پھر اس کے جاتے ہی فوراً کہتا —— "شبراتن؟ —— شبراتن؟؟ —— کا! "بول —— شبراتن" اور دور کھڑا ہوا ننھا مسرت سے طوطا کی بات سنتا رہتا۔ طوطا نے اس کے علاوہ اور کچھ بولنا نہ سیکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھی گھر کی مرغیوں کی طرح عجیب عجیب قسم کی آوازیں نکالتا رہتا۔ ننھا کو اس کی بولی سے زیادہ اس کی یہ آوازیں پسند تھیں، وہ بہت نہال ہوکر اسے سننے لگتا۔ طوطا نے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر پھر پکارا "شبراتن؟ —— شبراتن؟؟ —— کا! بول کا" ننھا نے اس کے پنجڑے پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

"کل دولہن بھابی چلی جائیں گی" دولہن بھابی کے چلے جانے کا احساس اور کسی کے ان کو نہ روکنے کا خیال اسے متفکر بنائے ہوئے تھا۔ اس وقت تصورات میں کھویا، دولہن بھابی کی پیار بھری نرم میٹھی باتوں کے پرہیجانی خیالات میں پریشان وہ اپنے سے بے خبر اور اپنی دلچسپیوں سے بے خبر بالکل بے ارادہ اور بے تھاہ ہو رہا تھا۔ نئی نئی دولہن بھابی جو اتنی بڑی ہونے کے باوجود بہت آدرمان سے اس کی ساتھی ہوگئی تھیں، اس کو طرح طرح سے بلایا کرتی تھیں۔ اس کی ننھی ننھی ادھ کہی باتیں سن کر گود میں لے کر اس کا پیار کرلیتیں، اس کی محبوب ترین چیز ہو رہی تھیں۔ ان کا بناپن، ان کا دُلار اور ان کا پیار ننھے کی زندگی میں سب سے اچھی سب سے عزیز اور سب سے محبوب بات تھی۔ اماں کے پیار سے بھی زیادہ اچھی، ہینا کے کھیلوں سے بھی زیادہ عزیز اور طوطا کی بولیوں سے بھی زیادہ محبوب۔ اس کے بیشتر گھنٹے بلکہ تمام دن دولہن بھابی کے پاس گزرا کرتے تھے۔ ان پانچ چھ دنوں میں ہینا کے ساتھ کھیلنا تو جیسے وہ بالکل ہی بھول چکا تھا، کیونکہ اب دادی اماں کے متواتر کہنے پر طوطا کو اس کے ہاتھوں سے بوٹنٹ ملتے تھے۔ ہاں شاہینہ کو پیار کرنا اس سے ہنوز نہ بھولا گیا تھا ممکن ہے یہ محض اس وجہ سے اب تک اس کے شعور میں محفوظ تھا کہ جب دولہن بھابی کا کمرہ بند ہوتا تو اس وقت بند کواڑ اور در سے لگے ہوئے پردے دیکھ کر برآمدے سے واپس پھرتے ہوئے اس کو ہلکا سا ملال ہوتا، اس کے

دل میں کسک ہوتی اور منہ بنا کر وہ دانستہ شاہینہ کی طرف رُخ کرتا۔ شادی کے ہنگامہ کی وجہ سے شاہینہ کے پاس اس کو تنہائی اکثر مل جایا کرتی اور وہ مزے میں اس کے ساتھ بیٹھا کھیلا کرتا۔ ادھر بھیا جان کمرے سے نکلتے اور اُدھر اس کے قدم کمرے کی طرف اُٹھ جاتے۔ آج دولن بھابی سے زیادہ بات کرنے کا اس کو موقع نہ ملا تھا۔ صبح سویرے صرف تھوڑی دیر کے لئے وہ ان کے کمرے میں گیا تھا۔ دولن بھابی کپڑے بدل رہی تھیں۔ ان کو سلام کر کے وہ چاہتا تھا کہ ان کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے سوچے ہوئے عجیب عجیب سوالات اور انجانی باتوں کا سلسلہ چھیڑ دے مگر گھر میں دو موٹی موٹی مہمانوں کے آجانے پر بڑی بھابی فوراً ہی دولن بھابی کو بُلا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔ دوپہر بھر یہ ان لوگوں کے شامل رہیں۔ نہ جانے کون کون تھیں وہ۔ اماں جان نے جب اُسے کہا کہ دیکھو یہ تمہاری فردو پھوا اور گگن نانی ہیں، تو ان کی بُرائی صورت دیکھ کر ان کو سلام کرنے کو اس کا ذرا جی نہ چاہا تھا۔ وہ ان کے آنے پر اور بھابی جان کے دولن بھابی کو بُلا لینے پر کڑھ سا گیا تھا۔ ہلکی سی خفگی کے ساتھ یہ ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ تن و تنہا صفدر بھیا کے کمرے میں تصویروں والے ڈھیر سے پرچے اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک پرچہ میں دولن بھابی جیسی ایک خوبصورت فوٹو دیکھ کر اسے بہت خوشی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کئی منٹ تک فوٹو کو طرح طرح سے دیکھتا رہا۔ رنگی ہوئی چھپی چھپائی دولن بھابی کی تصویر پا کر اسے بڑی مسرت ہوئی تھی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پرچہ میں سے وہ ورق پھاڑ لیا تھا۔ اور جلدی جلدی اُسے تہ کر کے اپنے قمیص میں چھپا لایا تھا۔ صبح کے پانچ چھ گھنٹے تو اس طرح گذرے تھے۔ دوپہر کو بھیا جان کا کھانا کمرے میں آتے ہی دولن بھابی اُٹھ کر چلی گئیں۔ اور ننھے کو ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ہی نہ ملا ——— کل دولن بھابی چلی جا رہی تھیں شام کو ان کے کمرے کا دروازہ کھلے گا۔ ناشتہ کے بعد ہی پھر بہن جان عمرانہ باجی، ممی جان وغیرہ ان کو گھیر لیں گی۔ پھر رات ہو جائیگی۔ بھیا جان آئیں گے۔ کمرہ بند ہو جائے گا اور دولن بھابی کے پاس پھر نہ بیٹھ سکے گا ———

ننھا اپنی بے بسی اور مواقع کی ناواقفیت پر دل ہی دل میں غصّہ ہو رہا تھا۔ چلتے چلتے اُسے ناگہانی پتہ چلا کہ وہ دولن بھابی کے کمرے کے پاس آگیا ہے۔ کمرہ بند تھا، گویا بھیّا جان اندر تھے۔ برآمدہ میں خفیف سی ہوا چل رہی تھی۔ جس سے در کے پردہ کے سلوٹوں میں سُبک روی پیدا ہو جاتی۔ اچانک ننھے کے جی میں آیا کہ دروازے سے جھانک کر وہ ایک ذرا دولن بھابی کو دیکھے۔ ان کو دیکھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ "نہ جانے دولن بھابی کیا کر رہی ہیں؟" بے ساختہ اس کے دل نے جاننا چاہا! "بیچاری دولن بھابی" جاگی جاگی سیماب انگیز محبّت نے بھی سہارا دیا "کل تو چلی ہی جائے گی یہ" اس نے سوچا اور آہستہ سے قدم بڑھاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے پردہ کا کونہ پکڑ لیا۔ پٹ بند تھے وہ پردے کو ہٹاتے ہوئے دروازہ سے آلگا اور ہلکے سے دونوں ہاتھوں سے پٹ کو دبایا، چند لمحے تک وہ دروازے سے لگا اندر جھانکنے کی کوشش کرتا رہا۔ بائیں طرف پٹ کے ایک لانبے شگاف کی جوف سے اس کو دولن بھابی کی سہری نظر آئی۔ وہ اور قریب ہوگیا اور جھک کر جوف سے سٹ گیا ــــ

دولن بھابی سوئی تھیں اور بھیّا جان بھی ان کے پاس ہی تھے۔ دولن بھابی کے ادھ کھلے ہوئے بازو میں صرف دو تین باریک چوڑیاں تھیں، ایک کج ہو کر تلوکہ کے پاس تھا اور دوسرے ہاتھ کی کھلی ہوئی لانبی پیاری انگلیاں ان کے گلابی رُخسار پر چھترائی تھیں۔ انگوری ساری کے اندر بھابی کا سویا ہوا مسکراتا چہرا جس کے لبوں میں ننھا سا خلا نظر آرہا تھا، اتنا خوبصورت تھا کہ اسے دیکھتے ہی ننھے کے بے کیف اور ہلکا دل سے مسرّت کی ایک ہلکی سی آبشار پھوٹ پڑی۔ سیل انبساط اس کے متفکر، پریشان اور تھکی ہوئی صورت کو اچانک شاداب بنا گیا۔ اس نے ایک گہری سانس پھیکی، جیسے ایک بوجھ اُتر گیا ہو۔ اس کے دونوں لب علیحدہ ہوگئے اور رُخساروں کی موہنیاں اُبھر پڑیں۔ وہ جوف سے اور قریب ہوگیا، اتنا کہ اس کی بھنویں اور بالائی پیشانی کا حصّہ بھی شگاف سے مٹ گیا۔ کمرے میں چھت سے لگا برقی

پنکھا زوروں پر چل رہا تھا۔ دولہن بھابی کے آنچل سے نکلے ہوئے سیاہ بال کے چند چھوٹے چھوٹے لچھے رُخسار سے لگی ہوئی انگلیوں اور کان کی لَو کے پاس زیادہ نمایاں ہوکر ہوا سے ہولے ہولے اُڑ رہے تھے۔ فرطِ طرب سے ننھے کی سانس رُک رُک کر تیز ہوتی ہوئی اُبھرنے لگی۔ جوف سے اندر کمرے کی ہوا ہلکے ہلکے سیٹیاں بجاتی اس کے چہرے سے ٹکراکر سنسناتی ہوئی باہر آرہی تھی۔ سیک تھپیڑوں کی ہلکی سی سرسراتی ٹھنڈک اس کے نم چہرے پر پڑتی اور اس کا سارا رواں کھڑا ہو جاتا۔ اس کی مسدود نگاہیں شگاف کے چھوٹے سے جوف سے گذر کر سامنے بالکل ہی سامنے اس کی دولہن بھابی کو انہماکانہ اور گرسنہ تک رہی تھیں.......

"ارے ؟" مدھم سی ایک آواز دفعتاً اُبھری اور ایک لانبا نحیف ہاتھ پردہ سے گذر کر ننھے کے کان پر آپڑا۔ ہاتھ کی انگلیوں نے ٹٹول کر فوراً ہی کان کی لَو کو پکڑ لیا۔ انگلیاں باہر تنیں اور ننھا جوف سے بہت دور پٹ سے علٰحدہ کھینچ لیا گیا۔ اس کے دیدے ساکت ہوگئے۔ چہرہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بھرتی ہوئی سانس پیٹ سے باہر نہ جاسکی اور کھُلے ہوئے ہونٹ نہ مل سکے۔ "بدتمیز کہیں کا" ____ ننھا بھابی جان کو اپنے روبرو پاکر ششدر و خوفزدہ تھا۔ جسم میں جیسے اس کا خون سرد اور ہر عضو معطل ہوگیا۔ بڑی بھابی کی سیاہ گول آنکھیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ غصّہ سے تنا ہوا چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔ "کیا دیکھ رہا تھا رے"؟ انھوں نے لَو کے ساتھ کان کے بالائی حصّہ کو بھی زوروں سے اینٹھتے ہوئے آہستہ سے دریافت کیا" بول بدمعاش کہیں کا"۔ مسلن میں پھر تیزی ہوئی اور انگلیوں نے پورا کان مروڑا۔ ننھا دم بخود تھا۔ واقعہ کا ناگہانی تغیّر اور کوائف کی اچانک نامطابقت کی آویزش اپنی کشاکش سے ان متواتر گوشمالیوں کو ایذا رسا نہ بنا سکی۔ تبدیلیِ حالت کا استعجاب، تنگ اور ہیبت نے بیک وقت ننھے کے دل و دماغ میں مختلف اثرات کا ہنگامہ برپا کر دیا۔ چند لمحوں تک وہ ذہنی طور پر لذت اور اذیت کے اس کنارے اور اس کنارے کے درمیان بھٹکتا

رہا، اور متضاد اثرات کی گھماگھمی میں کوئی واحد اثر قبول کرنے سے قطعًا مجبور۔
بھابی جان نے متعدد بار سختی سے گوشمالی کرتے ہوئے اسے ڈانٹا، اس کے کان
موڑے۔ طمانچہ لگایا اور سر پر ایک تھپڑ مارتے ہوئے برآمدہ سے باہر نکال دیا۔
"ٹھہر آج تجھے دُلہن سے پٹواتی ہوں۔" انھوں نے جاتے ہوئے میں بھی اسے ایک جھکولا
دیا۔ ننھے نے یہ بات سُنی اور چلتے ہوئے میں اس کی گونج پھر اس کے کانوں میں آگئی۔
"ٹھہر آج تجھے دُلہن سے پٹواتی ہوں۔" کانوں میں یہ بات جیسے مسلسل بجنے لگی۔
جس کا کرخت آہنگ ننھے کو اذیت دینے لگا ــــــ" دولن بھابی سے اس کو سزا
ملے گی ــــــ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس سے ایک جرم سرزد ہوا ہے جس کی
سرزنش بڑی بھابی کی گوشمالی نہ تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت، زیادہ شدید اور
زیادہ ایذا رساں وہ اندوہناک انفعال انگیز بات تھی، جو نہ معلوم کس طرح اور کیسے
دولن بھابی سے اس کو بطور سزا دلائی جائے گی۔ وہ مغموم اور متردد ہوگیا۔ ندامت،
ملال، تفکر اور بے کلی نے اُسے ہر طرف سے گھیر لیا۔ دبے دبے پاؤں سے وہ امرود کے
پاس سے گزرتا ہوا غسل خانے کی طرف قدم بڑھانے لگا ــــــ اُف اس کی دولن بھابی
کو یہ بات سُن کر کتنی تکلیف ہوگی ــــــ اپنی غلطی اور اعتراف جُرم پر اب اس کا
اضطراب سُرعت سے بڑھنے لگا ــــــ دولن بھابی اس کی چہیتی دولن بھابی۔!!
ان کو کتنی نفرت ہو جائے گی۔ انھیں کتنا دُکھ ہوگا ــــــ بڑی بھابی کہیں گی،
دولن ذرا اپنے ننھے کی بات سنو ــــــ اُف! اسے جان کر ان کو کتنی نفرت ہو جائیگی!!
ذرا اچھی طرح ان کی خبر لو .... اور دولن بھابی یہ بات سُن کر نہ جانے کیا
کریں گی .... اور کیا کہیں گی .... کان امیٹھیں گی .... ماریں گی
.... یا .... یا اس سے بولنا بند کر دیں گی ــــــ مضطرب، مضمحل، ہراساں
ننھا دل ہی دل میں یہ تمام باتیں خیال کر کے بے کل ہوگیا، وہ چُپ چاپ باورچی خانہ
کے پاس پایہ کی اوٹ سے لگ کر اپنی ہونے والی سزا پر غور کرنے لگا ــــــ اب کیسے
وہ ان کے پاس جائے گا .... کیوں کر انھیں اپنا چہرہ دکھائے گا ....

بڑی بھابی ضرور اس کی شکایت کریں گی۔ وہ ضرور یہ بات کہہ دیں گی .... اور .... دولہن بھابی ضرور اس سے بولنا بند کر دیں گی ـــــ' اس نے زبان سے اپنے خشک ہونٹ تر کرتے ہوئے ایک دو بار مُنھ چلایا' تھوک کو گھونٹا اور خاموش کھڑا ہوا سرد سانس بھرنے لگا۔ وہ کتنی دیر تک اپنے سے دور اور آنے والے واقعہ سے نزدیک ہراساں، متفکر اور خاموش اوٹ سے لگا کھڑا رہا۔

کچھ دیر! بھیا جان کے جاتے ہی بڑی بھابی فوراً ان کے کمرے میں گئیں اور تھوڑی دیر میں بہن جان، عمرانہ باجی، ممی جان بھی وہاں چلی گئیں ـــــ پھر بھابی جان کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر تنہا اوٹ سے لگا ہوا اور بھی ہراساں ہو گیا اس کا اضطراب بڑھ گیا ـــــ اب بڑی بھابی اس کو پکڑ کر لے جائیں گی خوف نے ننھے کے جسم کو سہاتے ہوئے اسے پایہ سے اور بھی سٹا دیا اور پوری طرح چھپا ہوا ذری سی گردن نکال کر یہ بڑی بھابی کو دیکھنے لگا یہ کمرے سے نکل کر تونت کے پاس سے گذرتی دالان میں چلی گئیں۔ ننھے نے ایک بار پھر گہری سانس لے کر اپنا تھوک گھونٹا۔ چند منٹوں کے بعد آرزو کی ماں بھی چھوٹے کمرے سے شاہینہ کو گود میں لئے دولہن بھابی کے کمرے میں چلی گئیں اور ممی جان باہر آگئیں۔ انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے برآمدے سے ننھے کو پکارا۔ ان کی پکار اس کے کان کے پردے سے ٹکرائی، وہ چُپ رہا۔ ممی جان نے پھر پکارا۔ ننھا صرف کسمسا گیا اور ممی جان نے جب برآمدے سے اُتر کر امرود کے پاس آکر ننھے کو زور سے پکارا تو اس کے جامد قدم یکایک اُٹھ گئے اور وہ پایہ کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ ممی جان نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "جاؤ تمھیں دُلہن بُلا رہی ہیں۔" ننھے نے اُنھیں ایک نظر دیکھا اور نہایت ہی ہلکے ہلکے قدموں سے برآمدہ کی طرف رُخ کیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کا دل بالکل اس کے کانوں کے قریب چلا آیا ہے، جس کی تیز آواز وہ بالکل صاف سُن رہا ہے۔ مغموم، متفکر، ملول اور ہراساں پُراسرار طاقت کے زیر اثر وہ کشاں کشاں برآمدے کے نزدیک آگیا۔ "اچی

ننھے میاں" کمرے کے اندر سے آرزو کی ماں کی پکار پھر اس کے دماغ پر کھٹ سے لگی۔ وہ خاموش برآمدہ پر چڑھ گیا ــــــ "بُلایا نہ جا رہے جی؟" کمرے سے آواز دوبارہ آئی۔ وہ چلنے لگا۔ احساس جُرم پر شرمندگی و ندامت، سرزنش کا ہراس و خوف اور ذلّت و تحقیر کا صدمہ اس کی مختصر سی محدود دُنیا، فکر و فہم پر متواتر حملہ کر کے اس کی ننھی سی شخصیت کو مسلسل لرزا رہا تھا۔ وہ کانپتا، گھبراتا، دھڑکتا اور کھویا ہوا پردے کے پاس آگیا۔ "ننھے"؟؟ دولہن بھابھی کی آواز آئی۔ آواز نے شدت احساس شرمندگی اور ذلّت کو ناگہانی مسلتے ہوئے اسے مکمل بہوت مرعوب کر دیا۔ پردہ ہٹا کر یہ اندر آگیا۔ "ننھے" دولہن بھابی نے بہت سنجیدہ بن کر پوچھا۔ سب لوگ کمرے میں موجود تھیں۔ دولہن بھابی نے اسے دیکھ کر کہا "ادھر آؤ" ان کی صورت دیکھ کر اس کی دہشت اُبل پڑی کہ اب وہ اس کی مرمت کریں گی۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ استعجاب میں ڈوبا، خوف سے لرزہ بہ اندام گھبرائی ہوئی نظروں سے وہ دولہن بھابی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ دولہن بھابی کی صورت ابھی تک ویسی ہی سنجیدہ تھی۔ آہستہ سے ہاتھ کے اشارے جب انھوں نے اسے اپنے قریب بُلایا تو ننھا کے پیر ڈگمگانے لگے اس کا سر ایک دم ہلکا ہوگیا اور اپنی ہونے والی سزا کے سحرانگیز زلزلوں سے ٹھٹکتا ہوا وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ ان سے فاصلہ ہنوز دور تھا، مگر صرف اتنا ہی جتنا بڑی بھابی کے لانبے ہاتھ اس کے کانوں کو چھو لیتے اور فوراً ایک کان پکڑ کر دُور سے اسے اپنے پاس کھینچ لاتے۔ دولہن بھابی نے اپنے ہاتھ اُٹھائے، اور دونوں ہاتھ ایک ساتھ ــــــ ننھے کا دل بہت زور سے کانپا، وہ انتہائی دہشت سے دولہن بھابی کے چہرے کو دیکھنے لگا، جواب ناگہاں بدل گیا تھا۔ ان کے اُٹھتے ہوئے دونوں ہاتھوں شانوں سے گذرتے اس کے دونوں کانوں تک پہنچے۔ چوڑیاں بجیں اور انگلیاں ملیں ــــــ "میرے ننھے بھائی! کل میں جا رہی ہوں۔" ہاتھ اسکے گالوں تک آکر ہی رُک گئے، اور یہ کہتے ہوئے دولہن بھابی نے انگلیوں سے اس کے رُخسار کو چوم لیا۔ ننھا کی ساری دہشت اور سارا خوف بارود جیسا بھک سے اُڑ گیا۔ اس نے

دونوں ہاتھوں سے اپنے گال سے لگی ہوئی دولن بھابی کی انگلیوں کو پکڑ لیا اور ان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ــــــ !!

" دیو روا کو کر لوں جوان میں گود یا کھلا کے " مسکراتے ہوئے پاس مسہری سے لگی آرزو کی ماں نے کہا۔ بہن جان اور عمرانہ باجی بھی ہنس پڑیں اور دولن بھابی نے شرما کر جلدی سے ننھے کو اپنی گود میں بھینچ لیا۔
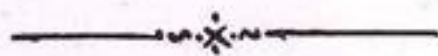
بنیائن

(انور عظیم)

گردن اس کی ہڈیالی تھی۔ اکڑی ہوئی۔ کالر اب بھی کسے ہوئے تھے۔ ٹائی اب بھی کسی ہوئی تھی۔ پتلون کے بکلس بھی کسے ہوئے تھے۔ اس بھیڑ میں ایک میں ایسا تھا جو یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میں صرف دیکھ نہیں رہا تھا محسوس بھی کر رہا تھا۔

ایک بس آکر رُکی۔ بریک لگانے سے بس کُتّے کی طرح چیخی۔ بھیڑ بھاگی، کُتّے کی طرف۔ دھکم پیل میں کچھ تو بس کے اندر پہنچ گئے۔ بس غُرّاتی ہوئی چل دی۔ جو لوگ رہ گئے وہ پھر مڑ کر لاش کی طرف دیکھنے لگے۔ میں بھی دیکھنے لگا۔ اپنے آپ کو اس طرح بھیڑ میں چھپ کر دیکھنا۔ مجھے تو پسینہ آگیا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ ننگے درختوں کی پھنگیوں پر سورج دہک رہا تھا۔ جہاں سایہ تھا وہاں بھی آگ تھی، ہوا میں گرد تھی۔ میرے پاس کھڑی ہوئی عورت، جس کے جسم سے سینٹ اور پسینے کی خوشبو ایک ساتھ آرہی تھی۔ رنگین جاپانی چھتری کو اپنے سر پر نچا رہی تھی۔ رنگوں کی چمکیلی اور شفاف پرچھائیاں اس کے چہرے کو گرما رہی تھیں اس کی بغل کا پسینہ بلاوز کے اندر اندر تیرتا ہوا اس کی کمر پر پھیل رہا تھا اور ٹیلکم کی گرد کو دھو رہا تھا۔ اس نے اپنے سینڈلوں کے موٹے پنجوں پر ذرا اُٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"آپ نے دیکھا اس کی مونچھیں کتنی ڈراؤنی ہیں؟"

میں نے اپنی ناک کے نیچے انگلیاں پھیریں۔

"مونچھیں؟" میں چونک گیا۔ ٹھنڈے بلیڈ کا تیز لمس میرے چہرے پر اب
بھی تازہ تھا۔

"مونچھیں نہیں مکھیاں ہیں۔" میں نے اس طرح کہا جیسے مجھے سب کچھ معلوم ہو۔
عورت نے بہت بُرا سا منھ بنایا اور چھتری دوسرے ہاتھ میں لے لی۔
دوسری بغل کا پسینہ بلاؤز کو بھگو رہا تھا۔ اس طرف سلائی ادھڑی ہوئی تھی۔
اس کی بھیگی ہوئی بغل مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے للچاکر اس کی طرف دیکھا۔
ایک بس دُھواں اُڑاتی ہوئی آئی اور گھڑگھڑاتی ہوئی چڑھائی پر نکل گئی۔
"اب یہاں کوئی بس نہیں رُکے گی۔ بس بھی لاش کو سونگھ لیتی ہے۔"
"بس نہیں آئے گی تو میرا پتہ کٹ جائے گا۔
"وہ تو کب کا کٹ چکا۔"
بھیڑ نے اُتو کی طرف دیکھا جو مر چکا تھا۔
مجھے اور پسینہ آیا۔ سورج اب بھی درختوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ہوا چل
رہی تھی اور سانس میں گھُل رہی تھی گرد کی طرح۔
بھیڑ کی اُکتاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ بس آتی تھی۔ نہ منظر بدلتا تھا۔
لاش اسی طرح پڑی تھی۔ پولس کا ایک آدمی کہیں سے آ نکلا۔ کون ہے۔ کون ہے؟
کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کب ہوا؟ کب ہوا؟ کب ہوا؟
"ہمیں کیا معلوم۔ ہم تو بس کا انتظار کر رہے ہیں۔"
"کیا یہ تازہ لاش ہے؟"
"دیکھنے میں تو تازہ معلوم ہوتی ہے۔"
"تازہ اور گرم۔ ویسے میں نے چھو کر نہیں دیکھا۔"
"تم کون ہو؟" جس سے یہ سوال کیا گیا تھا، وہ بھیڑ میں غائب ہو گیا۔
پولس کا آدمی ٹیلیفون بوتھ کے اندر چلا گیا۔
عورت نے ہونٹ کاٹتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں بھی کھسک گیا۔ بالکل

اس کے پاس گرمی گوشت کو پگھلا رہی تھی۔ ہڈی کو بھی۔ اس کے بالائی لب پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ سینٹ کی بو مٹ رہی تھی۔ پسینے کی خوشبو تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"لو بڑی بھیانک ہے۔"

"ٹھنڈی لو۔"

میں ہنسا۔ وہ بھی ہنس دی۔

"بھیڑ میں کسی نے کہا" اب پولس والے آئیں گے اور لاش کو وان میں اُٹھا لے جائیں گے۔

"ہاں ہاں اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔"

"جانے اندر سے کیا نکلے گا؟" ایک شخص نے سٹے باز کے لہجے میں کہا۔

"باہر بھی موت۔ اندر بھی موت۔" سب نے نظر اُٹھا کر دانا کی طرف دیکھا، جس کی آنکھیں غلیظ سے چپچپا رہی تھیں۔

پھر کئی بسیں آگے پیچھے آئیں اور چڑھائی پر رینگتی چلی گئیں۔ مسافر بسوں کے دروازے میں لٹک رہے تھے اور ان کے لباس جھنڈوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ ہوا میں اُڑتی ہوئی آنکھیں زہریلے اور کڑوے دھوئیں کے اس پار بھیڑ کی طرف دیکھ رہی تھیں جو چیونٹیوں کی فوج کی طرح حرکت میں تھی جو کبھی پھیل جاتی تھی۔ کبھی سکڑ جاتی تھی۔

میں نے عورت کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا چاہا۔ وہ دور سے لاش کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی سیاہ عینک کے شیشوں پر لاش نظر آئی۔ چہرے کی ذرا سی جنبش سے لاش غائب ہوگئی اور ہجوم تیرنے لگا۔ عورت کی عینک فلم دکھا رہی تھی اس کے چہرے پر موم کی ہلکی سی لیپ گرمی میں پگھل رہی تھی۔

"ہمارا شہر بہت اچھا ہے۔ مفت کی تفریح کا انتظام بہت اچھا ہے۔" کسی نے لاش کی طرف تھوکتے ہوئے جل کر کہا۔ کہنے والے کا چہرہ زرد تھا۔ مدقوق

اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ آنکھیں زرد تھیں۔ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

لانگ شاٹ۔ ٹیک۔ زوم۔ کٹ۔ کلوز اپ۔ پین۔ پھر ایک بار۔ پھر۔ لانگ شاٹ کٹ۔

اس کا چہرہ زرد تھا۔ وہ بلند ٹیلے پر بنگلے کے گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ایک بہت بڑا کیمرہ ایک ویگن کی چھت پر نصب تھا۔ کیمرہ میں کا سر غائب تھا۔ اور وہ ایک چوپائے کی طرح کیمرے کے پیچھے جھکا ہوا تھا۔ وہاں بھی بہت بھیڑ تھی۔ بندوق کے دغنے کی آواز آئی۔ کوئی گیٹ پر گرا۔ گیٹ کے اس طرف سے ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ شہسوار نے اُچک کر عورت کو گھوڑے پر بٹھالیا۔ گرد اڑی۔ گھوڑا غائب۔ عورت غائب۔ یکایک ارکسٹرا کا نغمہ پھوٹا۔ بھیڑ تالیاں بجانے لگی۔

ایک بھیڑ اس طرف تھی۔ ٹیلے پر۔ ایک بھیڑ اس طرف تھی۔ جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔ جہاں لوگوں کو بس کا انتظار تھا۔

یکایک شور اُٹھا "زندہ ہے، لاش زندہ ہے"۔

سب لاش پر جھک گئے۔ ایک ہاتھ نے جھپٹ کر اس کی ٹائی کھول دی۔ دوسرے نے کالر کھول دیئے۔ کسی نے لپک کر اس کا کوٹ نوچا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی قمیص تار تار ہو گئی۔ اندر ایک بہت میلا بنیائن لاش کے سخت سینے پر جھلی کی طرح منڈھا ہوا تھا۔

"اس کی تکا بوٹی کئے دے رہے ہیں سور"۔ عورت نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

پولس والے آگئے۔ ایک وان بھی آگئی۔ لوگ بکھر گئے۔ موت کی بو سونگھتے ہوئے۔ سؤروں کی طرح سر جھکائے۔ بس اسٹاپ کی طرف بھاگے۔ جہاں چڑھائی شروع ہوتی تھی۔

بسیں گھڑ گھڑاتی ہوئی آئیں اور آگے نکل گئیں۔

"پولس والے ہمیں پکڑ لیں گے۔ گواہی کے لئے لے جائیں گے۔ بسیں رُکتیں

کیوں نہیں ؟

رُک بھی گئیں تو بچ کر کہاں جاؤ گے ؟ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔"
میں پھر بھیڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔ جتنا چھپتا تھا، اُتنا ہی دکھائی دیتا تھا۔

عورت کے چہرے پر رنگوں کے دھبے اُبھر آئے۔ وہ بار بار ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ ہونٹ کے کنارے پر لہو کی ایک بوند کبھی جل اُٹھتی تھی۔ کبھی بُجھ جاتی تھی۔
ایک شخص کے گلے کی رگیں پھول رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔
وہ پلٹ پلٹ کر لاش کو دیکھ رہا تھا۔ جس کو پولس والے اُٹھا کر وان کی طرف لے جا رہے تھے۔ اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے لیکن وہ چیخ چیخ کر عورت سے کچھ کہہ رہا تھا۔ عورت سہمی ہوئی تھی اور اس کا مُنھ میرے مُنھ کے اتنا قریب آگیا تھا کہ میں اور زیادہ احتیاط سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ سب قہقہے لگا رہے تھے اور ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے میں بہت خوفزدہ تھا۔ وہ لوگ مُجھے اُٹھا کر وان کی طرف لے جا رہے تھے اور میں پولس والوں کے جوتوں کی چاپ سُن رہا تھا۔

"یہ ہر شخص ہے" عورت نے کہا۔

"یہ کوئی نہیں" میں نے یوں ہی جواب دیا۔

وہ جاپانی چھتری کو اور زیادہ تیزی سے نچانے لگی۔

میرے گلے میں آواز روٹی کے سوکھے ٹکڑے کی طرح پھنس رہی تھی۔

تم مجھے نہیں پہچانتیں۔ کوئی مجھے نہیں پہچانتا۔ کوئی ٹائی لے گیا۔ کوئی قمیص۔ لیکن بنیان کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ بھیڑ چھٹ رہی ہے۔ وان جا چکی ہے۔ لوگ ٹیکسی اور اسکوٹر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ دھوپ اور تیز ہو گئی ہے۔ سورج اور نیچے آگیا ہے۔ درخت جل رہے ہیں۔ کولتار پگھل رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سِلے ہوئے ہیں۔ وہ رو رہا ہے۔ وہ سب جانتا ہے تمھارے جسم میں بڑی لرزش ہے۔ تمھارا جسم ٹھنڈا ہے۔ پسینہ خشک ہو چکا ہے۔ تمھاری

عینک میں اب کسی لاش کا عکس نہیں ہے۔ سیاہ شیشے چمک رہے ہیں۔ آنکھیں چھپی ہوئی ہیں مگر تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ مجھے دیکھ رہی ہو مگر پہچانتیں نہیں۔ اب میں وہاں ہوں، جہاں تک تمھاری نظر نہیں پہنچ سکتی۔ وہ لوگ سفید ماسک مُنھ پر باندھے مجھ پر جھکے ہوئے ہیں۔ میری بے خون رگیں چھٹ چھٹ کاٹی جا رہی ہیں۔ جھلّی کی ڈوروں کی طرح سینہ چاک، پیٹ چاک، پورا جسم چاک چاک۔ دل کی حرکت بند ہوگئی۔ موت کتنا بڑا انکشاف ہے۔ کوئی میرا چہرہ نہیں دیکھتا۔ سب میرے شاندار لباس سے مرعوب ہیں۔ بنیان سے چکرائے ہوئے۔ شرمندہ۔ مسخرو! تم کیوں شرماؤ۔ میں یہ سب اپنے آپ سوچ رہا ہوں۔ جس کو چیرا پھاڑا جا سکتا ہے اور جس پر رپورٹ لکھی جا سکتی ہے۔ ایک پیلے فارم پر چھپے ہوئے سوالوں کے مطابق۔ نام۔ پیدائش کا سال۔ پیشہ۔ جینے کا پیشہ۔ مرنے کا پیشہ۔ جینے والے کا ایک سوال۔ مرنے والے کا ایک جواب۔ میں اس سوال نامے سے پہلے شروع ہوا۔ اور اس سے آگے جاؤں گا۔ اس سے کسی کو مطلب نہیں اور تم مجھے پہچاننے سے انکار کر رہی ہو۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔

کتنے سال ہو گئے، میں کسی نہ کسی بس میں تمھارے ساتھ سفر کرتا رہا ہوں اور اب میں اچانک مر گیا ہوں تو تم مجھے پہچانتی نہیں۔ بہت کم لوگوں کو مرنے کے بعد جینے کا موقع ملتا ہے۔ یوں اپنے آپ کو دیکھنے کا۔ اپنے آپ کو اور دوسروں کو دیکھنے کا۔

ایک بس آکر رکی۔ سب اس کی طرف جھپٹے۔ میں بھی جھپٹا۔ عورت مجھ سے پہلے بس کے اندر پہنچ چکی تھی۔ اس کا پہلو خالی تھا۔ جو سالہا سال سے ہوتا آیا تھا۔ اس وقت بھی ہوا۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ وہ بالکل آگے دیکھ رہی تھی۔ مسافروں اور ڈرائیور کی سیٹ سے آگے۔ اس کی عینک کی سیاہی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ اب بھی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

میں نے اس کے پورے وجود کو اپنی ران سے محسوس کیا۔ ہمارے درمیان لُو مٹ گئی۔ ہم دونوں کو ٹھنڈے پسینے کا احساس بہت قریب لے آیا تھا۔ اس کے

ہونٹوں پر وہی دھندلی سی مسکراہٹ اُبھری جو میں نے پہلی بار دیکھی تھی، اسی بس میں۔ بس دھوئیں میں لپٹی ہوئی تھی۔ گھڑگھڑاہٹ کے سوا اور کچھ سُنائی نہ دے رہا تھا۔ دُھوئیں کی لہروں سے آگے مکان بھی دُھوئیں میں لپٹے ہوئے تھے۔ درخت بھی۔ دوڑتی ہوئی بسیں اور کاریں بھی۔ ہر طرف ایک عجیب سی متحرک اور گرم ویرانی تھی۔

"آپ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔"

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو بار بار ہلتے دیکھا۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی کھلی ہوئی کمر پہ رکھ دیا۔ کمر پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور میرے ہاتھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی تھی۔

"تم نے مجھے پہچانا کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میرا سوال نہیں سُنا۔ وہ ہنس دی۔ اس کی کمر میں گدگدی ہو رہی تھی لُو کی لپٹیں اس کے چہرے کو جُھلس رہی تھیں۔

"آپ نے اس کا بنیان دیکھا؟" یکایک اس نے مُڑ کر مجھ سے پوچھا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب تھا۔ میرا چہرہ اس کی عینک کے شیشوں میں لرز رہا تھا میری آنکھوں پہ بھی عینک تھی اور میں عکس میں عکس دیکھ رہا تھا۔ دھواں باہر تھا۔ بس کے اندر دھوپ ہی دھوپ تھی۔

"بہت میلا تھا۔" اس نے پھر کہا۔ اتنے شاندار، صاف، نکھرے ہوئے لباس کے اندر "اتنا میلا بدبودار بنیان۔" وہ پھر مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے پھر اسٹریچر پہ ڈال دیا گیا تھا۔ ایک سفید چادر نے مجھے ڈھانپ لیا تھا میں کٹے پھٹے جسم پہ میلے بنیان کا بوجھ اب نہیں محسوس کر رہا تھا۔ میں ہلکا ہو گیا تھا اور اب میں اسٹریچر سمیت ہوا میں اُڑ سکتا تھا۔

"اب مجھ پہ زندگی کا دباؤ نہیں ہے۔" میں نے اس کے کان میں کہا۔

عورت نے ہونٹوں پہ زبان پھیری۔ اس کی زبان کی بھیگی ہوئی نوک نے ہونٹوں کے رنگ کو ہلکا کر دیا۔

"لباس بہت بڑا بلف ہے"۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔
عورت سمٹ گئی۔ اس نے ساری کا پلّو کمر پر کھینچ لیا۔ میں اس کی کمر کو سہلانے لگا۔ دھواں اب اتنا بڑھ گیا تھا کہ اندر آ رہا تھا۔ سارے مسافر ناک پر رومال رکھ کر کھانس رہے تھے۔
"شہر میں خطرناک قسم کا فلو پھیل رہا ہے۔"
"ہانگ کانگ سے امپورٹ ہوا ہے جناب۔"
"کینسر کہیں سے امپورٹ نہیں ہوتا۔"
بس میں ہر شخص چھینک رہا تھا۔ میں کمر سہلا رہا تھا۔ پسینہ خشک ہو گیا تھا گدگدی بند ہو چکی تھی۔ عورت نے گھبرائی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اب میری آنکھیں اس کی عینک کے اندر جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔ آنکھیں بہت خوب تھیں۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی، سُرخ ڈوروں سے روشن، سہمی ہوئی اور حیرت زدہ۔
"میں سب کچھ سمجھتی رہی اور وہ نکلا کچھ اور۔"
"کیا؟"
"میلا بنیان"
میں نے بات بدلنے کے لئے پوچھا۔
"کہو تمھارا دھندا کیسا چل رہا ہے؟"
"بُرا — بہت بُرا۔" اس نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا۔
"میں نے بہت دنوں سے تمہارا اشتہار نہیں دیکھا۔"
"نئے چہرے، نئے ماڈل، آگئے ہیں بازار میں۔"
وہ تو آتے رہتے ہیں۔"
"ہاں وہ تو آتے رہتے ہیں۔" اس کی آواز کا حزن اس کے چہرے پر پھیل گیا۔
مجھے مُردہ گھر میں چھوڑ کر وہ لوگ چلے گئے۔
میں نے عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا

تھا۔ اس نے راز داری کے انداز میں کہا —— "تمھارا ہاتھ بہت گرم ہے۔"

"موت بہت گرم ہوتی ہے۔"

میرے چہرے کے عکس سے اس کی عینک کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

میں نے اس کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ اس نے بھری دوپہر میں سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ ڈرائیور نے بس کا گیئر بدلا۔ بڑے زور سے جھٹکا لگا۔ سارے مسافر گڈمڈ سے ہو گئے۔ عورت کی نظر میرے کھلے ہوئے گریبان کے اندر تیرتی چلی گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ میں نے بھی گریبان کے اندر دیکھا۔ بنیان بہت میلا تھا۔ عورت کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

میں نے عینک ہٹالی۔ اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"تم بھی ویسے ہی ہو۔"

مُردہ گھر میں سناٹا ہے۔ میں سفید چادروں سے ڈھکی ہوئی لاشوں کی قطاریں دیکھ رہا ہوں اور انتظار کر رہا ہوں۔ دروازہ کُھلے گا۔ کوئی آئے گا۔ مجھے پہچانے گا۔ یہی پہچان میری رہائی ہو گی۔

صدیاں گذر گئی ہیں۔ نہ دروازہ کُھلا ہے۔ نہ کوئی آیا ہے۔ نہ خوشبو۔ نہ روشنی اس میلے بنیان کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔

کھنڈر

خواجہ بدیع الزماں

گھر میں داخل ہوتے ہی ایک بوڑھے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لمحہ بھر کو لگا کہ میں اس چہرے کو پہچانتا ہوں۔ لیکن یہ پہچان اتنی دھندلی تھی کہ میں اس میں الجھ کر رہ گیا۔ لگا کہ یہ چہرہ کسی ملبہ سے ڈھکا ہوا ہے اور اس ملبہ کو ہٹائے بغیر اس چہرے کو پوری طرح سے پہچاننا ممکن نہیں ہے۔ ذہن میں بہت گہرائی میں دبی ہوئی چیزوں کو کریدنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کچھ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

مجھے اپنے اوپر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ کیا سچ مچ میرا حافظہ اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ جانے پہچانے چہرے بھی اس کی گرفت سے نکلتے جا رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر بیتے ہوئے ایام کو کریدنے کی بھرپور کوشش کی لیکن اس بار بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ تبھی اماں نے میری مدد کی۔

"ارے نا پہچانو ہو کا ان کو۔" اماں نے پاس بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت کے کندھے کو ہلکے سے تھپکتے ہوئے کہا۔ "ای تمری بٹیا ممانی ہیں نے جی۔"

بٹیا ممانی کھکھلا کر ہنس پڑیں۔ ان کی اس بے ساختہ ہنسی نے جیسے ایک ہی جھٹکے میں اس سارے ملبے کو اتار پھینکا۔ جس کے نیچے ان کا چہرہ دبا ہوا تھا۔ اماں نے اگر بٹیا ممانی کا نام بھی نہ لیا ہوتا تو بھی ان کی اس بے ساختہ ہنسی کے بعد یہ ناممکن تھا کہ میں انہیں نہ پہچانتا۔

مجھے لگا کہ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ان سے سب کچھ چھین لیا تھا لیکن ان کی بے ساختہ ہنسی کو وہ نہیں چھین سکے تھے۔ اور اب شاید ان کی یہ بے ساختہ ہنسی ہی ان کی واحد پہچان کی شکل میں زندہ رہ گئی ہے۔

"جیتے رہو بیٹا"۔ میرے سلام کے جواب میں بٹیا مامانی بولیں۔

"کتنے دن بعد دیکھا ہے تم کو!"

بٹیا مامانی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان وقت کا بہت طویل وقفہ حائل تھا۔ شاید پچیس سال کا یا اس سے بھی زیادہ۔ کچھ یاد نہیں آرہا تھا کہ پچھلی بار انہیں کب دیکھا تھا۔ بس اڑتی اڑاتی خبر ضرور ملتی رہی تھی کہ اب وہ اس شہر میں نہیں رہتیں۔ اپنے کسی رشتے دار کے ساتھ جمشید پور میں رہتی ہیں۔ اور ادھر برسوں سے تو ان کے بارے میں کچھ سنا بھی نہیں تھا۔ بے شمار پرانے چہروں کی طرح جو غیر اہم ہو کر ذہن سے نکل جاتے ہیں ان کا چہرہ بھی میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔

"تمرے واسطے ہی روک لیا تھا بٹیا بھابی کو"۔ اماں کہنے لگیں ——— "یہ تو کب سے جانے جانے کا رٹ لگائے ہیں۔"

اماں اور بٹیا مامانی کیسی سگی بہنوں کی طرح گھل مل کر باتیں کر رہی ہیں اس وقت! کون یقین کرے گا کہ دونوں میں کبھی جنم جنم کی دشمنی تھی۔ بس نہ چلتا کہ ایک دوسرے کو کچا چبا جاتیں۔ دن رات کا کوسنا پیٹنا۔ روز روز کی چیخ چخ۔ گھنٹوں کوستے رہنے کے بعد بھی کیا مجال جو کسی کی زبان لمحہ بھر کو بھی بند ہو جائے۔

مزے کی بات یہ تھی کہ اماں اور بٹیا مامانی کا جھگڑا نہ تو زمین جائیداد کو لے کر تھا اور نہ ہی کسی خاندانی عداوت کی بنا پر۔ دونوں میں نند بھاوج کا جو رشتہ تھا وہ بھی محض پردیسی ہونے کی وجہ سے تھا۔ دونوں میں خون کا رشتہ تھا ہی نہیں لیکن لگتا ہی تھا کہ دونوں میں کئی پشتوں سے دشمنی چلی آرہی ہے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

میں نے بٹیا مامانی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ جھریوں سے بھرا ان کا چہرہ کیسا

کچلا ہوا لگ رہا تھا۔ اف! کس قدر قابلِ رحم اور کیسی بے بسی کی تصویر لگ رہا ہے یہ چہرہ۔ دفعتاً وقت جیسے بہت پیچھے کی طرف سرک گیا..... ایک بھاری بھرکم، رعب دار، کبھی نہ جھکنے والا چہرہ سامنے تھا۔ ان دنوں بٹیا ممانی سے مجھے بھی کچھ کم نفرت نہیں تھی۔ جب اماں سے ان کو جھگڑتے دیکھتا، جب وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر اماں کو، مجھے، میرے سارے خاندان کو کوسنے لگتیں تو غصّہ سے میں بھی پاگل ہوا اٹھتا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ چڑیل کا منہ نوچ لوں۔

چڑیل!!..... ہاں بٹیا ممانی ان دنوں چڑیل ہی تو لگتی تھیں مجھے۔ حالاں کہ صورت شکل اچھی خاصی تھی۔ گورا رنگ، بھرا بھرا رنگ، کھڑی ناک۔ امّاں سے تو ہر حال میں اچھی ہی صورت پائی تھی انھوں نے۔ پھر بھی وہ مجھے چڑیل ہی دکھائی دیتی تھیں۔ چڑیل کی طرح ہی بدصورت اور ڈراونی۔ کبھی کبھی تو خواب میں بھی انہیں دیکھ کر میں خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ لیکن ان ساری نفرت اور خوف کے باوجود ان کے اکلوتے بیٹے سمّو سے میری خوب گاڑھی چھنتی تھی۔

سمّو اور میں ہم عمر تو تھے ہی، ہم جماعت بھی تھے۔ ایک ساتھ اسکول جانا، ساتھ ہی اسکول سے لوٹنا۔ پھر ساتھ ہی کھیلنا کودنا۔ لیکن جھگڑے بھی ہم دونوں میں خوب ہوتے تھے۔ آئے دن مارپیٹ ہو جاتی۔ لیکن اماں اور بٹیا ممانی کی طرح نہیں کہ ہر وقت تناؤ اور کشیدگی بنی ہوئی ہے۔ جھگڑے ہم دونوں میں ضرور ہوتے تھے اور اکثر ہی ہم دونوں ایک دوسرے کو لہو لہان بھی کر دیتے تھے لیکن اس کا اثر گھنٹہ دو گھنٹہ ہی رہتا تھا۔ پھر سب کچھ بھول کر ہم دونوں ساتھ کھیلنے لگتے۔ ادھر امّاں اور بٹیا ممانی کی لڑائی شروع ہو جاتی جو در اصل میرے اور سمّو کے جھگڑے کا ہی نتیجہ ہوتی تھی لیکن ہم دونوں کا جھگڑا ختم ہونے کے بعد بھی ہفتوں کیا مہینوں تک چلتی تھی۔

اس تنا تنی کے دوران اماں بار بار مجھے ڈانٹتیں پھٹکارتیں ہائے رے شمو! تین نا مانے ہے او مونڈی کاٹے کے ساتھ کھیلے بنا۔ دیکھے نا ہے کیسا کیسا اکوسا وے ہے او ڈائن ہم سب کو منہ جھونسی کہے ہے نپتّر ہو جہیں ہم۔ اسے او ہی نپتّر ہو جہیئے۔ اللہ میاں

نا دیکھیں ہیں کا؟ کیسے کیسے ستاوے ہے او ہم کو۔"

ادھر بٹیا ممانی بھی سمّو کو ڈانٹتے ہوئے ایسے ہی الفاظ استعمال کرتیں۔ اور میرے ساتھ کھیلنے کے لیے منع کرتیں۔ لیکن ان سب کا نہ تو مجھ پر ہی کوئی اثر ہوتا تھا اور نہ ہی سمّو پر۔ ہم دونوں کا رویہ عام طور پر یہ ہوتا کہ انھیں جھگڑنے دو۔ ہمیں ان سے کیا سروکار! نہ تو میں سمّو سے بٹیا ممانی کے بارے میں کچھ کہتا اور نہ ہی وہ اماں کے بارے میں کوئی لفظ زبان پر لاتا۔ ہم دونوں کے درمیان ایک خاموش، ان کہا سمجھوتہ تھا کہ ہم دونوں کا تعلق اپنی جگہ پر ہے اور امّاں اور بٹیا ممانی کا تعلق اپنی جگہ پر۔

بٹیا ممانی کا گھر ہمارے گھر سے ملا ہوا تھا۔ ان دنوں دونوں ہی گھر مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ دونوں گھروں کو بانٹنے والی ایک کچی دیوار تھی۔ جس پر ایک طرف ہمارے گھر کا چھپر تھا تو دوسری طرف بٹیا ممانی کا۔ گھر کا چھپر۔ تھوڑی اونچی آواز سے بولنے پر دونوں گھروں کے لوگ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سُن سکتے تھے۔ اس طرح امّاں اور بٹیا ممانی ایک دوسرے کے سامنے آئے بغیر ہی اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتی تھیں۔

دشمنی اور مخالفت کا یہ طویل سلسلہ شروع ہونے سے پہلے دونوں خوشگوار تعلقات کے سنہری دور سے گذر چکی تھیں۔ بٹیا ممانی جب نئی نویلی دلہن بن کر آئی تھیں تو سب سے پہلے امّاں نے ہی انھیں بٹیا بھابی کہہ کر پکارا تھا۔ پھر جانے کیسے یہ "بٹیا" (دلہن) کا لفظ اتنا مقبول ہو گیا کہ انہیں بٹیا بھابی ہی کہنے لگے۔ اور آگے چل کر تو وہ بٹیا ممانی، بٹیا چچی اور بٹیا نانی اور بٹیا دادی بھی کہی جانے لگیں۔ "بٹیا" لفظ کچھ اس طرح ان کے نام کے ساتھ چپک گیا کہ وہ پھر کبھی الگ نہ ہو سکا۔

برسوں تو دونوں میں ایسا میل محبّت رہا کہ ایک کو دوسرے کے بغیر چین نہ ملتا۔ اماں کی تب شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد بھی بہت دنوں تک دونوں کے تعلق میں کوئی تلخی نہیں آئی۔ شادی کے بعد بھی امّاں میکہ میں ہی رہیں کیونکہ ملازمت کی وجہ سے ابّا سُسرال میں ہی آ کر بس گئے تھے۔

کہتے ہیں کہ دونوں کے جھگڑے مجھے اور سمّو کو لے کر ہی شروع ہو گئے ۔ پھر تلخی بڑھتی گئی اور دشمنی کے اور بھی اسباب پیدا ہوتے چلے گئے ۔ بٹیا ممانی کے شوہر درگاہی ماموں بہت خاموش اور امن پسند انسان تھے ۔ ابا بھی جھگڑالو طبیعت کے نہیں تھے ۔ لہذا دونوں میں مڈبھیڑ تو کبھی نہیں ہوئی جیسی اماں اور بٹیا ممانی کی ہوتی رہتی تھی ۔ بعد میں دونوں کے آئے دن کے ان جھگڑوں کا کچھ نہ کچھ اثر تو دونوں کے شوہروں پر پڑنا ہی تھا اور وہ پڑا بھی بھی ۔ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے سے بے تعلق ہوتے چلے گئے ۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ دونوں کے درمیان دعا رسلام کا رشتہ بھی ختم ہو گیا ۔ حالانکہ دونوں ایک ہی محکمہ میں کام کرتے تھے ۔ اور کبھی دونوں میں دانت کاٹی دوستی تھی ۔

.... گرمی کی دوپہر تھی اور چھٹی کا دن ۔ جھلس دینے والی لو کی سائیں سائیں کے علاوہ کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی ۔ اماں اور ابا دونوں بے خبر سو رہے تھے ۔ یکایک وہی جانی پہچانی سیٹی کی آواز سنائی دی ۔ میں سمجھ گیا ۔ سمّو کھیلنے کے لئے بلا رہا ہے ۔ چند لمحے ششش و پنج میں گزارنے کے بعد میں چپکے سے اٹھا ۔ بہت ڈرا ڈرا اور سہما سہما ۔ سویرے سویرے ہی اماں اور بٹیا ممانی کے درمیان ایک راونڈ ہو چکا تھا ۔ ابا کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے ۔ ان کے لوٹتے لوٹتے مطلع تھوڑا صاف ضرور ہو گیا تھا ۔ لیکن ابا اماں کو پوری روداد سنا چکی تھیں اور بہت دیر تک بٹیا ممانی کو برا بھلا کہتی رہی تھیں ۔ ابا بھی بہت کبیدہ خاطر ہو گئے تھے ۔ دروازے کی طرف جاتے ہوئے بار بار ڈر رہا تھا کہ کہیں ابا یا اماں کی آنکھ کھل گئی اور مجھے جاتے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی ۔

دروازے کے پاس پہونچ کر میں لمحہ بھر کو دم سادھے کھڑا رہا ۔ جاؤں یا نہ جاؤں ۔ سمّو باہر دروازے سے لگ کر ہی کھڑا تھا ۔ میرے قدموں کی آہٹ اس تک پہونچ چکی تھی ۔

”آؤ نہ یار“ سمّو پھسپھساتے ہوئے بولا ۔

لیکن میری نگاہ اس کوٹھری کی طرف تھی جہاں اماں ابا سو رہے تھے ۔ باہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی ۔

"ابے جلدی آنہ" سمّو نے جھنجھلاہٹ بھرے لہجہ میں کہا۔

میرے ہاتھ دروازے کی کنڈی کی طرف بڑھے لیکن پھر دفعتاً رک گئے۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"یار اس وقت نہیں شام کو کھیلیں گے۔" میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

لیکن سمّو بھی ایک ہی ضدی تھا۔

"آتا ہے یا نہیں؟" اس بار اس کے لہجے میں دھمکی کی کیفیت تھی۔ "کیا تیرے ہی ابا اماں ہیں۔ میرے ابا اماں نہیں ہیں کیا؟"

چند لمحے اس نے میرے جواب کا انتظار کیا۔ جب میں کچھ نہیں بولا تو وہ غصہ سے ابل پڑا۔

"اب تجھ سے کٹی ہو گئی۔ جا بیٹھ اپنی امّاں کی گود میں۔"

وہ جانے لگا۔ تبھی یکا یک جیسے تمام اندیشوں کو جھٹکتے ہوئے میں نے دروازہ کھول دیا۔ اور باہر آ گیا۔

"بول کیا کہتا ہے؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کی ناراضگی کم نہیں ہوئی تھی۔ میرا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں کہتا۔ کہہ تو دیا کہ تو جا کر بیٹھ اپنی اماں کی گود میں۔"

سمّو کی یہ عادت تھی۔ ناراض ہوتا تو مشکل سے ہی قابو میں آتا تھا۔

"غلطی ہو گئی یار۔" میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "اب ایسا نہیں ہوگا۔"

سمّو تھوڑا نرم پڑتے ہوئے بولا "اچھا تو ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آج شام کو گھومنے چلنا ہوگا۔" وہ شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کہاں؟" میں نے اور بھی تعجب سے پوچھا۔

"الو کی دم!" اس نے میرے بازو میں زور سے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ "بازار اور

کہاں۔ گھومنے اور کہاں جاتے ہیں؟"

بازار!..... باپ رے..... میرے تو ہوش اڑ گئے یہ سوچ کر۔ ابّا کا غصّہ سے تمتماہوا چہرہ سامنے آگیا۔

"بس! ٹیں بول گیا نہ" سمّو کھکھلا کر ہنس پڑا۔

یہ سچ ہے کہ سمّو جیسی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ یا تو میں اپنی فطرت سے ہی بزدل تھا یا پھر ابا اماں کی سخت گیری نے مجھے دبو بنا دیا تھا۔ وجہ جو بھی ہو لیکن یہ سچ ہے کہ مجھ میں ہمت اور جسارت کی بہت کمی تھی۔ لیک سے ہٹ کر چلنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ لیکن سمو کو لیک سے ہٹ کر ہی چلنے میں مزہ آتا تھا۔ جی تو میرا بھی بہت چاہتا تھا، سمو کی طرح بے روک ٹوک گھومنے پھرنے کو۔ اندر ہی اندر سمو سے جلن بھی ہوتی تھی۔ جو بیڑیاں میرے پیروں میں پڑی ہوئی تھیں انہیں توڑ ڈالنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔

اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے سمو کو ماں باپ کا بہت لاڈ پیار ملا تھا۔ درگاہی ماموں ہوں یا بٹیا ممانی دونوں ہی اس کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ وہ جس طرح لال پیلی آنکھیں دکھا کر درگاہی ماموں اور بٹیا ممانی سے بات کرتا تھا اس طرح ابا یا اماں سے بات کرنے کی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا

"یار۔ ابا ناراض ہوں گے۔" میں نے تھوڑا جھینپتے ہوئے کہا۔

"ابا ناراض ہوں گے، ہونہہ" وہ میری نقل اتارتے ہوئے بولا: "جیسے تیرے ہی ابا تو ہیں۔ اوروں کے تو ابا ہیں ہی نہیں۔ ارے! میں کیا جانتا نہیں کہ تو گھر گھسنا ہے، گھر سے باہر نکلتے تیری نانی مرتی ہے۔

میں خاموشی سے سنتا رہا اور اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ سمّو سے بحث کرنا فضول لگا۔ دراصل میں نے بھی اپنے لیے ایک ڈھال بنا رکھی تھی یا یوں کہئے کہ میرے اندر ایک ڈھال خود بخود بن گئی تھی جس کے بنانے میں شاید میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اگر ہاتھ تھا تو ان قدروں اور اصولوں کا جو بار بار ابّا اور امّاں کی نصیحتوں کی شکل میں میرے دل میں بیٹھنے لگے تھے۔ میں جہاں سمّو سے بہت

رشک کرتا تھا۔ وہاں میرے دل کی گہرائی میں کہیں یہ خیال بھی بیٹھا ہوا تھا کہ میں بہرحال اس سے برتر ہوں۔ مجھے لگتا تھا کہ اس کے طور طریقوں میں باہر سے چاہے جتنی بھی چمک دمک دکھائی دے ان میں چاہے جتنی بھی کشش ہو وہ غلط اور نامناسب۔ پھر بھی لگتا تھا کہ میرے اندر کہیں کہیں سمو بھی چھپا ہوا ہے جسے مجھے نکال پھینکنا چاہیے۔ لیکن بہت کوشش کرنے کے باوجود میں اسے نکال پھینکنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ اور کبھی کبھی تو میرے اندر چھپا ہوا یہ سمو مجھ پر اتنا حاوی ہو جاتا تھا کہ مجھے اس کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ہم دونوں مسجد کے ویران حجرے میں پہونچ گئے۔ جہاں لوگوں کی نظروں سے بچ کر ہم دونوں اکثر ہی کھیل کود میں بے سر پیر کی باتیں کرنے میں کچھ وقت بتاتے تھے۔ مسجد میں کوئی نہیں تھا اور بوسیدہ، سیلن بھرے حجرے میں لو اور دھوپ میں چل کر آنے کے بعد بہت راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ حجرے کی چھت میں چڑیوں نے بہت سے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ دروازے کے پاس کی تھوڑی سی جگہ کو چھوڑ کر حجرے کا باقی حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

سمو مجھے کھینچ کر دروازے سے دور لے گیا۔ پھر مجھے لگا کہ وہ اپنی جیب سے کوئی چیز نکال رہا ہے۔ اس نے جیب سے کوئی چیز نکال اور منہ سے دبالی۔ پھر بھک سے دیا سلائی کا زرد شعلہ میرے سامنے چمک اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ سمو نے ہونٹوں میں سگریٹ دبا رکھی تھی۔ سگریٹ سلگا کر اس نے جلتی ہوئی تیلی فرش پر پھینک دی۔ میں حیرت سے سب دیکھ رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں سمو کو سگریٹ پیتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دل میں نفرت کی ایک تیز لہر اٹھتی محسوس کی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ سمو سے ملنا جلنا مجھے تباہی کی طرف لے جا سکتا ہے۔

سمو زور زور سے سگریٹ کا کش لے رہا تھا اور ہر کش کے ساتھ مجھے اس کے ہونٹوں پر بڑی شرارت بھری مسکراہٹ دکھائی دے جاتی تھی۔ کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر ایک لمبا کش کھینچ کر اور سگریٹ ہونٹوں سے ہٹا کر اس نے سگریٹ میری طرف بڑھادی۔

"پیوگے؟"

"چھی! چھی! کتنی بری بات ہے۔" میں نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹکتے

ہوئے کہا۔

سمو نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"بری بات کیوں؟ کیا تمہارے ابا سگریٹ نہیں پیتے؟" بحث کرنا اس کی عادت تھی۔

"ان کی اور بات ہے"۔ میں نے اس کی دلیل کو رد کرنے کی کوشش کی۔ "کیا میں ان کی عمر کا ہوں؟"

"ارے عمر سے کیا ہوتا ہے"۔ اس نے کہا۔ "سگریٹ پینا برا ہے تو سب کے لیے برا ہونا چاہیئے۔ یہ کیا کہ بڑی عمر کے لوگ پی سکتے ہیں اور کم عمر کے لوگ نہیں پی سکتے۔ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں بحث کو جاری رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے شائد اسے میری شکست سمجھا۔ کہنے لگا ــــ "یار پی کر تو دیکھ ایسی بری چیز نہیں ہے۔"

اس نے سگریٹ پھر میری طرف بڑھا دی۔

میں دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک طرف تو یہ خواہش ہو رہی تھی کر پی کر دیکھوں تو سہی۔ کیسا مزہ ہوتا ہے سگریٹ کا۔ دوسری طرف لگتا تھا کہ بہت برا کام ہے یہ۔ میں نے بھی یہ کیا تو مجھ میں اور سمو میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔

لیکن شاید میرے اندر چھپا ہوا سمّو مجھ پر غالب آ گیا تھا۔ تبھی تو میں نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے لے کر ہونٹوں میں دبالی تھی۔ لیکن پہلا کش لیتے ہی اتنے زور کی کھانسی آئی کہ سگریٹ منہ سے اچھل کر دور جا گری تھی۔ آگ کی تیز لپیٹ نے جیسے میرے سینے کو اندر سے جھلس کر رکھ دیا تھا۔ اور منہ میں ویسی ہی کڑواہٹ بھر گئی تھی جیسی بیماری کی حالت میں ہوتی ہے۔ میں لگاتار کھانستا رہا تھا اور کھانسنے کے دوران مجھے سمّو کے قہقہے برابر سنائی دیتے رہے تھے۔

جب میری کھانسی اور سمّو کے قہقہوں کا طوفان کچھ تھما تو وہ بولا ــــ "مان گیا یار

تیرے بس کا یہ روگ نہیں ہے۔ سگریٹ پینے کے لیے بھی کلیجہ چاہیے۔ جل

میں بری طرح کھسیا گیا تھا۔ احساس کمتری اور تاسف کی ملی کیفیت میری رگ رگ میں پھیل گئی تھی۔ میں بے تحاشا گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ گھر میں سناٹا تھا۔ اور اماں اور ابا بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے پانی سے بیسیوں کلے کیے اور لمبی لمبی سانسیں چھوڑ کر یہ پتا لگانے کی کوشش کی کہ منھ سے کہیں سگریٹ کی بو تو نہیں آرہی ہے۔ ہر طرح سے مطمئن ہو کر میں بستر پر جا کر لیٹ گیا تھا۔

جہاں تک یاد آتا ہے۔ اس روز ہی شاید میں نے بے حد نمایاں اور صاف صاف طریقہ سے محسوس کر لیا تھا کہ میرے اور سمّو کے راستے الگ الگ ہیں۔ اگرچہ اس کے بعد بھی اس کے راستے بار بار اپنی طرف کھینچتے تھے لیکن اسے ایک کمزوری سمجھ کر میں اس پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں سمّو سے کترانے لگا تھا۔ میری کوشش رہتی تھی کہ اس سے کم سے کم ملا جائے۔ پہلے پہل اس میں بہت دقت بھی ہوئی تھی۔ سمّو بھی مجھے آسانی سے کھونے کو تیار نہ تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں جب اس کے ساتھ ہوتا ہوں تو اس کی انا کو ایک طرح کی تسکین ملتی رہتی ہے۔ لیکن میں احساس کمتری میں مبتلا رہتا ہوں اور مجھے بار بار خود کو یقین دلانا پڑتا ہے کہ میں اس سے کسی بھی لحاظ سے کمتر نہیں، بلکہ برتر ہوں۔

میں پڑھائی میں زیادہ سے زیادہ دل چسپی لینے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ سوچ کر بھی کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے میں اسے نیچا دکھا سکتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ پڑھائی میں اس کی دل چسپی بہت کم ہے۔ کھیل کود، سیر سپاٹا اور دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکنا ہی اس کے محبوب مشغلے ہیں۔

ان دنوں ہم دونوں آٹھویں درجہ میں پڑھ رہے تھے۔ سمّو فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔ اور اس بات کو لے کر میں اس سے بہت جلتا بھنتا بھی تھا۔ لیکن پھر میں نے تسکین کی ایک صورت ڈھونڈ نکالی تھی اور اپنے دل کو سمجھا دیا تھا کہ فٹ بال کی سنک سے پڑھائی کا شوق بہر حال بہتر

ہے ۔ لیکن ان سب کے باوجود جب ستمو کو کلاس کی فٹ بال ٹیم کا کپتان بنایا گیا تو میں رشک کی آگ میں جلے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ۔

میں ستمو سے لگاتار کٹتا جا رہا تھا ۔ اور میرے لیے اس کا جوش بھی ٹھنڈا پڑنے لگا تھا اس کی دوستی اب دوسرے لڑکوں سے تھی اور ان میں سے کئی تو عمر میں اس سے بہت بڑے تھے ۔ فٹ بال کا شوق دن بدن بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے دوستوں میں فٹ بال کے کئی پیشہ ور کھلاڑی بھی شامل ہو گئے تھے ۔ وہ رات میں بہت دیر سے گھر لوٹنے لگا تھا ۔

آٹھویں درجہ کے سالانہ امتحان میں میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا ۔ ستمو فیل ہو گیا تھا اور اسے آٹھویں درجہ میں ہی روک دیا گیا تھا ۔ کہہ نہیں سکتا کتنی خوشی ہوئی تھی مجھے ۔ اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی خوشی سے کہیں زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ستمو فیل ہو گیا تھا ۔ بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ ستمو کہیں دکھائی پڑ جائے ۔ کیا رنگ ہو گا اس کے چہرے پر ۔ میں نے اسکول میں چاروں طرف گھوم کر دیکھا بھی ۔ لیکن جانے کہاں لاپتہ ہو گیا تھا وہ ۔

میں خوش خوش گھر پہونچا تو دیکھا کہ اماں اور ابا ممانی میں مہابھارت چھڑی ہوئی ہے ۔

اماں مجھے دیکھتے ہی اونچی آواز میں بولیں ہائے ! دیکھو تو ای کتی کا ظلم ! کیسے کیسے اکو سے ہے ای ہمرے بٹیا کو ۔ ارے کتی ! کا ہمرا بٹوا ہی فیل کرا دیہس تیرے بٹوا کو جو ہاتھ دھو کے پیچھے پڑی ہے ہم سب کے ۔"

ادھر سے بٹیا ممانی کی پاٹ دار آواز آئی ۔ ہاں ہاں ! اب دماغ کا ہے نا ہوئیے ۔ بٹوا پاس جو کیہیس ہے ۔ جیسا دشمنا گت کیہیس ہے ہمرے ساتھ ۔ اللہ سب کا بدلہ لے لیہیس ۔ ہم کچھ نا بولے ہیں ۔

یہ لڑائی شاید لمبی کھنچے گی ! میں نے سوچا ۔ میں ستمو سے ملنے کو بے چین ہو رہا تھا ۔ شاید وہ گھر میں منہ چھپائے پڑا ہو ۔ سوچا کہ آواز دے کر اسے بلاؤں ۔ لیکن بٹیا ممانی بہت طیش میں تھیں اور بات بڑھنے کا اندیشہ تھا ۔ میں باہر گلی میں آ گیا اور بٹیا ممانی کے گھر پر ایک نگاہ ڈالی ۔ کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ ستمو گھر پر ہے یا نہیں ۔ تبھی ایک عورت بٹیا ممانی کے گھر سے باہر نکلی ۔

میں نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا ـــــ "سمّو گھر میں ہے؟"

وہ کچھ بولی نہیں۔ ایک معنی خیز مُسکراہٹ ہونٹوں پر لاکر اور ہاتھ ہلاتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی۔ تو سمّو گھر پر نہیں ہے۔ یقیناً وہ اسکول سے کہیں بھاگ گیا ہے۔ سیدھے گھر آنے کی ہمت اسے نہیں ہوئی ہو گی۔

کئی دنوں تک سمو کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ طرح طرح کی افواہیں سننے کو مل رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ کنوئیں میں گر کر جان دے دی ہے۔ کسی نے کہا کہ ریل کے پہئے کے نیچے دب کر مر گیا ہے کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ بٹیا ممانی کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ درگاہی ماموں بھاگے بھاگے پھر رہے تھے لیکن سمو کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔

سمو محلہ بھر میں گفتگو اور بحث مباحثہ کا مرکز بن گیا تھا۔ کوئی اسے لعنت ملامت کا نشانہ بنا رہا تھا تو کوئی درگاہی ماموں کی بدنصیبی پر آنسو بہا رہا تھا۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ۔ میں یہ تمام باتیں خوب مزے لے لے کر سنتا تھا۔ مجھے ایک عجیب خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ سمو کی مذمت ہو یا اس کے متعلق کہے گئے ہمدردی کے الفاظ، ان سب میں مجھے اپنی خوبیوں اور نیک چلنی کے اعتراف کی ہی گونج سُنائی دیتی تھی۔ اب یہ سب سوچ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور تاسف کا احساس بھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں میرے دل میں ایسے ہی خیالات آتے تھے۔

میں بیٹھک میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ گلی میں رکشے کی گھنٹیوں کی آواز سُنائی دی میں کھڑکی کے پاس جاکر باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ رکشہ رکا اور میں چونک پڑا۔ درگاہی ماموں اور سمو رکشے سے اتر رہے تھے۔ کیا حالت ہو گئی تھی سمّو کی۔ ان چند دنوں میں ہی وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ میں نے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری طرف دیکھے لیکن اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ آنکھیں نیچی کیے وہ درگاہی ماموں کے پیچھے پیچھے اس طرح چل رہا تھا جیسے وہ کوئی چوری کر چکا ہو اور چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔ اور سپاہی کے پیچھے پیچھے چل رہا ہو۔ میں خوشی کے مارے بے حال ہو رہا تھا۔ سمو کو اس شرمناک حالت میں دیکھ کر میری

خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی

سمو کوئی پندرہ دنوں تک گھر سے غائب رہا تھا۔ فیل ہو جانے کی خبر سنتے ہی وہ سیدھے گھر آیا تھا اور بٹیا ممانی کے بٹوے سے روپے چرا کر جو غائب ہوا تو پندرہ دنوں کے بعد ہی گھر لوٹا۔ بھاگ کر کلکتہ چلا گیا تھا۔ محلہ کے بہت سارے لوگ کام دھندے کے سلسلہ میں کلکتہ رہتے تھے۔ سمو پر ان کی نظر پڑی تو درگاہی ماموں کو خبر کر دی۔ درگاہی ماموں دوڑتے بھاگتے کلکتہ پہونچے اور سمو کو اپنے ساتھ لے کر آ گئے۔

اب سمو بالکل بدل گیا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی سمو ہے جو دن رات فٹ بال اور سیر سپاٹے کے پیچھے پاگل رہتا تھا۔ کیا مجال جو باہر کبھی دکھائی دے جائے۔ دن رات گھر میں پڑے رہنا اس کی جیسے عادت ہو گئی تھی۔ پھر سنا کہ وہ بیمار رہنے لگا ہے۔

کلکتہ کے پندرہ دن جیسے اس نے دوزخ میں رہ کر گزارے تھے۔ گندی بستی کے جال میں رہنا، اس چھوٹی عمر میں قلی اور مزدور کی طرح روٹی کے لیے کڑی محنت کرنا۔ پھر ملیریا کا حملہ۔ اس کی صحت چوپٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ ملیریا سے چھٹکارا مل گیا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد ہی پھر بخار نے آ دبوچا۔

رات کافی بیت چکی ہے میں بستر پر لیٹا کروٹیں بدل رہا ہوں۔ لمبا سفر کرنے اور تھکا ہونے کے باوجود نیند کالے کوسوں دور ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اماں اور بٹیا ممانی کے کھانسنے کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ کبھی گلی میں کوئی کتا بھونکنے لگتا ہے یا ڈراونی آواز میں رونا شروع کر دیتا ہے۔ دفعتاً وقت کے لمبے فاصلے کو چیر کر دبے جان، بجھی بجھی سی آنکھیں کیسی دہشت انگیز تصویر کی طرح میرے سامنے آ گئی ہیں۔ میں کانپ اٹھتا ہوں۔ یہ بیمار سمو کی آنکھیں ہیں جو بیجان اور بجھی بجھی ہونے کے باوجود مجھے اندر سے پارہ پارہ کیے دے رہی ہیں۔ ایک تلملاہٹ کا احساس ہے جسے جھٹک کر میں الگ کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ الگ نہیں ہوتا۔ پھر ایک سوکھا، کمھلایا اور مرجھایا ہوا ہاتھ جانے کہاں سے نمودار ہو گیا ہے.... مجھے اپنی طرف بلاتا ہوا ہاتھ ...... میں تقریباً چیخ پڑتا ہوں ...... اف! کیا بھیانک

منظر ہے ......

...... جاڑے کی ایک بے رنگ، اداس اداس سی شام۔ میں سمو کے گھر کے سامنے سے گذر رہا ہوں۔ یکایک، بے اختیار میری نگاہیں سمّو کی آنکھوں سے ٹکرا جاتی ہیں۔ کھڑکی کے پاس ایک اسٹول پر اس کا نڈھال جسم دھرا ہے۔ اور اپنا کمزور نحیف ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ میں اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ لیکن عین اسی لمحہ اماں کے الفاظ کسی بگولے کی طرح میرے دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں

"سمو کو بڑا نا بخار ہے۔ اس کی پرچھائیں سے بھی بچو۔" میرے بڑھتے ہوئے قدم یکایک رک جاتے ہیں۔ میں سمو کی طرف سے نگاہیں پھیر کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔

میں نے سمو کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے چوتھے روز ہی وہ مر گیا تھا۔

میں ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ اماں کی آواز جیسے بہت دور سے مجھے سنائی دے رہی ہے۔

"جلدی اٹھو۔ تمری بٹیا ممانی جا رہی ہیں۔ تمرے خاطر ہی تو رکی تھیں۔"

میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہوں۔ بٹیا ممانی کو جا کر سلام کرتا ہوں۔ باہر رکشہ کھڑا ہے۔ رکشے پر سوار ہونے سے پہلے یکایک بٹیا ممانی مجھے اپنے سینے سے لگا لیتی ہیں اور بلک بلک کر رونے لگتی ہیں۔ لیکن میری آنکھوں میں تو آنسو کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے، بٹیا ممانی مجھے سینے سے لگا کر اس طرح کیوں رو رہی ہیں! تبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شاید انجانے ہی میں میں نے ان کے دل کے کسی پرانے کھرنڈ کو چھیل کر رکھ دیا ہے جس سے وہ لہولہان ہو گئی ہیں۔

رات منزل اور مسکراہٹ

(گُربچن سنگھ)

رات کے دس بج رہے ہیں اور میں اس عظیم الشان ہوٹل کے دروازے پر چوکیداری کے لئے کھڑا ہوں۔ سڑک پر آمد و رفت کم ہو چکی ہے۔ بڑی بڑی دکانوں کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی پیشانی سے رنگین روشنیوں کا آنچل لہرا رہا ہے ان کے سامنے بڑے بڑے برآمدوں میں فٹ پاتھ کے باکر، مزدور اور بوٹ پالش کرنے والے لڑکے لیٹ چکے ہیں۔ سینما کا آخری شو بھی کچھ دیر بعد ختم ہو گا۔ چند لمحات کے بعد سڑک پر موٹروں کا شور اُبھرے گا اور پھر ایک عجیب سا سناٹا چھا جائے گا۔ ایک خاموشی۔ ایک پُر سکون خاموش ماحول میں اکثر میری بچّی کو گہری نیند آجایا کرتی ہے۔

تیسرے پہر جب میں گھر سے چلا تھا وہ مجھ سے کہہ رہی تھی "بابا جلدی لوٹ آنا۔

میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا "ہاں جلد ہی لوٹ آؤں گا بیٹی۔"

میں روز اس سے ایسا ہی وعدہ کرتا ہوں۔ اس کی بھولی سی صورت معصوم آنکھوں میں سے جھلکتی ہوئی التجا میرے سینہ میں برچھی کی طرح اُتر جاتی ہے اور میرا وعدہ، وعدہ ہو کر ہی رہ جاتا ہے۔ وہ بیمار ہے۔ عرصہ سے بیمار ہے وہ میری ننھی بچّی۔ میں اسے اپنی زندگی کا سارا سُکھ دے سکتا ہوں۔ اس کے لئے اپنی جان نچھاور کر سکتا ہوں، لیکن اس کی یہ ادنیٰ سی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔

شام کے وقت جب اندھیرے کی اُداسی اس کی آنکھوں میں ویرانی بھر دیتی ہے، میں اس کے قریب نہیں ہوتا، وہ مجھے یاد کرتی رہتی ہے۔ میری مریض بیوی جو میری مجبوریوں

کو سمجھتی ہے۔ اپنی نادان بچی کو کئی طریقوں سے سمجھاتی رہتی ہے۔

میں اس وقت یہ سب باتیں قطعی نہیں سوچنا چاہتا ہیں ڈیوٹی پر جو ہوں شہر کے پُر رونق بازار کا یہ ایک گوشہ۔ شام کو یہاں موٹر، ٹرام اور پیدل چلنے والوں کا ایک تانتا سا بندھ جاتا ہے۔ دُنیا کے ہر کونے کا انسان یہاں گھومتا پھرتا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سڑک کے کنارے جہاں بڑی بڑی عظیم عمارتیں، سنیما ہال اور مشہور دُکانیں ہیں، وہاں بڑے بڑے ہوٹل اور ریسٹران بھی ہیں۔ اور میں تو یہاں کے سب سے بڑے اور مشہور ہوٹل کا گیٹ کیپر ہوں۔ ہوٹل کا نام لینا مناسب نہیں سمجھتا۔ عین اسی طرح میں اپنا نام بھی بتانا مناسب نہیں سمجھتا۔ جو مجھ سے میری حقیقت سے واقف نہیں، وہ مجھے اعلیٰ خاکی وردی میں فوج کا کپتان سمجھنے کا دھوکا کھا سکتے ہیں۔ میری وردی روزانہ لانڈری سے دُھل کر آتی ہے۔ مجال ہے، جو کہیں سے بھی کریز ٹوٹی دکھائی پڑے۔

جیوں ہی شام کا جھٹ پٹا رات کی تاریکی میں بدل جاتا ہے جگمگاتی ہوئی بتیوں کی روشنیاں اس اندھیرے کو اپنے محدود آنچل میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگتی ہیں۔ اس اسکوائر کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ ہوٹلوں میں محفلیں گرم ہونے لگتی ہیں۔ قریب قریب جانی پہچانی صورتوں کا میری نظریں جائزہ لینے لگتی ہیں۔

دس برسوں سے میری نظروں نے بہت کچھ دیکھا ہے، بہت کچھ پہچانا ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے حسین و دل آویز قہقہے سُنے ہیں۔ دبی گھٹی سسکیاں اور ہلکی ہلکی پھسپھساہٹیں بھی۔ میں نے یہاں نشے میں ڈوب کر بہکنے والوں کی بکواس سُنی ہے اور دماغی طور پر شکست کھائے ہوئے پریشان لوگوں کی مایوس کُن اُکھڑی اُکھڑی باتیں۔ بیزنیس..... روپیہ پیسہ..... سیاست اور سنگیت..... ان سب کے بارے میں بہت کچھ سُنا ہے۔ کیسے کہوں کہ میں ایک خواندہ آدمی ہوں اور ان ساری باتوں کی سمجھ رکھتا ہوں۔

ہوٹل کے اندر سنگیت کی دُھن گونج رہی ہے، مصر کی ایک بے مثال حسینہ

آج اپنے رقص وفن کا مظاہرہ کرے گی۔ نام ہے بادِ صبا.. ! بادِ صبا میری بیوی کی طرح لوریاں نہیں گا سکتی، جنھیں سُن کر میری بیٹی گہری میٹھی نیند سو جاتی ہے۔ بادِ صبا، چندا ماما کی کہانی نہیں سُنا سکتی جنھیں سُن کر میری بچّی خوابوں کی دُنیا میں کھو جاتی ہے میں جانتا ہوں..... اس درمیان میری پیاری بچّی نے اپنی معصوم آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا ہو گا، اور پھر اپنی ماں سے پوچھا ہو گا "ماں، بابو جی نہیں آئے؟" اور میری بیوی نے کہا ہو گا "سو جا بیٹی ! وہ آتے ہی ہوں گے !"

مصر کی حسینہ بادِ صبا لوریاں نہیں گا سکتی اور میری بیوی، میری دُلاری بچّی کو مصر کے نیل کی وادی کی کہانیاں نہیں سُنا سکتی۔ قارون اور افلاطون کی کہاوتیں نہیں سُنا سکتی۔ وہ بڑے بڑے ریگستانوں میں بنے پرامیڈ کے قصے نہیں سُنا سکتی۔ وہ نیل ندی کی مچلتی ہوئی لہروں پر تیرنے والے قلوپطرہ کے بجرے کا حُسن بیان نہیں کر سکتی۔

بادِ صبا گاتی ہے، مہکتے ہوئے پیالوں کا گیت جو شہد کی طرح میٹھے ہیں اور انگاروں کی طرح گرم، جن کا نشہ بڑا تلخ ہوتا ہے۔ وہ جام و مینا کے گیت گاتی ہوئی رنگین روشنیوں کا آنچل پھہرائے رقص کر رہی ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں، سڑکیں ویران ہو چلی ہیں، راستے سنسان پڑ چکے ہیں۔ آج وہ ساری رات ناچتی رہے گی ناچتی ہی رہے گی۔ شب کے ستارے اونگھتے اونگھتے نیلگوں آسمان کی گہرائیوں میں ڈوب جائیں گے۔ میں نیند کا خمار اپنی آنکھوں میں پلکوں تلے سمیٹتا رہوں گا۔

راکا ابھی ابھی سیڑھیاں اُتر کر نیچے سڑک کی طرف گئی ہے، وہ مغرب کی جانب اُبھرتے چاند کو دیکھ رہی ہے۔ ہوا میں خنکی بھر آئی ہے۔ سامنے میدان میں صندل کے درخت ساکن کھڑے اپنی مہک بکھیر رہے ہیں۔ چاندنی میں ان کا سایہ دُلہن کی طرح سمٹ کر بے حس و حرکت کھڑا دکھائی دے رہا ہے۔ راکا چاند کی طرف دیکھ رہی ہے۔ آج ہوٹلوں کی طرف سے اُسے چھُٹی ہے۔ آج وہ ناچے گی۔ بادِ صبا جو ناچ رہی ہے۔ اچانک ہال سے سازوں کی آواز آنی بند ہو گئی ہے۔ تالیوں کی آواز گونج اُٹھی

ہے۔ ناچ اور گیت کا ایک دَور ختم ہوگیا۔ میری بیوی جاگ رہی ہوگی۔ جانے کیوں وہ کبھی کبھی سوئی سوئی چونک کر اُٹھ بیٹھتی ہے۔

"اردلی! راکا کی آواز ہے۔ وہ میرے قریب آتی ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

"اردلی تم بہت اُداس دکھائی دیتا ہے، کیا بات ہے؟"

"نہیں میم صاحب ایسی بات نہیں ہے۔"

"کتنا بجا ہے؟"

"میں اپنے ہاتھ کی گھڑی دیکھتا ہوں۔" بارہ بجنے والے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔

"میم صاحب بارہ بجے گا۔"

"اوہ! وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتی ہے۔"

"آج آپ نہیں ناچے گا؟"

"اوہ .... نو .... نو ....." جیسے کسی ذہنی کرب سے اس کا دل دُکھنے لگتا ہے۔ دل شکنی .... مایوسی .... شکست، محض ایک مظاہرے کی ہوس اور کچھ نہیں ...... اور کچھ نہیں۔

"میں اور کچھ نہیں پوچھتا" راکا ہوٹل کے اندر چلی جاتی ہے۔

سنگیت کی لے پھر اُبھرنے لگی ہے۔ مصر کی ممی میں جان آ چلی ہے۔ وہ پھر زندہ ہو اُٹھی ہے۔ شاید وہ اپنی نیم وا آنکھوں سے نئے زمانے کی نئی شکلوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے، وہ ایک عجیب سا گیت گا رہی ہے جس کے الفاظ نہ تو میں اچھی طرح سُن سکتا ہوں اور نہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔

شاید میری بچّی، میرا انتظار کرتے کرتے پھر سو گئی ہوگی اس کی کنول کی پنکھڑیوں جیسی نازک پلکیں مُندی ہوں گی اور وہ ایک خواب دیکھ رہی ہوگی۔ میں اس کا غریب باپ اس کے لئے چاند تاروں کے بہت سارے کھلونے لئے اُڑا چلا آ رہا ہوں۔ جیوں ہی دروازے کے قریب پہنچتا ہوں، وہ لپک کر میری طرف آتی ہے۔ 'بابو جی'! اور وہ چونک کر آنکھیں کھول دے گی۔ اپنی ماں سے پوچھے گی، "ماں! بابو جی نہیں آئے۔؟"

وہ اسے کہہ دے گی۔ آتے ہی ہوں گے بیٹی......تو سو جا....!"

ایک نوجوان جوڑا ٹیکسی سے اُتر کر اس طرف آ رہا ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو تھام رکھا ہے۔ یوں شک ہوتا ہے، انھیں اپنے آپ کا ہوش نہیں۔"

اچانک حسینہ کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہتی ہے۔

"لو دیکھو تو، میں تمھارا نام پھر بھول گئی۔"

"میں نے کہا نا جانِ من تم مجھے چاند، ستارہ، آسمان، راکیٹ، ہائیڈروجن بم، ایٹم بم۔ جو کہہ کر پکار لو، مجھے سب گوارا ہے۔"

"ڈارلنگ! مجھے پریشان مت کرو۔ اپنا نام ٹھیک طرح بتا دو" حسینہ روٹھنے کے انداز میں کہتی ہے۔

"میرا نام جمی ہے.... نوجوان ہنستا ہے۔

"اور میرا نام رس بیری....." دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔

رس بیری پوچھتی ہے "جمی تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو....؟"

"چاند میں!" جمی کہتا ہے۔ گھبراؤ نہیں جانِ من۔ میں کوئی غیر ذمہ دار، دھوکا باز آدمی نہیں۔ میں شانتی کا پجاری ہوں۔ ایک آزاد ملک کا آزاد شہری۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"وہ پھر ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اندر بادِ صبا نغمہ سرا ہے ویران سڑک پر ایک دیوانہ اول فول بکتا ہوا گزر رہا ہے۔

"میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ میرا راستہ مت روکو۔" پھر گالی گلوچ، سالا، بہن بھائی وغیرہ۔!" اچانک وہ چلتا چلتا رُک جاتا ہے اور ہوٹل کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ کر چیختا ہے۔ "شاردا میں کہتا ہوں نیچے آ جاؤ۔ اگر میں اوپر آ گیا تو تیری جان لے لوں گا.... شاردا.....!" اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے، پگلی۔

یہ بھی آزاد ملک کا آزاد شہری ہے۔

بادِ صبا گا رہی ہے۔

میں پہرے دار ہوں، اس عظیم الشان ہوٹل کا۔ یہاں کا دھن دولت، روپئے

پیسے اور عزت کا۔ بادِ صبا، اور رس بیری کا۔ سب مجھ پر یقین کر سکتے ہیں۔ میرا عوضانہ ہے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ۔ رات بھر دروازے پر کھڑا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ رات میرے لئے نہیں ہوتی۔ گیت، سنگیت اور آرام میرے لئے نہیں ہوتا۔ میری بچی کی خواہش ..... اس کے ارمان ..... اس کا سکھ میرے بس میں نہیں ہوتا۔ وہ اب تک نہ جانے کتنی مرتبہ چونک کر اپنی ماں سے پوچھ بیٹھی ہوگی، بیبی جی! بابو جی نہیں آئے۔

آج تو اسے بہت زیادہ بخار تھا۔ ڈاکٹر کہتا تھا ممکن ہے بچی کے دل و دماغ پر رات رات بھر جاگنے کا خراب اثر پڑے۔ نہیں نہیں میری ایک ہی تو بچی ہے اور کوئی اولاد نہیں۔ کوئی اُمید بھی نہیں۔

سلام! میرا ہاتھ اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ رات کا ایک بج رہا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ شہر کے رئیس کا اکلوتا لڑکا ہے۔ روز ہوٹل میں آتا ہے۔ بازی لگتی ہے۔ جام کھنکتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے آپ کو کنواری سمجھنے والی حسیناؤں کے جمگھٹ میں بیٹھ کر وہ راک اینڈ رال یا رمبا سنبھا کے بول دُہراتا رہتا ہے۔ وہ اپنے ایک نوجوان ساتھی سے کہہ رہا ہے۔ وہ خود کشی کرے گا۔ اپ ٹو ڈیٹ نوجوان کہتا ہے۔ دھت اے سلی یو آر... اتنے جذباتی نہیں بننا چاہئے۔ مرد تو عزت کے لئے۔ روپے سٹے میں گئے۔ جوئے میں گئے، تو دُکھ کیسا۔ کسی نے غبن تو نہیں کئے۔ مانگ کر ہضم تو نہیں کئے۔ تم نے ضرور جگر کا کھایا ہے میرے دوست۔ روپیہ تو محض ایک بہانہ ہے۔ چلو ہم کُھلی ہوا میں کچھ دیر سڑک پر ٹہلیں کوئی نہ کوئی دلچسپی کا سامان مل ہی جائے گا۔

عین اُسی وقت راکا ان کے پیچھے پیچھے آتی ہے۔ راکیش!' وہ پکارتی ہے مجھے یہاں سے لے چلو۔ پلیز، مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔

خود کُشی کرنے والے نوجوان میں گویا پھر زندگی لوٹ آتی ہے۔ دور ایک تارا ٹوٹ کر گرتا دکھائی دیتا ہے۔ نہ جانے روز کتنے تارے ٹوٹ کر دھرتی پر گرتے ہیں راکا نوجوان کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھ جاتی ہے۔ کار گھر گھراتی ہے اور ہوا سے باتیں کرنے لگتی ہے۔

اَپ ٹو ڈیٹ ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہتا ہے۔ ہُش ایڈیٹ۔ مُردہ، یوں لگ رہا ہے۔ اندر سازوں کی دُھن تیز ہو اُٹھی ہے۔ سُریں تڑپ رہی ہیں اور تڑپیں گی اور تڑپ کر شانت ہو جائیں گی جیسے طوفان کے بعد ساگر کے کناروں میں ایک ہلکی سی ہلچل ہی باقی رہ جاتی ہے۔ نہیں نہیں جیسے جنگل میں ایک خوفناک طوفان کے بعد گہری خامشی چھا جاتی ہے اور اس خامشی کو پتوں پر سے ٹپکنے والی پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ کی آواز سے چونکاتی رہتی ہیں ایسا پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا لیکن آج ......

بادِ صبا خاموش ہو گئی ہے۔

رات آدھی سے کافی زیادہ بیت چکی ہے۔ ہوٹل میں مکین لوگ اپنے اپنے کمروں میں لوٹ گئے ہوں گے وہ اب گہری نیند سو جائیں گے اور خوابوں کی دُنیا کی سیر کر رہے ہوں گے۔ دور آسمان پر چاند کس قدر اُداس دکھائی دیتا ہے۔ ستارے جیسے کسی گہری چنتا میں کھو گئے ہیں۔ وہ لوگ جو پارک کے اس پار جھیل میں کشتیوں کی سیر کو گئے تھے، واپس لوٹ رہے ہیں۔ ایک دن مارو ے یہیں کھڑا اپنے ایک دوست سے کہہ رہا تھا، پیرس کے دلدار چاندنی راتوں میں عُریاں ہو کر کشتی کی سیر کا مزہ لوٹتے ہیں، چاندنی جب تک جسم کو چھوئے نہیں، تب تک چاندنی رات کا لطف نہیں آتا اُمڑے ہوئے بادل ایک طرف کھسک گئے ہیں۔ پر چاند اُداس ہے۔ ایک دن جب انسان چاند پر پہنچ جائے گا تب ......؟

میری بیوی ... میری بچی کو چاند سے کوئی دلچسپی نہیں۔ راتیں ان کے لئے بڑی بھاری ہوتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ان کے گذر جانے کی دُعائیں مانگتی رہتی ہیں۔ میں بھی یہی سوچتا رہتا ہوں۔ رات جلدی بیت جائے۔

تھوڑی دیر بعد مشرق میں پو پھوٹے گی۔ اُجالا بکھرے گا۔ پھر رفتہ رفتہ آفتاب طلوع ہوگا اور اس کی تیز شعاعوں سے تاریکی کا سینہ چھلنی ہو جائے گا۔ انسان جاگ جائے گا سوئے ہوئے احساسات بیدار ہو کر اُٹھیں گے۔ تاریک گپھاؤں میں چھپے ہوئے اندھیرے کی طرح دل و دماغ پر چھائے ہوئے پراگندہ خیالات روپوش ہو جائیں گے

تب راکا سوچے گی۔ میں نے رات کے قیمتی لمحات کن پریشانیوں اور کشمکش میں گذارے۔
بادِ صبا تھکی ہاری سی کروٹیں لے لے کر جسم کی تھکان کو سُلا دینے کی کوشش کرے گی۔
پھر وہی زندگی ...... زندگی چل رہی ہے۔ کراہ رہی ہے۔ سنگھرش کر رہی ہے......
مسکرا رہی ہے اور میری بچی......؟"

میں اپنی بچّی کے لئے رنگین مہکتے پھولوں کا ایک بڑا ہی خوبصورت گلدستہ اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں اپنی بیوی سے کہوں گا۔ دیکھو یہ پھول بچّی کے لئے لایا ہوں۔ یہ کتنے خوبصورت ہیں اور کتنے پاکیزہ۔ رات کی پاکیزگی کے مظہر یہ پھول قدرت کے بے داغ ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ تم مجھ پر بھی یقین کرو میں ساری رات دور آکاش کو دیکھتا ہوا آنکھوں آنکھوں ہی میں بتا دیتا ہوں۔

میں بیزار سا اپنے تُلے قدموں سے عظیم الشان ہوٹل کے سامنے گھومنے لگا ہوں جیسے میرا ہر قدم ایک منزل کی طرف اُٹھ رہا ہو، جہاں شانتی ملتی ہے، سُکھ ملتا ہے۔ آرام ملتا ہے۔ بیوی کی مسکراہٹ اور معصوم بچّی کی میٹھی میٹھی باتیں سُننے کو ملتی ہیں۔ اندھیرا ڈھل رہا ہے زمانہ سو رہا ہے، آسمان جاگ رہا ہے اور میں شاید بھٹک رہا ہوں۔

نروان

(زکی انور)

"کیا یہ میں ہوں؟"

ایک دن میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر میں پالنے پر پڑے ہاتھ پاؤں پھینکنے والے بچّے کی طرح ہنس پڑی یقیناً میری وہ ہنسی بہت معصوم اور بھولی بھالی سی ہنسی تھی۔ لیکن اس دن زندگی میں پہلی بار مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ ہنسی جسے شبنم کے قطروں سے بھی زیادہ خنک ہونا چاہیے۔ دہکتا ہوا انگارہ بھی ہوسکتی ہے اور اس دہکتے ہوئے انگارے کے قریب مجھے اپنا وجود سلگتا ہوا محسوس ہونے لگا اور میں کانپ اُٹھی...... اور تب میں نہایت ہی سنجیدگی اور ایمانداری کے ساتھ اپنی زندگی کا مطالعہ کرنے لگی .... اور اس مطالعہ میں پل دو پل نہیں گھڑی دو گھڑی نہیں ..... دن ہفتے مہینے اور سال نہیں صدیاں بیت گئیں۔ نہ جانے کتنی کرب ناک صدیاں!

لیکن صدیوں کی کاوش کے بعد میں بہرحال کسی نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئی اور مطالعے کے اس نتیجے نے مجھے مفلوج سا بنا دیا۔ کہ بھائی جان نے اپنی زندگی کے جس کرب کو کسی عزیز ترین تحفے کی طرح کلیجے سے لگا کر رکھا ہوا تھا۔ اب وہ کرب چپکے چپکے، دھیرے دھیرے، دبلے پاؤں چور دروازے سے میری زندگی میں بھی داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

اور اس دن پہلی بار میں بھائی جان کے کرب کے لئے رو پڑی۔

یہ دس دس کوئنٹل کے بڑے بڑے دماغ پالنے والے بد دماغ ....

لوگ...... اُف خدا کی پناہ ایسی عظیم الشان بد دماغی؟...... اتنی بھاری حماقت ...... بٹوارہ...... بٹوارہ...... ملک کا بٹوارہ؟...... نہیں نہیں وہ ملک کا بٹوارہ کہاں تھا...... ملک کب کٹا؟...... ملک کب بٹا؟...... ملک تو آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا...... وہ تو انسان کے جسم کا بٹوارہ تھا...... آدھا جسم ادھر آدھا جسم اُدھر...... وہ تو دل کا بٹوارہ تھا...... آدھا دل اِدھر آدھا دل اُدھر ...... وہ تو خون کا بٹوارہ تھا...... خون کی ندیاں ادھر، کچھ ندیاں ادھر...... وہ تو......

بھائی جان کسی قدر زور دار آواز میں مزید کچھ دیر تک بڑبڑاتے رہے اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ انھوں نے شیشے کا بہت ہی خوبصورت اور نفیس گلدان اٹھاکر دیوار پر دے مارا...... اور پھر اس سے بھی کہیں زیادہ خوبصورت اور نرم ونازک بلوری اگربتی دان کا بھی وہی حشر ہوا یہ گلدان اور یہ اگربتی دان بنارس کی ان کی ایک عقیدت مند شاگردہ نے انھیں دیا تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں وہ بہت حفاظت اور پیار سے رکھا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ ختم ہوچکے تھے۔ البتہ شیشے کے چھوٹے بڑے نوکیلے لمبے ٹکڑے فرش پر بکھرے پڑے تھے اور بھائی جان ان پر تیز نظریں جمائے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔

وہ پھر بکنے لگے۔

نہیں نہیں نہیں...... میں پرانی یادوں کی یہ لاش کب تک سنبھال کر رکھوں گا ...... نہیں نہیں نہیں...... اُف یہ ہیبت ناک لاشیں!......"

یک لخت انھوں نے کینوس اسٹینڈ پر ایک زوردار لات جمائی اور وہ دور جاگرا۔ پھر وہ اسٹول پر بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

کچھ دیر پہلے وہ اسٹول پر کتنے تزک واحتشام سے بیٹھے تھے!

اگربتیاں جلائی گئی تھیں اور انھیں ترتیب سے اگربتی دان میں کھونسا گیا تھا اور پھر اگربتی دان کینوس اسٹینڈ کے برابر کی اس چھوٹی سی میز پر رکھ دیا گیا جس پر چاندی کے فریم میں ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر رکھی گئی تھی لیکن جس فریم پر گرد کی

ایک دبیز تہہ جم گئی تھی۔

گلاب کے تازہ پھول منگوائے گئے تھے اور انھیں گلدان میں سجاکر کینوس اسٹینڈ کے پاس ہی اس اسٹول پر رکھ دیا گیا تھا جس اسٹول پر کلر پینٹ رکھی ہوئی تھی۔

اور کچھ دیر پہلے برش ہاتھ میں لینے سے پہلے پنسل سے کینوس اسٹینڈ میں جڑے آرٹ پیپر پر سب سے اوپر سات سو چھیاسی بھی لکھا گیا تھا۔

اور پھر برش کو ہاتھ میں لیئے وہ دیر تک بہت سوچ سوچ کر جیسے ذہن پر زور دے کر وہ کچھ بدبداتے رہے تھے۔ غالباً بچپن کی یاد کی ہوئی کوئی دُعا جو انھیں بخوبی یاد نہیں رہ گئی تھی۔

لیکن اتنی تیاریوں کے باوجود نتیجہ تو اس بار بھی وہی نکلا تھا جو گذشتہ سات آٹھ مہینوں سے ان کا مقدر بن چکا تھا۔ یعنی وہ گھنٹوں ہاتھ میں برش لیئے لگاتار سگریٹ پیتے کینوس پر نظر جمائے رہے اور پھر .... اور پھر ......

نہیں نہیں اب کے گذشتہ سات آٹھ مہینوں کی طرح صرف بڑبڑاتے ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے پُرانی یادوں کی لاشوں کو اپنی فرش ٹرے شن کا شکار بھی تو بنایا تھا اور وہ شیشے کے چھوٹے بڑے نوکیلے لمبے ٹکڑے فرش پر بکھرے پڑے تھے۔

ہاں .... ہاں گزشتہ سات آٹھ مہینوں کے نتیجوں میں اور آج کے نتیجے میں ایک بڑا فرق یہ بھی تو تھا کہ میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا ——

"کیا یہ میں ہوں؟ —— "

اُف .... خدا کی پناہ ...... میں سُلگنے لگی ہوں!

اور میں سوچ رہی ہوں کہ کیا میں اس دہکتے ہوئے انگارے کو اپنی زندگی سے دور ..... بہت دور پھینک دینے کے لئے اپنا بازو بالکل کمزور محسوس کر رہی ہوں؟ وہی بازو جس نے ویٹ تھروئنگ میں کبھی کسی پہلوان لڑکی کو بھی فرسٹ پرائز نہیں لینے دیا؟

اور تب دہکتے ہوئے انگارے سے اپنا من سلگاتی ہوئی میں راکھ کر دینے لگی ہوں

اور اپنی اس احمقانہ حرکت پر مجھے پھر ہنسی آگئی اور دہکتے ہوئے انگارے کی شدت ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ لیکن میں جیسے گرد و پیش سے بالکل بے فکر بے نیاز راکھ کریدتی جا رہی ہوں اور ہنستی جا رہی ہوں اور سُلگتی جا رہی ہوں ۔۔۔۔۔۔

بھائی جان کے اسٹوڈیو میں قدم رکھنے کی ہمت کسی کو، یہاں تک کہ امّی جان کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن روحی آپا بے دھڑک گھس گئیں اور حکم چلانے کے سے انداز میں بولیں۔

"ابا جان! آپ کو یاد کر رہے ہیں؟"

"بیٹھو۔" بھائی جان بڑے وقار کے ساتھ بولے "بیٹھ جاؤ۔"

"نہ بیٹھنے کی جگہ ہے اور نہ بیٹھنے کا وقت۔" روحی آپا نے کہا۔ ابا جان آپ کو بُلا رہے ہیں چلیے۔

اگر میں یہ سمجھوں کہ دُنیا میں میرا اپنا کوئی بھی نہیں ہے۔ بھائی جان کہنے لگے "جو بھی ہے غیر ہے تو کیا یہ غلط ہے؟ ...... میں اس لمبی دُنیا چوڑی دُنیا میں ایک اکیلا آدمی ہوں ...... ایک تنہا آدمی ..... اُف خدا کی پناہ کس قدر ڈس اپوائنٹڈ اکیلا آدمی ...... کس قدر فرس ٹرے ٹڈ تنہا آدمی ..... وہ نہایت ہی بے بسی سے روحی آپا کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن روحی آپا پر ان کی بے بسی کا جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا اور وہ نہایت ہی غیر سنجیدہ انداز میں بولیں۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ..... آپ ضرور ایسا کچھ سوچ سکتے ہیں کسی کے سوچنے پر کسی کی کوئی پابندی نہیں، نہ حکومت کی نہ سماج کی نہ میری ...... آپ کچھ بھی سوچنے کا حق رکھتے ہیں ..... اور آخر احمق لوگ درخت میں تھوڑا ہی لگتے ہیں ...... ہم آپ میں تو ہوتے ہیں! ..... بہر حال اس موضوع پر پھر کبھی باتیں ہو لیں گی۔ فی الحال تو آپ چلیے ابا جان آپ کو کسی ضروری کام سے بُلا رہے ہیں۔"

بھائی جان نہایت ہی خاموشی سے اُٹھے اور روحی آپا کے پیچھے پیچھے اپنے اسٹوڈیو

سے باہر چلے گئے۔

وہ دن اور آج کا دن۔

ایک لمبی مُدّت ایک طویل عرصہ اور مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کئی یُگ بیت گئے ہیں، جیسے صدیاں بیت گئی ہیں، جیسے کئی بار فنا ہو ہو کر دُنیا بسی ہے، جیسے ہزاروں بار نوح کا طوفان آیا ہے اور پتہ نہیں کتنی بار میں نے مر مر کر جنم لیا ہے لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیا ہونے لگا ہے ...... اور کل کیا ہونے والا ہے؟

بھائی جان کا اسٹوڈیو ویران پڑا ہے۔ ان کے کینوس .... کے برابر کی چھوٹی سی میز پر چاندی کے فریم میں اس لڑکی کی تصویر گرد کی تہہ سے چھپ گئی ہے اور روحی آپا منوں مٹّی کے نیچے دب گئی ہیں لیکن ابا جان آج بھی بھائی جان سے ناامید نہیں اور آج بھی بڑے فخر کے ساتھ سینہ تان کر کہتے ہیں۔

"رفعت میرا بھتیجا نہیں میرا بیٹا ہے۔ وہ کم از کم میرا حکم کبھی نہیں ٹال سکتا۔ وہ مجھے کبھی نہیں مایوس کر سکتا لیکن ابھی اس کا زخم ہرا ہے میں کس مُنھ سے اسے کچھ کہہ سکتا ہوں۔ لیکن تم دیکھ لینا......"

لیکن امی جان بُرا سا مُنھ بنا لیتی ہیں کچھ اس طرح جیسے ان کے مُنھ میں کسی نے کوئی بہت ہی تلخ اور کڑوی دوا ڈال دی ہو۔ اور میں — میں جو ان باتوں میں کوئی خاصی انٹرسٹیڈ بھی نہیں ہوں لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری رگوں میں خون کے ساتھ کوئی اور چیز بھی دوڑ رہی ہے..... کوئی اور چیز جسے غالباً زہر کہتے ہوں گے۔

اور پھر امی جان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور وہ ابا جان کو اور اپنے آپ کو فریب دینے کی کوشش کرنے لگتی ہیں۔

"آپ کو فرصت ملے تو کسی دن چلئے میں اپنی آنکھیں چجوالوں اور نہیں تو پھر اچھا سا سُرمہ لائیے۔"

لیکن میں؟

"نہیں نہیں میں بہت کم ہی روتی ہوں .... امی جان جب اپنے مقررہ وقت پر ہر ایک حادثہ کو پیش آنا ہی ہے پھر آدمی روئے کیوں؟

لیکن میں؟

لیکن میں شدت سے یہ محسوس کرنے لگتی ہوں کہ خون کے ساتھ دوڑنے والی وہ چیز میرا جسم بے حس و حرکت کرنے لگی ہے ..... یقیناً زہر اسی چیز کا نام ہے .... اسی چیز کا جو میرے خون میں شامل ہوگیا ہے۔

لیکن اب میں تین چار سال پہلے کی بچّی کہاں رہی؟

اور اب تو میں یہ جاننے لگی ہوں کہ روحی آپا کیوں منوں مٹّی کے نیچے جا چھپی ہیں اور اب تو میں یہ بھی جانتی ہوں کہ امی جان کے مُنھ میں کس سے کوئی تلخ اور کڑوی حقیقت اُبھر آتی ہے..... میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ تلخ اور کڑوی حقیقت کونسی ہے؟

افسانوں کو تو میں نے کبھی کبھی حقیقت بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیا کوئی تلخ اور کڑوی حقیقت کبھی افسانہ نہیں بن سکتی۔

اور پھر میں تین چار سال پہلے کی بچّی بن جاتی ہوں۔

کیا میری روحی آپا کسی بھی قیمت پر زندہ نہیں ہو سکتیں؟ اے "کُن سے فیکون کرنے والے اللہ تو قادرِ مطلق ہے میں اپنی پیاری روحی آپا کی قبر میں جا لیٹتی ہوں اور انھیں تو واپس بھیج دے .....!

اے اللہ! کیا تیری رحمت میں جوش نہ آئے گا۔

چھی! کیسی الّم غلّم قسم کی باتیں میں سوچ رہی ہوں ..... تلخ حقیقتوں کو تسلیم کر لینا بہت دل گُردے کا کام ہے۔ جب تلخ حقیقتیں سامنے آتی ہیں تو آدمی ایسی ہی الّم غلّم قسم کی باتیں سوچنا چاہتا ہے حالانکہ حقیقت تو بس صرف اتنی ہے کہ روحی آپا مر چکی ہیں اور منوں مٹّی کے نیچے جا چھپی ہیں۔

اور یہ سب کچھ تو محض افسانے ہیں ..... تلخ اور کڑوی دوا، خون کے ساتھ رگوں میں زہر، روحی آپا کا زندہ ہونا۔ پتھر کا پسیجنا۔ پتھر سے ننھے پھوٹنا .....

لیکن یہ رس میں ڈوبی ہوئی آواز کیسی ہے ؟

"میرا کے پربھو گردھر ناگر......"

"یہ کون گا رہا ہے شبنم ؟"

"روحی آپا کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔"

"کیوں۔ نیر دیما بھی تو ہو سکتی ہے۔

"لیکن یہ روحی آپا ہیں۔ جو یوگ لینے کی ٹھان چکی ہیں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ انسان کی حقیقی زندگی یوگ سے شروع ہوتی ہے اور یوگ پر ختم ہوتی ہے۔ دُنیا میں جو کچھ بھی ہے نا شبنم! سب کچھ افسانہ ہی افسانہ ہے۔ لے دے کر یوگ ہی تو ایک حقیقت ہے...... دیکھو میں تمھیں ایک سے ایک چیز پڑھ کر سُناتا ہوں....."

"میں سائنس کی اسٹوڈنٹ ہوں بھائی جان! اور میرے دماغ میں اتنی خالی جگہیں نہیں جس میں واہیات باتیں سما سکیں....... کوئی تصویر بنائی آپ نے؟"

"میرے پاس اب کوئی رنگ نہیں اور برش کا ایک ایک بال میری روح میں برچھی کی طرح پیوست ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن تم سائنس کی اسٹوڈنٹ ہو اس لئے تم صرف ایک کام کرو..... روحی سے کہو کہ وہ وہی گانا گائے...... وہی فلمی گیت ..... ہم تیرے پیار میں سارا عالم....."

"اور کل آپ نے آپا سے کہا تھا کہ وہ گیت نہ گایا کریں..... کمال ہے۔"

"ہاں..... لیکن..... لیکن..... ہاں اس وقت میں چاہتا ہوں کہ روحی...... میرا مطلب ہے...... ہم تیرے پیار میں سارا عالم....."

"جی نہیں۔ نہ میں ان سے کہہ سکتی ہوں اور نہ وہ گا سکتی ہیں۔ اپنا وقار بھی دُنیا میں کوئی چیز ہے یا نہیں..... اپنی خود داری......"

لیکن..... لیکن..... لیکن یہ کیا؟ ...... آج کی دُنیا میں ناممکن شاید کچھ بھی نہیں۔

"ہم تیرے پیار میں سارا عالم کھو بیٹھے ..... ہم تیرے ....."

بلا شبہ یہ روحی آپا گا رہی ہیں اور مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ یہ وہی گیت ہے جو ایک دن میں گُن گنا رہی تھی تو روحی آپا نے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔ "کس قدر تھرڈ ریٹ ذوق ہے تمھارا کہ تم فلمی گانے گاتی ہو۔"

اور ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ روحی آپا یہ گیت گا رہی تھیں اور بھائی جان نے منع کر دیا تھا۔

اور آج؟ .... اور اس وقت؟

یہ کیا ہو رہا ہے؟

ڈم، ڈِم، ڈَم، ڈِم .... بول جمبورے میں کون ہوں؟

میں سر سے پاؤں تک پتھر کا بنا ہوا آدمی ہوں ممتاز! پتھر کا بُت! جس کی تم پوجا کر سکتی ہو لیکن جس سے کوئی اُمید وابستہ نہیں کر سکتیں۔"

بھائی جان نے وہ خط کسے لکھا تھا جو دھوبی کو کپڑے دیتے ہوئے میرے ہاتھ لگ گیا تھا اور جس کے لئے بھائی جان سے مجھے سفید صاف شفاف جھوٹ بولنا پڑا تھا۔

ہاں ہاں بے شک میں نے ہی دھوبی کو کپڑے دیئے تھے لیکن اللہ کی قسم بھائی جان! آپ کی شرٹ کی جیب سے کوئی خط وت نہیں نکلا تھا۔"

"میری اچھی شبنم ..... میری پیاری شبنم .... تم قسم خُدا کی میری سب سے پیاری ...."

روحی آپا آدھمکیں۔

"شبنم امی جان بُلا رہی ہیں۔ کتنی بار تمھیں منع کیا گیا ہے انھیں ڈسٹرب نہ کیا کرو۔"

"میں نے ہی بُلایا تھا۔"

"اور یہ خط کا کیا چکر تھا؟"

وہ..... وہ..... منسٹری آف ایجوکیشن کا ایک خط تھا میں نے سوچا شاید دھوبی کو کپڑا دیتے ہوئے شبنم نے نکال لیا ہو..... اب دھوبی کے ہاں جانا ہوگا۔"

"شاید کوئی امپورٹنٹ خط تھا؟"

"کوئی خاص تو نہیں.... میں دھوبی کے پاس جاؤں گا۔ مل گیا تو مل گیا ورنہ کوئی خاص بات نہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن۔

ممتاز میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ کون تھی وہ جس کے نام لکھا ہوا وہ خط بھائی جان روحی آپا سے چھپانا چاہتے تھے؟

اور ان دنوں میں آج سے تین چار سال چھوٹی تھی..... لیکن اس سے کیا، میں سب کچھ جان گئی۔

"لیجئے، بھائی جان! اور اب ذرا ہوش حواس درست رکھیے۔ خواہ مخواہ آپ مجھے چوری لگا رہے تھے........ یہ لیجئے اپنا لفافہ..... یہی تھا نا؟"

"ہاں ہاں...... آہستہ بولو...... کہاں تھا یہ لفافہ؟"

"حضور کی ویسٹ پیپر باسکٹ میں!...... یہ شاعر اور آرٹسٹ قسم کے لوگ۔ خُدا رحم کرے بیچاروں پہ..... میرا خیال ہے کہ جب یہ کام کا خط ویسٹ پیپر باسکٹ میں چلا گیا تو پھر یقیناً کوئی ردی کا غذ جسے ٹوکری میں ڈالنا ہوگا وہ پوسٹ ہو چکا ہوگا...... مگر بھائی جان یہ تو منسٹری آف ایجوکیشن کا خط نہیں ہے۔

لیکن جواب میں صرف ایک دبیز اور احسان مند مسکراہٹ جو آج بھی میرے ذہن کے گوشے گوشے میں نور پھیلا دیتی ہے۔ ہاں آج بھی جب میں وہ سب کچھ سوچتی ہوں اور بس سوچتی چلی جاتی ہوں۔ آج بھی جب میری رگوں میں خون کے ساتھ دوڑنے والا زہر خشک ہو چکا ہے، آج بھی جب میں نے اپنی زندگی کو سُلگاتے ہوئے شعلوں کو دور بہت دور پھینک دیا ہے اور آج بھی جب میں چاہوں مسکرا سکتی ہوں اور

آج بھی جب دُنیا انقلاب کی گود میں ہاتھ پاؤں پھینک رہی ہے۔ اور بغیر کچھ سوچے سمجھے ٹھیک پالنے میں لیٹے ہوئے بچّے کی طرح ہنس رہی ہے مسکرا رہی ہے اور آغوں آغوں کر رہی ہے۔

انقلاب شاید سچ ہی ہے کہ.....

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

اور تغیّر نے میرے تین اور خوبصورت سال مجھ سے چھین کر اس جوانی کے حوالے کر دیئے جو دیوانی ہوتی ہے۔

ایک نہایت ہی حسین، نرم و نازک اور خمار آگیں انقلاب آ گیا ہے۔

میں جوان ہو چکی ہوں۔

ایک نہایت ہیبت ناک، کریہہ اور ہوش رُبا انقلاب آ گیا ہے۔

اور روحی آپا ایک جوان یاد بن کر رہ گئی ہیں۔

اور میں؟ حسین، نرم و نازک اور خمار آگیں ہیں؟

میں جب بھی قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہوں مجھے یقین آ جاتا ہے۔ قیامت بہرحال ایک حقیقت ہے۔ لیکن یہ بھی تو ایک حقیقت ہی ہے کہ تین سال پہلے کی طرح آج بھی میں مرنا چاہتی ہوں البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ تین سال پہلے میں مشروط طور پر مرنا چاہتی تھی، شرط یہ تھی کہ روحی آپا زندہ ہو جائیں، اور آج میں صرف مرنا چاہتی ہوں۔

"یہ ممتاز کون ہے؟"

دُنیا گھومتی ہے۔ دُنیا اپنے محور پر گھومتی ہے۔ لیکن یہ محور کہاں ہے؟ یہ محور کیا ہے؟ یہ محور کون ہے؟"

"یہ ممتاز کون ہے"

اور دُنیا گھومتی چلی جا رہی ہے۔

وہ پیغمبروں کی طویل ترین قطار میں سے ایک پیغمبر اپنی قطار سے نکل کر آگے آجاتا ہے اور چیختا ہے۔ "لوگو! میں تمہارے لئے خدا کا ایک بہت ہی اہم پیغام لایا ہوں ...... سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں .... ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں"

اور بے شک یہ بے ثباتیٔ عالم ہی تو ہے کہ دُنیا گھومتی چلی جا رہی ہے۔ اور اپنی ہر ایک گردش کے ساتھ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں انقلابات اپنے گرد و پیش بکھیرتی چلی جا رہی ہے۔

یہ قرآن کا انگریزی ترجمہ ہے۔ یہ انجیل ہے۔ یہ ستیارتھ پرکاش ہے۔ یہ گیتا ہے۔ یہ رادھا سوامی مت کے سوامی جی مہاراج کا جیون چرتر ہے ..... لیکن برگد کا وہ عظیم الشان درخت کہاں کھو گیا جس کی چھاؤں نے ایک اچھے خاصے آدمی کو دیوتا بنا ڈالا تھا۔

نروان کی تلاش۔

سکون کی تلاش بھائی جان کو دیوتا بنا ڈالے، یہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ انہونی کیسے ہو سکتی ہے کہ انھیں سکون دستیاب ہو جائے کہ انھیں نروان مل جائے۔

لیکن سکون بھی کیا کوئی ایسی ادنیٰ سی چیز ہے جو مذہبی کتابوں میں مل جائے؟ سکون تو ایک ایسا امرت ہے جس کے لئے ساری زندگی آگ کے سمندر کا منتھن کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں وہ امرت دستیاب ہوتا ہے جسے ہم تغیر کہتے ہیں اور تغیر ہی وہ امرت ہے جسے سکون نصیب ہے، اور تغیر ہی زندگی کی وہ واحد پُرسکون سانس ہے جس کے بعد پھر کوئی اور سانس نہیں۔

اور روحی آپا کی موت کے بعد بھائی جان قابل رحم ہونے کی حد تک بے چین اور بے کل ہو کر مذہبی کتابوں میں سکون تلاش کرنے لگے ہیں۔

اور ان کے کینوس اسٹینڈ کے برابر پڑی ہوئی چھوٹی سی میز پہ چاندی کے فریم میں اس گمنام لڑکی کی تصویر پہ کی گرد صاف کر دی گئی ہے۔ یہ بہت بڑا کام میں نے کیا ہے۔ جس کے لئے فخر سے میرا سینہ تن گیا ہے۔

بھائی جان اپنی آرام کرسی پر لیٹے سوامی جی مہاراج کا جیون چرتر پڑھ رہے ہیں اور کم سے کم مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ ایک بے فکرا لونڈا ایک چھوٹے سے گڑھے میں، چوپایہ بن کر جھکا ہوا گڑھے کے کیچڑ میں مچھلی ٹٹول رہا ہے۔

"بے بی آپ کا لائٹرے کر چلی گئی تھی، لیجئے۔"

"بیٹھو شبنم۔"

"کہاں۔"

"اسٹول پر سے کلر پلیٹ وہاں ...... اُدھر کونے میں ڈال دو اور ...... اور نہیں تو اُدھر وہ چھوٹی سی میز ..... اچھا ٹھیک ہے .... بیٹھ جاؤ۔"

"حکم؟۔"

"جانتی ہو محبت کیا ہے؟"

"میں صرف اس قدر جانتی ہوں کہ ایم۔ ایس۔ سی کا یہ میرا فائنل سال ہے۔ میں اپنا دماغ الّم غلّم باتیں سوچنے میں تھکانا نہیں چاہتی۔

"روحی بھی بی ایس سی تھی ..... لیکن وہ ...... وہ کم بخت .... بے وقوف لڑکی .... خیر سنو ......"

اور میں سوچتی ہوں اس زخم کا کیا نام ہے؟

اس زخم کا نام شیشے کے بہت ہی خوبصورت، نفیس اور نرم و نازک گلدان اور اگربتّی دان ہے — اس زخم کا نام چاندی کے فریم میں ایک بہت ہی کومل کومل سی لڑکی کی تصویر ہے — اس زخم کا نام وہ پُراسرار لڑکی ممتاز ہے — اس زخم کا نام روحی ہے ....

اور میں؟

میرے دماغ میں پھر جیسے گونج اُٹھا ہے —— روحی بھی بی ایس سی تھی لیکن وہ کم بخت .... بے وقوف لڑکی .....

اور میرے دماغ میں پھر جیسے کوہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہے —— جانتی ہو

محبت کیا ہے؟

اور بھائی جان رادھا کرشن مت کے سوامی جی اور اُن کی پرم بھکت شبّو جی کی کہانی پڑھ کر سُنا رہے ہیں ——

...... ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ شبّو جی درشن کی دورہ میں بے کل اور تڑپتی ہوئی اپنے مکان سے جو کہ محلہ مائی تھان میں تھا برہنہ دوڑتی ہوئی چلی آئیں تب بُکّی جی نے جو کہ ان کی چھوٹی بہن تھیں کہا کہ تو اس طور سے سربازار کیوں چلی آئی ہے، اس میں ہماری بدنامی ہوگی تو انھوں نے جواب دیا کہ سوائے سوامی جی مہاراج کے مجھ کو تو کوئی نظر نہیں پڑا ...... ایک دن شبّو جی سوامی جی مہاراج سے تھوڑی دور پر بیٹھی تھیں اور یکایک بہت زور سے رونے لگیں تب اور صاحبوں نے جو وہاں موجود تھے کہا کہ تم کیوں رو رہی ہو؟ تب شبّو جی نے کہا کہ سوامی جی مہاراج مجھ کو درشن نہیں دیتے ہیں اس پر انھوں نے کہا کہ سوامی جی مہاراج مجھ کو درشن نہیں دیتے ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ سوامی جی مہاراج تو تمھارے سامنے بیٹھے ہیں تب شبّو جی نے کہا کہ یہ وہ درشن نہیں ہے کہ جو مجھ کو دو تین روز پیشتر انتر میں ہوا کرتے تھے ...... تب سوامی جی مہاراج نے ......"

"بور نہ کیجیے بھائی جان ..... اپنی قبروں میں وہ بیچارے مؤرخ اور سماجیات کے ماہر تڑپ اُٹھیں گے جنھوں نے لکھا ہے کہ انسان کو مہذب ہوئے ہزاروں سال ہوگئے ...... بے چارے ویسے ہی کم رُسوا نہیں ہوتے رہتے ہیں۔"

"میں دراصل یہ دکھلانا چاہتا تھا کہ شبنم کی محبت ایک عجیب و غریب روحانی طاقت ہے جو ......"

"ایک طلسم ہے اور پل بھر میں انسان کو اُلّو کا پٹھا یا اُلّو کی پٹھی بنا کر رکھ دیتا ہے۔"

"حضرت علیؓ نے ایک بار ......"

"یا اللہ ...... مجھ پر رحم کیجیے بھائی جان! میرے سر پر فائنل سوار ہے ....

اگر آپ کی جھولی میں کوئی کام کی بات ہے تو رکوں ورنہ ٹاٹما —"

میری جھولی میں سکون کے علاوہ سب کچھ ہے..... محبّت ہے، عقیدت ہے، پرستش ہے، یادیں ہیں، آنسو ہیں...... مسکراہٹیں.... بھی ہیں شبنم اور ہنسی بھی..... قہقہے بھی ہیں..... بولو تمھیں کیا چاہیے؟

اور میں انتظار کرنے لگی ہوں کہ دیکھوں یہ جھوٹا مداری اب اپنے جھولے سے کیا نکالتا ہے؟

ڈُم ڈِم ڈُم ڈُم ڈِم......

مداری نے اپنی جھولی سے ایک نیا کرتب نکال لیا ہے۔

"ہے کمالِ عشق پر بے طاقتی دل کی دلیل"

اور میں بھائی جان کے ہی ترنّم میں گن گنا اُٹھی ہوں۔

"جلوۂ دیدار کی اب تاب کب لاتا ہوں میں"

"تمھیں بھی اشعار یاد ہیں؟"

"جی ہاں — دو چار دس — مثلاً — اکڑ بکڑ بمبے بو، اسّی نوّے پورے سو...... وغیرہ"

جلوۂ دیدار کی اب تاب کب لاتا ہوں میں"

"لیکن آپ کو جلوۂ دیدار نصیب ہی کہاں ہے جو تاب کے لانے اور نہ لانے کا سوال پیدا ہو"

"شبنم —"

بھائی جان چیخ اُٹھے ہیں اور مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں جیسے میں نے ان کے پکے ہوئے زخم پر انگلی رکھ کر زور سے دبا دی ہو۔

لیکن مواد نہیں نکل سکا..... ایک آدھ نشتر لگتا جب تو۔

اور زخم پکتا ہی گیا۔

پکتا ہی گیا وہ زخم جس کا نام معلوم کرنے کے لئے میں سنیاس تک لے لینے کو

تیار تھی۔ آخر اس زخم کا نام کیا تھا؟

اور ابا جان بڑے فخر کے ساتھ سینہ تان کر امی جان سے کہتے رہے ۔۔
"بیگم! رفعت میرا بھتیجا نہیں میرا بیٹا ہے وہ کم سے کم میرا حکم کبھی نہیں ٹال سکتا ...... وہ مجھے کبھی مایوس نہیں کر سکتا۔

لیکن ابھی اس کا زخم ہرا ہے۔ میں کس مُنہ سے اُسے کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن تم دیکھ لینا بیگم کہ وہ ..... کہ وہ ....."

اور روحی آپا کی موت زہریلی تلخی امی جان کی روح میں، دور بہت دور تک سماتی چلی گئی اور اُن کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح بھیگتی رہیں لیکن دُنیا کو تو گھومنا ہے گھومتی رہی ایک منٹ کے لئے بھی تو یہ نردئی دُنیا روحی آپا کے سوگ میں خاموشی کے ساتھ کھڑی نہیں رہی۔

ایک دن میں بہت روئی۔ جی بھر کے روئی۔ لیکن کیوں؟ اس کا پتہ خود مجھے بھی نہیں، پتہ نہیں میں کیوں روئی۔ لیکن میں کیوں روئی، اس قدر روئی کہ نوح جلدی جلدی اپنے آرک میں جانداروں کا ایک ایک جوڑا پیک کرنے لگے۔ سانپ، بچھو، مچھر، شیر، ہاتھی، کیا کچھ نہیں انھوں نے ٹھونسنا شروع کیا۔ لیکن نوح نے نہ تو مجھے اپنے آرک میں لیا اور نہ بھائی جان کو .....

ہاں، مجھے ایک بات یاد آگئی ہے۔ نوح کے تگڈم کا زمانہ، وہ زمانہ تھا جب میں بھائی جان کو رفعت بھائی کہنے لگی تھی۔ ایسا کیوں ہوا تھا اس کی مجھے کوئی خبر نہیں ہوئی تھی بس ـــــ ایک سہانی صبح میں نے اپنے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی اور میرا سارا جسم پٹ پٹا کر چیخنے لگا اور میں نے سامنے کے آئینے میں اپنی ہونق جیسی بدحواس شکل دیکھی اور اس شکل میں اپنا وہ چہرہ تلاش کرنے لگی جس پر میرے کالج کے لونڈے مرتے تھے اور وہ چہرہ تلاش کرتے کرتے بس پتہ نہیں کس بیابان میں پہنچ گئی وہاں مجھے بھائی جان کی لاش پڑی نظر آئی اور میں نے اس لاش کو ـــــ ہیلو رفعت بھائی! کہہ کر مخاطب کر دیا اور تب اس سرد لاش میں مجھے حرارت کا احساس ہونے لگا اور بس میں بھائی جان

کو رفعت بھائی کہنے لگی۔

"ہیلو رفعت بھائی ..... کیا حال ہے..... کیا آپ نوح کے آرک میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں؟" میں چیخنے لگی، کیونکہ نوح کا آرک جانداروں کے جوڑوں سے بھر چکا.... اور آرک کے باہر پانی بڑھتا چلا جا رہا تھا اور میں اور بھائی جان گردن تک پانی میں کھڑے حسرت سے نوح کا آرک دیکھ رہے تھے اور میں چیخے جا رہی تھی "گھسنے کی کوشش مت کیجئے رفعت بھائی..... اس آرک کی ٹکٹ اب بلیک سے بک رہی ہے اور جب بلیک سے ہی ٹکٹ خریدنا ہے تو پھر بلیک سے ٹکٹ خرید کر اس سڑیل آرک میں گھسنے کا گناہ کرنا ہی تو پھر کسی خوبصورت گناہ کا انتظار کیجئے۔ بلیک سے ٹکٹ خریدنا بھی گناہ ہے اور..... اور اور بہت سے حسین گناہ اس دُنیا میں ہیں جو نوح کے ہزاروں سال کے سکنڈ ہینڈ آرک میں نہیں..... رُک جائیے رفعت بھائی ...... بس یوں ہی اٹنشن میں کھڑے رہئے..... پانی سر سے بھی اوپر ہو گا، لبوں تک پہنچے گا، پھر ناک تک، پھر آنکھوں تک پھر پیشانی تک اور پھر..... اور پھر پانی سے اوپر ہو جائے گا..... نوح کے آرک کو ٹا ٹا کر دیجئے....."

"ٹا ٹا —" میں نے بڑی حسرت سے نوح کے آرک کو الوداع کہہ دیا ہے۔

"ٹا ٹا" رفعت بھائی نے بھی بڑی حسرت سے نوح کے آرک کو الوداع کہہ دیا ہے۔

لیکن طوفان تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ پانی میرے لبوں کو چومنے لگا ہے اور میں ایک عجیب و غریب لذّت کے احساس سے مَری جا رہی ہوں۔ کاش! پانی کی یہ سرد سطح یوں ہی میرے پیاسے لبوں کو چومتی رہی اور میں مَرتی چلی جاؤں ...... ایک حسین مرگ مسلسل!

اور طوفان بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے.... اُف خُدا کی پناہ ابھی تو پانی سر سے اوپر بھی نہیں ہوا ہے لیکن طوفان کا شور قیامت برپا کرنے لگا ہے اور قیامت کے اس شور میں کوئی کیسے سو سکتا ہے۔

اور میں ایک بار پھر انگڑائی لیتی ہوئی اپنے پلنگ پر اُٹھ بیٹھی ہوں اور پھر وہی انگڑائی جس کے بعد نہ جانے کیوں میں نے بھائی جان کو رفعت بھائی کہنا شروع کر دیا تھا۔

لیکن یہ کیا ہو رہا ہے؟ اب تو میں یقینی طور پر جاگ چکی ہوں اور بخوبی سمجھ رہی ہوں کہ یہ شور نوح کے طوفان کا شور نہیں ہے بلکہ یہ میرے گھر کا شور ہے .... ہر کوئی چیخ چیخ کر باتیں کر رہا ہے۔ کیا وحشت ہے قسم خدا کی عجیب لوگ ہوتے ہیں یہ ہندوستانی، ایسا لگتا ہے جیسے گھر کے سارے لوگ بہرے ہیں اور سب ایک دوسرے سے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے ہیں!

مگر قصّہ کیا ہے؟

لعنت ہے مجھ پر .... چھی .... یا اللہ توبہ ...... یا اللہ توبہ ...... یا اللہ توبہ ...... لعنت ہے مجھ پر .... چھی چھی کتنی آسانی سے میرے ذہن میں یہ بات آگئی کہ لگتا ہے۔ رفعت بھائی نے خودکشی کرلی ..... اور بھی دل چسپ بات تو یہ ہے کہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں مولوی اکبر علی اپنی لمبی داڑھی کے ساتھ پھلتے ہوئے چیخ رہے ہیں ـــــــ " جملے میں استعمال کرو۔ خس کم جہان پاک ......" لعنت ہے مجھ پر کیسی واہیات باتیں سوچ بیٹھتی ہوں۔

لیکن قصّہ کیا ہے؟

کیا بات ہے کہ سارے گھر میں شور برپا ہے یہاں تک کہ اب اور بھی زیادہ گُم سم رہنے والے رفعت بھائی بھی چیخ چیخ کر باتیں کر رہے ہیں ...... چلو اب ایک اطمینان تو ہوا کہ انھوں نے خودکشی نہیں کی ہے اب اس کے بعد کوئی خبر کیسی ہی وحشت ناک کیوں نہیں ہوگی سُن لی جائے گی!

لیکن میرے اس عزم پر اوپر والا قہقہہ لگانے لگا ہے اور پھر اس نے اپنی جادوئی جھولی سے ایک نہایت ہی عجیب و غریب کرتب نکال کر سامنے زمین پر پھینک دیا ہے۔

"بول جمبورے موت سے بھی بُری خبر کچھ ہے؟"
"ہاں اُستاد ہے۔"
"تو پھر ہاتھ جوڑ کر سلام کر جمبورے میم صاحب کو۔"

اور خالہ جان کے چھوٹے صاحبزادے دھڑلے سے میرے بڈ روم میں گھس آئے ہیں اور مجھے سلام کر رہے ہیں۔
اسلم بھائی چار برسوں کے بعد نیویارک سے لوٹے ہیں اور میں یہ منظر دیکھ کر کانپ اُٹھی ہوں...... یہ منظر جو رفعت بھائی کی خودکشی سے بھی زیادہ وحشت ناک ہے۔
میں نے سوچا تھا کہ میں رفعت بھائی کو بچالوں گی۔ لیکن اب میں سوچنے لگی ہوں کہ رفعت بھائی کا سکون بھی وہیں ہے جہاں روحی آپا کا...... اب نہیں خودکشی سے کوئی نہیں بچا سکتا...... بے شک میں بھی نہیں۔
اُف ۔ اُف میرے معبود ایسے کرب ناک شعبدے!...... میرے خُدا تو بیٹھا بیٹھا کیا کچھ کرتا رہتا ہے...... اُف تیری پناہ!......"

"شبّی! محض چار برسوں میں تم کس قدر بدل گئیں!"
"جی؟...... جی...... جی ہاں!"
"کیسی ہو شبّی؟"
"جی...... جی...... جی اچھی ہوں۔"
"یہ تو تمھارا فائنل ایر ہوگا؟"
"جی جی...... جی ہاں۔"
"تم چونک کیوں گئیں؟"
"جی نہیں کوئی بات نہیں۔"
"اسٹڈی کیسی چل رہی ہے؟"

"جی .... بس یوں ہی سی۔"

"ارے تم تو بالکل بدل گئیں..... خالو جان!..... یہ شبّی کی وہ...... میرا مطلب ہے ان کی شرارتیں کہاں گئیں؟"

"ارے اب بڑی بھی تو ہو گئیں...... پھر بھی یہ سمجھو اسلم میاں کہ ان کی وہ پہلی شرارتیں ختم ہو گئی ہیں..... ہاں....."

لیکن اسی وقت سارا گھر یک لخت ماتم کدہ بن گیا۔

امّی جان کو روحی آپا یاد آگئی ہیں اور وہ رو رو کر اسلم بھائی کو روحی آپا کی موت کے حالات سُنا رہی ہیں۔ اسلم بھائی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ہیں۔ رفعت بھائی کی آنکھوں میں بھی، میں بھی رو پڑی ہوں اور بے بی بھی اور ابا جان بھی۔

اور پھر..... اور پھر......

اور پھر ساری دُنیا پانی سے بھر گئی ہے اور نوح کا آرک تیرنے لگا ہے لیکن پانی ابھی میرے سر سے اوپر نہیں ہو سکا ہے۔

اور پھر..... اور پھر......

پتہ نہیں طوفان ختم ہوا بھی یا نہیں؟ لیکن نوح کے آرک سے ایک فاختہ اُڑ پڑی ہے اور پھر وہ فاختہ میرے پاس پہنچ گئی ہے اور پھر وہ فاختہ مجھ سے پوچھ رہی ہے۔

"محترمہ! آپ نے سرزمین کا کوئی ایسا حصّہ دیکھا ہے جہاں سے طوفان گذر چکا ہو؟"

"تم کون ہو؟"

"یقیناً آپ دیکھ رہی ہیں محترمہ کہ میں ایک فاختہ ہوں..... خیر کوئی بات نہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ کبھی کبھی وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں سمجھنے میں سکون محسوس کرتا ہے...... آپ کے ساتھ بھی یہی بات ہے نا؟"

"ہو گی۔"

"ہو گی نہیں..... ہے..... لیکن میں آپ سے بحث کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ سرزمین کا کوئی ایسا خطہ ہے جہاں سے طوفان گذر چکا ہے؟...."

ایک بات میں اور بتا دوں ..... مجھے اسلم نے آپ کے پاس بھیجا ہے اُسے سکون کی تلاش ہے۔

"اسلم نے یا رفعت نے ؟"

جی نہیں محترمہ! رفعت تو آسمانی اور مذہبی کتابوں میں سکون کی تلاش کا مضحکہ خیز تجربہ کر رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں محترمہ! مجھے اسلم نے آپ کے پاس بھیجا ہے ...... لائیے میں آپ کے بال سنوار دوں۔"

اور نوح کے آرک سے آئی ہوئی وہ فاختہ اپنی چونچ سے میرے بال سنوارنے لگی۔

اور یک لخت میری آنکھ کھُل گئی ہے۔

اور میرے سرہانے ایک طوفان کھڑا ہے۔

"آپ۔؟" میں نے یہ سمجھا ہے کہ میں چیخ اُٹھی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری آواز بس کمرے میں ہی گھٹ کر رہ گئی ہے۔

"ہاں شبّی میں ہوں۔"

لیکن آپ ؟۔ اس وقت اور یہاں ؟"

"ہاں شبّی! مجھے سکون کی تلاش ہے!"

"لیکن کس مسخرے نے آپ سے یہ کہدیا کہ میرے کمرے میں آپ کو سکون مل جائیگا؟"

"دل نے۔ جو انسان کا سب سے زیادہ مسخرا ساتھی ہے!"

"بے شک یہ آپ کے دل کا مسخراپن ہے۔ سکون عنقا ہے۔ اسلم بھائی نہ کبھی کسی کو ملا ہے اور نہ کبھی مل سکے گا اور اس کی تلاش کرنے والا یقیناً ایک دن رفعت ہو جائے گا۔ اور ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر مسخراپن کرتا رہے گا.... سمجھے آپ ؟"

"پہلے تو تم ایسی قنوطی نہیں تھیں۔"

"اب ہو گئی ہوں۔"

"شاید رفعت کی صحبت کا اثر ہے؟"

"ہوسکتا ہے ..... ویسے ان کی صحبت میں آسمانی اور مذہبی کتابوں کے علاوہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو ممکن ہے جنات ہوں، آدمی تو ہرگز نہیں ہوسکتے۔"

"چلو، کہیں چلیں۔"

"نہیں..... میرا خیال ہے آپ کو رفعت بھائی پر رحم کرنا چاہیے ان پر ترس کھانا چاہیے۔

"مطلب؟ ..... اوہ ..... اچھا ..... اچھا تو اب میں سمجھا۔لیکن کیا خالو جان اور خالہ جان بھی رفعت پر رحم کرنا چاہتے ہیں؟"

امی جان کے بارے میں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔لیکن ابا جان تو بے شک ان پر مہربان ہیں..... آپ کی اطلاع کے لیے میں عرض کردوں رفعت بھائی ذہنی طور پہ بہت پریشان ہیں نہیں تو اب تک سب کچھ ہوچکا تھا۔"

"یعنی تم بھی اس پر ترس کھانے پر تلی ہوئی ہو؟"

"ارے میرا کیا ہے اسلم بھائی! میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ ایک اتنا بڑا، مشہور اور عظیم فن کار مر نہ جائے۔"

لیکن سنو شبی! روحی کی موت بہرحال ایک حادثہ ہے اور یہ تو رفعت کے مقدر کی بات ہے کہ روحی مر گئی.... ٹھیک اسی طرح جیسے کسی مالدار کی دولت لٹ جائے...... لیکن ایسا تو کبھی نہیں ہوتا کہ دوسرے مالدار لوگ اپنی تجوری اس لٹے ہوئے مالدار کی جھولی میں ڈال دیں.... یقیناً تم بھی انہونی کر رہے ہو اور خالو جان بھی.... یہ بے ایمانی ہے شبی سراسر بے انصافی بلکہ بے ایمانی....

"ایک آدمی کی زندگی انصاف اور ایمان سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔

ایک آدمی کی زندگی نہیں صرف رفعت کی زندگی۔"

"چلیے یوں ہی سہی، لیکن عرض یہ ہے اسلم بھائی کہ جس طرح میں روحی آپا کی تمام دوسری چیزیں سنبھال کر رکھتی ہوں، حفاظت سے رکھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اُن میں

صرف ایک ہیرپن بھی ضائع نہ ہو جائے اُسی طرح ہیں اُن کی یہ چیز بھی، جس کا نام رفعت ہے۔۔۔"

"لیکن یادگار استعمال نہیں کی جاتی۔"

"نہ سہی، لیکن یادگاروں کی طرف سے بے توجہی بھی تو بُری بات ہے اور میں روحی آپا کی وہ چیز محفوظ رکھنا چاہتی ہوں چاہے اُسے محفوظ رکھنے میں کتنی ہی قباحت کیوں نہ ہو۔"

"اور اگر تم ایسا نہ کر سکیں؟"

"ظاہر ہے ایسی صورت میں روحی آپا کی روح مجھے نااہل سمجھے گی اور میں اپنی نااہلی ..... میرا مطلب ہے میں نااہل کہلانا ہی نہیں چاہتی۔"

"ہم اب بے ہنگم اور واہیات باتیں کرنے لگے ہیں ..... چلو ذرا باہر گھوم آئیں۔ کیسی شاندار چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور کیسی مست ہوا چل رہی ہے .... آؤ ناشی!"

"یہ ہندوستان ہے اسلم بھائی، نیویارک نہیں۔"

"یقیناً تمھیں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ خالہ جان نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں تمھیں آمادہ کر لوں تو وہ خالو جان کو راضی کر لیں گی۔"

"لیکن یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ آمادہ کرنے کا یہ کاروبار شاندار چاندنی اور مست ہوا میں ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر رات بھر میں قیامت نہیں آگئی تو کل ضرور آئے گی اور چونکہ اُمید پر کہتے ہیں دُنیا قائم ہے اس لئے اس بات کی بھی اُمید کی جا سکتی ہے کہ ہم کل تک زندہ بھی رہیں گے ......

"تم شاید غصہ ہو گئیں، بہر حال تمھارے مُنھ سے یہ بات سُن کر یقیناً میری بے حد حوصلہ افزائی ہوئی کہ ..... اُمید پر دُنیا قائم ہے۔"

"لیکن اب اسلم بھائی ..... آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجئے، پلیز!"

"ایز یو پلیز ——"

لیکن ان کے باہر جانے کے بعد میں جیسے ہی کمرے کا دروازہ بولٹ کرنے اُٹھی وہ پھر

مسکراتے ہوئے اندر آ گئے اور میرے بازو گرفت میں لیتے ہوئے انھوں نے کہا۔
"میں اتنا بڑا فیاض نہیں ہوں تبھی کہ اپنی ساری کائنات اُٹھا کر کسی کی جھولی میں ڈال دوں۔"
میری آنکھیں مُند گئیں اور میں نے نوح سے پوچھا ——
شاید طوفان ختم ہو چکا ہے اور آپ نے جانداروں کے جوڑوں کو اپنے آرک سے نکال کر پھر دُنیا میں بھیج دیا ہے کہ وہ نئی دُنیا بسائیں؟"
"ہاں میری بچّی ہاں ...... کیا اس نئی دُنیا میں تجھے سکون کا سُراغ مل گیا؟"
"ہاں —— لیکن اگر سکون اِسی کا نام ہے تو پھر یہ بہت ہی واہیات سا سکون ہے۔ اس کے بھیتر تو غضب ناک طوفان پوشیدہ ہے۔"
"ہے تو ضرور ...... لیکن سکون کے بھیتر کا یہ طوفان ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا —— خبردار! اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔ ورنہ میری بچّی! تجھے ہزاروں طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔"
"نوح صاحب! میرا خیال ہے کہ یہ دُنیا، یہ طوفان، یہ سکون یہ آپ، یہ میں ....
.... یہ سب کچھ طلسمی قسم کا ہنگامہ ہے .... ہے نا؟"
"ہے تو سہی۔"
اسلم بھائی نے مجھے اپنی باہوں میں کسی حد تک دبوچ لیا —— اور میں نے نوح سے کہا ——
"میرا بھی یہی خیال ہے بابا کہ ایک عورت کے لئے کسی مرد کی باہوں میں سمٹی سمٹائی ہوئی چھوٹی موٹی سی دُنیا سے بڑھ کر پُرسکون اور کوئی دُنیا نہیں ہو سکتی ......
ایک ازلی سکون ..... ایک ابدی سکون ..... آپ کا کیا خیال ہے؟"
"میرا خیال ہے اب مجھے جانا چاہیے، میری فاختہ پُرسکون خطہ زمین کا سُراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔"
"لیکن مرد کا سکون بابا؟ ...... مرد بھی تو آپ کے آرک میں تھا نا آپ تو اس کے

بارے میں بھی جانتے ہوں گے ..... نوح صاحب! پلیز میری مدد کیجئے اور مجھے بتائیے کہ ایک مرد کا سکون .....“

”آدم سے پوچھو——“

نوح قہقہہ لگانے لگے ہیں۔

آدم سے پوچھ اے حوّا کی بیٹی! آدم سے پوچھ۔

نوح کا قہقہہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔

”ایک پل ..... وہی ایک پل ..... وہی ایک انمول پل ..... جس پل کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ آسمان سے زمین پر پھینک دیا گیا اور بھول گیا کہ وہ کیسا پل تھا، کیسا سکون تھا۔ چنانچہ وہ اب وہ ابد تک آسمانی اور مذہبی کتابوں میں اور برگد کے درخت کی چھاؤں میں سکون کی تلاش کرتا پھرے گا ..... حماقتوں کا پلندہ یہ آدم .....

نوح کا قہقہہ سمندری طوفان کا سا شور مچاتا ہوا ایک لخت تھم گیا ہے اور اسلم بھائی میرا بازو تھامے، مجھے چمٹائے کچھ اس انداز میں میرے بڈروم سے میرے ساتھ ساتھ نکل رہے ہیں جیسے ویڈنگ پرسر کے بعد کوئی جوڑا چرچ سے نکل رہا ہے۔ اور پھر وہ طلسمی نوح غائب ہو گیا ہے جس کے قہقہے اب تک میرے ذہن میں طوفان کا شور برپا کر رہے ہیں۔ لیکن اب مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے اس طوفانی شور کے بھیتر سے کوئی عجیب غریب طلسمی موسیقی پھوٹ پڑی ہے جس نے ایک بار پھر میری آنکھوں میں خمار بھر دیا ہے اور میری آنکھیں مُندنے لگی ہیں۔

اور پھر صدیاں بیتنے لگیں .....

اور پھر صدیاں بیت گئیں .....

اور جب آدمؑ آسمان سے زمین پر پھینکے جانے لگے تو میں نے بڑے بھروسے کے ساتھ اپنے آپ سے کہا——

”رفعت بھائی خودکشی نہیں کریں گے۔ رفعت بھائی کا آرٹ ایک بار پھر زندہ ہو جائے گا۔“

"لیکن ——"

"لیکن ——"

"لیکن ——"

"لیکن کیا؟ ...... دُنیا میں گناہ اگر کچھ ہے تو وہ ہے کسی کی جان لینا ......
اور اگر ثواب کچھ ہے تو وہ ہے کسی کو مرنے سے بچانا۔"

ایک اپسرا ایک یوگی کی تپسیا بھنگ کرنے کے لئے اس کے مٹھ میں پہنچ گئی ہے۔
بیشک میں کسی اپسرا سے کم کہاں ہوں۔"
"بیشک میں ایک حسین ترین لڑکی ہوں جس کی محض ایک جھلک دیکھ لینے
کے لئے سارا کالج پریشان رہتا تھا۔
"بے شک میں روحی آپا سے بھی زیادہ حسین ہوں۔"
"بے شک میں اُس پُراسرار لڑکی سے بھی زیادہ حسین ہوں جس کی تصویر سامنے
کی اُس چھوٹی سی میز پر چاندی کے فریم میں لگی رکھی ہے ...... لیکن اُس فریم پر تو گرد کی
ایک تہ جمی ہوئی ہے اور روحی آپا تو منوں مٹّی کے نیچے دبی پڑی ہیں ....."
"لیکن ممتاز کون ہے؟"
"کوئی بھی سہی —— افسانہ، افسانہ ہے اور حقیقت، حقیقت۔"
"ہاں —— یہ میرا وہی سوٹ ہے جو رفعت بھائی کو بے حد پسند ہے اور میرا
ہیئر اسٹائل؟ —— یہ اسٹائیل بھی تو انھیں بہت پسند ہے یہ اور بات ہے کہ
خود مجھے یہ اسٹائیل ایسا لگتا ہے جیسے سر کے بیچوں بیچ ایک دوسرا سر پھوٹ رہا ہے۔
لیکن بناؤ سنگار اپنے لئے ہوتا ہے کب؟ —— اور میں ...... اور میں تو رفعت
بھائی کے کب کے مرے ہوئے آرٹ میں نئی جان ڈالنے آئی ہوں مجھے اپنی پسند اور
ناپسند سے کیا لینا ہے ——"
اور اپسرا نے اپنی لمبی لمبی، پتلی پتلی، خوبصورت انگلیوں کی لمبی لمبی، نوکیلی،

رنگین اور چمک دار چونچیں یوگی کے گھونگریالے بالوں میں پیوست کر ڈالی ہیں۔یہ یوگی پر کیا بیت رہی ہے اس کا اپسرا کو کوئی علم نہیں۔ لیکن اپسرا کی آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگی ہیں۔

"نوح صاحب: میں چاہتی ہوں کہ اس آسمانی ہونق اور قابل رحم آدم کی زندگی کا وہ پل اسے نصیب ہو جائے جب یہ آسمان سے زمین پر پھینک دیا جائے۔ یہ آدمی ہے بابا! اسے زمین پر آدمیوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ آسمان پر فرشتوں کے ساتھ خواہ مخواہ بور ہوتا رہے گا۔"

اُف یہ مسکان؟ صدیوں کے بعد وہی میری جانی پہچانی مسکان!

"اے آسمانی روح! کیا تجھے مسکرانا یاد ہے؟"

"شبنم! ابھی ابھی میں طوفان نوحؑ کی سورہ پڑھ رہا تھا۔ واقعتاً خُدا مجبور تھا کہ اپنی مخلوق کو بیدردی سے فنا کر دے۔"

اور رفعت بھائی قرآن شریف کے انگریزی ترجمے سے وہ حصہ سنانے لگے ہیں۔

" I SEND NOAH TO THE PEOPLE. SO THATERE I PUT THEM IN THE ENDS. HEMAY DIRECT HIS PEOPLE, AND HE SAID..."

"رفعت بھائیؑ!"

"ہاں ——"

میں جانتی ہوں ساری دُنیا گناہ میں پھنس گئی تھی اور خدا جو اصلاح پسند کے ساتھ ساتھ انقلاب پسند بھی ہے، اس نے ایک نقاب لا ڈالا..... لیکن میں آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں۔"

"تم اچھی طرح جانتی ہو شبنم کہ برش چھونے کی صلاحیت مجھ میں باقی نہیں رہ گئی ہے ورنہ میں تمھاری ہمیشہ کی یہ چھوٹی سی فرمائش۔"

"ارے نہیں رفعت بھائی! میں کپڑے بدل کر اور تیار ہو کر اس لئے نہیں آئی آئی ہوں خواہ مخواہ گھنٹوں بور ہوتی رہوں۔ بھلا بیٹھ کر تصویر بنانا بھی کوئی تک کی

بات ہے وہ تو ہمیشہ محض آپ کو چھیڑنے کے لئے کہتی ہوں۔"

"اب تم بات بدل رہی ہو۔"

"توبہ کیجئے، میں آپ سے چھل کر سکتی ہوں۔ بھلا بخدا میری درخواست یہ نہیں ہے کہ آپ میری تصویر بنا دیں۔ میں تو آپ سے یہ عرض کرنے آئی ہوں کہ خُدا کے لئے آپ میری جان بچا لیجئے۔"

"اگر اس کے لئے مجھے اپنی جان بھی ....."

"افوہ ..... پہلے میری بات تو سُنئے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے لئے آپ کی اپنی جان انتہائی ادنیٰ سی چیز ہے۔ اور یہ چیز آپ بڑی آسانی کے ساتھ دے سکتے ہیں لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ آپ مر بھی جائیں تو آج مشاعرہ تو بہر حال ہو کر ہی رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ تجہیز و تکفین کی وجہ سے کچھ لیٹ ہو جائے ..... آپ نے سُنا ہوگا کبھی کبھی موت کے فرشتے بھی اپنا پروگرام بدل دیتے ہیں اور کسی کی موت ملتوی ہو جاتی ہے لیکن آپ نے کبھی نہیں سُنا ہوگا کہ کوئی مشاعرہ ملتوی ہوا ہو۔ اور میں سمجھتی ہوں وہ ضرور میری جان لے کر چھوڑیں گے۔

"کون؟ —— قصّہ کیا ہے؟"

"اسلم بھائی کے دوستوں نے ان کے اعزاز میں ایک مشاعرے کے لئے کمر کس لی ہے۔ مشاعرہ آٹھ بجے ہے ..... یا اللہ سات تو بج گئے اور اسلم بھائی مجھے ساتھ لے جانے کے لئے بضد ہیں اور آپ کو علم ہوگا ہی کہ نجومیوں نے میری پیدائش پر ہی امی جان کو بتایا تھا کہ میری موت کسی محفل مشاعرہ میں واقع ہوگی۔"

اور یہ ہنسی؟ ——

وہی پُرانی جانی پہچانی ہنسی!

یعنی رفعت بھائی ہنس بھی سکتے ہیں؟

"اے میرے معبود تو سچ مچ بڑا ہی رحیم و کریم ہے۔ اب میں تیرے ایک بندے کو بچا لوں گی۔"

اور نوح نے آرک کی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر کہا۔

"اے اپسرا تو نے بازی جیت لی ..... کانگرے چولیشن ..... میری حسین فاختہ! تو نے سکون کا سُراغ لگا لیا ..... کانگرے چولیشن!"

"رفعت بھائی! مجھے اُن ظالم بھیڑیوں سے بچائیے اور خدا کے واسطے آج رات کے آٹھ بجے تک کے لئے مجھے اغوا کر کے کہیں لے جائیے۔"

"کہاں چلو گی؟ ——"

"اور شور مچ رہا ہے ——"

"ہپ ہپ ہرّا ...... ہپ ہپ ہرّا ..... ہپ ہپ ہرّا۔"

"جی —— جی جہاں بھی ممکن ہو چلئے۔"

"میں ذرا شیو کر لوں۔"

"نو پلیز ..... کسی سیلون میں رفعت بھائی .... پیسے میں دے دوں گی۔"

"تو پھر اِسی کُرتے پاجامے میں چلوں؟"

نو پلیز .... گلی کے لونڈے بڑے حرامی ہیں ..... یقیناً گانے لگیں گے .... پہلوئے حور میں لنگور خُدا کی قدرت۔"

پھر وہی ہنسی!

وہی پُرانی جانی پہچانی ہنسی۔

یعنی رفعت بھائی ایک بار اور ہنس سکتے ہیں۔

"اے میرے معبود تو سچ مچ بڑا ہی رحیم و کریم ہے اب میں تیرے بندے کو مرنے سے بچا لوں گی۔"

اور نوح نے غالباً مطمئن ہو کر آرک کی کھڑکی بند کر لی۔

"رفعت بھائی وہ نیلا سوٹ ......اور...... وہ سُرخ ٹائی جس پہ تیر لگا ہوا دل کڑھا ہوا ہے۔"

"میں وہ ٹائی نہیں باندھوں گا شبنم .... وہ ٹائی نہیں۔"

رفعت بھائی جیسے کانپ اُٹھے ہیں اور میں ایک ماہر نفسیات جاسوس کے ذہن کے ساتھ گُن گنانے لگی ہوں ــــــ

"ہم تیرے پیار میں سارا عالم کھو بیٹھے....."

"شبنم ــــــ !"

اور درد میں ڈوبی ہوئی اس چیخ نے میرے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

"رفعت بھائی مجھے معاف کر دیجئے۔ یقین کیجئے یہ جو کچھ بھی ہوا بالکل انجانے پن میں ہوا ہے، مجھے کچھ نہیں معلوم ہے کہ....."

"تمھیں سب کچھ معلوم ہے شبنم..... تمھیں سب کچھ معلوم ہے۔ تین سال پہلے کی بات کوئی اتنی جلدی نہیں بھول جاتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے ممتاز کے نام میرا خط بھی ضرور پڑھ لیا تھا۔ اور یقیناً تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ لڑکی..... اُف..... شبنم معاف کرو مجھے۔"

"رفعت بھائی کی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں اور جیسے وہ نڈھال سے ہونے لگے ہیں۔ میں نے جلدی سے انھیں تھام لیا ہے اور انھوں نے اپنا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا ہے۔

ٹِک۔ ٹِک۔ ٹِک۔ ٹِک۔

بس اس کے علاوہ سکوت۔ مکمل سکوت۔

لیکن وہ حد سے زیادہ کرب ناک خاموشی میں نے ہی توڑ ڈالی۔

"تو کیا مشاعرے کی اذیت سے نہیں بچائیں گے؟"

"تم اپنی کسی سہیلی کے یہاں بھی جا کر چھپ سکتی ہو۔"

"جی؟ ــــــ جی ہاں۔"

"پھر کیا ضروری ہے کہ تمھارا اغوا کیا جائے اور اغوا کرنے والا میں ہی ہوں۔"

"کوئی ضروری نہیں.... جی؟..... جی نہیں یہ بہت ضروری ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ میں نہیں جانتی .... آپ کپڑے بدلئے۔"

"آج تو حکم چلا رہی ہو۔"

"جی ہاں .... یہ کام مجھے تین سال پہلے کرنا چاہئے تھا۔"

"کہاں چلو گی؟"

"قبرستان .... وہاں روحی آپا کی قبر سے ان کی ہڈیاں نکال کر آپ کے حوالے کر دوں گی اور میں ان کی قبر میں لیٹ کر آرام سے اسٹڈی کرتی رہوں گی۔"

"اچھا بڑا نیک خیال ہے۔"

"جی ہاں اب یہی ہوگا..... اُن کے دل، ان کی کتابیں، ان کے نوٹ بک، اُن کے کپڑے، ان کے اشعار، اُن کے خطوط سب کی میں حفاظت کر سکتی ہوں لیکن اُن کا محبوب میرے بس کا روگ نہیں، میں کہاں تک اُسے جھاڑ پونچھ کرتی رہوں؟.... انھیں ٹرے جڈی ناول پسند تھے۔ انھیں بے ہنگم غزلیں پسند تھیں ..... غزلیں تو خیر ہوتی ہی ہیں بے ہنگم، انھیں ہندوستانی فلم پسند تھے...... وہ آئیں اور آکر اپنے محبوب کا حال زار دیکھیں اور سر دُھنیں، مجھے اتنی فرصت کہاں ہے ..... یہ دُنیا انسانوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ قیس اور فرہاد کے لئے بنائی گئی ہوتی تو گول نہ ہوتی بلکہ ایک تھیٹر کی شکل کی ہوتی۔"

اور پھر وہی جانی پہچانی ہنسی، لیکن میں اس ہنسی کی طرف متوجہ ہونا نہیں چاہتی اور بدستور بکتی جا رہی ہوں ــــــ

"رفعت بھائی آپ کیا سمجھتے ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا غم صرف آپ کا غم ہے ...... آپ کا غم میرا غم ہے رفعت بھائی۔ امی جان کا غم ہے ابا جان کا غم ہے ..... آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کا عشق صرف آپ کا عشق ہے.... رفعت بھائی! یہ ہم سب کی زندگی کا ناسور ہے۔ یہ سارے کُنبے کا زخم ہے۔ یہ ساری قوم کا ناسور ہے .... آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آپ صرف آپ ہی نہیں ہیں۔ آپ ہم ہیں۔ آپ ہم سب ہیں اور ہم سب آپ کو مرنے نہیں دیں گے ..... لکھ لیجئے۔"

"ارے؟ —" میں چونک اُٹھی ہوں، طوفان ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے اور پانی میری آنکھوں تک پہنچ گیا ہے..... لیکن یہ پانی ہے؟..... مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ پانی نہیں بلکہ پگھلی ہوئی آگ ہے۔

شاید مجھے اس آگ کے دریا سے ڈوب کے پار اُترنا ہے۔

اور جب میں نے اپنے آنسو پونچھ کر رفعت بھائی کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"میری خاختہ! تو نے اس خطہ زمین کا پتہ لگا لیا جہاں سکون ہے۔"

رفعت بھائی میرا پسندیدہ نیلا سوٹ پہنے کھڑے تھے اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ کی پتلی سی تہہ جمی ہوئی تھی، جیسے یہ مسکراہٹ ان کی اپنی نہ ہو بلکہ انھوں نے کسی اور سے مانگ کر اس سے اپنے لب رنگ لئے ہوں۔

اور پھر.....

اور پھر میرے سامنے ٹائیوں کا ایک ڈبہ کھل گیا ہے۔

"شبنم! پلیز اپنے سوٹ کے رنگ کی ایک ٹائی نکال دو جب تک میں ذرا بال درست کر لوں۔"

"نا نا نا نا..... روحی آپا کو آپ کے بالوں کا یہی بے ہنگم پن تو مارے ڈالتا تھا۔ انھیں آپ کے بالوں کی بکھری لٹیں بیحد پسند تھیں۔"

"اور تمھیں؟ —"

اُف میرے اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کچھ کیا ہے اے عظیم کارساز! کس قدر کربناک کرشمے ہیں؟ ہاں ہاں — اگر یہ سب کچھ شعبدہ بازی ہی نکلا تو پھر کیا ہوگا؟ ..... اُف میں تو کانپ اُٹھی ہوں کہ اگر یہ سب کچھ محض تماشے ہی نکلے تو پھر کیا ہوگا؟

پارک کے ایک گوشے میں، تقریباً جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے وہ دونوں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔

وہ دونوں کون ہیں؟"

میں اپنے آپ سے پوچھتی ہوں۔

"وہ دونوں کون ہیں؟"

اور نوح نے آرک کی کھڑکی سے گردن نکال کر کہا۔

"آدم اور حوا ـــ"

"لیکن آدم اور حوا تو ......؟ .... تو کیا اب یہ دونوں فرشتے آسمان سے زمین پر پھینک دیئے جائیں گے؟"

میں نے پھر اپنے آپ سے پوچھا ہے اور نوح نے جیسے مجبور ہو کر پڑاک سے آرک کی کھڑکی بند کر لی ہے۔

" رفعت بھائی! آج زندگی میں دوسری بار میں آپ سے جھوٹ بولی ہوں۔ میرا پہلا جھوٹ وہ تھا جب میں نے قسم کھائی تھی کہ میں نے ممتاز کے نام آپ کا وہ خط نہیں لیا تھا۔ اور میرا دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ مشاعرے سے ڈر کر یہاں بھاگ کر آئی ہوں.... بے شک موت اور مشاعرے سے خوف کھانا ایک ذی ہوش آدمی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن میں اپنی کسی سہیلی کے یہاں بھی چھپ سکتی تھی۔"

"پھر تم ..... میرا مطلب ہے یہاں ....."

"میں آپ کو یہاں یہ کہنے لائی ہوں کہ جس سکون کے لئے آپ پریشان تھے وہ سکون میں نے آپ کے لئے مہیا کر دیا ہے۔"

"سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں۔"

"محال ہوگا ..... لیکن ناممکن نہیں ..... اور مجھے کیمیا کا نسخہ ہاتھ آگیا ہے میں جان گئی ہوں کہ سکون طوفان کا سر سے گزر جانے کا نام ہے ....."

"شبنم ـــ!"

"چیخئے، چلّائیے، اتنی زور سے شور مچائیے کہ پارک کے گارڈ اُس کنج سے

اِس کُنج تک آجائیں لیکن وہ، آپ یا کوئی بھی مجھے پکڑ نہیں پائے گا..... میں دور بہت دور جا چکی ہوں رفعت بھائی، میں بہت بلندی پر اُڑ رہی ہوں۔ اتنی بلندی پر جہاں سے اس سطح کی ساری چیزیں حقیر اور چھوٹی چھوٹی نظر آتی ہیں.... دُنیا سے پرے ایک اور دُنیا ہے رفعت بھائی جہاں کے مذہب میں گناہ صرف ایک ہے..... کسی کی لینا اور ثواب صرف ایک ہے کسی کی جان بچانا..... میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی ..... میں آپ کو مرنے.....

مجھے اپنی باہوں سے الگ کرتے ہوئے رفعت بھائی بڑبڑانے لگے ہیں ــــ
"یہ دس دس کوئنٹل کے بڑے دماغ پالنے والے بد دماغ لوگ...... اُف خُدا کی پناہ ایسی عظیم الشان بد دماغی..... اتنی بھاری حماقت..... بٹوارہ..... ملک کا بٹوارہ ..... نہیں نہیں وہ ملک کا بٹوارہ کہاں تھا؟..... ملک کب کٹا؟..... ملک کب بٹا؟.....

وہ اب بھی کبھی کبھی بکنے لگ جاتے ہیں ــــ
"یہ دس دس کوئنٹل کے بڑے بڑے دماغ پالنے والے...."
لیکن اب مجھے کوئی غم نہیں۔
اب مجھے کوئی فکر نہیں کہ ممتاز کون ہے
اب مجھے ذرا بھی کرید نہیں کہ رفعت صاحب کی میز پر چاندی کے فریم میں جڑی ہوئی وہ تصویر کس کی ہے جس کی گرد میں روزانہ صاف کرتی ہوں؟
اب کسی کو کسی بات کا غم نہیں ــــ
آدم کی زندگی کا وہ قیمتی پل گذر چکا ہے اور وہ آسمان سے زمین پر پھینک دیا گیا ہے۔
اور میں ایک فاتح کی طرح، بڑے فخر کے ساتھ اپنے آپ سے پوچھتی ہوں ــــ
"کیا یہ میں ہوں؟ ــــ"

ــــــــــ

کبوتری

(غیاث احمد گدّی)

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ لڑکی ذرا جھجکی اس نے اپنے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا جس کے اندر ایک کبوتری، وقت بے وقت پھڑ پھڑانے لگتی تھی۔ اس کی لمبی پلکیں جو اس کی گہری اور پُر سکون آنکھوں پر بنگال کے کسی بھی گاؤں کے پوکھر کے چاروں اور لگے ہوئے تاڑ کے پیڑوں کی طرح سایہ کئے ہوئے ہوئے تھیں ایک بار جُھکیں اور آنکھوں کو ڈھک لیا۔ اس دم کہیں سے بیتاب ہوا کا ہلکا سا جھونکا آیا اور اس کی پیشانی پر اُبھری ہوئی روشن تیوری کو چوم کر چلا گیا۔

تب لڑکی نے اپنے آس پاس بکھری ہوئی قوت کو سمیٹا چہرے پر تمکنت طاری کی اس کے بعد تیزی سے کمرے میں یوں داخل ہو گئی، جیسے کوئی پرنالہ کسی سخت موڑ پر ٹھہر کر ذرا تامل کرے پھر بہتی ندی میں چھپاک سے اُتر جائے۔

جب کوئی پرنالہ بھری دوپہر میں دور سے پیادہ آتا ہے اور آتے ہی ٹھنڈی ندی کی آغوش میں پناہ لیتا ہے، تو اس وقت کیسا انوبھو کرتا ہے؟ انوبھو کمرے میں داخل ہوتے ہی لڑکی نے ایسا ہی محسوس کیا، اور ذرا دیر کے لئے کھو سی گئی صرف ذرا دیر کے لئے کیونکہ جیسے ہی سامنے والی مٹیالے رنگ کی دیوار پر اس کی نظر پڑی وہ چونک اُٹھی۔ اس پر کوئی تصویر یا کلنڈر نہیں تھا بلکہ پوری دیوار پر کسی پرندے کے ایک بازو کی شبیہہ پینٹ کی گئی تھی۔ سفید پروں سے بھرا ہوا بازو، ایسا لگ رہا تھا۔ گویا ابھی ابھی جسم سے نوچ کر الگ کیا گیا ہو بازو کا نچلا حصّہ جو پرندے کے جسم سے کبھی جُڑا ہوا تھا ٹھیک وہاں سے لہو ٹپک رہا تھا.... خون .....؟

اس نے گھبرا کر دوسری دیوار کی طرف دیکھا۔ اس پر کوئی ایسی تصویر نہیں تھی، سنہری فریم میں قید ایک نیوڈ تھا۔ یہ تضاد دیکھ کر اسے عجیب سا لگا..... تصویر میں ایک بھرے بھرے گداز جسم والی عورت ایک دم سے برہنہ اوندھی پڑی تھی، جس کا پچھلا حصہ اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا، اور اس حصہ پر بھرپور روشنی پڑ رہی تھی، روشنی اور شیڈ سے کچھ یوں امپریشن پیدا کیا گیا تھا کہ دیکھتے ہی یوں محسوس ہوا گویا عورت کا یہ حصہ آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اُٹھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اسے دیکھتے دیکھتے وہ لڑکی بوکھلا گئی اس نے اپنی زندگی میں ایسی عجیب تصویر نہیں دیکھی تھی۔ پسینے کا ایک قطرہ ڈھلک کر اس کی گردن پر آیا تب وہ چونکی ..... اس کی لمبی لمبی خوابوں میں ڈوبی ہوئی پلکیں اُٹھیں اور آنکھوں کے تالاب میں ہلکی ہلکی لہریں روشن ہوئیں۔

کمرے میں دو مرد بیٹھے ہوئے تھے، اور دیر سے لڑکی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے اندر آتے ہی ان دونوں مردوں کو اچھا لگا ایسا لگا گویا ویرانے کھیتوں میں ہریالی پیدا ہونے لگی ہو، اور تاریک سمندر کی لہروں پر چاندنی نے ننھے ننھے چراغ جلا دیئے ہوں، ان کی آنکھیں جو زرد زرد تھیں ان میں ہلکی گلابی جھلک گئی اور پنڈلیوں پر کالی چیونٹیاں رینگنے لگیں، وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے کے لئے بے چین نظر آنے لگے، چہروں پر چمک آگئی اور رگوں میں ریشم کے دھاگے پھسلنے لگے۔

حالانکہ اس لڑکی کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی، جسے دیکھ کر آدمی تڑپ اُٹھے، آنکھیں، نہ چہرہ، نہ جسم کے خطوط، قوسین، کمانیں، نہ لبوں کی تراش، نہ رنگ، نہ چاندنی۔

"چاندنی! ہاں چاندنی......!"

پہلے مرد نے دوسرے مرد سے جو بات سرگوشی میں کہنی چاہی تھی اور کہہ نہ سکا تھا، وہ بات یہی تھی .....

"تم نے کبھی چاندنی دیکھی ہے..؟"

"ہاں۔" دوسرا مرد اگر جواب دیتا تو یہی کہتا۔ ہر انسان نے اپنی زندگی میں

کم از کم ایک بار چاندنی ضرور دیکھی ہے، وہی دودھیا دودھیا سی، دودھیا سی نہ بھی مگر ایسا احساس ضرور بندھتا ہے، گویا اس کی رگوں میں چاندنی سیال ہو کر بہنے لگی ہو لیکن اس آدمی نے دوسرے آدمی کو کوئی جواب نہیں دیا وہ اپنے آپ میں غوطہ کھا گیا۔

جب میں اس کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ عورت میرے ساتھ تھی۔ خوب صورت تھی، چھریرا بدن، ہلکی آسمانی رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی، وہ بہت اچھی لگ رہی تھی، سر کے لمبے سیاہ بال جس کے بارے میں وہ کہتی تھی کہ اگر کھول کر پھیلا دوں تو سارے کلکتے کو ڈھک لیں۔ بڑے سے جوڑے کی شکل میں گندھے ہوئے تھے، جس میں بیلے کی کلیاں آراستہ تھیں، آنکھیں بڑی بڑی اور چہرہ اتنا پیارا کہ نظر پڑتے ہی خواہ مخواہ پیار آجائے۔

ہاں، اُس کا نام چاندنی تھا، نہ بھی ہوتا جب بھی اُسے اسی نام سے پکارا جاتا۔ کیونکہ اس کے بدن پر چاندنی لپٹ لپٹ کر سو رہی تھی۔

وہ بہت تھک گئی تھی، کئی گھنٹے سے وہ اس مرد کے ساتھ ساتھ خاموشی اور وفاداری سے آوارہ پھر رہی تھی۔ ایک جگہ جہاں اسوتوش مکرجی کا مجسمہ نصب تھا، وہاں پہنچ کر وہ مجسمہ کے گرداگرد پڑی ہوئی ریلنگ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی اور اس مرد کی طرف دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولی۔

"اب کہاں تک بھٹکوں تمھارے ساتھ ساتھ ......؟"

"میں نے ساری شام اور ساری رات کے دام دیئے ہیں۔" یہ اس مرد کا جواب تھا۔ جسے سُن کر عورت نے ہوا سے اُڑتے ہوئے آنچل کو گردن سے پرے کیا اور مرد کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس پڑی۔ کچھ عجیب سی ہنسی، یوں کہ ہنسی نہیں تھی کچھ اور تھا، دھنک کا ٹکڑا تھا کلائیوں میں بجتی ہوئی چوڑیاں تھیں یا کچھ اور تھا.....

"دام..... تم تو اتنے بوڑھے ہو کہ اگر میں ضد کر بیٹھوں کہ مجھے گود میں اُٹھا کر

لے چلو میں بہت تھک گئی ہوں..... تو تم سے اتنا بھی نہیں ہوگا.....“اپنی اس بات پر وہ عورت زور سے ہنسی ”تو تم اتنے بوڑھے ہو کر ہر وقت دام دام کی رٹ لگائے ہوئے ہو؟“

”بس کرو.....“ مرد نے تڑپ کر ناگواری سے اس کے مُنھ پر ہاتھ رکھ دیا.....

”کوئی اچھی سی بات کرو، ایسی جسے سُن کر.....“

”مجھے......“اس لڑکی نے ہونٹوں کو بھینچ کر طنز بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا..... ”مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے، بہت دلچسپ ...... سُنوگے......؟“

”ہاں سُناؤ، ضرور سُناؤ“

ایک آدمی نے بازار سے چند گھنٹوں کے لئے ایک خوبصورت اور بھرے ہوئے گداز بدن والی ایک لڑکی کو خریدا۔ وہ لڑکی تو خوبصورت تھی ہی، وہ آدمی بھی کم وجیہہ نہیں تھا، دام بھی اس نے بہت دیئے تھے، اس نے لڑکی کو اپنی کار میں بٹھایا اور سارا دن بازار کی سیر کراتا پھرا...... ایسے ہی جیسے تم مجھے صبح سے دوڑائے پھر رہے ہو“

اس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے مرد کی طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرادی.......

”سارا دن پھرتے پھراتے جب شام پیروں میں اُتر آئی اور اندھیارا برسنے لگا تو اس آدمی نے کار کو سنسان ریگستان کی طرف موڑ دیا۔

پھر ایک ویران جگہ میں گاڑی روک دی، لڑکی سے کہا” تم کار کے سامنے کھڑی ہوجاؤ......اور اپنے سارے کپڑے اُتار دو، کہ میں نے پورے دام دیئے ہیں ....“

اس نے یہ کہہ کر کار کی ہیڈ لائٹ آن کردی، لڑکی خاموشی سے سر جُھکائے کار کے سامنے کھڑی ہوگئی اور اس کے حکم کے بموجب تیز روشنی میں ایک ایک کرکے اپنے کپڑے اُتارتی چلی گئی...“

جب عورت کافی دیر تک رُکی رہی اور مرد کے چہرے پر نظریں گاڑے مسکراتی رہی تو وہ ضبط نہ کرسکا۔

"پھر..... پھر کیا ہوا" اس نے بیتابی سے کہا "اس کے بعد کیا ہوا؟"

اس مرد کے سارے جسم میں رعشہ طاری ہونے لگا' اور آنکھیں رنگ بدلنے لگیں تو وہ عورت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہ میں نے ایک امریکن بلو فلم میں دیکھا تھا!....."

لڑکی پھر رُکی، اس نے پھر مرد پر نگاہ ڈالی۔ اس بار بیتابی زیادہ تھی، آنکھوں کی چمک بھی زیادہ تھی' یہ دیکھ کر عورت نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے اور اندر ہی اندر مگر زور زور سے ہنسنے لگی۔

پھر اس لڑکے نے کار اسٹارٹ کر دی۔ عورت نے لاپروائی سے فیصلہ کُن الفاظ میں کہا۔

"کار اسٹارٹ کر دی.....؟" تعجب اور پتہ نہیں کس جذبے کے زیر اثر مرد کے ہونٹ کھُلے کے کھُلے رہ گئے' آنکھیں خلا میں جھول گئیں۔

"ہاں..... گاڑی کے آگے بھاگتے بھاگتے جب وہ خریدی ہوئی تھک کر بے دم ہوگئی تو بے اختیارانہ گر پڑی، اس وقت لڑکے نے کمال چابک دستی سے کار کو بریک لگا دی؟" مرد کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی، اور ہونٹ نیلے پڑنے لگے تھے۔

"بریک لگا دی نا....' وہ آدمی اپنے آپ میں چونک اُٹھا'' پھر لڑکی کا کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا.... اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوا" عورت نے افسردگی سے کہا" گویا اگر اس بلو فلم ہی میں سہی' کار لڑکی کو کچل دیتی جب ہی ٹھیک تھا.....

"بال بھی بیکا نہیں ہوا؟" مرد نے حیرت سے پوچھا۔" تو پھر کیا ہوا' وہ لڑکی کہاں گئی؟"

کہیں نہیں وہیں اوندھی پڑ گئی۔ گھٹنوں کے بل پڑی وہ اتنا تھک گئی تھی کہ ہر آنے والی مصیبت کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی...... لیکن اس کا کچھ بھی نہیں بگڑا' وہ ویسے ہی گھٹنوں کے بل اوندھی پڑی رہی اور اس کے برہنہ جسم کا

پچھلا حصہ اوپر کی سمت اُٹھا رہا۔ جس پر کار کی دونوں ہیڈ لائٹس بھرپور روشنی پھینکتی رہیں۔۔"

(۲)

وہ لڑکی جو ذرا دیر پہلے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور خاصی سنجیدہ دکھلائی دے رہی تھی، دونوں مردوں کو مدت تک اپنے آپ میں گم دیکھ کر ضبط نہ کرسکی اور بلا وجہ کھلکھلا کر ہنس پڑی یوں جیسے ...... جیسے سیاہ بدلیوں کے درمیان دفعتاً چاندنی چٹک آئی ہو۔

"تم .... تم چاندنی ہو؟" دونوں مردوں نے چونک کر نظریں اُٹھائیں، اور ایک زبان ہو کر کہا "ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔!"

"میرا انتظار ...؟ کیوں میرا انتظار کیوں تھا؟"

"وہ تمہارے بھلے کے لئے؟" دوسرے مرد نے ہنستے ہوئے یقین دلایا۔

"ہمارے بھلے ....."

"ہاں .... تم ذرا ٹھہرو، ذرا اطمینان سے بیٹھو، تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔۔ ...... پھر ذرا توقف کے بعد پہلے آدمی نے اس کے سراپا پر نظر ڈالی اور اعتماد سے کہا ...... یہ ہم رضاکارانہ طور پر کرتے ہیں، جہاں اندھیرا دکھائی پڑا، ہم وہاں بخوشی پہنچ جاتے ہیں اور چاندنی بکھیر آتے ہیں۔ اور معاف کرنا ہمیں، اگرچہ تمہارا نام چاندنی ہے لیکن تمہارے پاس قسم کھانے کو بھی چاندنی نہیں۔"

وہ لڑکی جو ذرا دیر پہلے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اپنے چاروں اطراف سے ڈھیروں طاقت اکٹھی کر کے اندر آئی تھی، وہ سب کی سب رائی کے دانوں کی طرح بکھرتی ہوئی نظر آئی تھی تڑپ اُٹھی۔ فہم و نافہمی کے درمیان وہ اپنے آپ کو کچھ کمزور سی محسوس کرنے لگی۔ تب دوسرے مرد نے مسکراتے ہوئے ایک گلاس اُس کی طرف بڑھایا، اُسے پی لو، گھبراہٹ دور ہو جائے گی۔"

نہیں میں نہیں پیوں گی، مجھے صرف یہ بتایا جائے کہ ..... میرا مطلب ہے ....."

ہمارا مطلب ایک دم صاف ہے، ہم تمہارے دوست ہیں ہمدرد ہیں، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ تم یہاں سے دس میل بیل گھیا کے ایک اسکول میں ایک سو سات روپے پر بچّوں کو پڑھاتی ہو۔ تمہارا باپ بہت پہلے مرچکا ہے ..... ایک چھوٹی سی کوٹھری میں تم سات افراد رہتی ہو۔ ہمیں تو یہ بھی علم ہے کہ تمہارے پاس اب صرف ایک ہی ساڑی رہ گئی ہے کیونکہ کل ہی تم اپنی ایک پُرانی گلابی رنگ کی ساڑی کو جو ایک دم سے استعمال کے قابل نہیں رہ گئی تھی، کھڑکیوں پر پردے کے مصرف میں آویزاں کرچکی ہو۔

اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی جو پریسیڈنسی کالج کے دوسرے سال کا ناسمجھ سا جوشیلا طالب علم ہے، وہ کتابوں کا بہت شوقین ہے، تمہاری ایک بڑی بہن پاگل ہے اور دن بھر برہنہ پڑی کھانے کو مانگتی رہتی ہے۔ اور اس کے تین بچّے اور تمہارے دو ننھے ننھے بھائی .....

اور ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ ..... کہ ..... وہ آدمی دفعتاً رُک گیا ..... اور مسکراکر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ جو لمحہ بہ لمحہ گہری دلدل میں اُترتی جا رہی تھی ..... جب بہت دیر تک وہ آدمی اس کے چہرے پر نظریں گڑائے مسکراتا رہا تو اس وقت اس نے دل کے نہاں خانے میں پھڑپھڑاہٹ کی آواز سُنی۔

"اور کیا جانتے ہیں ..... اور کیا ....." لڑکی نے ذرا گھبراہٹ محسوس کی۔

کوئی خاص بات نہیں ..... اس آدمی نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا، صرف یہ کہ تمہارے گھر کے دروازے کے اندرونی حصّے میں، کسی اخبار سے تراشی ہوئی ایک تصویر چسپاں ہے ..... جس میں ایک چپٹی ناک اور بھدّے چہرے والی برہنہ عورت ہے، جس کا آدھا جسم کیچڑ میں دھنسا ہوا ہے اور اس کے ننگے سینے پر دو نوکیلی سنگین اُترتی جارہی ہیں .....

.........!

کیا ہوا؟ کیسے اس کی رگوں میں سفر کرنے والے لہو کی رفتار لڑکھڑانے لگی ہے

اور اس کی کنپٹیوں پر ایک ٹھنڈی سی جاندار شے رینگنے لگی ہے ..... یہ کیسا محسوس ہو رہا ہے کہ کالی آندھی زور سے اُٹھی ہے اور اس کے آس پاس کی تمام اشیا اس میں غرق ہونے لگی ہیں اور کوئی چیز اس کی آنکھوں کے سامنے ٹھہرنے کو تیار ہی نہیں ہو رہی ....

"کیا یہ جھوٹ ہے ؟" مرد نے تائید نہیں چاہی اسے لڑکی کا جواب نہیں درکار تھا۔ اس نے بدستور اطمینان سے کہا "لیکن اگر یہ سچ بھی ہے تو کیا ہوا، تمھارے گھر میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں انھیں میں سے کسی نے کسی اخبار سے یہ تصویر .... دراصل ہم چاہتے ہیں کہ ایسی تصویریں بچوں کے سامنے نہ ہوں تو اچھا ہے ...... کیونکہ ......"

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ اس آدمی کی آواز سے بھی مُنھ پھیر لیا۔ اس کی پیشانی پر ایک دل نواز تیوری اُجاگر ہوئی اور دیر تک وہیں تھرتھراتی رہی ...... اس کی رگوں کا مسافر ابھی چند لمحے پیشتر جس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ آگئی تھی، اس نے آہستہ سے مگر مضبوط سا قدم اُٹھایا۔

ہاں ابھی کچھ دیر پہلے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے تلوے اور ہتھیلیوں میں بجلی سی سما گئی ہو، اور آنکھوں سے دُھواں اُٹھ رہا ہو حالانکہ باہر کی سخت دھوپ اور لُو کے مقابلے میں کمرے میں بڑی پیاری پیاری ٹھنڈک پھیلی ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے ایک نامعلوم سی کیفیت کے زیرِ اثر تمام ماحول پر نظر ڈالی، اس کے پاؤں گویا سُن ہو رہے جا رہے تھے۔ اور بدن پتھر میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا وہ کیفیت جاتی رہی جب اس کی یہ کیفیت کم ہونے لگی تو وہ قریب والے صوفے پر بیٹھ گئی، ایک لمبی سانس! جس نے اس کے وجود کو قدرے ہلکا کر دیا۔

اس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا، ایک بہت بڑے کمرے کو بیڈ روم کم ڈرائنگ روم کی شکل دے دی گئی تھی۔ جنوبی دیوار سے لگا بہت بڑا اور بیحد قیمتی پلنگ بچھا تھا، جس پر نہایت شوخ زرد رنگ کی بیڈ سیٹ بھیلی ہوئی تھی، دیواروں کا رنگ

بھی زرد تھا۔ صوفوں پر جو غلاف چڑھے ہوئے تھے وہ بھی زرد رنگ کے تھے دروازوں کے پردے، چھت پر جھولتے ہوئے فانوس اور اس کے اندر سے نکلتی ہوئی روشنی سب کی سب زرد رنگ کی تھی۔ کمرے میں ہلکی مٹیالی روشنی پھیلی ہوئی تھی، سامنے میز پر ایک چھوٹا سا پلاسٹر آف پیرس کا بت رکھا تھا اس نے غور سے دیکھا، یہ اس شبیہ کی نقل تھی۔ ایک عریاں عورت اوندھی لیٹی ہوئی تھی اس کا پچھلا دھڑ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رفتہ رفتہ بلند ہوتا جا رہا ہے۔ یہ کیسی عورت تھی، یہ ننگی عورت جس کے جسم کا پچھلا حصہ لمحہ بہ لمحہ اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔

دفعتاً وہ لڑکی چونکی اور چونک کر اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مردوں کو دیکھا، جو بڑی گہری نظروں سے اس کی سمت تک رہے تھے۔ لڑکی کو چونکتے دیکھ کر ایک مرد نے کہا..... یہ اس خوبصورت اور تندرست لڑکی کا مجسمہ ہے جو پچھلے دنوں کویت کے ایک ہوٹل میں کیبرے رقص کرتے ہوئے ننگی ہو کر اوندھی ہو گئی تھی اور جب اس کے جسم کے اس حصے پر بھرپور روشنی ڈالی گئی تو ہوٹل میں بیٹھے کتنے ہی مردوں کی آنکھیں چندھیا سی گئیں اور کئی وہاں بیٹھے بیٹھے ہی بے ہوش.....

لیکن اس لڑکی کو کچھ عجیب سی بے چینی کھائے جا رہی تھی۔ اس نے بڑی ناگوار کیفیت کے زیر اثر نظر اٹھا کر اس مرد کی طرف دیکھا، جو مجسمہ کے بارے میں کہتا کہتا رک گیا تھا، اس نے بے قراری سے ہونٹوں پر زبان پھیری اور میز پر پرس کو آہستہ سے ڈال دیا۔

"لیکن مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟" اس کی آواز کہیں کہیں سے ٹوٹ رہی تھی۔

"اس لئے کہ اگرچہ تمہارا نام بڑا خوبصورت ہے اور سننے والے کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے، مگر....." ذرا توقف کے بعد اس نے پھر کہا، "تم اگر چاہو تو تم بھی اتنی ہی حسین اور دل آویز ہو سکتی ہو۔

"دل آویز" اس لڑکی نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی .... وہ کیا کرے گی دل آویزی

لے کر، یہ دل آویزی تو کویت کی اس کیبرے ڈانسر ہی کو زیب دیتی ہے۔ وہ تو اپنا ایک چھوٹا سا گھر بنانا چاہتی ہے۔ چاہتی ہے کہ اس کی بہن جو کئی سالوں سے بیمار ہے اس کا علاج ہو، اس کے بھائی کی ملازمت ہو، پھر کہیں وقت ملے تو سدھیر سے ملے، سدھیر... سدھیر کمار سین .....

اگر وہ واقعی چاندنی ہوتی، جیسا کہ اس کا نام ہے .... وہ لڑکی بھٹک گئی، اگر وہ واقعی خوبصورت ہوتی ایسی جیسی کویت کی حسینہ تھی تب ... تب.... تب وہ کیا کرتی، سدھیر کمار سین کیا کرتا.... لیکن سدھیر تو یوں بھی .... یوں بھی .....

"تمہارے بڑے بھائی نے بینک کی ملازمت کے لئے آج انٹرویو دیا ہے۔" وہ آدمی اچانک چپ ہو گیا اور لڑکی کی طرف غور سے دیکھنے لگا، جو کہیں ڈوبتی ابھرتی سی لگ رہی تھی .....

"ہاں ہاں، میرے بھائی نے ...... پھر اس انٹرویو کا کیا ہوا؟ کہیں سے اس کے چہرے پر چاندنی کا چھڑکاؤ ہوا۔

آپ جانتی ہیں انٹرویو ایک نہایت نارمل قسم کی چیز ہے۔"

"ہاں ....." اس نے مایوسی سے کہا۔ "میرے بھیا نے تین سال میں درجنوں جگہ انٹرویو دیا......"

"تمہارا نام چاندنی ہے۔ اور تمہارے جسم کی ساری چاندنی ہمارے پاس ہے۔" پہلے مرد نے کنکھیوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کویت کی وہ حسین رقاصہ، جس کا مجسمہ تم میز پر دیکھ رہی ہو اس کے جسم کی چاندنی بھی ہمیں نے دی ہے۔ اس لڑکی نے خود فراموشی کے سے انداز میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا اور زیر لب بڑبڑائی "میرے جسم کی چاندنی تمہارے پاس ہے..؟

تمہارا بھائی تین سال سے ملازمت کے لئے در بدر کی خاک چھانتا پھر رہا ہے ..... دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی ہو بہو نقل اتارتے ہوئے کہا... اور اس کی ملازمت ہمارے اختیار میں ہے.....؟

تمہارے اختیار میں ہے۔۔۔؟" لڑکی کی خود فراموشی میں اضافہ ہوا۔۔۔۔۔۔
تمہارے اختیار میں ہے۔"

"ہاں، تین چار سو کی۔۔۔۔۔ سات آٹھ سو کی ملازمت دراصل ہم تمہارے ہمدرد ہیں، بلکہ ہم تمام بنی نوع انسان کے ہمدرد ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ کوئی آدمی بھی بھوکا نہیں رہے، کوئی بدن کپڑے سے محروم نہ ہو، خوشیاں جو ہم اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں، تمام کُرۂ ارض کے جانداروں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔۔۔۔

وہ لڑکی جو کسی پرنالے کی طرح بھری دوپہر میں بہت دور اُبڑ کھابڑ راستوں کو طے کرتی ہوئی آئی تھی۔ وہ مٹیالے رنگ کی ندی میں یوں کھڑی تھی کہ بہتے ہوئے پانی کا ہر ریلا اس کو چھوتا ہوا گذر رہا تھا اور وہ خاموش کھڑی اپنے ساتھ بہتے ہوئے بے جان لمحوں کو تک رہی تھی، جو گرمی کی تمازتوں سے جُھلسے ہوئے پتّوں کی طرح اپنی ہریالی کھو چکے تھے، اور ایک دم سے مُردہ دکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ اس لڑکی نے چونک کر چاروں اور دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں بہتے ہوئے لمحوں کی جانب مرکوز ہو گئیں۔ لیکن نہیں۔ انھیں بہتے پتّوں میں ایک آدھ ایسا بھی گزر جاتا جس کی رگوں میں خون ہوتا، جو زندہ سا ہوتا، ہرا ہرا سا۔۔۔۔۔ ایسے ہی تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک جاندار لمحے کو پکڑنے کے لئے لڑکی نے ہاتھ بڑھانا چاہا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔

"کویت کی رقاصہ جس کا مجسمہ تم میز پر دیکھ رہی ہو، اس کے جسم کی چاندنی بھی ہم نے ہی دی ہے، اور ہم چاہیں تو، تمہارے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے۔۔۔

سایہ گہرا تو نہیں تھا، مطلب ہے ابھی کچھ کم گہرا تھا، مگر ایسا تھا کہ آس پاس کی چیزیں مدھم ہوتی جا رہی تھیں اور جیسے جیسے سایہ گہرا ہوتا جا رہا تھا، چہروں کے خط و خال پہلے خلط ملط ہوتے گئے پھر دھندلانے لگے، آنکھیں جو دیر سے روشن تھیں اس کی لوئیں دھیمی ہونے لگیں، پیشانی پر کی حسین تیوری مٹی، پھر نقوش دھندلائے۔۔۔۔۔ دھندلکا۔۔۔۔۔ تاریکی ایک بڑے لقمہ کی طرح اس کے گلے میں پھنس گئی۔

"مگر۔۔۔۔۔ مگر میں وہ قیمت نہیں ادا کر سکتی، جو کویت۔۔۔" لڑکی کی آواز تھکی

ہوئی تھی۔۔۔۔

"کون کہتا ہے"..... ایک مرد نے جلدی سے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، "ہمیں کوئی قیمت، کوئی معاوضہ نہیں چاہیے، ہم تو تم سے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تمھارے چھوٹے بھائی کی کتابوں میں سے ایک کتاب نکال لی جائے ...... اور تمھارے کمرے کے دروازے سے چپکی، اخبار سے تراشی ہوئی جو تصویر ہے اس کی جگہ اس خوبصورت رقاصہ کی تصویر چسپاں کر دی جائے اور بس۔

دوسرے آدمی نے لڑکی کو گہری سوچ میں اترتے ہوئے دیکھ کر کہا، بس اتنی سی بات ..... بس اتنی سی بات....."

بہت دیر ہوگئی، سایہ بہت گہرا ہوگیا اور سامنے والے چہروں کے خط و خال ایک دم سے معدوم ہوگئے، وہ لڑکی جو سینکڑوں میل کا لمبا راستہ کسی پرنالے کی طرح طے کر کے یہاں تک آئی تھی، اور بڑے اعتماد سے ندی میں اتری تھی، اس نے محسوس کیا کہ اس کے سینے کے اندر کوئی چیز پھڑپھڑا رہی ہے جیسے کسی تاریک کنویں میں کوئی چمگادڑ پھڑپھڑائے۔

باہر آسمان میں سیاہ بادل ہاتھیوں کی طرح جھوم رہے تھے، جس میں چاندنی دفن ہوتی جا رہی ہے، تب چاروں اور ایسا اندھیارا پھیلنے والا تھا جسے سوچ کر ہی دل دہل جاتا ہے۔

کہیں ویران آنگن میں کوئی کبوتری، غلیل کے پتھر کی چوٹ کھا کر گر پڑی تھی، اور پھڑپھڑا رہی تھی، بار بار پانی کے ایک قطرہ کے لئے اس کا منھ کھل جاتا ——— ایک قطرہ پانی .... کوئی ایک قطرہ پانی اس کے حلق میں ٹپکا دے تو وہ جی اُٹھے۔

بہت دیر سے وہ لڑکی آنکھیں پھاڑے اس کبوتری کو دیکھ رہی تھی جو اس کے قدموں میں تڑپ رہی تھی۔۔۔

پانی کا ایک قطرہ.... ایک قطرہ.... اور بس.... بس۔ اتنی سی بات، اتنی سی!

بابو

(کلام حیدری)

صبح سات بجے کا گھر سے نکلا میں ابھی ابھی گھر لوٹا ہوں۔ تھک کر چور ہو چکا ہوں مگر ذہن پر جو بوجھ تھا وہ اُتر سا گیا ہے لیکن جو بوجھ اب ذہن پر محسوس کر رہا ہوں وہ مجھے اُس بوجھ سے زیادہ بھاری معلوم پڑ رہا ہے۔

یہ میری حماقت بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے گھڑی دیکھی، گیارہ بج چکے ہیں۔ میں نے نوکر کو آواز دی تو میری بیوی بھی جاگ پڑی ہے، میں نہا دھو کر اب کھانے کی میز پر بیٹھ چکا ہوں۔

میری بیوی مجھ سے دن بھر غائب رہنے کے بعد اتنی دیر سے گھر پہنچنے کا احوال پوچھ رہی ہے۔ میں نے اصلی بات چھپا کر اُسے اپنی مصروفیتوں کا قصہ سنا کر ختم کیا اور کھانا کھانے لگا۔

بستر پر کئی کروٹیں لے چکا ہوں، بے حد تھک چکا ہوں مگر نیند نہیں آ رہی ہے۔

وہ ٹھکانے لگ گیا ہے۔ وہ جس جُرم میں جیل گیا ہے وہ اُسے پھر اس سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دے گا۔ فارینز ایکٹ میں گرفتار کرانے کے بعد میرے ذہن کا وہ بوجھ اُتر چکا ہے جو اس کی ملاقات نے اچانک میرے سر پر رکھ دیا تھا۔

بیس سال سے اس شہر میں عزت و نیک نامی کی زندگی گذارنے کے بعد یوں اچانک ایسے زلزلے سے دو چار ہو جاؤں گا، میں نے سوچا بھی نہ تھا۔

یہ خوبصورت مکان، یہ لان، اچھی بیوی، تین بیٹے، ایک بیٹی، شہر کی سب سے بڑی کپڑے کی آڑھت۔

خوش حال اور مطمئن زندگی کے بیس سال گذارنے کے بعد اچانک یہ زلزلہ۔

میری کنپٹیوں پر کچھ بڑھاپے کی سفیدیاں نمایاں ہونی شروع ہوگئی ہیں میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا کہ کوئی میری ہموار اور سیدھی زندگی کے راستے میں ہچکولے پیدا کرنے کے لئے آجائے۔

میں نے اپنے دس سالہ پرانے ڈرائیور کو بھی نکال دیا ہے۔کیونکہ........ کیونکہ......

میں ایک ضروری کام سے دوسرے شہر جا رہا تھا تو ڈرائیور نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا کہ اُسے ایک ہفتہ کی چھٹی چاہیئے اس لئے کہ اس کا بھائی بیس سال کے بعد اچانک آرہا ہے۔

"کہاں سے آرہا ہے" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی نہیں معلوم۔ویسے تار کلکتہ سے آیا ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔

"تو یہ بیس سال بعد اچانک تمھارا بھائی کون تھا جو اب تمھارے پاس آرہا ہے؟"

سر! میں تو کچھ جانتا نہیں، میں دس بارہ سال کا تھا جب ہی وہ کلکتہ میں رہتے تھے۔مجھے ان کی شادی یاد ہے اُس کے بعد کچھ نہیں معلوم وہ کہاں گئے اور کہاں سے آرہے ہیں۔"

میں اپنے ٹور سے لوٹا تو ڈرائور چھٹی پر چلا گیا۔

اُس دن ناشتہ کر چکا تھا اور برآمدے میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ پورٹیکو میں ڈرائیور ایک اجنبی کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔

ڈرائیور نے مجھے سلام کیا، پھر اُس اجنبی نے بھی۔

"سر! یہی میرے بھائی ہیں۔یٰسین!"

میں نے محسوس کیا ڈرائیور کا بھائی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔

اچانک جیسے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں دیکھے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا ہوں۔ مگر چند لمحوں میں ہی اتنے چہرے میری آنکھوں میں آگئے کہ سب کے سب گڈمڈ ہوگئے۔

اور تب اس بھیڑ بھاڑ میں آہستہ آہستہ ایک چہرہ اُبھرنے لگا۔

لیکن .....

لیکن ....

میں نے کُرسی پر پہلو بدلا اور اس چہرے کو جو اَب بے حد صاف طور پر میرے سامنے آگیا تھا اپنی نظروں سے دور کرنے لگا۔ اپنی یاد داشت کو جھٹلانے کی کوشش کرنے لگا۔

یٰسین!

یہ وہ نہیں ہے۔

"میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے بابو۔"

میں نے نظریں اُٹھا کر اوپر دیکھا — وہ یٰسین تھا بالکل یٰسین تھا! میں چاہے اس حقیقت کو پسند کروں یا نہ کروں مگر وہ چہرہ میرے سامنے تھا، ماہ و سال کے اثرات تھے مگر چہرہ وہی تھا۔

میں نے دل میں سوچا۔ تم نے پہچان لیا تو کیا میں نے نہیں پہچانا۔ تمھیں پہچان کر میں کہیں اپنے آپ کو نہ کھو دوں کیونکہ .....

مجھے اُس بڑے شہر کے آخری کنارے پر کھولا باڑی میں رہتے ہوئے دو ماہ سے اوپر ہو چکے ہیں۔

میں کوئی سیاح نہیں ہوں، میں کوئی شوقین امیر بھی نہیں ہوں جو تجربے کے شوق میں کھولا باڑی میں رہنے لگا ہے، پھر وہ یہاں سے چلا جائے گا اور کھولا باڑی کی زندگی پر دو چار آرٹیکل لکھ کر ہزاروں کمائے گا۔

مجھے تو یہاں میرے وہ ظالم حالات لے آئے ہیں جن میں گھر گیا ہوں ورنہ میں مزے سے کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا اور مستقبل کے سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا، میرے پاس ہر ماہ ایک مقررہ رقم گھر سے آجاتی تھی اور میں مزے سے ہوسٹل

کی اوسط زندگی گذار رہا تھا۔ بی۔اے کر چکا تھا اور اب اطمینان سے ایم۔اے کر کے بہتر زندگی کے خوابوں کے نشے میں زندگی گذار رہا تھا کہ اچانک۔

اس میں کوئی ڈرامائیت نہیں ہے کہ اچانک میرا باپ مر گیا۔ کیونکہ جس طرح اچانک میرا باپ مر گیا اُس طرح بہت سے لوگ مر جایا کرتے ہیں اور جس طرح میں کھولا باڑی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوا اُس طرح بہت سے لوگ مجبوراً کھولا باڑی میں پوری زندگی کاٹ دیتے ہیں۔

میرا باپ تو خیر ایک اچھا خاصہ سرکاری ملازم تھا کہ جب وہ مر گیا تو ایک مخصوص عرصہ تک میری ماں کو پنشن ملتی رہے گی۔

پنشن اور تنخواہ میں فرق ہوتا ہے اسی لئے میں ہوسٹل سے اس کھولا باڑی میں آگیا۔

سنہرے خوابوں کی بجائے اب مجھے اپنے دو بھائیوں کی تعلیم اُن کے مستقبل کی فکر لاحق ہوگئی۔ ایک بہن کی شادی کا مسئلہ سامنے کھڑا ہو گیا۔

زندگی مجھے کہاں لے آئی تھی؟

زندگی مجھے کہاں لے جائے گی؟

صبح سات بجے اُٹھ کر میں کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو میرے بلاک والے پانی کے نل پر حسب معمول بھیڑ جمع ہے۔ بالٹیوں اور گھڑوں کا انبار لگا ہوا ہے' کون پانی پہلے بھرے گا؟ جھگڑے ہو رہے ہیں، پھر میں اپنی لنگی اور تولیہ لے کر باہر نکل جاتا ہوں اور نل کے پاس پہنچتا ہوں تو اِن جھگڑتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کو پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ سب کے سب کنارے ہٹ جاتے ہیں۔

بابو نہائے گا۔ بابو نہائے گا۔

بابو کا لقب ان میں سے کس نے مجھے دیا تھا، میں نہیں جانتا مگر مجھے اس جگہ بابو کہا جاتا تھا اور اس احترام کا تجربہ مجھے روزانہ اس وقت ہوتا تھا جب میں نہانے کے لئے اس نل پر آتا تھا۔

اس احترام کے جواب میں اس کے سوا مجھے کچھ نہیں سوجھتا کہ جلدی جلدی نہاکر ہٹ جاؤں۔

میرے ہٹتے وہاں پھر وہی گالم گلوج اور لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے۔

میں ایک مخصوص معمولات کا پابند تھا اس لئے ساتھیوں میں سنجیدہ سمجھا جاتا تھا اور طرار قسم کے ساتھی اکثر غبی بھی کہہ دیا کرتے تھے۔

باپ کی موت نے میرے اوپر سنجیدگی کی ایک اور تہہ بٹھا دی تھی اس لئے دُنیا کی تمام ترغیبات سے کنارہ کش زندگی گذارنے کے لئے یہ کھولا باڑی بڑی مناسب جگہ تھی۔

شروع شروع میں مجھے لگا تھا کہ میں ان نیچے لوگوں میں زیادہ دن نہیں رہ سکوں گا، مگر ان لوگوں نے جو میرا احترام کیا تھا اُس سے میں کم از کم اتنا مطمئن ضرور ہوا تھا کہ میرے کام میں کسی طرح کا خلل نہیں پہنچے گا۔

اس احترام کی قیمت مجھے ایک اور طرح چکانی پڑتی، اس آبادی کے اکثر لوگ میرے پاس منی آرڈر لکھوانے، اپنے خطوط لکھوانے اور پڑھوانے آجاتے تھے۔ اکا دُکا سے شروع ہوکر اب یہ حال ہوگیا تھا کہ مجھے روزانہ کئی کئی خطوط لکھنے اور پڑھنے پڑجاتے۔ وقت بے وقت سے تنگ آکر میں نے اب صرف ایک دن مقرر کر دیا تھا۔ جب میں یہ کام کرتا تھا یعنی اتوار کے دن۔ بس اور اتوار کو میرے دروازے میں یہ سب اس طرح لائن میں لگ کر بیٹھتے کہ جیسے راشن کی دُکان میں نمبر لگائے ہوئے ہوں۔

میں باری باری خط پڑھتا' اُن کے جواب لکھتا۔ اور یہ کام دو گھنٹے سے کم میں کبھی ختم نہ ہوتا۔

وہ اتوار کی رات تھی جب کسی نے میری کوٹھری کا دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ میں گہری نیند سے اُٹھا اور بوکھلاہٹ میں بلا سوچے سمجھے دروازہ کھول دیا۔ وہ تیر کی طرح اندر آگیا۔

"بابو" اتنا کہہ کر وہ دروازے کی طرف مُڑا اور اس نے اندر سے کُنڈی چڑھا دی

اور ہاتھ کی ایک چھوٹی سی اٹیچی کو میرے پلنگ کے نیچے ڈال دیا۔

"مجھے یہاں پر گولی لگ گئی ہے۔" اس نے اپنا شانہ کھول کر دکھایا جس پر کس کر ایک گمچھا بندھا ہوا تھا۔

"گولی۔۔؟ ارے! یٰسین۔ کیسے ہوا۔" میں بے حد نروس ہوا۔

"بابو گھبرائیے نہیں، بس ایک دو چھرا ہی لگا ہے۔ میں یہاں پکڑ لیا جا سکتا ہوں۔"

"بات کیا ہے۔؟"

"جلدی میں کیا بتاؤں" میری اٹیچی اپنے پاس رکھیں گے۔ میں کل آکر لے جاؤں گا۔؟ اور میرے کچھ سوچنے سمجھنے سے قبل وہ میری کوٹھری سے نکل گیا۔

کچھ دیر تو میں اپنی چارپائی پر بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا۔ نیند غائب تھی!

اِن لوگوں کا کیا ٹھکانہ؟ پتہ کیا کہیں ڈاکہ ڈالا ہو۔ کہیں جھگڑا کر بیٹھا ہو، کہیں۔۔ میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک تالہ بنانے والی فیکٹری میں کاریگر ہے اور میرے اس بلاک میں اپنی نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔

چارپائی کے نیچے اٹیچی ہے۔

اس خیال کو میں ذہن سے جھٹک کر سو جانا چاہتا تھا، مگر نیند اور میرے بیچ میں یٰسین اور .....

پھر جانے کیا ہوا اور کب ہوا کہ میری آنکھ لگ گئی۔ بے خبر سو گیا، اُٹھا تو سرہانے پڑی ہوئی گھڑی میں ساڑھے سات بج رہے تھے۔

مجھے خیال آیا چارپائی کے نیچے ـــــ

باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا تو سامنے یٰسین کی کوٹھری کھلی ہوئی تھی اور وہ اور اس کی بیوی دونوں کے پُراسرار فرار پر عورت مرد سب ہی باتیں کر رہے تھے۔

میں نے اٹیچی چارپائی کے نیچے سے نکالی اور اسے کھولا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

سَو کے نوٹوں سے وہ اٹیچی بھری پڑی تھی۔ دو لاکھ تین لاکھ ـــــ

میں نہایت خاموشی سے کھولا باڑی چھوڑ کر اپنے شہر روانہ ہو گیا۔

ڈائری کی محبوبہ

(شکیل الرحمٰن)

سلیمان منزل میں اس کا تانگا رُکا۔ ارشد نے دیکھا سلیمان منزل واقعی ایک بڑی عمارت تھی۔ آج وہ یہاں پہلی بار آیا تھا۔ اس نے تانگے سے سامان اُتارا۔ اور تانگے والے کو پیسے دے کر سامنے کا بڑا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ دروازے کے اوپر ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔

"اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔"

اس نے فوراً اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھا۔ وہ کاغذ بوسیدہ ہو گیا تھا۔ اس پر کافی گرد جم گئی تھی۔ اور اس کا ایک حصہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر جھول گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے ہوا سے ہلتا ہوا یہ حصہ اپنی انگلی سے اندر چلے جانے کو کہہ رہا ہو۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے سوچا، یہ گاڑی بھی کتنی بے وقت آئی ہے۔ گرمی کا دن ہے اور میں خواہ مخواہ سوئے ہوئے لوگوں کو تنگ کر رہا ہوں۔" وہ صبح کا چلا ہوا تھا۔ راستے میں کافی بھیڑ تھی۔ اس لئے اسے کافی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ بہت پریشان سا ہو گیا تھا۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ اسے خود سے گھن آرہی تھی۔ اس کی کھوپڑی دھوپ سے پگھل جانے کو تیار تھی۔ وہ سوچنے لگا "سلیمان ماموں نے مجھے کئی بار بُلایا تھا۔ لیکن میں کبھی نہیں آیا۔ آج میں بغیر خبر کئے آگیا ہوں۔ یہ سوچ کر وہ اور زیادہ گھبرا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہنچنے سے پہلے ایک تار دے کر سلیمان ماموں کو خبر کر دے۔ لیکن اسے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ شام کو اسے اس کا انٹرویو لیٹر ملا۔ جو ذرا سا پتہ غلط ہو جانے کی وجہ سے نہ جانے کن کن شہروں کا چکّر لگاتا رہا۔ اور وہ صبح دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

مسلسل دو برسوں سے وہ بیکار تھا۔ اس کی مصیبت عجیب مصیبت بن چکی تھی اور یہ عجیب مصیبت عجیب تر بننے والی تھی۔ نوکری کے لئے وہ کافی پریشان تھا اس کی ماں اور اس کے چار چھوٹے بھائی اس کی زندگی میں شریک تھے اور اسے ان تمام لوگوں کا خرچ برداشت کرنا تھا۔ ارشد کے والد پولیس کے محکمے میں ملازم تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے زندگی مزے میں کٹی۔ ان کے مرنے کے بعد گھر پر مصیبت آ گئی۔ اسی سال ارشد نے بی۔اے پاس کیا۔ جس سال اس کے والد کا انتقال ہوا۔ اس لئے آئندہ پڑھنے کا ارادہ ترک کر کے وہ نوکری کی تلاش میں رہا۔ بیوہ ماں کے کچھ زیورات تھے وہ فروخت ہو گئے۔ ایک چھوٹا سا مکان تھا اسے رہن رکھ کر اس میں خود کرایہ دار بن کر یہ لوگ رہتے تھے۔ سلیمان احمد صاحب اس کے کچھ دور کے رشتے دار تھے۔ اور رشتے میں ماموں لگتے تھے۔ وہ بے چارے ان کی کافی مدد کرتے تھے۔ وہ ہر ماہ کچھ رقم بھیج دیتے تھے۔ یہ سہارا ان کے لئے بہت بڑا سہارا تھا۔ سلیمان صاحب اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ ان کے باپ کی اچھی جائیداد ان کے پاس تھی۔ یوں بھی وہ اپنے ہوٹل سے کافی کما لیتے تھے۔ ان کا ہوٹل بلیماران محلہ میں تھا اور وہ خود چوڑیوالان محلہ میں رہتے تھے۔ ارشد نے سوچا، سلیمان ماموں کتنے بڑے آدمی ہیں۔ جب وہ پڑھتا تھا اور اس کے والد زندہ تھے تو سلیمان صاحب اس کے یہاں اکثر آتے تھے۔ انھوں نے ارشد کو اس کے والد سے مانگا تھا۔ اس لئے کہ وہ اسے پڑھانا چاہتے تھے۔ لیکن ارشد کے والد کی محبت نے اسے جانے نہ دیا۔ جب وہ پڑھتا تھا تو وہ بھی سوچتا تھا کہ ایک روز وہ بھی بڑا آدمی بنے گا۔ لیکن بی۔اے پاس کرنے کے بعد جب اسے ہر جگہ ناکامی ہوئی اور اسے کہیں نوکری نہیں ملی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ بوجھ بہت بھاری ہے اور اس بوجھ کو سنبھال نہ سکے گا۔ اس لئے اس نے اپنے دل و دماغ سے یہ بات نکال دی تھی کہ اسے کوئی بڑی نوکری ملے گی۔ اسے کلرک کی جگہ بھی اب تک نہیں مل سکی تھی۔ دہلی کی ایک فرم میں کلرکوں کی جگہ تھی۔ اس نے بھی درخواست دے رکھی

تھی اور اسے انٹرویو میں بُلایا گیا تھا۔ وہ دہلی انٹرویو کے لئے صرف ایک دن پہلے پہنچا تھا۔ وہ سوچنے لگا اگر اسے یہ نوکری مل گئی تو وہ اپنی ماں اور اپنے بھائیوں کو یہیں لے آئے گا اور پچاسی روپے میں گزارہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ رقم بہت کام آسکتی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اس کی قمیص پھٹ گئی ہے۔ اسے نئی قمیص کی ضرورت ہے۔ جب اسے دوسرے ماہ پیسے ملیں گے تو وہ اپنی دو قمیص ضرور بنوائے گا اس کے بھائیوں کو بھی کپڑوں کی ضرورت تھی اس لئے وہ تھوڑی دیر کچھ نہیں سوچ سکا۔ اور پھر تھوڑے وقفے کے بعد سوچنے لگا۔ پہلے اپنے بھائیوں کی قمیص بنوادوں گا۔ اپنی تو بنتی رہے گی۔ میری قمیصیں زیادہ پھٹی ہوئی تو نہیں ہیں۔ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہ ملا۔

وہ دیکھنے لگا۔ سلیمان منزل کی عمارت بہت بڑی تھی لیکن کافی پُرانی تھی اس کی دیواریں جا بجا ٹوٹ گئی تھیں اور سفیدی نہ جانے کیا ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سفید نشانات تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہ چونے کے کبھی گہرے دھبے تھے۔ ارشد نے محسوس کیا جیسے سلیمان منزل کوئی قدیم عمارت ہو۔ کسی شہنشاہ کی بنائی ہوئی عمارت، وہ کچھ اس سے مرعوب ہو رہا تھا۔ وہ دروازے کی زنجیر ہلانے لگا۔ زور زور سے۔ ایک بار اچانک دروازہ کُھل گیا۔ اور ارشد بالکل چونک گیا۔ اس نے تھوک نگلنے کی کوشش کی لیکن اسے معلوم ہوا جیسے حلق میں تھوک کی ایک بوند بھی نہ تھی۔

اس کے سامنے ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ ارشد کو دیکھ کر لڑکی نے دوپٹہ اپنے سر پر رکھ لیا۔ اور شرما سی گئی۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں لڑکیوں کی عجیب عمر ہوتی ہے اور جب لڑکیاں خوبصورت ہوتی ہیں تو یہ عمر اور سرمستی پیدا کر لیتی ہے۔ وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے ذہن سے ساری شاعری کافور ہوگئی تھی اور وہ صرف یہ کہہ سکے۔

"میں سلیمان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں علی گنج سے آیا ہوں میرا نام ارشد ہے۔"

اور وہ لڑکی اس کے سامنے سے ایسی غائب ہوگئی جیسے وہ کوئی جادو کی لڑکی تھی۔ ارشاد نے حلق میں تھوک کی کچھ بوندیں پیدا کیں اور پھر انھیں ایک بار نگل گیا اور اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ رومال سے پوچھنے لگا۔ وہ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود کچھ نہ سوچ سکا۔ تھوڑی دیر میں سلیمان صاحب اس کے سامنے تھے آنکھیں بالکل سُرخ تھیں۔ وہ شاید ادھوری نیند میں جاگ گئے تھے۔ آتے ہی انھوں نے ارشد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"کب آئے کب آئے؟ مجھے کوئی خبر بھی نہ دی۔ اوں!"

ارشد نے ادب سے سلام کیا اور بولا۔

"مجھے وقت نہیں ملا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے......."

اور اس نے سلیمان ماموں کو اپنی مجبوری بتادی۔

سلیمان صاحب گرجے۔

"بھکاری او بھکاری۔"

اور اندر سے ایک بوڑھا نوکر دوڑا آیا۔

"یہ دیکھو تمھارے ارشد بابو آگئے۔ یہ سامان اندر لے چلو۔" پھر ارشد سے مخاطب ہوکر بولے۔ "آؤ بیٹا، اندر چلو!"

اور دونوں اندر چلے گئے۔ ان کے پیچھے بھکاری اس کا سامان لے گیا۔

ارشد نے غسل کیا۔ سلیمان ماموں کے ساتھ اس نے چائے پی۔ وہ خوبصورت لڑکی ارشد کے سامنے ہر وقت رہی۔ کبھی ناشتہ دیتی رہی، کبھی چائے، کبھی پان اور وہ کبھی نیچی نگاہیں کیے کبھی کبھی اس لڑکی کو دیکھ بھی لیا کرتا تھا۔

سلیمان صاحب نے کہا۔

ارشد! اسے پہچانتے ہو۔ یہ میری بیٹی ریحانہ ہے۔ تمھاری ممانی کی واحد نشانی۔ اور تم پہچانو گے کیسے؟ تم دونوں نے ایک دوسرے کو کبھی دیکھا بھی نہیں۔"

یہ تعارف ارشد کے لئے کافی تھا۔ ریحانہ شرما کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

شام کو ارشد جامع مسجد کی طرف آگیا اور حیرت سے مسجد کی عمارت دیکھتا رہا پھر ٹہلتے ٹہلتے ایڈورڈ پارک کی طرف چلا گیا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اسے انٹرویو کا خیال بار بار آرہا تھا۔ اور وہ کچھ گھبرا رہا تھا۔ نہ جانے کل کیا ہوگا۔ مجھے نوکری ملے گی یا نہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ اب تک کسی انٹرویو میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اسے کچھ وحشت ہو رہی تھی۔

وہ پارک میں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ اور اردو بازار کی طرف چلا آیا۔ آزاد ہند ہوٹل میں اس نے چائے پی اور پھر چوڑیوالان محلہ کی طرف چلا گیا۔ جہاں اس کے سلیمان ماموں رہتے تھے۔ نوکری اس بار ضرور ملنی چاہئے۔ اگر نہ ملی تو میں اپنی زندگی کی تباہی کے ساتھ پانچ اور زندگیوں کی تباہی کا وجہ بن جاؤں گا۔ آخر یہ نوکری پڑھے لکھے لوگوں کو ملتی کیوں نہیں ہے؟ وہ یہ باتیں صرف سوچ کر رہ گیا اور اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ وہ نو بجے سلیمان منزل لوٹا۔ سلیمان صاحب نے کہا۔

”بیٹا میں پرہیزی کھانا کھاتا ہوں۔ میں تمھارا ساتھ کھانے پر نہ دے سکوں گا۔ اور میں بہت پہلے کھا لیتا ہوں۔ تم کچھ خیال نہ کرنا۔ جاؤ اپنے کمرے میں ریحانہ کھانا لے کر جا رہی ہے۔“

ارشاد نے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں ماموں جان! میں تنہا کھا لوں گا۔“

اور وہ کمرے میں آگیا۔ کمرے کو وہ جس حالت میں چھوڑ گیا تھا اس حالت میں کافی تبدیلی ہو چکی تھی۔ کمرہ کافی سجا ہوا تھا۔ بستر پر نئی چادر تھی۔ ٹیبل پر دوات قلم اور خط لکھنے کے کاغذ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ گلدان میں خوبصورت پھول تھے۔ صراحی اور گلاس کچھ اس طرح رکھے تھے کہ جیسے پانی پلانے کے لئے اپنی طرف متوجہ کر رہے ہوں اس نے گلاس میں پانی لیا اور پینے لگا۔ اسی درمیان میں ریحانہ اندر آگئی اور آتے ہی بولی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں؟"

وہ چونک گیا اور گلاس منہ سے فوراً الگ ہو گیا۔

"کھانے سے پہلے پانی نہ پیجئے پھر کھانا کیا کھایئے گا؟"

ریحانہ کی آواز بہت پیاری تھی۔ ارشد کو نہ جانے کیسا معلوم ہوا۔ وہ مسکرا پڑا۔ اور اس نے گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

"خیر آپ کا جو حکم!"

اور وہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ ریحانہ نے پنکھا کھول دیا۔ فین کی آواز سے ارشد کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ ریحانہ کے ساتھ ہواؤں میں اُڑا جا رہا ہے۔ وہ کھانے لگا اس نے کھاتے کھاتے دریافت کیا۔

"آپ کھانا کھا چکیں؟"

"جی نہیں۔ اب کھاؤں گی۔" ریحانہ نے جواب دیا۔

"آپ کا نام معاف کیجئے گا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا۔ بہت پرانا نام ہے۔" ارشد نے ہمت کر کے کہا۔ لیکن اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں نادم ہونے لگا کہ اس نے ایسی بات کیوں کی۔ نہ جانے ریحانہ کیا سمجھے گی۔ لیکن اس کے جواب نے اسے چونکا دیا۔ ریحانہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"تو عنایت کر دیجئے ایک نام۔ میں اسی نام کو اپنا سمجھوں گی۔

ارشد کچھ بوکھلا گیا۔

"ہاں ہاں سوچوں گا۔ سوچوں گا۔ آپ کے لئے کوئی پیارا نام سوچ کر کل بتاؤں گا۔"

پھر ارشد نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ کھانا ختم کر چکا اور ریحانہ برتن لے کر چلی گئی۔ جاتے جاتے بولی!

"آپ صبح چائے پیتے ہیں؟ میرا مطلب بیڈ ٹی سے ہے۔"

ارشد نے جواب دیا۔

"نہیں بٹیا۔ شکریہ"

اور وہ چلی گئی۔ ارشد نے سوچا زندگی بھر بیڈ نہیں پی۔ آج یہ حماقت کیوں کروں۔ اگر یہ کہدیتا کہ میں پیتا ہوں تو وہ ضرور سمجھتی کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس لئے کہ میری زندگی کے متعلق وہ ضرور بہت کچھ جانتی ہوگی۔ وہ میرے افلاس اور بے کاری کو بھی جانتی ہوگی۔ وہ کتنی اچھی ہے۔ لیکن میں اس کا نام کیا رکھوں۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔ کیسی بات کہدی۔ اس کا نام کیا ہونا چاہیئے؟ خیر کل سوچ کر اسے بتادوں گا۔ پھر اس کے دماغ میں اس کی بیکاری ہتھوڑے چلانے لگی۔ وہ اس ڈائن سے کب نجات پائے گا۔ اس کی نوکری کب اس کے پاس آئے گی۔ نوکری کا خیال آتے ہی اس کے سامنے ایک خوبصورت لڑکی آجاتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ نوکری ایک دُلھن ہے جو اس کے گھر میں بہت جلد آئے گی۔

اس نے اپنے بکس سے اپنی ڈائری نکالی اور لکھنا شروع کیا۔

آج دوپہر کی گاڑی سے دہلی پہنچا"

"جامع مسجد کو پہلی بار دیکھا"

"میں تمہارے قریب آگیا ہوں۔ نہ جانے تم کب سے میرے ذہن کو پریشان کر رہی ہو۔ مجھے اب بھی اپنا لو میرا افلاس مجھے نگل جائے گا۔ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ کل میں تمہیں حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ کل سے تم میری ہو جاؤ۔ میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"

اور پھر ارشد سو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ریحانہ اس کے کمرے میں آئی۔ اس نے دیکھا ارشد بے خبر سو رہا تھا۔ اور لائٹ جل رہی تھی۔ وہ بتی بجھانے کے لئے بڑھی ہی تھی کہ اس کی نگاہ ارشد کی ڈائری پر پڑ گئی۔ ڈائری کھلی ہوئی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے ٹیبل کے بالکل قریب آگئی اور پڑھنے لگی۔

"آج دوپہر کی گاڑی سے دہلی پہنچا"

"جامع مسجد کو پہلی بار دیکھا"

''میں تمھارے قریب آگیا ہوں۔ نہ جانے تم کب سے میرے ذہن کو پریشان کر رہی ہو۔ مجھے اب بھی اپنا لو۔ میرا افلاس مجھے نگل جائے گا۔ مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت ہے۔ کل میں تمھیں حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ کل سے تم میری ہو جاؤ۔ اب میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

ریحانہ کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ وہ بے اختیار مسکرا پڑی اور لائٹ بُجھا کر اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور بہت رات تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی اس کے تمام جسم میں ایک گدگدی سی ہوتی رہی۔ اس نے سوچا وہ کتنے اچھے ہیں۔ کل سے کیا۔ میں نے تو آج ہی سے انھیں اپنا بنا لیا ہے۔ لیکن انھیں کیسے معلوم ہو کہ بہت پہلے ہم ایک دوسرے کا سہارا بن چکے ہیں۔ پہلی نظر میں بن چکے ہیں۔ اس راز کا انکشاف کیسے ہو؟ وہ سوچتے سوچتے سو گئی۔ اس کے کمرے کی لائٹ اسی طرح رات بھر جلتی رہی۔ لیکن ایک بار وہ اُٹھ گئی اور لائٹ کو دیکھ کر مسکرانے لگی اس نے بتی بُجھا دی۔ سوچنے لگی آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ دوسروں کے کمروں کی بتیاں بُجھانے کا کتنا خیال رکھتی ہوں لیکن آج اپنی بتی اب تک جلتی رہی ہے۔ وہ پھر سوچتے سوچتے سو گئی۔

دوسرے دن ارشد بہت سویرے اُٹھا۔ غسل کے بعد اسے فوراً ناشتہ مل گیا۔ ریحانہ نے اس سے پوچھا۔ ''رات نیند کیسی آئی؟''

ارشد نے جواب دیا۔ ''بہت اچھی۔ اتنی گہری نیند تو شاید زندگی بھر نہیں آئی تھی۔''

ریحانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو آپ نے میرے لئے کوئی نام بھی نہ سوچا ہوگا۔''

ارشد گھبرا سا گیا۔ ذرا ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''سوچوں گا۔ سوچوں گا۔ آج ضرور سوچوں گا۔ ایک پیارا سا نام۔ بالکل آپ کی طرح۔'' وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ ریحانہ

جا چکی تھی۔ وہ کچھ دیر سلیمان ماموں کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر دس بج گئے اور وہ اپنے انٹرویو کے لئے چلا گیا۔ چلتے وقت اس کے ماموں اور ریحانہ دونوں نے کہا۔

"خُدا حافظ!"

اور وہ راستے بھر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالے رہا۔ آج نہ جانے کتنا بڑا امتحان تھا۔

اس روز ارشد بہت دیر سے لوٹا۔ سلیمان صاحب اس کے انتظار میں باہر ٹہل رہے تھے۔ اور ریحانہ بھی بڑے دروازے سے لگی سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی جب ارشد آیا تو سلیمان صاحب دور ہی سے بولے۔

"کہو بیٹا کیا ہوا؟ انٹرویو کیسا رہا؟"

وہ بہت پریشان نظر آ رہے تھے۔ ارشد نے ان کی پریشانی کو پہلی نظر میں دیکھ لیا۔ اس نے کہا۔ "ماموں جان بہت اچھا رہا۔" وہ بہت قریب آ گیا تھا۔ نزدیک آتے ہوئے وہ بولا۔ "ایک ایک سوال کا میں نے تشفی بخش جواب دیا ہے، مجھے اس کا یقین ہے۔"

سلیمان صاحب بولے۔ "خُدا کا شکر ہے۔ خُدا کامیاب کرے۔"

دروازے سے لگی ریحانہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکرا پڑی اور اندر بھاگی۔ تھوڑی دیر میں سلیمان صاحب کے ساتھ ارشد بھی اندر آ گیا۔ کچھ دیر انٹرویو کے سوال وجواب پر باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے غسل کیا اور اپنے ماموں جان کے ساتھ چائے پینے لگا۔ چائے پیتے ہو اس نے کہا۔

"البتہ ایک سوال عجیب تھا۔ اور اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔"

سلیمان صاحب نے چونک کر پوچھا۔ "کیا تھا وہ سوال؟"

ریحانہ بھی چونک گئی اور ارشد کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ شاید وہ اس کے

چہرے پر کامیابی کی چمک تلاش کر رہی تھی۔ ارشد نے کہا۔

"ان لوگوں نے سوال کیا۔ اس کام کے کچھ تجربے بھی ہیں؟ میں کیا کہتا۔ کوئی تجربہ ہوتا تو کہتا۔ میں نے کہدیا، میں نے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ اور میرا اس سلسلے میں کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

سلیمان صاحب بولے۔ "کوئی بات نہیں۔ یہ سوال ہر جگہ پوچھا جاتا ہے۔ پھر بھی نئے لوگوں کے لیے کچھ گنجائش نکل آتی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ کامیابی ضرور ہوگی اور سنو، تمھیں نوکری کی خبر کب تک ملے گی؟"

ارشد نے کہا، ہاں یہ تو کہنا بھول ہی گیا تھا۔ مجھے ایک ہفتہ انتظار کرنے کو کہا گیا ہے۔ میں نے آپ ہی کا پتہ دے دیا ہے۔ وہ لوگ اسی پتہ پر اطلاع کر دیں گے مجھے ایک ہفتہ رہنا ہوگا۔"

کوئی بات نہیں۔ یہ تمھارا گھر ہے۔ تم یہاں شوق سے رہو۔ میں کل تمھاری ماں کو خط لکھ دوں گا۔ اور اس ماہ کی رقم بھی بھیج دوں گا۔ اس بار کچھ دیر ہوگئی ہے۔ اور سنو نوکری ہو جائے تو پھر تم سب کو یہاں بلا لو۔ سلیمان صاحب بولے۔

ارشد نے فوراً کہا۔ "ہاں ہاں ضرور بلا لوں گا۔ ان لوگوں کا میرے ہی ساتھ رہنا بہتر ہوگا۔"

ریحانہ باتیں غور سے سُنتی رہی۔ پھر نہ جانے کس خیال سے وہ جھوم سی گئی۔ اس نے غور کیا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ دو روز سے بار بار جھوم کیوں رہی ہے کون سی سرمستی پیدا ہوگئی ہے اس میں۔ وہ صاف یہ جانتی تھی کہ اس کے یہاں ارشد آگیا ہے۔ ارشد کافی تھک گیا تھا۔ اس لئے وہ پھر باہر کہیں بھی نہیں گیا اور بستر پر لیٹا اخبار پڑھتا رہا۔ نو بجے ریحانہ کھانا لے کر آگئی۔ ارشد کھانا کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے وہ بول اُٹھا۔

"میں نے آپ کے لئے ایک نام تجویز کیا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔"

ریحانہ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اور شرما سی گئی۔

"میں نے آپ کے لئے "شیریں" نام پسند کیا ہے۔کیوں۔پسند ہے آپ کو۔"
"آپ کو جو پسند ہے۔" وہ شرما کر چلی گئی۔ برتن لینے وہ خود نہیں آئی۔ بھکاری برتن لے گیا۔ وہ اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ دفعتہً اسے ارشد کی ڈائری کا خیال آیا۔ "آج ارشد نے اپنی ڈائری میں کیا لکھا ہوگا؟" وہ سوچنے لگی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ وہ تھوڑی دیر میں ارشد کے کمرے میں دبے پاؤں آگئی۔ وہ بے خبر سویا ہوا تھا۔ بتی جل رہی تھی، اور ٹیبل پر ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ٹیبل کی طرف بڑھی اور ڈائری پڑھنے لگی۔

"انٹرویو اچھا رہا۔ کامیابی کی سو فیصدی اُمید ہے۔"

"آج میں نے ریحانہ کو ایک پیارا سا نام دیا ہے۔ شیریں!"

"نہ جانے تم میرے قریب کب آؤگی۔ تمھاری زُلفوں میں نہ جانے کون سی مہک ہے۔ جس کے لئے میری روح تڑپ تڑپ رہی ہے۔ میں نے تمھیں اب تک نہیں دیکھا ہے۔ ایک بار آجاؤ۔ کیا میں تمھارے بغیر زندہ رہ سکوں گا؟ تم بھی تو کچھ سوچا کرو۔

ریحانہ نے ڈائری کو بے اختیار اپنے سینے سے لگالیا۔ اس نے سوچا۔ انھیں کیا معلوم کہ میں ان کے کتنا قریب آگئی ہوں۔ وہ جھوٹے ہیں انھوں نے میری روح میں اُتر کر مجھے دیکھ لیا ہے۔ آخر وہ کیا چاہتے ہیں میں نے تو انھیں پاکر نہ جانے کیا پالیا ہے۔"

اس نے ڈائری ٹیبل پر رکھ دی۔ ارشد کے قریب گئی اور اپنے بالوں کو کھول کر اس کے چہرے پر تھوڑی دیر کے لئے رکھ دیا۔ اور ٹھنڈی سانس لینے لگی۔ ارشد بے خبر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ وہاں سے ہٹ گئی اور بجلی کی بتی بُجھا کر اپنے کمرے میں آگئی اور سوگئی۔

دوسرے دن بہت سویرے ارشد کی آنکھ کھُلی۔ اس نے دیکھا ریحانہ اس کا

کمرہ صاف کر رہی ہے۔

"تو آپ ہیں۔ میں نے سمجھا کوئی بلی آگئی ہے۔" وہ اُٹھتے ہی بولا۔ ریحانہ مسکرا پڑی۔ آئینہ صاف کرتے ہوئے ریحانہ بولی۔

"ایک بات پوچھوں؟"

اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا جو ایک لمحے میں سُرخ ہو گیا تھا اور شرم سے آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔

"کیوں نہیں۔ ضرور پوچھئے۔" ارشد نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"آپ نے مجھے اب تک نہیں دیکھا ہے؟" ریحانہ بولی۔

"میں نے؟ آپ کو اب تک نہیں دیکھا ہے؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" ارشد کچھ گھبرا سا گیا۔

"آپ اپنی ڈائری لکھتے ہیں اور اسے پڑھتے نہیں۔ کل کی ڈائری میں آپ نے کیا لکھا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے بھاگ گئی۔

ارشد نے فوراً اپنی ڈائری دیکھی اور کل کی لکھی ہوئی باتیں پڑھنے لگا۔

"یہ ریحانہ بھی کتنی معصوم ہے۔" وہ سوچنے لگا۔ اسے بے ساختہ ہنسی آگئی اس روز سلیمان صاحب دن بھر گھر پر رہے۔ اس لئے ارشد انھیں کے پاس بیٹھا رہا۔ اور اس کو ریحانہ سے باتیں کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ ریحانہ بھی بے قرار تھی لیکن ان بھر دونوں نے کچھ باتیں نہیں کیں۔ ارشد کا دماغ سلیمان صاحب چاٹتے رہے۔ فاہموسا کی جنگ سے اڑن کھٹولہ فلم تک پر بحث کرتے رہے۔ اور ارشد ان کی باتوں میں اُلجھا رہا۔ اس روز سلیمان صاحب دن میں سوئے بھی نہیں۔

شام کو ارشد مرزا غالب کا مزار دیکھنے چلا گیا۔ اور پھر گھر آتے آتے کچھ رات ہو گئی۔ سلیمان صاحب کھانا کھا کر سو گئے تھے۔ وہ بھی کافی تھکا ہوا تھا اس لئے کھانا کھا کر وہ بھی سونے چلا گیا۔ سونے سے پہلے اس نے اس روز کی ڈائری لکھی

اور سو گیا۔

ریحانہ کچھ دیر بعد دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ اور دھڑکتے ہوئے دل سے ڈائری پڑھنے لگی۔

سلیمان ماموں کی گفتگو میں دن بھر گرفتار رہا۔"

ریحانہ مسکرا پڑی۔ آگے لکھا تھا۔

"شیریں واقعی بہت پیاری ہے۔"

ریحانہ نے اس جملے کو کئی بار پڑھا۔ پھر بھی اسے سیری نہ ہوئی۔ وہ آگے بڑھی۔

"مرزا غالب کا مزار دیکھنے گیا۔ وہاں غالب کا فلسفۂ زندگی مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا رہا کہ میں زندگی کی حقیقت اس کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھوں غالب کا مزار، غالب کی ایک نئی غزل ہے۔"

ان جملوں میں ریحانہ کے لئے کوئی دلچسپ بات نہیں تھی۔ وہ اور آگے بڑھی۔

"میری دُلھن! میری محبوبہ! آج دو روز ہو گئے تم نے مجھے بلایا تھا۔ اور میں اب تک تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نے تمھیں اپنا پتہ بھی دے دیا ہے کاش تم آجاتیں تمھارے آنے سے جو مسرت ہوگی، وہ صرف میرے لئے نہ ہوگی۔ سلیمان ماموں بھی خوش ہوں گے۔ میری ماں بھی خوش ہوگی۔ میرے بھائی بھی تمھاری آمد کی خبر سے اُچھلنے لگیں گے۔ اور شیریں کو بھی خوشی ہوگی۔ کل تم ضرور آجاؤ۔ میں تمھارے بغیر اب بالکل زندہ نہیں رہ سکتا۔ کل دس بجے دن میں تمھارا انتظار کروں گا۔ تم خاموشی سے آجاؤ سلیمان ماموں اور شیریں کو بھی خبر نہ ہو۔ پھر میں یہ خوشخبری سب کو سناؤں گا ہی۔"

ریحانہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا اس کا سر چکرانے لگا۔ اس نے ان جملوں کو کئی بار پڑھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں پریشان ہو گئی۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ کون ہے؟ وہ کس کا انتظار کرے ہیں؟ میں کیوں فریب میں مبتلا رہی؟ اس نے جملے کو چار بار پڑھا۔ "تم خاموشی سے آجاؤ۔ سلیمان ماموں اور شیریں کو بھی خبر نہ ہو۔"

اس نے ڈائری ٹیبل پر رکھ دی اور اپنے کمرے میں آکر بستر پر گر گئی۔ اور سسک

سسک کر رونے لگی۔ اور خوب روئی۔ بے اختیار روئی۔ اس کی ساری سرمستی جیسے ختم ہوگئی تھی۔ وہ تلملا رہی تھی۔ کبھی کرسی پر بیٹھتی تھی کبھی بستر پر۔ اس کے دماغ میں ارشد کے الفاظ ہتھوڑے چلا رہے تھے۔ ان کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا نشتر بن کر اس کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔ وہ پاگل سی ہو رہی تھی۔

آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی وہ یہ بھی سوچتی رہی کہ اگر اس کی اس کیفیت کا علم کسی کو ہوگیا تو یہ اس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔

دوسرے دن صبح ریحانہ ارشد کا ناشتہ لے کر نہیں گئی۔ اور اداس کمرے میں پڑی رہی اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ رات بھر روتی رہی تھی وہ اب بھی رہ رہ کر سسکیاں لے رہی تھی۔

ارشد نے بھکاری سے دریافت کیا۔

کیوں جی! "آج ریحانہ کہاں ہیں؟"

بھکاری بولا۔

"سرکار ان کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

"کیا ہوا انھیں؟" ارشد نے کچھ پریشان ہوکر پوچھا۔

"شاید بخار ہے۔ جاکر پوچھ لیجئے۔"

" بھکاری کھڑا رہا اور ارشد ریحانہ کے کمرے میں آگیا۔

"کیوں کیا ہوا آپ کو، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" ارشد ریحانہ کے بہت قریب آگیا تھا۔ وہ اپنا منھ چھپاکر اور رونے لگی۔ ارشد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اس نے پھر پوچھا۔ سچ بتائیے یہ آپ رو کیوں رہی ہیں؟

کیا ہوا ہے آپ کو؟ مجھے بتا دیجئے۔ آپ کو میری جان کی قسم ہے۔"

اور ریحانہ چونک کر اٹھ گئی۔ اس نے آنسو آنچل سے پونچھے۔ پپوٹے انتہائی

بوجھل تھے۔ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ اب بھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ ارشد نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر چونک کر چھوڑ دیا۔

"کچھ تو کہیئے۔ آپ تو کبھی اُداس نہیں رہتی تھیں۔ بات کیا ہوئی۔ اگر اس طرح کریں گی تو میں زندہ کیسے رہوں گا؟ آپ نے خُدا جانے میرے دل و دماغ کو کیا کر دیا ہے۔" وہ ذرا جذباتی ہو کر بول رہا تھا۔

"جھوٹ ہے!" ریحانہ اسی طرح سسک رہی تھی۔ "آپ کو میری پروا نہیں ہے۔ آپ فریب دینے کے عادی ہو گئے ہیں کیا؟ آپ کو جس لڑکی کا انتظار ہے وہ میں نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ لڑکی میں نہیں ہوں۔" اور وہ پھر رونے لگی۔

یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کے سوا میری زندگی میں کوئی لڑکی اب تک نہیں آئی ہے۔ اور آپ کو روح میں اُتار کر دوسری لڑکی کا انتظار کیوں کروں گا آخر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میری محبّت آپ کے لئے نہیں ہے؟ مجھے بتائیے؟ "آپ نے ....."

ریحانہ نے ابھی کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ باہر ڈاکیئے نے آواز دی۔ اور ارشد لپک کر باہر نکلا اور اُچھلتا ہوا اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں اس کے اپوائنٹ مینٹ کی اطلاع تھی۔ سب سے پہلے اس نے ریحانہ کو یہ خوشخبری سُنائی اور بے اختیار ریحانہ کی پیشانی چوم لی۔ پھر وہ سلیمان ماموں کے کمرے میں آیا اور یہ خبر سُنائی۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ اور مبارکباد اور دُعائیں دیتے رہے۔

ارشد نے ریحانہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ وہاں گئی۔ لیکن بالکل اجنبی کی طرح۔ اور خاموش کُرسی پر بیٹھ گئی۔ آہستہ سے بولی۔ میری طرف سے بھی آپ دونوں کو مبارکباد! اور مُنھ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ ارشد گھبرا رہا تھا۔

"آخر ہوا کیا ہے آپ کو؟ میں آپ سے سچ کہتا ہوں میرے دل میں شیریں کے علاوہ کوئی لڑکی نہیں ہے۔" ارشد پھر قسمیں کھانے لگا۔ ریحانہ اُٹھی اور اس نے اس کی ڈائری کھول دی اور بولی۔

"یہ کون ہے جس کا انتظار کرتے رہتے ہیں؟ اور پھر کہتے ہیں کہ اس کی آمد کی خبر مجھے نہ ہو۔ بتایئے یہ کون ہے؟ اگر وہ آپ کی پیاری ہے تو مجھے بھی پیاری ہوگی"۔

ارشد نے ایک قہقہہ لگایا۔ اوہ کتنی معصوم ہیں آپ بھی۔ واللہ میں تو آپ کے بھولے پن کا قائل ہوگیا۔ آپ واقعی میری وہ شیریں ہیں جس کی تصویر نہ جانے کب سے میرے ذہن میں موجود ہے۔ آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ یہ کوئی لڑکی نہیں ہے، یہ نوکری ہے جس کے متعلق میں دو سال سے اپنی ڈائری میں لکھتا رہا ہوں اور آج کی ڈائری میں مجھے یہ لکھنا ہے کہ "آخر تم مجھ پر مہربان ہوگئیں۔ تمھارے پیار کو سلام کرتا ہوں"۔ میں آپ کو اس سے پہلی ڈائری بھی دکھاتا ہوں۔ اس میں بھی آپ اس محبوبہ، نوکری کے سوا اور کسی لڑکی کو نہ پائیں گی۔ اس نے ڈائری سوٹ کیس سے نکالی اور دونوں ڈائریاں ریحانہ کو دے دیں۔ ریحانہ کے مُنھ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ اس نے دونوں ڈائریوں کو جگہ جگہ سے پڑھا۔ اور بے اختیار ہنسنے لگی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے لیکن ہونٹوں پر ہنسی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جاکر خوشی سے پاگل سی ہوگئی آج اس میں نئی سرمستی نے انگڑائی لی تھی۔ آج وہ پھر جھوم جھوم جا رہی تھی۔ وہ اپنی غلط فہمی پہ ہنس رہی تھی۔ اور کبھی کبھی گنگنا رہی تھی۔ آج اس کی عجیب کیفیت تھی۔ دوسرے دن ارشد علی گنج چلا گیا تاکہ وہ اپنی ماں اور بھائیوں کو جلد سے جلد لے آئے۔

چلتے وقت اس نے ریحانہ سے کہا۔

"میری ڈائری والی محبوبہ بھی ساتھ آئے گی۔ اس کے لئے کمرہ سجادیں"۔

بار حیا سے ریحانہ کی لانبی پلکیں رُخساروں پر جُھک گئیں۔ وہ زیر لب مسکرادی۔

ستین

(الیاس احمد گدّی)

لوگوں نے کہا تھا کناٹ پلیس یا چوپاٹی میں جو رنگا رنگی تمھیں نظر آتی ہے وہ یہاں کہیں دکھلائی نہ دے گی۔ کیونکہ یہاں کی عورتوں کے پاس جسم نہیں ہوتا۔ صرف ایک درد بھرا دل ہوتا ہے جو ذرا ذرا سی چوٹ پر تڑپتا ہے۔ یا پھر آنکھیں ہوتی ہیں، گہری سیاہ، اُداس آنکھیں جو کسی نا معلوم خوف سے ہر وقت چوکنی رہتی ہیں، ہرن کی آنکھوں کی طرح۔

لیکن وہ لڑکی جس کے یہاں مجھے بوڑھے نے پہنچایا تھا۔ بڑی خوش مزاج تھی اس کی عمر بہت زیادہ نہ تھی۔ بہت خوبصورت بھی نہ تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں بیحد سیاہ اور گہری تھیں پد ماندی کی طرح۔

اس نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور آ کر میرے پہلو میں — بیٹھ گئی۔ کچھ پیئیں گے آپ؟

"نہیں!"

"ولایتی بھی نہیں؟"

"نہیں! میں شراب نہیں پیتا۔"

"اچھا!" اسے تعجب ہوا۔ شراب تو بیحد ضروری چیز ہے۔ میرا مطلب ہے یہاں آنے کے لئے آدمی کو اس نچلی سطح تک اُترنا پڑتا ہے جہاں سے بندر آدمی بننا شروع ہوا تھا!"

وہ ہنس دی۔

لیکن میں اس اونچی سطح کی تلاش میں ہوں جہاں سے آدمی دیوتا بننا

شروع ہوا تھا۔

وہ پھر ہنس دی۔ تب تو آپ غلط جگہ آگئے ہیں۔

ہوسکتا ہے کوئی غلط راستہ ہی صحیح جگہ پہنچا دے۔

ہاں، یہاں کلکتہ میں یہ بھی ممکن ہے۔ کیونکہ یہاں صحیح راستہ پر چلنے والوں کو میں نے اکثر غلط جگہ پہنچتے دیکھا ہے۔

سمجھ دار تو ہو۔ نام کیا ہے تمہارا۔؟

نام۔؟ نام تو کئی ہیں۔ تم کسی بھی نام سے پکار لو، کیا فرق پڑتا ہے۔

اچھا نہیں لگا۔ جس جذبے کے تحت آیا تھا اُسے وہ سمجھ نہ سکی تھی۔ شاید سمجھ بھی نہ سکتی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ مجھے کچھ زیادہ دے۔ لیکن وہ اتنا ہی دینا چاہتی تھی جتنے کی میں نے قیمت چکائی تھی، کسی کنجوس بنئے کی طرح۔

تم ناچ سکتی ہو۔؟

کیوں۔؟ وہ چونک سی گئی، پھر خوشدلی سے بولی۔ تم مجھ سے کیا کروانا چاہتے ہو۔ کیا تم میرے ور کی طرف سے مجھے پسند کرنے آئے ہو۔؟

کیا شادی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔؟

لگا، جیسے اسے گہرا لگا ہو۔ تلملا سی گئی۔ پھر سنبھالا لے کر بولی۔

"نہیں۔ کیونکہ شادی بھی ایک طرح کا پیشہ ہی ہے۔!

"ہوگا۔ مگر میں تو اسے ایک مقدّس رشتہ ہی جانتا ہوں!"

اور ہمارے تمہارے بیچ جو رشتہ قائم ہوا ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب آسان نہیں تھا۔ میں رُکا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بہت بحث ہوچکی۔ آؤ چائے پئیں۔ اس میں نشہ نہیں ہوتا۔

"نشہ کس میں ہوتا ہے اور کس میں نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں!

چلتے چلتے اس نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں ایک شریر سی چمک جگمگائی۔

"اچھا" ____ ؟ پھر وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

باہر کسی کو چائے لانے کے لئے کہہ کر وہ پھر واپس آگئی۔

میری باتوں کا آپ نے بُرا تو نہیں مانا۔ ایسے ہی کبھی کبھی جھلاہٹ سوار ہو جاتی ہے ____ دراصل میں لوگوں کے قریب آنا چاہتی ہوں اور لوگ ہیں کہ اپنی ضرورت سے کچھ سوچتے ہی نہیں!"

"کیا تم سوچتی ہو ____؟"

"کیوں نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک میں بستر پر دراز ہو جاتی۔ اس کے بعد میں، میں نہ رہ جاتی۔ کوئی دوسری ہو جاتی۔ ہنسی کی بات یہ ہے کہ یہاں جو کوئی بھی آتا ہے، اسی دوسری عورت کے لئے آتا ہے۔ میرے لئے کوئی نہیں آتا۔!"

"میں آیا ہوں تمھارے لئے!" میں نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"بس بس...... اپنی بناسپتی محبت کا یہ باسی پھول اپنے کوٹ ہی میں لگا رہنے دو!"

وہ ہنسنے لگی۔ اس کی جوان دلکش ہنسی۔ مگر آنکھیں ویسے ہی اُداس تھیں۔ یوں ذرا دیر کے لئے کوئی جگنو چمک جاتا یا لمحہ بھر کے لئے کوئی کرن لرز جاتی، اور بس۔ اس کے بعد وہی اتھاہ اندھیرا......

"ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ چائے پی کر ذرا گھوم پھر لیں۔ رات کا کھانا راٹل میں کھا لیں گے۔ پھر میں تمھیں واپس چھوڑ جاؤں گا۔"

جی نہیں۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ میری جان پہچان کے یہاں بہتیرے لوگ رہتے ہیں۔ مجھے تمھارے ساتھ دیکھ کر کیا کہیں گے؟

"کیا تم کہنے والوں کی پرواہ کرتی ہو۔؟"

"کیوں، کیا تم نے مجھے بالکل بازاری سمجھ لیا ہے۔؟ میرا گھر ہے۔ میرے رشتہ دار ہیں۔ بہن بھائی ہیں سب جانتے ہیں کہ میں نوکری کرتی ہوں۔"

"گویا تم......!"

"میں اکیلی نہیں ہوں۔ اس شہر میں ہزاروں لڑکیاں نوکری کا بہانہ کر کے اپنے جسم کا دھندا کرتی ہیں۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے یہاں کی لڑکیوں کے پاس جسم نہیں ہوتا۔"

"تم نے غلط سنا ہے۔ یہاں کی عورتوں کے پاس سوائے جسم کے اور کیا ہوتا ہے۔ اور صرف عورتوں کے پاس ہی کیوں۔ مردوں کے پاس بھی۔ یوں سمجھ لو یہ شہر ایک بڑا کولھو ہے، جس میں روزانہ لاکھوں جسم ڈال دیئے جاتے ہیں۔ سارا دن کولھو انھیں پیلتا ہے۔ اور شام پڑے ان کا سارا عرق نچوڑ کر واپس پھینک دیتا ہے۔ یہ عرق جو یہاں کی ٹیوب لائنوں میں چلتا ہے۔ سڑکوں پر جگمگاتا ہے اور اونچی اونچی عظیم الشان عمارتوں میں جھلکتا ہے......"

"ہیئر ہیئر......" میں نے تالی بجائی تو وہ چونک کر شرما گئی۔ ذرا دیر پہلے غصے کی وہ تمتماہٹ جس نے اس کے سانولے چہرے کو سُرخ کر دیا تھا، یکلخت زائل ہو گئی۔

دیکھو ڈارلنگ! میں نے اس کی ٹھوڑی اُٹھائی ــــ

تمھارے جیسی خوبصورت لڑکی کو اتنی گہری باتیں نہ کرنی چاہیے۔ تمھیں تو پھولوں کی بات کرنی چاہیے، ستاروں کی اور چاند کی اور رات کے پچھلے پہر چلتی ہوئی اچھوتی پُروا ہوا کی۔ تاکہ اگر کبھی کوئی اچانک تمھارے سامنے آجائے تو تمھارے چہرے کی ملاحت اور تمھاری آنکھوں کی تابانی دیکھ کر تم سے پوچھ بیٹھے۔

"تمی کے ہے ارو وشی۔"

(تم کون ہو اے چاند کی دیوی ــ ٹیگور)

وہ ہنس دی۔ "تم چاہے جتنی خوشامد کر لو، مگر میں تمھارے ساتھ جاؤں گی نہیں۔"

وہ نانا کرتی رہی اور میں ضد کرتا رہا۔ آخر بڑی ردوقدح کے بعد وہ راضی ہوئی وہ بھی اس شرط پر کہ ہم کسی ہوٹل میں کھانا نہ کھائیں۔ بس ایک چکر دھرم تلہ کا لگا کر واپس آجائیں۔

سڑکوں پر گاڑیوں کا ایک کارواں رواں دواں ہے۔ فٹ پاتھ پر بھاگتے

ہوئے لوگوں کا ایک سیلاب جو بہا چلا جا رہا ہے۔ بہتا چلا جا رہا ہے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں۔ کسی کو کسی کی فکر نہیں۔ کوئی کسی کو دھیان سے دیکھتا بھی نہیں۔ یہ لڑکی جھوٹ ہی ڈر رہی تھی۔ اس انبوہ میں کون کس کو پہچانتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود وہ پہچان لی گئی۔ میں اسے زبردستی ایک دکان میں لے گیا کہ وہ کم از کم ایک آدھ بلاؤز پیس ہی لے لے۔ دُکان کی سیڑھیوں پر ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا کھڑا تھا۔ میلی سی ہاف شرٹ، بغیر پریس کیا ہوا پینٹ۔ بکھرے ہوئے بال اور آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا کھنچاؤ۔ ہم دُکان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے جب اس نے اس کو دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ لڑکے نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لڑکی کا ہاتھ جو میرے ہاتھ میں تھا۔ کانپنے لگا۔

"چلو واپس چلیں۔!

مگر کپڑا تو.......

نہیں چلو....... کسی دوسری دُکان سے لے لیں گے!

وہ مجھے گھسیٹنے لگی۔ لڑکے نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا اور سامنے بہتی ہوئی بھیڑ میں بہہ گیا۔

کیوں کیا ہوا— ؟ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔

"وہ تھا..... وہ ستین!"

اس کے بعد وہ کہیں نہیں رُکی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ وہ چلتے چلتے ہی کچھ لے لے۔ یا کم از کم کہیں رُک کر تھوڑا سا ناشتہ ہی کر لے۔ لیکن وہ کچھ ایسی بدحواس تھی کہ اس سے کچھ کہنا ہی مشکل ہو گیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے تپائی پر پڑی صراحی سے ایک گلاس پانی پیا۔ پھر صوفے پر ٹک کر بیٹھ گئی۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے مت لے جاؤ.....!"

"لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، آخر وہ کون تھا؟"

"وہ ستین تھا۔ میرا چھوٹا بھائی۔ مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے!"

"کیا وہ تم سے جھگڑا کرتا ہے؟"

"نہیں۔ یہی تو نہیں کرتا۔ میں چاہتی ہوں، وہ مجھ سے جھگڑے، مجھے مارے، گالیاں دے مگر وہ کچھ نہیں کرتا۔ صرف چُپ رہتا ہے۔ بس صرف دیکھتا رہتا ہے اور اس کی آنکھیں خُدا کی پناہ! لگتا ہے میرے جسم کے اندر گھُسی جا رہی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرے جسم کے سارے داغ دھبے دیکھ رہا ہے اور میں اپنے سارے وجود سے ننگی ہوتی جا رہی ہوں۔ تب غصّہ کا ایک ریلا آتا ہے اور میں اسے پڑھائی لکھائی چھوڑ دینے پر یا محلّے کے گندے اور بد قماش لڑکوں کے ساتھ پھرتے رہنے پر ڈانٹنے لگتی ہوں۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ صرف مسکرا دیتا ہے اور اس کی یہ مسکراہٹ مجھے اور بھی مشتعل کر دیتی ہے۔ وہ تحقیر آمیز، نفرت انگیز مسکراہٹ، تم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔"

"رینو ڈارلنگ! یہ سب تمھارا واہمہ ہے اور یا اس کا فرسٹریشن۔ اس کو کام میں لگا دو اور اس کی شادی کر دو۔"

"شادی کے لئے اس سے کہا گیا تھا، اگرچہ اس کی عمر کم ہے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ پہلے ایک لڑکی جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی، اس سے اس کی بڑی دوستی تھی۔ دونوں گھر میں بیٹھ کر پڑھائی کرتے۔ ہم سب جانتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں شاید پیار بھی کرتے ہوں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس سے بھی کنارہ کش ہو گیا۔"

"کنارہ تو سب ہی پکڑ لیتے ہیں رینو ڈارلنگ۔ ایک دن تم بھی مجھ سے کنارے ہو جاؤ گی۔" میں نے مذاق کیا تو وہ چونکی، جیسے واپس آ گئی ہو۔ پھر جیسے ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں روشنی سی آ گئی۔

"اُلٹی بات مت کرو۔ کنارہ تو تم پکڑ لو گے۔ اور سچ پوچھو تو تم سب کنارے ہی سے لوٹ کر واپس ہو لیتے ہو۔ کوئی اُتر کر تو دیکھے کہ میں کیسا طوفانی دریا ہوں۔"

"اور جو تم بہا لے جاؤ ــ؟"

"بہا بھی لے جاؤں گی تو اپنے سے جُدا نہ کروں گی۔ اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گی۔"

میں چونک سا گیا۔ ہم کبھی کبھی چلتے چلاتے اچانک دل کے کتنے نازک حصّوں پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں۔

اس کا نام رینو مجمدار ہے۔ میں نے اس کو ایک ماہ کے لئے "طے" کر لیا ہے۔ دو سو روپیہ ماہوار، ہفتہ میں دو دن وہ مجھے دے گی۔ یعنی مہینے میں آٹھ ملاقاتیں۔ ایک مہینہ اس شہر میں دینا ہے۔ اس بھرے شہر کی تنہائی کا اور کیا علاج ہے۔ رینو اچھی ساتھی ثابت ہوگی۔ وہ ابھی پامال نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اندر، بہت اندر کہیں کوئی چمکیلی، روشن چیز ضرور ہے جو کبھی کبھی لمحہ بھر کے لئے چمک اُٹھتی ہے۔ میں اس روشن چیز کو نزدیک سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ چھونا چاہتا ہوں.......

اس بیچ ستین سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں اپنے کمرے کا تالا کھول رہا تھا۔ جب کسی نے پیچھے سے پکار کر پوچھا "ماچس ہوگی آپ کے پاس۔۔؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ ستین تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹھک گیا۔ پھر ایک عجیب قسم کی کرختگی اس کے چہرے پر آ گئی۔ لیکن اس نے ماچس میرے بڑھے ہوئے ہاتھ سے لے لی۔ سگریٹ سُلگایا اور چُپ چاپ ماچس واپس کر دی۔

"مجھے پہچانتے ہو۔؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔ اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا ذرا دیر رُک کر اس نے غور سے میری طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔

"ہاں! میں نے دیدی کے ساتھ آپ کو دیکھا تھا۔"

اس کا لہجہ بڑا جارحانہ تھا۔ سانپ کی پھنکار کی طرح۔

ایک ہفتہ بعد ستین میرے گھر آیا۔ وہ کس قدر خوش تھا۔ اس نے کپڑے بھی صاف ستھرے پہن رکھے تھے اور چہرے کی خشونت بھی کسی قدر نرم پڑ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں ایک اٹیچی لے رکھی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ کہیں باہر جا رہا ہو۔

"دادا میں آج رات بھر آپ کے یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"نہیں شوق سے رہو، مجھے خوشی ہوگی۔ مگر تم کہیں باہر جا رہے ہو۔؟"

"ہاں، صرف دو دن کے لئے۔" اس نے اٹیچی ایک کنارے رکھ دی۔
"کہیں اپنی دیدی سے جھگڑا تو نہیں کر لیا۔؟"
"نہیں، اس بیچاری سے کیا جھگڑا کروں گا۔" وہ کسی قدر تلخی مگر کسی قدر ترحم سے مسکرایا۔

"وہ اپنے آپ سے ڈرتی ہے۔" اس نے تڑسے جواب دیا۔
"میں،" تو اس کو اتنا چاہتا ہوں کہ دُنیا میں اتنا کسی کو نہیں چاہتا۔ وہ بھی ہے کہ وہ جو کرتی ہے اس کا کسی کو پتہ نہیں — ہر روز جب وہ بن سنور کر گھر سے نکلتی ہے تو خوشبو کا ایک ریلا میرے کمرے میں گھس آتا ہے وہ نکل جاتی ہے اور میں سوچتا رہتا ہوں کہ اس خوشبو کو وہ کہاں کہاں بانٹ رہی ہوگی۔ کس کس جگہ اس نے یہ خوشبو بکھیر دی ہوگی۔ پھر رات گئے جب وہ گھر میں داخل ہوتی ہے تو میں یہ خوشبو اس میں تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ تب وہ ڈرنے لگتی ہے۔ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے .... وہ سارے حصار جو وہ اپنے ارد گرد کھڑے کرتی ہے، بغیر دھکا دیئے گرنے لگتے ہیں۔ تب وہ گھبرا کر اپنے کمرے میں گھس جاتی ہے اور میں اس سے کچھ نہیں کہتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ بے قصور ہے۔"
مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا گہرا ہوگا۔ اتنا گہرا اُترنے کے لئے اس کی عمر بہت کم تھی۔ ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ معصوم نرمی جو عمر کے ساتھ ساتھ زائل ہو جاتی ہے، ہنوز اس کے چہرے پر موجود تھی۔ میں نے مذاقاً پوچھا۔
ستین ڈیئر کیا عمر ہوگی تمھاری؟
"ساٹھ برس۔!" اس نے برجستہ جواب دیا۔
ساٹھ برس۔؟
ہاں ساٹھ برس۔ پھر اس نے بڑے کرب سے کہا۔ اس شہر میں کوئی نوجوان نہیں ہے۔ ہم بچپن کی ریکھا پار کرنے کے پہلے ہی بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔
مجھے بڑا پیار آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

ستین! تم میرے ساتھ دلّی چلو۔ میں وہاں تمہیں اچھی سی نوکری دلا دوں گا۔"

"مگر دادا کیا وہاں کوئی ایسی ندی بھی ہے جو کبھی کبھی بہنے لگے؟"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنس دیا۔

"دادا تم نہیں سمجھو گے۔ کوئی باہر کا آدمی نہ سمجھے گا۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ دیدی سے پوچھ لینا۔"

اس کی دیدی سے کچھ پوچھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ دوسرے دن وہ آئی تو بری طرح گھبرائی ہوئی تھی ــ وہ آتے ہی کرسی پر گر پڑی۔

"ستین کل سے غائب ہے۔

بس اسی کے لئے پریشان ہو ــ؟ وہ رات یہاں میرے پاس تھا۔ کہیں باہر گیا ہے۔ کہہ گیا ہے دو دن بعد لوٹ آئے گا۔"

اسے جیسے سکون سا مل گیا۔

"مگر وہ گیا کہاں ــ؟"

"یہ تو اس نے نہیں بتایا۔"

"کیا وہ خالی ہاتھ تھا؟"

"بس ایک اٹیچی تھی اس کے پاس!"

اوہ ...... وہ لرز سی گئی۔ پھر اس پر سناٹا چھا گیا۔ پھر وہ اندھیرے میں ڈوب سی گئی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

کیا وہ گھر سے جھگڑ کر گیا ہے؟

"نہیں۔"

وہ اُٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔

"کسی دن ...... کسی دن کوئی بُری خبر ...... آہ میں اس کے لئے اپنے آپ کو کبھی تیار نہ کر سکی ...... میں کیسے سُن سکوں گی!"

"مگر تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ کیا اس کو کوئی خطرہ درپیش ہے؟"

آہ، تم نہیں جانتے۔ وہ..... وہ ڈین ہے!

کیا۔؟ میں ایک دم حیران رہ گیا۔

تمھیں معلوم ہے اس اٹیچی میں کیا تھا۔ اس میں بم تھے۔ وہ انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا ہے۔"

نہیں۔ خوف سے میرے بدن میں جھرجھری سی آگئی۔

"کسی دن...... کسی دن...... آہ وہ کب تک بچ سکے گا۔؟"

وہ رونے لگی۔ میں اسے چُپ چاپ دیکھتا رہا۔ کل کی اس شوخ و شنگ لڑکی کا سارا ملمع اُتر گیا تھا۔ باہر ٹراموے کی گھنٹیوں کا شور، کاروں کے ہارن اور ڈبل ڈیکروں کی گڑگڑاہٹ گونجتی رہی۔

فن کے سفیر

پرندہ ایک نگار خانے کا

(احمد یوسف)

میں ان میناروں کے درمیان اکیلا کھڑا ہوں۔ کمرہ روشن ہے۔ یہ روشنی باہر کی ہے یا اندر کی، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ میری نظروں کا پرندہ نیچے سے اُڑان بھرتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے، اوپر، اوپر اور اوپر —— انتہا پر پہنچ کر تیزی سے چکر لگاتا ہے۔ دیر تک چکر لگانے کے بعد جیسے آسودگی کے نشے سے چور، نیچے، نیچے اور نیچے لوٹ آتا ہے۔

کمرہ کتنا آباد سا تھا۔ میری کتابیں، اس کی کتابیں۔ میرا بستر، اس کا بستر۔ میرا سامان اُس کا سامان —— سب کچھ گڈ مڈ سا ہو گیا تھا۔ قیامت قریب تھی اور جب ہم انھیں دیکھتے جو ہاتھ میں ہلکی پھلکی کتابیں لئے بہار کا لطف اُٹھا رہے تھے، تو ہم ایک دوسرے کا چہرہ پڑھ کر ڈھول دھپے شروع کر دیتے۔ یہ ڈھول دھپے بڑے اونچے قہقہوں پر دم توڑتے —— اور وہ جو مستقبل کی خزاں سے بے خبر تھے سخت اچنبھے میں گرفتار، ہماری طرف گردنیں بڑھا دیتے کہ ہمارے درمیان اچانک یہ بہار کیسے اُتر پڑی۔

فرش پر بکھری کتابیں ہم پر آنکھوں کے سُرخ انگارے پھینکتیں۔ کل کو قیامت آئے گی —— اور قیامت کے دن بس ہم ہی کام آئیں گے۔ تب ہم اُس کشتی کو مل جُل کر کھینے لگتے کہ کل کے دن کون کس کا ہوگا۔ پھر جب پتوار چلاتے چلاتے ہمارے ہاتھ شل ہو جاتے اور ہماری قوتیں سر نیوڑھا کر بیٹھ جاتیں تو ہم کونے میں رکھے ہیٹر کو جگاتے۔ اس کی سُرخ سُرخ زبان آن کی آن میں

کیتلی کے پانی کو بھی بولنا سکھا دیتی اور جب وہ تازہ دم سی شے پیالیوں میں اُتر آئی تو ہم ایک ساعت کے لئے کل، قیامت اور چیختے پہاڑوں کے خیال کو بُھلا دیتے۔ تب ہم ہم ہی ہوتے، ہلکے پھلکے سے، گلوں کی صفوں میں چلتے ہوئے، بازاروں میں دوڑتے ہوئے۔

تب ایک صبح پکے فرش کی ٹھنڈ نے میرے اندر داخل ہو کر میرے سینے اور میری پسلیوں کو توڑ توڑ دیا، اور صبح میں ایک نہیں تھا کئی ایک تھا، جو کبھی کراہتا تھا، کبھی چیختا تھا اور کبھی روتا تھا اور ان کئی ایک میں سے ایک مجھے صبر و ضبط کی تلقین کرتا تھا۔

اتنے ہی میں اس کی ایک آنکھ کھلی اور جب دوسری آنکھ کھلی تو وہ جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا۔ میں معالج کو بُلانے جا رہا ہوں، تم ذرا خیال رکھنا۔ اس نے ان کئی ایک میں سے ایک کو کہا جو عقل و فراست اور صبر و شکیب کی باتیں کر رہا تھا۔

معالج آیا اور درد کی تہوں تک پہنچنے کے لئے اس نے گہرے پانی کی خاموش صداؤں کو اور بند تہہ خانے کی گھن گرج کو سُنا۔

پھر اس کی انگلیاں گاڑھے سیال سے میری ٹوٹتی پسلیوں کو جوڑنے بیٹھ گئیں۔ ان سے بڑی حیات بخش شعاعیں نکل رہی تھیں۔

کئی دنوں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں واپس آگیا ہوں۔ میں نے شکر گذار آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

اور پھر ہم نے نئے سرے سے کتابوں کو سینے سے لگا لیا اور مل جل کر کشتی کو اور بھی تیزی سے کھینے لگے کہ اب قیامت زبان نکالے سامنے کھڑی تھی اور ہم چاہتے تھے کہ چشم زدن میں اس کے قریب سے نکل بھاگیں۔

پھر ایک دن بڑی کامیابی کے ساتھ ہم قیامت کی حدوں سے نکل بھاگے اور ہم نے اپنے اندر اطمینان کی سانس کو زینہ بہ زینہ اُتارا اور خوشی خوشی اس باغ میں داخل ہو گئے جو قیامت کی حدوں کے باہر آباد تھا۔

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے باغ کی خوشیوں پر پتی پتی خزاں برسنے لگی۔ یہاں ہر فرد دوڑ رہا تھا۔ میں نے دوڑنے والوں میں سے ایک کو روک کر دریافت کیا۔

"آپ کیوں ؟" ۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ بتانے کا وقت نہیں ہے۔"

وہ اس بھاگ دوڑ میں بہت آگے نکل گیا۔ تقریباً نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں دوڑتے دوڑتے ایک جگہ دم لینے بیٹھ گیا۔ بس یہی میری منزل ہے۔ میرے بہت آگے وہ ہے۔ میرے دل سے دعائیں نکل گئیں۔ اس میں جو دوڑنے کی غیر معمولی طاقت ہے اس کی بھی کوئی نہ کوئی معقول وجہ ہوگی۔ خدا کسی پر یوں ہی مہربان نہیں ہوتا۔ مجھے ایک ایک کر کے پچھلے سفر کی باتیں یاد آئیں۔ ہم زاہد شب گذار تھے۔ ہم تلخ جاموں سے عارضی توانائی حاصل کرتے تھے۔ تب ہی میری پسلیاں اس کی انگلیوں کی گمشدہ شعاعوں کی گرمی محسوس کرنے لگتیں۔

اور جب بھی کوئی دوسری طرف سے دوڑتا ہوا آتا تو میں منت سماجت کر کے اُسے دو چار ثانیوں کے لئے روک لیتا ــــ وہ کیسا ہے ؟ ــــ وہ اسی مقام پر ہے یا آگے بڑھ گیا ؟ ــــ مگر کوئی معقول سا جواب نہ ملتا۔

بالآخر میں نے اس سے ملنے کے لئے دور دراز کا سفر اختیار کیا کہ گئے ہوئے دن، ہر روز میرے دروازے پر دستک دیا کرتے تھے۔ راہ میں ہر موڑ پر شاعر کی آواز مجھ سے کہتی کہ کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا مسیحا اور خضر کی ملاقات سے بہتر ہے۔ میں بے حد خوش ہوتا، اور جھک کر اس آواز کا شکریہ ادا کرتا۔

وہ ایک بلند اور خوشنما ٹیلے پر بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس کے مناظر اتنے دلفریب تھے کہ ایک ساعت کے لئے میں یہ بھول گیا کہ میں یہاں دلفریب مناظر کا لطف اُٹھانے نہیں آیا تھا، میں تو اس سے ملنے آیا تھا۔

اور جب اُس ساعت نے دم توڑا تو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے گھور رہا تھا 'تم کون ہو؟' ــــ 'تم یہاں کیوں کر ؟' ــــ معاً میرے پاؤں تلے کی زمین دور تک گرتی چلی گئی اور میں تو گویا مطمئن سا تھا۔ نہ ہوش بہ قرار

تھا اور توازن قائم تھا ــــ یہ سب کیسے ہوا؟۔

میں نے دیکھا کہ وہ مینار میری طرف سے مُنہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اُسے بہت آواز دی، لیکن وہ بھاگتا گیا اور چھوٹا ہوتا گیا، چھوٹا ہوتا گیا اور بھاگتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ غائب ہوگیا۔ میں نے غصے میں اس کا چوکھٹا کھولا اور گُم شدہ مینار کو اس میں سے برآمد کرکے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

اس کی بلندیاں میری مُٹھیوں میں تھیں۔ اور مجھ پر عجیب سا سرخوشی کا عالم طاری تھا ــــ یہ بلندیاں بھی میرے دم سے ہیں اور یہ پستیاں بھی میرے دم سے ہیں

میں نے ان ٹکڑوں کو ایک بوری میں ڈال دیا اور فریم کو اُلٹا لٹکا کر کارڈ بورڈ پر ایک کراس کا نشان بنا دیا کہ اب وہاں ایک کھردری اور سخت چیز کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

دوسری صبح نے مجھ سے دھیرے سے کہا ــــ 'اتنے جذباتی کیوں ہوجاتے ہو ــــ'

'میں۔ میں۔ میں' میں کچھ گڑبڑا گیا۔

صبح کے دھندلکے میں اُسے سفید گنبدوں کے دیار سے آتا دیکھ کر میرا دل شبنمی قطروں سے دھل جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ ایک زمانے تک اس پر گرد نہیں جمے گی۔

اس کی زبان کچھ نہیں کہتی۔ لیکن آنکھوں کی قندیلیں ان خطرناک راستوں کی طرف اشارہ کر دیتیں جن پر شیر، چیتے اور اژدہے تھے۔ ہاں مگر یہ راستے......

یہ قندیلیں ہمارے اندر بھی عجیب بجھی بجھی سی کیفیت میں موجود تھیں ــــ

تب ایسا ہوا کہ ایک دن دوپہر کو جب سفید گنبدوں کے دیار نے لوگوں کو آواز دی تو جوق درجوق لوگوں کی صف میں میں بھی موجود تھا۔ اور یہ پیغام ایک آنکھ سے دوسری آنکھ تک کا سفر کرتا تھا۔ بہت سے بند دروازوں نے اپنی نیند

کی عمر چھوٹی کرلی کہ اس کے خاموش لبوں نے اس آواز کو سُننے کی دعوت دی تھی جو رات کے دم توڑتے وقت سفید گنبدوں کے دیار سے اُٹھتی تھی۔

'دیکھو یہ رقم میری ہے'۔

'یہ سکّے میرے ہیں'۔

'یہ پیسے میرے ہیں' ـــــ وہ تیزی سے سفید کاغذوں پر ان کا اندراج کرتا جاتا۔ تب ہم مطمئن ہوجاتے کہ ہماری جیبیں، اب اس کے پاس محفوظ ہیں۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک دن اسی کی دستک پر سبھی اس کے اردگرد اکٹھا ہوگئے۔

''اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے درمیان ایک شخص ایک بڑی رقم کے لئے پریشان ہے تو ـــ'

'تمھیں پورا اختیار ہے'۔

اس وقت اس کی آنکھوں میں روشنی کا ایسا جھماکا ہوا کہ ہماری آنکھیں خیرہ ہوگئیں ـــ

'میں تو......'

دو چار دنوں بعد ہماری رقمیں اس کے پاس پہنچ گئیں ـــ ایسے کتنے ہی مواقع آئے کہ پریشانیاں تو در بدر ماری ماری پھرتی ہیں۔ لیکن ہر بار اُس نے مجلس سے پوچھنا ضروری سمجھا۔ مجلس جھنجھلا اُٹھی ـــــ 'تم اپنے ہاتھ کو صرف اپنا ہاتھ کیوں سمجھتے ہو، یہ ہم سبھوں کا ہاتھ ہے۔

پھر ایک دن ایک تار پہنچا کہ بس ایک نعرۂ حق لگا کر اس کا باپ حق سے جاملا ہم سبھوں کے چہرے لانبے ہوگئے۔ اور ہم نے اپنی آوازوں کو زبان کی سلاخوں کے اندر ڈال دیا اور دھیمے دھیمے قدموں سے اس کے یہاں جا پہنچے۔ وہ بستر باندھ رہا تھا۔ ہم نے اس سے بستر چھین لیا۔ وہ برابر احتجاج کرتا رہا۔ لیکن ہم اس کے سفر کا سامان درست کرنے میں لگے رہے۔

اس دن وہ آنکھیں ایک بھاری بوجھ تلے دب کر نڈھال سی ہوگئی تھیں
وہ خاموشی سے پڑھے ہوئے اوراق، اور نہ پڑھے اوراق کو تک رہی تھیں ــــ
فسردہ فسردہ سی ــ یوں بھی جب ندی کا بندھ نہیں ٹوٹتا تو وہ اور بھی سرکش
اور بھی تُند خو ہو جاتی ہے۔

پھر جب وہ لوٹا تو اس نے مثلث کے خطوں کو اور بھی گہرا کر دیا۔
سفید گنبدوں کا دیار ــ اپنوں کا رنج و غم ــ کتابیں ــ ہر دم یوں محسوس
ہوتا کہ وہ ابھی کسی جہاد پر جا رہا ہے کہ کل کو کس نے دیکھا ہے۔
اور جب وقت اکٹھے بہت سارے مہ و سال کو نگل چکا تو میں نے سُنا، وہ
وہاں ہے، ــ

اس نے اپنے مرے باپ کے نام سے ایک دستاویز تیار کرائی ہے۔
میرا دل بھاری پتھر تلے دب کر دیر تک کراہتا رہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا
جیسے ہم پہاڑوں پر کچھ اور ہوتے ہیں اور میدانوں میں کچھ اور ــــ میدانوں کی
کڑی دھوپ شاید ہمیں یکسر بدل دیتی ہے ــ

'اس نے اپنی بہن کو گھر سے نکال دیا' ــــ
کسی نے میرے کانوں میں دہکتے انگارے ڈال دیئے۔ یا خُدا میری آنکھیں
پگھل رہی تھیں یا وہ مینار پگھل رہا تھا ــ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ دھندلکوں
کی قبا میں گُم ہوگیا۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا ــــ میں نے اس بے روح کاغذ کو اس بوری میں ڈال
دیا اور کارڈ بورڈ پر ویسا ہی ایک نشان ــــ
تب نڈھال سا پرندہ دوسری سمت جا نکلا۔

وہ رات بڑی بھیانک تھی۔ صبح ہی سے آسمان کے تیور بگڑے ہوئے تھے اور
اگر بارش لمحے دو لمحے رُکی بھی ہوگی تو وہ لمحے ہم سے نظریں چرا کر نکل بھاگے تھے۔ کوئی

دروازے پر لگاتار دستک دے رہا تھا۔ میں نے چھتری لگا کر تیز پانی میں دروازہ کھولا۔
'تم — اتنی رات گئے'۔
اس نے کچھ اشارے کئے — ہر سمت ظلمت کے دام بچھے ہیں۔ اس کے کپڑے بے طرح بھیگ چکے تھے، میں نے اُسے دُھلے کپڑے دیئے جو اس کے بھاری جسم پر چپک سے گئے۔
'کوئی غم نہیں' —
میں نے اپنا جسم لوہے کا بنا لیا ہے اور کلیجہ پتھر کا کہ سامنے وہ سنگ و آہن کی دیوار ہے جس کے پیچھے خوش رنگ نظارے ہیں'۔
اس کے سر کے قریب ساری رات چھت ٹپکتی رہی۔ مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ اور جب صبح نے اندھیرے کی چادر سے مُنہ نکالا تو میری آنکھ کُھل گئی۔ میں نے اُٹھ کر اُسے دیکھا وہ جا چکا تھا۔ دروازہ کُھلا تھا اور بارش اپنے راگ الاپ رہی تھی۔ میں دیر تک کھویا رہا اور جب میں واپس آیا تو کسی نے سرگوشیوں میں کہا اُسے تو سنگ و آہن کی دیواروں سے ٹکر لینا ہے۔
پھر وہ مشعل لئے شہر شہر اور قریئے قریئے مارا پھرا۔ ایک تیز ہوا کا جھونکا۔ میں نے اُسے کئی موڑ پر دیکھا، لیکن ہر موڑ پر وہ تازہ دم سا دکھائی دیا۔ وہ بھیڑ بھاڑ میں گُم ہو جانا چاہتا تھا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے قد کے پہاڑ کے آگے بھی ننھے مُنّے اور بے حقیقت سے دکھائی دینے لگتے۔ میں اس سے کہتا تمہاری یہ کوشش کبھی بھی بار آور نہیں ہو سکتی کہ ان میں سے ہر کوئی طوفانوں کے دوش پر پر نہیں چل سکتا، ہر کوئی موجِ بلا کے تھپیڑے نہیں کھا سکتا۔
وہ لوہے کے شہر کو جاتے ہوئے مجھ سے ملا۔ ساری شام وہ میرے ساتھ رہا۔ آگہی اور روشن دن کی باتیں 'اتہاس کے چار ادھیائے' پر جا نکلیں اور پھر جنگ اور امن، کی سمت پھر گئیں۔
'تم وقت کیسے نکال لیتے ہو؟'۔

'کبھی کبھی وقت میرے ہاتھ تھام لیتا ہے"۔
'تو تم پر اس کی عنایت خاص ہے'۔
'نہیں—' کہہ کر وہ اُداس اُداس سی وادیوں میں کھو گیا—دیر تک۔
تب ایک الوداعی سلام کے بعد وہ اپنی راہ ہو لیا۔
وہ لوہے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے درپے ہے۔
وہ دلوں کی آگ کو بھڑکا رہا ہے۔

پھر ایک دن دیواروں نے اسے اسیر کر لیا، اور ایک چھوٹی سی دُنیا میں سب کچھ سمٹ کر رہ گیا۔ ایسی دُنیا میں جہاں پہنچ کر ہر کوئی اپنی خبر سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی خبر کا کہاں سوال اُٹھتا ہے۔
اور تب اونچی دیواریں اس کے تین سال چاٹ گئیں۔

پھر ایک سنہری صبح کو شاعر نے اٹک اٹک کر کہا—"تم نے کچھ سُنا، برف کے پہاڑوں پر بگل بجتے ہی اس نے شہریاروں کے حضور میں اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیا"۔
میں نے کہا۔ 'تم آج صبح ہی صبح نشے کی باتیں کر رہے ہو'۔
'نہیں—نہیں—' اور اس 'نہیں' نے مجھے بڑی بے دردی سے گہرائیوں میں ڈھکیل دیا۔
گھنٹوں بعد جب میرا لہو خشک ہو گیا تو میں نے اسی مینار کی طرف نظر دوڑائی۔ اس کی ایک منزل گر چکی تھی۔
اور جب میں اپنے مقام پر واپس آیا تو میں نے دیکھا—وہ اطمینان سے بیٹھا پان چبا رہا تھا۔
اب وہ کیا کرے گا؟'

'زراعت'۔

'سیاست سے زراعت'۔

مجھے قدرے اطمینان ہوا ــــ چلو دوسری منزلیں تو سالم ہیں۔ 'سُرخ اور سبز میں کیا فرق ہے'۔

مجھے برابر خبریں ملتی رہیں۔

آج یہاں ــ کل وہاں ــ

وہ لکڑیوں کے گٹھر کو کھول کر لکڑیوں کو بکھیرنے کے درپے ہے۔

اس نئے آدمی نے اس پرانے آدمی کو جو کمزور سا ہو چلا تھا، چلتی گاڑی سے ڈھکیل کر خود اسٹیرنگ سنبھال لی ہے۔

میں نے دیکھا کہ وہ مینار چھوٹی اور بڑی اینٹوں کا ڈھیر بن چکا تھا۔

پرندہ دیر تک اس ڈھیر کے گرد چکر کاٹتا رہا۔ لیکن ڈھیر نے پھر لمحہ بھر کے لئے بھی سر نہیں اٹھایا۔ اور وہ مینار میری بوری میں سمٹ آیا۔

تب پرندے نے دوسرے مینار کا رُخ کیا کہ نگار خانے میں اب بھی کئی مینار ثابت و سالم کھڑے تھے

پرندہ ان کے انجام سے بے خبر تو نہیں تھا۔

خالی پلنگ

(رفعت بلخی)

اُسے پھر نیند نہ آئی۔ ساون برسا اور پچھلی رات کو ہوا بھی تھوڑی سرد ہوئی مگر جالب جوں کا توں اپنے بوسیدہ پلنگ پر پڑا آنکھیں چھت پر جمائے خود کو کوستا رہا۔ وہ ایک مدّت سے بیمار تھا۔ بیماری کے ان چار سالوں میں اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے کمرے کی تمام چیزیں بیمار ہیں۔ وہ بیمار ہے۔ اُس کا پلنگ بیمار ہے اُس کی چھت اور کمرے کی دیواریں بیمار ہیں۔ اور بیمار ہے وہ دریچہ جس کی زنگ آلود سلاخوں سے ہر موسم کا چاند اُسے یوں گھورتا ہے جیسے تسنیمہ اپنی شادی سے قبل اُسے کالج آتے جاتے بس دیکھا کرتی تھی۔ ہائے اس کی وہ آنکھیں۔ اُسے آج تک یاد ہیں وہ آنکھیں جیسے کسی مقدس محراب کے دیئے روشن ہوں۔ مگر وہ آنکھیں بھی شاید اب دریچہ ویران کر گئی ہوں گی۔ کون کس کا انتظار کرتا ہے۔؟ اس پر مایوسی کا کہر سا چھا گیا اور اس نے کرب آلود کروٹ لی۔ پُرانے پلنگ کی رندھی ہوئی آواز نے اُسے بہت اُداس کر رکھا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے اور گھر کے لوگوں کی ضد کے باوجود وہ اپنے پلنگ کو ہٹانے کے حق میں نہ تھا۔ نیم جان پلنگ اور بے جان جالب کے بیچ کا یہ جذباتی رشتہ روز بروز پُراسرار اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے اس لگاؤ کو اُس کی بیوی زیبا بھی منقطع نہ کرسکی۔ اور اب ان تینوں یعنی پلنگ۔ جالب اور زیبا میں بہت سی باتیں مشترک ہو چلی تھیں۔

زیبا جالب کی شریکِ حیات سے زیادہ اب شریک غم بن گئی تھی۔ شاید اُس کا غم قدرے گھٹتا اگر اُس کے پاؤں زینے پر بھرپور جمتے اور ایک شام وہ جالب کو بیہوش

پڑوسیوں کے کندھے پر اس طرح اچانک نہ دیکھتی جیسے کوئی ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ جاتا ہے اور پھر کوئی سورج گھر کو روشنی نہیں بخش پاتا۔ اُف کس قدر منحوس اور اندھیرا آسمان تھا کہ نہ کوئی چاند تھا اور نہ کوئی سورج اُس کے سر سے بہتا ہوا خون چہرے پر باسی لکیریں بن کر خشک ہوگیا تھا اور جس کی چاکلیٹی چمک پر مکھیاں منڈلا رہی تھیں۔

——— جالب ندی میں غسل کرتے ہوئے ایک چٹان سے کچھ اس طرح ٹکرا گیا تھا کہ جسم کا سارا بوجھ سر پر آرہا اور ریڑھ کی ہڈیاں نمک کھائی ہوئی دیوار کی اینٹوں کی طرح بیٹھ گئیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ خبر محلّے محلّے گشت کر گئی اور زیبا جو اُمید سے تھی کچھ اس طرح نااُمید ہوئی کہ آج تک اُس کا غم کم نہ ہوا اور اب تو اُس کے سینے کی جلن کچھ اس طرح بجھ گئی تھی جیسے وہ کبھی اُمید سے ہوئی ہی نہ ہو۔

سرجکل وارڈ کا اندرونی حصّہ زیادہ کشادہ نہ تھا۔ اُس کی دیواریں نصف حصّے تک سیاہ تھیں اور باقی حصّے چھت تک سفید تھے۔ بیڈ ۱۲ کونے سے قریب تھا۔ اور جس کے اوپر چھت سے لگی ایک بتّی جھولتی تھی جس پر گرد آلود پُرانا شیڈ پڑا تھا۔ تین دنوں کی لگاتار کوششوں کے بعد جب جالب کی بیہوشی ختم ہوئی تو اُس نے سر پر وہی چھت والی بتّی جھولتی دیکھی جس کی چمک نے سر میں بوجھ سا پیدا کر رکھا تھا۔ اس کا سارا جسم سرد تھا۔ اور جب اس نے گھبراہٹ میں کروٹ بدلنا چاہا تو خود کو اُسی طرح پتھر میں پھنسا ہوا پایا۔ جیسے وہ سنگ تہہ آب ہو کر رہ گیا ہو۔ اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ ہل بھی نہ سکا۔ اس نے سوچا شاید وہ مر گیا ہے اور اس کا بے جان جسم کسی ایسی قبر کے سپرد کر دیا گیا ہے جو اوپر سے ایک دم کھلی ہے۔ اور جس کی بلندی پر سفید آسمان تلے ہسپتال کی روشنی نہیں دوپہر کا بالغ سورج چمک رہا ہے اور سفید گاؤن یا ایپران جسم پر ڈالے الہ آبادی امرود کی رنگت والی خوشبودار ارناکلمی نرس ساوتری اور خشخشی داڑھی والا خاموش ڈاکٹر انصاری جیسے عرفانی دھوپ ہیں جن کی رفاقت اس کی اعصابی کمزوری دور کر دیں گے اس نے گردن موڑ موڑ کر

اپنے ماحول کا بھرپور جائزہ لیا جہاں زیبا کھڑی تھی۔ وہ بالکل چُپ تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ وہ مریض کے مستقبل سے قطعی بے خبر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی بلوریں آنکھوں میں دوبارہ اشک اُمڈ آئے۔ اور جالب چیخ اُٹھا۔

ڈاکٹر میرا جسم ادھورا کیوں ہے؟" اور ڈاکٹر کی تسلّی کے باوجود اُسے نیند نہیں آئی تھی۔ بے خوابی کی تکلیف سے اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ڈاکٹروں نے دوا کھلا کر اُسے مصنوعی نیند بخشی بھی تو اس کا ذہن جاگا رہا وہ کچی نیند میں جاگے ہوئے بچّے کی طرح بہت بے چین تھا اور آج چار سال ہو گئے بلکہ کچھ اوپر چار سال کہ وہ سوکھ کر خزاں کی زرد پتّی کی طرح خشک ٹہنی نما پلنگ سے چپک گیا تھا۔ یہ پتّی کبھی بھی ٹہنی سے جُدا ہو سکتی تھی۔ فالج صرف اُس کے جسم کے نچلے حصّہ تک محدود نہ تھا بلکہ اُس کے گھیرے اب دل و دماغ تک پھیلتے جا رہے تھے یا پلنگ کے ایک سرے سے دوسرے تک فالج ہی فالج تھا۔ اور وہ دبیز دوسوتی چادر کے تلے چھپ کر خوب رویا کیونکہ اس کا آسرا کمزور تھا۔

آج دریچہ پھر کھلا تھا۔ دُور حدِ نگاہ تک گہرے سلیٹی رنگ کا دُھند مسلّط تھا۔ دو وقت مل رہے تھے اور ساون کی گھنی بدلیوں کے کارن اندھیرا بڑھ رہا تھا پھر سوئی کی نوک کی طرح باریک پھواریں دھرتی کا سوندھا پن جگانے لگیں اور ان میں کچھ ہوا کے زور سے بھٹک کر اندر چلی آتیں اور جالب کے خشک لبوں اور پچکے ہوئے کھردرے گلوں کو سیراب کر جاتیں۔ بے سوچے سمجھے اس نے اپنے لبوں پر جمے ہوئے قطروں کو چاٹ لیا اور جس کی مٹھاس میں اُسے زیبا کے ہونٹوں کی حلاوت کا احساس ہوا مسلسل چار سال تک چت لیٹے رہنے سے اُسے بڑسور ہو آیا تھا۔ ساون کی پورہائی میں اس کے زخم کی ٹیس بڑھ گئی تھی۔ مگر آج آسمان کی پہنائیوں میں جھانک کر اُس کا دُکھ ہلکا ہو گیا تھا۔ جیسے اُس نے مقدس روحوں کا اُجالا دیکھ لیا ہو۔ اور اُس کا دُھواں آسمان سے زمین پر اُس گھڑی واپس آیا جب مکان کے نشیبی علاقے میں ہر روز کی طرح آج بھی رام داس تاڑی کے نشے میں چور اپنی بانجھ

عورت کو گالیاں دے رہا تھا۔ "تم سالا جورو نہیں کاتک کی ٹھنڈی کُتیا ہو۔" پھر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اور جب کبھی ایسی گالیاں جالب کے بیمار بستر تک پہنچتی تو وہ خواہ مخواہ محجوب سا ہو جاتا۔

ڈاکٹروں کی انتھک کوششوں کے باوجود جالب میں کوئی توانائی نہیں آئی تھی۔ اس نے ٹانگوں میں مالش بھی کی۔ سینک سینک کر باندھا اور باندھ باندھ کھولا بھی۔ لقا کبوتر کا جوس بھی پیا۔ مگر کمر سے نیچے جیسے گھُن سا لگ گیا تھا۔ پھر بہت مایوس ہو کر بولا۔

"زیبا میں ایک دلدل میں پھنس گیا ہوں جس میں بہت گہرائی تو نہیں مگر اس کی گرفت ناقابلِ تسخیر ہے۔"

"زیبا بہت روئی اور روتے روتے اس کی سوکھی ہوئی گردن میں پیوست ہو کر اُسے بے تحاشہ چومنے لگی۔ اُسے شرم بھی نہ آئی کہ اب وہ بہت بے بھروسہ ہو گئی تھی۔ اُس کے صندل جیسے چکنے گال اور ستواں ملائم ناک کی رگڑ نے جالب کے جسم میں بجلی سی بھر دی اور وہ بہت مشتعل ہو گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ زیبا کو اپنی قمچی جیسی باہوں میں کسنا شروع کر دیا اور زیبا اُس پر مکمل طور پر جھک گئی مگر اس کی یہ گرفت بھی کچے سوت کی طرح ٹوٹ گئی اور اس نے محسوس کیا جیسے وہ بچوں کے کھلونے پر سوار ہے جس کی نہ کوئی راہ ہے نہ کوئی منزل۔ جالب کا بے خواب پلنگ یہ راز بھی جانتا تھا کہ زیبا کتنی ہی بار رو رو گئی ہے اور اُس کی کھڑکی کا چاند اُس پر کس طرح ہنسا ہے۔ اور وہ کس قدر مجبور ہے کہ اُٹھ کر اُس کے آنسو بھی نہیں پوچھ سکتا۔

"زیبا تم دوسری شادی کر لو۔"

اور زیبا کا بیضادی چہرہ پگھلے ہوئے لوہے کی طرح سُرخ ہو گیا اور وہ ایک عجیب موڑ پر آ گئی۔ راستہ خاموش تھا اور مسافر تھکا تھکا سا۔ ایک لمحہ گذار کر پھر اُس نے کہا۔

"میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے زیبا کہ میں کسی لمبے چوڑے ریگستان

میں گنجے ببول کے نامکمل سایہ تلے اونگھ رہا ہوں اور اونچی شاخوں پر صدیوں کے پرانے گدھ مجھے بڑی لالچ سے دیکھ رہے ہیں اور اُن کی چونچ سے ہوس کی رال ٹپکتی ہے اور میرا جسم اس میں بھیگ بھیگ کر کچھ اس طرح جکڑ گیا ہے کہ چاہوں بھی تو تم تک نہیں آسکتا۔" یہ کہہ کر وہ تکیہ کے اوپر تھوڑا سرکنے کی کوشش کرنے لگا اس کی سفید شکن آلود چادر پر بدسور سے رستے ہوئے زرد و غلیظ پانی کے دھبے خشک پڑ گئے تھے جیسے شربت گر کر سوکھ گیا ہو۔ اور جس کی مٹھاس پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔

صبح کا سورج بادلوں میں گھر گیا تھا۔ کل جالب نے جو کچھ کہا تھا اس کا اثر زیبا پر نمایاں طور پر پڑا تھا۔ ہاں اس کا خوبصورت چہرہ شبنم میں ڈھلے ہوئے کنول کی طرح اب بھی شفاف تھا۔ خوبصورت چہرے دراصل آسمانی دین ہیں جن کے خنک تابناکی میں جلوۂ ازلی پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوپہر تک آسمان گھنے بادلوں کی وجہ سے محدّب شیشے کی طرح چمک رہا تھا اور بجلیاں تھیں کہ سخت بیتاب۔ پھر سہ پہر تک آسمان ٹوٹ کر برسا اور جس میں سرو قد اور اُجلی برف کی سی جسم والی زیبا نے ڈوب ڈوب کر نہایا۔ بارش کے موٹے موٹے قطروں نے اس کے ننگے جسم میں بجلی سی گدگدی بھر دی تھی اور وہی قطرے جب چہرے پر بکھر گئے تو سُرخ ہتھیلی پر سیماب کی طرح کانپ رہے تھے۔ آنگن میں کافی پانی جمع ہو گیا تھا جو برآمدے کی سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے اُتر آیا تھا۔ اُس پانی کی نکاسی کا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ ایک نالی تھی جو بے مصرف ہو کر بند ہو گئی تھی۔ پھر شام ڈھلے صحن کی پیاسی زمین نے پانی خود ہی جذب کر لیا۔

زیبا نہا کر جب قد آدم آئینے کے سامنے بے حجاب گئی تو اُسے اپنی ذات پر کافی ترس آنے لگا۔ اُسے اپنے بیمار شوہر کا خیال نہ ہوتا تو شاید اپنا بستر بھی وہ الگ کر لیتی مگر اُس نے سوچا ایسی روحیں مر کر بھی بے سکون رہتی ہیں اور وہ کسی بھی طرح اپنی عاقبت بگاڑنے کے حق میں نہ تھی۔ اس نے بلاوز کا بٹن لگاتے وقت محسوس کیا

جیسے چاند جُھک گیا ہے اور اب جسم کی وادی بھی ویران اور اندھیری ہو جائے گی
۔ پلنگ نے آواز دی اور وہ بھاگی بھاگی جالب تک گئی جس کا چہرہ شیو
نہ بننے کی وجہ سے سوکھی ہوئی چھال کی طرح کھردرا ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے کی
ہڈیاں سخت تھیں اور اس کے گال اتنا پچک گئے تھے کہ پھیلانے پر بھی مسلط
نہیں ہو پاتے تھے اس نے زیبا کے ریشم جیسے ملائم بالوں کو اپنی مٹھیوں میں کستے
ہوئے کہا۔

"برسن کے پانی سے دُھلے ہوئے تمہارے یہ سنہرے بال جب کھلتے ہیں تو
ان میں سے بڑی حیات آفریں خوشبو نکلتی ہے۔"

اس دن اُودی گھٹاؤں تلے زیبا نے آڑی ترچھی نارنجی رنگ کی ڈوریا
ساڑی پہن رکھی تھی۔ جالب خوب جانتا تھا کہ رنگوں اور موسموں کا بھرپور ادراک
عورتوں کو ہی ہوتا ہے۔ دُنیا کی ہر حسین چیز خاموش ہوتی ہے۔ چاندنی ہو یا شفق،
رنگ ہو یا خیال سب خاموش ہوتے ہیں ——— زیبا بھی خاموش تھی یا اُس کا
دُکھ حسین تھا۔ وہ اُبھر کر بھی خاموش رہتی تھی۔ مدت کی بیماری نے جالب کو بہت
بے اعتبار بنا دیا تھا۔ اور اُس کی بے اعتباری کو سہارا اُپنشدوں سے ملتا تھا "جگ
ٹوٹی کشتی ہے۔" پھر گوبندن نے تسلی کے باعث کہا تو اسے نیند سی آنے لگی تھی۔ پلنگ
خاموش تھا مگر حسین نہیں۔"

چوماسا کے ختم ہوتے ہی برگ و گیاہ کی تازگی میں کمی آگئی تھی۔ آج کی رات
اکتوبر کی آخری رات تھی۔ بڑی نمی تھی اس رات میں جب وہ ساری رات جاگا رہا
اور لگا ہے زیبا کے ہونٹ بھی چومے تھے۔ اس کی سوکھی ہوئی سیاہ ٹانگ جس میں گھنٹہ بھر
قبل زیبا نے زیتون کا تیل مالش کر رکھا تھا بستر سے لٹک کر کثیف چھتڑے کی طرح جھول
رہی تھی۔ اس چھتڑے کی مہک اب بستر کی مہک تھی جو اب کسی بھی مہک سے زیادہ مہلک
ہو گئی تھی۔ پسینے کی نمی اُس کے جسم میں کچے تانبے کی طرح نو پید اکر رہی تھی اور زیبا تھی
کہ گوتم کی سجاتا کی طرح آس لگائے بیٹھی تھی مگر لمحات عرصے میں تبدیل ہوتے گئے اور

اُس کے گوتم کو نہ مُکتی ملی اور نہ پیاسی آتما کو نروان ہی ملا۔ ڈاکٹروں نے اس مرض کو لا دوا بتایا تھا ——

ایک دن باسی رساول کی سطح پر دراریں پڑگئیں۔ جالب کی بھوک مری مری تھی۔ اس کی سانس کی رفتار بھی مدھم ہو چلی تھی۔ خواب آور گولیوں کے بکثرت استعمال نے اُسے اور بھی کمزور بنا رکھا تھا۔ اس کے بازوؤں پر بندھے ہوئے تعویذ اور مہرشفا کے رنگ اس کے پلنگ کی طرح پھیکے پڑ گئے تھے۔ اب اس میں حرص تھی نہ ہوس۔ وہ بہت اُداس تھا۔ آج سنجوگ سے نشیبی علاقے میں رام داس نے پھر پی رکھی تھی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بانجھ عورت کو کہہ رہا تھا۔

”تم سالا جورو نہیں کاتک کی ٹھنڈی کُتیا ہے۔“

”کاتک کی ٹھنڈی کُتیا“ اُسے نیند نہ آئی اس نے محسوس کیا جیسے یہ اندھیری رات سمٹ کر منتظر آنکھوں کے ذریعہ اُس کے جلتے ہوئے سینے میں اُتر آئی ہے اور وہ اب کبھی نہ سو سکے گا۔ سرہانے دھری شربتی رنگ کی چھوٹی شیشی میں خواب آور سفید گولیاں فرشتوں کی معصوم نگاہوں کی طرح جھانک رہی تھیں۔ اس نے دائمی سکون حاصل کرنے کے لئے پے در پے کئی گولیاں کھالیں اور تھوڑی سنسناہٹ کے بعد اس کی روح کپلوستو کے گوتم کی طرح عرفان و حقیقت کی تلاش میں شاید اُس دریچے سے بہت دور نکل گئی جس کی زنگ آلود سلاخوں سے ہر موسم کا چاند اُسے گھورتا تھا۔ اس اندھیری رات میں اس کا پلنگ تابوت کی طرح خاموش تھا اور پائینتی لگی نیلی آنکھوں والی کوئی سجاتا یہ سوچ رہی تھی کہ اُسے رہائی ملی یا اسیری

——— ٭ ———

پیاسی ندی

(نعیم کوثر)

وقت دبے پاؤں اس تیزی سے گذر جاتا ہے کہ اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ آج پھر وہ بالکونی میں کھڑی ہوئی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ وہ تنہائی سے اُکتا کر یہاں چلی آئی تھی۔ شام کی تاریکی پھیل چکی تھی اور کوری ڈور کا بلب روشن ہو چکا تھا۔ سامنے والے مکان کا وہ دُبلا پتلا نوجوان حلوائی کی دوکان کا کئی چکر لگا چکا تھا جس کی جوان لڑکی کچوریاں تل رہی تھی۔ نیچے بوڑھی بنگالن روز روز کی طرح چیخ چیخ کر محلّے کے شریر لڑکوں کو گالیاں دے رہی تھی۔

دفعتاً ٹیلیفون کے بیزر نے اس کے خیالوں کے تسلسل کو توڑ دیا اس نے بڑھ کر فون اُٹھا لیا۔

"ہلو مسز کمل اسپیکنگ"۔

"ہلو شیل میں کمل بول رہا ہوں۔ شیل جانتی ہو آج میں تمھارے لئے ایک بہت ہی خوبصورت تحفہ لا رہا ہوں جو تمھاری تنہائی کو دور کر دے گا۔ آنند میرے بچپن کا دوست، ہم لوگوں کے کالج کا ساتھی۔

قریب آدھ گھنٹہ گذرا ہوگا۔ ڈرائنگ روم میں آہٹ سی سُنائی دی اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ طے کرتی ہوئی جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اس کا دل دھڑک اُٹھا۔

سامنے سُرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس آنند مسکراہٹیں بکھیر رہا تھا اور آنند سکتے کے عالم میں ایک ٹک شیل کو دیکھے جا رہا تھا۔ ایک بیک پندرہ سال

پہلے کا منظر آنکھوں میں گھوم گیا۔ گھونگھٹ اُٹھاتے ہوئے اُس نے کہا تھا۔ "شیل بھابی آنکھیں کیوں بند رکھی ہیں ذرا ہمیں بھی تو دیکھو ہم بھی بُرے نہیں۔"

کالج میں کمل اور آنند کی جوڑی چاند ستاروں کی جوڑی تھی۔ کہنے کو تو کمل اور آنند میں محض دوستی تھی لیکن نہ جانے صورت اتنی ملتی جُلتی کیوں تھی ویسے ہی اُلجھے اُلجھے گھنگھریالے بال، وہی دہانہ، ایک مسحور کُن آنکھیں، وہی بات کرنے کا انداز۔ کالج میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ دونوں جُڑواں بھائی ہیں۔

آنند اکثر شیل کو چھیڑتا ——— "دیکھنا بھابی اس گھر میں سنبھل کر رہنا۔ کہیں ایک دن دھوکا نہ ہو جائے۔ میں تو فائدہ میں رہوں گا۔ لیکن کمل بیچارہ ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔"

آج پندرہ برس بعد بھی شیل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لپ اسٹک سے دہکتے ہوئے، کاجل سے سجی سنوری وہی جھیل جیسی خوبصورت آنکھیں اور گلاب سے تروتازہ پھولوں سے عارض۔ شاخِ گُل کی طرح لچکتا ہوا بدن۔ آج بھی وہ ہزاروں میں ایک کہی جاسکتی تھی اس کے حُسن و شباب کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی شادی کو پندرہ برس ہو گئے۔

آنند کو یہاں آئے ہوئے مشکل سے چار دن ہوئے تھے لیکن وہ جلد ہی ان لوگوں سے گھُل مل گیا۔ دن بھر کیرم کھیلا جاتا، پکنک کا پروگرام بنتا سیر و تفریح ہوتی اور سنیما دیکھا جاتا۔ دن کسی طرح گذر جاتے پتہ بھی نہیں چلتا اور بھیگی راتوں تک آنند کے کمرے سے شیل کے نقرئی قہقہے بلند ہوتے رہتے۔

شیل کو آنند بے حد عزیز تھا۔ قدم قدم پر وہ آنند کے آرام کا خیال رکھتی۔ آنند کی ہر فرمائش پوری کرتی۔ آنند کی پسند کی چیزیں خود اپنے ہاتھوں تیار کرتی۔ ذرا آنند کے سر میں درد ہوتا شیل بے چین ہو جاتی۔ گھنٹوں آنند کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر مالش کرتی۔ اور کمل کو ان سب باتوں سے کیا مطلب ——— دن بھر کے اُتار چڑھاؤ میں پھنسا رہتا اور رات گئے تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو سو جاتا۔ اسے جان کر بے حد خوشی تھی کہ آنند کے آجانے سے شیل کی تنہائیاں دور ہو گئی تھیں۔

شادی کے بعد کمل اور شیل کی خوشیاں یکساں تھیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ دونوں کی آزادیاں اپنی اپنی جگہ برقرار تھیں۔ بے شمار دولت تھی اور جتنی بھی تھی دونوں کے لئے ہی تھی۔ جتنا روپیہ ہوتا عیش و عشرت میں خرچ ہوتا۔ لیکن ان خوشیوں اور عیش کی زندگی کے درمیان ایک کمی کا احساس برابر ستاتا رہتا۔ شادی کے پندرہ سال بعد بھی وہ باپ نہ بن سکا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اپنے دماغ سے اس خیال کو نوچ کر پھینک دے لیکن یہ خیال موقع ملتے ہی اُس کے ذہن کو پریشان کرنا شروع کر دیتا۔ دن بھر کاروباری جھمیلوں میں تو وہ اس خیال کو بھولا رہتا لیکن رات ہوتے ہی وہ بے قرار ہو اُٹھتا۔ ساری ساری رات جاگتا اور اس کا ذہن پریشان رہتا۔ اُسے ڈاکٹر شیکھر کی پرانی بات ذہن اور دل پر کچوکے لگاتی۔

"مسٹر کمل آپ کبھی باپ نہیں بن سکتے اس لئے کہ......؟"

"ڈاکٹر وہ تقریباً چیخ سا پڑا تھا۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مسٹر کمل ڈاکٹر کے لہجہ میں ہمدردی تھی۔ اُف بھگوان کن کرموں کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ اُسے محسوس ہوتا اُس کے جسم میں نہ جانے کتنی چتائیں جل رہی ہیں اور ان ہی چتاؤں میں اس کی روح سلگ رہی ہے۔

اس طرح چھ ماہ گذر گئے۔

شیل آنند سے اس طرح گھُل مل گئی جیسے آنند ہی اس کا سب کچھ ہو۔ کبھی کبھی کمل کو محسوس ہوتا شیل اُس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے اور یہ آنند خوب دوستی کا حق ادا کر رہا ہے۔ اور اس کے دل میں شک و شبہات کے سوت پھوٹ پڑتے۔ وہ ایک عجیب سی آگ میں جلتا رہتا۔

پھر ایک دن اُس نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا اور اس اچانک فیصلے سے وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی کرن پھوٹ پڑی۔

ایک رات وہ تقریباً بارہ بجے آفس سے لوٹا شیل گھر پر نہ تھی۔

اُس نے آنند سے پوچھا ——— "شیل کہاں ہے ؟"

"میجر ہال کے یہاں، آج ان کے بچے کا جنم دن ہے"

وہ کُرسی پر آنند کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"آنند مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں اور آج رات ایک بہت اہم فیصلہ کرنا ہے۔ پہلے وعدہ کرو کہ جو میں کہوں اُسے تم پورا کروگے۔"

"کمل تم میرے دوست ہی نہیں بھائی بھی ہو۔ اپنی باتیں کہہ جاؤ۔"

"تم اپنے وعدے سے مکر تو نہیں جاؤگے آنند!"

"آزمائش شرط ہے میرے بھائی"

تو ٹھیک ہے آج رات تم کمل بن جاؤ اور میں آنند، شیل کو بالکل شک نہ ہوگا اور اُس کی برسوں سے ماں بننے کی خواہش پوری ہو جائے گی بولو آنند" شیل اب آتی ہی ہوگی"

"کمل میں ایسا گھور پاپ کبھی نہیں کروں گا۔ میں اُس کے یقین کو کبھی ٹھیس نہیں لگا سکتا ——"

"لیکن آنند اس میں شیل اور میرے خاندان ..... ؟ تم کو جانا ہی ہوگا۔ ورنہ اس پستول کی محض ایک گولی کام تمام کر دے گی" وہ جذباتی ہوگیا۔

آنند نے کمل کی طرف دیکھا اور سر جھکائے ہوئے شیل کے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا، گھپ اندھیرا۔ قریب آدھ گھنٹہ مشکل سے گذرا ہوگا کہ یکایک اپنے جسم پر بوجھ کا احساس ہوا۔

"کون ؟"

"میں ہوں" یہ شیل کی آواز تھی۔

اُف باہر کیسی سردی پڑ رہی ہے اور یہ کہتے ہوئے بک شیلف میں رکھی ہوئی کتابوں کی طرح اُس کے جسم سے چمٹ گئی۔ اور اُس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

"کیوں جی؟ ناراض ہو گیا ہے"

"اونہوں"

"پھر اس طرح مجھ سے دور دور کیوں رہتے ہو۔ میں خوب سمجھتی ہوں مجھ سے اب تمہارا دل بھر گیا ہے نا۔؟"

"اونہوں"

جانتے ہو کمل میں اب بہت خوش ہوں۔ تم اکثر کہتے تھے شیل تم اُداس کیوں رہتی ہو۔ اب میری ساری اُداسی دور ہو گئی ہے۔ تم اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو کوئی بچہ نہیں اور تم مایوس بھی ہو چکے تھے۔ لیکن بھگوان نے ہماری سُن لی آنند بھی تو ہمارے بچے کی طرح ہے۔"

اور دوسری صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ جب شیل نے آنند کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ چونک سی پڑی۔ آنند کا کمرہ خالی تھا۔ اُس کی گود کی طرح۔ ایک بار پھر وہ تنہا ہو چکی تھی۔

اپی ٹاف

(شفیع جاوید)

[اُن بدنصیب لوگوں کے نام جنہیں زندگی نے ٹھکرا دیا۔ اور جنہیں موت نے گلے نہیں لگایا]

میں نے آسمان کو چھونے کی کوشش کی تو زمین صفر ہو گئی میں لوٹ آیا تو آسمان ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ حصار تو دونوں کے ٹوٹے لیکن میں اب کہاں جاؤں؟ ہنوئی یا سائیگان؟ کال نے ہمیں دھرت راشٹر بنا دیا ہے اور اب میں یہ بھی نہیں دیکھ پاتا کہ کورو کدھر ہیں اور پانڈو کدھر؟ مجھے اس کی خوشی بالکل نہیں ہے کہ دوسری دُنیاؤں کا وجود یقینی ہے بلکہ دُکھ اس بات کا ہے کہ ہم سب بدھتشٹر ہوئے جاتے ہیں اور خضر کہیں نہیں ——— " فیوز اُڑ گیا، روشنی بجھ گئی۔ میں رُک گیا۔ کمال کے خط نے میری اندھی آنکھوں کو دیکھا (اس کے تمسخر کو میں نہیں دیکھ پایا)

روشنی پھر آئی ——— اور تم کیا جھک مارتے ہو؟ کامن ویلتھ رنگ اور نسل کی صلیب پر ٹنگا ہوا ہے، تم اس کی کہانی کیوں نہیں لکھتے؟ تم جان پلاش کی کہانی کیوں نہیں لکھتے؟ تم طارق کے بلیک ڈوارف کی کہانی کیوں نہیں لکھتے؟ تم AFRICANIZATION پر لکھو اور تم کینیا سے نکالے گئے پرفل پٹیل کے موڈرن بن باس کی کہانی لکھو، لُٹے ہوئے ماضی، خارش زدہ حال، اور مدقوق مستقبل کی کہانی لکھو اور ——— " فیوز پھر اُڑ گیا اور سب کچھ چمک کر بے رحمی سے اوجھل ہو گیا۔

"ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ ڈانس فلور پر ہیں۔" کئی سال پہلے ایسے ہی ایک موقع پر دانش نے کہا تھا۔

کمال کے ان پڑھے خط نے پھر میری اندھی آنکھوں کو دیکھا۔ میں نے نروس ہو کر خط کو پُرزہ پُرزہ کر دیا ہے اور کھڑکی سے نیچے پھینک دیا ہے۔ باہر کی چاندنی میں پُرزے نیلے پرندوں کی طرح بہاروں کی تلاش میں اُڑتے اُڑتے نگاہوں سے اوجھل ہوئے جاتے ہیں۔

اور میرا فن ؟

کمال نے آگے کیا لکھا ہوگا ؟ اگر روشنی یکساں رہتی تو میں پڑھ بھی لیتا۔ کسی نے کہیں لکھا ہے (یاد آتا ہے) کہ مشین پر بہت زیادہ بھروسہ ...... کمال یہاں ہوتا تو بات کچھ بنتی بھی لیکن اب تو خط کے ٹکڑے بھی جانے کن منزلوں میں ہوں گے

" بھائی میرے سامان کو ذرا جلدی سے WRAP کروا دیجیے، رات ہوگئی ہے اور میری گاڑی کی ہیڈ لائٹس آرڈر میں نہیں ہیں ڈبر کے سہارے ہی جانا ہوگا"

"آں رات ہوگئی ؟" منیجر نے نوٹوں کو گنتے گنتے چونک کر پوچھا ہے۔

I AM NOTHING BUT A PENNY

BUT A PENNY

A PENNY

جانے کس نے ریکارڈ چڑھا رکھا ہے۔

پولیس بے تحاشا اُس رقّاصہ کو ڈھونڈھ رہی ہے جس نے کل TOPLESS رقص کیا تھا ——

BUT A PENNY

A PENNY

متفقہ فیصلہ ہوا ہے کہ ہماری مہذب سوسائٹی پر اس کا بے حد خراب اثر پڑے گا لیکن اُو سمس کا لائسنس رد ہونے سے بچ گیا ہے۔ آئندہ اگر یہاں ایسا پھر ہوا تو ، متفقہ فیصلہ کریں گے کہ ......

BUT A PENNY
A PENNY

نفسیات ہمارے شعور اور لاشعور کے جھگڑے میں کچھ اس طرح اُلجھا کہ انسان کے لاتعداد پہلو اَن جانے رہ گئے لیکن وہ جو ایک معمولی سی چیز ہے تصوّف، اُس نے انسان کے قلب کو پکڑا ہے کہ اسی کو مانجھنے سے آدمی وہ آئینہ بن سکتا ہے جس پر گرد کی کوئی تہ نہ ہو (ایسا کہتے ہیں) کمال کا خط ہمیشہ فساد کی پوٹلی باندھ کر آتا ہے، جب آتا ہے مجھے زخمی کرتا ہے، اندر سے باہر تک اور وہ کمبخت کبھی احمد آباد سے چُھرا گھونپتا ہے، کبھی کینیا سے، کبھی چیکوسلواکیہ سے اور اب جانے کس احمق نے اُسے کمبوڈیا جانے کو کہہ دیا ہے، یہ تیری نوکری بھی بڑی واہیات ہے ——

اس نوکری اور ٹرین نے کیسے کیسے اپنوں کو جُدا کر دیا۔

"شاہدرہ تو اب دلّی کا محض ایک EXTENSION ہے مجھے یہیں اُتر جانا ہے۔

"بس! یہیں تک؟"

"روز کا آنا جانا ہے بھائی!"

"لیکن آپ سے جُدا ہونے کا بہت افسوس ہوا"

"بھائی صاحب زندگی بھر کے کیسے کیسے اپنے بچھڑ جاتے ہیں، ہم دونوں تو بہت چھوٹے سے سفر کے ساتھی ہیں۔"

شاہدرہ پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔ میں اب اخبار اُٹھا لیتا ہوں۔ نمایاں خبر SPACE SHUTTLE COCK کی ہے —— ٹوکیو سے نیویارک کا سفر صرف چند گھنٹوں میں —— خلا کتنا محدود ہے اور فاصلے کی سرحدوں کا کوئی وجود نہیں GLOBAL VILLAGE (یہ مک لوہن کہاں سے یاد آگیا) —— لیکن کراچی بہت بڑا جدید شہر ہے (یا ہو گیا ہے سُنتے ہیں) اور بٹوارہ کے بعد سے اقبال بھائی وہیں رہتے ہیں، پھر بھی اقبال بھائی ابھی تک ویسے ہی روایت پرست ہیں، ہم دونوں نے بائیس ۲۲ سالوں سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا، ہماری صورتوں میں کافی تبدیلی آگئی ہے میں موٹا ہو گیا ہوں اور

اقبال بھائی بوڑھے ہو گئے ہیں، یہ ہم دونوں ایک دوسرے کی تصویروں سے جان پائے ہیں۔ پابندی تو آدمی پر ہے ——— اب اُن کا مُنّا امریکہ سے لوٹ کر اُن سے الگ "بلو مون" ہوٹل میں رہتا ہے تو کیا بُرا ہے؟ اور گاڑی سے اُس نے بائی بائی والا ہاتھ نکال کر اقبال بھائی کو وش کیا، صرف وِش، تو اُسے ٹائم کہاں تھا؟ دفتر کا وقت نکلا جا رہا تھا اور الگ رہنا بھی ضروری ٹھہرا کہ اقبال بھائی کے یہاں وہ اپنی بیئر کی بوتلیں کہاں رکھے۔ باپ اور بیٹے دونوں نے میرے یہاں اپیل دائر کر رکھی ہے۔

بے چارے اقبال بھائی۔

بے چارہ مُنّا

اور بے چارہ میں ——— جو حاشئے کی چاک پر چک پھیریاں کھا رہا ہے۔ وہ دونوں ٹوکیو میں ہوتے، نیویارک میں ہوتے، ماسکو میں ہوتے یا فرض کیجئے کہ جہنّم ہی میں ہوتے تو جا کر اور دونوں کو سمجھا بُجھا کر کم از کم اپنی طرح حاشئے پر تو لے آتا لیکن ——— لیکن شاہدرہ تو پیچھے رہ گیا ہے اور تازہ خبر یہ ہے کہ ٹوکیو سے نیویارک کا سفر صرف چند گھنٹوں میں۔ اور اس طرف یہ کون ہے جس کی انگلیوں میں مومی شمع سی روشن ہے؟ کوئی ہم سفر؟ آگے بڑھنا — تعارف — صفر اور فاصلوں کا ٹوٹنا۔ کولڈ بیئر کی طرح چند حیات آفریں جُھلکے، تبسّم کی لَو، اور پھر؟ اور پھر؟ ——— "شاہدرہ تو اب دلّی کا محض ایک EXTENSION ہے اور مجھے یہیں اُتر جانا ہے۔ بھائی۔" نا بابا اُدھر کیا کچھ ہے مجھے کچھ نہیں دیکھنا، مجھ میں اب بالکل سکت نہیں۔ اچھے دنوں کی یادیں خوبصورت پرندوں کی طرح شکاری کے ڈر سے میرے دل کے نہاں خانوں میں چھپے ہانپ رہے ہیں۔

کھٹاک، جھن، جھن، جھناک۔ بڑا سا وینٹی بیگ اوپر کی برتھ سے

پھسل کر گر گیا ہے اور کھل گیا ہے اور بکھری ہوئی چیزوں کو اکٹھا کرنے میں مومی شمع جیسی روشن انگلیاں مصروف ہیں۔ لپ اسٹک، کنگھی، سلیپنگ پلز، تاش کی گڈی، (CONTRACEPTIVES) اور وہسکی کا نپ جو ٹوٹ چکا ہے، کرچیاں اور باؤلی خوشبو۔ مومی شمع جیسی روشن انگلیاں پھیلے ہوئے وہسکی پر تیرتی ہیں اور گندے فلور پر وہسکی کی نمی میں مجھے IDIOT لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے ——— زمین بھاگی چلی جا رہی ہے اور سرحدیں پیچھے چھوٹ رہی ہیں، شاہدرہ سے آگے دلّی، دلّی سے آگے کراچی اور کراچی سے آگے کیلیفورنیا، ایک فوجی افسر کے گھر عجیب وغریب خون، کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں رات گئے اس کے یہاں داخل ہوئے اور میاں بیوی جو ساتھ سوئے ہوئے تھے۔ دونوں کو بار بار زخم دے کر مار ڈالا اور جب گندے فلور پر خون کافی پھیل گیا تو ان لوگوں نے بے حد خوبصورت ٹویسٹ کیا اور اپنے پاؤں کی انگلیوں سے لکھ دیا IDIOTS SHOULD DIE THIS WAY وہ سب DRUGS کے زیر اثر تھے۔ اطالوی محاذ پر ہیمنگوے کے شعور کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور اس کے بھائی کا کہنا ہے کہ اس کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ پھر کبھی بھی وہ بغیر روشنی کے نہ سو سکا اور NICK ADAM کو تاریکی میں نیند اس لئے نہیں آئی کہ تاریکی میں اس کی روح نہ اس سے جدا ہو جائے اور روشنی اب تک نہیں آئی۔ اور آتی بھی ہے تو چلی جاتی ہے، پھر آتی ہے اور پھر چلی جاتی ہے۔

"اور لگتا ہے کہ ہم ڈانس فلور پر ہیں"۔ وہ جو دانش نے کبھی کہا تھا۔ پھر فیوز اُڑ جاتا ہے، مشینی کاروبار کمال کے پچھلے خط میں آخری جملہ POE کا تھا "WEMELANCHOLY TROUPE OF THE UNDEAD" ———

"تو وہ کیسے لوگ تھے اقبال بھائی جو تب نواکھالی اور اب احمد آباد میں مارے گئے؟"

"تم نے MAX BEERBONM کو پڑھا ہے؟"

"نہیں۔"

"اپنے نوٹ بک میں ایک جگہ میکس لکھتا ہے کہ خدا جن لوگوں سے پیار کرتا تھا وہ ۱۹۱۴ء میں مر گئے اور جن سے خدا نفرت کرتا تھا ان کو اس نے زندہ چھوڑ دیا۔"

"آگے سب کچھ دھواں ہے، باہر کچھ دکھائی نہیں پڑتا، روشنی کی آنکھ پھولی جارہی ہے اور کمال کے خط کے بعد اخبار کے علاوہ میرے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔

"افتخار احمد غیر منقسم ہند کا ٹینس چیمپین دلی پہنچ کر سب سے پہلے اپنے پرانے دوستوں سے فون پر گھنٹوں عجیب کیفیت میں عجیب باتیں کرتا رہا۔"

"کیسی باتیں؟"

"آئی ایم سوری، پریس میں ساری باتیں نہیں آتیں۔"

"سکھوں کو جب لاہور جانے کا ویزا ملا تو وہ سب لاہور کے مکانوں کی سیڑھیوں پر لوٹ لوٹ کر کیوں روتے رہے؟"

"میں تے کہدیا نا بھائی کہ پریس میں ساری باتیں نہیں آتیں۔"

"تم جھوٹے ہو۔"

"اینڈ یو آر ایڈیٹ — کیا تم مصالحت کی زندگی نہیں گذار سکتے؟"

"میں اپنے دل کو کیا کروں؟"

"ڈاکٹر برنارڈ TRANSPLAN TATION"

"پھر آنکھیں؟ جو وہی صورتیں، وہی کیفیتیں ڈھونڈھتی ہیں؟"

"EYE BANK کی خبر نہیں تمھیں؟"

"اور دماغ کو کیا کروں؟"

"BRAIN WASH"

"اور احساسات؟"

"انھیں، انھیں بھی کچھ ......"

"سب بدل جائے گا تو پھر میں کون رہوں گا؟"

"وہی جو دوسرا ہوگا۔"

"وہ تو کوئی دوسرا ہوگا میرے بھائی۔"

"یہ پہلے اور دوسرے کا چکّر نہ چھوڑوگے تو دفعہ فلاں کے تحت چارج.....

"ایک بات سُنو بھائی، میں دل، آنکھ، دماغ، احساسات سب بدل دوں، سب کچھ بدل دوں لیکن وہ ایک دفعہ فلاں، وہ بدل نہیں........؟؟"

تم صرف احمق ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی ہو اور ملک دُشمن۔ اور..

"بھائی مجھے گالی نہ دو، میں اپنے اندر کب کا مر چکا ہوں اب باہر بھی مر جاؤں گا۔"

جب بڑے پیمانے پر آگ لگتی ہے۔

تو وہ اپنے لئے ہوائیں بھی ساتھ لاتی ہے۔ اور تب اپنے ہی سائے میں کھڑے ہوکر ہم کہتے ہیں کہ اندھیرا ہے۔ اگر روشنی تھوڑی دیر بھی ٹھہر جائے تو میں کمال کو خط لکھوں کہ میں جان پلاش پر بھی لکھوں گا، طارق پر بھی اور پرفل پٹیل پر بھی لیکن اس سے پہلے ہی کیمبوڈیا کے کسی نم اور گندے فلور پر بہے ہوئے خون پر کوئی اپنے پاؤں کی انگلیوں سے لفظ IDIOT نہ لکھ دے۔ روشنی اب تک نہیں آئی۔

یہ انداز محبت

(شمیم سیفی)

چیٹرجی جنرل اسٹورز کے سیلز مین نے بکھرے ہوئے سویٹروں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "تو پھر آپ اُون خرید کر کیوں نہیں گھر ہی پر سویٹر بنوا لیتے ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "لیکن مشکل یہ ہے کہ ابا جان کو دفتر کے کاموں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ وہ میرے لئے سویٹر بُن کر بھیج سکیں گے۔"

سیلز مین مسکرا پڑا اور ساتھ ہی دوسرے کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی ایک لڑکی جس کے ہاتھوں میں نارنجی رنگ کے اون کی لچھی تھی مُسکراتے ہوئے تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اور جب وہ دُکان سے باہر نکلنے لگا تو پیچھے سے اس لڑکی نے کہا۔

"آپ بڑے عجیب ہیں۔"

اور اس نے گھوم کر یوں اس کی طرف دیکھا جیسے کوئی عجیب سی بات ہوگئی ہو

"نوازش ہے" وہ جواب میں مسکرایا۔

اور لڑکی کا قہقہہ فضا میں نغمے بکھیر گیا۔

"آیئے! میں آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں۔"

لڑکی نے اپنی ٹوسیٹر ایم۔ جی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس سے کہا۔

"شکریہ! میرا ہا..... سٹل یہاں سے قریب ہے۔"

غزلی!

میں جا رہا ہوں۔ تم میں سے کسی کو خبر کئے بغیر۔ مجھ میں جراٴت نہیں کہ وہ بات

میں خود تمھارے ڈیڈی سے کہہ دوں جسے وہ میرے انکار کا محض ایک بہانہ سمجھ لیں۔ ایک طرف ان کی محبت اور شفقت میرے سامنے آتی ہے اور دوسری طرف ـــــ میں کیا کروں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ـــــ ہمارے معاشرے میں محبت کا بس ایک ہی تصور ہے لوگ محبت کے اور اندازوں کو بھی سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے!

بہرحال! میں جا رہا ہوں۔ تمھارا بنا ہوا سوئٹر میرے ساتھ ہے۔ وہ سوئٹر جس نے تم کو مجھ سے ملا کر ہم دونوں کی زندگی کی ابدی کمی کی تکمیل کر دی تھی۔

لیکن اب حالات ایسے ہو گئے ہیں ...... میرا جلد چلے جانا ہی بہتر ہے تاکہ میں اپنے ابا جان سے بھی اس بات کو ختم کرا سکوں ......

غزلی! مجھے بھولنا نہیں۔

چمن کے سبز مخملی فرش پر ٹہنیوں کا عکس مرتعش تھا۔ الھڑ ہوائیں اپنے دامن کبھی شاخ گل سے اُلجھا لیتیں اور کبھی ڈیلیا اور کبھی کیلنڈولا کے خوبصورت اور رنگین پھولوں کو ہلکے سے چومتی گذر جاتیں۔

وہ زرد گلاب کے کنج میں خاموش لیٹا تھا۔ کوٹ اُتار کر اس نے سر کے نیچے ڈال لیا تھا۔ نائیلن کی ٹائی سینہ سے پھسل کر بغل میں چلی آئی تھی۔ اور اس کے ایک کنارے کو وہ اپنی انگلیوں میں لپیٹے رہا تھا کھول رہا تھا ـــــ ساتھ ہی ساتھ خیالات کی ایک لپٹی اور اُلجھی ڈور اس کی نگاہوں کے سامنے کُھلتی جا رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ افسانوی اتفاق اور ڈرامائی حادثہ بھی کہیں یقین کرنے کی چیز ہیں ـــــ پھر افسانے اور حقیقت کے درمیان کوئی تفاوت ہی کہاں رہ گیا تھا۔

پھر وہ بہت کچھ سوچنے لگا۔ اپنی سبک گام اُمیدوں کے متعلق اپنی تشنہ تمناؤں کی کی سیرابی اور تشنگی کے متعلق ـــــ وہ سوچتا رہا اور اس کے اوپر جھکی شاخ پر لگا ہوا زرد گلاب مسکرا مسکرا کر اس سے کچھ کہتا رہا اور وہ پھول کی بات پر دھیان دیئے بغیر نیلگوں وسعت افلاک کی پہنائی میں کچھ ڈھونڈھتا رہا ـــــ شاید اپنی زندگی کے

دیرینہ خلا کے لئے کوئی شیشہ و مرمر کی نازک اور ٹھوس سی حقیقت ــــــ لیکن زرد گلاب نے پھر دخل اندازی کی۔

"لیکن وہ تمھیں مل گئی ہے۔"

اتنے میں پاس کی چمپا کی ڈالیوں پر بیٹھی ہوئی ایک ننھی سی چڑیا کسی کی آہٹ پاکر چیں چیں کرتی ہوئی فضا میں اُڑ گئی۔

اس نے بھی مُڑ کر ادھر دیکھا۔ چمپا کے اوپر سے کوئی بڑی تیزی سے اس کی طرف آرہا تھا۔

"ہیلو! غز!..... غز..... غز....."

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں بلا کی حیرانی اُمڈ آئی۔

I mean..... آئی..... میں غزالہ کو چاہتی ہوں۔

"آپ؟؟"

اس نے قصداً اس چھوٹے سے لفظ کو بیحد حیرت و استعجاب کے ساتھ ادا کیا۔

لڑکی کا گورا چہرہ شفق گوں ہوگیا۔ وہ رُک رُک کر بولی۔

"غزالہ میری سہیلی ہے۔ میں اسے ہی تلاش کرتے کرتے ادھر آگئی۔"

"اوہ میں سمجھا..... لیکن وہ ابھی....."

ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ غزالہ ہرنی کی طرح دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

"نیلی! میں یہاں ہوں۔"

پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"ارے! ان سے ملیں تم نیلی! یہ ہیں جمال۔ ریسرچ اسکالر۔ اجی! آپ بھی تو کچھ بولئے۔ کم از کم۔ یہی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"وہ خوشی تو ہم دونوں کو کچھ دیر قبل سے ہی ہو رہی ہے۔"

جمال نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر تینوں کے قہقہے فضا میں بکھر گئے۔

"آؤ، ہم چل کر وہاں فوارے کے پاس بیٹھیں۔ دیکھو غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنوں نے فوارے سے چھوٹتی ہوئی پانی کی بوندوں کو زرّیں کر دیا ہے — کتنی پیاری لگ رہی ہیں وہ"۔ غزالہ نے تجویز پیش کی۔

"ہاں چلو ہم وہیں چلیں"۔ جمال نے تائید کی۔" ورنہ اگر ہم وہاں فوراً نہیں پہنچے تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے فوارے کے پاس ہی کھڑا ہوا 'وینس' کا مجسمہ سنہری کرنوں کے تار پر بیٹھ کر کہیں سچ مچ عشق کی نامعلوم دُنیا میں نہ چلا جائے۔

"واہ! جمال بھائی!" غزالہ سوئٹ پی کا ایک ننھا سا خوش رنگ پھول جمال کے کوٹ کے کالر میں لگاتی ہوئی بولی" گریک ٹریجیڈیز (Greek Tragedies) پر تحقیق کرتے کرتے تمہارے شعور کے ہر گوشے میں ایسے ہی قدیم بھوت سما گئے ہیں"۔
نیلوفر چُپ چاپ ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ اور اپنی نیلی نیلی شیشہ کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں سے بھی بہت کچھ سمجھ لینا چاہتی تھی۔

"ہاں: غزلی: بات کچھ ایسی ہی ہے — لیکن ...." وہ نیلوفر کی طرف مخاطب ہوا۔

"آپ تو یوں خاموش ہیں جیسے ..... جیسے۔ کہئے تو میں شاعری کر دوں۔ جیسے بہار کے معصوم شگوفوں نے ابھی مُنھ کھولنا ہی نہیں سیکھا ہو"

نیلی کی آنکھوں کی نیلاہٹ اور گہری ہو گئی اور ایسا معلوم ہوا جیسے ان کی سمجھنے کی صلاحیت بالکل مفقود ہو گئی ہو اور اب وہ کچھ بولنا چاہتی ہوں۔

لیکن ان سے قبل غزالہ بول اُٹھی۔

"ارے ..... رے غضب کر دیا جمال بھائی۔ گر یہ شرما کر سُرخ ہو گئی تو شفق کی اس سُرخ چادر کا رنگ اُڑ جائے گا"۔

"چلو تم نے میری شاعری پر گرہ لگا دی"۔

پھر 'وینس' کے مجسمہ کے قریب بیٹھ کر جمال کی اور نیلی کی ضد پر غزالہ نے فیض کی ایک غزل گائی اور جب وہ دوبارہ اس شعر کو گانے لگی۔

بزمِ خیال میں ترے حُسن کی شمع جل گئی دود کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

تو نیلی نے ایک عجیب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ارے غزلی دیکھو تو 'وینس' کا مجسمہ بھی جھوم اُٹھا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ہائے! یہ نغمہ۔ یہ نازک نغمہ جسے پہلے پہل ساز محبت پر گایا کسی نے"

"ہٹ دیوانی" غزالہ کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

جمال نے جلدی سے بات کا رُخ بدل دیا۔

"میں اب چلوں گا غزالہ۔ ڈیڈی آئیں تو میرا سلام کہدینا"

"لیکن جمال! ڈیڈی نے تو آج تمھیں کھانے پر روکا ہے"

"ہاں جناب! اب ایسی بھی کیا جلدی ہے" نیلی شاید پھر اپنی بات دُہرانا چاہتی تھی۔

"ذرا دیکھئے تو! سانولی شام کے یہ مسکراتے لمحے کسی کے احساس کی نکہت چرا کر خود خوشبو سے بوجھل ہوئے جا رہے ہیں اور یہ نرگس ولالہ کی معنی خیز چشمکیں! آپ انھیں دیکھ رہے ہیں کیا" اور جمال جو اب تک سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے بیٹھا تھا تکلف برطرف کرتے ہوئے اپنی اصلی شکل میں آ گیا۔۔۔ اس نے اپنے نتھنے پھُلا پھُلا کر لمبی سانسیں لیں اِدھر اُدھر دیکھا پھر سر کو جُنبش دیتے ہوئے بولا۔

"اوہوں ـــــ بالکل نہیں! یہاں کوئی اور خوشبو تو نہیں۔ البتہ آپ سے لپٹی ہوئی "مس چیف" کی تیز بو ضرور فضا پر چھائی جا رہی ہے ـــ اور ان آنکھوں میں وہ خود ـــ ہی جھانکتا ہوا بولا۔" ہاں۔ اس صاف وشفاف نیلی جھیل میں کچھ شریر لہریں ضرور بل کھا رہی ہیں"

"چلئے میں نے اپنی شکست مان لی" نیلوفر نے اسی میں اپنی خیر سمجھی۔ پھر وہ غزالہ سے بولی۔

"بیگم صاحبہ! خوب ہیں تمھارے جمال صاحب بھی۔ کہاں مل گئے تمھیں یہ؟"

"جمال بھائی صرف خوب نہیں۔ بہت خوب ہیں۔ ان کا تعارف" ـــــ غزالہ مسکرائی۔

"میں وہ سوئٹر جو ان دنوں بُن رہی ہوں، مکمل کر لوں تو کرادوں گی۔"
جمال نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔" بھائی نیلی صاحبہ! ابی غزالہ کی باتیں یوں ہی الجھی الجھی ہوئی ہیں آپ کب تک سوئٹر کے تیار ہونے کا انتظار کریں گی۔ میں بتاؤں ــــ میں جو ہوں آپ کے سامنے ہوں۔ البتہ غزالہ سے میری ملاقات یوں ہوئی کہ ایک بار میں ....."

"میں بتاؤں نیلی ــــ "غزالہ نے بات اُچک لی۔
"یہ سوئٹر خریدنے گئے تھے اور ان کو بدھو سمجھ کر دُکاندار انھیں مشورے دے رہا تھا کہ جناب! آپ اُون خرید کر گھر پر ہی سوئٹر کیوں نہیں بنوا لیتے ہیں اور یہ مسکین سی صورت بنائے یہ سوچ رہے تھے کہ دُکاندار نے یہ تجویز تو پیش کردی۔ لیکن یہ تو اس نے بتایا ہی نہیں کہ سوئٹر آخر بنوایا کس سے جائے۔"
نیلی نے ٹوکا "عجیب ہیں یہ بھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی بہنوں سے لڑائی رہتی ہے۔ ورنہ انھیں تو یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مانا بہنیں خوشامد کرواتی ہوں گی۔ شرطیں بدواتی ہوں گی۔ لیکن بہن کی خوشامد بھائی نہ کرے تو وہ بھائی کیسا، نہیں تو......"
نیلی اور نہ جانے کیا کیا کہتی کہ بطخوں کا ایک جھنڈ قیں قیں کرتا ہوا ان کے سر پر سے گذر گیا ــــ اور جمال نے دھندلے آسمان میں بطخوں کی قطار پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔
"بات یہ ہے محترمہ کہ (I am the monarch of all the survey)
اور اس کے بعد تو آپ کو یاد ہی ہوگا۔"
اور نیلوفر اور غزالہ دونوں ہی اس کے لہجے کی تبدیلی پر چونک پڑیں۔ غزالہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"خالی آسمان میں کیا ڈھونڈھ رہے ہو۔ وہاں کوئی رہتا تھوڑے ہی ہے ــــ آؤ چلیں ٹھنڈک بڑھ گئی ہے۔

اور پھر نیلی کی طرف بڑھ کر بولی۔

"نیلی ان کے کوئی بھائی بہن نہیں۔ یہ بالکل تنہا ہیں۔" ان کے اور جو رشتہ دار تھے وہ سب پاکستان چلے گئے۔"

"واہ! اس سلسلہ میں تم دونوں یکساں طور پر خوش قسمت ہو۔ تم بھی تو ان جھگڑوں سے آزاد ہو۔" میں نے جواب دیا۔

اور جب سب لوگ مکان کی طرف چل پڑے تو جمال نے اپنا کوٹ اُتار کر غزالہ کے دونوں شانوں پر پہنا دیا۔ اور یوں یکایک بات شروع کر دی جیسے وہ قبل سے ہی بولتا رہا ہو۔

"ہاں نیلی صاحبہ! تو اب آپ ہی بتائیں کہ میرے لئے یہ اہم مسئلہ تھا یا نہیں کہ مجھے آخر سوئٹر کون بُن دے گا ــــ مجھے غیب سے تو کوئی خبر ملی تھی نہیں کہ یہ مس غزالہ جعفری، بی اے اِنرز فائنل صاحبہ! اوہ نہیں نہیں غزالہ صاحبہ ــ جو دوکان میں کھڑی میری اور دوکاندار کی باتیں سُن رہی تھیں، ایک دم سے میرے لئے سوئٹر بننے کو تیار ہو جائیں گی۔"

نیلی اور غزالہ دونوں خاموش تھیں۔ جمال ایک وقفہ کے بعد پھر بولا۔ اب کے اس کی آواز پھر پہلے کی طرح بشاش اور ہلکی تھی۔

"اب نہ جانے کب اس سوئٹر کی تکمیل ہوگی ــــ لیکن اپنی خرابی کی تکمیل تو ہوگئی یہاں ــــ یہ روز روز کی نیلی پیلی ملاقاتیں۔"

نیلی نے اپنی ہنسی میں جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ان دونوں سے اجازت لے کر چلی گئی ــــ اور جمال وغزالہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

پھر ایک روز غزالہ نے نیلوفر کو فون کیا۔

"میری نیلی! دو دنوں سے جمال بھائی نہیں آئے ہیں۔ نہ معلوم وہ کیوں نہیں آئے ــــ چلو گی انھیں ان کے ہاسٹل دیکھنے۔"

اور جب وہ دونوں جمال کے کمرے میں پہنچیں تو بستر پر پڑا ہوا جمال یکایک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے منھ میں تھرمامیٹر دبا رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بے ساختہ بول ہی دیا۔

"ارے ...... تو ...... م"

اور تھرمامیٹر گر کر زمین پر چور ہو گیا۔

جمال کے دوست نے اسے آنکھ ماری۔ اور آہستہ سے اس سے کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"دوست میں نہ کہتا تھا۔

راہ میں فرش دل و دیدہ بچھائے رکھنا
سوئے دل کوئی پئے پُرسشِ غم آئے گا"

"میں تمھیں چانٹا ماروں گا گدھے! —— تمھیں نہیں —— تمھیں نہیں —— تم لوگ بیٹھو تو۔"

"جمال بھائی آپ کی طبیعت خراب تھی تو آپ نے ہمیں خبر کیوں نہ کی۔ جائیے میں آپ سے نہیں بولتی ہوں۔"

"بولو گی کیسے نہیں۔" جمال نے غزالہ کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھا غزالہ کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو اُمڈ آئے تھے۔

"دیکھو نیلی بیمار میں تھا۔ اور بلبلا یہ رہی ہے —— پگلی!" ہلکی سی چپت غزالہ کے سر پر جماتے ہوئے بولا۔

نیلی نے ایک لمبی سانس کھینچی۔

"ہاہ! احساس محبت کا یہ عالم توبہ! —— چوٹ کہاں لگی اور تکلیف ہوئی کہاں"

اور غزالہ نے زبان نکال کر اس کا منھ چڑا دیا۔

"اے"

جمال نے ایک بے ربط سا سوال کیا۔

"نیلی تم نے بلی پالی ہے؟"

"ہوں۔ بالکل۔"

پھر تم نے ضرور دیکھا ہوگا کہ اسے خواب میں کیا نظر آتا ہے۔"

"اجی جائیے۔ میں نے ایسی بلیاں اور بلے بھی دیکھے ہیں جنھیں حج کرنے کا شوق ہوتا ہے۔"

پھر نیلی کی نظر میز پر رکھے ہوئے "گولڈن بف" کے ٹن پر پڑ گئی۔

"یہ کس احمق ڈاکٹر نے آپ کو بخار میں بسکٹ کھانے کی اجازت دے دی ہے۔"

"کم ازکم میں تو تمھیں بسکٹ کھانے کی اجازت دے کر بیوقوفی نہیں کروں گا۔"

لیکن اجازت کی پرواہ کسے تھی۔ اس نے ٹن سے کئی بسکٹ نکال لئے۔

"لو غزلی تم نہیں کھاؤگی۔"

"ارے ہاں!" جمال کو کچھ یاد آگیا۔ پرسوں شام کو مجھے پھر چٹرجی کی دکان پر جانا پڑا۔ میرے دوست سجیدا کو اپنی بہن کے لئے ٹافیوں کا ڈبہ لینا تھا۔ میں سوچنے لگا یہ بہنیں بھی بڑی آفت ہوتی ہیں۔ ان کی فرمائش کے لئے ایک الگ بجٹ چاہیے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ دکاندار نے مجھے ٹوک دیا کہا کہ آپ نہیں لیں گے۔ اب بھلا اس کی بات کیوں کر ٹالی جاتی۔ میں نے بھی خرید لیا۔ ایک ڈبہ۔"

"اوہ جمال بھائی یو آر گریٹ — لائیے مجھے دیجئے۔ ٹافیاں مجھے بہت پسند ہیں ڈیڈی سے جب لانے کو کہتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں، اور....."

"اور خود ٹافیاں خریدتے ہوئے شرم آتی ہے۔" نیلی نے اپنے طور پر جملہ مکمل کر دیا۔ دوسرے روز جب وہ غزالہ کے یہاں پہنچا تو اس کے ڈیڈی اسے دیکھتے ہی بول پڑے۔

"میاں یہ کیا بچپنا ہے۔ تمھاری طبیعت خراب ہوگئی تھی تو تمھیں ہم لوگوں کو خبر کرا دینی تھی۔ یا یہاں چلے آنا تھا۔"

"جی ..... وہ دیکھئے نا!"

"جی ...... وہ ..... کیا۔" وہ بگڑے۔" نہ معلوم کیوں اب تک تمھیں ہم لوگوں سے غیریت معلوم ہوتی ہے۔"

"غیریت" جمال نے احتجاج کیا۔" یہ الزام تو مجھ پر نہ عاید کیجئے۔ مجھے یہاں آپ کے گھر میں ایسا لگتا ہے جیسا ..... جیسا شاید مجھے اپنے گھر میں بھی نہیں لگتا۔ یہاں آتا ہوں تو مجھے وہ سکون ملتا ہے۔ وہ مسرت حاصل ہوتی ہے انکل جس سے شاید میں تازندگی محروم ہی رہتا اگر —"

اتنے میں غزالہ آگئی۔

"ہیلو! جمال بھائی۔ کیسے ہیں آپ؟"

"بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے ہوا ہی کیا تھا۔ معمولی سی تجزیر تھی جو کل جاتی رہی تھی۔"

ڈیڈی آج میں نے جمال بھائی کے لئے خود سے فروٹ پڈنگ بنائی ہے۔ اس رذ نیلی کے یہاں دعوت میں میں نے دیکھا تھا یہ حضرت فروٹ پڈنگ ہی شوق سے کھا رہے تھے۔

"ٹھیک تو اسے چائے کے ساتھ ہی منگوالو۔"

اور غزالہ کچن کی طرف چلی گئی۔

"بیٹے" غزالہ کے ڈیڈی نے سگار کا گوشہ توڑتے ہوئے جمال سے کہا۔

"غزلی کا اگلے ماہ تک فائنل امتحان ختم ہو جائے گا۔ چاہتا ہوں کہ امتحان بعد ہی اس کی شادی کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں۔"

پھر سیاہ موٹے فریم میں لگے ہوئے شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں مسرت سے مسکرائیں۔

"لڑکا بھی میری نظر میں ہے۔"

اور جمال کچھ نہیں بول سکا۔ فرط مسرت سے بات اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی، اتنے میں غزالہ پھر آگئی۔ فروٹ پڈنگ لئے ہوئے جسے اس نے خاص طور پر خود سے اپنے جمال بھائی کے لئے بنایا تھا۔

دوسری شام غزالہ نے جمال کے لئے فروٹ کیک تیار کیا تھا اور وہ ڈرائنگ روم میں آتش دان کے پاس بیٹھی ہاتھ میں کسی شاعر کا دیوان لئے جمال کا انتظار کر رہی تھی۔

اور جمال اس شام شہر کے سب سے بڑے جوہری کی دوکان پر کھڑا ہاتھ کے زیورات خرید رہا تھا۔ لیکن اس قسم کی چیزوں کی پسند میں تجربہ کو بڑا دخل ہے اور اس قسم کا تجربہ تو اسے سرے سے تھا ہی نہیں۔ اور وہ اسی لئے بار بار دُکان میں کھڑے ہوئے لوگوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ شائد کسی کو اپنی مدد کے لئے منتخب کر سکے۔ اور یہ اس کی قسمت تھی یا اتفاق کہ نیلوفر اسی لمحہ اس دُکان میں داخل ہوئی اور جمال اسے دیکھتے ہی بے ساختہ اس کی طرف لپکا۔

"نیلی"

لیکن سب سے پہلے نیلی نے اس کا تعارُف اپنے ابا جان سے کرا دینا ضروری سمجھا۔

"ابّی! یہ ہیں جمال صاحب! میری ان سے ملاقات غزالہ کے یہاں ہوئی تھی۔"

"آداب بجا لاتا ہوں — نیلی ایک بات سُنو۔

اور وہ اسے تنہا ہی اس کاؤنٹر پر لے گیا جہاں وہ زیورات دیکھ رہا تھا۔

بتاؤ! غزلی کے لئے اس میں سے کون ٹھیک رہے گا۔"

نیلی تھوڑی دیر تک تو حیرت سے اس کا مُنھ دیکھتی رہ گئی لیکن جب جمال کی نگاہوں نے اس کی آنکھوں سے دریافت کیا کہ کیوں کیا دیکھ رہی ہو۔ تو اس نے جلدی سے ان کو زیورات کی طرف پھیر لیا۔

"یہ اچھا..... نہیں نہیں۔ غزلی کی نازک سی کلائی کے لئے یہ بہت ہی مناسب رہے گا۔"

اور دوسرے دن غزالہ کے یہاں اس سے قبل کہ کوئی اور بات ہو۔ غزالہ نے جمال کے آتے ہی یہ سوال کر دیا۔

”لائیے۔ دیکھوں تو کیا چیز خریدی ہے آپ نے میرے لئے۔“
جمال مسکرایا۔
”اوہ تو یہ نیلی نے خبر کر دی ہے تمھیں۔ ٹھیک ہے وہ تمھارے لئے ہی ہے لیکن وہ ابھی تمھیں دیکھنے کو نہیں ملے گی، وہ تو میرا روپیہ آ گیا تھا اسی لئے میں نے کل ہی خرید ڈالا۔ تم امتحان ختم کر لو پھر اس کا موقع آ ہی جائے گا۔
”اوہ تو یہ ڈیڈی نے خبر کر دی ہے آپ کو۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔ پھر شرما کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔
اور جمال کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔
”خدایا تو نے جس جنت سے محروم رکھا تھا وہ مل ہی گئی مجھے آخر۔ انسان کیونکر جی سکتا ہے اس معصوم محبت کے بغیر۔“
”آپ کو صاحب یاد کر رہے ہیں۔“
”مجھے اُس نے چونک کر غزالہ کی طرف دیکھا اور جلدی سے غزالہ کے ڈیڈی کے مطالعہ کے کمرے کی طرف چلا گیا۔
”آؤ۔ آؤ بیٹے! وہ بڑے پیار سے بولے۔ میں تمھارے والد کو خط لکھ رہا ہوں لیکن اس سے قبل میں نے سوچا تم سے پوچھ ہی ڈالوں کہ تمھیں اس شادی سے کوئی اعتراض تو نہیں۔“
” پھر وہ مسکرائے۔“ ویسے تم سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی ہے۔
”جی۔“ جمال نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔
”اجی میاں! میں تمھاری اور غزالہ کی شادی کے متعلق باتیں کر رہا ہوں۔ وہ سگار کا سیاہ سیاہ دھواں منہ سے نکلتے ہوئے بولے۔ مسکراہٹ ان کے لبوں سے مستقل چھٹی ہوئی تھی۔
”جی ..... میں ...... وہ ......“
”ہا ہا“ وہ بڑے زوروں سے ہنسے۔ ”ہنستے ہو تم لوگ بیسویں صدی کے نوجوان

بڑے آزاد خیال لیکن ان معاملوں میں بس پُرانی صدیوں کے لوگوں کی حرکتیں شروع کر دیتے ہو۔ وہ جو ہے غزلی! میں نے اس سے صرف یہ کہا کہ بیٹی! امتحان بعد تیری شادی کر دینا چاہتا ہوں اور جو تب سے میری نظروں کے سامنے سے بھاگی ہے تو آج تک مجھ سے چھپی پھرتی ہے۔

انھوں نے بات ختم کی تو جمال نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں...... میں......"

"بس بس! زیادہ بہادری مت دکھایئے۔ میں۔ میں کے سوا اور کیا نکلے گا آپ کے مُنھ سے۔" انھوں نے پھر اپنی بات شروع کر دی۔

"جایئے! جا کر غزلی کے ساتھ تتلیاں پکڑیئے۔ میں جج صاحب کو خط لکھ رہا ہوں وہ بس ایک دو روز میں آجائیں گے۔ یا میں خود وہاں چلا جاؤں گا۔ تو ہم بوڑھوں کی رسمی گفتگو بھی طے پا جائے گی۔

اس کی ہمّت نہیں پڑی کہ ان سے کچھ کہہ سکے۔ نہ جانے وہ اس کا مطلب کیا نکالیں۔ اس لئے وہ وہاں سے سیدھے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پھر اس نے غزالہ کے ڈیڈی کو ایک خط لکھنا چاہا لیکن لیٹر پیڈ کے نہ جانے کتنے صفحے اس کوشش میں برباد ہوئے۔ اور جب وہ انھیں خط لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے غزالہ کو ایک خط لکھا اور اس خط کو غزالہ کے یہاں بھجوا کر خود رات کی گاڑی سے گھر کے لئے روانہ ہو گیا

نیلی کو چمن میں غزالہ وینس کے مجسمہ کے قریب بہت ہی اُداس بیٹھی ہوئی ملی۔

"یہ کیا غزلی؟"

"جمال بھائی یہاں سے چلے گئے۔"

"کیوں آخر؟"

"ڈیڈی سے کل ان کی گفتگو ہوئی تھی۔"

"ہاں ہاں! تو کیا انکل نے کوئی اور بات سوچ لی ہے کیا۔ حالانکہ انھوں نے خود تم دونوں کو قریب دیکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ تمھیں ہمیشہ کے لئے ان سے قریب کر دیا جائے۔ پھر یہ کیا۔۔۔ ٹھہرو! میں ابھی جاکر پوچھتی ہوں انکل سے۔

"نیلی" غزالہ نے دوڑ کر اسے تھام لیا اور اس کے شانوں پہ سر رکھ کر سسک پڑی۔

"سمجھتی کیوں نہیں۔۔۔ تم لوگ مجھ سے میرا بھائی چھیننے پر کیوں تلی ہوئی ہو آخر۔۔۔"

اور نیلی کی نیلی آنکھیں اپنی نافہمی پر حیرت سے سفید ہوگئیں۔
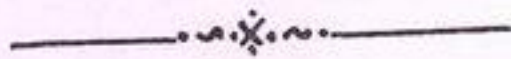
درد کا رشتہ

(از معین شاہد)

پورب سے پچھم اور پچھم سے پورب جانے والی شاہراہ کے ٹھیک اُتر میں، سڑک سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹی سی پہاڑی، لُٹے پٹے قافلہ کی طرح، اپنے ارد گرد سے چٹانیں اور پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے سمیٹے ابھی تک کھڑی ہے۔ اس انتظار میں کہ شاید کوئی نیا انسان آئے اور ان بکھرے ہوئے سنگریزوں اور چٹانوں کو تہذیب کا احرام پہنائے اور کلیساؤں اور مندروں میں انھیں سجادے۔ ان سے کوئی بدھ، کوئی شیو، کوئی پاروتی یا کوئی مصلوب مسیحا تراشے۔ لیکن یہ پہاڑی صدیوں سے یوں ہی کھڑی ہے۔ کسی عظیم فن کار کے کھُردرے ہاتھ کی تلاش و جستجو میں۔ اس پہاڑی پر ایک بڑی سی چٹان معلّق یوں کھڑی ہے جیسے کسی نے اسے پہاڑی پر کسی کیل سے ٹھونک دیا ہو۔ یہ چٹان۔ مانو کہ دھرتی کا کوئی بڑا سا گھاؤ ہو جس کی ٹیس، ٹپک، درد سے پوری پہاڑی کا جسم لرز رہا ہو۔ اور اب یہ گھاؤ پھوٹنا ہی چاہتا ہو۔ صدیوں سے دھرتی کا یہ گھاؤ پہاڑی کے جسم پر شعلہ سا بن کر لہک رہا ہے۔ آج تک اس پر کوئی نشتر نہیں لگا پایا۔ کوئی ایسا انسان ادھر سے نہیں گذرا جو اس چٹان کو اس پہاڑی پر سے لڑھکا دے اور پہاڑی کے جسم کا بوجھ ہلکا کر دے۔ پہاڑی کے پیچھے یہ دھرتی ہے کہ درد کی شدت سے اپنے جی کو مسوسے جا رہی ہے اور یہ پہاڑی ہے کہ اس گھاؤ کی سوزش سے نہ پہلو بدل سکتی ہے اور نہ ٹھیک سے سانس لے سکتی ہے۔

اس عام شاہراہ سے انسانوں کے ہزاروں قافلے آئے اور گذر گئے لیکن ان میں کوئی بھی فرہاد نہیں تھا جو اپنے تیشہ کی ضرب سے اس چٹان کی رگوں سے کوئی نہر نکالتا۔ کوئی ایسا آذر، کوئی ایسا بُت تراش نہیں آیا جو اس چٹان کو تراش خراش

کر کے ایلورا اور اجنتا کے غاروں میں سجاتا۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں ہے جو اس چٹان کے دُکھ کو پہچانے۔ اس چھوٹی سی پہاڑی کے کرب کو جانے۔

چٹان تنہا ہے۔

اس کا کرب اور درد بھی تنہا ہے۔

کوئی اس کرب اور درد کو بانٹنے والا نہیں۔

چٹان کی کربناکی، اس کی بے زبانی اور اس کے اتھاہ غم کا شریک شاید وہ سورج کا بڑا سا گولا نظر آ رہا ہے جو آہستہ آہستہ زرد رُو ہو کر مضمحل، ہراساں اور پریشان اس چٹان کے درد کو اپنے اندر سمیٹتا ہوا مغرب کے گھنے جنگل میں ڈوب رہا ہے۔ سورج ایک دوسرا پتھر ہے جو آسمان کے ڈھلوان پر لڑھک رہا ہے۔ اس زمین اور آسمان میں کوئی فرق بھی تو دکھائی نہیں دیتا۔ دونوں ہی بوجھ سے دبے ہوئے ہیں اور دونوں کی سانسیں اب اُکھڑ رہی ہیں۔ جنگل، سورج، پتھر، چٹان زمین اور آسمان یہ سب کے سب اپنی بے زبانی اور اپنی خموشی کی صلیب پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے گونگے رشتے آپس میں بڑے ہی گہرے ہیں۔ جو انسانوں کی گرفت میں نہیں آسکتے۔ ان کا درد ایک دوسرے سے جُڑا ہوا ہے۔ ان میں درد کا رشتہ ازل سے ہی ہے اور یہ رشتہ ابد تک جائے گا۔

سورج اب ڈوب چلا ہے اور میں گھنے جنگل اور پتھر کے بیچ ایک نقطۂ موہوم کی طرح کھڑا ہوں اور میری مٹھی میں وقت ہے جو تھم نہیں رہا ہے۔ سورج زیادہ لہو لہان ہو رہا ہے کہ وہ اپنے دن بھر کے ساتھی سے جُدا ہو رہا ہے اور اپنے پیچھے رات کی سیاہی چھوڑے جا رہا ہے۔ پتھر سورج کو آواز دے رہا ہے۔ مگر وہ ایک لمحہ کے لئے مُڑ کر دیکھتا بھی نہیں، رُکتا بھی نہیں ـــ اور تب میں گھنے جنگل کے کانٹوں سے لہو لہان ہو کر واپس آجاتا ہوں اور میرے سامنے وہ چٹان ہے جس کے پاس ایک پُرانی کہانی پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے۔

"گھنے جنگل کے کانٹوں سے ہو کر

لہو لہان گذرا جب میں

دیکھا ایک پتھر

جس کے پاس ایک کہانی تھی پرانی۔ (ڈاکٹر نر بدیشور پرشاد)

چٹان کی یہی پرانی کہانی، درد کی کہانی وہ ایک لڑکی بھی کہہ رہی ہے جو اس پہاڑی کے دامن میں لگے ہوئے "بدھوا ہاٹ" میں آئی ہے۔ جس کے پاس ایک بڑی سی بکری ہے اور اس بکری کے دو بچے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک بارہ برس کا لڑکا بھی ہے شاید بھائی ہوگا۔ وہ ایک لال سلک کی ساڑی میں ملبوس ہے۔ جس پر سیکڑوں شکنیں پڑی ہوئی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے کئی سالوں کے بعد اس ساڑی کو پہنا ہے۔ ساڑی سے اس کے لال تہ بند کا گندہ، مٹیالا کونا جھانک کر اس کے غربت وافلاس کی چغلی کھا رہا ہے۔ اس کے پاؤں گرد سے اَٹے ہوئے ہیں۔ ویسے وہ پاؤں میں ایک نہایت ہی بوسیدہ چپل پہنے ہوئی ہے جس کے تسمے کئی جگہ سے ٹوٹ چکے ہیں اور جن کو رنگ برنگ دھاگوں سے جوڑنے کی ناکام، حسرت زدہ کوشش کی گئی ہے۔ نہایت ہی پاکیزہ سا چہرہ، بھولا بھالا سا، جس پر دم توڑتی ہوئی آرزوؤں کے نہ جانے کتنے چراغ جھلملا رہے ہیں۔ جس پر گرد کا ایک فانوس سا پڑا ہوا ہے۔ وہ خاموش ہے مگر اس کی یہی خاموشی اور یہی بے زبانی اس کی زندگی کے ارمانوں، حسرتوں، خوشیوں، غموں، ناکامیوں، کامیابیوں کی وہ داستان مجھ سے کہہ رہی ہے جسے وہ کہنا بھی چاہتی تو نہ کہہ پاتی۔

وہ ایک بے نام سی لڑکی کتنے ناموں سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اس کا نام بیک وقت نجمہ، راشدہ، کامنا، آشا، سریتا ہے۔ اور وہ بیک وقت ہندستان کے کئی گاؤں، کئی قصبوں، اور کئی وادیوں سے آئی ہے۔

وہ اپنے آنچل کے ایک کونے کو بار بار اپنے انگوٹھے میں لپیٹ رہی ہے۔ لپیٹتی ہے اور پھر کھولتی ہے۔ جیسے زندگی کے عقدے کو سلجھا رہی ہو، اُلجھا رہی ہو، عقدہ کشائی کا یہ عمل جاری ہے اور یہ عمل اس کی ناکام زندگی کی غمازی کر رہا ہے اس کی پوری زندگی کچھ پانے کی جستجو ہی میں گذری ہے۔ افسوس اور ندامت کے سوا اب اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اس کی زندگی اب تک ایک کورا کاغذ ہی تو ہے کہ جس پر سیاہی

کی ایک بوند بھی نہ ٹپکی آج تک۔

اس کی شادی ہو چکی ہے۔ کیونکہ اس کی مانگ میں سیندور ہے۔ اور اس کی ناک میں سیپ اور موتیوں کی ایک نتھ بھی پڑی ہوئی ہے۔ اس کا شوہر عید میں اس کے گھر آنے والا ہے۔ لیکن اس کے آنگن کی مہندی کی وہ شاخیں بھی سوکھی پڑی ہیں۔ جن کی چھاؤں میں اس کے ہاتھوں میں مہندی لگائی گئی تھی اور اس کے بدن میں اُبٹن لگایا گیا تھا اور تب اُس کا بدن سونے کی طرح ڈک ڈک، پیلا ہو گیا تھا۔ اب تو اس کے کھیت سوکھے پڑے ہیں۔ ان میں دراڑیں سی پڑ گئی ہیں۔ آج اس کے گھر میں اتنا بھی نہیں کہ وہ اپنے ہلواہے بوڑھے باپ کے لئے ایک بانس سورج چڑھے، اُبلا ہوا ساگ اور مڑوا مکئی کی روٹی ہی کھیت پر لے جاسکے۔ اور یا پن پیہار کے لئے ایک گھونٹ مٹھے کا پیالہ ہی اس کے سامنے رکھ سکے۔

عید کا چاند اب کے ہاٹ کے بعد منگل کے روز دکھائی دے گا۔ اس کے پاس یہی بکری اور اس کے دو بچے رہ گئے ہیں جنھیں وہ بدھوا ہاٹ میں بیچنے آئی ہے۔ اس بکری اور اس کے دو بچوں کے سہارے اس نے کتنے ہی سہانے خوابوں کے تانے بانے بُنے ہیں۔ اس نے اپنی تمنّاؤں کی سیج سجائی ہے۔

اب اس کی بکری اور اس کے دو بچے پچاس روپے میں بک گئے ہیں۔ وہ ان روپیوں کو آنچل کے اس کونے میں بڑی احتیاط سے باندھ رہی ہے جیسے وہ بار بار اپنے انگوٹھے میں لپیٹ رہی تھی۔ اس کی آرزوئیں اور اس کے خواب اس کے آنچل کے ایک کونے میں گویا سمٹ کر اور بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ پچاس روپے اور زندگی کا یہ طویل سفر۔ اس حقیقت کو یہی چٹان جانتی ہے جو اس کے درد کی شریک ہے۔

جنگل، پتھر، سورج، چٹان اور اس لڑکی میں جو رشتہ ہے وہ درد کا ہے۔ وہ اپنا درد لئے اب بھی چُپ چاپ ہے۔ اس کے خوابوں کے آئینہ خانے میں اس کی چھوٹی موٹی خواہشوں کی تتلیاں اُڑتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ جنھیں وہ پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔

''وہ'' کا درد میں جانتا ہوں اور ''میں'' کا درد وہ جانتی ہے۔ صرف وہ۔ میں اور وہ کے دائرے کے اندر ہی سب دائرے بنتے ہیں۔ اس دائرہ کے باہر کوئی دائرہ نہیں بنتا۔

میں ان تمام دائروں کو اپنے وجود کے دائرہ کے اندر سمیٹے اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ رات اندھیری ہے۔ سیاہ، کالی۔ پتھر، چٹان اور پہاڑی بھی سیاہ ہیں۔ لیکن جب یہ پہاڑی رات کی سیاہی کے زہر کو قطرہ قطرہ اپنے اندر پوری طرح تحلیل کرے گی تو آج نہیں تو کل کسی رات، کسی پہر، چاند ضرور نکل آئے گا۔ اور اپنی دودھ جیسی سفید چاندنی میں اس پہاڑی کی سیاہی کو دھو ڈالے گا۔ نکھار دے گا۔ سفید موتیا، چنبیلی اور جوہی کے پھول بھی تو کبھی کبھی سنگلاخ زمین پر اُگ جاتے ہیں۔ وہ لڑکی بھی تو اپنی زندگی کے پتھر پر پھول کھلا رہی ہے۔ اور جی رہی ہے نا —— ایسی ہی چاندنی اس بے زبان، گونگے درد کے رشتوں والی لڑکی کی زندگی میں بھی تو چھٹکے گی اس کے درد کا زہر بھی تو کوئی پیئے گا۔ اسی انتظار میں وہ چٹان بھی ہے اور وہ لڑکی بھی۔

وہ وقت آنے والا ہے۔

وہ وقت آئے گا۔

مسز جوّن

(ش اختر)

چیٹرجی کمپاؤنڈ میں مسز جون کے علاوہ کوئی دوسری چیز اب قابل دید نہ تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں البتّہ یہ جگہ بہت پُراسرار اور مشہور تھی۔ دور تک پھیلے ہوئے اس کمپاؤنڈ میں ایک بہت اچھا سا خوش نما باغ بھی تھا مگر وہ ایک بات جو اس وقت تھی، اب کہاں۔ کمپاؤنڈ کے وسط میں ایک لال عمارت تھی جس میں ایک بڑا ہال تھا۔ جہاں ملکہ ایلزبیتھ سے حضرت عیسیٰ تک کی تصویریں، خوبصورت فریموں میں آویزاں تھیں۔ عمارت کے ٹھیک سامنے مثلث نما۔ احاطے میں گلاب اور گُلِ داؤدی کے چھوٹے چھوٹے پودے سرو کے نازک اندام درختوں کے درمیان بہت اچھے لگتے۔ اس احاطے میں ایک فوّارہ بھی تھا۔ فوارہ کے چاروں طرف بجلی کے بلب جلتے بجھتے رہتے اور فوارہ کی ویل اس طرح رقص کرتی کہ ایک حسین سی عورت کی شکل بن جاتی لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مریم کی تصویر تھی، جسے ایک اطالوی سپاہی نے بنایا تھا۔ لیکن مسز جون کا کہنا تھا کہ وہ اس کمپاؤنڈ کے مالک فادر چیٹرجی کی آخری حسین لڑکی تھی جس سے اطالوی سپاہی کو عشق ہوگیا تھا۔ چونکہ عام لوگوں کا گذارہ یہاں ممکن نہ تھا اور مسز جون اس وقت بھی اس کمپاؤنڈ کے فوجی بیرک میں رہا کرتی تھیں اس لئے ان کی باتوں کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور فادر چیٹرجی زندہ تھے۔ چیٹرجی کمپاؤنڈ تو اب بھی باقی ہے۔ مگر اب چیٹرجی کمپاؤنڈ میں مسز جون کے علاوہ کوئی دوسری چیز قابل دید نہ تھی۔

مسز جون میری پڑوسن تھیں۔ اس پورے کمپاؤنڈ میں ایسی طرح دار عورت کوئی نہ تھی بڑے ڈیل ڈول کی دراز فربہ اندام عورت تھی۔ قد، صحت اور شکل وصورت کی باہمی

مناسبت سے ایسی عورتیں کم پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی ہر چیز نرالی تھی۔ چلتی تو ایسا لگتا جیسے مکنا ہاتھی چل رہا ہے۔ خصوصاً جب وہ ساری کمر کے گرد باندھ کر پانی بھرنے لگتی تو میں اپنی کھڑکی سے اُسے ضرور جھانکتا۔ ایسی بھری بھری جل تھل عورت میں نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ اپنی کمسن بچیوں کو اکثر اس بے دردی سے پیٹتی کہ مجھے غصہ آجاتا۔ مگر مجھ میں بولنے کی ہمت نہ تھی اس کا ڈیل ڈول جیسا تھا اس کی زبان بھی ویسی ہی تھی کمپاؤنڈ میں کوئی نل نہ تھا۔ پانی لانے کے لئے اُسے اکثر گنگو ٹولی کی نکڑ پر جانا پڑتا۔ نل پر خواہ کتنی ہی بھیڑ رہے اس کا گھڑا سب سے پہلے بھر دیا جاتا اور وہ مزے سے فاتحانہ انداز میں جھومتی ہوئی گھڑا لے کر چلی آتی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھے اس کا رعب کمپاؤنڈ میں سب پر غالب تھا۔ کبھی کوئی جملہ کستا بھی، تو اتنا آہستہ کہ خود اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہ سُن پاتا۔ مسز جون کی راما کے علاوہ تمام لوگوں سے دوستی تھی۔ اس میں مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی اور کرسچین بھی تھے۔ کمپاؤنڈ کی سبھی عورتیں اس کی بہادری، چرب زبانی علم اور عقل کی قائل ہو چکی تھیں۔ کسی کو لڑکا ہوتا تو نرس تک کو بلانے کی روادار نہ ہوتی تھی کسی کی طبیعت خراب ہو جاتی تو اس کی صحت یابی کی ذمہ داریاں اس کے سر تھیں، ایک دن ایک نئی تویلی کرایہ دارن کے پیچھے محلہ کا ایک لوفر لگ گیا۔ بہت دنوں تک تو وہ بے چاری برداشت کرتی رہی لیکن جب نوبت آنکھ ماریوں سے "کنکریا مارنے" تک کی آگئی تو اس نے مسز جون سے تمام باتیں کہہ دیں۔ بس پھر کیا تھا، کمپاؤنڈ میں ایک دلچسپ قیامت نازل ہوگئی۔ لوفر کو بلا کر مسز جون نے اسے ننگا کر دیا اور پھر اس قدر پیٹا کہ غریب ساری ہیکڑی بھول گیا۔

میں نیا نیا آیا تھا۔ وہ میری پڑوسن ضرور تھیں۔ مگر ابھی تک صاحب سلامت نہ تھی ایک دن حسب دستور وہ اپنی بچیوں کو بے دردی سے پیٹ رہی تھی، مجھ سے زیادہ دیر تک نہ دیکھا گیا۔

"آپ اسے کیوں مار رہی ہیں، ننھی سی جان ہے" میں ہمت کر کے بول ہی پڑا۔

"کچھ نہیں برادر، بہت پاجی ہو گئی ہے۔"

میری آنکھیں روتی ہوئی بچی سے ہٹ کر اس کے بھرپور جسم پر ٹھہر گئیں۔ اس کا سینہ

کھولتے ہوئے دودھ کی طرح بار بار اُبلا آرہا تھا۔ مجھ سے زیادہ دیر تک نہ دیکھا گیا مجھے واپس لوٹتے دیکھ کر اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ پُر تپاک لہجہ میں بولی۔

"کہاں چلے برادر .... ایک کپ ٹی تو پیتے جائیے" یہ کہتی ہوئی وہ میرا ہاتھ پکڑے زبردستی مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ کمرہ بہت بوسیدہ اور سیلا ہوا تھا۔ مگر ہر چیز سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی۔ کیلنڈر بے شمار تھے۔ علاوہ ازیں باقی جگہوں پر حضرت عیسیٰؑ اور صلیب کی کئی کاغذی شکلیں بھی چسپاں تھیں۔

"آپ اخبار میں کام کرتے ہیں نا" مسز جون اب میرے سامنے پالتی مارے بیٹھی تھیں۔

"جی ہاں"

"اور آپ کہانیاں بھی لکھتے ہیں"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا"

"میں سب خبر رکھتی ہوں برد ر۔ میں چلتی پھرتی انفارمیشن بیورو ہوں ...."

"خوب! تو آپ مجھے بہت دنوں سے جانتی ہیں"

جواب میں انھوں نے ایک بڑا مردانہ وار قہقہہ لگایا۔

اس مختصر سی ملاقات کے بعد وہ مجھے "بردر" کہنے لگی اور مجھے بھی اسے سسٹر مان لینے میں اپنی جان بخشی دکھائی دی۔

کمپاؤنڈ میں صرف راما ہی ایسا آدمی تھا جس کی مسز جون سے نہ بنتی تھی۔ مسز جون اس کی بہت شکایتیں کیا کرتی تھیں اور وہ بھی اسے گالیاں دیا کرتا۔ راما مجھ سے اکثر کہتا "ذرا ہوشیار رہیے گا، بڑی مردمار عورت ہے، پھنسانے میں ماہر ہے" مجھے اس کی باتوں سے تکلیف ہوتی تھی۔ مسز جون میرے لئے اس وقت تک بہت ایماندار، صاف گو اور محنتی عورت تھیں بیماری میں انھوں نے میری بڑی خدمت کی تھی۔ لیکن مسٹر جون اس کے بالکل برعکس تھے۔ خاموش منحنی سے آدمی جنھیں دیکھ کر مجھے مسز جون کی بے بسی پر رحم آجاتا۔ کبھی کبھی مسز جون شوہر کی شکایت کرنے سے بھی نہ چوکتیں ایک روز دونوں میں جھگڑا ہوا اور مسٹر جون بغیر کھانا کھائے آفس چلے گئے۔ ان کی روانگی کے بعد میں مسز جون

کے کمرے میں گیا۔

"یہ آج آپ لوگوں میں لڑائی کیوں ہوگئی، آج تو پہلی تاریخ ہے اور عموماً پہلی تاریخ کو میاں بیوی میں صلح ہوجاتی ہے۔"

"کچھ نہیں برادر۔ اپنے کو لاٹ صاحب سمجھتا ہے۔ ستر روپیہ کیا کماتا ہے۔ جیٹ دکھاتا ہے۔ مجھے مارنے کو ہاتھ اُٹھایا تھا۔ میں نے بھی وہ لتاڑ ماری کہ بس یاد کرے گا۔ سوکھا بانس ہے، مگر پھٹائی کتنی کرتا ہے ....."

میں یہ سُن کر حیرت زدہ ہوگیا۔

"آخر لڑائی کس بات پر ہوئی؟"

"کہتا ہے تم دوسرے مَردوں سے ہنسی مذاق کیوں کرتی ہو؟ بھلا بتایئے برادر، ہنسی مذاق نہ کروں، تو زندہ کیسے رہوں۔ بھلا بات کرنے سے کہیں عزّت چلی جاتی ہے؟"

یہ باتیں وہ مجھ سے یوں کر رہی تھی جیسے مسٹر جون سے اس کا کوئی رشتہ نہ ہو۔

میں کافی دیر تک اس کی مہمل باتیں سُنتا رہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ عجیب عورت ہے، شوہر کو مارتی ہے، پڑوسیوں کی رات بھر سیوا کرتی ہے۔ کمزور عورتوں کی خاطر اپنی عزّت خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ غرض میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

دفتر میں بھی یہی سب سوچتا رہا اور جب شام ہوگئی اور میں اپنے کمرے میں واپس لوٹا تو مسز جون اور مسٹر جون کا زوردار قہقہہ سُنائی دیا۔ میں چونک پڑا۔ عجیب لوگ ہیں میری آہٹ سُنتے ہی دونوں نے جھانک کر دیکھا اور پھر حسب دستور چائے کی پیالی لئے ہوئے مسز جون حاضر ہوگئیں۔

"اب تو آپ بہت خوش ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صلح ہوگئی۔"

"جانتے ہیں برادر۔ سَو بار کان پکڑوا کر اُٹھا بیٹھی کروایا ہے۔"

"اچھا کیا سسٹر۔ یہ مرد لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔" مجھے اپنی جان عزیز تھی اس لئے حامی بھرنا ضروری تھا۔

"کیا کروں برادر، کسی سے بات کرنے میں کیا لطف ملتا ہے۔ گر دوستی نہ رکھوں

تو اچھے بُرے میں کون کام آئے گا۔ پھر میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں، مگر اپنا ڈیفیٹ برداشت نہیں کرسکتی؟

"بالکل مسٹر۔ اپنی ڈیفیٹ کبھی برداشت نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے یہ بات دُہرائی۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے کئی دنوں بعد میں اخبار کا کام کرتے کرتے تھک گیا تو سوچا مسز جون سے ایک پیالی چائے مانگوں۔ اس کے کمرے میں گیا تو نیلو اور شاہینہ رو رہی تھیں اور مسز جون چُپ چاپ، گُم سُم نیم برہنہ چوکی پر لیٹی تھیں، مجھے دیکھتے ہی فوراً اپنے نیم عُریاں جسم پر پھٹی ہوئی رضائی ڈال لی۔

"سوری" میں پچھلے پاؤں واپس لوٹنے لگا۔

"ارے آیئے بردر۔ آپ سے کیا پردہ" مسکراتی ہوئی شوخ لہجہ میں مسز جون بولیں۔

"کیا بات ہے نیلو؟ تو کیوں رو رہی ہے"، میں نے اس کی چھوٹی بچی کو بلکتا دیکھ کر پوچھا۔ میں منتظر تھا کہ مسز جون اُٹھ کر بیٹھیں تو میں چائے کے لئے کہوں، لیکن وہ برساتی گرمی میں بھی ویسے ہی رضائی جسم پر ڈالے لیٹی رہیں۔

آپ سے کیا چھپاؤں بردر، کل رات سے کچھ نہیں پکا ہے۔ بھلا ستر روپیہ میں کیا ہوتا ہے" بولتے وقت اس کی آواز سُست ہوگئی تھی "میں کہیں باہر بھی نکل نہیں سکتی۔ ساری پھٹ کر اتنی چھوٹی ہوگئی ہے کہ سر چھپاتی ہوں تو پیر نکلتا ہے اور پیر چھپاتی ہوں، تو ناڈیا بن جاتی ہوں۔" بولتے بولتے ہنس پڑی۔

میں نے ہکلاتی ہوئی آواز میں کہا "میرے پاس دس روپے ہیں، اگر آپ کے کام آگئے تو مسرت ہوگی۔

مسز جون کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے ویسے ہی لیٹے لیٹے اپنی ہتھیلی بڑھادی۔ بچیاں میرے پاس کھڑی تھیں۔ میں چاہتا تو وہ روپیہ انھیں بھی دے سکتا تھا لیکن میرے قدم غیرارادی طور پر ان کے پاس پہنچ گئے۔ اب رضائی سرک کر سینہ سے کچھ نیچے آگئی تھی میں جلتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ یکایک پھر وہ چِت لیٹ گئیں۔

میں نے جلدی سے نوٹ ان کی ہتھیلی پر رکھا اور دوڑ کر اپنے کمرے میں بھاگ آیا۔ کتنی دیر تک میری سانس تیز چلتی رہی کہہ نہیں سکتا۔ البتہ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا ایک میلی سی چادر میں سمٹی سمٹائی مسز جون چائے کی پیالی لئے کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ مریم کی طرح معصوم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب نہ وہ گرمی تھی نہ وہ مقناطیسی کشش، جو کچھ دیر پہلے مجھے ان کے کمرے میں نظر آئی تھی اب ان کے لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"لیجئے برادر، چائے پیجئے۔" مجھے ان کے لہجے میں وہی پرانی شفقت ملی۔ "میں آپ کی بہت تھینک فل ہوں۔ پہلی تاریخ ہی کو لوٹا دوں گی۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی، کیا یہ وہی عورت تھی جو تھوڑی دیر پہلے آگ کا گولہ بنی ہوئی تھی!

کئی بار پہلی تاریخ آئی اور چلی گئی۔ مگر نہ مسز جون نے کبھی روپے لوٹائے اور نہ کبھی اس کا ذکر ہی کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس طرح کا لین دین ہی نہ ہوا تھا۔ یہ بھی ان کے کردار کی غالباً ایک خصوصیت تھی۔ لہٰذا میں نے بھی یہ خیال دماغ سے نکال دیا کہ روپے انھیں بطور قرض دیئے گئے تھے۔ ان کا پھول کی طرح کھلا ہوا چہرہ مجھے بہت اچھا لگتا۔ ایک دن میں نے مذاقاً کہا بھی!

"آپ تو بالکل گیتا بالی لگتی ہیں سسٹر!"

اس کا چہرہ سورج مکھی کی طرح کھل گیا اور وہ چہکنے لگی۔

"کیا کہوں برادر! لک ہی خراب تھا۔ ورنہ اس وقت کہیں اور ہوتی۔"

"آپ نے کبھی محبت کی ہے سسٹر؟" میں نے راکھ کے ڈھیر میں ہلکی سی چنگاری تلاش کی۔

"محبت کی نہیں جاتی برادر، ہو جاتی ہے۔" وہ بالکل فلمی انداز میں بولیں۔ پھر مسز جون نے اپنی محبت کی تین چار چھوٹی بڑی کہانیاں سنائیں۔ ان کے ہیرو دوسری جنگ عظیم کے افریقی سپاہی تھے۔ یوں تو روز ہی وہ دیکھنے کے قابل تھیں۔ لیکن اتوار کی صبح کو جب وہ گرجا جانے لگتیں تو بس دیکھنے کی چیز ہوتیں۔ نہا دھو کر گل چینی کے پھول بالوں میں اُڑس لیتیں، پھر اپنے چھوٹے سے قافلہ کے ساتھ اس طرح چلتیں کہ آگے آگے وہ، اس کے پیچھے اس کی دونوں

لڑکیاں اور سب سے آخر میں مسٹر جون۔

گنگو ٹولی کی ہر لڑکی کے بارے میں مسز جون کو جتنی واقفیت تھی وہ کسی اور کو حاصل نہ تھی۔ کس لڑکی کے تعلقات کس سے ہیں اور وہ اسے کب چھوڑ دے گی اور اس کو فلاں سے کتنے اباشن ہوئے ہیں۔ اس کی اطلاع اُن کے علاوہ کوئی اور نہ دے سکتا تھا۔ اس کے یہاں اکثر و بیشتر مختلف قسم کی لڑکیاں آتی رہتیں۔ مجھے قدرے حیرت بھی ہوتی کہ آخر یہ لڑکیاں یہاں کیوں آتی ہیں اور ایک دن جب اس کی تصدیق ہوگئی کہ مسز جون ان لڑکیوں کو ضرورت مندوں کے پاس لے جایا کرتی ہیں، تو مجھے اُن سے نفرت ہوگئی۔ میں نے پہلے بھی یہ سب سُنا تھا، مگر مجھے اس پر یقین نہ آتا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے خود ہی اس خبر پر مہر صداقت لگا دی۔ وہ میرے کمرے میں آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

"برور! آپ کو کچھ چاہیے؟"

"کیا سسٹر؟" میں نے اخبار کے کالم پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ارے یہی برور، کچھ اڈوینچر"

"کس قسم کا اڈوینچر، سسٹر؟"

"ایوننگ اڈوینچر، ایوننگ میٹ۔"

"یہ کیا بلا ہے؟"

"گڈ گاڈ..... ارے برور، یہی کوئی لڑکی وڑکی۔" میں اس جملے کی توقع اُن سے کبھی نہ کرتا تھا۔ شرم سے میرا چہرہ لال ہوگیا۔ مسز جون نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر مردانہ وار قہقہہ لگاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ "آپ تو لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے ہیں۔"

میری آنکھ کھل گئی۔ کئی دنوں تک سوچتا رہا۔ مسز جون واقعی قابل نفرت عورت ہے۔ مجھے اس سے نفرت کرنی چاہیئے۔ راما ٹھیک کہتا تھا وہ فاحشہ ہے اور آخر کار دل کو کڑا کر کے میں نے فیصلہ کیا کہ اب تمام تعلقات ختم کر دوں گا۔ پہلے تو وہ میری بے توجہی کو میری مصروفیت سمجھتی رہی۔ پھر جب میرے رویہ کی تبدیلی پر یقین آگیا تو وہ بہت سست ہوگئیں اور کچھ سوچتی ہوئی میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"آپ مجھ سے اینگری ہیں بردر۔" اُن کی آواز میں درد تھا۔ "میں بہت خراب عورت ہوں، ہے نا؟" ایک اُن کی آنکھ سے آنسو نکل گیا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔

"نہیں سسٹر، یہ سب آپ نے کیسے سوچا۔؟"

آنسوؤں کا سیلاب میرے فیصلہ کو بہا لے گیا۔

"میں آپ کی قرضدار ہوں بردر، میں بھولی نہیں ہوں۔ بہت جلد چکا دوں گی۔"

قرض کی بھولی بسری بات سُن کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔ اس وقت مجھے اس کا علم ہوا کہ مسز جون میری خفگی کی اصلی وجہ نہیں جانتیں۔

"نہیں سسٹر، یہ سب آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے وہ روپیہ قرض کے طور پر نہیں دیئے تھے۔" میں نے صفائی پیش کرنی چاہی، مگر مسز جون واپس جا چکی تھیں۔

اس ناخوشگوار واقعہ کے بعد دو دن کے لئے میں کھونٹی چلا گیا اور تیسری رات واپس لوٹا، تو چرچ کمپاؤنڈ میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے حسب معمول آہستہ سے اپنا کمرہ کھولا اور لیمپ جلانا ہی چاہتا تھا کہ بغل کے کمرے سے ہلکی ہلکی سرگوشیاں سُنائی دیں۔

"سالی جرنیل بنتی تھی، ..... اب بتا کس کی جیت ہوئی۔" یہ ایک مانوس آواز تھی۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد میں نے پہچان لیا، یہ راما کی آواز تھی، راما، جس سے مسز جون کو شدید نفرت تھی۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ آج راما، مسز جون کے کمرہ میں کیسے داخل ہو گیا۔ میں نے کواڑ کے سوراخ سے دیکھنا چاہا۔ ایک قدم دروازہ کی طرف بڑھا بھی پھر ہانپتی ہوئی سانس میں پھنسی پھنسی آواز سُن کر میرے قدم رُک گئے۔

"حرام زادے .... مجبوری تھی — ورنہ مزہ چکھا دیتی۔ مگر یاد رکھ، ایک دن تجھے بھی ننگا کر کے نہ مارا تو یاد کرے گا۔"

"چپ سالی۔"

مسز جون کی ایک ہلکی سی کراہ اُبھری، پھر چند لمحوں کے لئے سانس کے تیز چلنے کی آواز آتی رہی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا، تاکہ مسز جون کو میری موجودگی کا علم نہ ہو۔ میں سب کچھ سمجھ چکا تھا، مگر میرے ذہن کی ایک گرہ اب بھی نہ کھلی تھی۔

"یہ راما کی جرأت کیسے ہوئی" میں اسی سوچ میں گم تھا، کہ بغل کے کمرے میں آہٹ تیز ہوگئی اور مسز جون کی گرم آواز پھیلی۔

"لا روپیہ نکال۔ جلدی کر"

"کتنے؟"

"سالا ملائی کرتا ہے"

"دس روپے تو بہت ہیں۔ تجھ میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ گیلی مٹی کے دس روپے"

راما کچھ اور بھی بولتا کہ چٹاخ کی ایک آواز آئی اور پھر مسز جون آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں۔

"سالا کتا کا بچہ — جان مار دوں گی، دس روپے دیتا ہے یا نہیں۔"

راما، کچھ نہ بولا۔ صرف ریزگاری گننے کی آواز آتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور اس سے قبل کہ راما چور کی طرح بھاگتا کہ مسز جون نے ایک زور کی لتاڑ ماری۔ راما لمحہ بھر کے لئے رُک گیا۔ وہ کچھ بولتا مگر مسز جون پھر بھوکی شیرنی کی طرح ٹوٹ پڑیں۔

"بھاگ حرام زادہ...... سالا...... کتا کا بچہ......"

میں نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں راما بھاگ گیا تھا۔ کافی دیر بعد جب مجھے قدرے اطمینان ہوگیا، تو میں نے دروازہ کھولا۔ روشنی جلائی اور بستر پر نڈھال لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں تمام باتیں ناچ رہی تھیں۔ آخر قصہ کیا تھا۔ راما کو یہ جرأت کیسے ہوئی۔ مسز جون کی وہ مجبوری کیا تھی؟ میں مثلث کے انھیں تینوں نقطوں کے درمیان گم تھا۔ کہ دروازے پر ہلکی سی چاپ سنائی دی۔

مسز جون کھڑی تھیں اُن کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ رہا کرتی تھی۔

وہ میلی سی چادر میں لپٹی لپٹائی چائے کی پیالی لئے کھڑی تھیں۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے برادر؟"

"میں ذرا کھونٹی چلا گیا تھا" میں نے چائے کی پیالی لے لی اور اُن کی آنکھوں میں جھانکنے لگا مگر ان میں تو وہی معصومیت چھپی تھی۔

"یہ نیلو اور شیلو کہاں ہیں۔"

اپنے پاپا کے ساتھ انکل کے یہاں گئی ہیں۔"

"ہوں......"

"ایک بات کہوں بردر....."

"کیا.....؟"

مسز جون بائیں ہاتھ کی مُٹھی میں دبی ہوئی ریزگاری نکالتی ہوئی بولیں۔" مجھے بہت شرمندگی ہے برادر کہ میں نے روپے واپس لوٹانے میں کافی دیر کر دی .... برادر! اَب تو آپ اینگری نہیں رہے گا۔ نا۔ میں کسی سے لڑ کر بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکوں گی، پھر آپ جیسا شریف نیبر کہاں ملے گا۔"

مجھ پر ایک بجلی گر پڑی۔ چائے کی پیالی کانپنے لگی۔ تھوڑی دیر پہلے کا حادثہ ذہن میں پھر سے تازہ ہوگیا۔ راما کی دی ہوئی دسؔ روپے کی ریزگاری میز پر پڑی ہوئی میرا مُنہ چڑا رہی تھی۔

اذانوں کے پہرے

صبوحی طارق
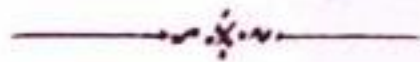
——— ہاں! تمہاری بخشی ہوئی وہ نمیار نہ آگ تھی نہ شعلہ، یہ تو جلتی ہوئی شبنم تھی پھولوں کی گود میں سوئی ہوئی چاند کی کرن تھی۔

پگھلتی ڈھلتی برف باری تھی ——— تیرے رحم کی برف باری!

کیسے کہہ دوں کہ وہ واقف نہیں تھی۔

اپنے وجود سے اپنی حقیقت سے اپنی ہیئت سے!!!

کتنی حقیر سی بات تھی کتنا ادنیٰ سا تھا اُس کا ضمیر!

یہ سچ ہے ——— تم نے اپنے قلم کی لکیروں کو جامد بھی تو نہیں کیا تھا۔

ہا! کتنا خوبصورت تھا تمہارا یہ شاہ کار، یہ پَرتو!

لازوال و بیکراں، جہانگیر ——— مگر تشنہ و پیاسا۔

کتنی خالی خالی تھیں اس کی نگاہیں جو تمہارے آسمانوں کے بوسیدہ صحیفوں کی طرف اُٹھتی ہیں۔

لیکن تم نہیں تھے، وہاں تو پرچھائیاں تھیں، اندھیرے تھے، سناٹے تھے اور مٹتے اندھیروں کی کشتی پر تمہارے نور کا عکس ڈول رہا تھا۔

کس کس نے اس نور کو نظروں میں نہیں بھرا۔

کون تھا جس نے رات کی جالیوں سے ان بکھرتی کرنوں کو نہیں اپنایا لیکن وہ ——— ازلی و ابدی، پیاسی و تشنہ بھٹکتی رہی۔ خیال خیال بھٹکتا رہا ——— کہیں یہ پیاس بجھ نہ جائے۔

نظر نظر سسکتی رہی ——— کہیں یہ دل راکھ کا ڈھیر نہ ہو جائے۔

تمھیں پا جانے کی آس نہ ہوتی تو شاید مٹی کا انبار ہوتی!

تمھارے خوابوں کا خمار ہی تو تھا، تمھاری خاموشیوں کی آواز ہی تو تھی کہ وہ ایقان و ایمان کے دامن پر سجدے کرتی رہی!

مگر تم اٹل رہے!

کلیوں سی مسکراہٹ، پھولوں سی خوشبو، بوند بوند شبنم میں مسکراتے ہر بار تم اپنے عہد کو پتھر بناتے رہے۔

یہ ہی تو وہ پتھر تھے جو موتی بنے سمندر کی پہنائیوں میں جا چھپے اور وہ ان موتیوں کی تلاش میں راہ راہ سرگرداں رہی —— پیروں کے آبلوں کو دھوتی، آنکھوں کی تمنا کو لَو دیتی رہی۔

اس دن نہ تم نے آسمانوں کو کھولا نہ عدم کی خاموشیوں کو توڑا اور نہ ہی سربلند پہاڑوں کو ریت ریت، ریزہ ریزہ بنا کر بکھیرا۔

اس کی ہستی ہی کیا تھی، وہ نہ تو "سفر" تھی نہ "کفر"!!

لیکن تم نے نہ جانے اس کے بوجھ تلے کیسا پتھریلا، خنک، اوس بھرا، گدلا بستر بچھا دیا تھا کہ اس کی ہستی لہولہان ہونے لگی اوس بھری وہ خنکی اُسے منجمد کرنے لگی۔ یہ گدلا پن کائی سا بنا اس کے وجود سے لپٹ گیا اور کہیں دور سے غراتی دھاڑتی آوازیں اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ ان غلافوں سے پرے، اوپر جو سیاہ و سفید پیوند سے ڈھکے ہوئے ہیں اور جنھیں ہوائیں ادھر اُدھر بکھیرنے لگتی ہیں تم اس کو تھام لیتے —— اُسے اُٹھا لیتے؟؟

لیکن —— اُمید کی شمعیں جب جل جل کر بجھنے لگتیں۔

یقین کے بُلبلے ہیرے بنے دمکنے لگتے۔

اس کی تو ہر دھڑکن ایک نشور تھی، ہر آہٹ ایک طوفان تھی۔

اور پھر یہ تم ہی تو تھے جو اس کی ہر دھڑکن میں چھپے نہ جانے کیسا سُر الاپتے تھے کہ وہ چلا اُٹھتی۔

"سامنے کیوں نہیں آتے، کبھی تو آؤ گے نا! میری سانسوں کے ہولے ہولے بجتے تار ٹوٹ جائیں تو انگ انگ میں جلتی یہ آگ راکھ بن جائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو کس سے پوچھو گے کہ سانسوں کی ٹوٹتی ڈور میں اُمید کی گرہ کس نے لگائی تھی؟ میں نہ رہوں تو میرے سجدے کس در پر کس کے لئے پاؤ گے؟"

لیکن کیا ہوا کہ تم نے ہر شبنمی قطرہ چھپا لیا، ہر سنہری کرن سمیٹ لیا، گرد و غبار سی اُڑنے لگی۔ آندھیوں کا دُھواں دُھواں سا پھیلنے لگا۔ میرے معبود! کیسا وقت تھا، کیسی گردش تھی، کیسا موڑ تھا، کیسی آگ تھی، کیسے غول تھے —— کیسے ریوڑ تھے —— جو قدم قدم پر ایستادہ تھے۔ وہ رُک گئی —— یہ جو "ہبل" ہے —— "عزیٰ ہے —— "لات ومنات" ہیں —— کیا ان سب میں تم چُھپے بیٹھے ہو؟

نہیں —— نہیں —— یہ تو اس کا وہم تھا گمان تھا۔ یقین و بے یقینی کی ڈولتی پرچھائیاں تھیں۔

تم تو کہیں دور —— صبح کے شبنمی ہاتھوں سے اپنے چہرہ کی کتاب کا ورق ورق اُلٹ رہے تھے۔

"پھولوں کے شگافوں سے تم ہی تو جھانک رہے تھے۔ لالہ کے داغوں میں تمھاری ہی تو مسکراہٹ تھی۔ پرندوں کی مناجات میں تم ہی تو چھپے بیٹھے تھے۔"

اور وہ رُک گئی جیسے تم نے اس کے قدموں پر پہرے لگا دیئے ہوں ورنہ شاید وہ بھی اُلجھ جاتی ریوڑوں میں کھو جاتی، غولوں میں گُم ہو جاتی۔

اس کے لب کپکپاتے رہے، قطرہ قطرہ پانی کی ٹپکتی آواز اپنے نقوش بناتی رہی وہ پکارتی رہی —— رحم کی بھیک مانگتی رہی۔

"میرے معبود! میرے سجود! میری محبت میں تیرا کوئی رقیب نہیں، شریک نہیں، راز دار نہیں، راز داں نہیں۔"

یہ کیسا عہد تھا —— یہ کیسی وفا تھی۔ شاید اس نے تمھیں پا لیا تھا۔ پرندوں کے گیتوں نے، پھولوں کی پنکھڑیوں نے، لالہ کے داغوں نے چھپے راز عیاں کر دیئے تھے۔

تمھارے ترنم، تمھاری نغمگی، تمھاری خوشبوؤں میں ڈوبی ڈوبی وہ صدیوں کی نیند میں غافل ہوگئی۔

وقت کی ایک اور گردش تھی —— زمانے کے تیور بدلے، لمحے لمحے نے اپنا رنگ بدلا۔

تم نے ٹھٹا ٹھٹول کرنے والے ان جانداروں کو کھجور کے کھوکھلے تنوں کی مانند کر دیا شاید یہ تمھارے وہی الفاظ تھے، پتھر سے —— جو تم آسمانی اوراق پر بجلیوں سے لکھا کرتے تھے۔

"جب آسمان پھٹ جائے گا جب تارے جھڑ پڑیں گے جب زمین کے پیوند اُکھیڑ دیئے جائیں گے تو ....."

لیکن وہ پھر بھی تمھاری محبت میں سرشار اپنے آنسوؤں کی انجلی دیتی رہی وفا پرستی کے پھول نچھاور کرتی رہی۔

سر بہ سجود، زیر لب، زیر سماں، زیر سایہ پکارتی رہی....

"میرے معبود، میرے سجود، میں تیری طرف بڑھ آئی ہوں اپنی آوازیں بلند کر تاکہ میں ان کا دامن تھام کر تیری پناہ میں ڈوب سکوں۔"

مگر تم کہاں تھے؟ —— یہ کیسے بہرے تھے؟ —— آوازوں کے؛ اذانوں کے؛ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، تم نے اُجالوں کے بادبان کھینچ لئے اندھیروں کی لہروں کو موجزن کر دیا۔ گزرتے لمحوں کا پتوار تھامے رات کا تارا ٹمٹماتا رہا۔

—— "شاید کوئی متنفس نہیں جس پر نگہبان مقرر نہیں۔"

مگر اس کا نگہبان کون تھا —— ؟ کہاں ...... تھا؟

وہ زندہ دفنائی جانے لگی —— زمینوں کے گڑھے بھرے جانے لگے۔ کلبلاتی جانیں خاک کا پیوند بنتی گئیں۔

وہ پریشان و سرگرداں دوڑتی رہی۔ پیروں کے آبلوں کو دھوتی نخلستانوں کی ٹھنڈک ڈھونڈھتی رہی اور پھر کیا ہوا کہ ریتیلے چٹانوں سے پرے اونچے اونچے

ٹیلوں کے اس پار کسی نے تمہیں لبیک کہا اور تمہاری آوازوں کو زبان دے دی

"جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے۔ جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے تو......"

تو نہ جانے وہ کیسی ٹھنڈک تھی، کیسا نور تھا اور کیسی آواز تھی جو صدیوں پر محیط رہی کہ وہ بھٹک نہ سکی، بہک نہ سکی۔

پر وقت کے دریا میں موجزن لہریں سر پٹک پٹک کر ختم ہونے لگیں۔ سیاہ سورج آگ اُگلتا چلا گیا۔ بادلوں کے سینے ناسور بن کر رہنے لگے اور وہ ایک بار پھر چلا اُٹھی۔

"کہیں میں عُریاں نہ ہو جاؤں۔ "لاف و یعوق" نہ بنا دی جاؤں۔ کہیں اونچے میناروں تلے در پہ تیرے انسان سر پٹکنے نہ لگیں۔ میں تجھے بھول کر گھپاؤں اور غاروں میں وحشت و درندگی میں ڈوب کر شہوت کی پوجا نہ کرنے لگوں..... مجھے بچا لے —— میں نے تجھ سا دوسرا کوئی نہیں دیکھا۔ میرے ساتھ تیرے پہرے ہیں —— تو جو اکبر ہے اعلیٰ ہے —— تو جو ارفع ہے، عظیم ہے —— عظیم تر...."

صدیاں اُڑتی چلی گئیں —— کون تھا —— کون نہیں تھا مگر وہ تمہاری آس لگائے اس سنگریزہ، سنگلاخ، سنگ و آہن، سنگ و خار، سنگ و خشت دُنیا میں جیتی رہی ——!

جیتی رہی!!!

———

سکٹ رمولی

(شعیب شمس)

نام تو ان کا کچھ اور ہی تھا۔ لیکن انسان کچھ اس قدر سہل پسند اور کاہل واقع ہوا ہے کہ وہ ہر کام میں اختصار کا متلاشی ہے۔ جیسے اس طرح وہ وقت بچا کر کسی اور کام میں جی وجان سے لگ جائے گا۔ لیکن ایسا ہوتا ہی کب ہے۔ اسی طرح شیخ رحمت علی کا نام بگڑتے بگڑتے سک رمولی رہ گیا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ تو پہلے ان کا پورا نام لیا کرتے تھے۔ شیخ رحمت علی۔ پھر اس کے بعد شیخ رحمت ہوئے۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ نام میں بھی اختصار ہوتا گیا اور وہ صرف سک رمولی رہ گئے۔

شیخ رحمت علی جب اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں ابراہیم پور مدرسہ میں بحیثیت مدرس آئے تو گاؤں کے سارے لوگ انھیں مولوی صاحب کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ لیکن کسی جوان آدمی کو جس کے دل میں مختلف قسم کے جذبات ہوں۔ راتوں کی اُمنگیں اور شاموں کی رعنائیاں ہوں وہ بھلا خود کو مولانا یا مولوی کہلانا کیوں پسند کرے گا۔ انھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور لوگوں نے انھیں شیخ رحمت علی کہنا شروع کر دیا لیکن بعدہٗ وہ صرف سک رمولی رہ گئے۔

سک رمولی کو گاؤں کی سیاست میں بڑا دخل تھا۔ وہ ہمیشہ خود کو کسی نہ کسی گروپ سے متعلق رکھنا چاہتے تھے۔ حالانکہ گاؤں کے چند سر برآوردہ اصحاب نے انھیں اس عمل سے پہلو تہی برتنے کے مشورے بھی دیئے۔ اس لئے کہ اس کا اثر گاؤں کے بچوں پر بڑا خراب پڑتا تھا۔ جب کسی گروپ کو یہ خدشہ لاحق ہوجاتا کہ سک رمولی مخالف گروپ کی تعریفیں کرتے ہیں تو اس گروپ والے اپنے بچوں کو اس مدرسہ سے اُٹھا کر دوسرے مدرسوں میں بھجوا دیتے جو اس گاؤں سے

ملحق کسی دوسرے گاؤں میں ہوتا۔ حالات کی تبدیلی کا احساس خود سک رمولی کو بھی تھا لیکن سیاست سے فطری دلچسپی نے انھیں مجبور کر رکھا تھا۔ وہ اگر کچھ اور تعلیم یافتہ ہوتے یا حالات ہی میسّر آتے تو اب تک وہ ایم۔ایل۔اے یا ممبر پارلیمنٹ ضرور ہوگئے ہوتے۔ لیکن ان میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ تقریر نہ کر سکتے تھے جب بھی کسی مجمع کو خطاب کرنے کی نوبت آتی تو وہ اپنا دامن بچا کر نکل جاتے اور ایسے موقعوں پر انھیں پیٹ میں بڑا شدید درد ہوتا۔ سبھوں کا خیال تھا کہ تقریر کرنے کے نام سے سک رمولی محض پیٹ کے درد کا بہانہ بنا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ مرض ایسا ہے جو بظاہر پتہ نہیں چلتا اور سک رمولی کا یہ بہانا بڑا ہی کارگر ثابت ہوتا۔

بہر حال سک رمولی جن دنوں ابراہیم پور میں آئے تو اس وقت جوان تھے شادی انھوں نے اس وقت بھی نہ کی تھی اور اب بھی غیر شادی شدہ ہیں اور مجرد زندگی گذار رہے ہیں۔ عنایت اللہ صاحب جو ان کے بڑے ہی ہمدرد تھے اور جن کا احترام سک رمولی اپنے بزرگ کی طرح کرتے تھے۔ انھوں نے انھیں اس کے لئے رضامند کرنے کی بہتری کوششیں کیں کہ وہ تنہائی کی اس زندگی سے نجات پالیں اور کسی کو اپنے حجلۂ عروسی میں لا بٹھائیں لیکن وہ ہمیشہ دامن بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر ایک دن عنایت اللہ صاحب نے انھیں اس ارادہ سے پکڑ لیا کہ آج سک رمولی صاحب سے ہاں کرا ہی چھوڑیں گے۔

اگر آپ میری بات مانیں تو میں اس قصبہ میں ایک اچھے اور خوشحال گھرانے میں آپ کی شادی کی بات کروں۔"

"مجھے اس سلسلہ میں آپ بخش ہی دیں تو بہتر ہے۔"

"آخر میں بھی تو جانوں کہ ایسی کون سی وجہ ہے جو آپ شادی کرنا ہی نہیں چاہتے؟"

"وجہ تو اور کچھ بھی نہیں لیکن میں شادی بیاہ کے جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

عنایت اللہ نے انھیں سارے نشیب و فراز سے آگاہ کرنے کی کوششیں

کیں۔لیکن سک رسولی ٹس سے مس نہ ہوئے۔وہ جھاڑ کی طرح اپنی جگہ پر جمے رہے اور اس پر مصر تھے کہ میں تجرد کی زندگی کو سب سے بہتر تصور کرتا ہوں۔"

بہرحال اسی طرح انھوں نے ۲۵ سال گذار دیئے اور جب ان کی اتنی عمر آگئی تو لوگوں نے انھیں شادی کے سلسلہ میں ٹوکنا بھی بند کر دیا۔گاؤں کے بعض منچلے یہ سمجھتے تھے کہ سک رسولی رات کے اندھیروں میں کچھ ایسی ویسی حرکتیں ضرور کرتے ہوں گے۔اس لیے کافی رات گئے انھوں نے ان کے کمرے میں جھانکنے کی بھی کوششیں کیں لیکن سک رسولی ہمیشہ لنگی اور بنیائن پہنے خواب غفلت میں نظر آئے اور صبح سویرے وہ اس انہماک سے کسی لڑکے کی انگلی پکڑ کر جیم واؤ پیش جو، نون زبر نَ جُونَ پڑھاتے نظر آئے۔

صبح سے شام تک وہ اسی طرح اپنے فرائض میں مشغول نظر آتے۔اور جب سارے بچے بیک وقت الف زبر اَ، ب زیر بِ مل کر رٹ لگاتے تو گاؤں کی فضا میں عجیب خوش گوار سی موسیقی کے زیر و بم پیدا ہونے لگتے اور وہ جھوم جھوم کر بچوں کو درس قرآن دینے میں منہمک نظر آتے۔جب گاؤں کے سارے افراد کو سک رسولی کے کردار پر کوئی شبہ نہ رہا تو وہ بلا جھجھک ہر آنگن میں گھستے رہے اور عورتوں میں بیٹھ کر کبھی ان کے جھگڑے چکاتے۔کبھی کسی کی شادی کے متعلق غور و فکر کرتے۔انھیں مناسب مشورے دیتے،اور کبھی کبھی جوان لڑکی کو دیکھ کر کہتے۔

"ارے یہ وہی ہے،کتنی بڑی ہوگئی ہے۔میں جب اس قصبہ میں آیا تھا تو یہ محض اتنی سی تھی۔" وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں محض ایک فٹ کا فاصلہ رکھ کر اس کے قد کا اندازہ کرتے اور لڑکیاں شرما کر مسکراتی ہوئی کسی کونے میں دبک جاتیں۔

"اچھا لا جلدی سے مجھے پان کھلا دے۔اب چلوں،عنایت اللہ میرا انتظار کرتے ہوں گے۔آخر تیسری شادی کا انتظام بھی تو مجھے ہی کرنا ہے۔"

سک رسولی کو کسی کی شادی کرانے میں بڑا لطف آتا تھا۔شادی انجام پا جانے کے بعد وہ سارے قصبہ میں اس طرح فخر سے سینہ پھلا کر چلتے جیسے انھوں نے

سماج کی بہت بڑی خدمت انجام دی۔ سک رمولی کو ہر گھر میں رسوخ حاصل تھا اور ہر شخص ان کا احترام بھی کرتا تھا۔ اس لئے کہ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ان کا شاگرد ضرور رہ چکا تھا اور وہ حق اُستادی جتانا خوب جانتے تھے۔ خصوصاً عورتیں شادی بیاہ کے معاملوں میں ان سے مشورے لینا ضروری سمجھتی تھیں۔

"راحیلہ اب جوان ہو چکی ہے۔ کچھ اس کی بھی فکر ہے آپ کو؟"

راحیلہ کی ماں نے پان بڑھاتے ہوئے سک رمولی سے کہا۔

"مجھے کس کی فکر نہیں۔ اچھا کوئی انتظام کرتا ہوں۔"

لیکن کسی وجہ سے وہ بھنائے ہوئے ہوتے تو کہتے۔

"کیا ساری جوان لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی کرانے کا میں نے دفتر کھول رکھا ہے۔ جسے دیکھو وہ اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں دوڑا چلا آرہا ہے۔ جیسے سک رمولی کے بھروسے پر ہی لوگ لڑکیاں پیدا کرتے ہیں کہ سک رمولی تو ہیں ہی کہیں نہ کہیں جوڑا لگا ہی دیں گے۔"

لیکن سک رمولی کی ان دل خراش باتوں کا کسی پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا اس لئے کہ سبھوں کو اس کی واقفیت تھی کہ سک رمولی کے کانوں میں بات پڑ جانی چاہیے۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ اور وہی ہوتا بھی تھا۔ حق اُستادی جتا کر وہ کوئی نہ کوئی مناسب لڑکا ڈھونڈھ ہی لیتے تھے۔

ایک شام سک رمولی اپنے کمرہ میں بیٹھے کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے کہ عنایت اللہ کا اہل کارہ انھیں بُلانے آیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"ہم کا جانیں بھیا۔"

"اچھا تم چلو، میں آتا ہوں۔"

سک رمولی جب عنایت اللہ کی بیٹھک پر پہنچے تو قصبہ کے کئی معزز حضرات پہلے سے موجود تھے۔

"آیئے سک رمولی صاحب تشریف رکھئے۔"

"کہیئے خیریت تو ہے ؟" سک رمولی نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہم لوگوں کا ارادہ ہے کہ گاؤں میں ایک زنانہ اسکول بھی قائم ہوجائے اس لئے کہ مدرسہ سے نکلنے کے بعد بچے تو کسی نہ کسی اسکول میں تعلیم کی غرض سے بھیج دیئے جاتے ہیں لیکن بچیوں کو اس کے بعد گھر ہی بٹھا دیا جاتا ہے اور آج کے اس دور میں لڑکیوں کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے۔"

"یہ تو درست ہے لیکن میں اس سلسلہ میں بھلا کیا کرسکتا ہوں ؟"

"ہم لوگ آپ سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کی کیا رائے ہے ؟"

"میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں، مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

پھر زنانہ اسکول کے لئے کوششیں کی گئیں اور منظوری بھی آگئی۔ اب سوال یہ درپیش تھا کہ اسکول کس عمارت میں چلایا جائے۔ گھوم پھر کر لوگوں کی نگاہیں سک رمولی کے مدرسہ پر آٹکیں اور اسی مدرسہ کو منتخب کرلیا گیا۔

منظوری کے دوسرے ہی مہینہ مس ثمینہ زنانہ اسکول کی مسٹریس بن کر آگئیں۔ اب صبح سے دس بجے تک سک رمولی کا مدرسہ چلتا اور جب قصبہ کے سارے بچے چلے جاتے تو پھر ثمینہ زنانہ اسکول کی کارروائیاں شروع کردیتیں۔

سک رمولی کا کمرہ تو مدرسہ سے کچھ دور تھا لیکن اسی مدرسہ میں ایک کمرہ ثمینہ کی رہائش کے لئے بھی مقرر کردیا گیا۔ ثمینہ کی عمر دیکھنے میں زیادہ نہ معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے کہ وہ دھان پان سی پتلی دُبلی تھیں لیکن سک رمولی نے یہ انکشافات بڑے ہی رازدارانہ طریقہ پر کیا کہ "مس ثمینہ کی عمر ۳۶ سال ہے اور اب تک غیر شادی شدہ ہیں۔" ثمینہ کی عمر زیادہ حیران کُن نہ تھی لیکن سبھوں کو اس بات کی حیرانی ضرور تھی کہ وہ اب تک کُنواری کیوں ہیں ؟" ثمینہ کے کنوارے پن کی بات تو قصبہ کی کنواریوں کو بڑی بھائی۔ اس لئے کہ عمر خواہ کتنی بھی ہوجائے لیکن کنواری لڑکیاں کسی کنواری کو بچی ہی سمجھتی

ہیں اور اس لئے ثمینہ کے کمرہ میں گاؤں کی کنواریوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا۔ کوئی کروشیا کا کام سیکھنے کے بہانے آتی اور دوستی پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔ کوئی محض تفریح کی خاطر گھومنے پھرنے آتی اور ثمینہ کے کام کرتی رہتی۔ ثمینہ کو بھی ان سبھوں سے بڑی مدد مل رہی تھی۔ اور وہ سبھوں کے خلوص سے متاثر بھی تھی۔ کبھی کبھی سک رمولی محض وقت گذاری کے لئے ثمینہ کے یہاں جا بیٹھتے تھے۔

"آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے بڑی ہی لذیذ ہوتی ہے۔ ذرا چائے پلائیے۔"

اور ثمینہ بلا کسی حیل و حجت کے انھیں چائے پیش کرتے ہوئے کہتی۔

"میں سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کو پان نہیں پیش کرسکتی، اس لئے کہ میں خود بھی پان نہیں کھاتی۔"

آپ پان کی فکر نہ کریں، کہیں کھالوں گا۔"

اور جب وہ چائے پی کر ثمینہ کے یہاں سے نکلتے تو مسکراتے ہوتے۔

سک رمولی جنھوں نے ساری زندگی مجرد رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب عجیب عجیب سی باتیں سوچنے لگے۔ چونکہ فطری طور پر جلد باز واقع ہوئے تھے اس لئے اس کام میں بھی دیر کرنے کے حق میں بالکل نہ تھے۔ اس مقصد کے تحت افشائے محبت کردوں، وہ کئی مرتبہ ثمینہ کے کمرہ میں گئے لیکن ہمیشہ چائے کا مُدعا ظاہر کرنے کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکے۔

سک رمولی کی آمد و رفت سے لوگوں کو کبھی کبھی یہ شبہہ بھی ہوتا تھا کہ کہیں دوسروں کی شادی کرانے والا خود ہی نہ اب شادی رچا بیٹھے لیکن لوگ یہ سوچ کر خاموش ہوجاتے تھے کہ جس نے ساری زندگی تجرّد میں گذار دی، اب کیا شادی کرے گا اور لوگ اپنی ہی منطق سے خود ہی مطمئن ہوجاتے تھے۔

لیکن سک رمولی پہلے والے سک رمولی نہ رہے تھے۔ نہ تو وہ عنایت اللہ کی بیٹھک پر جاتے۔ نہ کسی کی شادی کی فکر انھیں ستاتی تھی۔ وہ بہت زیادہ خاموش اور گم سُم رہنے لگے تھے۔ سک رمولی کی اس تبدیلی کو سبھوں نے گہری نظروں سے

دیکھا لیکن کسی میں کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔

سک رمولی اس رات ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکے۔ رہ رہ کر انھیں آج کا واقعہ یاد آ رہا تھا۔ انھیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ عنایت اللہ اس قدر رازدارانہ طور پر ملتے ہوں گے۔ یہ درست ہے کہ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا لیکن گھر میں جوان لڑکے اور بہوئیں موجو تھیں پھر وہ ایسی حرکت کیوں کر رہے ہیں۔ ساری رات وہ بے چین رہے اور جب ذہن کوئی فیصلہ نہ کر پایا تو انھوں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور غائب ہو چکی تھی۔ انھیں بھلا نیند آتی بھی تو کیسے؟

دوسری صبح جب انھوں نے بستر چھوڑا تو طبیعت میں کسل مندی بہت زیادہ تھی۔ انھیں اپنا ذہن کافی تھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور انگ انگ درد سے چور تھا۔ مدرسہ میں بچّے ہنوز روز کی طرح الف زبر اَ، بے زبر بَ کی رٹ لگا رہے تھے۔ بچّوں پر انھوں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور کہا "بچّو آج تم لوگ اپنے اپنے گھر جاؤ میری طبیعت ٹھیک نہیں، آج میں نہ پڑھا سکوں گا۔"

بچّے فرصت مل جانے کی خوشی میں تالیاں بجاتے اور شور مچاتے ہوئے اپنی اپنی کتابیں سنبھال کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ آن کی آن یہ خبر سارے قصبہ میں پھیل گئی کہ سک رمولی کی طبیعت ناساز ہے اور جب لوگ مزاج پرسی کو ان کے کمرہ میں پہنچے تو وہ بخار میں دھت پڑے سسکیاں لے رہے تھے۔

لوگوں کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے سک رمولی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے سارے کے سارے لوگ مبہوت کھڑے تھے لیکن کسی میں بھی ہمت نہ تھی کہ وہ سک رمولی کے آنسو پونچھتا۔ عنایت اللہ آگے بڑھے اور ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ کو تو بڑا تیز بخار ہے۔"

"کوئی خاص بات نہیں، دو ایک دنوں میں بھلا چنگا ہو جاؤں گا۔"

"لیکن آپ رو کیوں رہے تھے؟"

"آج مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور مجھے اپنی اس کم نصیبی پر رونا آگیا۔" وہ مسکرانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن مسکراہٹ کا کھوکھلا پن عنایت اللہ کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا تھا۔

دو تین دنوں کی بات تھی پھر وہ بھلے چنگے ہو گئے اور ان کی آمد و رفت سارے گھروں میں پھر بدستور جاری ہو گئی۔

"آپ نے راحیلہ کے متعلق کچھ نہ کیا؟"

کروں گا اور ضرور کروں گا لیکن سب سے پہلے اس کنواری کا انتظام کروں جو ہمارے قصبہ میں نئی نئی آئی ہے۔"

"کون اُستانی جی؟"

"ہاں، ہاں، وہی۔"

"لو، اب اس سے کون شادی کرے گا۔"

"بہت سے مل جائیں گے۔"

"کہیں آپ کا اپنا ارادہ تو نہیں؟ راحیلہ کی ماں نے معنی خیز مسکراہٹ سے دریافت کیا۔

"میں بھلا اب شادی کے لائق رہ گیا ہوں؟"

"آپ کے لائق تو بس اُستانی جی ہیں ہی۔"

"ایسی گندی باتیں نہ کیا کرو بہن، لاؤ پان کھلاؤ۔"

اور سک رمولی جب پان کھا کر جانے لگے تو راحیلہ کی ماں نے کہا۔

"ذرا راحیلہ کا خیال رکھئے گا۔"

"مجھے سب کی فکر ہے بہن، ایک راحیلہ ہی کیوں؟"

اور وہ جھپاک سے باہر نکل گئے۔

تین چار دنوں کے بعد سارے قصبہ میں یہ خبر لوگوں کے ذہنوں پر بم کے گولے کی طرح گری کہ عنایت اللہ ثمینہ سے شادی کر رہے ہیں اور یہ شادی سک رمولی نے طے

کرائی ہے۔ کسی کو یقین بھی نہ آتا تھا لیکن یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔

"سک رمولی صاحب کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں بھئی بالکل سچ، سَو فی صدی درست۔"

"لیکن آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

"میں نے ثواب کا کام کیا ہے، کوئی گناہ تو نہیں کیا؟"

"لیکن عنایت اللہ کی یہ عمر ہے شادی کی؟"

"ابھی کون سی زیادہ عمر ہو گئی ہے۔ پچاس سال تو ہوئے ہی ہیں۔"

"کیا پچاس سال کی عمر میں لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں؟

"نہیں ہوتی ہیں تو ہوں گی۔"

اور سک رمولی کی اس منطق کے آگے لوگوں کو کوئی جواب ہی نہ بن پڑتا تھا۔

شادی ہوئی اور خوب دھوم دھام سے ہوئی اور جب ثمینہ عنایت اللہ کے یہاں رخصت ہو رہی تھی تو لوگوں نے دیکھا سک رمولی اس دن بہت زیادہ ضعیف نظر آ رہے تھے۔ ان کے گالوں کی جُھریاں بھی واضح ہو گئی تھیں۔

سک رمولی اب بھی حیات ہیں اور اسی دلچسپی سے سبھوں کے جھگڑے چکاتے ہیں شادیوں کی رسمیں ادا کرتے ہیں اور پان چباتے ہیں۔ آج بھی صبح سویرے ان کے مدرسہ میں بچے "الف زبر اَ، بے زبر بَ کی رٹ لگا کر ایک عجیب سی خوشگوار موسیقی پیدا کرتے ہیں اور وہ بیٹھے سوچا کرتے ہیں "ان سارے بچوں اور بچیوں کی شادیاں تو مجھے ہی کرانی ہیں، شوکت اقبال کے لئے بہتر رہے گی اور منیرہ حمید کے لئے، نہیں حمید نہیں آصف۔ حمید کے مقابلہ میں آصف زیادہ خوبصورت اور مہذب ہے۔ حمید کی طرح چڑچڑا نہیں اور منیرہ جیسی گڑیا کے لئے آصف ہی ٹھیک رہے گا اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد نظریں اُٹھاتے اور ڈپٹتے "اور زور زور سے پڑھو" لیکن انھیں اس کا احساس تھا کہ لہجہ میں اب وہ جھنجھناہٹ بھی نہیں رہی۔ بچے پڑھ رہے تھے۔

الف زبر اَ، بے زبر بَ

عورت، پیار، خون

(ل۔م۔شاہد)

وہ بہت دیر سے بھٹک رہا تھا، مگر اسے کوئی عورت نہیں ملی۔ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب بھی اسے عورت کی ضرورت محسوس ہوتی گھر سے نکل پڑتا اور چلتے چلتے اسے کوئی عورت مل جاتی مگر آج نہ جانے کیا بات ہوئی ویسے تو اسے سڑکوں اور پارکوں میں بہت ساری عورتیں ملیں مگر وہ عورت نہیں ملی جو گندے اشارے پر مسکرا دیتی ہے۔

رات کے تقریباً آٹھ بج چکے تھے، وہ لمبی سنسان سڑک پر چل رہا تھا۔ اسے اچانک خیال آیا کہ وہ عورت کی تلاش میں شہر سے بہت دور نکل آیا ہے، وہ گھر کی طرف تیز قدم اُٹھانے لگا کہ اچانک آسمان پر کالے کالے بادل چھا گئے اور ہوا تیز چلنے لگی اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا کوئی بچنے کی جگہ مل جائے سامنے جھاڑیوں میں ایک بہت پُرانا ٹوٹا پھوٹا مکان نظر آیا۔ وہ مکان کی طرف لپکا اور ایک ٹوٹی ہوئی چھت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اتنا گہرا اندھیرا کہ سامنے کی کوئی چیز صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی۔ یہ مکان بالکل غیر آباد علاقے میں تھا۔ بارش تیز ہو چکی تھی۔

وہ چُپ چاپ کھڑا تھا کہ قریب ہی برتن کی آواز سنائی دی وہ چونک پڑا۔ ادھر اُدھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ وہ ڈر سا گیا کہیں بھوت تو نہیں۔ مگر ایک لمحہ بعد اسے چوڑیوں کی کھنک سُنائی دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی۔ عورت — آخر اسے عورت مل ہی گئی۔ اسی عورت کی تلاش میں گھنٹوں بھٹکتا رہا تھا۔ مگر اس غیر آباد علاقے میں عورت کہاں سے آئی؟ نہیں، یہ کوئی آسیب ہے اور پھر وہ ایک بار خوف سے کانپ

گیا۔ وہ پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ اس کے پاؤں سے کوئی چیز ٹکرائی، اور آواز گونج اٹھی۔
"کون ہو تم——" یہ ایک عورت کی آواز تھی۔
اب اسے یقین آگیا کہ وہ سچ مچ عورت ہی ہے اور اس کا ڈر کچھ کم ہوا۔
"میں ایک مرد ہوں۔ اچانک ہی بارش شروع ہوگئی۔"
"بھیگ تو نہیں رہے ہو؟"
تھوڑی دیر خاموشی رہی۔
"تم ایک عورت ہو نا؟"
"تم کیا سمجھ رہے ہو۔ کیا میں کوئی بھوت ہوں؟"
"نہیں، بات یہ ہے کہ اس غیر آباد علاقے میں تم اکیلی کیسے رہتی ہو۔ کیا تمھیں ڈر نہیں لگتا؟"
"بالکل ڈر نہیں لگتا، اور میں اکیلی نہیں ہوں میرا ایک بچہ بھی ہے جو ابھی سویا ہے۔ میرا ایک آدمی بھی ہے جو رکشا چلاتا ہے، اب وہ آتا ہی ہوگا۔ مگر ہوسکتا ہے کہ آج اسے آنے میں دیر ہو کیوں کہ بارش اچانک شروع ہوگئی ہے۔ تم بھیگ تو نہیں رہے ہو۔ میری طرف بڑھ آؤ۔"
اور وہ اس عورت کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔
"کیا سوچ رہے ہو؟"
"سوچ رہا ہوں کہ تم نہ جانے کیسی عورت ہو، آواز سے تو لگتا ہے کہ تم بے حد خوبصورت ہو۔"
"میں خوبصورت ہوں، اور ایک بڑے گھرانے کی بھی ہوں۔"
"پھر تم یہاں کیسے آگئیں؟"
"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ کبھی میں ایک شریف عورت تھی۔ مگر پڑوس کے ایک عیاش مرد نے دھوکہ دے کر ایک رات کو مجھے لوٹ لیا اور سڑک پر پھینک دیا۔ مجھے بالکل ہوش نہیں تھا کیونکہ اس عیاش مرد نے میرے حلق میں بہت ساری شراب انڈیل دی

تھی۔ آدھی رات کو رکشا والا سنیما کی سواری پہنچا کر جا رہا تھا کہ اس نے مجھے سڑک پر پڑا پایا اور رکشا میں ڈال کر یہاں لے آیا۔ تب ہی سے میں رکشا والے کے پاس ہوں آخر کس منہ سے گھر جاتی۔ میرے دل میں مردوں کے لئے ایک نفرت پیدا ہو گئی ہے مگر رکشا والے نے اپنی رفاقت سے میرے اندر کی نفرت کو مار ڈالا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ابھی نفرت مری نہیں ہے موجود ہے۔"

وہ عورت غیر ارادی طور پر اس کے اور بھی قریب آ گئی۔ عورت کے ملائم جسم کے لمس سے اس کے اندر کا بھوکا آدمی جاگ پڑا۔ ہوا سرد تھی۔

"مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔" اس نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

وہ تو نہایت چالاک عیاش مرد تھا۔ پہلی ہی نظر میں بھانپ گیا تھا کہ عورت ابھی جوان ہے۔

"میرے پاس کوئی کمبل بھی تو نہیں ہے۔"

وہ عورت کے بہت قریب آ گیا، اس نے عورت کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو، شاید بہت سردی لگ رہی ہے تمھیں۔"

"تمھاری آواز سے پتہ چلتا ہے کہ تم نے اب تک ایک ہی بچے کو جنم دیا ہے۔ تمھارے جسم میں کساؤ ابھی باقی ہے، تمھاری سانسوں میں اب بھی کچھ کچھ خوشبو ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے عورت کو تقریباً سمیٹ لینا چاہا۔ عورت پیچھے کی طرف ہٹ گئی، بولی "تم نے شاید شراب پی رکھی ہے، تم نشے میں ہو۔"

"تھوڑی بہت پی لی ہے۔ نشہ تو اتر چکا تھا مگر تمھیں پا کر دوبارہ نشہ آنے لگا ہے۔"

"تم اچھے آدمی نہیں لگتے، پیچھے ہٹ جاؤ۔"

"وہ عیاش مرد جس نے تمھیں لوٹ کر سڑک پر پھینک دیا تھا، اگر مل جائے تو کیا کرو گی تم؟"

اتنے میں بجلی چمکی، بجلی کی روشنی میں عورت نے اس مرد کو اچھی طرح دیکھا۔ اسے کچھ یاد آیا اور اس نے فوراً جھک کر کچھ اٹھایا۔

پھر اندھیرے میں ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ پھر ایک بار بجلی چمکی —— عورت کے ہاتھ میں ایک خون آلود چھرا تھا۔

—— ❊ ——

مَیں کیا کروں؟

شہاب دائروی

ایک سال بعد جب میں سسرال سے میکے اپنے گاؤں میں آرہی تھی تو سفر کے میرے سارے لمحات زلیخا باجی سے ملنے کے خوش کن تصور میں گذرے تھے۔ وہ میرے گاؤں کے اختر مرزا سے بیاہی ہوئی تھیں۔ بہت خلیق، ہنس مکھ، خوبصورت، تندرست پُرکشش اور جاذب نظر لیکن ایک سال بعد جب میں اپنے گاؤں پہنچ کر ان سے ملی تو میرے دل و دماغ کو بہت شدید جھٹکا لگا۔ پتھر کی چٹان سی ان کی جوانی برف کی سِل کی طرح پگھل کر اختتام پذیر تھی، چہرے کا کھلا ہوا شاداب پھول زرد تھا اور وہ سفید لباس میں ملبوس پلنگ پر نہ جانے اپنے کس خیال میں گُم بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر بڑی خفیف سی مسکراہٹ ایک پل کے لئے آئی اور پھر ان کے سوال میں ڈوب گئی۔

''اچھی تو ہو؟ —''

''جی —'' میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا — ''آپ بیمار تھیں کیا؟ —''

''نہیں تو —'' وہ چونکی، اور اب جب کہ وہ میرے لاکھ انکار کے باوجود میرے لئے چائے تیار کرنے گئی ہیں میرے ذہن کے سارے دروازے کھُل گئے ہیں، وہ ایام بہت روشن اور واضح ہو گئے ہیں جن کی یاد نے نہ جانے کتنی بار مجھے زلیخا باجی سے ملنے کے لئے بے قرار کیا تھا۔

سسرال آئے ہوئے زلیخا باجی کو دس دن ہوئے ہوں گے کہ ایک دن میری ماں مجھے ان کے گھر لے گئیں اس وقت وہ غسل کرنے کے بعد آنگن میں اپنی کمر تک لہراتی ہوئی زُلفوں کو ہوا میں سکھا رہی تھیں، ہم دونوں کو دیکھتے ہی انھوں نے

بہت تعظیم سے پلنگ پر بیٹھایا۔ پھر بہت دیر تک وہ میری ماں کے سوالوں کا ادب سے جواب دیتی رہیں — یہی کہ ان کی ماں مفلوج باپ ضعیف اور گذر اوقات کیلئے چند بیگھے زمین ہیں پھر میری ماں اپنے مقصد پر رجوع ہوئیں۔

"میں تمہارے پاس ایک خاص ضرورت سے آئی ہوں دُلہن —"

"تو بغیر جھجھک کہئے نا —" وہ ہمہ تن گوش ہوگئیں۔

"مجھے معلوم ہوا کہ تم بہت پڑھی لکھی ہو، اگر تم اپنا تھوڑا سا وقت میری لڑکی شگفتہ کی تعلیم کے لئے نکال سکو تو مجھے ایک بہت بڑی فکر سے نجات مل جائے" ماں نے کہا — "گاؤں میں لڑکیوں کے لئے عمدہ تعلیم کا کوئی انتظام نہ رہنے کی وجہ سے سخت دُشواری ہے"

"میں تو دن بھر اکیلی پڑی اُکتاتی رہتی ہوں اور وقت کاٹے نہیں کٹتا —" وہ بولیں — "کل سے شگفتہ کو بھیج دیجئے گا۔ اس کو تعلیم اور مجھے تنہائی کی ایک ساتھی مل جائے گی —"

لیکن تمھیں ایک بات بتاؤں دُلہن تاکہ تمھیں عدم واقفیت کی شکایت نہ ہو اور مجھے سُبکی —" ماں نے کہا — "شگفتہ کی شرارت سے شیطان بھی پناہ مانگتے ہیں۔"

"ہاں تم سچ مچ بہت شریر ہو؟" — وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں پھر ہنستی ہوئی بولیں — "شرارت اور تیزی ذہانت کی علامت ہے اور مجھے ایسی لڑکیاں بہت پسند ہیں۔"

پھر دوسرے دن میں ان سے قرآن مجید، اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ فارسی کی صلاحیت ان کی بڑی اچھی تھی۔ گلستاں تو وہ مجھے اس طرح پڑھاتی تھیں جیسے کہ انھیں حفظ ہو۔ شام کو جب میں گھر جانے لگی تو وہ مسکراتی ہوئی بولیں۔

"جھوٹ تمھاری ماں بولی تھیں کہ تم سے شیطان پناہ مانگتے ہیں۔ آج تو تم نے کوئی شرارت کی ہی نہیں —"

جواب میں مسکرا کر میں رہ گئی۔ اور پھر اس دن سے میرا روز کا معمول ہوگیا۔ میں دوپہر کے وقت ان کے یہاں پہنچ جاتی اور اندھیرا پھیلنے سے کچھ پہلے گھر لوٹتی تھی۔

رفتہ رفتہ ان کی محبت، خلوص اور شیریں باتوں سے میں لفٹ پاکر کسی حد تک ان سے بے تکلف ہوگئی۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھیں، میری اُستانی تھیں لیکن انھوں نے خود مجھے اپنی سہیلی کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بہت سی باتوں میں ہم دونوں کے درمیان حجاب کا پردہ لاحق تھا۔ یا ممکن ہے کہ وہ باتیں ان کے خیال سے میری سمجھ سے بالاتر ہوں اور کچھ تھیں بھی ایسی ہی، مثال کے طور پر میں یہ مطلق نہیں سمجھ پائی تھی کہ ایک دن وہ بہت چاؤ سے اپنی انگلیوں کے پور پور میں مہندی رچانے کے بعد کیوں دوسرے دن مٹی اور سنگ ریزے میں رگڑ رگڑ کر اس کی سُرخی زائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور جب میں نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تھی تو جواب میں ان کے ہونٹ قدرے پھیل کر پھر سکڑ گئے تھے۔ میں یہ بھی نہیں جان سکی تھی کہ کیوں انھوں نے مجھ سے اپنی مانگ میں افشاں بھروا کر دوسرے دن دھو ڈالی تھی۔ مجھے بہت سی دُلہنوں کو دیکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ جو سسرال میں زرق برق لباس پہنے بہت دنوں تک نئی نویلی دُلہن بنی رہیں، لیکن وہ تو ان سب سے مختلف تھیں جب میں نے انھیں ایک دن ریشمی لباس پہننے پر بہت اصرار کیا تو وہ بہت ہی اُداس ہو کر بولیں۔

"کس لئے پہنوں۔"

"آخیر سب دُلہن کس لئے پہنتی ہیں؟" میں نے فوراً سوال کیا۔

"تم بہت شریر ہو۔" انھوں نے میرے گال پر تھپکی دی، پھر آسمان کی طرف تکتی ہوئی بولیں۔۔۔ "سب میں اور مجھ میں جو فرق ہے تم نہیں سمجھو گی۔" اور میں ان کا جواب سُن کر خاموش ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ جب وہ کہتی ہیں تو ٹھیک ہی کہتی ہوں گی کیونکہ وہ عقل اور عمر میں مجھ سے بہت افضل تھیں، پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اختر مرزا کسی کام سے شہر چلے گئے تھے۔ انھوں نے مجھے رات کو بھی روک لیا۔ جب الگ الگ

بستر پر ہم دونوں لیٹ گئے تو ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، اور باتوں باتوں میں مجھے پتہ چلا کہ ان کے والد اختر مرزا کے مقروض تھے اور یہی سبب تھا دو بی بیوں کو قبرستان میں سُلائے ہوئے اختر مرزا سے ان کی شادی کا ہونا۔ مجھے ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے والد عورتوں کے پردہ کے بہت قائل ہیں اور باجی کی آنکھیں بھی ادھر اُدھر پھسل کے کوئی مرکز پر نہیں ٹھہری تھیں، اور یہ جان کر مجھے اس وجہ سے اور بھی تعجب ہوا کہ جب باجی کے خیال کی اڑان کی کوئی منزل نہیں تھی تو وہ دُلہن ہوتے ہوئے بھی کیوں دُلہنوں کی طرح سنگار نہیں کرتی تھیں۔ میں بہت دیر تک یہی سب سوچتی رہی اور سوچتے سوچتے سو گئی، پھر نہ جانے کتنی دیر سوئی رہی تھی کہ یکایک چیخ کے اُٹھ بیٹھی، کسی نے مجھے دبوچ لیا تھا، دیکھا تو وہ باجی تھیں، میرے رُخسار کو وہ اپنی ہتھیلی پر لیتی ہوئی بولیں۔

"تم بہت ڈرپوک ہو، میں ہوں تمھاری باجی ــ"

میں شرمندہ ہو گئی۔ پھر باجی نے میری گردن میں اپنی باہیں حمائل کر کے مجھے بستر پر گرا دیا۔ میں بار بار کسمسائی اور انھوں نے بار بار مجھے دبوچا، میرے رُخسار کو چوما میری پیشانی کا بوسہ لیا اور جب صبح میں نے آئینہ دیکھا تو میرے ہونٹ کئی جگہ سے چھل گئے تھے، میرے ہونٹوں کو بچپن سے اب تک نہ جانے کتنی بار میری ماں نے بھی چوما تھا لیکن اتنی وارفتگی میں نے ان میں کبھی نہیں پائی تھی جتنی کہ باجی کے چومنے میں رات تھی میں تو ان کی بے انتہا محبت سے بہت خوش تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ باجی پر اُلٹا اثر پڑا تھا، وہ شرمندہ شرمندہ بجھی بجھی سی چُپ تھیں جیسے کہ انھوں نے مجھے چوم کر کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو۔ میں نے انھیں ٹوک دیا۔

"آج آپ اُداس کیوں ہیں؟ ــ"

"نہیں تو ــ" وہ ٹال گئیں۔ حالانکہ مجھے سو فیصدی یقین تھا کہ وہ اُداس تھیں لیکن پھر میں جُرم کی جرأت نہ کر سکی۔ وہ گرچہ مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھیں لیکن میرے دل میں ان کے احترام کا جذبہ بہت تھا پھر کئی دنوں تک ان کے ہونٹوں پر چپکی کی مہر

لگی رہی، میں نے بھی ان کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ سوچا کہ یہ وقتی خاموشی ضرور کوئی دن ٹوٹے گی لیکن وہ میرے تمام تر کوششوں سے بھی نہیں ٹوٹ سکی، یہ بات تھی کہ باجی مجھے تعلیم دینے سے کنارہ کش ہو گئی تھیں، وہ مجھے پڑھاتی ضرور تھیں لیکن بالکل اس طرح جیسے کہ کوئی خشک طبیعت کا معلّم درس دیتا ہو۔

ان میں بہت بڑی تبدیلی آگئی تھی ایسی تبدیلی جس نے پہلی باجی اور اب کی باجی میں کوئی مناسبت ہی نہیں چھوڑی تھی، وہ ہنس مکھ تھیں یہ حد درجہ متین اور اور سنجیدہ، وہ درس دیتے دیتے ایک کہانی سُنا دیتی تھیں یہ درس دینے کے علاوہ کچھ بولتی ہی نہیں تھیں، میں نے بہت بار انھیں بُلانے کی کوشش کی بہت بار ان کے ہونٹوں کو مسرت سے ہمکنار کرنا چاہا لیکن ہر بار ان کی آنکھوں کے پیمانے چھلکنے سے میں کانپ گئی، اور میں نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ نہ جانے انھیں کون سا غم اُداس تر کرتا گیا۔ حالانکہ مرزاجی نے انھیں اپنے گھر کا مختار بنا دیا تھا۔ نہ ساس تھیں اور نہ نند اور اللہ نے دھن دولت سے بھی سرفراز کیا تھا پھر بھی وہ بہت سادہ غذا کھانے لگی تھیں۔ ایک دن میں نے ان سے سوال کر ہی دیا۔

"آپ کو مُرغ وماہی کیوں پسند نہیں ہیں باجی؟ —"

"تم سے یہ کس نے کہدیا کہ مجھے پسند نہیں ہیں —" باجی سنجیدگی سے بولیں۔

"پھر آپ کھاتی کیوں نہیں ہیں؟ —" میں نے اپنی نگاہیں باجی کے چہرے پر جما دیں۔

"کھا کر میں پاگل ہونا نہیں چاہتی ہوں ——" افسردگی کی ایک لہران کے چہرے پر سے گذر گئی، بولیں —— "تم نہیں سمجھو گی، جاؤ اپنا سبق یاد کرو۔" ظاہراً تو میں اپنا سبق یاد کرنے لگی مگر میرا دماغ بہت دیر تک باجی کی باتوں میں اُلجھا رہا، مُرغ وماہی تو سب کھاتے ہیں، میں خود بھی بہت چاؤ سے کھاتی ہوں لیکن میں نے نہ تو کسی کو مُرغ وماہی کھانے سے پاگل ہوتے ہوئے سُنا اور نہ خود پاگل ہوئی ہوں پھر میرا ذہن یہ ماننے کو بھی روادار نہ ہوا کہ باجی کی واقفیت صحیح نہ ہوگی

گلستاں اتنی روانی سے پڑھانے والی باجی بھلا اتنی بات کیسے نہیں جانتی ہوں گی میں ابھی اسی گتھی کو سلجھانے ہی میں لگی ہوئی تھی کہ بارش کے چھینٹوں سے برآمدے کا وہ حصہ بھیگنے لگا جہاں ہم دونوں بیٹھی ہوئی تھیں باجی اُٹھتی ہوئی بولیں۔

"چلو کمرے میں سبق یاد کرنا۔"

میں ان کے ساتھ ساتھ اختر مرزا کے اس کمرے میں آگئی جو زمینداری کے کاغذات موٹی موٹی کتابوں، اخبارات اور رسائل سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ان کا کمرہ خلاف معمول کھلا ہوا تھا یا ممکن ہے کہ وہ بند کرنا بھول گئے ہوں یا پھر اس کے کھلا رہنے کی کوئی اور وجہ ہو ورنہ میں نے تو دیکھا تھا کہ وہ کمرہ زیادہ تر بند رہتا تھا اور جب کبھی کھلا رہتا تھا تو اس سے حقّے کی گڑگڑاہٹ کی آواز نکلتی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا جس کے بستر پر کئی تکیئے پڑے تھے۔ دائیں جانب کی دیوار پر ایک چھوٹی سی شیشے کی الماری لگی ہوئی تھی اور اس میں جاپانی خوبصورت گلدان میں کپڑے کے خوبصورت پھول سجے ہوئے تھے۔ میں پلنگ پر بیٹھ کر سبق یاد کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد جب باجی اُٹھ کر کسی کام سے باہر گئیں تو گل دان کے پھول نے مجھے قریب سے نظارے کی دعوت دی میں کھڑی ہو کر الماری کے بہت قریب ہوگئی۔ پھول کی نفاست قابل تعریف تھی، پھر میری نگاہیں گل دان میں سجے ہوئے پھولوں سے ہٹ کر الماری میں رکھی شیشیوں میں منتقل ہوگئیں، ایک شیشی خضاب کی تھی، اختر مرزا بہت دنوں سے خضاب لگاتے ہیں یہ میں جانتی تھی اور یہ میں اس وجہ سے جانتی تھی کہ میرے ابا بھی خضاب لگاتے اور بہت دن ہوئے ایک بار ابا کے لئے ان سے خضاب مانگ کر لے جا چکی تھی، دوسری شیشی پر "حب جوانی" کا لیبل لگا ہوا تھا یہ "حب جوانی" کیا چیز تھی میں بالکل نہیں سمجھ سکی، ابا کی الماری میں ایسی لیبل کی شیشی کبھی میں نے دیکھی ہی نہیں تھی، دوسری شیشی "کشتہ فولاد" کی تھی، پھر اسی طرح کی بہت سی شیشیاں تھیں، کسی پر جواہر والا اور کسی پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ اور میں ابھی دیکھنے میں منہمک ہی تھی کہ

باجی کی آواز گونجی۔

"تم میں یہ ٹوہ کی عادت بہت بُری ہے شگفتہ۔"

میں نے پلٹ کر باجی کو دیکھا، ان کے چہرے پر بڑی جھلاہٹ تھی، نیوٹے ان کے پھڑپھڑا رہے تھے، میں نادم ہو کر کانپ سی گئی۔ پھر وہ میری کتابیں اُٹھاتی ہوئی بولیں۔

"بارش ختم ہو چکی ہے برآمدے میں چل کر پڑھو۔"

اور اس دن کے بعد کئی دنوں تک میں باجی کے یہاں نہیں جا سکی، یہ بات نہیں تھی کہ انھوں نے مجھے آنے سے منع کر دیا تھا یا میں ان سے خفا ہو گئی تھی بلکہ کئی دنوں تک بخار مجھے غوطہ دیے رہا اور روز باجی کا پٹواری میری خیریت دریافت کرنے آتا رہا، پھر کئی دنوں کے بعد جب میں ان کے یہاں گئی تو باجی مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

"تنہائی میں سوچتے سوچتے میں پاگل ہوئی جا رہی تھی ——"

"کیا سوچتی رہی ہیں آپ؟" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں ——" وہ ٹال گئیں، پھر اپنی ڈائری کے اوراق کے اندر اپنا قلم رکھتی ہوئی بولیں —— "تم اپنا پچھلا سبق دُہراؤ میں فوراً دال بگھار آتی ہوں ——" میں اپنا پچھلا سبق دُہرانے لگی اور کن انکھیوں سے باجی کو تکتی رہی، باجی کی ڈائری پڑھنے کی میری بہت پرانی آرزو تھی، لیکن وہ کبھی اپنی ڈائری چھوڑتی ہی نہیں تھیں لکھتی تھیں اور اپنے بکس میں بند کر آتی تھیں، لیکن آج شاید وہ بھول گئی تھیں، ایک بار پیاز چھیلنے میں باجی نے دوسری طرف مُنہ پھیرا، میں نے پھرتی سے ڈائری کا وہ ورق کھول دیا جہاں قلم رکھا ہوا تھا۔ ڈائری کے ورق کے اوپر آج کی تاریخ اور اس کے نیچے باجی کی تحریر، لکھا تھا۔

"انسان کو اپنی زندگی کی کشمکش اور خلش سے نجات پانے کے لیے خودکشی ایک راہ تھی تو اس راہ کو بھی خُدا نے اپنے بندوں پر حرام قرار دے کر بند کر رکھی

ہے اور اب کوئی ذی شعور انسان حرام موت مرنا کس طرح گوارا کرے۔"

میں نے ڈائری کا پھر پچھلا ورق کھولنا چاہا لیکن وہ دال بگھار کے واپس آرہی تھیں جلدی سے میں نے ڈائری بند کردی اور زور زور سے اپنا پچھلا سبق دُہرانے لگی۔ اس رات بھی باجی نے میرے گھر اطلاع کراکر مجھے اپنے یہاں روک لیا۔ مرزاجی پھر شہر گئے ہوئے تھے۔ الگ الگ بستر پر رات گئے جب ہم دونوں لیٹ گئیں تو بہت دیر تک میں اپنی آنکھیں بند کئے اپنے بستر پر باجی کا انتظار کرتی رہی لیکن نہیں آئیں، وہ اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی رہیں، اور بار بار ان کے ہونٹوں پر "مَیں کیا کروں" کی آواز تھرتھراتی رہی، میں نے بہت سوچا کہ آخر باجی کیا کرنا چاہتی ہیں کس خلش سے وہ بے چین ہیں۔ مگر میں کچھ نہ سمجھ سکی اور سوچتے سوچتے میں نہ جانے کب سو گئی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو تم؟" باجی چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتی ہوئی بولیں ـــــ "تمھیں بھی میری طرح سوچنے کا مرض لاحق ہو گیا ہے کیا؟ ـــــ"

"جی نہیں تو ـــــ" میں نے پردہ پوشی کی، اب میں ان سے کیا کہتی کہ جب تک وہ چائے بناتی رہی تھیں میں ان کے ہی متعلق سوچتی رہی تھی، پھر بہت دیر تک وہ مجھ سے سوالات کرتی رہیں یہی کہ میرے شوہر کیسے ہیں، کیا کرتے ہیں، مجھے مانتے ہیں یا نہیں، اور میں اپنی نئی زندگی سے آسودہ ہوں یا نہیں، اور میں انھیں مناسب جواب دیتی رہی پھر میں جب اُٹھ کر اپنے گھر جانے لگی تو میں نے ایک بار پھر باجی کو بہت غور سے دیکھا۔ اب ان کی وہ آواز جو نیند کی غفلت میں ان کے ہونٹوں پر کبھی کبھی تھرتھراتی تھی ان کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان بن کر واضح ہو گئی تھی، جیسے کہ وہ مجھ سے اور سب سے پوچھ رہی ہوں کہ وہ کیا کریں؟ اور پھر میں جب تک گاؤں میں رہی ان کے بار بار بُلاوے پر بھی ان سے نہیں ملی سچ کہتی ہوں کہ مجھے ان سے ملنے کی ہمت ہی نہیں، میکے سے سسرال آئے مجھے کافی دن گذر چکے ہیں لیکن اب بھی جب کبھی باجی یاد آتی ہیں تو جیسے کہ وہ میرے

سامنے بیٹھی ہوں اور ان کے چہرے پر "میں کیا کروں" کا واضح نشان مجھ سے کوئی باعزت راستہ پوچھ رہا ہو ——— جس راستے پر میں انھیں چلنے کا مشورہ دے کر رُسوائیوں کا مقابلہ کیے بغیر ان کے اس خلش سے نجات دلا دیتی جس خلش کو اب میں اچھی طرح جان چکی تھی۔
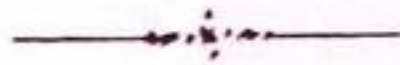
الزام ان کو دیتے تھے

رحمٰن حمیدی

فرطِ غضب سے میری آنکھیں انگارے کی طرح سُرخ ہوگئیں، اور جسم نفرت و غصہ کی شدت سے کانپنے لگا۔ پرویز کی اس حرکت نے مجھے نفرت و حقارت کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا۔ میرے رنگین خواب اور رومان آفرین خیالات پر ایسی بجلی گری کہ میرے خوش آئند مستقبل کا حسین تاج محل گر کر چکنا چور ہوگیا۔ اور میری خوشبوؤں سے شاداب چمن حیات خزاں آلود ہوگئی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنا ذلیل اور نیچ ہو سکتا ہے، اس کی زندگی کا دوسرا رخ اتنا نفرت آگیں اور قابلِ ملامت ہو سکتا ہے۔

اگر کسی اور کی زبانی یہ بات مجھے معلوم ہوتی تو ہرگز یقین نہ آتا لیکن اپنی آنکھوں کو کیسے جھٹلا سکتی ہوں، دیدہ و دانستہ خود کو فریب کیسے دے سکتی ہوں۔ آخر مجھ میں کون سی کمی آگئی ہے کہ وہ کسی اور کو چاہنے لگے ہیں۔ اسے پیار و محبت سے لبریز خطوط لکھتے ہیں۔ اور اس کے خطوط ڈائری میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ اب میری سمجھ میں آیا۔ آفس کی مصروفیت کے بہانے وہ کہاں رہتے ہیں۔ لیکن انہیں یہی کرنا تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی؟ حالاں کہ میرے والدین تو شادی کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ شادی تو ان کی خواہش اور اصرار پر ہوئی ہے۔

چند روز کی بات ہے، وہ مجھ سے کہہ رہے تھے ”نوشابہ سہاگ کی رات جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تمہاری نشیلی اور مخمور آنکھیں میں مجھے اپنے خوابوں کا سرور

نظر آیا۔ میں نے دیکھا، تمہاری ان آنکھوں میں شراب و شباب کی رنگین دنیا ہے۔ میں نے دل سے کہا، میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ اس دنیا کا مالک ہوں، میں اپنی خوش نصیبی پر مسکرا اٹھا۔"

شادی کے چند ماہ بعد انھوں نے مجھے اپنے ماضی کے بارے میں بتایا تھا

"میری پیدائش کب اور کہاں ہوئی مجھے علم نہیں، میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو یتیم خانہ کی چہار دیواری میں پایا۔ میں نے یتیم خانہ سے میٹرک کرکے "مرغوب حسین اینڈ کو" میں سروس جوائن کرلی۔ میں نے اس قلیل آمدنی سے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ خدا کی مہربانی ایسی ہوئی کہ ایم۔ اے کے رزلٹ کے ساتھ ہی پٹنہ گورنمنٹ کالج میں لکچررشپ مل گئی"

وہ سنجیدہ ہوگیا۔ لیکن میرے دل میں ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ایسی شریک حیات ملے جس کے زلفوں کی چھاؤں میں رہ کر زندگی کا سارا کرب و اذیت بھول جاؤں اور حسن راحت جاں کی باہوں میں کھو کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاؤں۔" وہ مسکرانے لگا۔" نوشابہ! میں غم زندگی کے اندھیروں سے تنگ آچکا تھا۔ وادیٔ حیات کی تنگ و تاریک راہوں پر صرف تمہاری شمع محبت کی ضرورت تھی۔ اور جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو، اندھیرے مٹ گئے ہیں حیات کی بے آب و گیاہ وادی میں پیار و محبت کے سوتے پھوٹ پڑے ہیں، زندگی بہار بداماں ہوگئی ہے۔"

یہ سب جھوٹ ہے، چھل ہے، فریب ہے، میں ان کے شیریں کلامی کے دھوکے میں ہرگز نہیں آسکتی، آج اگر میں ان کے سلف کی صفائی نہ کرتی تو یہ راز کبھی افشاں نہ ہوتا۔ اور میں زندگی پھر اندھیرے میں بھٹکتی رہتی۔ ڈائری کے اوراق سے نکل کر ایک خط میرے قدموں پر گر پڑا۔ غیر ارادی طور پر میں اٹھا کر پڑھنے لگی۔

میری زندگی!

ایک ہفتہ سے تمہاری خیریت نہیں مل رہی ہے، جس کی وجہ سے طبیعت بے حد پریشان ہے، ہر وقت تمہاری فکر لگی رہتی ہے

آخر کیسی مصروفیت ہے کہ دو سطر لکھنے کی مہلت نہیں مل رہی ہے

اب زیادہ نہ تڑپاؤ! دیر نہ کرو، تمہارے بغیر ہر طرف اداسی پھیلی ہوئی ہے۔

صرف تمہاری اپنی

شدّتِ غضب سے میرا جسم کانپنے لگا، ایک ایک لفظ خارِ مغیلاں کی طرح میرے ذہن میں چبھنے لگے، میرا سر چکرانے لگا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہر طرف آتشیں لہریں پھیل رہی ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے خط ان کی میز پر پھینک دیا۔ میں غم اور نفرت و حقارت کی آگ میں جل رہی تھی۔ واقعی مردوں کے پیار اور کچے دھاگے کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ سوچ کر میری پلکیں بھیگ گئیں۔ پرویز کو پہچاننے میں مجھ سے کتنی بڑی بھول ہوئی ہے، زندگی کی سب سے بڑی بھول۔!!

میرے ہوتے وہ کسی اور سے پیار کریں، کسی اور سے دل بہلائیں کسی اور کو رومان آفریں خطوط لکھیں۔ یہ ناممکن ہے، میں یہ کبھی نہ ہونے دوں گی، جب میرے تصوّر میں بھی پرویز کے سوا کسی کا خیال تک نہیں گذرا تو پھر میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ میرے ہوتے وہ کسی اور کو پیار کریں۔ یہ میری محبت کی توہین ہے، یہ میری نسوانیت پر کاری ضرب ہے۔

ضرور یہ خط ان کے کالج کی طالبہ صفیہ کا ہے، جس سے ان کا نیا رومان چل رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی اس کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں، اس کی ہر چیز انہیں بے حد محبوب ہے، اس کی ہر ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ میں بھی کتنی نادان ہوں، ان باتوں کو سمجھ نہ سکی۔ لیکن اب انہیں فیصلہ کرنا ہوگا، انہیں کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ اب میں اس گھر میں ہرگز نہیں رہ سکتی۔ اور اگر میں رہ گئی تو زندگی اجیرن ہو جائے گی اور میری حیات کا کارواں مفلوج اور اپاہج ہو جائے گا۔ اور میں تادمِ حیات آہوں اور سسکیوں کے درمیان تڑپتی اور روتی رہوں گی۔

شام کے وقت پرویز جیسے ہی کالج سے آیا۔ میرا غصہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔

"شادی شدہ ہو کر کسی لڑکی سے محبت کرتے آپ کو شرم نہیں آتی ـــــ!؟

"کیا کہہ رہی ہو ـــــ؟" وہ چونک پڑا۔

"دیکھئے انجام بننے کی کوشش نہ کیجئے، میں نے صفیہ کا خط پڑھ لیا ہے۔ اگر آپ کو یہی کرنا تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی، میری زندگی سے کھیلنے کے لئے ـــــ؟

"کہاں ہے وہ خط؟"

"یہ لیجئے۔"

پرویز نے خط کو غور سے دیکھ کر پوچھا "یہ خط تمہیں کہاں ملا، اس طرح کے اور بھی خطوط میری ڈائری میں ہیں، حیرت ہے، تم اپنی ہینڈ رائٹنگ بھی نہیں پہچانتی ہو۔"

پرویز مسکرا رہا تھا۔

اور میں فرطِ ندامت سے اشک آلود ہو گئی۔!!

نئے تیشے نئے کوہکن

بیچ کا ورق

ظفر اوگانوی

اس نے اپنے سات منزلہ مکان کی چھت پر آج پہلی بار یہ محسوس کیا کہ وہ اپنی بلندیوں میں بھی تنہا ہے اور تنہائی میں بھی بے مثال ہے اس کے ایک گال پر فخر کی سُرخی تھی اور دوسرے پر کرب کا پیلاپن۔ وہ اس ملے جُلے احساس کے ساتھ چھت کے اس جانب آگیا جہاں سے جُھک کر عمارت کے لان کو دیکھا جاسکتا تھا۔ اس نے نیچے بہت ہی نیچے جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک سناٹا، خاموشی کی ایک بے مفہوم فضا۔ اس نے آنکھیں ملیں پھر دیکھا۔ پھولوں کی کیاریوں میں سورج کا پگھلا ہوا خون جم چکا تھا۔ زمین کے ہونٹ پر پپڑیاں پڑچکی تھیں۔ مرکزی پھاٹک کے دونوں طرف پام کے دو لانبے، سڈول پیڑ جانے کب سے سنتری بنے کھڑے تھے اور جھلس رہے تھے کہ اب ان کی شاخیں سوکھ سوکھ کر کسی کوڑھی کے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح گرتی رہی تھیں اور اب ٹھنٹھ ہاتھوں سے وہ ایک دوسرے کو چھو بھی نہیں سکتے تھے، حلق میں کانٹے پڑچکے تھے اور اب وہ ایک دوسرے کو پوچھ بھی نہیں سکتے تھے۔ آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں بچا تھا اور اب وہ اپنے ساتھی کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے ——

اور پھاٹک کچھ یوں بند تھا، کچھ یوں کُھلا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی آئے گا، جیسے ابھی ابھی کوئی گیا ہے۔ اتنے میں گرد آلود ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس کی آنکھوں میں گھُس گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں پھر وہاں سے اُٹھ کر دوسری سمت کو آگیا۔ گرد سے اَٹی ہوئی آنکھوں کے باوجود اس نے از سرِ نَو اپنے آپ کو خم کیا۔ گردن لانبی کی اور نیچے بہت ہی نیچے تاکنے لگا۔ عمارت کے احاطے ہیں چار دیواری سے ملا ہوا پائیں باغ میں جانے کے لئے راستہ۔ اس نے اپنی گردن سیدھی کی۔ احاطے کے باہر

سڑک، راستے، مسافت اور شاہراہیں جی پڑی تھیں کہیں کسی کا نقش قدم نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اپنی ان دونوں آنکھوں سے دیکھا جس میں فخر کی چمک کے سوا کبھی کوئی اور چمک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ مگر آج اس کے چہرے سے اس کی آنکھوں سے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود پگھل جائے گا اور مسافتوں میں تحلیل ہو جائے گا ـــــ پھر اس نے گردن اٹھا کر سورج کو دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا ہو رہا تھا اور سورج کے جسم میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ دن یرقان کے اثر سے زرد ہو چکا تھا ـــــ مگر گرد کا جھونکا اس کی آنکھوں کو یہاں بھی پا گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور اب اس جانب آکر کھڑا ہو گیا جہاں سے جھک کر وہ تالاب دیکھ رہا تھا۔ اس میں کوئی مچھلی نہیں تھی۔ اگر کچھ تھا تو صرف بے جان لہریں تھیں اور تا حد نظر ریگستان، سمندر اور اس کا پھیکا عکس تھا ـــ پھر دھول اُڑی اس کی آنکھوں کو چندھیا گئی۔ وہ اُٹھ کر بن منڈیر کی چھت کے اس طرف آگیا جو اس کے مکان کا پچھلا حصہ تھا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ پائیں باغ جھلس چکا تھا اور سامنے جنگل تھا خاموش آوازوں کی ایک ہیبت ناکی تھی۔ جو بڑھتے ہوئے اونچے سیاہ پہاڑوں سے ٹکرا رہی تھی۔

اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا، نئے سرے سے اس نے چاروں سمتوں کا جائزہ لیا۔ پھر اپنی آنکھیں ملیں اور اس جھلسا دینے والی تپش میں بھی وہ چھت کے بیچوں بیچ آکر بیٹھ گیا۔ بیٹھا رہا ـــ سوچتا رہا کہ ساتویں منزل کی چھت جس کے اوپر وہ ہے اس کے اوپر کچھ نہیں ہے، آخر ایسا کیوں ایسا کیوں ـــــ اس لمحے اس نے یہ بھی دیکھا کہ آفتاب ٹھٹکا کھڑا ہے اور اس کے سر کے اوپر سے گذرتے ہوئے اس کے قدم رک گئے ہیں شعاعیں اس کو دیکھ کر پیچھے کی سمت مڑ رہی ہیں۔ ہوا رکی کھڑی ہے۔ گرد و غبار کا دور دور پتہ نہیں ہے اور اس کی آنکھیں بالکل شفاف ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ ویرانے میں سات منزلہ عمارت کچھ یوں لگ رہی تھی جیسے یہاں اب اس کے سوا کوئی نہیں آئے گا۔ تنہائی

کی گرمی میں عمارت جھلس کر سیاہ ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کے گالوں پر بے اطمینانی کا سایہ لہرانے لگا تھا ـــــ وہ بس وہیں بیٹھا سوچتا رہا ـــــ سوچتا رہا کہ کیا ہو اتنے میں اس کے چہرے پر ایک بجلی کوندی۔ دل کا عکس یہاں وہاں نظر آنے لگا تو اس نے دونوں ہاتھ کی نوکیلی انگلیاں اپنے چوڑے سینے کے بیچوں بیچ گاڑ دیں۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے دونوں طرف کی پسلیوں کو علیحدہ کیا اور دائیں ہاتھ کو سینے کے اندر لے جاکر بائیں طرف سے ایک سادہ کاغذ نکالا اس کے بعد ایک پسلی نکالی اور اس کو بائیں طرف سینے میں ڈبو کر سادہ کاغذ پر لکھنے لگا لکھتا رہا۔ دونوں صفحے پر جب وہ لکھ چکا تو اس نے اپنے کھلے سینے کے اندر سے دوسرا سادہ ورق نکالا۔ جب وہ بھی دونوں طرف لکھا جا چکا تو اس نے اس کو پہلے ورق پر رکھ دیا ـــــ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ورق لکھے جاتے رہے۔ دوسرے پر تیسرا تیسرے پر چوتھا۔ پانچواں چھٹا۔ لکھنے کے دوران اس نے کسی سمت نہیں دیکھا۔ بس وہ لکھتا رہا وہاں کوئی نہ تھا۔ سورج رکا ہوا تھا۔ ہوا ششدر تھی۔ اس کے چہرے پر روشنی کا لطیف ارتعاش تھا اور وہ ان سب سے بے نیاز اپنی پسلی کو سینے میں بائیں طرف ڈبوتا اور لکھنے لگتا۔

جب اس کے چاروں طرف ورق ہی ورق ہو گئے تو اس نے اپنا ہاتھ روکا اور اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے چاروں سمت ڈالی۔ ورقوں کی چار دیواری اس حد تک اونچی ہو چکی تھیں کہ اب وہ اس میں محدود ہونے کو تھا اور جب اس نے محسوس کیا کہ یہ چار دیواری خود اس کے لئے ہی زنداں بن جائے گی تو اسی وقت اس نے اپنی پسلی سینے میں اپنی جگہ واپس لگا دی۔ پھر دونوں طرف کی پسلیوں کو سمیٹا اور ایک دوسرے میں پیوست کر دیں ـــــ اس طرح خود کو اصلی ہیئت میں واپس لاکر اس نے ہلکا محسوس کیا اور چاروں طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سورج اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ ویرانی اپنی جگہ بے بس تھی۔ پھر وہ چھت کے کنارے پر آیا۔ اس نے دیکھا۔ سمندر سوکھ چکے تھے۔ پہاڑ پگھل رہے تھے۔ جنگلوں میں آگ لگ رہی تھی۔ تب ہی اس کی آنکھوں کے لمس سے شعاعیں نرم پڑ گئیں، سورج

مرتعش ہوگیا۔ زمین حرکت میں آگئی۔ اس پر بھی جب اس کے اندر ٹھنڈک کا احساس نہیں جاگ سکا تو اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ نتیجے میں ہوائیں سمٹیں اور ایک طوفان کی صورت اس کی طرف بڑھنے لگیں۔ طوفان بہت تیزی کے ساتھ آنے کو تھا۔ اس خوف سے کہ یہ لکھے ہوئے ورق کہیں ضائع نہ ہو جائیں اس نے جلدی جلدی ورق سمیٹنا شروع کر دیا مگر اندر کھینچی ہوئی طویل سانس کا ردِ عمل دیکھتے دیکھتے سامنے آگیا اور سارے ورق ہاتھ میں لیتے لیتے طوفان اس کو چھو گیا اور دونوں ہاتھ سے جلدی جلدی سمیٹنے کی کوشش کے باوجود ایک ورق درمیان سے اُڑ کر طوفان کے دوش پر چل پڑا۔

اب ورق اُڑتے ہوئے اوپر اُٹھ رہا تھا، آگے جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے ایک لمحے کو کچھ سوچا اور سارے ورق وہیں چھوڑ چھاڑ کر اس ایک کو حاصل کرنے کیلئے وہ بے تاب ہوگیا اس کے بغیر تسلسل ممکن نہیں ہے۔ پھر اُٹھا اور ورق کو تاکتے ہوئے پہلے چھت پر دوڑا۔ وہ احاطے سے باہر عمارت کی پچھلی سمت اوپر اُٹھتے ہوئے آگے کی طرف جا رہا تھا۔ سیڑھیوں سے اُتر کر جانے میں دیر ہو سکتی ہے۔ اس نے سوچا اور ساتویں منزل کی چھت سے کود پڑا۔ ورق ہوا کے دوش پر جنگل کے رُخ جا رہا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو دیکھتے دیکھتے طوفان سے آگے جا سکتا تھا مگر اس نے اپنے پیروں کو تیز رفتاری کے عمل سے باز رکھا کہ خواہشوں کا اپنا وجود ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر ہوا کے دوش پر سے اس کو اُتار سکتا تھا لیکن اختیار کے مشاہدے میں اس کو اس سے بھی گزرنا تھا۔ اسی لئے وہ سمندروں سے گذرا۔ پہاڑوں پر چڑھا۔ ریگستانوں میں جھلسا۔ چلتا رہا۔ دوڑتا رہا۔ آخر کار اس اُڑتے ہوئے ورق نے کہ ہوا کے ساتھ چلتے چلتے بے ہمت ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ اُترنے کی ٹھہرائی۔ وہ یہ دیکھ کر مسکرایا — مسکرایا کہ جنگل کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی اور ورق جلنے سے بچ گیا تھا۔ سب سے اونچے پہاڑ کی سب سے اونچی چٹان پر، اس کی عمارت سے کروڑوں دن کی مسافت کے فاصلے پر اتر گیا۔ وہ بالکل محفوظ تھا، اس میں ایک نقطے کی تبدیلی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ پہنچا اور مسکراتے ہوئے اس نے

اپنی چٹکیوں سے اس کو اُٹھالیا۔ کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ جب ہر طرح سے مطمئن ہو گیا تو اپنے پنجوں سے سینے کی پسلیوں کو الگ کر کے اس نے ایک شگاف بنایا اور اس کو اپنے سینے میں ڈال کر پسلیاں برابر کر لیں ـــ اب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ مکان کی طرف واپس جائے اور دیکھے کہ بقیہ ورق جنھیں وہ چھوڑ کر آ گیا تھا، کس حال میں ہیں۔ راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ پہنچتے ہی وہ ان سارے ورقوں کو نمبر کی زنجیر میں جکڑ دے گا کہ پھر کوئی ورق ادھر اُدھر نہ ہو اور ترتیب بہت ہی ٹھوس اور مستقل ہو ـــ جب وہ اپنے ویران مکان کے پھاٹک کے پاس پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ یہ اب تک اسی طرح بند ہے۔ اس میں کوئی داخل نہیں ہوا ہے۔ یہاں کون آ سکتا ہے اس سرگوشی کے ساتھ اس نے پھاٹک کھولا۔ لان سے ہو کر پہلی منزل پر آیا۔ اس نے دیکھا۔ ویرانی میں کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا۔ دوسری، تیسری اور سبھی منزلیں ٹھیک ٹھاک تھیں۔ ساتویں منزل پر جاتے ہوئے اس نے نچلے زینے کو دیکھ کر فیصلہ کر لیا کہ اب چھت سے وہ اس وقت تک نیچے نہیں اُترے گا جب تک کہ ترتیب کا کام مکمل نہ ہو جائے۔

لیکن یہ کیا ـــ اس کے چہرے پر غصّے کی ایک واضح سرخی دوڑ گئی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ آنکھوں میں سُرخ شعلے ناچنے لگے۔ سارے ورق غائب تھے۔ کوئی ایک وہاں موجود نہ تھا۔ کون لے جا سکتا ہے اوہ۔ طوفان ہی سارے ورق اُڑا لے گیا ہو گا۔ غصّے میں اس نے سورج کو دیکھا، سورج پگھل گیا۔ جنگلوں میں سرنو آگ لگ گئی۔ سمندروں کا پانی کھولنے لگا۔ پہاڑ چٹخنے لگے اور طوفان جو پہاڑوں کی دوسری سمت کہیں گذر رہا تھا، رُک گیا۔ واپس لوٹنے لگا کہ اس کو واپس ہونا ہی تھا۔ لوٹا تو اس کے دوش پر ایک ورق بھی موجود نہیں تھا اس کا چہرہ جُھلسا ہوا تھا اور سیاہ جُھلسے ذرے اس کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑے کانپ رہے تھے۔

پھر اس نے ان سارے چہروں کو ایک شفقت سے دیکھا، گویا ان کا جُرم معاف کر دیا گیا ہو اس کے بعد وہ چھت کے کنارے پر آیا اور جُھک کر دیکھنے لگا۔ سڑکیں، شاہ راہیں، مسافتیں ہر ایک جگہ ورق ہی ورق تھے پھر وہ دوسری سمت

آیا۔اس نے دیکھا۔سمندر کی سطح پر چند ورق تیرتے رہے تھے۔پانی ٹھنڈا، شفاف، سبک رفتار تھا۔پہاڑوں کے ٹیلے شاداب تھے، لہلہا رہے تھے۔ جنگل کی آگ بجھ چکی تھی اور ورق چاروں اور پھیل چکے تھے۔لیکن اس کے اپنے مکان کے احاطے میں کوئی تبدیلی نہیں تھی، کوئی ورق یہاں نہیں تھا۔ اور بام کے دونوں پیڑ کوڑھی سنتریوں کی طرح اب بھی ایک دوسرے کے غم کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھے سورج کا لہو اب تک لان کی کیاریوں میں جما پڑا تھا۔ہونٹوں پر پپڑیاں تھیں اور پھاٹک اب بھی کچھ یوں بند تھا۔کچھ یوں کھلا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی گیا ہے۔

اس کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ کی انگلیوں سے پسلیوں کو الگ کر کے سینے کا جوڑ کھولا اور مدفن سے اس ورق کو نکالا جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا، جس سے حال اور مستقبل کے سارے علاقے ٹوٹ گئے تھے۔بہت ہی حسرت کے ساتھ اس کو چند لمحے بس یوں ہی تکتے رہنے کے بعد اس نے اس ورق کو پھاڑ ڈالا پرزے پرزے کر دیئے اور چھت کی ہر ایک سمت سے سبھی پرزے اس نے ہوا میں اڑا دیئے اور وہ اڑتے رہے۔اڑتے رہے۔کوئی شاہراہوں پر نکل گیا، کوئی جنگل کی طرف اڑ گیا۔کوئی اس کے مکان کے احاطے میں ہی گر گیا۔

تب ہی اس نے دیکھا کہ وہ سارے ورق جو اپنے ساتھی کی تلاش میں چاروں اور پھیل چکے تھے۔اس کے مکان کے پھاٹک سے باہر جوق در جوق کھڑے ہیں اور ہر ایک کاندھا اپنے ساتھی کی لاش کے ایک ایک ٹکڑے کا کرب سہ رہا ہے۔یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔اس نے نیچے آکر پھاٹک کھولا سارے ورق اندر داخل ہوتے چلے گئے۔اس نے ان کے کاندھے پر سے سارے اعضا اکٹھا کئے اور جوڑنے بیٹھ گیا۔

اور جب سارے پرزوں کو وہ جوڑنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے پہلے ورق کو آواز دی کہ ترتیب کے کام میں اب کسی طرح کی دیر نہیں ہونی چاہیے اس نے

دیکھا۔ سارے ورق اپنی جگہ کھڑے ہیں ان میں سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھ رہا ہے اس بار اس نے قدرے غصّہ میں پہلے ورق کو پکارا۔ پھر بھی کوئی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ہر ایک اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ تیسری بار اس نے بے انتہا طیش میں حکم دیا کہ پہلا ورق سامنے آئے۔ اس کو دیکھ کر بہت ہی تعجب ہوا کہ پہلے ورق کے نام پر ہر ایک ورق آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ان میں پہلا ورق کوئی نہیں تھا۔ آخری ورق کوئی نہیں تھا —— پھر اس نے ان سبھوں کے جرم کو معاف کر دیا۔

———٭———

پائن کاٹج

(قمر التوحید)

مَیں آوارہ روح نہیں ہوں اگرچہ میرے پیروں میں گردش ہے۔ مَیں خلاؤں میں نہیں بلکہ ٹھوس زمین پر چلتا ہوں۔

میں خالق ہوں۔ میری تخلیق زورِ قلم سے نہیں بلکہ ان آنکھوں سے ہوتی ہے جن سے میں وہ دیکھتا ہوں جو اور نہیں دیکھتے۔ میری آنکھیں برچھی کی انی ہیں جو ماضی کی منجمد کائیاں کھرچ ڈالتی ہیں۔ ہیئت بریدہ، مَیں، ماضی، حال اور مستقبل کی ایک متحرک اکائی ہوں۔ مجھ میں وقت گُم ہے اور میں وقت ہیں۔ جب میں ایک جگ کی بے کیف ساعت کے بعد کماؤں ریجی منٹل سنٹر کے عقب میں واقع ایک قدیم عیسائی قبرستان کے روبرو اُس خوبصورت مگر سوگوار بنگلہ کے سامنے رُکتا ہوں جس کا نام "پائن کاٹج" (Pine Cottage) ہے تو مجھے حیرت نہیں ہوتی ہے۔ یہ میرا گھر ہے اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔ اس کے دروازے بند ہیں۔ بڑے بڑے زنگ آلود تالے ہی اس کے پہرے دار ہیں۔ اس کے وسیع احاطہ میں لانبے لانبے چیڑ اور دیودار کی الم انگیز سائیں سائیں اور ان کی مضمحل غیر مربوط بازگشت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ صحن، برآمدے غلام گردشیں، چیڑ کی خشک مگر ملائم پتیوں سے اَٹی، اس کاٹج کے پُر اسرار ماضی کو ڈھکنے کی کوشش کر رہی ہیں...... لیکن میں سب کچھ دیکھتا ہوں کیونکہ میں آنکھیں ہوں، پلکوں کے غلاف سے عاری۔

میں ان خشک و بے جان پتوں پر اپنے عنکبوتی قدموں کے مبہم نقوش چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہوں اور ملگجے ہاتھوں سے ڈرائنگ روم کے زنگ آلود قفل توڑ دیتا ہوں۔ دروازے کُھلتے ہیں اور میرے جانے پہچانے مگر الم گزیدہ ڈرائینگ

روم میں ایک مضحکہ خیز چپ چراہٹ کی غیر مانوس و بے جان بازگشت آڑی ترچھی پھیل جاتی ہے۔ اس کمرے میں چار روشن دان ہیں۔ ایک کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور اسی کے ذریعہ اس کا، زندگی سے رشتہ قائم ہے۔ ڈوبتے سورج کی قرمزی شعاعیں وہاں سے کمرے میں داخل ہو کر مکڑے کے ایک مہیب مگر خوبصورت جال پر رُک گئی ہیں اور جال کا ہر تار ریشمی لچھے کی طرح تابناک ہو رہا ہے۔ غربی دیوار پر لیوُنارڈو ڈاونچی کی نامکمل "لاسٹ سپر"، مشرقی دیوار پر روڈن کا "مفکر" اور اس سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی آٹھ انچ کے فاصلہ پر پیکاسو کی "خاموش زندگی" آویزاں ہیں۔ ایک گوشہ میں وینس ڈی میلو کا مجسمہ گرد سے اٹا پڑا ہے اور دوسرے میں کماؤنی رقص کے چند مجسمے ایک میز پر سجے رکھے ہیں۔ میں روشن دانوں کو کھولتا ہوں۔ قیمتی قالین پر رکھے ایک وکٹورین صوفے کی گرد صاف کرتا ہوں اور اس کے اوپر پھیلے عنکبوت کی چھتری کے زیر سایہ بیٹھ کر اس زندگی کی تخلیق کرتا ہوں جو اس کاٹج کی زندگی تھی۔ حسین، خوشگوار، مترنم۔

میں مرحوم بسنت رام ہوں۔ ۹ اگست ۱۹۴۲ کی صبح کو اپنی کوکھ جلی ماں کی آواز پر ریلوے سروس سے دستبردار ہوا اور کھادی پہن کر حریت کے سیلِ رواں میں جا ملا۔ اور پھر زنداں کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔ ایک سال بعد جیل سے رہائی حاصل ہوئی تو میں سیدھا کلکتہ آیا اور اپنی حسین بیوی رادھیکا اور واحد لڑکی نیلم کو دوبارہ پاکر بے حد خوش ہوا۔ جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرے تو اس وقت بھی میں کلکتہ ہی میں تھا مگر آزادی کے ایک سال بعد یہاں کی تیز رفتار مصنوعی زندگی سے گھبرا کر رانی کھیت جیسے، خاموش مقام پر منتقل ہو گیا۔ یہاں میں نے چیڑ اور دیودار کی تجارت شروع کر دی اور اس میں فروغ پاکر ایک انگریز سے یہ مکان خرید لیا جو بعد میں "پائن کاٹج"، کے نام سے مشہور ہو گیا۔

میرا "پائن کاٹج" گوتھک طرز تعمیر کا ایک حسین نمونہ تھا اس کی مثلث نما دیواروں اور برآمدوں اور اس کی نوکیلی چھتوں میں مجھے ایک غیر مرئی سکون ملا۔ دوسری جنگ عظیم

کی تباہ کاریاں میرے ذہن سے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح چپکی تھیں اور اسی لئے میں نے اپنے گھر کو موسیقی، مصوری اور آرٹ کا ایک شوالہ بنا دیا۔ رفتہ رفتہ "پائن کاٹیج" کماؤں ریجیمنٹل سنٹر کے آفیسروں کے لئے ایک "شانگریلا" بن گیا جہاں وہ اکثر اپنی شامیں گذارتے اور اپنے ذوق کی تسکین کرتے ......

پھر ایک رات آئی ......

بجلی کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج میں لپٹی مہیب رات۔ اور جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی تو میں نے دل میں ایک درد محسوس کیا اور میری شمع زندگی گُل ہو گئی۔ نیلم ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ وہ اپنے ڈیڈی کے آخری سفر کے وقت ان کے پاس نہیں پہنچ سکی دوسرے دن مجھے نذر آتش کر دیا گیا اور ایک قصہ ختم ہو گیا۔ مگر قصہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس کا آغاز ہوا۔

نیلم ہمیشہ کے لئے رانی کھیت چلی آئی۔ اپنی جوان اور حسین ماں کی گود میں، اس نے باپ کی موت کا غم جلد ہی بھلا دیا ماں اور بیٹی نے، ایک دوسرے کے پاکیزہ پیار میں سرشار، خود کو وقت کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ "پائن کاٹیج" کی سوگوار فضا ایک بار پھر مترنم ہو گئی۔

جون کی ایک خوبصورت دوپہر تھی۔ رانی کھیت میں ٹورسٹس کا تانتا شروع ہو گیا تھا۔ ایک بس کماؤں ریجیمنٹل سنٹر کے چک پوسٹ پر آ کر رُکی اور اس پر سے ایک شخص جس کے چہرے پر حُسن اور وقار کا ایک خوبصورت امتزاج تھا، اُترا۔ ایک قلی نے اس کا مختصر سا سامان اُٹھایا اور دونوں بائیں جانب نشیب کی طرف جانے والی سڑک پر چل دیئے۔ جب وہ عیسائی قبرستان کے سامنے آئے تو وہاں رُک گئے۔ پھر داہنی طرف مڑ کر دیکھا تو سامنے ہی "پائن کاٹیج" تھا۔ اس شخص نے بڑھ کر گیٹ کھولا۔ اندر داخل ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ قلی بھی۔ کاٹیج کے پورٹیکو پر وہ رُکے ہی تھے کہ نیلم کی آواز آئی۔

"ممی، ممی جلد آؤ، میرے پروفیسر صاحب آئے ہیں۔"

پھر فوراً ہی ڈرائنگ روم کے دروازے کھلے اور نیلم پروفیسر کے سامنے ایک

الھڑ دیو داسی جیسی کھڑی تھی وہ تقریباً ہانپتی ہوئی بولی۔

"ایک حسین تعجب۔ آپ نے آنے کی اطلاع تو دی ہوتی۔ میں نے تو سمجھ رکھا تھا کہ آپ میری دعوت بھول چکے ہیں۔"

"دعوتیں بھولی نہیں جاتی ہیں، نیلو۔" پروفیسر نے متانت سے کہا اور معنی خیز نظروں سے نیلم کو دیکھنے لگا۔ نیلو کے گالوں پر سرخی پھیل گئی۔ اور جب رادھیکا بسنت وہاں آئیں نیلو نے کہا۔ "ممی یہی ہیں میرے پروفیسر....."

"جن کے نام کی تو مالا جپا کرتی ہے۔" ماں نے جملہ مکمل کر دیا اور پھر پروفیسر سے مسکرا کر کہا۔ "بڑی مہربانی آپ کی پروفیسر صاحب، جو ہمیں یاد کیا۔ ویسے تو اس ویران جگہ میں کوئی مہمان بھی نہیں آتا۔"

پروفیسر صاحب کو ان کا کمرہ بتایا گیا جو بالائی منزل پر تھا۔ ماں بیٹی کے کمرے بھی اوپر ہی تھے۔

جلد ہی نیلم کی تنہائی پسندی، انتہا پسندی میں تبدیل ہوگئی۔ انتہا پسندی جس نے اسے پروفیسر کے نقش پا کو سجدے کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور پھر وہ فیصلہ کن دوپہر آئی، جب رادھیکا بسنت اچانک لکھنؤ چلی گئی تھیں اور پروفیسر ڈرائنگ روم میں بیٹھا روڈن کے "مفکر" کو دیکھ رہا تھا۔ ایک مترنم آواز آئی۔

"مفکر" کو دیکھنے والے، ذرا وینس کو بھی تو دیکھیے۔"

پروفیسر نے پلٹ کر دیکھا نیلو پشت پر کھڑی تھی۔ وہ سٹپٹا کر بولی۔

میرا مطلب ہے وینس ڈی میلو کو بھی تو دیکھیے۔ اس کا ایک بازو نہیں ہے، پھر بھی یہ کتنی حسین ہے۔"

اس میں کیا شک ہے۔ نسوانی حسن کا یہ پیکر آج بھی ویسے ہی دل آویز ہے، جیسے اس دن تھا، جب زہرہ کنول سے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تھی۔ فن کا کمال اس کی ابدیت اور آفاقیت میں ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

لیکن ابدی حسن تو صرف دیویوں اور دیوتاؤں میں ہے وینس بذات خود حسین

ہے مگر یہ مجسمہ تو مصنوعی ہے۔ اس میں ابدی حسن کہاں ؟ دیکھئے نا اس کا ایک بازو ہی ٹوٹ گیا ہے ایسا فن لمحاتی خواہشات، یعنی دبی ہوئی غیر آسودہ جنسی خواہشات کو ٹھوس شکل دینے کی کوشش ہے۔ اس سے نامراد فن کار کی انا کی تسکین ہوتی ہے مگر اس میں ابدیت کہاں ؟" یہ بولتے ہوئے نیلو صوفہ کے بازو پر بیٹھ گئی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے پروفیسر سے سوال کیا۔

"اچھا، حسن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟" نیلو کا انداز بے باکانہ تھا۔

پروفیسر نے ایک نظر اسے دیکھا اور مسکراتا ہوا بولا "Eternal Temptness"

"کیا ؟ کیا کہا آپ نے ؟" نیلو کی برجستگی پر پروفیسر سٹپٹا گیا۔ اور خالص کلاس روم والے انداز میں بولنے لگا۔ "سقراط کا خیال ہے کہ حسن ایک عارضی ظلم ہے۔ افلاطون کے نزدیک یہ قدرت کی ایک رعایت ہے۔ تھیوپریٹس اور تھیوکرٹیس کے نزدیک یہ ایک خاموش فریب ہے۔ ہومر نے اسے قدرت کا ایک بیش بہا عطیہ کہا ہے اور آووڈ (ovid) کے نزدیک یہ دیوتاؤں کے ذریعہ ودیعت کی ہوئی ایک خوبصورت جنس ہے۔"

"اُفوہ، مگر آپ کے نزدیک یہ کیا ہے ؟" نیلم نے اُکتا کر پوچھا۔

"پہلے تم اپنے چھوٹے سے دماغ سے بتاؤ کہ حسن تمہارے نزدیک کیا ہے ؟" پروفیسر نے اس کے سر کو اپنے سینے کے نزدیک کھینچ کر سوال کیا۔

"میرے نزدیک ؟ میرے نزدیک : Beauty in Things Exists in the Mind Which Contemplates Them"

"بہت خوب، بہت خوب۔ میں بھی ڈیوڈ ہیوم کے اس خیال کی تائید کرتا ہوں لیکن حسن کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔"

"وہ کیا ؟" نیلم نے پوچھا۔

"ترغیب گناہ !"

"ہاں، گناہ میں لذت ہے۔ لذت حسن ہے" نیلم کی آنکھوں کے ڈورے سُرخ ہو رہے تھے۔

"مگر یہ لذت عارضی ہے۔"

"لمحۂ لذت ابدی ہے۔ ہیروڈیس کی لڑکی سلمیٰ نے پیغمبر زمانہ سے کہا تھا۔ مجھے ہونٹوں کا بوسہ دو تاکہ میں لذت جاودانی حاصل کر لوں۔" اینٹونی نے قلو پطرہ سے کہا تھا۔" مجھے اپنے بوسہ سے غیر فانی بنا دو۔" نیلم کے ہونٹ وا تھے۔ پروفیسر ان ہونٹوں پر جُھک گیا۔ نیلم نے خود کو لمحات کے سپرد کر دیا۔

اسی شام رادھیکا بسنت لکھنؤ سے واپس آگئیں۔ رات کے کھانے کے بعد، پروفیسر اور نیلو اپنی کُرسیوں سے اُٹھے نیلو ڈرائنگ روم میں بھاگ گئی۔ پروفیسر نے عقیدت سے رادھیکا بسنت کے قدموں کی دھول لی اور کہا۔

"آپ کی آشیرواد چاہیے۔"

"کیا مطلب؟" رادھیکا بسنت نے پوچھا۔

"میں۔ مطلب یہ کہ میں نیلو سے شادی کرنی چاہتا ہوں۔"

"او!" رادھیکا بسنت ایک لمحہ متفکر ہوئیں پھر بولیں مگر آپ کے والدین؟"

"میں تنہا ہوں۔"

"او، مجھے دُکھ ہوا۔" پھر انھوں نے نیلو کو آواز دی اور دونوں کو اپنی دُعائیں دیں۔

پروفیسر نے رادھیکا بسنت سے کہا "آپ مجھے "تم" کہیں تو اچھا ہو گا۔" وہ بڑبڑائیں "تم۔" پھر بولیں "تو پھر تم یہاں سے کب جا رہے ہو؟"

"بہت جلد۔ لوٹنے کی تاریخ کی اطلاع دوں گا۔" یہ کہہ کر پروفیسر کمرے سے باہر چلا گیا۔

رادھیکا بسنت یوں ہی کُرسی پر بیٹھی خالی پلیٹوں کو تکتی رہیں۔ وہ خوش تھیں کہ ان کا ایک بوجھ سر سے اُتر رہا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے کمرے میں میری تصویر

کے سامنے آئیں تو میں نے ان کے چہرے کی رنگت میں تبدیلی دیکھی۔ انھوں نے میری تصویر کو غور سے دیکھا۔ پھر ان کے ذہن میں اس معطر شب کی یاد آئی جب انھوں نے پھولوں کی سیج پر اپنی زندگی میرے حوالے کر دی تھی۔ مگر زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی اور میں اپنی بیوی اور بچی کو اس طویل و عریض دُنیا میں تنہا چھوڑ کر چلا گیا۔ انھیں بیٹی کا پیار ملا۔ مگر وہ پیار جس کی تمنا ہر عورت کے دل میں رہتی ہے۔ انھیں نہ ملا۔ ان کی غیر آسودگی ان کے وجود کی جوالامکھی میں لاوا بن کر تپتی رہی اور وہ اس میں شب و روز ایک بے چین روح کی طرح جلتی رہیں۔ وہ آج بھی جوان تھیں اور انھیں اس کا احساس تھا۔ مگر احساس کی دُنیا اور ہے، حقیقت کی اور۔ انھوں نے اپنی ہر جنسی خواہش کو کچل دیا مگر اس کی جڑیں سرطان کی طرح ان کے وجود میں پھیل گئی تھیں۔ رادھیکا بسنت کو اپنی موت کی آگہی تھی۔

جب نیلم کمرے میں آئی تو ماں کو خلا میں تکتے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے آہستہ سے پکارا "ماں" جواب ندارد نیلم نے انھیں جھنجھوڑ کر دوبارہ پکارا "ماں" انھوں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کمرے سے باہر چلی جائے۔

نیلم نے کہا "ممی، میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ پروفیسر صاحب دو تین دنوں بعد جائیں گے۔"

رادھیکا بسنت نے دوبارہ نیلم کو کمرے سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ دوبارہ خیالات کی دُنیا میں کھو کر اپنی چتا کی آگ کو تیز تر کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں آئیں تو نیلو اور پروفیسر رمی کھیل رہے تھے۔

تم نے لکھنؤ جانے کا ارادہ ملتوی کیوں کر دیا؟" انھوں نے پروفیسر سے پوچھا۔ پروفیسر جیسے چونک گیا۔ اس نے گھبرا کر جواب دیا "جی، بات یہ ہے۔ بات یہ ہے کہ نیلوفر کی خواہش ہے کہ میں چند دن اور رک جاؤں۔"

نیلو شرما گئی۔ رادھیکا بسنت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ قدرے

وقفہ کے بعد انھوں نے کہا "میں بھی رمی کھیلوں گی۔"

"ونڈرفل ممّی، ضرور، ضرور" نیلو خوش ہو کر بولی۔

"لیکن ایک پل رُک جاؤ۔ میں ذرا اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے ماروں۔"

"اوہ، کم آن، ممی ڈارلنگ، تمھارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟"

"چہرے کو کیا ہوا ہے؟" پھر وہ تقریباً چیختی ہوئی بولیں "میرے چہرے کو کیا ہوا ہے؟ کیا تمھاری آنکھیں نہیں ہیں۔ دیکھو تو سہی، میرے گالوں پر نالیاں نظر نہیں آتیں کیا؟" یہ بول کر وہ عجب انداز میں مسکرانے لگیں۔ نیلو اور پروفیسر نے حیران ہو کر انھیں دیکھنا شروع کر دیا۔

"مجھے اپنے چہرے کو دھونا ہی ہوگا۔ پھر ہم سب رمی کھیلیں گے۔" یہ بولتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ پروفیسر کبھی زینوں پر ان کے قدموں کی چاپ پر کان رکھتا اور کبھی نیلو کو دیکھتا۔ نیلو کبھی تاش کے پتّوں کو دیکھتی اور پروفیسر کو۔ جب رادھیکا بسنت واپس آئیں تو ان کا چہرہ صاف شفاف ہو رہا تھا۔ شاید انھوں نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ ساڑی کی سلوٹیں درست کی تھیں وہ مسکراتی ہوئی آئیں اور ان دونوں کی نگاہوں کی عقابیت سے بے نیاز بولیں۔

"آؤ، اب رمی کھیلیں۔"

پھر پتّے تقسیم ہوئے اور کھیل شروع ہوا۔ جب نیلو نے کالے پان کا ایکہ پھینکا تو رادھیکا بسنت نے مسکراتے ہوئے کہا "میری قسمت!" اور دوسرا پتہ پھینکا۔ پروفیسر نے کالے پان کی بیگم پھینکتے ہوئے کہا۔

"آپ ایسا کیوں کہتی ہیں؟"

رادھیکا بسنت نے کہا "میرا مطلب ہے کتنی یکسانیت ہے اس سیاہ ایکہ کی زندگی میں اور کتنی مماثلت ہے اس کی اور میری زندگی میں۔ تم دونوں کی شادی ہو جائے گی پھر تم نیلو کو لے کر لکھنؤ چلے جاؤ گے اور میں اس پائن کا ٹج میں محیط تنہا رہ جاؤں گی۔ میرے ساتھی یہ چیڑ اور دیودار ہوں گے، یہ پُر اسرار پہاڑیاں ہوں گی

اور ان سے گذرنے والے طوفان۔ کتنی مماثلت ہے مجھ میں اور اس سیاہ پتّے میں وہ تنہا و تاریک ۔۔ میں تنہا و تاریک۔" رمی کا کھیلنا رُک گیا۔ پروفیسر اور نیلو تصویر حیرت بنے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

اور میں، جو تارِ عنکبوت کے زیرِ سایہ بیٹھا اپنے ملگجے، ہیئت بریدہ وجود کو بسنت رام میں تحلیل کر چکا ہوں، میں جو ایک غیر واضح مبہم اکائی ہوں، میری آنکھیں جو صرف دیکھتی ہی نہیں بلکہ سُنتی بھی ہیں، ان ہی آنکھوں نے سُنا کہ نیلو دہشت زدہ ہو کر بولی۔

"اوہ، پور (POOR) ممّی۔"

اور اُٹھ کر اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ رادھیکا بسنت نے پیار سے بیٹی کو تھپتھپایا اور پروفیسر کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔ "اب تم چند دنوں کے لئے رُک گئے ہو تو کیوں نہ ہم لوگ کل دوپہر پکنک پر چلیں۔"

"واہ، واممی۔ ضرور چلیں۔ ہم لوگوں نے خود پروگرام بنایا تھا لورز کرسٹ (LOVERS CREST) کا، نیلو خوش ہو کر بولی۔

"لیکن لورز کرسٹ تو دور ہے۔ وہاں سے ہم لوگ ایک دن میں تھوڑے ہی لوٹ سکتے ہیں۔" رادھیکا بسنت نے کہا۔

"تو کیا ہوا، وہاں پر ریسٹ ہاؤس تو ہے ہی۔ رات گذار کر دوسرے دن پلٹ آئیں گے۔ کتنا لطف آئے گا۔"

اچھی بات ہے۔ اب چلو پتّے بانٹو۔ ایک ڈیل (DEAL) اور ہو جائے۔ ابھی وقت زیادہ نہیں ہوا ہے۔"

وال کلاک میں اسی وقت بارہ کا پہلا گھنٹہ بجا۔

"مجھے تو نیند آرہی ہے ممی۔ آپ لوگ کھیلیں۔ صبح ملاقات ہوگی۔ گڈ نائیٹ۔" یہ کہہ کر نیلو اپنے کمرے میں چلی گئی اور ۔۔۔۔ دور ۔۔۔۔ بہت دور، آتش دان کے شعلوں کے پس منظر میں یہ دونوں رمی کھیلتے رہے۔

"کتنی تنہا ہیں میری ممی۔" نیلو نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ اس کے دل میں ماں کے لئے بے پناہ ہمدردی پیدا ہوئی۔ کیوں نہ آج ماں کے ساتھ سویا جائے۔ ان سے دیر تک پیار کی باتیں کروں گی۔ یہ سوچ کر وہ اپنے بستر سے اُٹھی اور ماں کے کمرے میں آکر ان کے بستر پر لیٹ گئی۔ مجھے یہاں پاکر ممی کتنی خوش ہوں گی۔

لیکن جلد ہی اسے نیند آگئی۔ تھوڑی دیر بعد، جب رادھیکا بسنت اپنے کمرے میں آئیں تو وہاں نیلو کو سوتا دیکھ کر واقعی بے حد خوش ہوئیں۔ انھوں نے اُسے غور سے دیکھا نیلو کے بال تکیے پر بے ترتیبی سے بکھرے تھے۔ ان خوبصورت بالوں کے نیچے کسی چھتنار درخت کے ٹھنڈے سائے تھے، جہاں پروفیسر آرام کرے گا۔ کتنا خوش نصیب ہوگا پروفیسر انھوں نے سوچا نیلو کو جگا دیا جائے مگر رُک گئیں۔ پھر وہ نیلو کے کمرے میں چلی آئیں۔ انھوں نے اپنی ساڑی اُتاری اور ریشمی کوٹ پہنے بستر پر لیٹ گئیں۔ سامنے وارڈروب کا آئینہ تھا انھوں نے اس میں اپنا عکس دیکھا تو اُٹھ بیٹھیں اور شیشے کے نزدیک آئیں۔ اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ جوانی کی دوپہر میں سنولایا ہوا جسم گداز تر ہو گیا تھا۔ وہ مسکرائیں مسکراہٹ ابھی تک دل آویز تھی۔ کمر پر کچھ بھاری پن تھا مگر ناگوار بھاری پن نہیں تھا۔ ان کے جسم کا دل کش نشیب و فراز کانٹوں کی طرح ان کے احساس میں چبھ گیا۔ پھر انھوں نے روشنی بجھائی اور بستر پر لیٹ گئیں۔

تمام رات نی کھیت خاموشی کی دبیز چادر اوڑھے ایک قنوطی فلسفی کی طرح چپ تھا۔ انھوں نے کروٹ لی، کمبل اپنی گردن تک اوڑھ لی۔ پھر انھیں نیند آگئی۔ رات کے پچھلے پہر ان کے کمرے کے باہر کسی کے قدم رُکے۔ دروازے آہستہ آہستہ کھلے رادھیکا بسنت کی آنکھیں کھلیں تو انھیں یاد آیا کہ دروازے تو بند کئے ہی نہیں تھے ان پر دہشت طاری ہوگئی۔ انھوں نے فوراً کمبل سے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ دروازے بند ہوئے۔ کوئی ان کے بستر تک آیا اور بولا۔ "آج دروازے کھلے کیوں چھوڑ دئے۔

جواب نہ پاکر وہ پھر بولا۔ اچھا ہی کیا۔ بار بار دستک دینے سے مجھے خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں ممی نہ جاگ جائیں۔" یہ بولتے ہوئے اس نے کمبل ہٹانا چاہا تو رادھیکا بسنت نے دبی آواز میں کہا "اوہوں، چلے جاؤ۔

"اچھا بھئی چلا جاتا ہوں۔ ایک پیار تو دو ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔" یہ کہہ کر وہ ان کے پاؤں کی طرف جھکا اور وہاں سے کمبل ہٹاکر باری باری ان کی پنڈلیوں کو چومنے لگا۔ صدیاں بیت گئیں۔

بازو والے کمرے میں آہٹ ہوئی۔ وہ گھبراکر وہاں سے غائب ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی رادھیکا بسنت نے دروازے بند کئے۔ پھر اپنی پنڈلیوں کے ان حصّوں کو دیکھنے لگیں جہاں انھیں چوما گیا تھا۔ انھیں ایک درد انگیز، مسحور کُن لذّت محسوس ہوئی۔ وہ اس لذّت سے ناآشنا نہیں تھیں۔ لیکن آج مدّت کے بعد کسی مرد نے انھیں پھر چوما تھا۔ اُن ہونٹوں نے ان کی مدفون جنسی خواہشات کی قبر سے مٹّی ہٹاکر انھیں جلتی چتا پر رکھ دیا

صبح ناشتہ پر رادھیکا بسنت غائب تھیں۔ نیکو نے کہا "شاید ممّی رات اچھی طرح سے نہیں ہوسکیں۔ میں نے سمجھا تھا وہ مجھے جگا دیں گی مگر انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں سونا چھوڑ دیا اور خود میرے کمرے میں چلی گئیں۔ میرا تو سارا پلان ہی فیل کرگیا۔ ابھی انھیں جگاکر آتی ہوں۔"

پروفیسر کانچ کا ایک برتن تھا جو کسی اونچائی سے گرکر ایک جھناکے کے ساتھ چور ہوگیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔ جب وہ لوٹ کر آئی تو پروفیسر کو کھانے کے کمرے سے غائب پایا۔ وہ شوخی سے "سر آپ کہاں ہیں"، پکارتی ہوئی برآمدے میں آئی تو اسے نہایت ہی بے چینی کے عالم میں باغ میں ٹہلتے پایا۔

"کیا ناشتہ نہیں کرنا ہے۔ ممّی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انھوں نے کہا ہم لوگ ناشتہ کرلیں۔"

"ناشتہ؟ ہاں۔ ابھی آیا۔ ممّی ہیں کہاں؟"

"اپنے کمرے میں"۔ پھر نیکو نے کہا۔ "آج پکنک کا پروگرام تو ملتوی ہوگیا۔ دیکھیں

اب کب موقع ملتا ہے۔"

پروفیسر نے غور سے نیلو کو دیکھا۔ پھر یکایک بول اُٹھا "نیلو، میری نیلو مجھ سے جلد از جلد شادی کر لو۔"

"ایسی بھی جلدی کیا ہے؟" "ابھی تو شمع کے گرد طواف کیجئے۔" نیلو نے شوخی سے کہا۔

"نہیں نیلو، مجھ سے بہت جلد شادی کر لو۔ تمھارے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے۔"

"لیکن میں نے تو خود کو آپ کے سپرد کر ہی دیا ہے۔" پروفیسر نیلو کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس نے کہا۔

"میں ایک منٹ ممی سے مل لوں۔"

"اچھا، میں برآمدے میں بیٹھی خط لکھتی ہوں اور آپ کا انتظار کرتی ہوں۔"

پروفیسر رادھیکا بسنت کے کمرے کے باہر رُکا۔ پھر اُس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں۔؟"

"چلے آؤ۔" رادھیکا بسنت ایک مقتول کی طرح اپنے بستر پر بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بے خوابی کا گدلاپن تھا۔ اُنھوں نے نیم مُردہ مسکراہٹ سے پروفیسر کا استقبال کیا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

وہ خاموش رہیں۔ پروفیسر نے رُکتے رُکتے کہا۔ "مجھے سخت افسوس ہے رات جو کچھ ہوا۔ میں شرمندہ ہوں۔"

رادھیکا بسنت نے بھرپور پروفیسر کو دیکھا اور بولیں "کاہے کی شرمندگی۔ تپتیا تو میری بھنگ ہوئی۔"

"لیکن پاپ مجھ سے ہوا۔"

"اور تم نے میرے انگ انگ میں جلتا سیسہ اُنڈیل دیا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میرے شریر کے اگنی کنڈ کی آگ تو ٹھنڈی ہو چلی تھی تم نے اپنے ہونٹوں کے سورگ سے اس کی راکھ ہٹا دی اور مجھے نرکھ میں جھونک دیا۔ اب میں اسی آگ میں بھسم ہو جاؤں گی

میری روح آوارہ بگولوں کی طرح بھٹکتی رہے گی۔ اسے صرف تم ہی مکتی دے سکتے ہو؛

"کیسی مکتی؟"

"گنگا سے جمنا کا ملان۔"

"لیکن یہ پاپ ہے۔ میں نیلو سے شادی کرنے والا ہوں وہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"مجھے نرکھ میں جھونکنے والے، شبدوں کی پھونک سے میرے شریر کی آگ کو بجھانا چاہتے ہیں۔ پاپ پُن کی باتیں پرکھوں کی تھیں۔ میرے کانٹوں کو تم چُن لو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے بستر سے اُٹھیں۔ پروفیسر ڈر گیا لیکن اسی وقت نیلو وہاں آدھمکی۔ رادھیکا بسنت سنبھل گئیں انھوں نے فوراً کہا "نیلو اب میں بالکل ٹھیک ہوں کل ہم لوگ پک نک پر ضرور چلیں گے۔ میں آج ہی انتظام مکمل کر لیتی ہوں۔"

"نہیں ممی ایسی بھی جلدی کیا ہے۔ ایک دو دن اور انتظار کر لیں۔"

"لیکن میں تو اب بالکل ٹھیک ہوں۔ کل ہی کا پروگرام رکھا جائے۔"

دوسرے دن بعد ناشتہ، تینوں لورز کرسٹ (Lower's crest) کے لئے روانہ ہوئے۔ دوپہر سے قبل وہ وہاں پہونچ گئے۔ ریسٹ ہاؤس ایک پہاڑی پر تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں دو چھوٹے چھوٹے جھرنے تھے۔ اس کے بعد ڈھلوان تھی جس پر چیڑ کے بے شمار درخت ماتم کناں تھے ریسٹ ہاؤس کی داہنی طرف وہ پہاڑی تھی جو لورز کرسٹ کے نام سے مشہور تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں سامان جما کر یہ لوگ اُس پہاڑی کی طرف بھاگے۔ چوٹی پر چھوٹی سی چوکور ہموار سطح تھی جسے لوہے کے پائپ سے گھیر دیا گیا تھا۔ چوٹی کی بائیں جانب ایک گہری کھڈ تھی۔ شاید آواز سے بھی دور۔ رادھیکا بسنت تو سستانے کے لئے بیٹھ گئیں مگر نیلو اور پروفیسر کھڈ میں جھانکنے لگے۔ پھر جلد نیلو اپنا سر پکڑ کر ماں کے پاس آ بیٹھی۔

"اُف، کتنی بھیانک گہرائی ہے اس کھڈ کی۔ میرا تو سر چکرانے لگا۔" اُس نے کہا۔

"اس کا نام لورز کرسٹ کیوں پڑا؟" پروفیسر نے رادھیکا بسنت سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"مجھے معلوم ہے ممی، کماؤں رجمینٹل سنٹر کا ایک نوجوان انگریز افسر تھا جو کسی کماؤنی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوگیا۔ دونوں اسی چوٹی پر چھپ کر ملتے تھے۔ جب سنٹر کے بڑے افسروں کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نوجوان پر پابندیاں عاید کر دی گئیں۔ بعد میں اس نے اس لڑکی سے شادی کرنے کے لئے اپنی نوکری چھوڑ دی۔ لیکن اس کے بعد کالے گورے کا سوال پیدا ہوگیا اور انگریزوں نے اس نوجوان کا اس حد تک بائیکاٹ کیا کہ وہ ایک طوفانی رات اسی جگہ بھاگ آیا اور اسی کھڈ میں کود کر جان دے دی۔ جب دوسرے دن یہ خبر مشہور ہوئی تو اس لڑکی نے بھی یہیں سے چھلانگ لگا دی۔"

"یہ سب من گڑھت کہانیاں ہیں۔" رادھیکا بسنت بولیں۔

تینوں خاموش تھے۔ شام ہو چلی تھی۔ خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اُٹھے اور ریسٹ ہاؤس چلے آئے۔ یہاں برآمدے میں بیٹھ کر یہ لوگ بھاگتے ہوئے سورج اور دوڑتی ہوئی شام کے پس منظر میں پرندوں کی آخری آوازوں کو سُنتے رہے۔

ڈنر بعد، پروگرام بنا کر ایک بار پھر لورز کرسٹ پر چلا جائے اور کھڈ کے ارد گرد بسے گاؤں کی روشنیاں دیکھی جائیں۔ چوٹی پر ایک گہری مگر تلوار کی دھار جیسی خاموشی تھی پروفیسر اور نیلو جلد ہی چوٹی پر پہونچ گئے۔ رادھیکا بسنت آہستہ آہستہ قدم رکھ رہی تھیں۔ وہ تھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گئیں ان کی ساڑی پنڈلیوں تک اُٹھ چکی تھی۔ انھوں نے اس مقام پر نہایت ہی پاکیزگی سے ہاتھ پھیرا۔ جہاں پروفیسر نے اپنے ہونٹ رکھے تھے۔ ان پر ایک سرور طاری ہوگیا چہرہ تمتما اُٹھا۔ جب وہ چوٹی پر آئیں تو یکایک رُک گئیں۔ پروفیسر نیلو کو سینے سے لگائے اس کے ہونٹ چوم رہا تھا۔ اس نے رادھیکا بسنت کو دیکھ لیا۔

"نیلو، ممی۔" اس نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔

نیلو کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ اس نے شرماتے ہوئے کہا "ممی تم کہاں رہ گئی تھیں۔ میں تو

گھبرا رہی تھی۔ آؤ، دیکھو ممی، نیچے گاؤں کی روشنیاں کس طرح جگنوؤں جیسی دیکھ رہی ہیں۔"
"اور انھیں کیا پتہ کہ ہم لوگ اس بلندی سے ان کی روشنیوں کا نظارہ کر رہے ہیں۔" ماں نے کہا۔
پھر تینوں کھڈ میں جھانکنے لگے۔ یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ نیلو ایک دلدوز چیخ کے ساتھ اوپر سے نیچے گری اور گرتی ہی چلی گئی۔
پروفیسر چیخا "نیلم" اور اس کی طرف لپکا۔ رادھیکا بسنت نے اسے تھام لیا۔ اور چیخ کر بولیں "پاگل مت بنو۔"
دوسرے دن نیلم کی لاش برآمد کی گئی اور اسے وہیں جھرنے کے کنارے نذر آتش کر دیا گیا۔ شام تک پروفیسر اور رادھیکا بسنت "پائن کاٹج" لوٹ آئے۔ رات جوں توں گذری۔ تمام دن دونوں میں ملاقات نہیں ہوئی۔ جب ڈنر کے وقت پروفیسر میز پر نہیں آیا تو وہ اس کے کمرے میں گئیں۔ پروفیسر خلا میں تک رہا تھا اور اس کا سوٹ کیس بغل میں رکھا تھا۔
"کھانا میز پر منتظر ہے۔" انھوں نے دھیمی آواز میں اس سے کہا۔
پروفیسر اس آواز کی طمانیت سے گھبرا گیا۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں کل صبح کی بس سے جا رہا ہوں۔"
"کہاں؟"
"لکھنؤ۔"
"وہاں کیا کرو گے؟"
"میری یونیورسٹی جلد ہی کھل رہی ہے۔ اب میرا یہاں کیا کام ہے؟" یہ کہہ کر وہ رونے لگا اور آہستہ آہستہ بولا۔ "سنگدل لڑکی، مجھے تنہا چھوڑ دیا۔"
"نیلو تو اب نہیں ہے۔ وہ تمھیں مسرت نہیں دے سکی۔ مگر تم اب بھی خوشیاں حاصل کر سکتے ہو۔" یہ بولتے ہوئے انھوں نے پروفیسر کا ہاتھ تھام لیا۔ ان پر شہوانیت طاری تھی۔ ان کی پتلیاں خونیں تھیں۔ پروفیسر نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا

اور انھیں شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا "آپ یہ کیا کر رہی ہیں ؟"

"میں کچھ بھی نہیں کر رہی ہوں۔ سب کچھ تم نے کیا ہے۔ ایک تپسیا کے بعد میں نے اپنے دل و دماغ سے مرد کے خیال کو بھلایا تھا۔ لیکن اس رات تم نے مجھے کیوں چھوا؟ کیوں تم نے میری پنڈلیوں کو چوم کر میرے جسم میں آگ کے کانٹے بو دیئے۔ اس رات سے یہ کانٹے مجھے چبھ رہے ہیں۔"

"مجھ سے بھول ہوئی تھی اور میں اس کی معافی بھی مانگ چکا ہوں۔"

"میں اس بھول کی قیمت چاہتی ہوں۔ نیکو بیکا سو کی "خاموش زندگی" تھی جو صرف کینوس پر زندہ رہے گی۔ میں متحرک ہوں مجھے دیکھو میں گلدان کا پھول نہیں۔ میں وینس ہوں۔ میں رتی ہوں۔ میں رتی ہوں اور تم میرے کامدیو۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی ساڑی کا آنچل گرا دیا ـــــ

اور میں، اس ڈرائنگ روم سے دُور ہو جاتا ہوں۔ عنکبوت کا مکروہ سایہ میرے اوپر سے غائب ہو جاتا ہے۔ میری آنکھوں کی پُتلیاں چھوٹی ہو جاتی ہیں جس طرح کیمرہ کا اپر چھوٹا ہو جاتا ہے میں اپنی پتلیوں سے پروفیسر اور اپنی بیوی کو فوکس کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ دور، بہت دور اُجلی تاریکی میں گھرے، پائن کالج کے ایک کمرے میں میری بیوی نیم عُریاں ہو چکی ہے اور پروفیسر سے کہتی ہے "کشمکش المیہ کی بنیاد ہے۔ اسے ذہن سے نکال دو۔ میں ابھی تک جوان ہوں۔ اپنی شریانوں کا خون مجھ میں منتقل کر دو۔"

پروفیسر ایک خونخوار بھیڑیئے کی طرح اُٹھتا ہے۔ کمرے کا دروازہ بند کرتا ہے۔ رادھیکا بسنت ایک گداز مسکراہٹ کے ساتھ اس سے لپٹ جاتی ہیں۔ پروفیسر ان کی پیٹی کوٹ پنڈلیوں تک اُٹھاتا ہے اور وہاں اپنے ہونٹوں کے نشان ڈھونڈھنے لگتا ہے۔

پائن کالج کے دروازوں اور دریچوں پر بے شمار دستکیں ہوتی ہیں۔ میں ڈرائنگ روم سے باہر آتا ہوں اور خود کو بیکراں تاریکی میں فنا کر دیتا ہوں۔

ـــــــ ٭٭٭ ـــــــ

موسم کا مسیحا

محمود واجد

"تم نے سچ کہا، موسم اب وہ نہیں رہا"۔ الف نے کہا۔

"موسم تو دراصل اندر سے آتا ہے"۔ ب نے گرہ لگائی۔

"نہیں"۔ الف غضبناک ہو گیا "۔ تم اپنا قبلہ کر لو، اوپر سے آتا ہے میاں اوپر سے!"

"کیا..... کیا.....؟"

"ہاں..... ہاں.....!"

"دیکھو!"

پتہ نہیں الف کی آنکھوں میں کیا تھا کہ ب سچ مچ دیکھنے لگا۔ سامنے وہ غار تھا جہاں سے روشنی پھوٹی تھی۔

وہ پہاڑ بھی جس کی چوٹی پر کوئی کھڑا تھا۔

"لوگو!"

ب کو ایسا لگا جیسے کوئی اسے مخاطب کر رہا ہو۔

"کیا تم اس پر یقین کرو گے جو میں پہاڑ کے اس طرف دیکھ رہا ہوں!"

"ہاں، ہمیں یقین ہے تم سچ بولو گے!"

سب لوگوں نے جو وہاں بھاگ کر آئے تھے ایک زبان ہو کر کہا۔

پھر اس نے ویسا ہی کیا جیسا اسے حکم دیا گیا تھا۔ ایک پرندے کو اس نے پالا۔

اس کا ایک نام رکھا۔ اس نام سے پرندے اتنا مانوس ہوا کہ پکارتے ہی اس کے پاس آجاتا۔

لوگ حیرت زدہ تھے۔

"کیا چیز تھی جس نے اسے ایک جان کیا تھا؟"

اس نے سوال کیا۔ پھر خود ہی جواب دیا۔

"وحدت"

"وحدت کیا ہے؟" کہیں سے آواز آئی۔

"یکائی!"

"مثال چاہئے!" پھر آواز آئی

"منزل کی طرف نگاہ۔ اس بات سے بے نیاز کہ کون کیا کہہ رہا ہے"

"اور منزل؟"

"ہاں۔ ایک اور اس کی گواہی۔ اپنی وہ چیزیں اس کے لئے خرچ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو!"

لیکن بہت سے ذہنوں میں سوال ابھرا "ہم نے بھی وہ خرچ کیا جو ہمیں عزیز تھا۔ پھر......"

وہ سمجھ گیا۔

"تو سنو" اس نے پھر کہا۔ "ایک دن اس نے اس پرندے کو ذبح کر دیا اور اس کے چار حصے بنائے اور پہاڑ کے چار سمتوں میں پھینک دیا۔ پھر اس نے اس پرندے کا نام لے کر پکارا۔ وہ پرندا اڑتا ہوا اس کے پاس آگیا۔"

"ہم کیسے مانیں کہ یہ وہی پرندہ ہے؟" ایک نے سوال کیا۔

"ہاں یہ وہی پرندہ ہے" دوسرے نے قریب آکر اس کے پاؤں میں بندھے دھاگے کو دیکھ کر کہا۔ پھر تیسرے نے اور چوتھے نے اور سب نے!

"تم جادوگر ہو۔" پہلے شخص نے اعتراض کیا۔

"ٹھہرو!" قبل اس کے کہ دوسرے معترض ہوتے اس نے کہا

"میں بتاتا ہوں۔" وہ رکا۔ پھر بولا۔

"اسم ایک ہے اور سارے اس کے پرتو۔ نام ایک ہی ہے۔ سارے نام مشتق!"

مجمع دم بخود تھا۔

"تم جب نام رکھتے ہو تو اسمِ اوّل سے مستعار ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس میں روح ہو۔"

"روح سے کیا مراد ہے؟" ایک سوال ابھرا۔

"یہی تو بنیادی بات ہے" اس نے کہا "سارا قصہ تو روح کا ہے۔ اسی کی ہم حفاظت کرتے ہیں۔ چار حصّے یا اعضا تو جسم کے الگ الگ نام ہیں۔ روح نہیں تو ان کا کوئی وجود نہیں۔"

"پھر ہم کتنی جلدی کرتے ہیں" ایک رونے لگا۔

"ہاں۔ تین باتوں میں عجلت کرو! اسے یاد رکھنا۔

"اسی عجلت کے سبب تو ہم یہاں ہیں؟" ب نے کہا۔

"نہیں" الف نے پھر بات کاٹی۔ ہم نے عجلت میں کچھ نہیں کیا۔ یہ ہمارا فیصلہ تھا، سوچا سمجھا جو ہماری روحوں سے ہم آہنگ تھا۔"

"پتہ نہیں کیسی روح اور کس کی بات کر رہے ہو" ب نے زور دے کر کہا "تم نے خود کہا ہے کہ اب موسم بدل گیا ہے!"

جانے کیا ہوا کہ الف ایک دم خاموش ہو گیا۔

"اب اگر پرندے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تو کیا وہ نہیں آئے گا؟" ب نے سوال کیا۔

"نہیں نہیں۔"! الف رونے لگا۔ پھر بولا "نام تو روح سے مشروط ہے۔ اگر نام نہیں تو کچھ نہیں۔"

پھر دونوں خاموش ہو گئے کہ موسم سچ مچ بدل گیا تھا اور مسیحا کوئی نہیں تھا۔

پاکستان سے نئی اردو کہانی

تیسری آنکھ

علی حیدر ملک

میں نے اسے حیرت کے زاویئے سے دیکھا۔ وہ کوئی اور نہیں میری اپنی بیوی تھی۔

"میں اپنے کنوارے جسم کی قسم کھا کر کہتی ہوں ......"

راہباؤں کی سی سنجیدہ یہ آواز اس عورت کی تھی جس سے میرا رشتہ بھی ازار بند کا ہے اور جو گذشتہ تین سال سے بلاناغہ ہر رات میرے بستر کی ایک ایک شکن کی شریک رہی ہے۔

اپنی بیوی کی یہ بات سُن کر میری عقل کے سارے سوتے جیسے مفلوج ہو گئے اور میں بے بسی کے عالم میں بے تحاشہ قہقہے لگانے لگا۔ ہا ہا ہا ... ہا ہا ہا !

"احمقوں کی طرح قہقہے نہ لگاؤ۔" اس نے بے شکن لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھوں سے کنڈوم اور ڈایا فرام کے کئی خالی کئی بھرے پیکٹ میرے چہرے کی طرف اُچھال دیئے۔ تب میری دونوں آنکھیں ندامت کے پانی سے بھیگ بھیگ کر مندنے لگیں اور تیسری آنکھ آہستہ آہستہ کھلنے لگی لیکن قبل اس کے کہ یہ پوری طرح کھُل پاتی، دروازے پر بڑی بے چینی سی دستک ہونے لگی۔ میں نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ دستک دینے والا شخص بے دھڑک اندر آگیا۔

"میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔

"لیکن کہاں ؟"

"یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا"

"آخر کیوں ؟"

"تم اس سے بھی واقف ہو جاؤ گے۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے ہم ایک محل نما عمارت کے قریب پہونچ گئے ۔ یہ ایک حسین اور فلک بوس عمارت تھی جس کے چاروں طرف محل کی دیواروں سے بھی اونچا سنگی حصار کھینچا ہوا تھا۔ اس سنگی حصار کے گرد مسلح اور چاق دچوبند سپاہیوں کی ایک فصیل کھڑی تھی ۔

مجھے اس شخص نے محل کے اندر ایک بہت بڑے کمرے میں لے جاکر کھڑا کر دیا ۔ میں نے اپنی نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ایک بہت بڑی اور اونچی سی کرسی پر ایک نہایت چھوٹا آدمی، کرسی کے ہتھے مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا ۔

میرے ساتھ والے آدمی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر کہا ۔

"ظل سبحانی، حاکم جاودانی ـــــ سلطان عالم، معمار اعظم ـــــ فرشتہ عنایات عقل کائنات ....."

وہ اسی طرح نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ لیکن میں یہ الفاظ یاد نہ رکھ سکا۔ کیوں کہ ان میں سے بیش تر میرے لئے قطعی اجنبی تھے ۔ لفظوں کی بارات رکی تو اس شخص نے گہری سانس لی اور پھر ذرا دم لے کر بولا۔ "مژدہ ہو کہ یہ شخص اپنی ان دیکھی نسل کے بوجھ سے بیزار ہے اور خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے ۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج یہ قہقہہ لگاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔"

"بہت خوب ـــــ بہت خوب ـــــ" حاکم شہر کے چھوٹے سے سر پر رکھے ہوئے بڑے سے تاج میں لرزش پیدا ہوئی ۔" اے میری خوش حال قوم کے زندہ دل فرزند! ہا بدولت تجھ سے بہت خوش ہوئے   مانگ تو کیا مانگتا ہے؟"

"میرے مہربان آقا! بندہ جان کی امان کے بعد ایک سوال کا جواب چاہتا ہے ۔"

"بولو ـــــ" پورا ایوان نرم دل آقا کی کرخت آواز سے لرزنے لگا۔

"سوال یہ ہے کہ میری ذاتی اور نجی باتوں کا علم اس آدمی کو کیسے ہوا؟"

سورج مکھی کی مانند اس شخص نے جو مجھے اپنے ساتھ لایا تھا، حاکمِ شہر کی طرف دیکھا۔

"اس سوال کا جواب دیا جائے۔" حاکم نے حکم صادر کیا۔

اے میرے عزیز ہم وطن! تو نے سُنا ہوگا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ــ ظلِ سُبحانی نے شہر کی تمام دیواروں میں سچ مچ کے کان اور آنکھیں لگوادی ہیں تاکہ رعایا کی خبر گیری کی جا سکے ـ تمہیں اس بات کے لئے حضور پُر نور کا ممنون ہونا چاہئے کیوں کہ اسی میں تمہارا اور تمہاری قوم کا مفاد ہے۔"

سو میں نے اپنے اور اپنی قوم کے مفاد میں سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس کے عوض میری بھاری تنخواہ مقرر ہوگئی اور مجھے یہ کام سونپا گیا کہ میں شہر کے ہر چوراہے پر کھڑا ہو کر دن بھر قہقہوں کی بارش کرتا رہوں تاکہ ان نافرمان باغیوں کا منہ بند کیا جا سکے جو یہ کہتے تھے کہ ایک بڑی نحوست ہم پر مسلط ہوگئی ہے جس نے ہمارے لبوں سے مسکراہٹیں چھین لی ہیں۔ شہر کے لوگ ہنسنا بھول گئے ہیں اور بچے اس لفظ سے قطعاً ناآشنا ہیں۔

میں اس الزام کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ہر موڑ، ہر چوراہے پر قہقہے انڈیلنے لگا۔ لوگ تعجب سے مجھے دیکھتے اور ہمدردی کی سوئیاں میرے وجود میں چبھو کر آگے بڑھ جاتے جیسے میں کوئی پاگل ہوں ـ ایک دن ایک بچے کو حیرت سے اپنی طرف تکتے ہوئے دیکھ کر، ہنستے ہنستے اچانک میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اور میں رونے لگا۔ حاکمِ شہر کو اس کی خبر ہوگئی اور اس نے دربار میں بلا کر مجھ سے کیفیت طلب کی۔

"کیا تم باغیوں سے مل گئے ہو؟ صاف صاف بتاؤ ورنہ ....."

"بندہ پرور! آپ کو یہ گمان کیسے ہوا کہ آپ کا یہ غلام نمک کا ذائقہ بھول سکتا ہے؟"

"تو کیا یہ غلط ہے کہ قہقہوں کی بجائے سرِ بازار تمہاری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے؟"

"حضورِ عالی! یہ بالکل سچ ہے۔ لیکن وہ خوشی کے آنسو تھے۔ انسان جب حد سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔"

میری یہ بات حاکم کے دل کو لگی اور اس نے میری دانشمندی سے متاثر ہو کر مجھے اپنا

مشیر خاص مقرر کر لیا۔ اب میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں شہریوں کے لئے معلومات اور تفریح کا سامان فراہم کروں۔

سو میں نے ہر گھر میں ایک شیشے کا گھر مہیا کر دیا جس کے پردے پر چنچل، البیلی عورتیں جب اپنے شیشے جیسے شفاف اور چمکتے ہوئے جسم کے ساتھ نمودار ہوتیں تو دیکھنے والے اپنا دل تھام کر سسکاریاں بھرنے لگتے۔

ہوا کے دوش پر گھر گھر پہونچنے والی آوازیں کانوں سے ہوتی ہوئی ناف کے نیچے تک جسم کی ہر رگ کو چھیڑتیں ورغلاتیں۔

کورے کاغذ کا سینہ رنگ برنگ کے ناپاک نقطوں کی سلاخ سے داغ داغ کر جھوٹ کے بے لباس ہرکارے ہر طرف دوڑا دیئے گئے۔

شہر اب شہر نہیں رہا بلکہ ایک آوارہ کشتی اور ایک منہ زور جنو کی علامت میں ڈھل گیا تھا۔

ہر فرد کو راشن کے ساتھ وہ جھلیاں بھی مفت تقسیم کی جا رہی تھیں جو ماں کی کوکھ کی خدمت انجام دے کر گمراہیوں کے نشان مٹاتی اور انسان کا بوجھ کم کرتی تھیں۔ شر پسند باغیوں کی کسی بات کا اثر اب لوگوں پر نہیں ہو رہا تھا۔

حاکمِ شہر ہر طرح مطمئن و مسرور تھا۔ لیکن میرے اپنے ہی منصوبے کے مطابق جب شیشے کا گھر روشن ہوتا یا ہوا کے دوش پر سفر کرنے والی آوازیں میرے کانوں پر دستک دیتیں یا اجلے کاغذ کا داغ سینہ نظروں کے سامنے آتا تو میرے پورے جسم میں ایک انجانے خوف کا سیّال گردش کرنے لگتا اور میرے ہونٹوں پر ایک دعا، ایک فریاد تڑپنے لگتی۔

"اے سیّارہ! اے سیتا!! اے مریم!!! تمہیں تمہاری پاکدامنی کی قسم ہماری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی آبرو رکھنا...."

لیکن ایک دن جب میں اپنے فرائض انجام دے کر گھر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیوی گھر سے غائب ہے ـــــــ اور سنگھار میز پر رکھی ہوئی میری تصویر رنگ رنگ کی لجلجی جھلیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

دکھ اور تاسف کی وجہ سے میری دونوں آنکھیں مندنے لگیں۔ ـــــــ مگر ٹھیک اسی سمے تیسری آنکھ کے دریچے جیسے اچانک روشن ہو گئے۔

لکشمن ریکھا

(منظر کاظمی)

"...خوراک سے جاندار پیدا ہوتے ہیں۔
بارش سے خوراک پیدا ہوتی ہے۔
قربانی سے بارش ہوتی ہے۔
اور قربانی عمل سے ہوتی ہے..."

اور ہم جو انسان کی سب سے بڑی ایجاد پر خوش تھے کہ اسی ایجاد نے ہمیں خانہ بدوشی کی زندگی سے نجات دلائی، اب کولتار کی لمبی اور چوڑی سڑکوں پر اپنی چپلیں گھسیٹ رہے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس کے بعد جو سورج نکلے گا وہ ہماری منزل کو ہماری ہتھیلیوں پر لاکر رکھ دے گا اور تب ہمارے پاؤں کے آبلے قہقہے لگائیں گے اور یوں صبح سے شام تک کے سفر کا نتیجہ کسی نرم نرم خواب کی جھل مل کرتی ہوئی تعبیر کی مانند ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ کولتار کی لمبی اور چوڑی سڑکوں کے سفر نے ہمارا قد چھوٹا کر دیا۔

اور اس سفر کا آغاز خود ہم نے کیا تھا۔

کہ سفر کی باہیں، ہم نے سُنا تھا، راحتوں کے گلے میں جھولا جھولتی ہیں۔
مسکراتی ہیں۔
اور جھوم جھوم جاتی ہیں۔

اور ان مسکرانے والی آنکھوں کے بہت اندر تک، ہزار ڈھونڈھیے، پچھلے سفر کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ کوئی گرد نہیں ہوتی۔

حالانکہ پیپل کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر ہم لہلہاتی ہوئی فصلوں کا رقص دیکھتے

تھے اور دھان کی بالیوں اور کبھی گندم کے خوشوں کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر نکلنے والی خوشبو جب پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی، اس وقت ہمارا عجب حال ہوتا تھا کہ ہم اپنی نگاہیں، خاص کر ایسے دنوں میں، وہیں نزدیک کے کسی پن گھٹ پر جھل جھل کرتی ہوئی گاگروں پر مرکوز رکھتے تھے۔ گوریوں کی جھما جھم پر ایک بوڑھا شخص اندر ہی اندر کڑھتا اور کچھ ہی دور پر ہمیں بیٹھا ہوا دیکھ کر دھیرے دھیرے بڑبڑاتا، پھر بہت سوچ کر آپ مسکراہٹیں بکھیرتا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی راہ پر لگ جاتا اور یہ سب کچھ، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس بوڑھے شخص کی نگاہیں بڑا تجربہ رکھتی ہیں، ہمارے لئے بہت کچھ تھا کہ یہ راز ہم پر بہت دنوں بعد کھلا اور ایک شخص نے ہمیں بہت کچھ دینے کے بعد بھی کچھ نہیں دیا کہ اس نے ہمارا سب کچھ لے لیا۔

اب تو چھل چھل کرتی ہوئی گاگروں کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں اور کبھی اس کا اتفاق بھی ہوتا ہے تو یہ اپنا رنگ بدل لیتی ہیں۔ ان کا سنہرا رنگ پگھل پگھل کر پانی کی حالت اور آگ کی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر نہ جانے کیا ہوتا ہے کہ ہمارے جسموں سے ایک آبشار پھوٹتا ہے اور اندر کا سب کچھ باہر آجاتا ہے اور اس میں پسینے کی بو، جسم کا تناؤ اور جھکتی ہوئی کمر کا بل ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ پگھلی ہوئی گاگروں کا رنگ سیاہ اور حالت ٹھوس ہوتی جاتی ہے اور چاروں طرف سے اسی ہزار ہاتھ یکبارگی بلند ہوتے ہیں اور ان سب کو اپنی گرفت میں رکھنے والی دو آنکھیں مسکراتی ہیں اور قہقہے لگاتی ہیں۔ ایسے سفر کا ایسا انجام ہوگا، یہ بول پہلے اجنبی تھا اب مقدر بن گیا ہے۔

پیپل کی گھنی چھاؤں ٹیڑھا میڑھا ایک دائرہ بناتی ہوئی جہاں ختم ہوتی ہے وہیں سے کولتار کی لمبی سڑک کا آغاز ہوا تھا اور ہم نے کوئی بات سنی ہو اور اس پر عمل کیا ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم نے وہی کیا جو دوسرے کرتے تھے

اور اس طرح کیا جس طرح دوسروں کو کرتے دیکھا تھا۔ ہماری تمام مصروفیتیں اسی کی حد میں تھیں اور ہم نے سیکھ رکھا تھا کہ اس چھاؤں سے مل مل کر جو دھوپ کی ایک لکیر گذرتی ہے وہ ہماری سرحد نہیں اور یوں ہمیں اتنا سیکھ لینے کے بعد، اپنے حدود میں دُنیا کی وسعتیں نظر آتی تھیں پھر جانے کیا ہوا کہ سنہرے رنگوں والے کسی ہرن کا، جسے ہم نے بہرحال نہیں دیکھا تھا، پیچھا کرتے ہوئے ایسے لوگ ہم سے دور ہو گئے جنھوں نے ہمیں پہلی بار اپنے گھر کی پہچان کا شعور بخشا تھا۔ اور ایسے ہی دنوں میں ایک دن ایسا ہوا کہ دور آسمان کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے آگ کے شعلوں اور دھوئیں کے بادلوں کو دیکھ کر ہم اس راہ پر چل پڑے جو دھوپ کی لکیر کے بعد شروع ہوتی تھی اور جس راہ پر اور بھی لوگ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں یوں چل رہے تھے گویا وہ کسی بڑے سے میلے میں جا رہے ہوں اور خوش تھے کہ ان کے ساتھ ان کے چھوٹوں کی فرمائشیں اور بڑوں کی دُعائیں شامل تھیں۔ کچی سڑک کی مخملی دھول ان کے قدموں سے لپٹ لپٹ کر روتی تھی اور اپنے لئے کسی پناہ گاہ کا پتہ پوچھتی تھی۔ مگر وہ لوگ مچل مچل کر آگے کی جانب بڑھتے جاتے تھے اور ہر دو چار قدم کے بعد اپنا پاؤں پٹکتے تھے کہ ان کے نئے جوتوں کی چمک دھیمی پڑ جائے، یہ بات انھیں گوارا نہ تھی کہ جہاں وہ جا رہے تھے، کچھ اس طرح کی باتیں رائج تھیں۔

کولتار کی سڑک نے کیسی نرم نرم اور مخملی دھول کو اپنے اندر چھپا رکھا ہے اس کا علم ہمیں اس سفر کے آغاز ہی میں ہو گیا تھا، لیکن ہم مجبور تھے کہ فرمائش اور دُعائیں ہمارے لئے بھی زادِ راہ بن گئی تھیں۔ پھر بھی اس پورے سفر میں وہ لوگ بہت یاد آئے جنھوں نے ہمیں پہلی بار اپنے گھر کی پہچان کا شعور بخشا تھا اور جو کسی ہرن کی تلاش میں ہماری نظروں سے بہت دور چلے گئے تھے۔ اتنی دور کہ آسمان کی بلندی میں اُڑنے والا جٹایو بھی اپنی ایک نگاہ میں ہم دونوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور ہم نے تو اپنے سر پر کسی جٹایو کی

پرواز بھی محسوس نہیں کی، پھر ہم کیا کرتے کہ ہمارے لئے بعض چیزیں زادراہ بن گئی تھیں۔

زاد راہ، کہ سفر کے لئے ضروری تھا

اور سفر، کہ اس کا آغاز خود ہم نے کیا تھا۔

کہ سفر کی باہیں، ہم نے سُنا تھا، راستوں کے گلے میں جھولا جھولتی ہیں مسکراتی ہیں۔

اور جھوم جھوم جاتی ہیں۔

پھر وہاں پہنچ کر جہاں کولتار کی سیدھی سڑک کبھی نہ ختم ہونے والا ایک چکر بنا کر اپنی لمبائی ختم کر دیتی ہے، اسی ہزار ہاتھوں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہمیں عجیب سا لگا کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس دو ہاتھ تھے لیکن آنکھیں کسی کی نہیں تھیں۔ چالیس ہزار انسانی جسم کے یہ اسی ہزار ہاتھ مٹی چھوتے ہیں اور سونا بنتا ہے بظاہر اس کی شکل سیاہ ہوتی ہے لیکن کیفیت اس کی سونے جیسی ہوتی ہے کہ بے شمار چھل چھل کرتی ہوئی گاگریں پگھل پگھل کر اس میں شامل ہوتی جاتی ہیں۔ چالیس ہزار انسانی جسم سے آنکھیں ان کی چھین لی گئی ہیں کہ وہ اپنے ہاتھوں کا کمال نہیں دیکھ سکیں، جب ان ہاتھوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا تو ہم، کہ ہر حال میں اپنی آنکھیں محفوظ رکھنا چاہتے تھے، بہت گھبرائے، بہت پریشان ہوئے اور اس دوران ہمیں ایسا لگا کہ ملگجی شام کا ایک دوپٹہ سا لہرانے لگا ہے اور اس پر ہلکے اور نرم دھوئیں میں ڈوبی ہوئی ایک آبادی کا عکس بہت واضح ہے اور تب ہمیں اپنا زاد راہ یاد آیا اور تبھی کچھ سوچ کر ہم نے، بہرحال اپنی آنکھیں بچا بچا کر مٹی کے ڈھیر کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحہ ہمارے ہاتھ بھی، اسی ہزار ہاتھوں کی طرح اپنا کمال دکھانے لگے۔

"..... میرے لئے تینوں عالم میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو میں کردں

نہ کوئی ایسی غیر حاصل شدہ چیز ہے
جسے میں حاصل کرنا چاہوں۔
پھر بھی عمل میں مشغول ہوں....."

اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے مٹی کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا ہو یا سیاہ رنگ کا سونا بناتے وقت اپنے ہاتھوں کا کمال دکھانے میں کسی سے پیچھے رہ گئے ہوں، لیکن ہماری آنکھیں، کہ ہم نے انھیں ہر حال میں اسّی ہزار ہاتھوں والے آدمی کی نگاہوں سے محفوظ رکھا ہے، ہمیشہ پریشان رہتی ہیں اور اس کا اظہار کرتی رہتی ہیں کہ سروں پر چمکنے والی دو آنکھیں اب کہاں سے آئیں گی اور یہ کہ ان کی جگہ پر دو گول گول سوراخ جو بہت بھیانک نظر آتے ہیں اور جن کے ایک سرے سے کچھ دیکھئے تو دوسرے سرے پر سب کچھ صاف صاف دکھائی دیتا ہے، ان کا کیا ہوگا؟ کیا اپنے ہاتھوں کے کمال سے وہ اسی طرح ناواقف رہ جائیں گے؟ ہم تو صبر بھی نہیں کرسکتے کہ یہاں سب کے سب اپنی آنکھوں کی سرنگ پر ہتھیلیاں ڈالے یوں کانپ رہے ہیں گویا انھوں نے اپنی آخری سانس کو اپنا پورا اعتماد بخش دیا ہے اور اس کے بعد بھی ان پر خوف طاری ہے۔

ایک شام، کہ ٹھنڈی اور سرمئی اور ملگجی شام کی عکس ریزی اس میں تھی، ہمیں تڑپا گئی۔ اور ہم، کہ ہمارے پاس سیاہ رنگ کے سونے کا ایک حصّہ، جو ہمارے ہاتھوں کی خیرات تھا، ہمیں اُکسانے لگا۔ خوبصورت سیڑھیوں کے ایک طویل سلسلے سے گذر کر پہلے تو ہم مخملیں قالین کے بستر پر چلے پھر اپنی نگاہوں کو ادھر اُدھر گھُما کر دیکھا تو دھوپ کی لکیر سے بننے والی سرحدوں کی آبادیاں پہلی بار پہچان میں آئیں۔ پھر انھوں نے اپنے اپنے ڈھنگ اور اپنی اپنی نوعیت کے مطابق ہماری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اس لمحہ گاگروں کا رقص دھیما پڑنے لگا، فرمائشیں ذہن سے نکل گئیں اور دُعاؤں کا اثر جاتا رہا کہ مخملی قالین کے بستر نے دوستی کے اس معاہدے پر بے پناہ مسرّتوں کا

اظہار کیا تھا۔

معاہدہ، کہ دوستی کا تھا۔

دوستی، کہ دو سرحدوں کے درمیان مستقل تناؤ کی بہترین علامت ہے، اور علامتیں، کہ خود تو قربان ہوجاتی ہیں لیکن حقیقتوں کی پہچان بخش دیتی ہیں۔

اور یہ پہچان؟

ایک واٹر ٹینک کی تیاری میں ہزاروں گاگریں ٹوٹتی ہیں اور اس ٹینک کو آگے بڑھنے کی علامت سمجھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے دل کے قریب ہی بعض لمحوں نے ایسے گھر بسا لئے ہیں جہاں شام ہوتے ہی گریہ وزاری اور نوحے کی دل خراش آوازیں آگے بڑھنے کی تمام علامتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہیں اور پس منظر میں ایک آواز ——— دور سے آتی ہوئی ملی جلی آوازوں کا ایک سرگم بلند ہونے لگتا ہے لیکن مخملیں قالین کے فرش پر تھرکتے ہوئے جسم کے پیچ وخم میں سرگم کی تمام بلندیاں دم توڑ دیتی ہیں اور نئے معاہدے کے تحت ہماری آنکھیں جسموں کے نشیبی علاقے سے اپنا سفر شروع کرتی ہیں اور راستے کی تمام بلندیوں کو یوں روندتی ہیں کہ چند لمحوں کے لئے ان کی پہچان کی تمام علامتیں موہوم اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوجاتی ہیں اور تب ہمارے ہاتھوں کی خیرات ہمیں بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتی ہے اور مخملیں قالین کے بستر پر چل کر ہم سیڑھیوں کے طویل سلسلے سے نیچے اُتر آتے ہیں۔

ایسے میں سُرمئی شام کے دوپٹے میں لپٹی ہوئی آبادیوں کا عکس پھر سے آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ملی جُلی آوازوں کا سرگم پھر سے بلند ہونے لگتا ہے اور پیپل کی گھنی چھاؤں سے ٹوٹ ٹوٹ کر بنتا ہوا دائرہ اپنے مرکز پر سمٹ کر اور کبھی پھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور دھان کی بالیوں اور گندم کے خوشوں کے اندر پھوٹنے والی خوشبو ہمارے اندر کا سب کچھ دھو دیتی ہے اور تب فرمائشوں اور دُعاؤں کا ایک ہجوم اپنے مخصوص تیور کے ساتھ ہم کو ایک معاہدے کی یاد دلاتا ہے لیکن

ہمیں بھیک مانگنے کا فن اور اسّی ہزار آنکھوں کی سُرنگ کے علاوہ کچھ بھی یاد نہیں

پھر ہم کیا کریں ؟

سوال، کہ جواب مانگتے ہیں۔

جواب، کہ ہمارے پاس کوئی نہیں۔

ہم کہاں جائیں ؟

سڑکیں، لمبی اور کشادہ کہ سیڑھیوں سے اتر کر ہم انھیں سڑکوں پر چلتے ہیں جہاں ہر طرف خود کار اور بے آواز بندوقیں اپنے اور بے گانوں کی تمیز کھو کر چوڑے چکلے سینوں کی تلاش میں بڑی بے چینی کے ساتھ گویا ایک گردش میں ہیں اور ہم ان سے بچ بچ کر نکل جانے کی کوشش میں پریشان رہتے ہیں کہ آنے والی صبح کا سورج ہمارے لئے وہی پیغام لائے گا جو اسی ہزار ہاتھوں والے ایک شخص کے اشارے پر ہم تک آتا ہے اور ہم اس کے شور میں خود اپنی بھی آواز نہیں سُنتے اور آنکھوں پر حفاظتی پٹی باندھ کر اپنے ہاتھوں کے کمال دکھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

کمال، کہ اسّی ہزار ہاتھوں کا ہے۔

ہاتھ، کہ مٹّی چھوتے ہیں اور سونا بنتا ہے۔

سونا، کہ اس کی خیرات نے ہمیں بھیک مانگنے کا فن سکھایا اور فن،

کہ ہم نے مٹّی کو کبھی نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔

لیکن ایک واٹر ٹینک کی تیاری میں ہزاروں گاگریں ٹوٹ گئیں اور اس کے اظہار میں ہم پر ہمیشہ ایک خوف طاری رہا کہ لوگ بغیر سوچے سمجھے ہمیں ملزم ٹھہرائیں گے کہ ہم نے جنگل کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور یہ کہ ہم ان سے ان کا لباس اور گھر واپس مانگتے ہیں۔ پانچویں اور دسویں اور بیسویں فلور پر رہنے والے اپنے آپ کو قدآور سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ دراصل انھیں زمین پر کھڑے ہو کر اپنا قد ناپنے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ ورنہ ایسا کیوں ہو کہ سورج ہر سیکنڈ اپنا لاکھوں من وزن کم کرتا جائے اور ہم

اپنے انجام سے بے خبر اپنے آپ کو قد آور سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا رکھیں۔

دھوپ کی لکیر سے بننے والی سرحد کی آبادیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دوسروں کی بیویاں مانگتے ہیں اور انھیں مل جاتی ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کی بیویاں ان کے متعلقین آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور اس کے بعد وہ زندہ رہتے ہیں کہ انھوں نے خانقاہوں سے اپنا رشتہ جوڑ لیا ہے اور ہم جو چپلیں گھسیٹ گھسیٹ کر اپنا قد چھوٹا کر چکے ہیں، حیرت سے انھیں دیکھتے ہیں اور جب ان کے چہروں پر آنکھوں کی سرنگ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تو ملگجی شام کا ایک ہلکا سا دوپٹہ نگاہوں کے سامنے لہرا جاتا ہے اور اپنے سفر کے آغاز میں قدموں سے لپٹ جانے والی نرم نرم دھول یاد آنے لگتی ہے اور ایسے ہی لمحوں میں اپنی پُشت پر تیز آنکھیں بیدار ہوتی ہیں اور پُرانے سفر کو مخالف سمت میں دُہرانے کی تحریک پیدا کرتی ہیں۔ لیکن ہم، کہ ہم نے مٹی کو کبھی نفرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا، ایسا کرنے پر خوف زدہ ہیں کہ لوگ ہمیں ملزم ٹھہرائیں گے کہ ہم ان سے ان کا لباس اور گھر واپس مانگتے ہیں۔

پہلے جو کبھی ہم گھر سے نکلتے تھے اور ایسا ہو جاتا تھا کہ ہماری آنکھیں سُرخ ہوں تو ان گنت آنکھیں ہم پر شفقتوں کی برف باری کرتی تھیں۔ اور اب یہ ہے کہ ہمارا پڑوسی قتل کر دیا گیا۔ سڑک کے کنارے بہنے والی نالیوں کا رُخ موڑ دیا گیا اور سورج غروب ہوتے ہی عورتوں کی تقسیم شروع ہو گئی اور ہم حیرت سے انھیں دیکھ رہے ہیں کوئی اتنا ہی پوچھ لیتا کہ ہماری آنکھیں متحیّر کیوں ہیں تو یقین ہے کہ ہماری پشت پر بیدار ہونے والی آنکھیں اتنی سخت نہیں ہوتیں اور سچّائیوں پر اسباب کے پردے پڑ جاتے۔

سچائیاں، علامتوں کے لباس میں چھپ کر ہمارے سامنے اس لئے بھی آتی ہیں کہ ان کی شعلہ بار نگاہوں کی تاب ہم میں سے کون لائے گا، جب ہمارے جسم کے اندر سے ایک آبشار پھوٹتا ہے تو بہتی ہوئی آگ کی اوپری سطح پر محض دو چار

ہرے بھرے پودوں کو دیکھ کر ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس دم لہلہاتی ہوئی فصل کے درمیان سے گذرنے والی آگ کی ندی ہمارے ذہن سے نکل جاتی ہے۔

یوں تو یہ بات بالکل بیکار سی معلوم ہوتی ہے کہ ہم اسّی ہزار ہاتھوں کا ذکر بار بار کرتے ہیں کہ ان کا ذکر کہیں بھی ہو سکتا ہے اور کسی بھی تعداد میں ہو سکتا ہے اور اس کی ابتدا اور انتہا دونوں کا حال یکساں ہے تعداد کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ ہاتھ اپنا کمال نہیں دیکھ پاتے اور اس کمال کا مظاہرہ کہیں یوں ہوتا ہے کہ مشینیں ٹوٹتی ہیں تو خوشی کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں اور کہیں یوں کہ ندیاں اُبلتی ہیں تو آنکھوں سے خون کے آنسو جاری ہوتے ہیں۔

دراصل دھوپ کی سرحد سے بننے والی آبادیاں اپنی آنکھوں سے محروم ہیں اور یہ محرومی ان کے دوسرے اعضا کو بیتاب کئے رہتی ہے۔ اور ہم جو اپنے زادِ راہ کے بل بوتے پر کولتار کی لمبی سڑک کو اپنی منزل سمجھ بیٹھے تھے، جنہوں کے نشیبی علاقے سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں اور نئے معاہدے کی خوشی میں راستے کی تمام بلندیاں معدوم ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔ مشینوں کے ٹوٹنے پر نعرے بلند ہوتے ہیں اور اُبلتی ہوئی ندیوں کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ سیاہ رنگ کے سونے کی خیرات نے ہمیں بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا ہے۔ حالاں کہ اس بات پر ہم آج بھی خوش ہیں کہ انسان کی ایک ایجاد نے ہمیں خانہ بدوشی کی زندگی سے نجات دلائی اور اس کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے مٹی کو کبھی نفرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اپنے ہاتھوں کا کمال دکھانے میں ہم کسی سے پیچھے رہ گئے ہوں۔ لیکن ہماری پُشت پر بیدار ہونے والی آنکھیں ہمیں اپنے پُرانے سفر کو مخالف سمت میں دُہرانے پر اُکسا رہی ہیں اور ہم خوف زدہ ہیں۔

"یہ دُنیا ایسے شخص کے لئے نہیں جو
قربانی نہ کرے"

چہ جائیکہ عالمِ بالا۔
اے کوروؤں کے برگزیدہ انسان ....''

کہ پیپل کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے لوگ ہم سے اگر یہ پوچھیں کہ ہماری آنکھیں، جنھیں ہم نے ہر حال میں محفوظ رکھا ہے، کیا ہوئیں، تو ہم کیا کہیں گے؟

اس سفر کے لئے جب ہم چلے تھے تو اپنے سفر پر کسی جٹایو کی پرواز بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اور اس سفر سے جب ہم واپس آئے ہیں تو اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین بھی سخت ہوگئی ہے۔

گرہ، ناخن، گرہ

شبیر احمد

سرمئی شام سیاہ چادر لپیٹ کر سوگئی تب ہوا یہ کہ ایک ٹکڑا، شائد چاند کا چھوٹی حویلی کے آنگن میں اتر آیا۔ وہ حیرت کے آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ آواز کا جادو جادو جاگا تو ہوش کی پلکیں جھپکیاں لینے لگیں۔ سانسوں کے گرم گرم لمس کی لذتوں سے آشنا ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی کے آخری تیس سال کہیں غائب ہو گئے۔ تب وہ گاؤں کا وہی رسیلا چھیلا تھا جس کے بازوؤں کی سفید سفید مچھلیاں، پھسل پھسل جائیں تو گاؤں کی کتنی ہی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے۔ جب کبھی اس کا اپنا دل دھڑکتا تو وہ کملاندی کے تٹ پر بیٹھ کر ہیر کے گیت گاتا۔ حالانکہ ہیر کے گیت پنجاب کے تھے۔ اور وہ بہار کا تھا۔ پھر بھی گیت اسے بیحد پسند تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ گاؤں کی چھبیلیاں دزدیدہ نگاہوں سے اس کے چوڑے سینے کو دیکھتی رہتیں کہ اس چوڑے سینے میں اپنے نازک وجود کو سمیٹ لینے کی تمنا ہر ایک کے دل میں مچلتی تھی مگر ہیر سب تھوڑی ہی بن پاتی ہیں۔

ایک دن اس کے گیت کی مدھر تان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی کہ اسے ہیر مل چکی تھی۔ "اب تم یہ گیت کبھی نہ گاؤ، میں سدا کے لئے تمہارے پاس چلی آئی ہوں"

"ہیر ——— ؟"

"کون ہیر ——— ؟"

وہ چونک پڑا۔ ہیر کے گیت روٹھ گئے۔ جب اس نے ہوش کی آنکھیں کھول دیں تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے سینے سے لگا کوئی کسمسا رہا ہے۔

"تم ——— ؟ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا

"ہر روز راہوں میں پلکوں کی سیج سجاتی تھی کہ شائد تم آجاؤ ــــــ!
مگر تم ــــــ؟"

پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وہ صرف اسے دیکھتا رہا۔ کچھ بولا نہ ڈولا۔ اپنی ہی آواز بے وفائی کر رہی تھی۔ اور جسم پتھر کا بن گیا تھا کہ اس جملے نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ یہی جملہ، بہت قبل، اس کے کانوں نے سنا تھا۔ اور اس کے فوراً بعد اس نے دیکھا بھی تھا کہ تاریکی میں چھوٹی حویلی سے نکل کر دو سائے باہر جا رہے تھے۔ اسی وقت اس نے اپنے بیٹوں کی چارپائیوں کا جائزہ لیا۔ پہلی چارپائی خالی تھی۔

اس کے تین بیٹے تھے۔ چھوٹی حویلی اور بڑی حویلی کے منہدم صدر دروازہ کے ٹھیک سامنے تین درخت تھے جو اس نے اپنے بیٹوں کی پیدائش کے دن لگائے تھے۔ ان درختوں کی آبیاری میں اس نے اپنا سب کچھ لگا دیا کہ یہی اس کی زندگی کا حاصل تھے۔ ان شاداب درختوں کو دیکھ دیکھ کر وہ بے حد خوش تھا۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ سب سے بڑا درخت مُرجھا گیا۔ پھر اس کی پتیاں زرد ہو گئیں اور تب اس کے جسم کا ایک ایک لباس اتر گیا وہ بے حد اداس ہوا۔ اس کی اُمنگوں پر منوں اوس پڑ چکی تھی۔ جس دن وہ درخت کاٹ کر الگ کر دیا گیا وہ بہت رویا، اتنا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور سوج گئیں۔ وقت کے مرہم نے اس کے گہرے زخم کو مندمل کر دیا۔

"اداس کیوں ہوتے ہو، جو ہیں ان کی سلامتی کی دعائیں کرو"

اس نے ان کی سلامتی کے لیے دعائیں بھی کیں تو کچھ ہی دنوں بعد دوسرا درخت مرجھا گیا، اس کی پتیاں زرد ہو گئیں۔ پھر اس کے جسم کا ایک ایک لباس اتر گیا اور اس کے اپنے چہرے پر جھریاں ابھر آئیں۔ جسم ہڈیوں کا ایک بے ڈول اور جھول سا ڈھانچہ بن گیا سر کے بال ایک دم سفید ہو گئے۔ بڑی حویلی کے صدر دروازہ کے سامنے اب ایک چھوٹا سا نوخیز درخت رہ گیا تھا۔

"تنکے کا سہارا کبھی کبھی غنیمت ہوتا ہے"

اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں سوچ سکا۔

"بڑے میاں! تم نے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ تم نے یہ جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی کہ اکثر رات کو کیوں ایک سایہ تمہارے درختوں تک جاتا ہے۔ پھر دو سائے 'بڑی حویلی' میں داخل ہو جاتے ہیں"۔

"تو کیا وہ بہو ——؟ نہیں نہیں۔ اسے دیکھ کر تو میرے دل میں خواہش ہوئی ہے کہ اس کے قدموں پر عقیدتوں کے سجدے سجا دوں۔ مگر گاؤں کے لوگ تو عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں"۔ دلہن بننے کے کچھ ہی دنوں بعد کہ حنائی انگلیوں کی سرخیاں ماند بھی نہیں پڑی تھی کہ بہو کے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالی گئیں۔ بڑی بیگم کی طرح وہ بھی سفید لباس پہننے لگی۔ اس لباس میں وہ کوئی مقدس ہستی لگتی۔ گمان ہونے لگتا کہ حقیقت منتظر لباس مجاز میں آ گئی ہے اور دیکھنے والوں سے پوچھ رہی ہے —— تمہاری جبین نیاز میں تڑپتے ہوئے ہزاروں سجدے کہاں گئے ——؟ کہاں گئے

وہ سجدے ——؟؟

گاؤں کے لوگ تو کچھ اور ہی کہتے۔

"مگر ——؟"

وہ "مگر" سے آگے کچھ نہیں سوچ سکا۔

بڑی حویلی میں ایک بھی مرد نہیں رہ گیا تھا۔ بڑی بیگم بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ تین بیٹوں کا غم سہ نہ سکیں۔ کچھ بڑی بوڑھی رہ گئی تھیں سو ان لوگوں نے بھی شائد اپنی اپنی آنکھیں موند لی تھیں اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔

گاؤں والے کہتے ہیں۔ بہو، بڑی بیگم ہی کی طرح معصوم اور پاکیزہ ہے۔ مگر گاؤں والے اس کے تقدس کی قسمیں کیوں نہیں کھاتے ——؟ اک سوالیہ نشان ——

یہ نشان پھیل کر کچھ اور بڑا ہو گیا تو اس نے سوچا۔

"بہو معصوم اور پاکیزہ نہیں ہے ــــــ؟"

سوالیہ نشان کچھ اور پھیل گیا۔ تب اس میں "مگر" کو ڈالا۔ سوالیہ نشان سمٹنے لگا۔ سمٹ کر چھوٹا ہوا۔ اور چھوٹا۔ پھر مگر کو نگل گیا۔ پھر نقطہ بنا۔ پھر غائب ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ سوچ رہا تھا:۔

"غیب کی باتیں تو صرف خدا جانتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تو کچھ نہیں دیکھا۔"

"مگر گاؤں کے لوگ ــــــ؟"

غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔

وہ مسلسل سوچتا رہا۔ گاؤں کے لوگ بہو کے تقدس کی قسمیں کیوں نہیں کھاتے ــ کل تک بڑی حویلی کتنی سربلند، پرشکوہ تھی، مگر آج ــــــ؟ کیا ہو گیا ہے حویلی کے مکیں کو ــــ خاندانی شرافت کی چادر اب اتنی تار تار ہو چکی ہے کہ جس کا جی چاہا، ٹانگ اڑا دیتا ہے ــ اب یہ حویلی کہاں رہی۔ یہ تو ایک عظیم کھنڈر ہے یا پھر خاندان کی روایات کا بوسیدہ اور خستہ مقبرہ، جس پر کبھی نہ کوئی چراغ جلایا اور نہ خوشبو ہی بسائی گئی اور نہ مقدس قدموں کا کوئی نقش ہی باقی رہا کہ بیباک اور بے حجاب پاؤں نے سب کچھ روند ڈالا تھا۔

ایک دن وہ بیحد اداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ مایوسیاں سمٹ آئیں۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ گاؤں کے کچھ اور درخت سوکھ گئے تھے۔ ان کی پتیاں زرد ہو چکی تھیں۔ اور ان کے جسموں کے لباس اتر چکے تھے۔ اداسی کی وجہ یہ تھی کہ اب اس کا تیسرا نوخیز درخت بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! وہ لرز گیا۔

اس کے باوجود گاؤں والوں کی باتوں پر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"بہو معصوم اور پاکیزہ ہے۔ میرا دل نہیں مانتا کہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ! میں جب بھی اس سے ملا ہوں۔ میں نے اس کی کالی کالی اور بڑی بڑی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل کے طوفان کو پڑھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی سپاٹ، اداس اور کھوئی کھوئی

ویران آنکھوں میں دور دور تک کچھ بھی تو نہ تھا۔ ایک سادہ سے تاثر کے سوا جو بہت ہی معصوم اور پاکیزہ تھا"

"مگر ——— ؟ پھر وہی سوالیہ نشان ——— وہ مگر سے آگے نہیں سوچ سکا۔

"بڑے میاں! تمہاری عقل پر پردہ پڑ چکا ہے۔ سچائی کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش خود کیوں نہیں کرتے۔ آنکھیں کھل جائیں گی تمہاری۔"

اور سچائی اس کے سامنے کھڑی تھی اور وہ اسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

میرا سارا بدن ان دیکھی آگ میں کب سے بھُن رہا ہے ——— اور تم ——— ؟

میرے ساتھ بڑی حویلی تک چلو۔"

پتھر کے ہونٹ لرزے، کانپے اور تھرتھرائے۔

"بہو ——— "

"تو پھر میں یہیں ——— "

اس نے بلاؤز کے بٹن کھول دئے۔

"بہو، بڑی حویلی سے نہ صرف یہ کہ میرے تعلقات ہیں بلکہ مجھ پر حویلی کے احسانات بھی ہیں۔

کیوں مجھے رسوا کرنے پر تُلی ہو۔"

اور تب بہو کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں دو متوازی خطوط کے درمیان کے کسی ابھرے ہوئے نقطے کو مسلنے کے عمل میں مصروف تھیں۔

"آؤ ——— اب دیر نہ کرو ——— اس ان دیکھی آگ کو ہم دونوں ملکر بجھا دیں۔

وہ بے جس و بے حرکت ایک ٹک اسے دیکھتا رہا کہ اس کا یہ روپ پہلی بار اس کے سامنے آیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا دیں۔

"اے اللہ میاں! کیا یہی سب کچھ دیکھنے کے لیے میں اب تک زندہ ہوں"

"آج اسی چارپائی کو سیج بناتی ہوں"

اس نے ایک ہی سدھ میں کھڑی تین چار پائیوں میں سے ایک کو گرا لیا۔ اور پوری قوت سے اسے بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ پھر اس سے لپٹ کر بے تحاشہ اس کے ہونٹوں، گالوں اور ہاتھوں کو چومتی رہی۔ عقیدتوں کے چراغ ایک دم سے بجھ گئے اور بڑے میاں کے جسم میں بھی گرم گرم خون دوڑنے لگا کہ اس کی زندگی کا آخری تیس سال پھر کہیں غائب ہو چکا تھا۔

"ہیر —— میری ہیر !!

اس کے بازوؤں کی گرفت مضبوط ہو گئی اور وہ اس کے سینے سے لگی کسمساتی رہی۔ لیکن اچانک اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ کچھ اسطرح چونک کر اس سے الگ ہو گیا۔ جیسے کرنٹ نے چھو لیا ہو۔ اس کی آنکھیں کھڑی ہوئی دونوں چار پائیوں کا جائزہ لے رہی تھیں جن کا اب کہیں وجود نہیں تھا۔

پھر جب اس کا کھویا ہوا تیس سال مل گیا۔ اس کی آنکھیں ایک دم سے سرخ ہو گئیں۔ اور وہ بہو کو اس وقت تک مکے اور تھپڑوں سے مارتا رہا جب تک کہ وہ گر کر بیہوش نہ ہو گئی۔ وہ بے حس بے حرکت کچھ اس سکون سے پڑی تھی جیسے نیند میں ہو۔ اور وہ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

"بڑی حویلی تک اسے پہونچا دینا چاہیے۔"

پھر اس نے اس کا بلاؤز اٹھایا، ساڑی اٹھائی اور اس کے بازوؤں کو پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا تو وہ کچھ اسطرح چونک کر اٹھ بیٹھی جیسے کچی نیند سے جاگ گئی ہو۔ پر سکون آنکھوں کے سامنے کی دھند چھٹتی گئی اور ایک ہیولیٰ واضح شکل میں تبدیل ہو گیا۔

"آپ —— ؟"

اور پھر اس نے اپنے ننگے جسم کا جائزہ لیا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی اب جو اس نے بڑے میاں کو اپنے سامنے دیکھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"تم —— ؟"

اور ایک لمحے کا انتظار کئے بغیر اس پر ٹوٹ پڑی۔

"کمینے، سور ــــــ تیری یہ مجال۔ کچا چبا جاؤں گی تجھے۔"

وہ بھوکی شیرنی کی طرح اسے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخنوں اور دانتوں سے نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ وہ لہولہان ہو چکا تھا ــــــ مگر کچھ بول نہیں رہا تھا

اچانک اس نے بڑے میاں کو چھوڑا اور سسک کر رونے لگی۔ کبھی وہ اپنے لمبے لمبے کالے بالوں کو نوچتی اور کبھی سر کو ــــــ وہ پاگلوں کی سی حرکت کر رہی تھی۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ "ابھی" اور "ابھی" میں کتنا فرق تھا۔

بہو نے آخری بار بڑے میاں کو حقارت سے دیکھا اور اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اور اسی حالت میں بڑی تیزی کے ساتھ بھاگ گئی۔

جب وہ نظروں سے دور ہو گئی۔ اور اس کی سمجھ میں "ابھی" اور "ابھی" کا فرق بھی آگیا تو اس نے سوچا کہ جب سورج اپنے چہرے سے نقاب الٹ دے گا تو وہ گاؤں کے تمام لوگوں سے کہیگا کہ تم سب جھوٹے ہو۔ بہو آوارہ اور بدچلن نہیں ہے۔ میں اس کے تقدس کی قسمیں کھا سکتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ وہ مریم کی طرح پاکیزہ ہے اور تم سب ان لوگوں میں ہو جنھوں نے مریم پر انگلیاں تو اٹھائیں مگر اسے قریب سے نہیں دیکھا اور جب سورج نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دیا تو اس کی زبان ہمیشہ کے لیے گنگ ہو گئی اور وہ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکا کہ بڑی حویلی کے سامنے والے تالاب میں بہو کی ننگی لاش تیر رہی تھی ــ!!

ــــــ۔۔۔ــــــ

لمحوں کا سفر

نورالہدیٰ سید

شاید جنگ ختم ہو چکی ہو، اور لاتعداد جاں باز لمحے موت کے گھاٹ اتر چکے ہوں۔ اور ایک صدی کی وسعت میں دفن ہو چکے ہوں!

شیر پور بلاک کی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے میں نے سوچا۔ اور سنگ میل پر کھدی ہوئی تحریر کو پڑھتے پڑھتے کئی اور لمحے ڈھیر ہو گئے۔

میر پور کا نام بدل گیا ہے شیر پور!

نام؟ نام کی اہمیت ہی کیا ہے کہ یہ تو محض پہچان کے لئے ہوتے ہیں ایک صدی کی وسعت میں پھیلے ہوئے بے نام لمحوں کی الگ الگ اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟

اور تبھی مجھے ایسا لگا کہ ایک لمحہ میرے پاس آتے ہی رک گیا۔ بمبئی کی کسی شاہ راہ پر رکی ہوئی اس پہلی موٹر کار کی طرح جس کے پیچھے سینکڑوں اس سے بھی قیمتی کاریں بے بسی سی رکی کھڑی ہوں۔

یہ پہلی کار میری ہے!

اور وہ شاہ راہ میرے کان میں دھیرے سے کہتی ہوئی سی معلوم ہوئی،

"آگے اور بھی کاریں جا چکی ہیں۔"

اور اسی دم وہ رکا ہوا پہلا لمحہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اور تب اور بھی لمحے جاتے

چلے گئے ۔

وہ حویلی ہے، جو حویلی تھی! اور وہ ——— اس کا پہلا اور سب سے بڑا پھاٹک
وہ جو پہلے تھا ۔
میں نے دیکھا
اور دیکھتا رہا ——— ادھر، ——— ایک نئی آبادی!
اور پُرانی آبادی؟
میں اس قدیم ترین قبرستان کی طرف چل پڑا کہ پُرانی آبادی اب یقیناً وہیں ہوگی ۔
لیکن جنگ وہاں کبھی ختم ہی ہونے والی تھی ۔ اور وہ مردہ لمحے؟ ——— میں نے ان مردہ لمحوں کی جیبوں میں اپنی یادوں کی انگلیاں اُڑس دیں کہ وہ کچھ نہ کچھ ڈھونڈ کر نکال ہی لیتیں ۔ سو انہوں نے ایک تحریر نکال لی ۔ اور میں انہیں پڑھنے کی کوشش کرنے لگا اور کچھ پڑھا بھی، پھر سوچا ———
تھکے ہوئے لمحوں کو تازہ دم لمحے کچل کر مار ہی ڈالتے ہوں گے ۔! اور پھر میں نے ان ضعیف قبروں کی بے نور آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں ۔ معاً مایوسیوں کے دامن سے ایک خیال باہر نکل آیا ۔ اور اس نے کہا ۔

"تمہارا چہرہ تو ان آنکھوں میں ہرگز دکھائی نہیں دے سکتا ۔"

اور یہ سنتے ہی میں وہاں سے باہر نکل آیا ۔ اور پرانی آبادی سے ہو کر چلتا ہوا سوچتا رہا ———
"نئی آبادی میں ہی ٹھہرنا ہوگا؟"
اور عین اسی وقت آنکھوں نے بتایا ۔
"وہ ہے نئی آبادی ۔"
"جو تمہیں گھور رہی ہے ۔"
میں نے اس سے یہ سوچتے ہوئے پوچھا کہ نئی آبادی پرانی آبادی سے مختلف ہے کیا؟
اور پھر میں نے دیکھا کہ پرانی آبادی کی ضعیف سرحد کو چھوتا ہوا ایک بوڑھا مکان مجھے متوجہ کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا :

وہ ہے سب سے بڑی عمارت ـــــــ وہ !

لیکن جب مجھے اس کی وہ بات کچھ بھی سمجھ میں نہ آئی تو میں نے اس کی طرف بغور دیکھا۔ وہ پرانی آبادی کی سرحد پر بالکل تنہا کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے تھکے تھکے اور مرجھائے ہوئے چہرے پر عارضی شگفتگی کی دھوپ چھاؤں آنکھ مچولی کھیل رہی تھی ۔ اور جب میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا تو وہ مجھ سے بڑی ہی سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"وہ بڑا احاطہ ہے اور ـــــــ تھا بڑا احاطہ ؟"

میں نے اپنے ایک بازو سے پرے بہت دور تک دیکھ لینے کے بعد دوسرے بازو سے پرے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں۔ پھر اسی بوڑھے مکان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اور چھوٹے چھوٹے احاطے ؟"

"وہاں بھی تھے، یہاں بھی ہیں۔"

"اور شیر منزل ؟"

"وہ ہے" ـــــــ اور وہ تھی میرپور کی بڑی حویلی !!"

میں نے اس کے سارے وجود پر بجلی کی صورت ایک عجیب سے کرب کو کوندتے دیکھا۔ اور یہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ شیر منزل میں بڑے وزیر آنے والے ہیں۔

"اور پرانی حویلی میں وائسرائے آئے تھے !"

راستہ بھر رہ رہ کر سرگوشیاں کرتا رہا۔

"شیر علی کی خدمت بے مثال ہیں . . . . ."

بڑے وزیر کے پراعتماد الفاظ بھی میرے کانوں میں گونجتے چلے جا رہے تھے۔ اور میں بڑبڑاتا چلا جا رہا تھا۔

سر! وہ پرانی آبادی ہے۔ اور وہ ـــــــ پرانی حویلی !"

معاً میرے کانوں میں ایک زوردار آواز گونجی !

"تم بھی کیسے پاگل ہو ؟! مردہ لمحوں کو یاد کون رکھتا ہے ؟"

اسی وقت میں شیر منزل میں داخل ہو رہا تھا ۔ اور اندر سے آوازیں باہر آ رہی تھیں :۔

" شیر علی صاحب ، ہم تو آپ کا یوں بھی تعاون کرتے ! "

اور جب میں اندر داخل ہوا تو مجھے ایسا لگا جیسے شیر منزل کی بجائے سرکاری دفتر کی عمارت گونج اٹھی ہو ۔ اور شیر علی کہہ رہے ہوں ۔

" پرانی حویلی میں وائسرائے آئے تھے تو میر صاحب سے بھی یہی کہا گیا تھا ۔ "

" تب کی بات تو کچھ اور تھی نا ! " کسی نے جھلا کر کہا تھا ۔ جس کے جواب میں شیر علی تنک کر بول اٹھے تھے ۔

" میں نہیں سمجھا ! "

معاً وہ میری طرف اس طرح مخاطب ہو گئے تھے جیسے پوچھ رہے ہوں ۔

پرانی حویلی کو دیکھنے گئے تھے ؟

اور بار بار میرا دل ان سے پوچھنا چاہ رہا تھا ۔

" آپ نے تھکے ہوئے لمحے کو دیکھا ؟

لیکن اب تک وہ کئی لوگوں سے گفتگو میں الجھ چکے تھے ۔ کئی پروگرام ، کئی فیصلے ! پھر میں نے ان کی آواز سنی وہ کسی سے کہہ رہے تھے ۔

" کوآپریٹیو فارمنگ کا انتظام اب جلد ہی مکمل ہو جائے گا ۔ "

" اور لون کمیٹی کی میٹنگ سر ؟ "

ڈرائنگ روم کے ایک کنارے بیٹھا ہوا ایک شخص پوچھ رہا تھا ۔ اور جیسے ہی وہ اس کی طرف مخاطب ہوئے ایک شخص کہنے لگا ۔

" پرانی آبادی میں لوگوں کی حالت کچھ ..... "

" کچھ زیادہ خراب ہو گئی ہے ! "

شیر علی نے خود ہی اس کا جملہ مکمل کر دیا تھا ۔ اور پھر ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول کی

بات آگئی تھی۔ اور کئی لوگ بہت دیر سے ان کی چیئر مین شپ کی تعریفیں کرنے لگے تھے۔ لیکن میں وہیں کھڑا کھڑا سوچ رہا تھا۔

"مجھے اپنے بیٹے کا داخلہ اسی اسکول میں جلد ہی کروا دینا چاہئے!"

معاً ایک شخص کی آواز ابھری

"چھوٹے صاحب تو نینی ٹال اسکول سے آج ہی آ رہے ہیں؟"

"ہاں، تم ہی انہیں جا کرلے آنا!"

شیر علی نے جیسے ہی اسے ہدایت کی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے قدم شیر منزل سے باہر نکل رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا ــــــــ

"لیکن کوارٹر کا کیا ہوگا؟"

"پرانی آبادی میں ایک مکان خالی ہے۔"

شیر علی نے کہا تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا:

"آپ کا تعلق تو پرانی حویلی سے تھا!"

اور اب کوئی مشورہ ــــــــ خاموش! کہ تمام لمحے خاموشی سے ہی گذر جاتے ہیں۔ البتہ ایک صدی کی وسعت کھنچتی رہتی ہے

میں زینے، برآمدے اور پورٹیکو سے ہوتا ہوا چلتا سوچتا جا رہا تھا اور وہی بوڑھا مکان! وہ مجھے دیکھتے ہی مُسکرانا کیوں چاہتا ہے۔

شیر علی نے کہا تھا:

"وہی میرے والد کا گھر تھا، میر پور حویلی کا عطیہ!"

"اور اب پرانی آبادی کی ایک ایک چیز شیر علی کی ہے!"

"یہ کس کی آواز ہے؟"

"لمحہ!"

"تم؟ ــــ آ گئے؟"

"نہیں! ابھی تو ایک صدی کی وسعت مجھے آواز دے رہی ہے۔

"شاید جنگ ابھی جاری ہے۔"

یہ سوچتے ہی میرے پیر رک گئے۔ اور میں ایک بار پھر پرانی حویلی کی سرحد کو چھوتے ہوئے اسی بوڑھے مکان کو دیکھنے لگا جو خلافِ معمول بے حد سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سر سے پیر تک مجھے بغور دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے یکایک مسکرانے لگا۔ اسی لمحے میں نے سنی، ایک آواز:

"لمحے، جن کے تم منتظر ہو آتے ہی ہوں گے۔

مجھے ایسا لگا جیسے یہ آواز اسی کی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آج تم اس قدر سنجیدہ ہو؟

"جنگ تم بھی جیت سکتے ہو!"

میں؟ ——— میں نے حیرت کے عالم میں کچھ سوچتے ہوئے اپنے چاروں اور کا جائزہ لیا، پھر اس کی طرف بغور دیکھا۔ وہ نہایت ہی خاموش سا یوں کھڑا تھا جیسے اب کچھ ہی دیر میں اس کا سارا وجود پگھل کر ڈھیر ہو جانے والا تھا اور اس کی وہ آوازیں جو میں نے سنی تھیں بہت جلد پرانی اور نئی آبادی کی وسعت کا محاصرہ کر لینے والی تھی۔

اور اب اس طرف، دور، ایک نئی آبادی تھی۔ ٹھیک میرے سامنے ایک اور نئی آبادی! لمحے تیزی سے اسی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ اور اسی لئے میں مستعد ہو کر ایک بار پھر چل پڑا، وہاں سے آگے!!

مسیح

(نسیم محمد جان)

وہ دن اس کے ذہن کے پردے پر اب بھی کسی کہرے میں گھری مقدس عبادت گاہ کی طرح دُھندلا دُھندلا موجود تھا۔ وہ اس شہر میں ایک نُووارد تھا۔ اسے ایک مکان میں ٹھہرا دیا گیا تھا۔ تکان کی زنجیروں سے آزاد ہوا تو اسے مکان دیکھنے کی خواہش تنگ کرنے لگی اور پھر ایسا لگا جیسے کوئی انگلیاں پکڑے ایک ایک کمرہ دکھا رہا ہے۔ اس نے اچھی طرح دیکھا مکان کی ساری کھڑکیاں، سارے دروازے کھلے تھے۔ وہ بہت خوش تھا صاف ستھری دیواروں کو دیکھ کر کھلی ہوئی کھڑکیوں کی سکراہٹ سے اسے عجیب سا کیف مل رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس وقت یہ علم نہ تھا کہ کوئی چیز اسے پسند کیوں آتی ہے اور بعض چیزیں ڈنک کیوں مارتی ہیں۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کی انگلیاں پکڑے مکان کے باہر لے جا رہا ہے۔ وہ اس کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر دیکھ نہیں رہا تھا۔ اب اسے کچھ کچھ یہ احساس ہو چلا تھا کہ کسی آدمی کو دیکھنے کے لئے اس کی آنکھیں بالکل بے کار ہیں بلکہ ان کے کھلے رہنے اور بند ہونے کا تعلق دیکھنے سے قطعی نہیں ہے۔ مکان کے احاطے کو دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس اندر کھینچی مگر چاروں طرف کی دیواریں اسے اچھی نہیں لگ رہی تھیں اس کی ایک خواہش مچلنے لگی، میں دیواروں کے باہر کی دُنیا دیکھوں گا! وہ اس شہر میں آنے کے لئے تیار ہوا تو آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔ جب آنکھوں میں روشنی لوٹی تو وہ اس مکان میں تھا۔ وہ احاطے کے دروازے تک آیا۔ وہاں لٹکتی ہوئی تختی دیکھنے لگا جیسے اس کی آنکھیں ایسی ہی چیزوں کے لئے بنی ہوں" مجھے ایک معینہ مدّت تک یہاں رہنا ہے پھر میں آزاد ہو جاؤں گا، اس نے سوچا۔

وہ اپنے ڈرائنگ روم سے کئی پُرانے کلنڈر اُتار چکا تھا جن کی جگہ نئے کلنڈر لیتے گئے تھے۔ اسے اس دن کا انتظار تھا جب وہ احاطے کے دروازے کے باہر ہوگا۔ وہ روزانہ اپنے کمرے کی ہر چیز دیکھتا رہتا تھا۔ اب اسے اپنی آنکھوں پر اعتماد ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ایک بات اب تک نہ آسکی تھی کہ دیوار سے لگی بیساکھی کس کے لئے ہے کبھی کبھی اسے ان سوراخوں سے باہر دیکھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا جو معماروں کی بے توجہی کے ثبوت تھے۔ اسے باہر کی دُنیا بہت حسین لگتی تھی۔

پھر وہ دن بھی آیا جب اسے آزادی ملی وہ دروازے سے گذرتا ہوا سڑک پر آگیا۔ اسے یہ شہر عجیب لگ رہا تھا۔ ہر آدمی اپنے کو موٹے موٹے کپڑوں میں لپیٹے تھا۔ جیسے شہر میں برف باری ہوئی ہو۔ ہر شخص بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا۔ دن بھر سڑکوں اور گلیوں میں چکّر کاٹنا اور رات گئے واپس آنا اس کا معمول بن چکا تھا۔

اب اسے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ چلتے چلتے لوگوں کے پیر تھک جاتے تھے۔ ایک قسم کا درد ہڈیوں میں ہونے لگتا تھا پھر ان کی نظریں بیساکھیوں پر پڑتی تھیں اور تیزی سے بیساکھیاں پیروں کی جگہ لے لیتی تھیں۔ اسی وقت ان پر یہ شرط عائد کردی جاتی کہ اپنے مکان کے دروازے اور کھڑکیاں کبھی نہ کھولیں —— اور اب ہر باپ اپنے بچوں کو بیساکھی سے ہی چلنا سکھاتا ہے، اس کے جسم میں سوئیاں چُبھنے لگیں۔

—— اس نے طے کیا کہ وہ شہر کے تمام لوگوں کو مجبور کردے گا اپنے اپنے مکان کی ساری کھڑکیوں اور سبھی دروازوں کو کھولنے پر۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو پھر سارے شہر کو نجات مل جائے گی۔

اب وہ روز بُری طرح زخمی ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید درد ہوتا تھا —— اور لوگ تھے کہ ہر کھلی ہوئی کھڑکی سے پتھر پھینک رہے تھے —— اس نے محسوس کیا کہ ہر پتھر ایک صلیب ہے، اگر اس کے جسم کی حرکت مفقود ہوگئی تو وہ مسیح

ہو جائے گا۔ وہ خوش تھا ——— ابھی میں اپنے تھکے ہوئے جسم گھسیٹ سکتا ہوں۔
——— مگر ایک دن زخموں کی ٹیس نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا ہے تاکہ
شہر کی اُڑتی ہوئی گرد سے محفوظ رہ سکیں۔ پھر اس نے خود ہی کھڑکیاں بند کرلیں ———
اب لوگوں کے پھینکے ہوئے پتھروں کا کوئی ٹکڑا بھی اندر داخل نہ ہوسکے گا ———
اس کے ہاتھ بیساکھیوں تک پہنچ گئے۔
——— اب وہ مطمئن تھا اور سمجھ رہا تھا کہ مصلوب ہونے سے بچ گیا۔
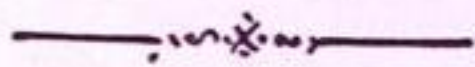
گدھ اور قحبہ خانہ

(اختر یوسف)

آسمان پر سورج دن بھر کراہتا رہا تھا۔

دن بھر اس کے ارد گرد خون اور شعلوں کے چھوٹے بڑے دائرے گونجتے رہے تھے۔

وہ مجبور تھا... وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔!

اسے تو اپنے چاروں طرف اور نیچے سب کچھ دیکھنا ہی تھا... سب کچھ برداشت کرنا ہی تھا... پہلے

دروازے، کھڑکیاں، روشن دان اور مکان اپنے مکینوں، شاید مکینوں کے ہی دھماکوں سے پھٹ پھٹ کر گوشت کے کچے ٹکڑوں میں لپٹے ننگی سڑکوں پر آ پڑے تھے... بند رہنے میں بھی کہاں چھٹکارا تھا....

بہت دیر تک سوچ میں اُلجھا اُلجھا اس نے کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سرکا کر جب باہر دیکھا، تو دیکھا کہ... آسمان پر سورج نہیں تھا... وہ شاید کراہتے کراہتے بے ہوش ہو کر کہیں گر چکا تھا.... آسمان پر ہر طرف کالک اُڑ رہی تھی... کہیں کہیں سفید و سُرخ چنگاریاں بھی نظر آ رہی تھیں... آس پاس سڑکوں پر شاید وحشی اور نوکیلے نال والے گھوڑے اِدھر اُدھر بڑی تیزی سے دوڑ رہے تھے یا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کی کوشش کر رہے تھے... سڑک پر اس کے سامنے گدھوں اور چیلوں کا ایک ہجوم اپنی چونچیں بڑی پھُرتی سے تیز کر رہا تھا... اور یہ دیکھ کر اسے بڑی بے جان سی ٹھنڈک محسوس ہوئی.... پھر دوسرے ہی لمحے وہ کھڑکی کا پٹ بند کر کے اپنی سانسوں کو اپنے اندر تھامے چارپائی پر سہما سہما سا بیٹھ گیا۔

اس کا پورا کمرہ اندھیرے کی کیک ٹسی گرفت میں تھا... بجلی کا بلب آنکھیں بند کئے جیسے رو رہا تھا... شاید وہ جلنا نہیں چاہ رہا تھا... لیکن اس کمبخت کو کیا معلوم کہ کل سے آج تک جانے کیا کیا جل چکا تھا... ختم ہو چکا تھا... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تاریکی میں ملفوف ہو چکا تھا...

اچانک گِدھوں اور چیلوں کی بھیانک چیخیں تیز نشتر بن کر اس کے کانوں میں اُتر گئیں... وہ گھبرا کر اپنی چارپائی سے جیسے اپنی چھت پر جا لگا... پھر اس کے بعد کیا ہوا، اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا...

اور جب اس کی آنکھ کھُلی تو اس نے خود کو فرش پر لیٹا پایا... اس کی قمیص بالکل گیلی سی معلوم ہو رہی تھی... سر میں شدید ٹیس بھی تھی... اس نے اپنے سر کو ٹٹولا... وہاں اسے ایک گہرا زخم سا محسوس ہوا... وہ سب کچھ سمجھ گیا کیونکہ اس کی انگلیاں بھی خون سے تر ہو چکی تھیں... بڑی مشکلوں سے اس نے خود کو سہارا دیا... اُٹھا... سوچا۔

— وہ ... زندہ ہے۔

پھر تھوڑی دیر تک اپنی سانسیں اپنے اندر ہی تھامے وہ ٹھنڈے فرش پر کھڑا کھڑا باہر دھیان لگائے رہا... اس کے بعد بڑے کمزور قدموں سے چلتا ہوا کھڑکی تک گیا... ہولے سے پھر اس کا ایک پٹ سرکایا... باہر ہر طرف بڑا گہرا، گھنا، سیاہ دُھواں دُھواں سا پھیلا تھا... آمنے سامنے کے تمام مکانات مکینوں سے خالی معلوم ہو رہے تھے... یا ان کو ان کے مکانات ہی نگل چکے تھے

قبرستان کی سی ڈراؤنی چپی وہاں رینگ رہی تھی... آس پاس سے ابھی تک پتھریلی سڑکوں پر وحشی اور نوکیلے نال والے گھوڑوں کے تیز دوڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں... کہیں کہیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان پھٹ کر، ٹوٹ کر بڑی زوردار آوازوں کے ساتھ نیچے زمین پر گر رہا تھا... سامنے سڑک پر گدھوں اور چیلوں کا ہجوم تھا یا نہیں، یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا... کیوں کہ وہاں اب اندھیرا اپنا سینہ پھلائے آلتی پالتی

مار کر بیٹھا ہوا تھا... اچانک، پھر جیسے اس نے محسوس کیا کہ گدھوں اور چیلوں کی چیخیں دھار دار نشتر بن کر اس کے کانوں میں اُتر گئیں.... اس نے ہڑبڑا کر کھڑکی کا پٹ بند کر دیا اور تیزی سے لپکتا ہوا، آکر اپنی چارپائی کے اندر سمٹ گیا۔

اس بار گدھوں اور چیلوں کی چیخیں پہلے سے کہیں زیادہ زوردار تھیں ... ایسا لگ رہا تھا کہ یہ آسمان، زمین، پاتال سب اپنے سروں پر اُٹھا لیں گے اور پھر انھیں کسی بہت گہرے سمندر میں لے جاکر دے ماریں گے.... اس نے اپنی تمام انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لی تھیں، لیکن چیخیں تھیں کہ باریک سے باریک نشتر بن کر اس کی انگلیوں کو چھیدتی ہوئی اس کے کانوں میں زبردستی اُترتی جا رہی تھیں... وہ اگرچہ چارپائی کے نیچے بیٹھا تھا، لیکن اس کو شک یہ ہو رہا تھا کہ کہیں غلطی سے وہ اپنے باتھ روم کے بے حد ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے باتھ ٹب میں تو نہیں جا گرا تھا... اور ابھی اس کا یہ شک اس سے الگ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کو لگا، گدھوں اور چیلوں کی چیخوں کا شور اس کے دروازے پر اپنے بھاری بھاری پر پٹک رہا تھا... اس نے اس لئے بڑی تیزی سے اپنی پوری قوت سماعت کو دروازے کی طرف لُڑھکا دیا... اس نے سُنا، شاید کہیں بہت دور سے کچھ ایسی آوازیں آ رہی تھیں۔

۔ رکو مت... گھس جاؤ۔

۔ ارے نہیں۔

۔ دھت۔

۔ ارے کسی بھی گھنٹی یا گھنٹہ سے اس کا کوئی سمبندھ نہیں ہے۔

اور اس کے بعد وہ کوئی آواز نہیں سُن سکا... پھر، بہت دیر کے بعد جب اس نے فرش کو برف کی ایک بڑی سی سِل سا محسوس کیا تو چارپائی کے نیچے سے اُچھلنے کے سے انداز میں سرک کر اوپر آگیا... پھر اپنے اغل بغل یوں ہی کچھ ٹٹولا، لیکن وہاں اندھیرے کے سوا تھا ہی کیا... پورا کمرہ تو اندھیرے کی کیک ٹسی گرفت میں تھا... اس سے اب نہ کھڑا رہا جا رہا تھا اور نہ بیٹھا جا رہا تھا... اس کو لگ رہا تھا، جسم کی تمام ہڈیاں

باہر ٹوٹ کر آ گریں گی ... ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گی ... یا اس کا دل اس کے سینے کو چھید کر باہر آ جائے گا اور کھڑکی کو توڑتا ہوا کہیں بھاگ کھڑا ہوگا ..... اس لیے چار و ناچار وہ بے سدھ سا چارپائی پر بیٹھ گیا ...

•
•
•

جب اس کی آنکھ کُھلی تو اس نے دیکھا، کھڑکی کے پٹ کے سوراخوں سے کچھ روشنی سی اندر، کمرے میں جھانک رہی تھی ... سر میں اس کے بہت شدید درد اپنی پوری طاقت سے جم گیا تھا ... پھر بھی کھڑکی کا پٹ اک ذرا کھول کر اس نے باہر دیکھا، تو دیکھا کہ

آسمان پر سورج ویسے ہی کراہ رہا تھا ... اور

اس کے اِردگرد خون اور شعلوں کے دائرے چھوٹے بڑے دائرے بڑی تیزی سے گونج رہے تھے ....

سڑک بالکل سنسان پڑی تھی ... وہاں اس وقت گدھ اور چیل نہیں تھے ... ہاں انسانی گردنیں، ہاتھ، ٹانگیں، ٹوٹی پھوٹی سی، مکھیوں میں پٹی لپٹائی اِدھر اُدھر بکھری تھیں ... دھوپ کی غصیلی تیزی نے ان میں عجیب سی سڑاند بھی پیدا کر دی تھی ... اچانک یہ سب دیکھتے دیکھتے، اس کی نگاہیں سامنے پڑوسی کے مکان کے دروازے کی طرف اُٹھ گئیں ... دروازہ چاروں اُور سے کُھلا ہوا تھا ... مکان کے اندر شاید کوئی نہیں معلوم ہو رہا تھا ... لیکن اس کے پہلے کہ وہ مکان کے اندر اپنے پڑوسی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا، اپنے چکراتے اور گھومتے سر کو پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا ....

لیکن یہ وقت بیٹھنے کا نہیں تھا، اس لئے اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور باہر آ کر ایک پتھر اُٹھایا ... لیکن اسے ایسا لگا کہ پتھر اُٹھاتے ہی اس کا ہاتھ بھی پتھر کا ہو گیا تھا ... اس کی نگاہیں، دوبارہ اپنے پڑوسی کے دروازے کے کچھ آگے نہیں اُٹھ رہی تھیں ... وہاں ایک منظرِ وحشت کے آخری مرکز پر جو تھا ... ! لیکن بغیر نشانہ لئے ہوئے پتھر وہاں تک پہنچے گا

کیسے؟ اس نے بہت دہل کر سوچا... پھر بھی اس نے پوری طاقت کو ایک نقطے پر جمع کرتے ہوئے نشانہ تاک کر پتھر ادھر ہی چلا دیا، جہاں پہ ایک کُتّا، پڑوسی کی بے گردن کی جوان عورت کے مُردہ پستانوں کو بڑی تیزی سے اُدھیڑنے میں مشغول تھا..... کُتّا پتھر کی زد میں آ گیا تھا... وہ آدم خور مگر بجائے بھاگنے کے اپنے لمبے لمبے تیز اور خون سے لت پت دانت کھسوڑتا اس کی طرف بڑی تیزی سے لپکا، پھر دوسرے ہی لمحے اپنے کمرے کے اندر آتے ہوئے اس نے سُنا، آسمان تڑاق سے پھٹ کر کہیں ٹوٹ گرا تھا۔

دروازے کی درز سے کمرے کے اندر آنے کے بعد اس نے باہر دیکھنے کی کوشش کی تو اسے کچھ بھی نظر نہ آیا... حالاں کہ ابھی ابھی اس نے باہر سورج کی بڑی تیز روشنی دیکھی تھی، لیکن چند ہی منٹوں کے بعد اچانک، وہاں روشنی کی بجائے پگھلی کالک کی چم چماہٹ نے اسے ذرا سا چونکا دیا تھا... منٹوں میں رات کیسے ہو گئی....؟ یہ سوچ کر حیرت وحشت سے چمٹی ہوئی اس کے ذہن میں سن سنا سی گئی... اور اس سے قبل کہ وہ خود کو پاگل سمجھ بیٹھتا، اچانک لاتعداد گھوڑوں کی ٹاپیں بڑی برق رفتاری سے اس کو سڑکوں پر پھیلتی، اُمنڈتی اور ٹوٹتی معلوم ہوئیں... پھر دوسرے ہی لمحے اُس نے دیکھا کہ باہر کے ماحول پر اچانک چھا جانے والی کالک کی چم چماہٹ دھیرے دھیرے پھر روشنی میں بدلنے لگی... بدلتی گئی... بکھرتی گئی... اور اب اس کے سامنے کچھ بھی نہ تھا ... یعنی سورج کی تیز روشنی میں اس نے دیکھا کہ سامنے پڑوسی کا مکان اپنے اغل بغل کے کئی مکانوں کے ساتھ بھوری مٹی میں تبدیل ہو چکا تھا... اور وہ کُتّا جس پر ابھی ابھی اس نے پتھر کا نشانہ لگایا تھا، چیتھڑہ ہو کر جہاں تہاں بکھرا تھا... لیکن یہ سب کیسے ہو گیا...؟ پل بھر میں یہ کیا ہو گیا...؟ اس کے ذہن نے تابڑ توڑ سوچا... سوچا کیا.... پھر اس نے کچھ سوچا بھی یا نہیں... اس کا اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلا...

دروازے کی درز سے اس کی آنکھ لگی ہوئی تھی... باہر سورج کی روشنی اب سیاہی مائل ہو گئی تھی... سڑک پر لاتعداد گِدھ اور چیل اپنے پَر پھڑ پھڑا رہے تھے، اور اپنی دھاردار سُرخ چونچوں کو بھوری مٹیوں کے اوپر اور اندر رگڑ رگڑ کر تیز کر رہے تھے... بار بار باہر

دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں، چوں کہ تھک کر چور ہو چکی تھیں اس لئے ٹوٹا ٹوٹا سا مجبوراً وہ اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گیا... کمرے میں جانے کتنے دنوں سے تازہ ہوا نام کو نہیں آئی تھی... اس لئے ٹوٹے اور ادھڑے پلاسٹروں کی پھپھوند اڑاتی بو ہر طرف پھیل گئی تھی... جس سے اسے بڑی کراہت اور گھبراہٹ سی معلوم ہو رہی تھی... لیکن کرتا کیا...؟ باہر تو نکل نہیں سکتا تھا... گدھوں اور چیلوں سے جنگل کا جنگل خالی ہو چکا تھا... کھڑکیاں اور دروازے تک کمرے کے وہ نہیں کھول سکتا تھا... کیونکہ ڈر تھا، کہیں آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی اپنی زد میں اسے نہ لے یا پھر، کسی گدھ کی لمبی چونچ ہی نہ اس کے کمرے میں داخل ہو جائے... بہرحال، اسے ہر حال میں ادھڑے پلاسٹروں کی عجیب سی پھپھوند اور بساند بھری بو کو چاٹتے رہنا تھا۔

●

●

●

— دیکھتے کیا ہو... پاگل ہو...؟

ایک آدمی کی آواز جیسی آواز سُن کر وہ اچانک بستر سے فرش پر آکھڑا ہوا... اور پھر سہم کر تھر تھراتے قدموں سے دروازے کی دراز کی طرف لپکا...

— ارے نہیں... نہیں... یہ تو ہمیشہ الگ تھلگ رہتا ہے... یہ ان لوگوں سے بالکل الگ ہے۔

اس نے دیکھا... کوئی دو بڑی بڑی سینگوں والا بھیانک سا آدمی نما صورت رکھنے والا کوئی جانور اپنے لانبے لانبے دانت نکالے چیخ رہا تھا۔

— دھت...

جیسے کسی بندوق کی گولی کہیں چھوٹ گئی ہو...

— میں... ٹھیک کہتا ہوں۔

لانبے لانبے انگارے کی سُرخی سے لئے دانت پھر بڑی تیزی سے ہلے...

اس کی آنکھیں دروازے کی دراز سے جیسے چمٹ سی گئی تھیں... دِل دو ٹکڑے ہو کر جیسے کسی باز کے پروں پر سوار ہو گیا تھا...

— نہیں ... یہ دیکھو...

پھر... دوسرے ہی لمحے اُس نے دیکھا کہ باہر دیوار پر لگی اُس کے نام کی تختی ریزہ ریزہ ہو کر سامنے بھوری مٹیوں کے ڈھیر پر جا گری تھی...

پھر... اس سے کچھ اور نہیں دیکھا گیا... ہاں اتنا ضرور اس نے محسوس کیا کہ بیک وقت چیلوں اور گدھوں کی بھیانک چیخیں اور آسمان، شاید پورے آسمان کے پھٹ کر، ٹوٹ کر نیچے گرنے کی آوازیں تیز نشتر بن کر اس کے کانوں میں اُتر گئیں..

●

●

●

بہت دیر کے بعد، جب شاید وہ کسی گہری نیند سے جاگا تو اُس نے خود کو ایک تنگ و تاریک گلی سی ایک جگہ میں پایا... اسے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے کمرے سے اچانک اس انجان اور تنگ و تاریک گلی سی جگہ میں کیسے آ گیا... اس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو کسی نے جیسے اسے اُٹھنے ہی نہیں دیا... اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا... تو اسے اندھیرے کے سوا اور کوئی بھی نظر نہیں آیا... اس لئے دوبارہ اس نے جو اُٹھنے کی پہلے سے دوگنی طاقت سے کوشش کی تو اس کے اغل بغل تیسری جیسی کوئی چیز گونجی:

— گھبرائیے نہیں... آپ محفوظ ہیں... لیکن آپ بہت کمزور ہیں...

— میں کہاں ہوں... ؟... اس کے ہونٹ ہلے۔

— آپ ... ایک قحبہ خانے میں ہیں...

کسی نسوانی آواز نے جواب دیا۔

— قحبہ خانے میں ہوں... میں تو اپنے کمرے میں تھا...!!

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کہا...

۔ ہوں گے... لیکن میری گلی میں ایک گدھ کی چونچ سے چھوٹ کر آپ آ گرے تھے... میں یہاں آپ کو لے آئی... ہم یہاں محفوظ ہیں...

اسی نسوانی آواز نے کہا...

۔ محفوظ ہیں... ہیں... ں...!! اس کی آنکھیں بڑی حیرت سے چھترا گئی تھیں...

پھر... اس کے بعد نجانے کیسے اچانک اس نے بالکل گھومتے، چکراتے ہوئے دیکھا کہ اس کے پڑوس کی بے گردن کی جوان عورت کے مُردہ پستانوں کو ایک کُتّا بڑی پھُرتی سے ادھیڑنے میں مشغول تھا... اور — اس کے بعد وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا کیوں کہ اس کے چاروں طرف کا اندھیرا بہت گہرا گیا تھا — !

———.،.،.×.،.،.———

شونار ہرین

(شفیع مشہدی)

وہ ایک تنگ، لمبی سی سرنگ میں کھڑا ہانپ رہا تھا۔ سرنگ بہت لمبی تھی ..... نہیں لمبی نہیں بلکہ بہت اونچی تھی۔ لیکن سرنگ تو لمبی ہوتی ہے، زیر زمین، تنگ و تاریک، پھیلی ہوئی۔ مگر یہ سرنگ اونچی تھی آئل ریفائنری کی چمنی کی طرح اوپر کی طرف اُٹھتی ہوئی جیسے برلا کا اسکائی اسکریپر ہو۔

سرنگ تاریک نہیں تھی۔ گندی بھی نہیں تھی اور لمبی بھی نہیں۔ بلکہ اونچی شفاف، روشن مگر بے حد تنگ۔ اتنی تنگ کہ کنکریٹ کی دیواروں کے بیچ اس کا جسم پھنس کر رہ گیا تھا۔ سرنگ کی وسعت جیسے اس کے جسم کو ناپ کر بنائی گئی تھی۔ اس کا پورا جسم اس میں فٹ تھا۔ حتیٰ کہ اگر وہ زور سے سانس لیتا تو اس کی پسلیوں کو دیواریں دبانے لگتیں۔ وہ ٹھیک سے ہانپ بھی نہیں سکتا تھا۔ دھیرے دھیرے کنکریٹ کی دیواروں میں انگلیوں کو گاڑ کر وہ خود کو اوپر اُٹھا رہا تھا اور ایسا کرتے وقت اسے سانس روک کر بدن کا توازن برقرار رکھنا پڑتا تھا، مبادا اس کا پاؤں پھسل جائے ...... اس نے نیچے کی طرف آنکھیں کیں تو سرنگ کی لامحدود گہرائی میں گر کر اس کی بینائی چور چور ہوگئی اور گھبرا کر اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔ مگر سرنگ کی لامعلوم اونچائی میں اس کی آنکھیں گُم ہو کر رہ گئیں۔ اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ لامحدود اونچائیوں اور بیکراں گہرائیوں کے بیچ معلق کھڑا تھا۔ جیسے ماضی اور مستقبل سے بے بہرہ کوئی حال کے شکنجے میں گھٹ رہا ہو۔ یا پھر جیسے یوری گگارین خلا میں اچانک معلق ہوگیا ہو مگر نہیں وہ معلق تو نہیں تھا۔ اسے تو سرنگ کی دیواریں مضبوطی سے جکڑے ہوئی تھیں اس نے اپنی تمام طاقتوں کو یکجا کر کے اپنے جسم کو اوپر کی طرف اُٹھایا اور بمشکل پانچ چھ

انچ اوپر اُٹھ سکا۔ پسینے میں شرابور، گھٹتی ہوئی سانس کے ساتھ اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔ وہ اس سرنگ میں نہ جانے کب سے جکڑا ہوا اوپر کی طرف اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور دفعتاً اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک خیال سرد لہر کی طرح دوڑ گیا۔

"اگر اس سرنگ کی کوئی (Opening) نہ ہوئی تو؟"

ریڈی ڈنسی کی شکستہ فصیلوں کے بیچ گل مہر کی رعنائیوں میں ڈوب کر اس نے جب اس سے کہا تھا۔ نہیں بلکہ پوچھا تھا کہ محبّت کے بارے میں اس کا خیال کیا ہے تو وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی تھی۔

(It is an Obsessive Psychoneurosis)

اور وہ اس تشریح سے گھبرا گیا تھا۔ بات بدلنے کے لئے اس نے گل مہروں کی شاخوں پر لگی آگ کے بارے میں باتیں کرنی شروع کر دی تھیں۔ قطار میں لگے خوبصورت پیڑوں پر سُرخ بہار آئی تھی اور رعنائی کھِل کھِلا کر ہنس رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورے ریڈی ڈنسی میں آگ لگ گئی ہے۔

"اسے انگریزی میں (Flame of the Jungle) کہتے ہیں" اس نے سکوت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

"ہاں! اور اُردو میں؟"

"شعلہ دشت وفا۔!" ترجمہ بہت خوبصورت تھا۔ بالکل اسی طرح۔ اس نے اس کی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"ہشت ....." ہاتھ کھینچ لیا گیا...... اور اس کا دل ٹوٹنے لگا۔!!

اس نے اوپر کی طرف دیکھا، سرنگ اور تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ ذہن جھنجھنانے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی گرفت ڈھیلی کر دے اور اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائے، جہاں "کچھ نہیں" کا احساس ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کچھ نہیں ...... ایک انجان سناٹا اور کچھ نہیں۔۔۔!"

ریڈیو سے ڈراما نشر ہو رہا تھا اور ایک آدمی ایشور کے رول میں آدم سے کہہ رہا تھا۔

"اے آدم تو روتا کیوں ہے؟ تجھ میں اور مجھ میں کوئی زیادہ بھید نہیں پگلے! تو محدودیت کی سرنگ میں گھٹ رہا ہے اور میں لامحدودیت کی اننت سیماؤں میں بھٹک رہا ہوں!"

"پھر تم نے منشیہ اور جگ کی رچنا ہی کیوں کی تھی ایشور؟" ایک سوال۔

"یہ ادھورے پرشنوں کے انت ہین پتھ اور انت ہین پتھوں کے یہ ادھورے پرشن —— میں سوئم انھیں نہیں جانتا —— میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو سوئم ان انت ہین پتھوں کی سیماؤں کو ڈھونڈھ رہا ہوں ....."

"اے مہاکال کے مہاپرش، مجھ سے میرا راج مکٹ چھین لے کہ میں ان اننت سیماؤں میں کب تک بھٹکتا رہوں گا۔ اگیان کے ان ادھورے پرشنوں کے تیروں سے میرا وکیتتو چھلنی ہے ....."

"میں ان سیماؤں کو پھلانگ جاؤں گا .... میں محدودیت اور لامحدودیت کی مایا کو چکنا چور کر دوں گا اور اور .... اور ....."

اور اس نے دیکھا کہ اس کی بائیں پسلی کے پاس دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ اُبھر آیا ہے۔ جس سے باہر کی بھینی بھینی سی مٹیالی خوشبو آرہی ہے اور وہ بے دھڑک آنکھیں موند کر اس میں گھس آیا۔ وہ سوراخ سے باہر یوں پھسل گیا جیسے بچے کے ہاتھ سے گیند۔ دوسرے لمحہ اس نے خود کو ایک انتہائی پُر فضا مقام میں کھڑا پایا۔

وہ مسکراتی ہوئی اس کے لئے منتظر تھی اور سُرخ کمانوں سے رعنائی کے گاگر چھلک رہے تھے۔ نہ جانے کتنی دیر سے وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لینا چاہا تھا۔ مگر وہ دھندلے بادلوں کے اُٹھتے ہوئے مرغولوں میں ایک خیال کی طرح تحلیل ہو چکی تھی —— ایک لطیف خیال جو

لمس کی تمازت سے پگھل گیا تھا.....!

وہ ایک انتہائی پُرفضا مقام تھا جہاں اُفق کی وسعتوں میں کھنڈری کی برف پوش چوٹیاں رعونت سے سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ یہ شاید کوئی ہل اسٹیشن تھا جہاں ٹریس پر کھڑا وہ نشیب و فراز کی بھول بھلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ دور تک وادی میں سُرخ ٹائلس کے خوبصورت مکانات جنگلی خود رو پودوں کی طرح اُگے ہوئے تھے اور رنگ برنگے پھولوں سے لدی وادی اس کی اپنی آرزوؤں سے بھی زیادہ دلکش دکھائی دیتی تھی .... اس کا ذہن بھٹکنے لگا تھا.......

گومتی کے منکی برج پر رکشا دھیرے دھیرے چل رہا تھا....... عروس ابیلاد کے دوپٹے میں ٹکے ہوئے تارے جھل مل جھل مل کر رہے تھے اور وہ اس کے پہلو میں بیٹھی لوچ دار آواز میں باتیں کر رہی تھی۔ موضوع شاید اودھی تہذیب کی رنگا رنگی تھی کہ بوڑھا رکشا والا بول اُٹھا.....

"میاں صاحب، باہر والوں نے تو لکھنؤ کا ترنم ہی بگاڑ دیا....." اور وہ ششدر رہ گیا تھا۔ جہاں رکشا والے ایسی زبان استعمال کرتے ہیں وہاں ـــ اور اس نے برسوں پہلے اس بوڑھے تانگے والے کا تصور کیا، جس نے احمد کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

"میاں اب یہاں رنڈیاں کہاں ہیں، یہ تو بگڈنڈیاں ہیں....."

اس نے اپنے ہاتھوں پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کیا تھا، ہلکا سا لطیف سا اس نے دلکشا میں نل سے گرتے ہوئے شفاف پانی کو دیکھ کر پیاس محسوس کی تھی اور اس نے اپنی ہتھیلیوں میں بھر بھر کر اپنے چلّو سے اسے پانی بھی پلایا تھا مگر پیاس شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ ریذی ڈنسی، دلکشا، امام باڑہ اور، اور.....

..... تم اُداس کیوں ہو؟

"مجھے خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔"

"کس سے؟ مجھ سے؟"

"نہیں! تم سے نہیں۔ حالات سے، جو بہت ظالم ہوتے ہیں!"
اور پٹھان کوٹ ایکسپریس چار باغ کو چھوڑتے ہوئے فراٹے بھرنے لگی تھی اور سارا منظر پیچھے کی طرف بھاگنے لگا تھا۔
وہ ٹریس پر کھڑا حسین وادی میں پگھلتی رعنائیوں میں ڈوبا تھا اور نیچے وادیوں سے سرمئی بادلوں کے مرغولے اوپر اُٹھتے آرہے تھے۔ دفعتاً مرغولوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اس کی جلد پر گالوں کی ٹھنڈی پھوار سی برس پڑی۔ ایک عجیب سی لطیف کپکپاہٹ اس میں سرایت کر گئی تھی۔ سرد، سرد، چیونٹیاں اس کے جسم پر رینگنے لگی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سرنگ کی ساری تھکان دور ہو گئی ہے۔
بادلوں کے دھندلکوں سے نکل کر اس نے خود کو ریس کورس کے میدان میں پایا تھا جہاں ایک ہجوم، ریس کے آغاز کا منتظر تھا۔ سفید، سمندی، ابلق، سیاہ، ـــــــ رنگ رنگ کے گھوڑے پیٹھ پر جوکینر کا بوجھ اُٹھائے بیقراری سے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ سب کو ریس کے آغاز کا انتظار تھا...... اس نے بھی اپنے لئے ایک گھوڑے کا انتخاب کیا۔ سیاہ سا گھوڑا، ٹیگور کے "شونا رہرین" کی طرح مچل رہا تھا اور جاکی اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں کالیداس کی شکنتلا جیسی چولیاں پہنے ماڈرن لڑکیاں اور واسکوڈی گاما جیسے لمبے خط بڑھائے ماڈرن ہپی نما لوگ اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف نگاہ جمائے کھڑے تھے۔ اس نے اپنے سیاہ گھوڑے کی طرف دیکھا اور اسے یقین سا ہو گیا کہ اس کا گھوڑا آج ریس میں ضرور بازی جیت لے گا اور دھیرے دھیرے یہ احساس اتنی شدت اختیار کرتا گیا کہ اس کو سفید گھوڑے اور خود میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا وجود اس گھوڑے اور ریس کی بازی پر مرکوز ہو کر رہ گیا تھا ـــــ ٹھائیں کی آواز کے ساتھ گھوڑے دوڑ پڑے مگر سیاہ گھوڑا اپنی جگہ پر بُت کی طرح جما رہا۔ جاکی نے پے درپے اسے ایڑیں لگائیں۔ چابک لہرائے مگر سیاہ گھوڑا جیسے جم کر رہ گیا تھا..... اس کی سانس جیسے رُک سی گئی۔ اس کا جی چاہا وہ دوڑ کر خود سیاہ گھوڑا بن جائے مگر

ارد گرد کھڑے ہجوم کے چہرے پر پھیلتی ہوئی خوشیوں کی لہر سے وہ خائف سا ہوگیا ــــ اس کا دم گھٹنے لگا ــــ جاگی پے در پے چابک لہرا رہا تھا اور اچانک سیاہ گھوڑا الف کھا کر، گہری کھائیوں میں گر پڑا ــــ اس کی پیٹھ میں درد کی لہریں دوڑ گئیں، جیسے سارے چابک خود اس کی پیٹھ پر پڑے تھے ......

اظہار نے اپنے خط میں لکھا تھا ــــ "میں تمہاری پہلی زندگی پر غور کرتا ہوں اس کی کہربائیت کو سوچتا ہوں۔ اس کی ہمہ گیر کشش، اس کی رنگین جانداری کو سوچتا ہوں جس سے افسردہ زندگیوں کے حزین لمحات بھی مترنم ہونے لگتے تھے....

...... اور پھر وقت کے اس نشتر زہر آگیں کو دیکھتا ہوں جس نے پوری سفاکی کے ساتھ تمہاری شہ رگ کو مجروح کر دیا ...... اور تم؟"

وہ بے مقصد سا پہاڑیوں پر گھومتا رہتا اور پھر نشیب میں پہاڑی رقص کو دیکھنے لگا۔ جہاں رنگ برنگ کے کپڑوں میں ملبوس پہاڑی دوشیزائیں، الغوزے کی سریلی آواز اور پہاڑی دف کی تال پر کیف میں جھوم رہی تھیں۔ اسے یہ منظر بہت دلکش لگا تھا اور وہ پتھر کی گیلری پر آگے کی قطار میں بیٹھ کر نہ جانے کب تک سرور میں کھویا رہا کہ سیاہ گھوڑا، ریڈی ڈنسی اور چار باغ سب اس کے لاشعور کی اندھی کھائیوں میں گم ہو گئے ــــ دفعتاً دور بہت دور سے اس کی آواز سنائی دی جو اس کا نام لے کر پکار رہی تھی اور وہ بے تحاشا اس کی طرف دوڑنے لگا ــــ وہ بے تحاشا اس آواز کی طرف بھاگتا رہا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکتا رہا ــــ مگر پہاڑ کی اونچائیوں پر پہنچ کر وہ آواز گم ہوگئی اور تب اس کا تلخ احساس ہوا کہ کوئی بھی اسے آواز نہیں دے رہا تھا اس کی شکست خوردگی کا احساس ایک کڑواہٹ کی طرح اس کی زبان پر بکھر گیا تھا۔ اور وہ بوجھل قدموں سے واپس اس رقص گاہ کی طرف چل پڑا۔ اس کا پیر، سنگریزوں نے زخمی کر دیا تھا اور خون رس رس کر راستوں کی رنگینی میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ رقص جاری تھا اور لوگ رقص کی رنگینی میں کھوئے ہوئے تھے۔ مگر پتھر کی گیلری کی اگلی قطار میں اس کی نشست خالی نہیں تھی۔ کوئی دوسرا اس پر

بیٹھ چکا تھا۔ وہ گیلری کے اختتام تک اپنے لیے کوئی نشست تلاش کرتا رہا مگر ساری سیٹیں پُر ہو چکی تھیں۔ کیا اس کے لئے اب اس رقص گاہ میں کوئی نشست نہیں رہی؟ اس کی شکست خوردگی کا احساس اور بھی شدید ہو گیا اور وہ گھبرا کر ایک نوکیلے سے پتھر پر بیٹھ گیا مگر رقص گاہ کا منظر اب اس کو اس مقام سے نظر نہیں آ رہا تھا ــــ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں ــــ اور سارے نقوش اس کے ذہن پر باری باری منعکس ہوتے رہے۔ اس کی گھٹن کا احساس شدید ہوتا گیا اور دوبارہ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو اس اونچی سی سرنگ میں جکڑا ہوا پایا۔ مگر یہ تنگ سُرنگ بالکل تاریک تھی اور اس کی ہڈیاں اس کی تنگی میں چٹخ رہی تھیں .... اس کے کانوں میں آواز گونج رہی تھی ...... ایشور کہہ رہا تھا۔

"یہ ادھورے پرشنوں کے انت ہین پتھ اور انت ہین پتھوں کے ادھورے پرشن ...... یہ انت ہین سیمائیں اور یہ انت ہین ......"

وہ لامحدود اونچائیوں اور بیکراں گہرائیوں کے بیچ جکڑا ہوا گھٹ رہا تھا۔ .... اوپر دیکھنے کی اسے جرأت نہیں تھی اور نیچے اس کی بینائی اتھاہ گہرائیوں میں گر کر ریزہ ریزہ ہو جاتی تھی ..... تنگ سرنگ اس کو دھیرے دھیرے دباتی جا رہی تھی اور اس کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں ...... درد کی شدت سے وہ چیخ پڑا۔

"میں محدودیت اور لامحدودیت کی مایا کو چکنا چور کر دوں گا .... اور، اور اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور اتھاہ گہرائیوں میں گرتا چلا ــــ وہ گرتا چلا گیا ــــ محدودیت اور لامحدودیت، درد، اذیت، خوشی، غم سب احساس کافور ہو چکے تھے اور صرف ایک احساس باقی تھا کہ وہ تاریکیوں میں گرتا چلا جا رہا ہے، گرتا جا رہا ہے ــــ دفعتاً اسے اپنے پاس کسی دوسرے وجود کا احساس ہوا۔ اس نے تاریکیوں میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو سیاہ گھوڑا اس کے پہلو میں مُردہ پڑا ہوا تھا۔

وحشی

طارق ندیم

حسب معمول کالج سے آتے ہی وہ مونا کی کھوج لینے لگی۔ اور اُس کی ماں برس پڑی —— "مونا...... مونا...... مونا نہیں ہوا مُوا آنکھوں کا تارا راج دُلارا ہو گیا۔ سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ جب دیکھو مونا کی رٹ۔ نہ کھایا پیا نہ یہ خبر لی کہ ننھی کی اب کیسی طبیعت ہے۔ بس آتے ہی چیخ اُٹھیں بنّو..... مونا۔ سگی بہن سے بھی پیارا ہو گیا ہے۔"

بات بھی سچ تھی سارا دن کھٹ پٹ۔ گھر کی ساری چیزوں کا ستیاناس کئے رہتا تھا۔ وہ سمجھ گئی ضرور کوئی فتنہ برپا کیا ہے مونا نے جو ماں اس کی خبر لے رہی ہے۔ لیکن پوچھنا بھی تو ضروری تھا۔

"آخر ہوا کیا۔ کچھ بتایئے بھی تو ممی؟"

—— "یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ بالشت بھر کا تو ہے مگر گھر بھر کو آسمان پر اُٹھائے رکھتا ہے۔ کل ہی شام شیشہ کا نیا گلاس آیا وہ چکنا چور کر دیا۔ ننھی کا ڈوپٹہ چر چر کر ڈالا۔ دودھ کی بھری دیگچی گرا دی۔"

سلطانہ چُپ چاپ ماں کی ڈانٹ سُنتی رہی۔ جب اس کی ماں خاموش ہو گئی تو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

—— "بس اتنی سی بات اور اتنا بڑا ہنگامہ۔ میں نے سمجھا قیامت آ گئی۔" پھر گلے لگ کر ماں کو منانے لگی۔

—— "مگر ڈیر ممی یہ بھی تو دیکھو ننھا مونا کتنا پیارا پیارا سا لگتا ہے۔ کتنی چہل پہل رہتی ہے اُس سے۔"

ماں بھی پھسل پڑی —— "اچھا چل، ہٹ..... تار ایسی ہو گئی پر ابھی تک

بچپنا نہیں گیا ...... جا دیکھ جا کے اپنے لاڈلے کو ...... زبردست ہاتھ پڑے ہیں آج ......" اور وہ لگی مُونا کو پکارنے ــــ "مُونا ...... مُو ...... نا"

اپنے کمرہ میں گئی تو اُسے میز پر بیٹھا دیکھا۔ وہ اس کی طرف لپکی مگر مُونا نے اس کی طرف سے مُنہ پھیرلیا۔ بڑی مشکلوں سے وہ مُونا کو منانے میں کامیاب ہوئی۔ وہ اُسے اپنی آغوش میں لے کر بے ساختہ پیار کرنے لگی ــــ "مجھے تجھ سے کتنی محبت ہے مُونا ..... تُو ہی تو ایک رازدار ہے میرا جسے میں اپنے دل کی ساری باتیں سُناتی ہوں۔ تو کتنا اچھا ہے لیکن بڑا شریر بھی ہے۔ کبھی کبھی تیری شرارت اچھی نہیں لگتی .... اُوں" اور مُونا نے اپنے سفید چمکیلے دانت نکال کر اس کا مُنہ چڑا دیا۔ اُس نے ہلکے سے اس کے گال پر ایک تھپکی دی ــــ "شریر"۔ پھر مُونا کو اپنے بستر پر لٹا کر روز کی طرح کالج کی باتیں سنانے لگی۔

"ــــ بھئی مونا آج تو مزہ آگیا۔ انٹر کالج ڈبیٹ تھا نا۔ بڑے گھاگ، رنگے سیار اسپیکرز آئے ہوئے تھے۔ مہیلا کالج سے میں تھی اور کملا، دو ــــ کالج سے شیلا ــــ ارے وہی موٹی بھینسیں اور رینو تھی۔ دو باہر کے کالجوں کی لڑکیاں تھیں۔ نام یوں ہی سے تھے۔ باقی سب مرد تھے۔ ہجوم تھا اُف۔ میں تو پریشان تھی اتنے بڑے مجمع میں کیسے بول سکوں گی۔ سب سے پہلے کالبس کالج کی ایک لڑکی کھڑی ہوئی۔ طوطے کی طرح رٹی ہوئی تھی۔ لڑکوں نے ہا... ہو .... شروع کیا تو ٹھس ہوگئی۔ بے چاری تھی تو بہت خوبصورت مگر بُرا ہو ان لڑکوں کا پتہ نہیں کیوں اتنا چیختے ہیں جیسے حلق نہیں بینڈ باجا۔ پھر لگاتار کئی لڑکے آئے مگر سب کے سب اوٹ پٹانگ بک رہے تھے۔ بحث کا موضوع تھا سیکس اور اُس کی اہمیت۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں ہو رہی تھیں۔ کوئی اس کی اہمیت کو رسل جیسے فلسفی کی طرح مورالیٹی اور انسانیت کے پیمانوں سے ناپ رہا تھا تو کوئی بالکل کروشچیف کے سے مزاحیہ انداز میں مُکا دکھا کر اپنی بات منوانے پر بضد تھا تو چند اس کی اہمیت کا جائزہ ملک کے معاشی اور اقتصادی حالات کی روشنی میں لے رہے تھے۔ ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی کسی سے کیوں پیچھے رہتے۔ بڑے بڑے ادیبوں کے کہے ہوئے فقرے دُہرا کر دھونس جمانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ تقریباً دس مقرر اپنی اپنی ہانک چکے تو میری باری آئی۔ میں نے سیکس کا

کا خالص نفسیاتی طور پر تجزیہ لینا شروع کیا تو واہ واہ کی صدا اور تالیوں کی گونج سے سارا ہال گونج اُٹھا۔ میں نے اپنی تقریر سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سیکس بھی ایک فطری امر ہے۔ اسے روکنا ظلم ہے۔ یہ ایک جمالیاتی حس ایک ایسا لطیف جذبہ ہے جو ماحول سے متاثر ضرور ہوتا ہے فکر ماحول کو سازگار بھی بناتا ہے۔ سیکس قدرت کا سب سے حسین تحفہ ہے۔ پھر دوسرے مقرر ایسے ٹھیک ہوئے مُونا کہ بس تم رہتے ہو تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ مزہ آگیا۔ مجھے فرسٹ پرائز میں یہ گولڈ میڈل دیا گیا۔ میں کتنی خوش ہوں مُونا کہ بس تم رہتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔ مزہ آگیا۔ مجھے فرسٹ پرائز میں یہ گولڈ میڈل دیا گیا۔ میں کتنی خوش ہوں مُونا..... بول تجھے کیا دوں اس خوشی میں..... ارے بول نا!

مُونا کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔

—”ایں تو سو رہا ہے..... واہ بھئی میں نے تجھے کتنی مزیدار باتیں سنائیں اور تُو ہے کہ نیند کے جھولے میں جھولا لینے لگا..... اچھا تو لے سو جا...“ وہ لوریاں گا کر اُسے سُلانے لگی۔

دوسرے دن پھر وہی ہوا۔ اُس کے گھر آتے ہی روحی نے یہ خبر سنائی —”آج مُونا پر بڑی مار پڑی ہے۔ حکیم صاحب کے گھر جا کر ان کی بہت ساری چیزیں برباد کر ڈالیں۔ حکیم صاحب کی بیوی نے اسے مارا پھر ممی سے شکایت کی تو ممی نے بھی اس کی خوب پٹائی کی....“ یہ سُننا تھا کہ پہلے تو وہ حکیم صاحب کے یہاں گئی اور حکیم صاحب کی بیوی کو بُرا بھلا کہا —”مُونا نے آپ کی جو چیزیں برباد کی تھیں ان کی فہرست میرے پاس بھیج دیتیں۔ میں انھیں خرید کر آپ کے پاس بھجوا دیتی۔ لیکن آپ نے اسے مارا کیوں۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں آپ کو چھوڑوں گی نہیں — آیندہ سے — ہاں“ احمد علی سیشن جج کی لاڈلی بیٹی کے سامنے ٹٹ پونجیئے حکیم کی بیوی کی کیا چلتی۔ چپ رہی۔

حکیم صاحب کے یہاں سے آئی تو ماں سے لڑنے لگی۔

—”ممی مجھے قبر میں ڈالیئے..... میرا جلا مُنھ دیکھیے جو مُونا کو پھر کچھ کہا تو...“ اور ہر ماں کی طرح اس کی ماں نے بھی بیٹی کو اپنے ہاتھوں قبر میں ڈالنے والی بات سے گھبرا کر صبر

ڈال دی "اچھا بھی جا...... اب کی دفعہ سے تیرے مُونا کو کوئی کچھ نہ کہے گا۔
----ایسی بُری بات مُنھ سے نہیں نکالا کرتے۔"

اُس نے اپنی ماں کو گلے لگا لیا ــــ "ارے واہ رے میری ممی ....میری اچھی ممی۔"
پھر وہاں سے ڈوپٹہ نچاتی بھاگی تو آکر دھم سے اپنے بستر پر گری "مونا!"
اور مُونا بھی جیسے منتظر ہی تھا۔ آپہنچا۔ اور اُس نے "لوسیٹ آف آل" کہتے ہوئے مونا کو اپنے سینے سے کس کر بھینچ لیا۔

پھر ایک دن وہ آیا کہ سلطانہ نے کالج کی تعلیم ختم کی تو شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی اور وہ بالکل بدحواس سی ہو کر رہ گئی۔ اُسے رہ رہ کر مُونا کا خیال آتا۔ مونا کا کیا ہوگا۔ اس کے بغیر وہ کیسے رہ سکے گی۔ اس کی غیر موجودگی میں تو اللہ کتنی آفت آجائیگی اس پر۔ گھر، ماں باپ، بھائی، بہن چھوٹنے کا تو غم تھا ہی مونا سے علٰحدہ ہونے کا کچھ کم قلق نہ تھا۔

بارات بڑی دھوم دھام سے آئی۔ اُس رات مُونا کو سینہ سے چمٹا کر وہ خوب روئی روتی ہی رہتی اگر اس کی سہیلیاں آکر اسے زبردستی رسم کے لئے نہ لے جاتیں۔ رسموں کے درمیان ایک بار بھی اُس نے کنکھیوں سے اپنے شوہر کی طرف نہ دیکھا۔ اگرچہ اس کی شریر سہیلیاں برابر اس کے کان میں یہ کہے جا رہی تھیں۔

ــ "ارے خوش قسمت ایک نظر دیکھ بھی تو..... چاند اُتر آیا ہے زمین پر ــ بے چارہ کتنی دیر سے تیری ایک نظر التفات کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اور تو ہے کہ......"
مگر اس کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ جانے کیوں بس رہ رہ کر مُونا آنکھوں میں گھومتا جاتا۔

صبح ہوئی تو رُخصتی کے وقت اس نے ضد باندھ لی ــــ "مونا کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔ ماں نے غصہ سے جواب دیا ــــ "پگلی ہو گئی ہے کیا...... بچوں کی سی باتیں کرتی ہے" اور وہ آہ و بکا کے شور میں اسٹیشن روانہ کر دی گئی۔

کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ سسرال پہنچتے ہی وہ بے حد مصروف ہوگئی اور میکے نہ آسکی۔
ادھر موناکی حالت اس کی غیر موجودگی میں بالکل ابتر ہوگئی۔ مار بھی زیادہ پڑنے لگی تھی۔
زرد زرد سا ہوگیا تھا۔ دو ماہ بعد جب سلطانہ اپنے خوبصورت شوہر ڈاکٹر احمد جمال کے
ساتھ میکے پہنچی تو دیکھنے والوں نے پہچان لیا کہ وہ بالکل بدل گئی تھی۔ اب وہ بات بات پر
قہقہے نہیں لگاتی بلکہ اس کے چہرہ پر ایک عجیب وقار آگیا تھا۔

اور ایک رات "میاؤں"..... "میاؤں" کی دردانگیز۔ چیخ سے سارا گھر جاگ اُٹھا
سلطانہ نے مونا کو اتنا مارا کہ مونا مرگیا۔ لوگ حیران رہ گئے۔ بات بس اتنی سی تھی کہ سلطانہ
اپنے شوہر کے لئے ایک گلاس دودھ لئے جارہی تھی کہ مونا نے راستہ میں اُچک لیا گلاس
گر کر چکنا چور ہوگیا۔ سارا دودھ بہ کر برباد ہوگیا۔ وہ غصّہ سے سُرخ ہوگئی اور پھر
جیسے اسے دورہ سا پڑگیا..... "وحشی.... "درندہ"...."جانور"...." وہ مونا کو مارتی
گئی۔ مارتی گئی۔ بڑی مشکلوں سے لوگوں نے خاموش کرایا۔

گئی رات جب ہر طرف سکوت چھاگیا تو جانے کیوں وہ اپنے شوہر کے سینہ سے
لپٹ کر سسک اُٹھی..... "وحشی"!

———

آدھا چاند، پورا چاند

ابواللیث جاوید

قدموں کے چہرے راستوں پر پڑے کراہ رہے تھے اور راستوں کی مانگ میں زندگی کی تلخیوں کا رنگ پھیلتا جارہا تھا۔ دور بہت دور ایک چیل چٹانوں کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اب ٹکرائی، اب ٹکرائی مگر ارادوں کا پتھر دم توڑتی ہوئی خواہشات کے سر سے کبھی نہیں ٹکرایا۔ وہ ٹکٹکی باندھے وقت کا چہرہ گھورتی رہی، جس پر تہ بہ تہ سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان سلوٹوں کی دراروں سے ارمانوں کی چتائیں جل رہی تھیں اور گدلا گدلا دبیز دھواں پھیلتا جارہا تھا۔ نہایت کثیف اور بدبودار۔ جیسے واقعی کہیں شمشان میں کوئی لاش جل رہی ہو۔ اس نے ان ارادوں کی کوکھ میں جھانک کر دیکھا تھا مگر ہر بار اسے ایک کیڑا سا کلبلاتا نظر آیا تھا۔ ماضی کی صلیب پر یادوں کی تڑپتی لاشیں جھول رہی تھیں اور سُرخ سُرخ لہو، ٹپا ٹپ ذہن کے کُھردرے فرش پر چو رہا تھا۔ ان قطروں سے بکھر رہی تھیں روشن لمحات کی تاریکیاں، تاریکیوں کے سینے میں دبے ہوئے گنہگار دھبے، زور زور سے پکار اٹھتے تھے۔ اور اس کا رواں رواں کھڑا ہو جاتا تھا۔

اور اس کا رواں رواں اس وقت بھی کھڑا تھا جب وہ اپنی عمر کی آنکھ مچولی کھیلتی گھڑیوں کی دل نواز آوازیں سُن رہی تھی اور بچپن کی بھولی بھالی باتیں اس سے الوداعی سلام کہہ رہی تھیں اور جوانی کی مست مست امنگیں اسے گلے لگانے کے لئے بازو پھیلائے اس کی طرف لپک رہی تھیں۔ وہ گھڑیاں کتنی خطرناک تھیں اس کے لئے! نہ لڑکپن نہ جوانی، نہ

اندھیرا نہ اجالا، جیسے تھوڑا تھوڑا دن، تھوڑی تھوڑی رات، تھوڑی تھوڑی خوشیاں، تھوڑا تھوڑا غم ــــ! یہ امتزاج تھا دو مختلف عمروں کا، یہ سنگم تھا دو مختلف سمتوں میں بہتی ہوئی دھاروں کا ــــ یہ لمحہ تھا ارادوں کی غیر پختگی کا، یہ وقت تھا بہاؤ کا، روانی کا، پھسلن کا اور واقعی پھسلنے میں، گرنے میں، سنبھلنے میں اس وقت نہ جانے کیوں اتنی لذت تھی، اتنی مٹھاس تھی، اتنی شیرینی تھی۔ اور جب موسم انگڑائیاں لیتا اور فضاؤں میں گدگدیاں سموجاتیں تو اس کا انگ انگ تھکن محسوس کرتا، کسک محسوس کرتا، اور آنکھوں میں بے قراری سموجاتی۔ اس کی آنکھیں کچھ ڈھونڈتیں، کوئی سہانا سا درد، کوئی انجانا سا خواب!!

اُف ہائے ــــ! میں مری ــــ!!

درد کی شدت سے اس کے منہ سے نکل گیا۔ سلائی مشین کی سوئی اس کی انگلی میں بس چبھ گئی تھی اور خون کی دھار بہ نکلی تھی۔ قریب ہی بیٹھے ہوئے ساجد نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور خون رستی ہوئی انگلی کو جلدی سے اپنے منہ میں لے کر چوسنے لگا۔ اس کا سارا جسم ایک عجیب سی کپکپاہٹ میں ڈوب گیا۔ کسی جوان ہاتھوں کا یہ لمس اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ جس میں ایک انجانا سا کیف تھا، ان دیکھا سا مزہ تھا۔ اور زخم کے اس درد میں اسے ایک انوکھی سی لذت ملی تھی۔ ساجد دیر تک اس کے ہاتھ کو سہلاتا رہا اور وہ خاموش بیٹھی ساجد کو غور سے دیکھتی رہی اور درد کا شیریں پن محسوس کرتی رہی۔ فرحت کے آتے ہی ساجد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بولا ــــ

ــــ دیکھو آپی ــ ان کی انگلی بری طرح گھائل ہوگئی ہے ذرا فرسٹ ایڈ کردو۔"

"تم نے تو فرسٹ ایڈ کرہی دی۔ اب اور کیا فرسٹ ایڈ ہونی ہے۔!" فرحت مسکراتی رہی۔

"جی ــــ وہ ــــ میں ــــ تو ــــ" ساجد ہکلانے لگا۔

"ہاں ــــ ہاں ــــ! کچھ کہو بھی تو سہی۔"

وہ گھبرایا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور فرحت مسکراتی ہوئی شازی کی طرف دیکھتی رہی جو نظریں نیچی کئے ہوئے اپنی زخمی انگلی پر دوپٹہ کے ایک کونے کو لپیٹ رہی تھی۔

سازی کی انگلی پر ساجد کے بوسہ کا لمس اُبھرتا رہا۔ زخم پر ہلکے پھلکے پھاہے کی طرح، کلی کی پنکھڑیوں پر بھنورے کے لمس کی طرح اور اس کا احساس دوشیزگی منہ بند کلی کی طرح ابھرتا رہا، کھلتا رہا، گویا ماہِ نَو کا باریک سا ٹکڑا آسمان کے مغربی کنارے پر اُبھر رہا ہو، ڈوب رہا ہو، دیکھنے والوں کی نظروں سے کبھی اوجھل، کبھی نمایاں۔ اس نے اپنے آپ میں ایک کھلبلی سی محسوس کی، ایک بے چینی سی محسوس کی۔ ایسی بے چینی جو پہلے تو کبھی نہ تھی۔ احساس کی آندھی چلتی رہی اور شباب کی موجوں میں مدوجزر آتا رہا۔ کنارے مدہوش ہوتے رہے اور آکاش اور دھرتی کی بلندی و پستی ایک دوسرے کو دعوتِ ہم آغوشی دیتی رہی۔

نظروں کی جنت بستی رہی اور خیالوں کا ابلیس شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جاتا رہا۔ لے جاتا رہا اور قدم ڈگمگاتے رہے۔ ایک پُرشور سناٹا دل و دماغ پر طاری رہا اور شازی اسی کیفیت میں اپنے بستر پر گری اور دیر تک پڑی خیالوں کے ریگزاروں پر برہنہ پا بھٹکتی رہی۔ اندھیرے میں خیالوں کی چمگادڑیں دیواروں سے ٹکراتی رہیں۔ ہوائیں چلتی رہیں اور اس کے لاشعور پر ایک لطیف مردانہ لمس حاوی رہا۔ سارے جسم کی پہاڑی ندی میں طغیانی آتی رہی۔ اور دور جنگلوں کا شور سنسناتا رہا۔ برساتی چشمے ابلتے رہے اور وہ اس بوندا باندی میں اپنا چہرہ بھگوتی رہی ساجد کے ہاتھوں کی گرفت اور انگلی پر بوسہ کا نقش اسے بھٹکاتا رہا۔ اس کے احساس کو جوان کرتا رہا۔ اس کی خواہشوں کو جگاتا رہا۔

اور پھر شازی پر بہار کی مہربانی ہوگئی۔ پھول میں خوشبو سما گئی۔ اور وہ گل گلزار ہوتی چلی گئی وہ ہواؤں کے دوش پر اڑتی رہی اور خوشبو چمن چمن پھیلتی رہی۔ اس کی نظریں ٹکراتی رہیں آبگینوں سے آئینوں میں چھپے ہوئے چہروں سے، ان چہروں سے جن میں پیار کی لکیریں تھیں۔ خون کی رنگت تھی۔ اور زندگی کی نشانیاں تھیں۔ اسے نشانیوں کی خواہش تھی اور اس کے دل میں ایک تڑپ تھی۔ سیمابی سی، بالکل شہابی سی۔ ابلتے ہوئے لاوا جیسی گرمی تھی، تن بدن میں، اور اسی گرمی میں اس کا دل و دماغ جھلس رہا تھا، فکر و نظر، لمحہ و ساعت اور ساری کی ساری گھڑیاں، رات کی تنہائیاں دن کے ہنگامے، شام کا سیندور اور صبح کا سہاگ کا خیال آتے ہی ایک خوشبو سی اڑ جاتی تھی ارمانوں کی، ولولوں کی، حوصلوں کی اور کسک سی ہونے لگتی تھی دل میں، آنکھوں میں بے چین سا سرور دوڑ جاتا تھا اور کسی اجنبی سے قدموں کی آہٹ کا سنگیت فضاؤں میں جاگ جاتا تھا او

زبان دھیرے دھیرے، ہولے ہولے کسی نام کی رٹ لگانے لگتی تھی۔ مگر اسے یقین نہیں آیا تھا زبان پر، دل پر، کانوں پر، کیوں کہ جب عمر ایسی متوالی ہو جاتی ہے، تو دھوکا دینے لگتا ہے سب کچھ ——— اپنا بھی، پرایا بھی۔ مگر وہ نام جو خود بخود لبوں پر مچلا تھا اس میں اپنائیت تھی، پکار تھی، کشش تھی، دعوت تھی اور ایک اشارہ تھا۔ دل کا اور ارمانوں کا ہاتھ بڑھ گیا تھا اس جانب، جس جانب نظروں کی جنت تھی، تکمیل تھی ارمانوں کی۔

"سنو ——— !"

"جی ——— ! جی ——— !!"

"یہ جی جی کیا ——— ؟ بیٹھو یہاں ——— !"

"فرحت آپی !"

"فرحت آپی نہیں۔ میں ہوں ساجد۔ تمہارا زخم ؟" اور ہاتھ پھر ساجد کے قبضہ میں تھا اور وہ انگلی کا زخم تو کب کا بھر چکا تھا، پر زخم تیار تھا ایک نیا، بالکل شگوفہ جیسا، جس میں چبھن بھی تھی تو بڑی میٹھی میٹھی، درد بھی تھا تو بڑا ہی لطیف سا۔ شازی کھوئی رہی خوابوں میں، میٹھے میٹھے سپنوں میں، اس کا شہزادہ بالکل اس کے سامنے تھا، محو گفتگو جس کی باتیں کانوں میں رس گھولتی رہیں، جس کی آواز کا جادو اس پر چلتا رہا، اور بالآخر ساجد کی آغوش میں اس کا سارا وجود آکر سمٹ گیا تھا اور ناریل کی لمبی باہوں میں اٹکا ہوا چاند آسمان کی طرف دیکھتا رہا، جیسے اس بے رحم سے وہ کوئی مدد مانگ رہا ہو، بالکل مجبور اور لاچار سا۔ ابابیل کا جھنڈ بیابانوں سے باتیں کرتا رہا اور ویرانوں کی آنکھیں شازی کے بدن کی طرح کھلی رہیں، بالکل آدھی آدھی سی اور ندیوں کا شور اس کے بکھرے جذبات کی طرح بڑھتا رہا۔ آنکھوں کے آنگن میں برہنگی کا شباب مچلا اور شازی کے شباب کے بچپن سے نبرد آزما ہوتا چلا گیا۔ معصوم بچپن شباب کے گرم جھکڑ میں جھلس گیا اور بستر پہ مچلتی آرزوؤں کا ستایا ہوا گورا بدن سسکیاں لے رہا تھا جیسے آدھا چاند غروب ہو رہا ہو۔

کمرے کی کھڑکی سے سمندر کی لہریں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور صبح کے

بھولے پن کو سمندر کا آئینہ اس کے رات کی داستان دکھاتا رہا۔ یہ کھلے کھلے سے گیسو۔ یہ اڑی اڑی سی رنگت اور رنگت میں مدوجزر کی بلندی اور میرین ڈرائیو کے سمندری فٹ پاتھ پر قدموں کی آہیں ابھرتی رہی تھیں۔ ان آہوں میں گم تھیں وقت کی مایوسیاں۔ کربناکیاں، دور سمندری سطح پر بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے ایک پرندہ نے چونچ ماری تھی اور مسرتوں کے ایک قیمتی لمحہ کو چرا لیا تھا۔ شازی کو جیسے چوٹ سی لگی تھی۔ یہ چوٹ لگنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ وہاں سے اٹھی تھی اور باتھ روم میں سما گئی تھی۔ اور پہلی بار اسے باتھ روم آپریشن تھیٹر جیسا معلوم ہوا تھا۔

جون کی لہکتی دوپہر میں ٹھک ٹھک کی صدائیں فضا کی دیواروں سے سر ٹکراتی رہیں اور کوئی کواڑ چرمرایا تھا اور شازی اس کے اندر سما گئی تھی۔ دیوار سے پیٹھ لگائے وہ کھڑی رہی ساجد کے ہاتھوں کا لطیف لمس اس کے کنوارے جسم کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا رہا۔ ہاتھ کا سایہ اس کے جسم پر تیرتا رہا، تھرتھراتا رہا، مچلتا رہا۔ اب ہاتھوں کے قبضہ میں بدنامی کا گول مٹول چہرہ تھا۔ نہایت سبک سبک سا اور جنوں کے کتے اچھلتے رہے کودتے رہے اور آخر میں ان کی رسّی اس زور سے ٹوٹی کہ تپتے ہوئے صحرا کی ریت پر ان کی ناپاک رال کی بوندیں جذب ہوتی چلی گئیں۔ پیاسی دھرتی پر بارش اور پھر بارش کے بعد نکھرا ہوا پورا چاند ساجد کے بستر پر مسکرا رہا تھا۔ وہی کل کا آدھا چاند آج بالکل پورا پورا سا تھا۔ مگر چاند کے جسم پر ایک دھبّہ لگ گیا تھا اور جب جب چودھویں کا چاند نمودار ہوا، سمندر میں جوار بھاٹا آتا رہا اور شازی کے جسم کی سمندری سطح پر کوئی پرندہ اپنی ٹھونگیں مار کر مسرتوں کا لمحہ چرا تا رہا۔

جوہو بیچ کی گیلی ریت پر خاموشیوں کی زبان نے شازی کو جو لذّت دی تھی وہ شاید انوکھی تھی۔ لہریں ریت کو دور تک گیلا کرتی رہی تھیں اور دور کوئی تارا ٹوٹ کر سمندر کی لہروں میں گم ہو گیا تھا۔ دودھیا چاندنی مسکراتی رہی تھی مگر شہر کی روشنی نے اس کی مسکراہٹوں کو نگل لیا تھا۔ گیٹ وے آف انڈیا پر ہپیوں کا ہجوم تھا۔ تہذیب کی انتہائی بلندیاں ان کے ڈھنگ پر ماتم کناں تھیں اور ساجد کی باہوں میں مونا کا وجود کسمسا رہا تھا۔ شازی جب

سامنے سے اُسے گھورتے ہوئے گذری تو ساجدنا آشنائی کا بادہ اوڑھتے تہذیب کی تابانی سے اپنی آنکھیں پھوڑتا گذر گیا اور شازی کی آنکھوں میں اندھیرے گھستے چلے گئے۔ اندھیروں میں اجالوں کا بسیرا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر مونا لیزا کی مُسکراہٹ فلورا فاؤنٹین کے خوبصورت فٹ پاتھ پر جب اس نے سلیپنگ پلز خریدنی چاہی تورات کا طلسم پاش پاش ہوچکا تھا اور کبھی نہ بُھلا دینے والی صبح کا مسحور کن خیال تصویریں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ سمندر کے سینے پر ابھرتا ہوا حاجی علی کا مزار روشنی کا مینار معلوم ہو رہا تھا اور شازی اندھیروں سے نکل کر روشنی کے سائے میں آچکی تھی۔ پانی زیادہ نہیں بڑھ پایا تھا مگر راستے پانی کی زیادوں میں گم ہو گئے تھے اور ان کا عکس پانی کی پیشانی پر لہرا رہا تھا۔ ایسے راستوں پر بھی ہندوستان بھیک مانگ رہا تھا۔ سامنے تار دیو کی ایر کنڈیشنڈ مارکٹ کھڑی پشیمان ہو رہی تھی۔ ڈوب مرنے کے لئے سمندر دعوت دے رہا تھا۔ مگر کوئی قدم آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ ریس کورس کے میدان میں گھوڑوں کی دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اور ہر گھوڑے کا تعاقب ایسی نظریں کر رہی تھیں جو ہمیشہ بلندیوں پر ہی رہتی ہیں۔ قدموں سے کون کیڑا کچلا گیا، کون جاندار روندا گیا اس سے بالکل بے نیاز، بے خبر، بے پروا۔ ان نظروں کو بلندیوں کی معراج انہیں جانداروں نے عطا کی ہے جن کے مقدر میں خاک وخشت، افلاس ونادار لکھے ہے دور ایک آواز ابھری تھی۔

"یہ جو محبت ہے اس کا ہے کام

محبوب کا جو بس لیتے ہوئے نام

مر جائے

مٹ جائے

ہو جائے بدنام ....."

کٹی پتنگ کو سہارا بھی ملا تھا مگر شازی دوراہے پر کھڑی تھی اور کارواں گذر گیا تھا، اس کا غبار فضا کو گدلا کر رہا تھا۔ سڑک بیوہ کی مانگ کی طرح سونی تھی مگر اس کے دل میں بے پناہ ہنگامہ برپا تھا۔ راہیں مسدود تھیں اور منزلیں دھند لکے میں گم۔ ابھرے پیٹ والی عورت

نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو زندگی محسوس ہوئی۔ یہ زندگیاں کبھی سارے ملک کا مسئلہ بن کر کھڑی ہوجاتی ہیں۔ دولاکھ زندگیاں کا سوال تھا۔ اگر حملے کئے بھی جائیں تو عدم وجود کی درمیانی مدت پر موت حادی ہوجائے یہ کوئی ضروری بھی تو نہیں۔ نازی کیمپوں کی داستانیں، بنگلہ دیش کی انقلابی دھرتی پر دُہرائی گئی تھیں۔ اور انسانیت نے تنگ آکر چہرہ پر شیطانیت کا چہرہ چڑھالیا تھا بھائی نے بہن اور باپ نے بیٹی جیسے پاک رشتوں کو خاک میں ملادیا تھا۔ اب اس دھرتی پر باقی ہی کیا رہ گیا تھا۔

سورج کا آدھا جسم سمندر کے پانی میں ڈوب چکا تھا اور پانی کی مضطرب سطحوں پر سنہری کرنوں کا جال پھیلتا جارہا تھا۔ شازی کی زندگی بھی کسی نئے جال میں پھنسنے والی تھی۔ ایک جال کی نکلی مگر پھانس دل میں چھپی ہوئی تھی۔ قدموں کی آہٹ نے اس میں کوئی خوف پیدا نہیں کیا۔ وہ بڑی دلیری سے آنے والے کا انتظار کرتی رہی۔ درندگی ــــــ رات کے مرد اور دن کے مرد پر اسے ہنسی آگئی۔ خوب صورت لباس کے اندر چھپا ہوا بھیڑیا۔ جسموں کی تھکن اور باہر چلتی ہوئی گرم گرم لوئیں پسینے کا بہنا اسے یاد آیا، قدم قریب آئے تو اس کے منہ سے شراب کا بھبھکا پھوٹا۔ اس کا جیون ساتھی اور سر پر بھوت سوار کئے ہوئے۔ شمع بجھتی چلی گئی۔ اور رات کمرے میں صبح کی کرن دوڑی تو ندیم نے رخ بدل کر کہا تھا۔

’’تم تو بھیگی ہوئی تولیہ ہو۔ تم سے جیسے کسی نے اپنا گیلا جسم پہلے ہی پونچھ لیا ہو۔ گھن گھن آرہی ہے۔‘‘

کمرہ خالی تھا اور اس کی ہر چیز بالکل خالی خالی۔ اور خالی ذہن میں کتنے خیالات گھستے رہے۔ بائیکولا کی بستیوں کا خیال اشارے کرتا رہا مگر اس کی ہمت نے ان اشاروں کو کچل دیا۔ دادر کے کافی ہاؤس میں آنے والے ایکسٹرا چہروں میں ایک چہرہ اور جاملا۔ اور پردوں پر ایک تو بہ شکن انگڑائی اور ابھری۔ زندگی میرین ڈرائیو کی خم دار سڑک کی طرح پیچیدہ تھی مگر روشن سی۔ پیر تھکا دینے والے راستے ہر سو پھیلے ہوئے تھے جن پر قدموں کے چہرے پڑے کراہ رہے تھے۔

لیٹر بکس کی تلاش

(شوکت حیات)

آنکھیں کھلیں اور ہاتھوں کو لفافے کے لمس سے آشنائی ہوئی تو نام پتہ دیکھے بغیر ہی میں نے سفر کا آغاز کر دیا کہ نام پتہ دیکھنے کی اہمیت بھی کیا تھی۔ لفافے کو کسی طرح لیٹر بکس میں پہنچنا تھا ــــ

اور میں نے لیٹر بکس کی تلاش شروع کی کہ شہر اجنبی تھا اور سڑکوں اور عمارتوں سے آشنائی تو تھی لیکن ان کے اندر باہر کے حال سے ناواقف تھا۔

چلتے چلتے ایک راہ گیر سے دریافت کیا۔ اس سے پہلے کہ سوال پورا ہوتا، اس نے یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو اور یوں سنا جیسے پہلی بار سن رہا ہو۔ پل دو پل میں اس کے چہرے کی لکیریں برف ہو گئیں اور رومال سے اس نے چہرہ صاف کیا تو کسی نے مثبت اور منفی تار سر سے گذار دیئے

ابھی ابھی وہ کوئی اور تھا اور ابھی ابھی ...

میں نے پھر وہی بات پوچھی۔ پھر اس کے چہرے کی لکیریں برفیلی ہوئیں اور رومال سے اس نے چہرہ صاف کیا تو سر میں پھر تاروں کے برقی لمس کا احساس ہوا۔

ابھی ابھی یہ وہ تھا...... اور ابھی ابھی ......

میں نے ٹھہرنا بے کار سمجھا۔ معذرت چاہتے ہوئے اپنے آپ کو حرکت دی۔

پہیوں پر جڑے، تلملاتے ہوئے چہروں کی ریل پیل میں پستا رہا۔

ایسی ریل پیل کہ آنکھ جھپکنے میں صدیوں پیچھے رہ جانے کا خوف ــ!

تکان کے آثار ابھرنے لگے تو لاعلمیت اور اجنبیت نے آنکھوں کو بھاری کر دیا ــــ

ڈگمگاتے ہوئے قدموں کا فاصلہ بتدریج کم ہوتا گیا۔ دائیں بائیں نظریں ترازو کے پلڑوں

کی طرح حرکت کرتی ہوئی اسے ڈھونڈھتی رہیں ——

کوئی قاعدے کا آدمی ملے تو لیٹر بکس کی آگہی ہو ——

لیکن گھنٹوں "قاعدے" میں اُلجھا رہا اور اس بیچ جانے کتنے چہرے سوچتے ہی سوچتے سامنے سے گذر گئے۔

اسی اُلجھن میں گُم چلتے چلتے نیند آنے لگی اور اسی دیوانگی کے زیر اثر سبزہ آلود گنبدوں اور زنگ خوردہ ہواؤں کے آشیانے میں داخل ہوا اور جب چند سخت چند ملائم ہاتھوں کے ذریعہ گھسیٹ کر باہر نکالا گیا تو یاد آیا، کس لئے چلا تھا اور کہاں جانا تھا ——

ہاتھوں میں لفافہ ابھی تک دبا تھا۔ یکایک لفافے کا حجم بڑھنے لگا۔ انگلیاں کچھ دیر تک ساتھ دیتی رہیں اور جب ان کی پوریں ٹوٹنے ہی والی تھیں، میں نے ہڑبڑا کر لفافہ زمین پر پٹک دیا ——

ایک آواز ہوئی ——

کچھ لوگ دوڑے ——

کچھ لوگ رُکے ——

کچھ لوگ گرے ——

اور اضطراری طور پر میں نے لفافہ پھر سے ہاتھوں میں اُٹھا لیا تو سب کے سب مجھے گھیرے میں لے کر کھڑے ہوگئے۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"کس کی تلاش میں ہو ——؟"

"کیسا لفافہ؟"

ستعمال شدہ چائے کے کلھڑ مسلسل پھینکے جاتے رہے۔

میں نے اپنی تلاش کا مقصد بتایا اور ٹھٹھا مارتے ہوئے سمندر میں ڈوب گیا۔

ڈوبتے اُبھرتے، میری باری آئی تو سب کی آنکھوں سے برف کے ریزے جھرجھراتے ہوئے گرنے لگے اور منٹ دو منٹ کی دیر میں دائرہ منتشر ہوگیا تو میں نے سوچا——

قاعدہ، قاعدہ ہے

وتر بھی قاعدہ ہے۔

اور عمود بھی قاعدہ

اور ——

ہواؤں کے رُک پر سیاہ مثلث آویزاں ہے۔

دیکھتے دیکھتے مثلث نقطہ بنا اور نقطہ بھی دھیرے دھیرے معدوم ہوا تو سامنے وہی خلا تھی ——

وہی سرد ہوا ——

اور وہی تھرتھراہٹ ——

پھر بھی میں سڑکوں پر چلتا رہا کہ لفافہ کو لیٹر بکس میں پہنچنا ہی چاہیے ......

کہ لیٹر بکس کو ہونی ہی چاہیے ......

زرد کمبل اوڑھے ہوئے ایک بوڑھا شخص لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا آرہا تھا میں اس کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔

"یہاں کوئی لیٹر بکس نہیں ہے؟"

"کیا کہا؟"

"یہاں کوئی لیٹر بکس ہے؟"

"کیا؟"

"لیٹر بکس!"

"لیٹر بکس؟"

"ہاں!"

"نہیں سمجھا!"

"مجھے لیٹر بکس کی تلاش ہے .... بہرے ہیں کیا آپ ....؟"

"اہاہا......"

"لیٹربکس ....."

"میاں ـــــ لیٹربکس کی تلاش میں تو میں خود صدیوں سے بھٹک رہا ہوں۔
سب بھٹک رہے ہیں ..... تم بھی بھٹکو ..... جاؤ جاؤ .... تم بھی ...."

میں نے قدم بڑھائے۔ موڈ خراب ہو چکا تھا، کمبل پوش اس طرح لمبے لمبے
قہقہے لگاتا ہوا دور ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے سکوت چھا گیا ـــــ اچانک
پُشت سے کمبل پوش کے لمبے لمبے قہقہے اُبھرے ... مُڑ کر دیکھا ... دور دور تک سڑک
تنہا تھی ... دور دور تک کسی آواز کا نام و نشان نہیں ملتا تھا ....

ایسا لگا کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا ہو۔ بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر
ٹٹولنے لگا ..... کوئی ہاتھ نہیں تھا ... کسی نے آنکھیں موند دیں .... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
دیکھا .... کوئی ہتھیلی نہیں تھی .... قدموں کی آہٹ آس پاس سے اُبھری .... چونکتے
ہوئے چاروں طرف گھوم گیا ـــــ یہ کیسی گھڑی تھی کہ بار بار اپنے اندازے کی تردید
کر رہا تھا .... سنسان سڑک کو چھوڑ کر ایک گلی میں مُڑ گیا .... پُشت سے پھر کمبل پوش
کے لمبے لمبے قہقہے اُبھرے جو کچھ ہی دور چل کر گنجان گلی کے ہنگامے میں ڈوب گئے۔

گندے پانی سے بھرے ایک بڑے سے گڈھے کو پار کرنے کے لئے اُچھلا اور
اور ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا .... اس کے ہاتھوں کا پیکیٹ پھٹ گیا اور میرے پیروں
کے نیچے ایک ٹماٹر خون اُگل رہا تھا۔ جڑے ہوئے ہاتھ، تھرتھراتے ہوئے لب دیکھ کر
اس نے مجھے معاف کر دیا اور چہرے پر جمی ہوئی برف کھرچتا ہوا بھیڑ میں گُم ہو گیا۔

کیسا لفافہ ہے ...؟

کیا لفافوں کو لیٹربکس میں پہنچنا ہی چاہئے ...؟؟

سوالات کی ٹیوب لائٹ جھلملانے لگی۔ سر کو پلڑوں کی طرح ہچکولے دیتے ہوئے
میں نے خلا پر نظریں مرکوز کیں ـــــ سماعت پر زوردار جھٹکا پڑا۔

"دیکھ کے ..."

جب تک نظریں واپس ہوئیں، کانوں میں سیکڑوں موٹروں کے ہارن نے

مسلسل پڑپڑاتا ہوا دھما کا چھوڑا۔ حد نظر تک موٹروں کی قطاریں تھیں۔

میں سڑک کے بیچوں بیچ....

کسی نے دھکا دیا اور میں کنارے کی طرف لڑھکا۔

سمٹتے بکھرتے ہوئے سر کے بال انگلیوں میں پھنس کر ہانپنے لگے تو میں نے سوچا۔

وقت کم ہے ــــــ

شہر اجنبی ہے ــــــ

چہرے برفیلے ہیں ــــــ

اور ڈاک نکلنے کا وقت ختم ہونے والا ہے....

لیکن ڈاک نکلنے کا وقت....؟؟

کیا وقت....؟؟؟

کچھ قدم جم گئے ــــــ

ایسے دیکھا گیا، ایسے سُنا گیا جیسے پہلی بار....

چہرے برف کی کرچیوں سے اٹ گئے.... رومالوں سے جھاڑے گئے.... اور پھر چلتے بنے۔

جانے والوں میں سے ایک کا لپک کر ہاتھ پکڑا:

"لیٹر بکس کہاں ہے؟؟؟؟"

جواب سُننے سے پہلے ہی ذہن میں متعدد لکیریں اُبھریں۔

اس شخص نے ہڑبڑاتے ہوئے ہاتھوں کو جن پر لرزہ طاری تھا، پیچھے کر لیا اور مجھ سے چھپنے چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھوں سے میرا ہاتھ مقناطیس کے موافق قطب کی طرح الگ ہو گیا ــــــ

میں نے ساری بات، سارے احساسات اندر کی طرف سرکا دیئے اور دریافت طلب نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔

"لیٹر بکس دیکھا ہے آپ نے؟"

"میں تو خود اس شہر میں نو وارد ہوں۔"

"معاف کیجئے گا..."

"چاروں سمت دیکھا ہے؟"

"اُتر دیکھ چکا..... دکھن اور پورب بھی ....، پچھم نہیں گیا ہوں..... اُتر یہی ہے نا؟"

"یہ تو دکھن ہے۔"

"یہ پورب ...."

"نہیں پچھم ہے۔"

"کمال ہے!... آپ شہر میں نو وارد ہیں اور سب جانتے ہیں ...."

"میں نے سمتوں کو ہمیشہ اپنی گرفت میں رکھا ہے۔"

"کمال ہے...!"

"آپ ...."

"بے نام سمتوں کا زخمی پرندہ .... اس شہر میں اجنبی ..."

"اچھا...."

"اچھا...."

جب وہ آگے بڑھ گیا تو اس کے ہاتھوں کے لفافے پر نظر پڑی۔ غور کیا تو ہر راہ گیر کے ہاتھوں میں لفافہ دکھائی دیا جنھیں گرتے پڑتے احتیاط سے سنبھالے سب اپنے اپنے ساتھ لئے چل رہے تھے۔ ہر شخص ایک دوسرے کے قریب رنگین چہروں سے آتا اور کان کے پاس سے لب کے ہٹتے ہی ہر ایک کے چہرے پر سفیدی یا زردی چھا جاتی

کون کس سے سوال کرے ــــــ

کون کس کو جواب دے ــــــ

سب کے سب ایک دوسرے سے ایک ہی سوال کر رہے تھے

"لیٹر بکس کہاں ہے؟؟؟"

"لیٹر بکس.... ؟؟؟"

متواتر چلتا رہا ——

کتنے ہی پڑاؤ...

کتنے موڑ...

کتنے ہی چوراہے...

ربر تلے پستی ہوئی لکیروں کی طرح مٹتے رہے

اور شہر کے مشرقی سرے پر پہنچ کر بھی کوئی لیٹر بکس نظر نہیں آیا تو لفافہ پھاڑ دینے کی خواہش پھن کاڑھ کر کھڑی ہوگئی کہ لفافے کا حجم پھر بڑھتا جا رہا تھا۔ پوریں پھر سے کڑکڑانے لگیں۔ انگلیاں سڑاک سے اپنا عمل کرنے والی ہی تھیں کہ آنکھوں نے سرگوشی کی اور چلتے چلتے یوں رُکا جیسے پیچھے جانا ہو، جیسے آگے جانا ہو، جیسے کہیں نہیں جانا ہو۔

اس شہر کو چھوڑ دوں..

اس شہر سے آگے بڑھوں... یہاں کوئی لیٹر بکس نہیں...

دوسرے شہر میں بھی نہیں ہوا تو...

یہاں نہیں ہوا تو وہاں بھی نہیں ہوگا... کہیں نہیں ہوگا... ساری کائنات شہر میں در آئی ہے..

لیٹر بکس ہوئے کیا؟؟؟

سب تو یہی پوچھ رہے ہیں!

چلوں بھی.....

اس سے آگے کوئی شہر نہیں....

اس سے پیچھے بھی نہیں...

سب کچھ یہی ہے...

نا...

بے ارادہ لفافے پر نام پتہ ڈھونڈھنے لگا۔ کوشش کئی بار عمل کی چرخی پر گھومی

لیکن کہیں کچھ نہ تھا ـــــ

کوئی نام،

کوئی پتہ،

کوئی تحریر؟

تیز روشنی کے سامنے جانچ کی ـــــ

اندر بھی کچھ نہیں!

اب یہ جو سوچنا شروع کیا کہ لفافہ ہاتھوں میں آیا کیسے تو یہ یادداشت بھی جانے کون سی خلائیں گُم ہوگئی اور تب لفافہ جیب میں رکھ کر میں واپس مُڑا۔

میں نے ہی لیا ہوگا....

یا کسی نے دیا ہوگا...

یا...

آسمان سے....

خود بخود ہنس پڑا۔

نہیں...

کچھ ہی دور چلا تھا کہ جیب کے بھاری ہونے کا احساس ہوا۔

انگلیوں میں حرکت ہوئی تو بہت سارے لفافے ایک ایک کر کے گرے۔

لاتعداد لفافے سب کے سب بند ـــــ نام پتہ سے عاری۔ صرف ایک لکیر ـــــ جو نیچے بھی جاتی تھی اور اوپر بھی ـــــ آنکھیں خوردبین بن سکیں تو وہ بھی غائب۔

حملہ آور ہواؤں کے بیچ میں نے جس تس کر کے لفافوں کو سمیٹنا شروع کیا۔ چھوٹا سا ڈھیر بنایا۔ لیکن ڈھیر بنتے ہی سارے لفافے سرک سرک کر بھاگے۔

پھر سے دوڑ دوڑ کر انھیں سمیٹا۔ ڈھیر بنایا اور پھر سب کے سب سرکنے لگے۔

کئی بار جب ڈھیر بنا کر تھک گیا اور لفافوں کے فرار کا عمل بدستور جاری رہا

تو ناچار باچھوں کی طرف بار بار لپکتی ہوئی انگلیوں کی زبان تراش ڈالی۔ لفافوں کو جیب میں رکھنا چاہا لیکن ایک رکھتا تو دوسرا سرکتا، دوسرا رکھتا تو پہلا سرکتا، پہلا رکھتا تو دوسرا سرکتا.... یوں تیسرے کی باری آئی ہی نہیں....

(حملہ آور ہوائیں بدستور چل رہی تھیں)

پہلو بدلا۔ جلبلاہٹ ناقابل برداشت ہوگئی تو ایک ایک کرکے سارے لفافوں کو پھاڑنا شروع کر دیا۔ ان گنت لفافوں کو پھاڑتے ہوئے جانے کتنی صدیاں گذریں۔ اور چند لمحوں کے لئے رک کر جائزہ لیا تو سارے کے سارے پھٹے ہوئے ٹکڑے الگ الگ مکمل لفافوں کی شکل میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے جیوں کے تیوں موجود تھے۔

پھر پہلو بدلا اور غصے میں پھر سے انھیں پھاڑنا شروع کیا اور پھر جانے کتنی صدیاں گذریں اور چند لمحوں کے لئے رک کر پھر جائزہ لیا تو سارے کے سارے پھٹے ہوئے ٹکڑے پھر سے....

نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں.... عریاں زمین پر لیٹ گیا اور گہری نیند میں سو رہا۔ اچانک آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ بہت ساری انگلیوں نے بہ یک وقت چاروں طرف سے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ سارے کے سارے لفافے جسم سے لپٹے ہوئے مجھے اٹھا رہے تھے۔ اور لیٹر بکس کی تلاش پر اکسا رہے تھے۔

غصے میں انھیں پکڑ پکڑ کر پھر سے پھاڑنا شروع کیا اور جانے کتنی صدیاں گزریں کہ چند لمحوں کے لئے رک کر جائزہ لیا سارے کے سارے پھٹے ہوئے ٹکڑے پھر سے مکمل لفافوں کی شکل میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے جیوں کے تیوں موجود تھے۔

اور اب چاروں طرف سے مجھے اپنے نرغے میں لیتا ہوا لفافوں کا ٹھاٹھیں مارتا بے قابو اژدہام سامنے تھا۔

انگلیاں شل ہو چکی تھیں۔

گم گشتہ سمتوں کے ہانپتے ہوئے آخری سرے دم توڑ رہے تھے حملہ آور ہوائیں بدستور چل رہی تھیں ـــــ گرد و غبار اچھالتے ہوئے زوردار جھکڑ چلنے لگے۔

سارے لفافوں کو چھوڑ کر تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھ گیا ـــــ کچھ ہی دور جانے کے بعد غیر ارادی طور پر پیچھے کی جانب مڑا تو سارے کے سارے دیوہیکل لفافے دوڑتے ہوئے میرا تعاقب کر رہے تھے اور میں رو رہا تھا اور مسکرا رہا تھا کہ بس چند ہی قدم آگے ایک آوارہ دریا بہہ رہا تھا اور سطح آب پر کمبل پوش کے ڈوبتے اُبھرتے ہوئے قہقہے گونجتے ہوئے دم توڑ رہے تھے۔

ٹوٹتے لمحوں کا دُکھ

(شفق)

میری بات سُنو! آگے مت بڑھو کہ تم جس کا تعاقب کر رہے تھے وہ پیچھے ہی چھوٹ چکا ہے۔

وہ دیر سے چیخ رہا تھا اور اب تو چیختے چیختے اُس کی آواز مضمحل ہوتی جا رہی تھی۔ اور میرے قدم برابر زمین نگلنے میں مصروف تھے میں اُس کی چیخیں دیر سے سُن رہا تھا لیکن سوال تو یہ ہے کہ ...

کبھی کُتوں کے بھونکنے سے بھی قافلے رُکے ہیں؟

قافلے — کُتے — اور میر کارواں ....

قافلے اور کتوں کا رشتہ تو ازل سے قائم ہے اور ابد تک رہے گا اسے کوئی بھی یکسر نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ کُتے جو کسی منہدم دیوار کے سائے میں سکون سے آنکھیں موندے بیٹھتے ہیں، کسی آہٹ پر چونک کر آنکھیں کھولتے اور غرّانے لگتے تو ان کا غرّانا نیند کے خلل کا سبب بھی ہو سکتا ہے اور گُم رہی کی علامت کا بھی۔

اس کا فیصلہ تو کوئی میر کارواں ہی کر سکتا ہے لیکن افسوس ..... اُس نے اپنی اہمیت کھو دی ہے۔ اس پر کسی کو اعتماد نہیں رہا کہ اب تو وہ خود رہبری کا محتاج ہے جس نے کہا تھا،" میں تین آنکھوں والا ہوں میری تیسری آنکھ کی وسعت لامحدود ہے میں آنے والے خطرے کا سد باب قبل ہی کر لیتا ہوں"۔ لیکن سب نے دیکھ لیا کہ سوائے ایک بار کے جب اُس نے کہا تھا، "اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے اُس پار دُشمن کی فوج ہے تو تم یقین کر لو گے اور لوگوں نے اقرار میں سر ہلا دیا تھا"۔ اُس نے ہمیشہ راہ گم کی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زمین کو نگلنے والے قدم نگلتے ہی رہے ہیں اور تب ہی ایسا ہوا ہے کہ کسی

منہدم دیوار کے سائے سے چونک کر کوئی کتا اٹھتا ہے اور ....
میری بات سنو آگے مت بڑھو کہ ...
میں پیچھے پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن نہیں دیکھوں گا کہ میری آنکھیں سیکڑوں بار کی سُنی سُنائی اور دیکھی بھالی کہانی پھر سُنیں اور دیکھیں گی اور پھر وہ سیاہ ناگ جو اپنا پھن پھیلائے تیزی سے آگے بڑھتا آ رہا ہے اگر میں اُس کی زد میں آ گیا تو وہ میرے ذہن میں اپنا پھن گاڑ دے گا اور غصے میں نوچ نوچ کر گوشت کھانے لگے گا پھر میں اُس سے کیسے چھٹکارا پاؤں گا۔

کون نجات دلائے گا ؟

میر کارواں ؟

اس نے تو ہمیشہ راہ گم کی ہے۔ قافلے کو کسی ایسے مقام پر لا کر خود لاپتہ ہو گیا ہے جہاں سے کسی طرف کوئی راہ نہیں جاتی اور جب اُن کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں تو اُنھیں میں سے کوئی جیالا ہمت کر کے آگے بڑھتا ہے۔ سب کا شانہ پکڑ کر ہلاتا ہے۔ اپنی قمیص پھاڑ کر بانس پر ٹانگتا ہے تب اُس کے نہ کہنے پر بھی لوگ اسے راہ بر مان لیتے ہیں اور اس کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ اُس اُمید کے ساتھ کہ اب منزل ضرور ملے گی لیکن .... تھوڑی دُور کی رہبری ہی اُس کی نظریں بدل دیتی ہے۔ اور وہ دوسروں کی طرح اچانک اس طرح غائب ہو جاتا ہے کہ قافلے والوں کو اس کا علم اس وقت ہوتا ہے جب تنگ و تاریک راہیں ان کا استقبال کرتی ہیں .... تب وہ اُسے آوازیں دیتے ہیں لیکن آوازوں کی گونج خود اُن کا مُنھ چڑھاتی ہے۔ تب وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتے ہیں۔ ٹھوکر لگتی ہے، پاؤں اور پیشانیاں لہولہان ہوتی ہیں۔ گرد چہرے کا مقدر بنتی ہے زخموں کا ناسور بنتا ہے اور پھر ایک طویل مدت تک ناسور اُن کی راتوں کی نیندیں حرام کیے رہتا ہے۔

میں نے کُتوں کی آواز پر رُکنا نہیں سیکھا کہ ان کا بھونکنا اس کی علامت ہے کہ ایک بار پھر میر کارواں گم رہی کے راستے پر گامزن ہے اور اس کا وجود لُبھاتی ہے۔

آگے مت بڑھو، تم جس کا تعاقب کر رہے تھے وہ پیچھے چھوٹ چکا ہے اور...

اور...

کیمپوں کے باہر تپتے ہوئے ریگستان کا لامحدود سلسلہ... اور پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے...

جب میں پیٹ سے زمین نگلنے لگا تھا تو میرا رُخ کیچڑ کی طرف تھا۔

ماں کی آنکھیں خوف سے پھٹی رہ گئی تھیں اور حلق سے نکلنے والی چیخ نامکمل تھی پھر وہ جھپٹ کر میرے پاس آئی اور میرا شانہ پکڑ کر میرا رُخ خشکی کی طرف کر دیا تھا.... لیکن کچھ ہی دیر بعد میرا رُخ بدل گیا۔ یہ دیکھ کر اُس کا چہرہ دُھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا مجھے تو یاد نہیں ماں نے کہا تھا۔ ابتدا ہی میں میرے مُنھ سے کیچڑ کے ذرات اُڑنے لگے تھے۔

تب پریشانی میں اُس نے بال نوچ ڈالے تھے۔

اور جب میرے تلوؤں نے زمین کو نگلنا شروع کیا تو ہمیشہ ہی سوکھی زمین سے کتراتا رہا اور دانستہ کیچڑ بھری راہیں تلاش کرتا رہا، تب ماں کی آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگائی اور ہونٹ سوکھے رہے۔ اور پھر جلد ہی کھاری مٹی کی غذا بن گئی۔

کیسے؟

کسی نے مجھے نہیں بتایا۔ میں سب کا دامن پکڑ کر پوچھتا۔ تم کچھ جانتے ہو۔ تم کچھ بتا سکو گے؟ لیکن سب کی خالی آنکھیں میری طرف اُٹھتیں اور میرے ہاتھ سے دامن چھوڑ جاتا۔

بات تیری کی۔ میں نے غلاظت کے ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر اُن لفظوں کو تلاش کیا جو مُدّت سے اُس میں چھپے ہوئے تھے اور جب الفاظ وافر مقدار میں اکٹھا ہو گئے تو اُن کی گٹھڑی بنائی اور اپنے شانے پر رکھ کر زمین نگلنے لگا۔

میں مسافر ہوں... میں سفر کرتا ہوں۔

میں سوداگر ہوں الفاظ بیچتا ہوں۔ انمول الفاظ۔ تمھیں ضرورت ہے؟ جیسے

ضرورت ہو خریدئے ...

جو سفر کرنا چاہتا ہے میرے ساتھ چلے کہ میں اپنی بھیڑ سے بچھڑا ہوا ہوں۔ شانے پر وزنی بوجھ ہوتے ہوئے بھی میں زمین نگل رہا ہوں۔ میں نے اپنی قمیص پھاڑ کر بانس پر نہیں لٹکائی .... میں نے ... میں نے تو اپنی قمیص میں اُن لفظوں کو اکٹھا کیا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ تم جس کا تعاقب کر رہے تھے وہ پیچھے چھوٹ چکا ہے۔

میری پیاس اور شدت اختیار کر چکی ہے لیکن .... سخت حیرت ہے۔ آخر اس کا پتہ اسے کیسے چلا کہ میں کسی کا تعاقب کر رہا ہوں ؟

وہ سفید پوش سفید ریش جھکی کمر والا بوڑھا آگے ہی جا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں زرّیں گلاس بھی ہے۔ جس میں لبالب بھرا ہوا ٹھنڈا پانی موجود ہے۔ پھر کیا میں (Exploit) کیا گیا ہوں۔ میر کارواں اور سفید ریش ؟

دائیں آنکھ کھولوں بائیں بند کروں۔ بائیں کھولوں دائیں بند کروں۔ دونوں آنکھیں تو میری ہی ہیں۔

پیچھے پلٹنے میں سیاہ ناگ کا خطرہ ... مگر دوسری طرف اس کی چیخوں کا مطالبہ ہے کہ میں پیچھے پلٹ کر دیکھوں آخر وہ کون ہے ؟ اور ایسی بات اُسے کیسے معلوم ؟

اور پھر یوں ہوا کہ میرے پیچھے مڑتے ہی زمین پیروں کے حلق میں اٹک گئی، میرا جسم ساکت ہو گیا۔ بس نظریں اپنے حلقوں میں گردش کر سکتی تھیں اور میری نظریں ایک دائرہ بناتی ہوئی اپنے شانوں پر آرکیں۔

اس ذخیرے میں کوئی لفظ مفہوم کی چمک سے واقف ہے ؟

عقب والے سفید ریش کی حالت بہت خراب تھی اور میں اسے چھوڑ کر آگے بڑھ چکا تھا۔ آگے اور پیچھے کی صورتوں میں تضاد تو نہیں لیکن گلاس میں فرق ضرور ہے۔ نئے پُرانے کا فرق ... چمک اور دُھند کا فرق ...

وہ لمحے جو مصلوب ہو جائیں ... وہ بجلیاں جو تمازت کھو دیں ... وہ سرکش موجیں جو قدم چوم لیں تو قدم فاصلے نگلتے ہی رہتے ہیں۔

جب مسلسل حرکت ہی نصب العین قرار پایا تو پھر اس سفید ریش کی باتوں کا کیا؟ مصلوب لمحے، قدموں تلے روندی موجیں، قدموں کے حلق میں اٹک نہیں سکتیں۔

کیا اتنی سی بات میر کارواں کو معلوم نہیں کہ یہ صحرانوردی سے نہیں خلانوردی سے پیشانیاں روشن ہیں، ٹوٹتی بکھرتی دیواروں سے اُڑتی دھول پیچھے کی طرف مُنھ کالا کرنے دوڑ رہی ہے اور گری دیوار کی نیو سے روشنی کی طلوع ہوتی قندیل ...

تو پھر کتّوں کے بھونکنا سے کارواں کیوں رُکے۔

عقب والا سفید ریش چیختے چیختے بے دم ہو کر رُک گیا تھا۔ اور آگے والا مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہا تھا۔ اچانک اُس نے جست لگائی اور ..... ایک گہری خلیج عبور کر کے دوسری چٹان پر پہنچ گیا۔

اتنی لمبی چھلانگ اور اُس کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ .... اور میرے حلق میں کانٹوں کی فصل ... کیا میں یہ خلیج عبور کر سکتا ہوں۔؟

نہیں کبھی نہیں ... عقب والے نے چیخ کر روکنا چاہا لیکن آگے والے کی آواز اُس پر حاوی ہو گئی۔

کیا تم نے اس سے پہلے بھی خلیجیں عبور نہیں کی ہیں؟ سب ایک جست اور پھر ... تب بھونکنے والے کُتّے کسی منہدم دیوار کے سائے میں مُنھ چھپالیں گے، یقین کرو ہمیشہ ہی ایسا ہوا ہے، لگاؤ چھلانگ ورنہ سیاہ ناگ تمھارے ذہن کا گوشت ...

نہیں ... نہیں ... تب میں نے ایک بار فاصلے کا تعین کیا اور پھر ..

اور جب میری آنکھیں کُھلیں تو میں دونوں چٹانوں کے درمیان خلا میں اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھوں نے دونوں چٹانوں کو تھام رکھا تھا اور درمیان کی کھائی اتنی گہری تھی کہ ..

ہمت کر کے آگے بڑھو ...

میں .... تمھاری چٹان پر نہیں چڑھ سکتا۔ مجھے سہارا دو میرے محسن ورنہ ..

اب میں اتنا بے وقوف نہیں کہ تمھارے قریب آؤں۔ اگر تم نے مجھے دبوچ لیا تو ..... وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ کر میرا انتظار کرنے لگا۔

خُدا کے لئے میری مدد کرو، مجھے اپنی طرف کھینچ لو ... میں نے عقبی سفید ریش سے التجا کی مگر اُس نے افسردگی سے سر ہلا دیا۔ "تم ہماری سرحد سے آگے بڑھ چکے ہو نادان لڑکے۔"

تو پھر کیا میں یوں ہی لٹکتا رہوں گا؟؟

پیوند کاری

عبد الصمد

گھوش بابو ـــــــ تارک ناتھ گھوش، مقامی اخباروں میں فری لانسنگ کرتے تھے۔ خبروں سے لے کر سیاسی اور سماجی مضامین ایک ہی قلم سے لکھتے۔ وہ جس محلے میں رہتے تھے، وہ بابوؤں، چپراسیوں اور ڈرائیوروں وغیرہ کی آبادی پر مشتمل تھا۔ ہر آدمی اپنی مصروفیت میں گھرا ہوا اور اپنے آپ میں گم تھا۔ اکثر لوگ فاضل اوقات میں اوور ٹائمنگ کرنے میں اپنی نجات سمجھتے اور بال بچوں کے ساتھ وقت گذارنے کے خواب کو بھی کسی اچھے وقت کے لئے اٹھا رکھتے گھوش بابو کو وہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ لوگ انہیں ماسٹر جی کہتے کیوں کہ جاڑوں میں وہ اکثر اپنے مکان کے برآمدے میں دھوپ میں بیٹھ کر بہت ساری کتابیں، رسالے اور اخبارات پھیلائے رہتے۔ شاید کسی زمانے میں ماسٹری کا کام پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھنا بھی رہا ہوگا اسی لئے جاہل سے جاہل آدمی کے ذہن میں بھی ماسٹر کا ایک دھندلا سا تصوّر محفوظ رہ گیا ہے۔ گھوش بابو کے پاس کبھی کوئی پڑھنے نہیں آتا تھا لیکن صرف پڑھتے لکھتے رہنے کی وجہ کر وہ مشہور تھے اور اگرچہ محلے میں ان کی کوئی جان پہچان نہیں تھی، پھر بھی آتے جاتے، جب بھی ان پر کسی کی نگاہ پڑتی تو دیکھنے والے کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ انہیں سلام کرے۔

گھوش بابو خود بھی الگ تھلگ رہنے والے ایک گوشہ نشیں قسم کے آدمی تھے۔ میل جول بڑھانے کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ یوں شہر اور محلے کے سارے مسائل کی انہیں خبر رہتی اور وہ اخباروں میں بھی یہ چیزیں لاتے رہتے۔ اخباروں کا پابندی سے مطالعہ کرنے

والے ان کے محلے، اس کے مسائل اور خود گھوش بابو سے اچھی طرح واقف تھے۔ گھوش بابو کو افسوس تھا تو بس یہی کہ خود ان کے محلے والوں کو اپنے مسائل کی بالکل خبر نہیں تھی۔ اخبار تو وہاں آتا ہی نہ تھا۔ گھوش بابو کے پاس ڈھیروں اخبار اور رسائل آتے۔ گھوش بابو کو سبھی اخبارات پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور گھر میں کوئی تنہا ہی نہیں، صرف ایک بوڑھا نوکر تھا جو نجانے کب سے ان کے پاس تھا اور خدا کی ایک ہی مخلوق تھا۔ گونگا تو وہ تھا، بہرہ بھی تھا۔ نہ کسی سے بولنا نہ چالنا، بس اپنے کام میں لگا رہتا۔ گھوش بابو اس سے بہت خوش تھے۔ وہ وقت پر انہیں بجائے، ناشتہ، کھانا دے دیتا۔ گھر کی صفائی کرتا، اخبارات اور رسائل سمیٹ سمیٹ کر رکھتا اور ان کی غیر موجودگی اور موجودگی، دونوں صورتوں میں مستعدی کے ساتھ گھر کی حفاظت کرتا۔ ویسے دنیا بھر کے چوروں کو یہ خبر تھی کہ اس گھونسلے میں مانس نہیں ہے۔

گھوش بابو نے اپنے رسوخ سے محلے کی لائبریری میں دو تین اخبارات اور دو ایک رسالے جاری کر دیئے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہاں کوئی نظر ہی نہ آتا تھا ایک لائبریرین کے سوا۔ جو کارپوریشن کا تنخواہ دار تھا۔ وہ لائبریری کی صفائی ستھرائی پر تو بہت دھیان دیتا لیکن اسے لکھنے پڑھنے کی بالکل فرصت نہیں تھی اور نہ یہ بات اس کے فرائض میں شامل تھی۔ نہ وہ اخباروں، رسالوں اور کتابوں کو سجا سجا کر رکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ گھوش بابو کبھی کبھار اس طرف جا نکلتے تو لائبریرین کو لوگوں کو اس طرف راغب کرنے کے لئے بہت سے گر بتاتے۔ وہ ان کی نصیحتوں کو بہت غور سے سنتا اور ہر بار ہاتھ جوڑ کر بس ایک ہی جواب دیتا۔

" گھوش بابو، آپ پڑھے لکھے آدمی ہو، تم چار آدمی کو بھی پکڑ کر لا سکتے ہو۔ میری کون سنے گا۔ اور پھر یہ تو میرا کام بھی نہیں۔"

گھوش بابو سوچنے لگتے کہ وہ چار آدمی کون ہو سکتے ہیں جنہیں وہ پکڑ کر لائیں۔ سوچتے سوچتے کافی دیر ہو جاتی یہاں تک کہ جمائی لیتے لیتے عاجز آ کر لائبریرین مقررہ وقت سے قبل ہی لائبریری بند کرنے کے لئے کتابیں سمیٹنے لگتا۔

گھوش بابو اپنے محلے کی گندگیوں اور کارپوریشن کی نااہلی کے بارے میں جب دو چار بار اخباروں میں لکھتے تو ایک آدھ بار کارپوریشن کے عملے بھی صفائی کے لئے آدھمکتے محلے والوں کو یہ چیز سخت ناگوار گزرتی۔ یہاں انہیں سب سے بڑی سہولت یہ حاصل تھی کہ انہیں کوڑے کرکٹ پھینکنے کے لئے دو قدم بھی نہیں چلنا پڑتا تھا۔ وہ ہفتوں، مہینوں مزے سے اپنے گھروں کے سامنے کوڑے پھینکتے رہتے۔ گھوش بابو کا منہ بند کرنے کے لئے صفائی کے عملے جگہ جگہ کوڑے دان رکھ جاتے جن میں کوڑے ڈالنے کے لئے دو چار روز تو جانا ہی پڑتا۔ پھر پرانی روش شروع ہو جاتی۔ کوڑے دان کا پیٹ بھرنے کی نوبت کبھی نہ آتی اور کوڑے پھر گھروں کے سامنے جمع ہونے لگتے۔ ان کا انبار لگ جاتا تو بچے کھیلنے کے لئے ان کی پہاڑیاں سی بنا لیتے۔ ان کی دھاچوکڑی سے کوڑے کے انبار راستوں پر پھیل جاتے اور گھوش بابو جیسے لوگوں کو چلنے پھرنے میں اتنی تکلیف ہوتی کہ وہ مجبور ہو کر، گندی کے خلاف لکھنے پر آمادہ ہو جاتے صفائی کے عملے جب اپنے ٹریکٹر لے کر آتے تو ایسا لگتا جیسے محلے پر کسی دشمن کی فوج نے اچانک حملہ کر دیا ہو۔ وہ چیخ پکار اور بھاگ دوڑ مچتی کہ توبہ بھلی۔ عورتیں ٹاٹ کے پردوں سے لگی اداس اداس سی تماشے دیکھتی اور بچے ٹریکٹروں پر چڑھنے کے شوق میں شور مچاتے اور عملوں سے مار اور گالیاں کھاتے۔ صفائی کے بعد محلہ بڑا پھیکا پھیکا سا بے رونق دکھائی دیتا۔ دو چار دن یہ کیفیت رہتی، پھر زندگی اپنے معمول پر آجاتی۔ گھوش بابو کے گھر کے آگے ان کا کوڑا تو نہیں ہوتا کہ انہوں نے اپنے نوکروں کو سختی سے ممانعت کر رکھی تھی لیکن جب دوسری طرف کی جگہ کوڑے کے انبار سے بھر جاتی تو پھر کوڑا آہستہ آہستہ بڑھ کر گھوش بابو کے دروازے کی طرف چلا آتا اور گھوش بابو کا لگنے لگتا اور خود گھوش بابو کو اسے پھلانگ کر آنا پڑتا۔ اس صورت حال پر ان کا بس ہی کتنا تھا۔ غنیمت تھا کہ وہ لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

گھوش بابو کی زندگی اسی محور پر دیر تک گھومتی رہتی، شاید اسی طرح یہ گھوم کر ایک دن رک بھی جاتی کہ ان کے فلیٹ سے لگے فلیٹ میں ایک نیا کرایہ دار آگیا اور گھوش بابو کو

مجبوراً اسے قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ نیا کرایہ دار بھی انہیں کی طرح تنہا تھا بلکہ اس سے بھی سوا کہ اس نے اپنے آگے پیچھے نوکر وغیرہ کا دم چھلا بھی لگا رکھا تھا۔ گھوش بابو کو پہلی ہی نگاہ میں وہ شکل وصورت، چال ڈھال اور اطوار وانداز سے وہ بہت پُراسرار معلوم ہوا اور وہ اس کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

وہ روز صبح اپنی کھڑکی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے۔ دھوتی، کرتا، بے ترتیب داڑھی اور سر کے بال ——— اس کے ہاتھوں میں کاغذات کا ایک بلندہ ہوتا اور وہ ہمیشہ جلدی جلدی بھاگتا ہوا نظر آتا۔ دن بھر اس کے فلیٹ میں تالہ لٹکا ہوا رہتا۔ پتہ نہیں رات میں کس وقت وہ آتا تھا۔ گھوش بابو کے گھر کا دروازہ اس سے پہلے ہی بند ہو جاتا۔ صبح میں کھڑکی سے اسے جاتے دیکھ کر ان کی خواہش ہوتی کہ وہ اسے روکیں، لیکن ان کے سوچتے سوچتے وہ ان کی دسترس سے نکل جاتا۔ محلے میں وہ کسی سے اس کے بارے میں کیا پوچھتے، وہ تو خود انہیں بھی نہیں جانتے تھے۔ نوکر بے چارہ گونگا بہرہ تھا، وہ بس ان کی لکھی ہوئی فہرست کے مطابق کھانے پینے کا سامان بازار سے لے آتا تو یہی بہت غنیمت تھا۔

اتفاق سے گھوش بابو ایک صبح چہل قدمی کے لئے نکل ہی رہے تھے کہ پاس کے فلیٹ کے نزدیک دو تین افراد دکھائی دیے۔ گھوش بابو کو دیکھ کر وہ ان کی طرف لپکے۔

"شیام جی گھر پر کس وقت رہتے ہیں؟"

کون شیام جی؟"

آپ کے پڑوسی ہیں۔ شیام بندھیا دھیا۔ آپ نہیں جانتے۔؟"

"سمجھا، میں روز سویرے ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ آپ نے بتایا تو معلوم ہوا کہ وہ شیام جی ہیں۔ شیام بندھیا دھیا۔ کیا کرتے ہیں وہ ؟"

"ا جی کام تو وہ کارپوریشن میں کرتے ہیں لیکن دن رات فقیروں کے ساتھ گھومتے ہیں۔ پاگل۔"

گھوش بابو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ان لوگوں کا منہ تکتے رہے۔

"جب آپ انہیں جانتے ہی نہیں تو پھر کچھ کہنے سے کیا فائدہ ؟"

"نہیں، نہیں، آپ کہئے، میں ان سے مل کر آپ کا پیغام پہونچا دوں گا۔"

"گھوش بابو فوراً سمجھ گئے تھے کہ یہ موقع ضائع کرنے کا نہیں ہے۔

" دھنیہ واد "۔ کہ دیجئے گا کہ یونین کے لوگ آئے تھے۔ ان کا چندہ باقی ہے۔ بس آج ہی کل میں پہونچا دیں۔ نہیں تو انہیں یونین سے نکال دیا جائے گا"۔

گھوش بابو نے اسی وقت سے شیام بندوپادھیا کا انتظار شروع کر دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دن بھر انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو انتظار سے نہیں روک سکے اور انتظار میں مبتلا رہ کر انہوں نے کوئی کام ہی نہیں کیا۔ رات کا کھانا دیر سے کھانے کے بعد بھی دیر تک وہ باہر ٹہلتے رہے۔ لیکن انہیں شیام جی تو کیا، ان کا سایہ بھی نظر نہ آیا۔ آسمان پر بادل گھر آئے اور دیکھتے دیکھتے بہت تیز بارش ہونے لگی، اور گھوش بابو کو اندر آنا ہی پڑا۔ میز پر کام کرتے کرتے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی، اچانک ایک ضرورت سے ان کو اٹھنا پڑا۔ گھڑی رات کے تین بجا رہی تھی۔ انہوں نے باہر نکل کر پڑوس میں جھانکا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ گھوش بابو خوش ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اب انہیں نہیں سونا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ اپنی میز پر بیٹھ گئے اور اسی وقت اٹھے جب مرغ نے پہلی اذان دی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آئے۔ ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا ایک اس کی کوکھ سے ننھی ننھی سی صبح جنم لیتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے پڑوس میں دستک دی۔ دروازہ کھلا شیام بندوپادھیا، صرف ایک دھوتی باندھے کھڑے تھے۔ گھوش بابو کو دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔

"آئیے۔ آئیے۔ میں کھانا پکا رہا تھا"۔

"دیکھئے میرا نام تارک ناتھ گھوش ہے۔ فری لانسنگ کرتا ہوں، آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں۔"

"اوہ، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ جرنلسٹ تو ہمارے سماج کا وہ حصہ ہیں کہ اگر

اگر یہ نہ ہوں تو پھر ہمیں اپنے آپ کبھی خبر نہ ملے۔"

"خوشی ہوئی کہ آپ ہم لوگوں کے بارے میں اتنا اچھا خیال رکھتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔ آپ شاید کارپوریشن میں کام کرتے ہیں۔"

"ہاں جی گھوش بابو، روٹی تو کسی طرح کمانا ہے نا آخر۔"

شیام جی کے لہجے کا گھوش بابو کوئی مطلب نہیں نکال سکے۔

شیام جی نے اسٹوو پر سے چاول اتار کر ان کے لئے چائے تیار کی۔

"دیکھئے گھوش بابو! میں آپ کو کھانے کو اس لئے نہیں کہہ رہا کہ میں جس وقت کھانا کھاتا ہوں، اس وقت تو ناشتہ بھی نہیں کیا جاتا۔ لیکن میں بھی کیا کروں، ایک ہی بار کھاتا ہوں، اتنی فرصت نہیں کہ بار بار کھانا بناؤں، اتنے پیسے نہیں کہ ہوٹل میں کھالوں۔"

"شیام جی، آپ تو کارپوریشن میں کام کرتے ہیں، پھر آپ کی اتنی مصروفیت کیوں ـ ؟"

"میں نے آپ سے کہا کہ نوکری میں روٹی کے لئے کرتا ہوں اور کام اپنے لئے۔"

کام کا ذکر کئی بار ہوا لیکن شیام جی نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ کون سا کام ——

گھوش بابو نے چائے ختم کی تب تک شیام جی نے کھانا بنا لیا تھا۔ گھوش بابو باہر نکل آئے، تب انہیں خیال آیا کہ انہوں نے ان سے وہ بات تو کہی ہی نہیں جس کے لئے وہ گئے تھے وہ دروازے کی طرف مڑنے والے ہی تھے کہ انہوں نے سوچا، بار بار کسی کے ہاں جانا مناسب نہیں۔ شیام جی اب کھانا کھا رہے ہوں گے، پتہ نہیں، وہ انہیں دیکھ کر شرمندہ ہو جائیں —— وہ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے۔

شیام بندوپادھیا سے ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ اپنے آپ کو بہت عقل مند اور ہوشیار سمجھتے ہوئے بھی اس شخص کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ تجسّس انہیں کارپوریشن کے دفتر کی سیر بھی کرا لایا۔ دفتر میں انہیں صحیح الدماغ آدمی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ دفتر کے ساتھی کھلم کھلا ان کا مذاق اڑاتے لیکن وہ ایک مسکراہٹ میں ساری بلا ٹال جانے کا فن جانتے تھے۔

تعلقات سب سے اچھے تھے لیکن دوستی کسی سے نہیں تھی۔ وہ چھٹی کے اوقات میں اچانک غائب ہو جاتے لیکن ڈیوٹی پر وہ انسان آنے والی اچانک مصیبت کی طرح نازل ہو جاتے کچھ لوگوں کا ان کے بارے میں یہ بھی خیال تھا کہ وہ ایک پاگل شخص ہے جسے پیسے جمع کرنے کی ہوس نہیں، بیماری ہو گئی ہے، اسی وجہ سے اس نے شادی نہیں کی، اس کا دور نزدیک کا کوئی بھی رشتہ دار نہیں، اس کو کسی سے دوستی نہیں، کہیں آنا جانا نہیں۔ کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے کہ وہ فاضل اوقات میں فقیروں کے ساتھ بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ اس لئے اس نے شکل وصورت میں کچھ ایسی ہی بنائی ہے۔ اتنے بڑے شہر میں بھیک مانگنے سے زیادہ نفع بخش پیشہ اور کون ہو سکتا ہے؟ ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا، یہاں تو اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ فاضل اوقات میں بڑے بڑے ہوٹلوں میں بیرے کا کام کرتے ہیں تاکہ دھنی لوگوں سے زبان بول کر خوب ٹپ وصول کر سکیں۔

گھوش بابو کو یہ باتیں بڑی عجیب لگ رہی تھیں۔ اگرچہ انسانوں سے زیادہ ان کے مسائل کو پڑھا وہ جانتے تھے، پھر بھی مسائل کے تعلق سے انسانوں سے ان کی قربت تھی۔ مگر اب تو ایک عجیب ہی انسان ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا جو ان کی دسترس سے باہر جا رہا تھا شیام جی سے کئی بار انہوں نے گھما پھرا کر پوچھنے کی کوشش کی اور شیام جی نے ہمیشہ انہیں ایسے جواب دیئے کہ ان میں اور کچھ ہوتا ہو لیکن گھوش بابو کے سوال کا جواب ہرگز نہیں ہوتا تھا۔

ایک شام کو وہ اپنا مضمون بیچ کر ایک اخبار کے دفتر سے نکلے تو سڑک پر غیر معمولی بھیڑ تھی، جس کے سبب ٹریفک کا اژدہام ٹس سے مس ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سڑک کراس کرنے کے لئے وہاں پر ایک پل بھی تھا لیکن گھوش بابو اس کو کبھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ پچیس سیڑھیاں چڑھنا اور پچیس سیڑھیاں اترنا انہیں بہت کھٹن لگتا۔ ایک آدھ بار انہوں نے یہ غلطی کر ڈالی تھی تو گھنٹوں ان کی سانس معمول پر نہیں آ سکتی تھی۔ ٹریفک کو جیوں کا تیوں دیکھ کر وہ کچھ دیر یونہی کھڑے سوچتے رہتے۔ پھر

ہمت کر کے چھبیس سیڑھیاں چڑھ گئے۔ ابھی وہ پل پر دو چار قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ اچانک انہوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ پل کے اوپر ہی ایک بے حد میلا کچیلا فقیر ضعف اور نقاہت کے مارے آنکھیں موندے پڑا تھا اور اس کے سرہانے شیام جی شیام بندوپادھیا بیٹھے ایک پیالے سے کوئی عرق چمچہ چمچہ کر کے اس کے منہ میں ڈال رہے تھے۔ گھوش بابو حیرت سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ شکل و شباہت سے شیام جی بھی کوئی فقیر ہی لگ رہے تھے۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مستغرق تھے کہ انہیں گھوش بابو کی موجودگی کا مطلق احساس نہیں ہوا۔ گھوش بابو نے بھی انہیں نہیں چھیڑا اور چپ چاپ واپس اتر گئے اس وقت انہیں تھکاوٹ کا بالکل احساس نہیں ہوا۔ انہوں نے بہت دنوں کی جستجو اور تگ و دو کا راز پالیا تھا۔ انہوں نے شیام جی کے بارے میں بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ کوئی بہت ہی عجیب ، پُر اسرار آدمی ، لیکن یہ تو بہت معمولی آدمی نکلا بہت ہی معمولی

کئی روز تک وہ شیام جی سے دور ، شیام جی کے خیال کو اپنے تصور سے جھٹکنے کی کوشش کرتے رہے ، لیکن اس کوشش میں شیام جی کا خیال ان سے چمٹ گیا ۔ انہیں اس معمولی آدمی سے خوف آنے لگا جو نامعلوم راستوں سے ان کے اندر جڑیں مضبوط کرتا جا رہا تھا۔ انہوں نے شیام جی سے دور بھاگنے کے بہت جتن کئے ، انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش کی ، ان سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ شیام جی کا معمول اپنی جگہ پر تھا ۔ وہی صبح سویرے جانا ، رات گئے لوٹنا ، ایک دو بار انہوں نے گھوش بابو کو آواز بھی دی لیکن انہوں نے دروازہ نہیں کھولا ۔ گونگا بہرہ نوکر تو کسی کی کچھ سنتا ہی نہ تھا ۔

ایک صبح یہ چہل قدمی کے لئے وہ گھر سے دور جا چکے تھے کہ اچانک شیام جی سامنے سے آنکلے ۔

"ارے کہاں رہتے ہیں گھوش بابو ۔ ملاقات ہی نہیں ہوتی ہے ؟"

"بھائی ، آپ ہی دن بھر غائب رہتے ہیں ، ملاقات ہو تو کیسے ؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں گھوش بابو۔ میں نے تو اپنے ذمہ کام ہی ایسا لگا رکھا ہے کہ ایک دم فرصت نہیں رہتی۔ آپ جیسے دوستوں کی میں بہت کمی محسوس کرتا ہوں۔"

گھوش بابو کے جی میں آیا، کہہ دیں، مجھے معلوم ہے، آپ کتنا بڑا کام کرتے ہیں۔ لیکن وہ چپ رہے۔

شیام جی کو تو ہمیشہ جلدی رہتی تھی، سو وہ اتنی بات کرکے چلے گئے لیکن دوسری صبح گھوش بابو نے اپنے آپ کو شیام جی کے فلیٹ کی گھنٹی بجاتے پایا۔ انہوں نے ایسا کبھی ارادہ نہیں کیا تھا لیکن کوئی چیز تھی جس سے مجبور ہو کر وہ یہاں تک کھنچ آئے تھے۔

شیام جی نے انہیں دیکھا تو بہت خوش ہوئے اندر لے گئے، اسٹو پر کھچڑی کی دیگچی چڑھی تھی۔ اور شیام جی ایک تسلے میں آلو کا بھرتہ بنا رہے تھے۔

"جی چاہتا ہے شیام جی کہ آج تو آپ کے ہاتھوں کا بنا کھانا کھاؤں۔"

"ارے گھوش بابو، یہ تو بڑی ہی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے مجھے اپنا سمجھا۔ اب تھوڑی دیر بیٹھیے۔ اتنی دیر میں کھانا تیار ہوا جاتا ہے۔"

"آج مجھے فرصت ہے شیام جی۔ میں اطمینان سے بیٹھوں گا۔"

شیام جی کے کمرے میں دیوار میں لگی کھلی الماری میں چند کاغذات اور فائل رکھے تھے۔ گھوش بابو ان فائلوں کو شیام جی کے ہاتھوں میں کئی بار دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے شیام جی سے پوچھا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں وقت گزاری کے لئے آپ کے یہ کاغذات دیکھوں۔"

"ضرور۔ ضرور۔ لیکن آپ انہیں دیکھ کر بہت بور ہوں گے۔ ان میں دلچسپی والی کوئی بات نہیں۔"

"شیام جی۔ میں جرنلسٹ ہوں، کوئی رومانی افسانہ نگار نہیں۔ میں دلچسپیوں میں یقین نہیں رکھتا۔"

"آپ ضرور دیکھیں یہ کاغذات شائد آپ کے کام ہی کی کوئی چیز نکل آئے۔"

شیام جی نے خود ہی ایک فائل اٹھا کر گھوش بابو کو دے دی۔

گھوش بابو نے فائل کھول کر ایک رجسٹر نکالا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ہر صفحے پر خانے بنے ہوئے تھے۔ اور ہر خانے میں نام، عمر، پتے اور بیماریوں کے نام درج تھے۔ دو تین ورق الٹنے کے بعد انہوں نے شیام جی کو دیکھا۔ وہ دیگچی میں سے ایک چمچہ چاول نکال کر دیکھ رہے تھے کہ کھچڑی گلی یا نہیں۔

"شیام جی، میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی فہرست ہے؟"

شیام جی نے قہقہہ لگایا۔ ہنستے ہنستے بولے۔

"بھئی ہماری تو یہی کہانیاں ہیں، یہی افسانے۔"

"گھوش بابو چپ چاپ ورق الٹتے رہے۔ سبھی ورق ایک جیسے تھے کھچڑی تیار ہو گئی تھی۔ ایک تھالی میں شیام جی نے گھوش بابو کے لئے کھچڑی نکالی۔ ایک ڈبہ سے گھی کا ایک چمچہ اس میں ڈالا اور کنارے پر بھرتہ رکھ کے ان کے آگے پروس دیا۔ ویسی ہی ایک تھالی انہوں نے اپنے لئے بھی نکال لی تھی۔ اتنے معمولی کھانے کے لئے ایک بار پھر انہوں نے معذرت کی۔ گھوش بابو کا کوئی نوکر بھی کوئی مزیدار کھانے نہیں پکاتا تھا اس لئے گھوش بابو ہر طرح کے کھانے کھا لیتے۔ دونوں نے خاموشی سے کھانا ختم کیا۔ ہاتھ دھونے کے بعد تولیہ سے خشک کرتے ہوئے شیام جی نے بہت ہی گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

گھوش بابو۔ میری فائل میں شہر کے سبھی فقیروں، بھیک منگوں کے نام پتے اور بیماریاں درج ہیں۔ میں نے بڑی محنتوں سے انہیں جمع کیا ہے۔ میں نے انہیں اپنی زندگی انہیں معذوروں اور بے سہاروں کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے۔ آپ کو پتہ نہیں کہ دنیا میں میرا کوئی رشتہ دار نہیں، پریوار نہیں، میری شادی نہیں ہوئی۔ ایک اناتھ آشرم میں میری پرورش ہوئی۔ میں بے سہارا اور بے یار و مددگار لوگوں کے

کرب کو اچھی طرح جانتا ہوں

گھوش بابو کے سامنے شیام جی کے اندر ایک دوسرا ہی شخص بیٹھا تھا جو گندے، الجھے بڑے بڑے بالوں والے دیوانے شیام جی سے بہت مختلف تھا۔ یوں گھوش بابو کو پہلے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ سامنے والے شیام جی کے اندر ایک اور شیام جی ضرور ہے۔ دوسرے شیام جی کو دیکھنے میں انہیں دیر ضرور لگی۔

"شیام جی، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ اتنے مصروف آدمی ہیں۔ لیکن آپ نے جس مقصد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے، اس کا حصول بہت کٹھن ہے۔ بھیک نے ایک غیر قانونی انڈسٹری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کے خاتمہ کے لئے ایک لمبی لڑائی کی ضرورت ہے۔"

"گھوش بابو، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن آپ جس انڈسٹری کی بات کر رہے ہیں ویسی ویسی تو کئی انڈسٹریز ہمارے ہاں ہیں جن کا قلع قمع کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تنہا کسی فرد کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے پورے معاشرے کو ایک ساتھ مل کر کوشش کرنی ہوگی۔ میرے جیسا معمولی اور تنہا آدمی تو اس کی ہمت کبھی نہیں کر سکتا۔ میں تو ان بھیک منگوں کی خدمت کرتا ہوں جو واقعی معذور ہیں، بے سہارا ہیں، جو بے بسی کے عالم میں سڑکوں اور گلیوں میں مرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اگر انہیں کی خدمت مجھ سے ہو جائے تو یہی بہت بڑی بات ہو ——— اچھا گھوش بابو، میں چلتا ہوں۔ آپ سے پھر باتیں ہوں گی۔"

شیام جی جس میلے کچیلے کپڑوں میں تھے، انہیں میں باہر آ گئے۔

گھوش بابو کے ذہن میں شیام جی ایسے جا کر بیٹھے کہ پھر نکلنے نہ نکلے۔ شیام جی کے بارے میں سوچتے ہوئے انہیں، پٹنہ میں گنگا کے کنارے ڈول سے پانی نکال کر پھینکتے ہوئے وہ پروفیسر یاد آ گئے جن سے ملنے کے لئے وہ ایک بار پٹنہ گئے تھے۔ پروفیسر بھیم دت چکرورتی سے وہ یونیورسٹی میں پڑھ چکے تھے۔ بنی نوع انسان کے درد کی انہیں جو بھی

واقفیت تھی، وہ پروفیسر حلکر ورتی ہی کی دین تھی۔ وہ ریٹائرڈ ہوکر پٹنہ جا بسے تھے۔ انہیں اطلاع ملی کہ پروفیسر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں، دن بھر گنگا کے کنارے بیٹھے پانی پھینکتے رہتے ہیں۔ رات میں کوئی انہیں پکڑ کر گھر لے آتا ہے اور کمرہ میں بند کر دیتا ہے۔ لیکن صبح ہوتے ہی وہ پھر نکل بھاگتے ہیں۔ گنگا کے کنارے ہی انہیں زبردستی کچھ کھلا دیا جاتا ہے ورنہ دن بھر وہ بھوکے ہی رہ جاتے ہیں۔ گھوش بابو جب وہاں پر پہونچے تو انہوں نے دور ہی سے دیکھا کہ ستر سالہ پروفیسر انڈر ویر پہنے ڈول سے پانی نکالنے میں میں چٹے ہوئے ہیں۔ جسم پر گوشت غائب ہے اور ہڈیوں میں بھی اب دم باقی نہیں گھوش بابو دور سے دیر تک یہ منظر دیکھا کئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس تصویر کا وہ کیا عنوان دیں۔ پروفیسر جب اپنے کام سے تھک جاتے تو کسی پتھر پر بیٹھ کر، لیٹ کر کچھ دیر سستا لیتے۔ پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔ آخر گھوش بابو ان کے پاس گئے۔ انہوں نے انہیں بالکل نہیں پہچانا اور اپنے کام میں مصروف رہے۔ گھوش بابو نے انہیں سلام کیا تو بولے۔

"دکھائی نہیں دیتا تمہیں، میں کتنا مصروف ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے بھی کوئی بیکار بے حس آدمی سمجھ رکھا ہے۔"

"سر، میں تو آپ کا شاگرد ہوں، آپ سے ملنے خاص طور پر آیا ہوں۔"

"اچھے شاگرد ہو کہ وہ کام نہیں کرتے جو میں کرتا ہوں۔ تم لوگ ملنے جلنے میں وقت کیوں ضائع کرتے ہو، وقت کا کوئی اچھا مصرف کیوں ڈھونڈ نہیں نکالتے؟"

پروفیسر کہیں پر سے پاگل دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ گھوش بابو نے پوچھا۔

"آپ نے کون سا کام ڈھونڈھ نکالا ہے سر۔ وقت ضائع کرنے کے سوا یہ اور کیا ہے؟"

پروفیسر نے کام روک کر ان کی طرف دیکھا۔

"بے وقوف۔ تم لوگوں کی سمجھ میں یہ چیز ہی نہیں آسکتیں۔ تم نے جو کچھ حاصل کیا

ہے ۔ وہ کتابوں سے، جنہیں میں مُردہ سمجھ کر بہت عرصہ قبل پھینک چکا ہوں ۔ تم لوگوں کے محسوسات کی تہ تک نہیں پہونچ سکتے ۔" پروفیسر اب پتھر پر آ بیٹھے تھے ۔

"تم جانتے ہو کہ گنگا کے پانی نے کچھ برس قبل میرے شہر میں کیا اندھیر مچایا تھا۔ جن کے مکانات پختہ اور دو منزلہ تھے ان کے لئے تو تفریح تھی ۔ ان کے لئے پانی کا نظارہ بہت خوب صورت تھا لیکن غریب، بے سہارا لوگوں کے لئے قہر ۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری سرکار نے شہر کے ان علاقوں کا تو نظر کر دیا جہاں پانی تفریح کا دوسرا نام تھا لیکن غریبوں کے لئے کچھ نہیں کیا ۔ یہ غریب مچھیرے آج بھی ہر سال تباہی کا انتظار کرتے ہیں ۔ اگر گنگا کے پانی کو خطرے کے نشان سے نیچے نہیں رکھا گیا تو ان مچھیروں کا کیا ہوگا ۔ ؟"

پروفیسر چکرورتی کے لہجے میں اس قدر سنجیدگی اور گمبھیرتا تھی کہ گھوش بابو ان کی بات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ۔

پروفیسر چکرورتی تو اپنے کام میں مصروف ہو گئے لیکن وہ گھوش بابو پر پہاڑ بن کر گر گئے ۔ گھوش بابو کئی دنوں تک اس پہاڑ کے نیچے دبے رہے ۔ کئی مہینوں کی کوششوں کے بعد جب وہ اس پہاڑ کے نیچے سے باہر نکل آنے میں کامیاب ہوئے تو انہیں پروفیسر بالکل دیوانہ شخص نظر آیا جس کے بارے میں کچھ سوچنا بھی وقت کی بربادی تھی ۔ گھوش بابو نے پہلے ارادہ کیا تھا کہ وہ پروفیسر پر اخباروں میں مضمون لکھیں گے لیکن پہاڑ سے نکل آنے کے بعد ایک پاگل کے مشن پر کچھ لکھ کر انہوں نے تماشہ بننا نہیں چاہا ۔

شیام جی کے آنے جانے کے اوقات مقرر نہیں تھے ۔ وہ کسی وقت بھی سویرے نکل جاتے ۔ اور کسی وقت بھی دیر سے لوٹ آتے ۔ گھوش بابو کے صبح، شام اور رات کے اوقات ان کے مطالعہ کے لئے مقرر تھے ۔ اس وقت ان کی نظریں بار بار کھڑکی کی طرف اٹھتی رہتیں ۔ انہیں شیام جی کا انتظار سا رہنے لگا ۔ وہ جب بھی شیام جی کو دیکھتے تو لپک کر باہر نکل آتے اور ان سے دو چار باتیں کرتے، تب ہی ان کی تشفی ہوتی ۔ وہ شیام جی سے ان کی مصروفیت کا حال جاننا چاہتے لیکن شیام جی اس قدر مصروف ہوتے کہ اپنے بارے

میں کچھ بتانے کا موقعہ انہیں کم ہی ملتا۔ ایک بار گھوش بابو اس ارادے سے سویرے ان کے ساتھ ہی نکلے تاکہ وہ خود سے ان کی مصروفیت کا حال دیکھ سکیں۔ شیام جی اس قدر تیز چلتے تھے کہ گھوش بابو کے لئے ان کا ساتھ دینا مشکل ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تک تو ان کے ساتھ دوڑتے رہے جب سانسوں پر قابو پانا مشکل ہو گیا تو بولے۔

"بھئی شیام جی، جلدی آپ کو ہے، مجھے تو نہیں۔ ذرا آہستہ چلئے تو میں آپ کا ساتھ دوں۔"

شیام جی بڑے زور سے ہنسے

"گھوش بابو، مجھے تو واقعی جلدی ہے۔ اگر آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے تو پھر میرا ساتھ تو دینا ہی ہوگا۔"

شیام جی نے یہ بات کہی ضرور لیکن انہوں نے اپنی چال دھیمی کر دی۔ چلتے چلتے وہ لوگ فقیر باڑے کی طرف نکل آئے۔ گھوش بابو نے بستیاں تو بہت دیکھی تھیں، لیکن ایسی بستی ابھی تک نہیں دیکھی تھی جس میں بستی والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ شاید کسی پرانی حویلی کے کھنڈرات تھے جس میں جگہ جگہ اینٹیں اٹکی رہ گئی تھیں جو چھت کہلاتی تھیں۔ کچھ فقیروں نے جن کی آمدنی شاید کچھ زیادہ تھی، ان اینٹوں پر پھٹے پرانے ترپال اور چادریں ڈال رکھی تھیں۔ ان سے ٹھنڈک کچھ بڑھ گئی تھی۔ کھنڈرات سے متصل ایک طویلہ تھا جس پر کھپریل چھت کے آثار ابھی باقی تھے۔ یہ فقیروں کا گویا یوتھ ہاسٹل تھا۔ لمبے دالان میں یہاں سے وہاں تک ان گنت فقیر پڑے تھے۔ کچھ کھانس رہے تھے، کچھ بیٹھے لیٹے کیا کر رہے تھے، یہ گھوش بابو نہیں دیکھ سکے۔ شیام جی نے سوئے ہوئے فقیروں کو چادریں اڑھا دیں، جو کھانس رہے تھے، ان کی پیٹھ تھپتھپا دی، کچھ کو صحن میں لے جا کر منہ ہاتھ دھلایا، بیماروں کو اپنے تھیلے سے دوائیاں نکال کر کھلائی، زخموں سے چور فقیروں کو مرہم لگایا۔ گھوش بابو ناک پر رومال رکھے یہ منظر دیکھا کئے۔ لیکن شیام جی نے بے حد میلے کچیلے، بدبو دار اور ایسے بیمار و نادار فقیروں کے منہ میں اپنے ہاتھوں سے نوالے دینا شروع کیا جو حرکت بھی نہیں کر سکتے تھے تو گھوش بابو فوراً باہر نکل آئے۔ کچھ دیر انہوں نے انتظار بھی کیا کہ شاید شیام جی

بھی باہر آجائیں ۔ جب دیر تک شیام جی نہیں آئے تو وہ واپس لوٹ آئے ۔

رات میں شیام جی سیدھے ان کے گھر آگئے ۔

"گھوش بابو، آپ تو میری مصروفیت دیکھنے گئے تھے ۔ پھر اتنی جلدی چلے کیوں آئے ؟"

"بھئی، مجھ سے وہاں کی گندگی اور بدبو برداشت نہیں ہوئی ۔ آپ کیوں کر رہ جاتے ہیں ۔ ؟"

"گھوش بابو، میں کوئی تماشہ بین تو ہوں نہیں کہ تماشا اچھا نہیں لگا تو باہر نکل آئے ۔ یہ تو میرا مقصد حیات ہے جس کا میں کچھ صلہ نہیں چاہتا ۔"

"لیکن شیام جی، آپ ان کی دواؤں اور غذاؤں کے لئے پیسے کہاں سے لاتے ہیں، آپ تو خود ہی ...."

"دیکھئے، گھوش بابو، مجھے کارپوریشن سے جو پیسے ملتے ہیں، ان میں، میں اتنے پیسے کاٹ لیتا ہوں کہ میرا مہینہ بھر کا خرچ نکل آئے ۔ بقیہ اپنے اس شوق پر اڑا دیتا ہوں ۔ پھر ان بچاروں کے اپنے پیسے بھی ہوتے ہیں جن کا وہ مصرف نہیں جانتے ۔ ایک انجانا خوف انہیں پیسے کمانے اور انہیں جمع کرنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے ۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی گھوش بابو کہ کچھ فقیروں نے مرنے کے بعد ہزاروں روپے چھوڑے ہیں ۔ خود میں بھی اس کی بھنک نہیں پا سکا ۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے ۔ شیام جی، لیکن یہ جو آپ کوڑھیوں اور دق کے خوفناک مریضوں کے بدبودار منہ میں دانے دیتے رہتے ہیں، اس کی ہمت آپ نے کیسے پیدا کی ؟"

"شروع میں تو مجھے دقت ہوتی تھی لیکن اب تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا ۔ جب میں نے ان بدنصیبوں کی خدمت کو اپنا مقصد بنایا تو مجھے خود ہی نفرت اور گھن جیسی بیماریوں پر قابو پانا پڑا ۔ اور پھر ہمارے دیش میں ایک گاندھی جی بھی تو تھے جو کوڑھیوں کے پیشاب، پاخانے تک اپنے ہاتھ سے صاف کرتے تھے ۔"

"شیام جی، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے سامنے ایک مقصد ہے اور زندگی کا

صحیح مصرف وہی جانتے ہیں جو زندگی کو کسی مقصد کی اُور لے جانے کا سلسلہ جاری ہیں۔
لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ آپ تنہا یہ بار کیوں اٹھائے ہوئے ہیں، آپ سرکار اور مختلف سماجی اداروں کی مدد کیوں نہیں لیتے، انہیں اس طرف متوجہ کیوں نہیں کرتے۔ ؟"

شیام جی ہنسے۔

"گھوش بابو، آپ مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی ہو۔ میں تو سمجھو، ایک جاہل آدمی ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ دوسروں سے مدد مانگنے کے پیچھے ہمیشہ دوسرا مقصد پوشیدہ ہوتا ہے جسے میں نے ابھی تک اپنے پاس بھٹکنے نہیں دیا۔ میں اس کام میں حصّہ لینے سے کسی کو روک نہیں سکتا لیکن کسی کو اس کے لئے مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ میں لگ بھگ بیس سالوں سے اس کام میں لگا ہوا ہوں۔ آج تک تنہا رہا۔ باتیں لوگوں نے بہت کیں لیکن آگے بڑھنا ایک الگ ہی معاملہ ہے۔ تنہا میں نے تیس ہزار فقیروں کے نام پتے جمع کئے ہیں۔"

"تیس ہزار — !"

"ہاں صاحب، تیس ہزار۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو نہ سماج تسلیم کرتا ہے، نہ آئین نے ان کی کسی قسم کی درجہ بندی کی ہے۔ اس کے باوجود ہیں وہ اس سماج کا حصّہ، جس سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔"

"لیکن شیام جی، سماج اور آئین کے تسلیم کر لینے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو تسلیم کیا گیا ہے خود ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، یہ تو ہم اور آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"میں تو خود یہی کہتا ہوں کہ مسئلہ در اصل اسی لئے پیدا ہوا ہے کہ ہم سماج اور آئین کے محتاج بن کر رہ گئے ہیں۔ خود آگے بڑھ کے کام کرنے کی ہمیں توفیق نہیں ہوتی۔ میں پوچھتا ہوں کہ انفرادی طور پر اپنی ذمّہ داریاں محسوس کرنے سے کس قدر قانون نے ہمیں روکا ہے۔"

"بات تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں شیام جی۔ لیکن توفیق کو بیدار کرنے کے لئے بھی ایک تحریک کی ضرورت ہے۔ ورنہ جانتے تو سبھی ہیں، کرتے نہیں۔"

"نہیں گھوش بابو، یہ چیز تحریک وغیرہ چلانے سے بیدار نہیں ہوگی۔ بھگوان نے

لاکھوں اوتاروں اور رشی مینوں کو زمین پر بھیجا تو اس سے کیا ہوا، کیا سارے لوگ اچھے ہو گئے ـــــ ہمیں صرف اپنے ضمیر کو ٹٹولنا ہوگا، اگر یہ چیز باقی ہو تب ـــــ ''

گھوش بابو لاجواب ہو گئے۔ شیام جی کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک انہیں کے بارے میں سوچتے رہے۔ یہ دیوانہ سا آدمی ان کے اندر اس احساس کا بیج ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی انہوں نے لکھا پڑھا، وہ عمل کے سامنے بیکار ثابت ہوا۔

دوسرے روز کے اخبار میں شیام جی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جو گھوش بابو نے ایک ماہر جرنلسٹ کی طرح لیا تھا۔ دراصل شیام جی نے جو باتیں گھوش بابو سے کہی تھیں، وہ اب ان کے انٹرویو کا حصہ بن گئی تھیں۔ گھوش بابو اخبار لئے، رات گئے تک شیام جی کا انتظار کرتے رہے۔ پتہ نہیں شیام جی نے اخبار بھی دیکھا یا نہیں۔ جب شیام جی گھر پہونچے تو گھوش بابو اخبار لے کر ان کے پاس آئے۔ شیام جی نے واقعی اخبار نہیں دیکھا تھا، انہیں تو اس کے بارے میں کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ اخبار میں اپنا انٹرویو دیکھ کر وہ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔

'' اس کو کیا ضرورت تھی گھوش بابو۔ میں شہرت اور نام وری میں یقین نہیں رکھتا۔''

آپ کا کہنا صحیح ہے لیکن صحیح اور ایمانداری کے ساتھ کام کرنے والوں کے خلوص کا اعتراف تو ہونا ہی چاہئے۔ پھر آپ کے مشن کی خبر لاکھوں لوگوں کو ہوگی تو ان میں کچھ ایسے ضرور نکل آئیں گے جو آپ ہی کی طرح زندگی کے سامنے کسی مقصد کو رکھ سکیں۔''

'' خیر آپ کی خواہش ہے تو یونہی سہی، ورنہ میں اس سلسلے میں بہت زیادہ پُرامید نہیں ہوں۔''

اخبار میں انٹرویو چھپنے کے بعد ہفتوں اس میں قارئین کے خطوط شائع ہوتے رہے جن میں شیام بندوا پادھیائے مشن کی سراہنا ہوتی رہی۔ کئی اخباروں کے نمائندے شیام جی کی تلاش میں آئے۔ ایک آدھ ملنے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن شیام جی نے مزید

کچھ کہنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں تو گھوش بابو سے شکایت ہوگئی کہ اس طرح ان کی مصروفیت میں رکاوٹ پڑنے لگی تھی۔ لوگوں کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ شیام جی صرف رات ہی کو گھر پر رہتے ہیں، چنانچہ ان کے ہاں دستک اب رات ہی میں پڑنے لگی تھی۔ دن میں جو لوگ آتے، ان کی ملاقات تو گھوش بابو سے ہوتی اور وہی شیام جی کے پی آر او کی طرح ان کے ہر سوال کا جواب دیتے۔ شیام جی کو تو خبر بھی نہ ہوتی۔ اخباروں سے ان کا واسطہ تھا نہیں، ملنا، جلنا کسی سے تھا نہیں۔ انہیں اس سرکاری افسر کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی جو سرکاری اوقات میں یعنی دس سے چار بجے تک کے بیچ کئی بار ان سے ملنے آیا تھا اور آخر اس کی ملاقات گھوش بابو سے ہی ہوئی۔ اس نے گھوش بابو کو یہ اطلاع دی کہ آئندہ سرکار نے شیام جی کی سماجی اور فلاحی خدمت کے صلے میں پدم شری دینے کا ارادہ کیا ہے اور اس سلسلے میں شیام جی کی حسب خواہ مرضی بھی ضروری ہے تو گھوش بابو نے بڑے اطمینان سے شیام جی کی طرف سے اجازت دے دی تھی۔ شیام جی کو تو اس وقت پتہ چلا جب ریڈیو اور اخباروں کے ذریعہ یہ خبر خواص و عام ہوئی اور چوبیس گھنٹے لوگوں کا تانتا شیام جی کے گھر بندھا۔ اس کے سبب شیام جی کی چند گھنٹے نیند بھی حرام ہوگئی تو وہ بوکھلائے ہوئے گھوش بابو کے پاس آئے۔

”دیکھا گھوش بابو، آپ نے اپنے لکھنے کے شوق میں، میری زندگی کیسی برباد کردی“

”کمال کرتے ہیں شیام جی، آپ بھی۔ آپ کو پدم شری ملا ہے اور آپ اسے بربادی کہہ رہے ہیں۔“

”کون سا سرخاب کا پر لگ گیا مجھ میں۔ جو مقصد لے کر میں چلا ہوں، اس میں بھی رکاوٹ پڑ رہی ہے۔“

”شیام جی، ایک مہذب سماج، ہمیشہ اپنے کارکنوں کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے اور ــــــ“

”گھوش بابو، آپ تو بہت پڑھے لکھے آدمی ہو، مجھے یہ بتاؤ کہ آخر ہم کب تک

اپنے کھوکھلے پن کی پیوندکاری کر کر کے خوش ہوتے رہیں گے۔ ہم اپنے کھوکھلے پن کو کبھی دور کر سکیں گے یا نہیں۔؟"

"شیام جی، ہم سماج کے سامنے جب تک کوئی نمونہ نہیں رکھیں گے تب تک سماج کو وہاں تک کیسے لے جا سکیں گے۔ مہذب سماج کی بنیادیں یونہی نہیں پڑ جاتیں، اس کے لئے معاشرہ اور اس کی سبھی اکائیوں کو اپنی ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں۔"

"گھوش بابو، سماج اور سرکار کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے دو اور رہیں اپنی۔"

"آخر ہم آپ بھی تو سماج ہی کا حصہ ہیں اور حکومت کا بھی ایک رنگ۔ آپ سب سے الگ تھلگ ہو کر سماج کی خدمت کیسے انجام دے سکتے ہیں۔"

شیام جی سے ایک لمحہ کے لئے کچھ جواب نہ بن پڑا تو گھوش بابو نے اپنی بات جاری رکھی۔

"سماج اور حکومت کے اعتراف سے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ پھر اس سے مقصد کے حصول میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ حکومت کسی کی جاگیر نہیں، سماجی فرائض میں مصروف افراد کی مدد کرنا حکومت کا فرض بھی تو ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت بچاری کیا کرے گی۔ یہ بھیک منگے تو کسی خانے ہی میں نہیں، جو لوگ سماج کا حصہ ہیں، انگ ہیں، حکومت انہیں کی مدد کر دے تو۔۔۔"

"شیام جی، آپ جیسے حوصلہ مند افراد کو اتنا مایوس نہیں یہ ہونا چاہئے۔ اگر کہیں پر کوئی بات غلط ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مایوس ہو کر وہاں سے منہ موڑ لیا جائے ہوش مند اور باشعور لوگوں کو تو غلطی کے سدھار کی کوشش کرنی چاہئے۔

"آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں گھوش بابو۔ آپ کی باتیں اونچی ہوتی ہیں۔ میں جاہل آدمی ہوں اور مزدور ہوں، میں اتنی بڑی بڑی باتیں سوچوں اور سمجھوں تو پھر کوئی کام ہی نہیں کر سکوں گا۔"

شیام جی کو اعزاز لینے کے لئے دلی سے بلاوا آیا۔ آمد و رفت اور قیام وغیرہ کی

ذمہ داری حکومت کی۔ اتفاق یہ کہ شیام جی کی سمجھ میں بھی یہ بات آسانی سے آگئی ورنہ گھوش بابو نے تو یہ سمجھ رکھا تھا کہ انہیں اس سلسلے میں کافی محنت کرنی پڑے گی۔ دراصل گھوش بابو کی محنت ہی نے ذہنی طور شیام جی کو تیار کر دیا تھا۔ کپڑوں، جوتوں وغیرہ کا انتخاب گھوش بابو ہی نے کیا۔ شیام جی نے گھوش بابو کو بھی ساتھ چلنے کو کہا اور گھوش بابو تیار بھی ہو گئے کہ عین موقعہ پر ان کی طبیعت خراب ہو گئی، انہیں تیز بخار آگیا اور وہ نہیں جا سکے۔

شیام جی کا سفر پورے ایک ہفتہ کا تھا۔ دو تین روز تک تو گھوش بابو گھر سے نکل ہی نہیں سکے۔ ان کی طبیعت کچھ اچھی ہوئی تو وہ باہر چہل قدمی کرنے لگے۔ شیام جی کے بند دروازے کے پاس کئی معذور فقیر پڑے تھے۔ گھوش بابو کئی روز تک ان فقیروں کو بند دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان فقیروں کو وہ شیام جی کے بارے میں کیا اطلاع دیں۔ شیام جی جہاں گئے تھے، وہ ان فقیروں کی سمجھ سے بہت دور کی چیز تھی۔

'پدم شری' ملنے کے تیسرے دن گھوش بابو نے شیام جی کو ٹی وی پر دیکھا۔ میک اپ نے ان کے خدوخال کو بہت تبدیل کر دیا تھا اور وہ بہت سنجیدگی اور وقار کے ساتھ بتا رہے تھے کہ انہوں نے اس اعلےٰ سرکاری جانچ کمیٹی کا ممبر بننا قبول کر لیا ہے جو اگلے ہی ہفتہ ملک بھر کے دورے پر روانہ ہو رہی ہے۔ تاکہ فقیروں اور بھیک منگوں کی حالت کا پتہ چلایا جائے اور قومی سطح پر ان کی آباد کاری کا ایک پروگرام مرتب کیا جائے ——

گھوش بابو کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ آخر ان کی محنت رنگ لائی اور شیام جی جیسا مخلص کارکن مناسب اور صحیح راستے پر لگ گیا۔

ادھر فقیروں کو جو نہیں روکا ٹوکا گیا تو شیام جی کے گھر کے آس پاس ان کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ پہلے یہ لوگ میدانوں اور سڑکوں پر رہتے تھے، جب بارش ہونے لگی تو وہ بھی ادھر اُدھر کے دالانوں اور سائے بانوں میں اُمڈ آئے، دو ایک گھنے درخت تھے، ان کے

نیچے ڈیرہ ڈال دیا۔ دالانوں اور سائے بانوں کے مالکوں نے جب انہیں جھڑک دیا تو وہ پھر سڑکوں پر آ گئے۔ لیکن جب بھی دھوپ یا بارش کا سلسلہ جاری ہوتا۔ وہ پھر وہاں آجاتے۔ مشکل یہ تھی کہ ان کے ساتھ ان کے خارش زدہ کتے، پیشاب، پاخانے گندے چیتھڑے اور ان سے چمٹی ہوئی بدبو نے بھی وہاں پر اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ فضا اتنی آلودہ ہوگئی تھی کہ وہاں پر سے بیچ بیچ کے چلنا ضروری اور ناک پر رومال رکھے بغیر گذرنا ناممکن ہوگیا۔ گھر قریب رہنے کے سبب سب سے زیادہ تکلیف گھوش بابو ہی کو تھی۔ ان کا دالان اور صحن بھی محفوظ نہیں تھا۔ گھوش بابو نے اپنے گونگے نوکر کو سختی سے تاکید کردی تو وہ ڈنڈے لے کر چوبیس گھنٹے وہاں پر تعینات رہنے لگا۔ وہ نہ کسی کا سنتا نہ بولتا، صرف گھوش بابو کے اشارے پر سمجھتا۔ دنیا کی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ گھوش بابو کا گھر پاک وصاف رہنے لگا لیکن آس پاس گندی فضا کے رہتے ہوئے یہ صفائی کتنی مضحکہ خیز تھی۔ ہزار صاف ستھرے رکھنے اور اگر، لوبان کی دھونی دینے کے باوجود ان کے گھر میں ایک مخصوص قسم کی بو پھیلی رہتی۔ گھوش بابو اس بو کی تلاش میں گھر کا کونہ کونہ چھان مارتے اور جب ناکام ہو کر، گھبرا کے باہر آتے تو چاروں طرف وہی مخصوص بو ان کے سر پر چڑھ کر ہنستی رہتی۔

یہ فقیر بھی ایک الگ ہی چیز تھے۔ ان کو ہزار سمجھایا جاتا۔ ہر طرح سے قائل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ لیکن ان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی۔ انہیں صرف شیام جی۔۔۔ شیام نند ودیادھیا ہی سمجھا سکتے تھے۔ وہ ان سے کم پر کسی طرح تیار ہی نہیں تھے۔ گھوش بابو۔

کتّا اور کھوپڑی

علی امام

بیچھم باپی کے موڑ پر مختلف رنگوں والے کتوں نے مجھے گھیر لیا۔ بھوں، بھوں کے شور سے فضا گونج اٹھی۔ میں خوف سے ہچکولے کھانے لگا۔

اللہ ...... اللہ ...... یا اللہ ...... دہائی مخدوم بابا کی ...... دہائی ...... دہائی ...... انترٹی شاہ کی دہائی۔

پھر تھوک کے فوارے زبان اور ہونٹ کی مدد سے نکال کر خود کو تھوک کے دائرہ بندی سے جکڑ لیا۔ اماں اکثر کہا کرتی ہیں۔ موذی جانوروں سے بچنے کے لئے خود کو 'تھوک تھوکا' لیا کرو خود سے۔

لیکن کتوں کا ہجوم سیلاب کی طرح بڑھتا ہی گیا۔ پلے، کتے، کتیاں، فربہ، لاغر، اور دیوانے، سیانے ...... شور، ہنگامہ، غراہٹ اور پنجوں سے زمین کو کھرچ کر اڑایا ہوا گرد و غبار فضا کو چنگھاڑ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ کہ جسم و جان کی قوتیں بڑی تیزی سے سلب ہوتی جاتی تھیں۔

کتوں نے ایک حلقہ بنا لیا اور مجھے اپنے حلقے سے باندھ دیا۔ جیسے کہ اس دائرے میں ایک نقطہ ہوں سہما ہوا، ٹھٹھرا ہوا۔

اور پھر کتے حلقہ بنائے ہوئے چلنے لگے اور اس حلقے سے پٹا ہوا میں بھی چلنے کے لئے

مجبور تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا اگر یہ نقطہ محیط سے قریب ہوا تو محیط اسے کاٹ کھائے گا۔

میں بے تحاشہ جانے انجانے رستوں پر چلتا رہا۔

کبھی آگے

کبھی پیچھے۔

کبھی دائیں

کبھی بائیں۔

حلقے چلتے رہے، بھونکتے رہے، گرد اڑاتے رہے، غراتے رہے اور کبھی کبھی کاٹ کھانے پر اکسائے بھی جاتے۔ میں پگڈنڈی پگڈنڈی ــــــ گلی گلی ــــــ سڑک سڑک ــــــ نالی نالی ــــــ ہوتا ہوا ان کے قدموں سے چلتا رہا، ان کی آنکھوں سے دیکھتا رہا، ان کے کان سے سنتا رہا۔

اس درمیان کئی بار کوشش بھی کی کہ بھاگ نکلوں مگر قدم جو جم سے گئے تھے۔ اور دل جو بیٹھ چکا تھا، میرا ساتھ نہ دے سکا۔

کتے مجھے اپنے حلقے سے باندھے گھسیٹتے پھرے اور میں گھسٹتا رہا۔

دائرہ کے درمیان لڑھکتے لڑھکتے دو دہائی بیت گئی۔ تب آج اچانک محیط ٹھہر ٹھہر کر چل رہا ہے۔ شاید ان کی منزل آگئی تھی۔

تو واقعی ایسا ہی ہوا کہ حلقہ رک گیا۔ اور چاروں طرف کا معائنہ کرنے لگا۔ ایک وسیع سڑک جس سے تمام سڑکیں آکر ملتی ہیں ــــــ اسی کے پشت پر ایک گلوب نما بلڈنگ ایک لویل اور خوب صورت لان سے گھری آہنی دیواروں سے جکڑی ہوئی تھی۔

اور میں اپنے حلقے کے درمیان سہما سہما۔ ٹھٹھرا ٹھٹھرا چپکا ہوا ہوں۔ اب حلقہ... ... آہستہ آہستہ آہنی دروازہ سے لان کے اندر جانے کی جدوجہد کرنے لگا ہے۔ مگر رکاوٹیں کس قدر تیز ہیں کہ حلقہ کو بھی اپنی آہستگی کو سختی اور تیزی میں تبدیل کرنا پڑا۔ اس دھکم دھکا کھینچ تان میں نقطہ اپنی جگہ سے کھسکتا اور پھر ٹکرا کر لوٹ آتا ہے۔ اور گون کا سلسلہ اس وقت

تک چلتا رہا جب تک کہ حلقہ لان میں داخل نہ ہو گیا۔ جب حلقہ لان میں داخل ہو گیا تو میرے لڑھکنے کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں ایک جگہ جم گیا۔ کتوں نے سانس لیا۔ کچھ دیر آرام کیا پھر بڑے اہتمام کے ساتھ لان کے اندر کے عظیم الشان محل میں داخل ہوا۔

محل کے اندر کا عجیب حال تھا۔ میری آنکھیں دیکھ کر سلگ اٹھیں۔ حالانکہ جن آنکھوں سے میں دیکھ رہا ہوں وہ دوسروں کی ہیں۔ اپنی آنکھیں ہوتیں تو نہ جانے کیا ہوتا۔

لاتعداد کھوپڑیاں فرش پر بڑی تیزی سے متحرک ہیں۔ اور ہر ایک، ایک دوسرے سے ٹکرا کر پلٹ رہی ہیں۔ لڑھک رہی ہیں، کھسک رہی ہیں کہ بند برتن کے پانی کے سالمے ایک خاص رفتار سے گردش کرتے، ٹکراتے اور لوٹتے ہیں۔

کھوپڑیاں لگاتار ٹھن ٹھن، کھٹ کھٹ ٹکرا رہی ہیں ——— ایک عجیب شعور، عجیب ہل چل ہے گنبد کے اندر۔

میرے حلقے کی ایک کڑی ٹوٹی اور ایک کھوپڑی کو پکڑ کر کھانا شروع کر دیا۔ جب وہ لوٹ کر اپنی جگہ پر آ گیا۔ اور دوسری کڑی اپنی جگہ سے اچھل کر ایک دوسری کھوپڑی پر ٹوٹ پڑی ——— اور جب وہ فارغ ہو گیا تو تیسرا ——— پھر یوں ہوا کہ ایک آتا، خوب کھاتا، فربہ ہوتا پھر لوٹ کر اپنی جگہ پر چلا جاتا تب دوسرا آتا ——— اور یہ سلسلہ جاری رہا کہ ایک آتا، دوسرا جاتا ——— اور جب حلقے کے تمام کتوں نے سکون حاصل کر لیا۔ تو ہر ایک نے میری طرف دُم ہلانا شروع کر دیا۔ جب میں نے دم ہلاتے ہوئے دیکھا۔ تو مجھے خوشی ہوئی کہ اماں نے کہا تھا "دم ہلاتے ہوئے کتے کاٹتے نہیں ہیں" چنانچہ میں ان کے حلقے سے آہستہ آہستہ نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ حلقے کے آخری سرے سے گذرنے والا تھا کہ تمام کتے پلٹ کر مجھے کاٹ کھانے کے لئے دوڑے گو وہ بھوکے نہیں تھے۔ لیکن اسی وقت سیانا درمیان میں آ گیا اور اس نے مجھے چکو مر ہونے سے بچا لیا۔ میں سہم کر اپنی جگہ لوٹ آیا۔ سیانا مجھ پر احسان کر کے میری ہمدردی حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ سنجیدگی اور متانت کا لبادہ اوڑھ کر میرے قریب آیا۔ اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

جھانکتا رہا۔ پھر اپنے پنجوں سے میرے جسم کو دھیرے دھیرے سہلانے لگا اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اکساتا رہا۔

جب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ایک کتا زبان نکالے اور رال ٹپکاتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا ہے ____

میں گھبراہٹ میں کبھی اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوں۔ کبھی اپنے آپ کو دیکھتا ہوں اور ٹٹول ٹٹول کر خود کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہوں ____ اور ایک لخت چیخ پڑتا ہوں

نہیں نہیں، یہ میرا عکس نہیں ____ یہ میرا عکس نہیں نہیں ہے ____ یہ میرا نہیں ہے۔

ذی تم کہاں ہو، آؤ اور میری اچانک تبدیلیوں پر ہنگامہ مچا دو یا قہقہے لگاؤ اگر تم نہیں آسکتی تو شام کو بھیج دو جو مسرتوں کی قربت سے ہمیشہ محروم رہی ہے۔

ذی ____ شا ____ کچھ نہیں ____ کچھ نہیں ____ سب کچھ میں ہوں۔

آگ ____ آگ ____ آگ ____ اندر کی آگ باہر کی آگ سے مہک اٹھی ہے اور میں خودی کی کھائی میں گم ہوتا جا رہا ہوں۔ اب بالکل چھپ چکا ہوں پھر ____ اور اچانک اندر سے باہر کا غلاف اتار کر جب پھر باہر آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے کھڑا کتا میرے جسم کو چاٹ رہا ہے۔

مگر اب میں اپنے کان سے سُن رہا ہوں۔ اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں۔ اپنے پیروں سے چل رہا ہوں۔ حالاں کہ خوف کے عناصر کچھ کچھ موجود ہیں۔ پھر بھی میں اپنے حلقے کو توڑ کر چھلانگ لگا کر کھوپڑی کو پکڑ رہا ہوں۔

اندھا دھند کھوپڑیاں میری زد میں آتی جاتی ہیں اور میں انہیں ہضم کئے

جاتا ہوں ۔ جب مکمل طور پر انہیں ہضم کر لیتا ہوں تو کتے مجھے پھر اپنے گھیرے میں
لے لیتے ہیں ۔ مگر اب میں حلقے کے محیط پر گھوم سکتا ہوں، دوڑ سکتا ہوں — اور
جو جی میں آئے کر سکتا ہوں ۔ کیوں کہ کھوپڑی ساکت و جامد میری آمد پر لرز رہی ۔ اور
کتے میرے اتارے ہوئے خول کو پرچی پرچی بنا کر خود پہن رہے ہیں ۔ !

لخت لخت

(حسین الحق)

ایک پُرانی شکستہ حویلی کے کھنڈرات میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

حویلی کا بیرونی حصّہ کسی طور" محفوظ کہا جاسکتا ہے کہ چاروں طرف کی دیواریں ابھی قائم ہیں، گو کہ ان پر بھی کائی جم گئی ہے اور سبزہ نے گھر بنا لیا ہے اور برسات جب آتی ہے تو حویلی والے بس اسی دیوار کو دیکھتے رہتے ہیں کہ یہی تو واحد پردہ ہے ۔ اندر جو کچھ بھی ہوتا ہے یہ دیوار ہی اندر کے اس ہونے والے "سب کچھ" کو لوگوں کی نظروں سے چھپائے ہوئے ہے۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں پہلے بہت کچھ تھا لیکن اب کچھ بھی نہیں ہے اب صرف حویلی کے چاروں طرف دیواریں ہیں اور دیوار سے گھرا ہوا ایک بہت بڑا، روندا، کچلا، اوبڑ کھابڑ میدان ہے اور اس میدان کے بیچ ایک حویلی جو پہلے کبھی "محل" ہوگی لیکن اب صرف حویلی رہ گئی ہے۔ حویلی میں ابھی بھی بڑے بڑے کمرے اور "ہال" ہیں جو اپنی اصل شکل وصورت کھو چکے ہیں اور انھیں کمروں میں سے ایک میں ....

اور ایک میں وہ رہتا ہے اور روز اندھیرا ہوجانے کے بعد ایک کمرے سے وہ اور ایک کمرے سے وہ نکلتا ہے اور بیچ والے کمرے میں دونوں داخل ہوجاتے ہیں۔

بیچ والا کمرہ جہاں وہ رہتا ہے۔

اس بیچ والے کمرے میں آنے سے پہلے دونوں اپنے اپنے کمرے میں پڑے سوال وجواب کرتے رہتے ہیں۔

آج بھی وہی سلسلہ جاری ہے۔

"ہو بھائی ؟"

''ہاں بھائی ! اب تک تو ہوں۔''

''اُٹھوگے ؟''

''اُٹھنا ہی پڑے گا۔''

''کیا وقت ہو رہا ہے ؟''

''وقت سے ہمیں کیا مطلب بھائی ؟''

''پھر بھی !''

''اتنا ہی کافی ہے کہ اندھیرا ہو چکا ہے۔''

''آخر ایسا کیوں ہے بھائی ؟ دن کا سورج روشنی کیوں لے لیتا ہے ؟ رات سے ہمارا کیا رشتہ ہے، ہم یہ سب کیوں کرتے ہیں ؟ یہ سب کچھ کب تک چلتا رہے گا ؟ سو رہے ہو بھائی کہ جاگ رہے ہو ؟''

''جاگ رہا ہوں اور سن بھی رہا ہوں !''

''پھر میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے ؟''

''آج تک یہاں کسی بات کا جواب بھی ملا ہے ؟''

دوسرا اس ''جوابی سوال'' پر خوش رہتا ہے، پھر بہت دیر تک دونوں اپنے اپنے پلنگ پر پڑے رہتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ دونوں اپنے بدن سے چادر ہٹاتے ہیں۔ بہ یک وقت دونوں اُٹھ کر بیٹھتے ہیں، پلنگ سے پیر نیچے لٹکاتے ہیں اور اب دونوں نے ساتھ ہی پلنگ چھوڑ دیا ہے۔ سارے میں گہرا دبیز اندھیرا پھیلا ہوا ہے، مہینے کی آخری تاریخیں ہیں اس لئے چاند بھی اپنا سفر پورا کر چکا ہے اور جو بھی آدھا ٹکڑا چاند بچا ہوا ہے۔ اسے بھی بادلوں نے گھیر رکھا ہے لیکن اس اندھیرے میں دونوں اس طرح چل رہے ہیں جیسے روشنی میں ہوں، سارے رستے جیسے ان کے جانے پہچانے ہوں، یا صدیوں سے ان کے قدم ان رستوں کی پیمائش کر رہے ہیں اور ان رستوں کے سارے نشیب و فراز ان کے وجود کا ایک حصّہ بن چکے ہوں۔

سچ مچ ایسا ہو یا نہ ہو لیکن ان کی رفتار... تھکی تھکی رفتار یہی بتا رہی ہے کہ یہ سفر

ان کے من سے شروع ہوتا ہے اور ان کے من پر ختم ہوتا ہے۔

چلتے چلتے دونوں رُک جاتے ہیں۔ یہ ایک بڑا ہال ہے جس میں پُرانے زمانے کی کچھ کُرسیاں اور سامان ہیں، کمرے کے چاروں طرف بڑے بڑے دریچے ہیں۔ دریچے کے پاس کھڑا ہوکر باہر کی طرف دیکھنے لگتا ہے اور دوسرا کمرے کے بیچوں بیچ اندھیرے کا جزو بنا کھڑا ہوا اور بڑبڑا رہا ہے۔

''وہ لوگ بھی کیا لوگ تھے؟ ایسے ایسے محل بنا کر چلے گئے، کہ دُنیا کا ہر سُکھ اس کے اندر موجود تھا۔''

''تم جانتے ہونا؟'' اس نے دریچے کے پاس کھڑے ہوئے آدمی کی طرف مخاطب ہوکر کہا۔ ''یہ دیوان عام تھا، یہاں وہ بیٹھ کر دوسروں کی فریاد سُنا کرتے تھے۔ فرغل بھاری بھر کم لمبی چوڑی ٹوپی، عمامے اور تاج پہنے جس دم تخت پر وہ بیٹھتے تھے تاج کا نگینہ پورے ایوان کو روشن کر دیتا تھا۔ یہاں پہ وزیر اعظم کی مسند تھی، یہاں پر امیر الامراء کی مسند اور یہ ملکہ کا تخت تھا۔''

دریچے کے پاس کھڑے ہوئے آدمی کے چہرے پر ایک اُداس مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کھڑکی سے باہر اندھیروں میں لگاتار دیکھے جا رہا تھا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ دوسرا مسلسل بڑبڑا رہا ہے۔

''اس پورے محل کے منقش در و دیوار اپنی خوبصورتی، نفاست اور انفرادیت میں بے نظیر تھے۔ اس ہال کے گوشے گوشے پہ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ فرش پر نرم گداز قالین بچھے رہتے تھے جن پہ پاؤں رکھنے سے احساس ہوتا تھا جیسے پیروں کے نیچے مخمل یا کسی خوبصورت اور نازک ترین عورت کا رُخسار آگیا ہو۔ پھاٹک پر وردیاں پہنے مؤدب اور چاق و چوبند دربان رہتے تھے اور احاطے میں داخل ہونے کے بعد محل تک پہنچنے کے لئے روش پر سُرخ بجری بچھی رہتی تھی جس پر سے لوگ چرمر چرمر کرتے آتے تھے اور جاتے تھے۔ محل کے دائیں جانب ''چمن'' تھا جس میں گلاب، بیلا، نرگس، لالہ اور سوسن کے پھول کھلتے تھے اور رات آتے ہی رات کی رانی ہر طرف خوشبو ہی خوشبو بکھیر

دیتی تھی، باغ سے ذرا پرے چھوٹے چھوٹے خوبصورت تالاب تھے جہاں شہزادیاں شام سویرے لہروں کا تموج دیکھتی تھیں۔ سارے میں شمعیں اور قندیلیں تھیں جو شام ہوتے ہی روشن کر دی جاتی تھیں اور سارے کے سارے میں ایسی دودھیا روشنی پھیل جاتی تھی جیسے ساون بھادوں کی چودھویں رات میں بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے کے بعد اچانک سارے آسمان سے کہیں دور.... بہت.... چلا جاتا ہے — سب کچھ دھلی دُھلائی چاندنی میں نہا جاتا ہے۔ دن روزِ عید اور رات شب برات تھی۔ ہر طرف چہل پہل، ریل پیل، نوکر چاکر، ہالی معالی! آج فلاں کی دعوت، آج فلاں تقریب، آج فلاں تیوہار، بس ہر طرف زندگی ... زندگی.... زندگی ہی زن...“

کہتے کہتے رُک جاتا ہے جیسے کچھ سُننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”یہ کس چیز کی آواز ہے؟“

”کوئی گدھا غالباً میدان میں پیشاب کر رہا ہے“ دریچے پر کھڑے ہوئے آدمی نے دھیرے سے جواب دیا۔

”بھگایا کیوں نہ گیا؟“

”کون بھگاتا؟ ہم تو سرِ شام ہی تھک جاتے ہیں۔“

پھر دونوں بہت دیر تک چُپ چاپ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ دونوں ہی پر غالباً خیالات سوار تھے۔

”ادھر آؤ۔“ دریچے پر کھڑے ہوئے آدمی نے دوسرے کو آواز دی۔

”دیکھتے ہو؟“ دوسرا جب قریب آگیا تو پہلے نے دوسرے کے کاندھے پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے کہا، جیسے بہت تھک گیا ہو۔

”کیا؟“

”اندھیرا!“

”اندھیرا بھی دکھائی دیتا ہے۔“

اندھیرا ہی تو دکھائی دیتا ہے۔ باقی سب کچھ تو دھند میں کھویا ہوا دور کا منظر

ہے۔" پہلا بہت دھیرے سے بڑبڑاتا ہے اور پھر اندھیرے میں نظریں دوڑانے لگتا ہے
دونوں ایک دوسرے کے سہارے کھڑے ہیں جیسے دونوں ہی کچھ محسوس کر رہے ہوں، کچھ تھا جو دونوں ہی نے اپنے اپنے اندر اتار لیا تو جیسے شانت ہو گئے۔
"اب تو وقت ہو گیا ہو گا؟"
"شاید۔"
"چلو چلیں۔"
اور پھر دونوں بیچ والے کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔
بیچ والا کمرہ! جہاں وہ رہتا ہے۔
وہ! جو ایک لاش ہے!!
لاش کا کفن تار تار ہے بلکہ یوں کہیے کہ کفن سڑ گل کر تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ کہیں کہیں پر تھوڑا بہت کپڑے کا ٹکڑا باقی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ ٹکڑا اسی سڑے گلے کفن کا ایک حصّہ ہو یا پھر ان دونوں میں سے کسی نے ان جگہوں پہ کپڑا رکھ دیا ہو۔ بات جو بھی ہو لیکن لاش بے ستر نہیں تھی۔
یہ دونوں لاش کے دائیں بائیں بیٹھ جاتے ہیں۔
دائیں طرف بیٹھا ہوا آدمی کوٹ پینٹ شرٹ میں ملبوس ہے۔ ٹائی بھی باندھ رکھی ہے، آنکھوں پہ دبیز چشمہ، فرانسیسی انٹلکچوئلس کے انداز میں فرنچ کٹ داڑھی اور مونچھ۔ بائیں سمت بیٹھا ہوا آدمی شیروانی اور شرعی پاجامے میں ملبوس، شرعی داڑھی مونچھیں از روئے شریعت غائب، شیروانی کے اوپر علمار کے انداز کی قبا، سر پہ لمبا چوڑا عمامہ، بغل میں لاٹھی، ہاتھ میں تسبیح، اور پیشانی پر کثرت نماز سے پڑنے والا نشان، لاش کے سر کے بال غائب ہو چکے ہیں، تالو کے اوپر کا حصّہ بجبجاتے زخم کا مرکز، کہیں کہیں سے پیپ بھی نکل رہی ہے، پیشانی کے اوپر کا گوشت غائب، سفید سفید ہڈی نمایاں۔ ایک طرف کا کان سڑ کر گر چکا ہے، دوسری طرف کا کان آدھا گل چکا ہے اور آدھے میں چیونٹیاں لپٹی ہوئی ہیں، بھوں کا بال غائب، پپنی کا پتہ نہیں ہے۔

آنکھوں کی جگہ دو اندھے غار جن کے اندر چیونٹے چیونٹیاں اور مختلف قسم کے دوسرے رینگنے اور اُڑنے والے چھوٹے بڑے کیڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ اُڑ اُڑ کر اندر جاتے ہیں اور پھر اندر سے بدبودار گوشت کے ٹکڑے لے کر باہر آتے ہیں ناک کی جگہ یہ بھی غار ہے اور ناک اور آنکھ کے راستے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چیونٹیاں، اُڑنے والے چیونٹے، مکھیاں بہت اطمینان سے ناک کے راستے سے اندر جاتے ہیں اور آنکھ کے راستے سے باہر آتے ہیں، آنکھ کے راستے سے اندر جاتے ہیں اور ناک کے راستے سے باہر آتے ہیں، ہونٹ گل گل کر لٹک چکے ہیں اور دانت اپنی جگہ چھوڑ کر حشرات الارض کی غذا بن چکے ہیں۔ گردن سے تلوے تک کہیں پیپ بہہ رہی ہے، کہیں گوشت ادھڑا ہوا ہے، کہیں سے کالا جما جما خون نکل رہا ہے۔ ہاتھوں کی انگلیاں اپنے چمڑے چھوڑ کر بدہیئت ہو چکی ہیں اور مُڑ مُڑ گئی ہیں۔ پیر کا پورا حصہ گوشت سے بیزار ہے، ایڑی آگے کی طرف ہو گئی ہے اور انگلیاں پیچھے کی طرف۔ پورے جسم پر سانپ بچھو مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے بہت اطمینان کے ساتھ آ رہے ہیں جا رہے ہیں، لاش کے اوپر، لاش کے نیچے، لاش کے دائیں بائیں، لاش کے سرہانے اور پائنتی ہر طرف پیلا پیلا مواد بہہ رہا ہے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے افراد کو چھو چھو کر زمین میں جذب ہو رہا ہے۔ پھر بھی لاش کی مجموعی حالت یہ بتا رہی ہے کہ لاش تھوڑے دنوں کی ہے۔

کمرے کی پوری فضا پُراسرار دُھندلکے میں گُم ہے اور بدبو سے سارا ماحول مہک رہا ہے۔ دونوں بہت دیر سے خموش بیٹھے ہیں، دونوں ہی کچھ سوچ رہے ہیں لیکن شاید گفتگو کرنے میں دونوں ہی کے لئے کوئی چیز مانع ہو رہی ہے۔ کچھ دیر بعد دونوں نے بہ یک وقت ایک دوسرے کی طرف نگاہ کی۔ آنکھوں میں دردِ مشترک کی جھلکیاں دکھائی دیں۔

دوسرا پھر بڑبڑانے لگتا ہے۔

"روز وہی کام، سورج غروب ہوا اور چارپائی چھوڑ دو، کچھ دیر تک وہ اور پھر یہ، یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ ہم کیوں نہ ...؟"

"شش!" پہلے نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔ دیواریں بھی کان رکھتی ہیں۔"

"تم بزدل ہو۔" دوسرا غرانے لگتا ہے۔ "کیا کر لیں گے؟ مار ہی ڈالیں گے؟؟ یہ روز روز کی مصیبت سے تو بہتر ہے... یہاں لاکر عذاب میں ڈال گئے ہیں... کمینے... سالے.... وقت کیا ہو رہا ہوگا؟"

"پتہ نہیں!"

"اب تو سبھی چل چکے ہوں گے؟"

"ممکن ہے۔"

"لیکن ابھی ہیں دور ہی کیوں کہ آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔"

"ہاں ایسا تو ہے۔"

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ دونوں ہی کوئی خاص بات کہنا چاہ رہے ہیں لیکن یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ یہ بات شروع کون کرے۔

"ہٹ سالا۔" دوسرا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا؟"

"بچھو تھا غالباً۔ رینگتا ہوا چہرے پر آگیا تھا۔"

"ٹارچ ہے نا؟"

"ارے ہاں! میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

پھر کمرے میں ٹارچ کی مدھم روشنی پھیل گئی۔

چاروں طرف مٹی ہی مٹی۔ کہیں کہیں سے مٹی اور سپیدی کا چونا بھر بھرا بھر بھرا کر گرتا ہے۔ زمین "چپ چپ" ہو رہی ہے۔ کہیں کہیں پر سے سانپ کی پھنکار بھی سنائی دے رہی ہے، بیٹھے ہوئے اشخاص کے چہرے سپاٹ ہو رہے ہیں، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ان دونوں کو ان حشرات الارض سے کوئی خوف نہیں ہے۔

"ارے یہ کیسے مر گیا؟"

ٹارچ کی روشنی رینگتے ہوئے ایک اژدہے پر ٹھٹھک گئی جو مردہ پڑا تھا۔

پہلا اُداس دھیمے لہجے میں ہنسنے لگا۔ "اس نے مجھے کاٹا تھا۔"

"ذرا باہر دیکھنا تو۔"

دوسرا آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولتا ہے۔ ساری حویلی پر سکوت طاری ہے صرف ہوائیں سن سن کرتی آ رہی ہیں اور جا رہی ہیں۔ کہیں کہیں سے کتّوں اور سیار کے رونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ حویلی کے میدان میں لگے ہوئے تاڑ کے درخت "ہڑ ہڑ" کر کے ہلتے ہیں تو فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ سارے میں عجیب سی بدبو بہہ رہی ہے جو اس پُراسراریت اور ہولناکی میں اور اضافہ کر رہی ہے۔

باہر کی طرف دیکھتے ہوئے دوسرا بڑبڑانے لگتا ہے۔

اندھیرا.... اتھاہ گہرا اندھیرا.... اور اس گہرے اندھیرے سے ابھی وہ اُبھریں گے .... مشعلیں اور لالٹینیں لئے ہوئے.... وحشی درندے.... دوسروں کی کوئی فکر ہی نہیں ہے.... اپنی بھی فکر نہیں ہے.... بے حس.... بتانا بھی مشکل.... روشنی وقف ماتم ہوئی.... روشنی وقف ماتم ہوئی...."

"اوہ! آ گئے! آ گئے!" پہلے نے اچانک کان کھڑے کئے اور دور سے ہواؤں کے ریلے کے ساتھ آتی ہوئی آواز کو سُننے کی کوشش کرنے لگا۔

"ہاں شاید!" دوسرے نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔

اور پھر دونوں نے خود کار مشین کی طرح کام شروع کر دیا۔ دونوں نے اپنے اپنے تھیلے سے مختلف قسم کی چیزیں نکالنی شروع کیں۔ ساری چیزیں جب دونوں کے سامنے ڈھیر ہو گئیں تو ایک نے ٹارچ کی روشنی کا مرکز لاش کو بنایا اور دوسرا کپڑے سے بدن خشک کرنے لگا، بڑی بڑی مشکل سے جسم خشک ہوا اس لئے کہ جہاں پر کپڑے والا ہاتھ پڑتا وہاں خشکی کے بجائے اندر سے "پیچ" سے نکلنے والی پیپ اور گندگی پھیلا دیتی، کسی نہ کسی طرح جسم خشک ہوا تو ٹارچ کی روشنی سر پر پڑنے لگی اور پہلے نے اپنے تھیلے سے نکالا "وگ" سر پر چڑھا دیا جس سے سر پر بال بھی نظر آنے لگے اور رسنے والی پیپ بھی غائب ہو گئی۔ پھر شیشے کی دو گولی نکال کر آنکھوں کے

گہرے غار میں فٹ کی گئی، پلاسٹک کی ناک ناک کے غار کی جگہ چسپاں کی گئی، پیروں پر موزے چڑھائے گئے۔ ہاتھوں میں دستانے پہنائے گئے۔ جب یہ کام پورا ہو چکا تو تھیلے سے ایک لمبا چوڑا کفن نکال کر دوسرے نے پہلے کی گود میں رکھ دیا پھر چاروں طرف کی زمین صاف کرنے کی مہم شروع ہوئی اور کمرے میں رینگتے ہوئے سارے سانپ بچھو اور حشرات الارض چُن چُن کر کھائے جانے لگے۔

"جلدی کرو۔" قدموں کی آواز قریب ہوتے دیکھ کر پہلے نے کہا اور دونوں کے ہاتھوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ زمین جانوروں سے صاف ہو چکی ہے۔ اب لاش کو کفن پہنایا جانے لگا۔ اس کام میں دوسرا بھی پہلے کا شریک ہے۔ وہ کفن پہنا رہا ہے اور بڑبڑا رہا ہے۔

"تم.... تم ابھی ایک دم اچھے ہو جاؤ گے... پاک... صاف... اور منزہ.... وہ آئیں گے... اور تم... اور تم... رات بھر کا یہ ہنگامہ... یا یا یا... صبح ہوتے ہی سب کچھ ختم... بساط بند... تمہارے کمرے میں تالا بند... کوئی یہاں نہیں آسکتا... ہم اپنے کمروں میں مقید... ہم کہیں نہیں جا سکتے... دن بھر آدھے جاگے آدھے سوئے..... سب کے منتظر... پھر کل... یہی سب کچھ... ایسے ہی تم... بالکل اصلی!!"

"جلدی کرو جلدی!" پہلا جھلا کر اور غرّا کر بولا۔ دوسرا اور تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ کام بھی کرتا جا رہا ہے اور بڑبڑاتا بھی جا رہا ہے۔"

"کیا ہے یہ سب کچھ... عجیب اور متحیّر کُن... ناقابل یقین... اب کیسے جلدی کروں... لاش سنبھالے نہیں سنبھل رہی ہے... پیر سنبھالنے کی کوشش میں ہاتھ الگ ہو جاتا ہے... ہاتھ ٹھیک ہوتا ہے تو ہونٹ لٹکنے لگتا ہے... تم بھی عجیب ہو... نہ راکھ بن کر بکھر جاتے ہو... نہ پتّھر بن کر ٹھہر جاتے ہو... روز اندھیرے میں نوشہ بنتے ہو اور دن بھر میں اپنی قبا کو اپنے وجود کا ایک حصّہ بنا ڈالتے ہو... تم، ہم، وہ... سب ایک سحر کے اسیر... قیدی... شیش محل کے... شب کے مسافر... جنگل میں رستہ بھولے ہوئے... بھول بھلیوں میں گُم...

قدموں کی آواز بہت قریب ہوتی جارہی ہے۔

کسی کسی طرح سے لاش کو کفن پہنایا گیا اور تینوں بند باندھ دیا گیا ہے۔ پھر دونوں لاش کو اُٹھا کر سفید دُھلی دُھلائی چادر بچھا دیتے ہیں اور لاش کو زمین پر لٹا کر تھیلے میں سے نکالی ہوئی کیوڑے اور عرق گلاب کی دس بوتلیں بہ یک وقت اس پر اُنڈیل دیتے ہیں اور لاش پر مخمل کی چادر اوڑھا دی جاتی ہے جس پر رنگ برنگے گُل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔

جس وقت لاش کو چادر اوڑھائی جارہی تھی تو ایک بار پھر دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں ٹھٹھک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے .... دونوں کے بیچ لاش .... بائیں جانب پہلا ... دائیں جانب دوسرا ... دونوں خموش .... ایک دوسرے کے آمنے سامنے .... جیسے دونوں ہی کوئی خاص بات کہنا چاہ رہے ہوں لیکن یہ فیصلہ نہیں کر پارہے ہوں کہ یہ خاص بات شروع کون کرے۔

باہر بہت تیز چرچراہٹ کے ساتھ حویلی کا پھاٹک کھلنے کی آواز آتی ہے اور دونوں چونک پڑتے ہیں۔

"جلدی کرو، جلدی کرو" پہلا ہدایت کرتے ہوئے جلدی سے چادر سے سر کو ڈھانپ دیتا ہے۔ سرہانے، پائنتی میں اور دائیں بائیں اگر بتی جلادی جاتی ہے۔ ایک بڑے سے برتن میں ڈھیر سا لوبان اور کافور رکھا ہوا ہے۔ اس میں انگارے ڈالے گئے اور اب ساری فضا خوشبو سے معطر ہوگئی ہے۔

آنے والے دالانڈے میں آچکے ہیں ... ڈھیر سارے قدم ... بے صبری سے بڑھتے ہوئے قدم ... یہ دونوں مودّب انداز میں دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اور ایک مرتبہ اچانک دروازہ کھلتا ہے اور ڈھیر سارے لوگوں کا ازدحام کمرے میں در آتا ہے۔

سر ... ڈھیر سارے سر ... ہر کے ہاتھ میں لالٹین، پیٹرومیکس، مشعلیں اور ٹارچیں! ساری روشنیاں بہ یک وقت لاش کے اوپر مرکوز ہوگئیں۔

سبھی اُچک اُچک کر لاش کو دیکھنے لگتے ہیں.... ایک ازدحام ہے جو لاش کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہا ہے اور ایک دوسرے پر گرا پڑ رہا ہے۔

"باری باری سے ... ایک ایک آدمی... اپنی باری کا انتظار کیجئے... دیکھئے بے ادبی نہ کیجئے... احترام... احترام!" پہلا لوگوں کو لاش پر گرنے سے روکنے کیلئے بار بار گھگھیا گھگھیا کر درخواست کرتا ہے لیکن نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سُنتا ہے!

"ٹھیک ہیں... ٹھیک ہیں... بالکل ٹھیک ہیں... سلامت ہیں.... وہی رُعب... وہی دبدبہ... وہی شاہانہ انداز... سب ٹھیک ہے... خوشبو.... سلامتی... سب ٹھیک ہے... سب ٹھیک!!"

تھوڑی دیر کے شور وغل اور ہنگامے کے بعد چند آوازیں گونجیں اور پھر کچھ دیر بعد چاروں طرف بھی آواز گونج رہی تھی۔" ٹھیک ہے.. ٹھیک ہے... سب ٹھیک ہے!"

بہت ساری آوازیں بہ یک وقت گونجنے لگیں، سبھی ناچ رہے ہیں گا رہے ہیں، خوشی میں مست ہو کر کچھ مخصوص خوش الحان حضرات نے حسب معمول پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

"فبای الآء ربکما تکذ بان ٥

"فبای الآء ربکما تکذبان ٥

خوشی میں جشن مناتے ہوئے لوگ ... آمنے سامنے بیٹھے ہوئے وہ دونوں ... دونوں کچھ گویا... کچھ چپ... دونوں ایک دوسرے سے نگاہوں ہی نگاہوں میں مخاطب بھی... کشمکش کی کیفیت بھی... جیسے دونوں ہی کوئی خاص بات کہنا چاہ رہے ہوں لیکن فیصلہ نہیں کر پا رہے ہوں کہ بات شروع کون کرے۔

"اور ساری فضا میں اگر بتی، لوبان اور کافور کی خوشبو... اور رقص کرتے ہوئے لوگ ... اور جھوم جھوم کر پڑھی جانے والی آیت ..."

فبای اٰلآء ربکما تکذبان ٥

فبای اٰلآء ربکما تکذبان ٥

دونوں ایک دوسرے کی طرف بے تابانہ دیکھتے ہیں جیسے دونوں ہی ابھی فوراً ہی کوئی خاص بات کہنے والے ہیں لیکن دونوں ہی کی نگاہیں پھر فوراً ہی اس انداز میں جھکتی ہیں جیسے دونوں ہی اپنے اپنے دل میں شرمندہ ہو گئے ہوں گے یا دُکھی ہو گئے ہوں!!

موت بہ نام زندگی کا اسٹیج

م۔ ق۔ خان

حقیقت یوں ہے کہ.........

میں اُس دیس کا باسی ہوں جہاں ستیہ، اہنسا اور پریم کی بنسی ہر کس و ناکس کے ہونٹوں پر بجتی ہے۔

اور حقیقت یہ بھی ہے (بلکہ تلخ حقیقت ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حقیقت تلخ ہوا ہی کرتی ہے) کہ اُسی اہنسا، ستیہ اور پریم کی بنسی بجانے والے دیس میں...... چھوڑیئے ان باتوں کو کہ مسلسل غم کے تھپیڑے کے سہنے سے ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے۔

مجھے جنبش لب کا بے حد افسوس ہے کہ ستیہ، اہنسا اور پریم کے پرم پجاری کی سخت تلقین و تاکید کے باوجود میں اپنی زبانِ بے لگام کو کھولنے پر مجبور ہوں۔ میں اب جناب پروفیسر رابرٹ ہینڈلے آف دی رائل سوسائٹی لندن کی اس لغت کا انتظار نہیں کر سکتا جس کی تصنیف و تالیف کا مقصد ہماری زبان کی تشریح و وضاحت ہے

یوں میری زبان پر شکایت کے کلمے اس وقت بھی ٹھونکے مار رہے تھے کہ خول سے نکل آئیں جب مجھے انسان سے اس حالت میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہم نے اس عتاب کو خاموشی سے برداشت کر لیا۔ کیونکہ اپنی زبان پر اپنے گناہ نے زبردست مہر لگا دی تھی یار بار کی ہدایت اور تنبیہہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گناہ میں ملوث رہنے کی یہ جائز سزا تھی۔ یہ ایسا گناہ تھا، جسے ہر زمانے میں معیوب سمجھا گیا ہے۔ آج کی بات اور ہے ب دُنیا بدل چکی ہے اور ساتھ ہی اخلاق و اختلاط کے اصول و ضوابط بھی۔

خیر جو ہونا تھا ہوا۔ وقت نے پھر کروٹ بدلی، حالات نے ایک انگڑائی لی اور ہماری زندگی کی تاریخ میں عہد آفریں دن آیا۔ ایک حکیم فرنگی نے اپنے علم تحقیق اور برسوں کی ریاضت

کے بعد ایک انکشاف کیا کہ ہمارا نہ صرف انسان سے رشتہ ہے بلکہ مجھے ان کا جدامجد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ رشتہ پینسٹھ ملین برسوں کا ہے۔

لیکن ہماری خوشی چار دن کی چاندنی ثابت ہوئی۔ ہم اس انکشاف کے دور رس نتیجوں سے بے بہرہ تھے۔ جناب! مداریوں نے مجھے فوراً پکڑا اور کھیل تماشوں کا آلہ کار بنا کر پیٹ کا دھندا شروع کر دیا۔ ہمیں وہ قیدو بند کی زندگی ایک پل نہیں بھاتی کیونکہ ہم نے تہذیب و تمدن کا لبادہ اوڑھ کر اپنے ہاتھوں بنائی چہار دیواری میں خود کو بند کرنا کبھی پسند نہیں کیا۔ ہم تو جنم جنم کے رہتی رہے ہیں۔ ہم یہ سوچ کر ان کا ساتھ دیتے رہے۔ کہ یہ دن رات رنج والم کے بکھیوں سے دبا رہتا ہے چلو انھیں خوش ہونے کا موقع تو میسّر آجاتا ہے۔

اب ان کی دیکھا دیکھی سرکس والوں نے ہم سے طرح طرح کے کام لینے شروع کیے اب کہیں جو میری اُفتادِ طبیعت عود کر آئی اور کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہو جاتا تو ڈانٹ پھٹکار اور قمچیوں کی مار پڑتی اور کبھی کبھی ہمیں فاقے پر ڈال دیا جاتا۔ آپ ہی انصاف کیجئے کہ یہ کیسی احسان فراموشی ہے کہ جس کی روزی ہم مہیا کرنے میں ہر طرح سے معاون و مددگار ہوں وہ مجھے فاقے کی سزا دے، ہم نہ ہوئے ہندوستان کے کسان و مزدور ہوئے، جو روٹی اُگائے وہی دانے دانے کو ترسے۔

ہماری اس مظلومیت اور ہمارے ساتھ روا اس بے انصافی کے خلاف کوئی آنسو کیا بہاتا، احتجاج کیوں بلند کرتا حالانکہ ہر مذہب نے جانداروں کے ساتھ رحم و ہمدردی کا درس دیا ہے لیکن ان کا مذہب تو کسی موقع پر ڈھال بنتا ہے۔ بہر حال کبھی کبھی قاتل ہی مسیحا بھی بن جاتا ہے۔ الفریڈ کورٹ (جو سرکس کے جانوروں کو سدھانے میں بڑی شہرت کا مالک تھا) نے ایک کتاب لکھی اور انگلستان کے بہت سارے شہروں میں سرکس میں ہمارا استعمال خلاف قانون کر دیا گیا۔ آپ کو یہ جان کر شاید تعجب ہو کہ سوئیڈن کے بادشاہ (گو اب بادشاہت کو دُنیا کی سب سے مہلک چھوت کی بیماری سمجھا جاتا ہے) بھی اپنے ملک میں قانون نافذ کر دیا کہ ہم اور ہماری کے کسی فرد سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

تم ہم سے کام لے کر کیا نمائش کرنا چاہتے ہو؟ لوگوں کے ذہن میں محض یہ مرتسم کرنا کہ تم بہت قدرت والے ہو۔ تمھاری فہم و فراست تسخیر فطرت کا بھلا شاکی ہی کون ہے ـــــ ہم غریب ـــــ؟ تم اتنی قدرت والے ہو تو بجلی کا کوندا کیوں نہیں روکتے ـــــ بادل کی گرج کیوں نہیں بند کر دیتے، طوفان کا رُخ، سیلاب کا زور، زلزلے کی تخریب روک ڈالو تم اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے وبا موت، امراض اور بھوک جیسی چیزوں سے کیوں نہیں نبرد آزما ہوتے؟ لیکن تم تو خود ہمہ وقت دست و گریباں ہو تم ہمیشہ سے ہابیل و قابیل رہے ہو۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ تم پر فرشتوں کا اعتراض بیجا نہیں تھا۔

تم اوڈیپس ہو ـــــ اوڈیپس!

تھیں یقین نہیں آتا ـــــ؟

آؤ میرے ساتھ ـــــ دیکھتے ہو دس دیگوں میں پانی کھول رہا ہے نا اب ـــــ دس کو اس میں ڈال دیا گیا ـــــ محض دیکھنے کے لئے کہ کھولتا پانی کتنی دیر میں ان کے اندر کی زندگی ختم کر سکتا ہے۔ مرنے کے پہلے تڑپنے کا منظر کیسا ڈرامائی ہے ـــــ کیسا ہیبت ناک! اور اسی ہیبت کی فضا کو جلا بخشنے کے لئے تم نے یہ کیا ہے۔

دور دور تک دیکھو۔ صرف توپ کا پیاسا دہانہ ہے۔ اس سے جو آتشیں شئے نکلی وہ ستّر کے پرخچے اُڑاتی فضا میں دُھواں دُھواں ہوگی اور اس طرح گولے کی تخریبی طاقت کا اندازہ لگایا جاسکا۔

اب دس کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور ماہر نشانہ بازوں نے کھوپڑی سے ایک انچ نیچے رائفل کی گولی داغ دی ـــــ یہ بھی ایک تجربہ ہے کہ یہ گولیاں کیسا سوراخ بناتی ہیں۔ دوسری جانب دیکھو، دیکھو تم تماشوں کے بڑے رسیا ہو۔ سینکڑوں کی ننگی پیٹھ اور ریڑھ کی ہڈی پر وزن گرایا جا رہا ہے اور پھر لوگوں کی نظریں گھڑی پر ہیں وہ کتنے وقت میں مفلوج ہوتے ہیں۔ ہزاروں کو نیوٹرن گولے سے نکلی شعاع کا نظارہ کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے ـــــ اچھا اب یہ نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں ـــــ اب انھیں الیکٹرک شاک دیا جا رہا ہے ـــــ لو دیکھو Freadmill پر دوڑ پڑتے، اندھا دھند، کوئی

یہاں گرا کوئی وہاں گرا، اور تجربہ مکمل — زندگی — معدوم!

یہ کسی پاگل کی بکواس نہیں ہے جناب! یہ دُنیا کے نہایت ترقی یافتہ ملک کے تجربہ گاہوں میں پیش آنے والے واقعات کی روداد ہے۔

یہ کسی پاگل کی بکواس نہیں ہے جناب! یہ دُنیا کے نہایت ترقی یافتہ ملک کے تجربہ گاہوں میں پیش آنے والے واقعات کی روداد ہے۔

"ہندوستان سے برآمد بندروں کے ساتھ انسانوں جیسا رحم و ہمدردی کا سلوک ہوگا۔" عہدنامہ

اور دستاویز کے جلی حروف کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ہزاروں تجربہ گاہ میں ہلاک کر دیئے گئے۔

مسٹر ٹائیشن نے ۱۸۶۰ء میں لنگور، بوزنہ، میکاق اور انسانی جسم کی ساخت کا ایک تقابلی جائزہ اور طبّی تجربہ گاہوں میں چوہے، خرگوش، مینڈک اور گابینا پگز کی شامت آگئی لیکن اس قتل و غارت گری کا بازار تو تب ہوا جب ۱۹۵۴ء میں ڈاکٹر جوناز سالک نے ہمارے خون میں RH کا عنصر دریافت کیا اور Polio کا علاج ہمارے گردے سے چمٹ گیا۔ کبھی Rhesus اور کبھی Bonnet کو بساطِ حکمت و طب کے نوآموز اور نازہ واردان کی اُفتادِ طبع، نشانہ بننا پڑا۔ اور Polio کے انجکشن کے ایک Batch کے لیے کا خون ناحق جائز ٹھہرا۔

حکیم مشرق نے بڑے پتے کی بات کہی تھی

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جُرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ورنہ یہ امر قابل غور ہے کہ Chimpanzee ' Apes Crang - Utang ، Gorilla اور Fibbon کی تو تم سے بہت مشابہت ہے لیکن انھیں دام گرفت میں لانا یا تربیت دینا اتنا آسان اور دوسری جانب خُدا کی بستی کو دوکان سمجھنے والوں کی تجارانہ پالیسی اور مالی منفعت کے لحاظ سے بھی خسارے کا سودا ہے کیونکہ ایک بوڑھے کی قیمت کم ازکم پانچ ہزار دو سو پچاس روپے ہوتے ہیں جب کہ ہماری قیمت ؟ مجھے پکڑنے والے

کو صرف سترہ روپئے میں فروخت کرنا پڑتا ہے، اس پونجی پر دوسرا سوداگر تین سو بیس روپئے کا سودا کرتا ہے، اور اس تجارت کی تیسری منزل کا سوداگر مجھے تین ہزار دو سو روپئے کو فروخت کرتا ہے نفع کا سارا حصہ پیٹرسن اور دھیٹا جیسی دو مشہور کمپنیوں کے نام محفوظ ہے۔

تجارت میں سب کچھ جائز ہے۔ سرسوں کے تیل میں موبل ملایا جاسکتا ہے، مرغ و ماہی کی جگہ چیل کوؤں اور دوسرے آبی جانوروں کو پیش کیا جاسکتا ہے، جہاں انسانوں کی تجارت ہوتی ہے، عورتیں جنس بن کر برآمد کی جاتی ہوں، جہاں مقدس دیوی دیوتاؤ کی مورتی چرا کر فروخت کی جاسکتی ہے۔ جس ملک کی نادر قلمی کتابیں یورپ اور امریکہ کی منڈیوں کو سمگل کی جاتی ہوں وہاں ہمارا کیا شمار؟

مجھے غم اس بات کا ہے کہ جس نے دُنیا کو امن اور شانتی کا پیغام دیا جس سرزمین پر "اہنسا پرمودھرمہ" کا نعرہ بلند ہوا، جہاں کے لوگ اپنے مُنہ پر کپڑے باندھ کر رہتے ہوں کہ سانس لیتے وقت کہیں کوئی ذی روح ہلاک نہ ہو جائے، جہاں گائے کو ماں اور چوہے کو دیوتا سمجھا جاتا ہے اُسی خطۂ زمین میں ہمارے لئے عرصۂ حیات تنگ ہے!

اب دیکھئے ہمارے ساتھ کن وجہوں سے انتقام لیا جاتا ہے یوں تو دو لاکھ امریکہ کی تجربہ گاہوں میں موت کے گھاٹ اُتارے ہی جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں موت سے کیسے سامنا ہوتا ہے اس کا ایک منظر دیکھئے۔ لندن کے ہوائی اڈے کو دیکھیں۔ تین سو چورانوے کو ہوائی جہاز سے اُتار کر سیدھے ایک بند وان میں ٹھونس دیا گیا شاید کسٹم والوں کو شبہہ تھا ان بندروں کے پاس سونا، مورتی، نادر کتابیں، بھنگ یا حشیش ہو۔ سوداگروں پر ایسا شبہہ کرنا کوئی بُری بات نہیں۔ ہندوستان، پاکستان، لنکا اور برما سے انگلینڈ جانے والوں کو یہاں کے کسٹم آفیسرز کا اچھا تجربہ ہے۔ کئی بار حاملہ عورتوں پر سمگلنگ کا شک ہوا ہے۔ اس پریشانی میں بچے نے وقت سے پہلے ہی جنم لے کر ماں کی آبرو بچائی ہے اس سے افسوسناک اور مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ دوسرے ممالک سے آنے والی ہر کنواری لڑکی کا Virginity Test ہوتا ہے — جہاں شادی کے پہلے جنسی تعلق ذرا بھی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی — دوسروں کے لئے یہ معیار ہے۔

اذیت کوش اور بے رحمانہ سلوک نہیں ہے؟

یہ دیکھئے یہ Strapped کرسیوں سے بندھے کئی درجن ایک ساتھ اپنی حیران آنکھوں سے ان لوگوں کی جانب دیکھ رہے ہیں جن کے ہاتھوں میں خون نکالنے کے لئے سیرنج ہے۔ یہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے۔ ان کے جسم میں رواں خون اب سیرنج میں جمع ہو رہا ہے دس فی صد خون نکل آیا۔ ابھی ابھی ان کے اندر توانائی موجود ہے، حیران آنکھیں اب بے چین ہیں لیکن حیرت سے مجبور! ۲۵ منٹ کے وقفے کے بعد ان کے جسم کا بیس فی صد اور خون نکال لیا گیا اور دوسرے ۲۵ منٹ کے بعد بیس فیصد اور۔ بچا ہوا خون بھی سیرنج میں آگیا ہے اب ان کی آنکھیں سفید پڑ گئی ہیں، جسم نڈھال۔ اب انھیں ہلاک کر دیا کہ ان کو زندہ رکھنا اخراجات کو بڑھانا ہے۔

دوسری جگہ پر گلے میں پھانس لگا کر انھیں اُلٹا لٹکا دیا گیا کہ وہ ضربوں کے بعد کتنی دیر تک جی سکتے ہیں۔ اب یہ غریب لوگ آسن کے ماہر تو ہیں نہیں کہ سانس روک لیں۔ دھیرے دھیرے مر جاتے ہیں اور ایک تجربہ مکمل ہو جاتا ہے۔ کسی نے دریافت کیا "اگر انھیں بیہوش کر دیا جاتا تو تجربے میں کوئی رُکاوٹ آتی؟"

ماہرین نے صفائی پیش کی۔ "جب انھیں اس طرح اُلٹا لٹکا دیا جاتا ہے تو خود بخود بیہوش ہو جاتے ہیں...... لیکن تالی بجانے سے البتہ آنکھیں کھول دیتے ہیں۔"

ہوش اور بیہوشی کا کیسا اچھا فرق بتلایا ہے۔

یہ طریقہ کار بہر حال جلد ہی موت سے ہمکنار کرتا ہے لیکن یہ؟

ہمارے پورے جسم پر پلاسٹر چڑھا کر چھ مہینوں تک چھوڑ دیا گیا اور اس کے بعد مختلف عضو کا وزن لیا گیا۔ ان کے پاس اس بے رحمانہ سلوک کے لئے یہ جواز ہے کہ خلا میں پرواز کرنے والوں پر بے وزنی Weightlessness کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اس کا تجربہ ـــــ کسی خلا باز کو Plaster casts میں بھیجا گیا؟ یہ تو محض تفنن طبع کے لئے کیا گیا تھا۔

لگے ہاتھوں ایک اور تجربہ گاہ کی سیر کیجئے اور محترمہ اوریانہ فلاسی ایک اطالوی جرنلسٹ

ہاں تو تین سو چورانوے کو اس طرح ایک تاریک و تنگ وان میں بند کر دیا کہ وہاں ہوا کا بھی گزر ممکن نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے دم گھٹنے سے مر گئے۔ اور اس طرح نواب سراج الدولہ کا بدلہ لے لیا۔ گو سراج الدولہ سے منسوب یہ (Blacx Hall Tregdy) بھی محض افسانہ ہی افسانہ ہے تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا ایک فن!

لوگوں نے اخبار کی سُرخیوں میں یہ خبر پڑھی اور نظریں دوسری خبروں کے لئے دوسری جانب بڑھ گئیں۔ لیکن فنکار کا دل بڑا احساس ہوتا ہے۔ مشہور رقاصہ رکمنی دیوی ارنڈیل نے جو اس زمانے میں راجیہ سبھا کی ممبر تھیں پُر زور احتجاج کیا۔ پھر دوسروں نے بھی واویلا مچائی اور برآمد پر پابندی لگا دی گئی۔ تجربہ گاہ درآمد، برآمد کے دفتروں سے لے کر سوداگر اور دیادھوں نے بھاگ دوڑ مچادی اور حکومت کا دروازہ پھر سے کھٹکھٹایا جانے لگا۔ تین مہینے کے بعد ایک معاہدہ ہوا۔ " ہندوستان سے درآمد بندروں کے ساتھ انسان جیسا سلوک کیا جانے لگا۔

فوراً ایک ادارے کی تشکیل کی گئی جو مختلف تجربہ گاہوں کی ضرورت کی درخواست پر سفارش کرے گا۔ اس ادارے کی کارگزاری سُنئے کہ اس ادارے نے ایک بھی درخواست نامنظور نہیں کی اور جب کبھی کسی نے شور مچایا مسٹر میکفرسن نے بڑی خوبصورتی سے صفائی پیش کی " بھلا میں کون ہوتا ہوں کہ ان تجربوں میں ہونے والے سلوک کو بے رحمی یا سنگدلی کا نام دوں " ـــــ گو ان کی تقرری اسی کام کے لئے ہوئی تھی۔ وہ نہایت فراخدلی سے سفارش کرتے رہے اور ہماری حکومت کمال سادگی اور فرماں برداری سے احترام کرتی رہی عمل کرتی رہی۔

اب یہ سارے اگر تجربہ کے وار پر ہی جاں بحق نہیں ہوتے تو انھیں اس کے بعد ہلاک کر دیا جاتا ہے کیونکہ ان کو صحت مند بنانا اور ان کے نان و نفقہ اور بود و باش پر ان کی قیمت سے زیادہ خرچ آتا ہے۔ اور تجارت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک بات بالکل صاف عیاں ہے کہ ہمارے اور اہل مغرب کی نظر میں ہمدردی کے پیمانے مختلف ہیں کیونکہ جو انسانوں کی جان کی پروا نہیں کرتے وہ بھلا ہمارا کیا خیال کریں گے۔

اب میں ایک تجربہ گاہ میں جھانکنے کی دعوت دیتا ہوں اور آپ خود فیصلہ کر لیں کہ یہ

کا آنکھوں دیکھا حال سُنئے۔

"بلی کو بے ہوش کیا گیا۔ اس کے سر اور پیٹ کے بال استرے سے صاف کئے گئے۔ اس کی کھوپڑی الگ کی گئی۔ پانچ گھنٹوں کے بعد اس کا سر، دماغ، شریان، پٹھے، جبڑے، ناک، آنکھیں اور رگوں کو الگ کیا گیا اور انھیں بوزنے کی خون کی نالیوں سے منسلک کر دیا گیا۔ گو یہ سارے اعضا بلی سے الگ تھے ڈاکٹر موصوف کا انکشاف تھا کہ بلی کی خوشی، خوف، یادداشت اس کے دماغ سے گزرتی برقی رو سے صاف صاف ظاہر تھی۔ پانچ گھنٹوں کی عارضی زندگی با استعار زندگی کے بعد بوزنے کے خون کی سپلائی منقطع کر دی گئی تین منٹ کے بعد سارے اعضا موت کی پُر سکوت وادی میں سو گئے۔ ڈاکٹر نے نہایت فخریہ انداز میں کہا۔ میرا یہ تجربہ سوان ہے۔ اب جلدی میں انتقال ذہنی کا تجربہ انسانوں پر کروں گا۔"

مجھے خوف ہے اب ہر اس انسان کو محتاط رہنا پڑے گا جس کے پاس دماغ ہے پرندہ پکڑنے، کتے پکڑنے والی گاڑی کے بعد انسان پکڑنے والی گاڑی جلد ہی سڑکوں پر آنے والی ہے۔

"لبی —— بلی کی موت پر میں کیسے اظہار غم کروں، نل دمِ ، ہیر رانجھا، ساوتری ستیہ دان، سوہنی مہیوال کے دیس کے لوگوں نے میری بلی کو اس بہیمانہ تجربہ کے لئے کیسے سپرد کر دیا؟"

ہم بالغ اور بوڑھوں کا تو جو حال ہے وہ ہے ہی اب ان معصوم بچوں کا کیا قصور ہے جو ایسی سزا ملتی ہے۔ جنم لینے کے کچھ دنوں کے بعد بچوں کی دونوں آنکھیں نکال لی گئی ہیں۔ ایسے ایک دو نہیں درجنوں بچے ہیں۔ اب انھیں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ماں کی تلاش میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں —— اور پھر اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کس طرح کھیلتے یا اُچھلتے ہیں۔ دیکھئے کئی بچے مر گئے ہیں اور ان کی مائیں کئی کئی دنوں تک اُسے اپنے سینوں سے لگائے پھر رہی ہیں۔ ماں کی عظیم مامتا کو ان کے تجربوں کی عقلیت کی اہمیت کون جتلائے ....؟

ایک تجربہ اور بھی دیکھئے اور ماہرین نفسیات کے تخیل کی پرواز کی داد دیجئے تاکہ

سے ریڑھ اور پسلیاں بنا کر بے داغ اسپات کا سر بنایا۔ ان کے جسم پر نکیلی لگا دی گئیں۔
اب ان بچّوں کو جو مدّت دراز سے ماں سے محروم رکھے گئے تھے آزاد چھوڑ دیا گیا کہ وہ آغوش
شفقت میں سمٹ جائیں۔ ان کے جسموں میں کیلیں پیوست ہوگئیں یا اس بنے ہوئے مجسے
میں دوڑتی برقی رَو نے انھیں شاک دیا۔ اس ایجاد کو Porcupine Mother
یعنی خار پشت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ابھی ان بچّوں کے ساتھ اور تجربے بھی
کرتے ہیں۔ اب ان کے بنائے چاہ یاس (Wells of Despair) پر ایک
نظر ڈالئے۔ مخروطی نالیوں میں بچّوں کو رکھا گیا ہے جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں
ہے۔ اب ان بچّوں کو طرح طرح سے اذیت دی جاتی ہے کبھی شور کیا جاتا ہے، کبھی دھماکا،
کبھی چکا چوند کرنے والی روشنی اوپر سے ڈالی جاتی ہے اور پھر بالکل اندھیرا گھپ!
یہ عمل اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہ کتنی دیر میں اپنا ذہنی توازن کھوتے ہیں۔ یہ طریقہ کار پاگل
بنانے کی ایجاد ہے۔ ایسے ہی تجربوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ فن اور سائنس ایک دوسرے
کے شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔ John Webster نے The Duches of
Mal میں ہیبت (Horror) کی فضا کرنے کے لئے ایسا ہی منظر پیش کیا تھا۔
اب بھلا محترمہ ڈی آن ڈونا ٹو لاکھ چیختی رہیں کہ

Recent behaveoural studies have shoun that Primates can reason, manipulate and commuicate on a lavel similer to man's."

ان تمام مظالم و سفاکی پر سبقت لے جانے والے سانحے وہ ہیں جو آئے دن
دفاعی اسلحے اور ملٹری ریسرچ میں پیش آتے ہیں۔ آج کے اعداد و شمار کا اندازہ صرف
اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۶ء میں ایک سو اکتیس پر ۲۰ نیوٹرن بم تجربہ کیا
گیا۔ ان کے سامنے ۲۵۰۰ سے ۸۰،۰۰۰ راڈرز کی شعاعیں ڈالی گئیں۔ یہ اس وقت
کھلے میدان میں تھے۔ اس عمل کے بعد لوہے یا لکڑی کی ایسی چوبوں سے انھیں چھیڑا گیا
جن میں برقی رو موجود تھی۔ اب ان کا یہ حال تھا کہ انھیں لاکھ کریدا جائے وہ اس سے

بے نیاز تھے۔ ان پر جو اثر ہوا وہ یوں ہے ۔

"پورے جسم میں تھرتھراہٹ، آنکھوں کا حلقوں میں تیرنا، اندھی بے حسی، قے اور ابکائیاں، وحشی اینٹھن اور مروڑ، پورے جسم کا آگے کی جانب پھینکنا، کبھی کبھی رینگنا، ہذیانی دھکے اور نوچ کھسوٹ، گردنوں کا پیٹ یا پیٹھ کی جانب لٹکنا، ہاتھ پاؤں کا بے ہنگم طریقہ پر بکھراؤ۔ اور آخر کار سوت کی پر سکون نیند!"

ان سارے تجربوں کا حاصل یہی وہ دوائیں جو روز روز نئے امراض پھیلانے میں مددگار ثابت ہوئی ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب شناخت، طبیعت، کھانا پینا رہنا ہر شئے میں اس قدر تضاد ہے تو ہمارے امراض اور ان کا علاج کیسے ایک ہی ہو سکتا ہے (Thalidomide) کے اثرات حاملہ عورتوں پر کیا ہوئے آپ نہیں جانتے۔ آپ (Hopkins Institute) میں جاکر دیکھئے کیا ہو رہا ہے؟ صرف نقالی اور بلا وجہ قتل عام۔ کیا کوئی سائنس داں اب یہ نہیں کہے گا کہ ہمارا انسانوں سے بالکل تعلق نہیں ہے؟

ذوالنون

(انیس رفیع)

کچھ یاد نہیں پڑ رہا ہے کہ اس شخص کا کیا نام تھا۔ کبھی کبھی خیالوں کو ایک نقطے پر بٹور کر میں غور و فکر کرتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ اس شخص سے یا تو میرا گہرا سمبندھ ہے یا پھر بہت باریک، غیر واضح اور لمحاتی تعلق۔ ہاں یاد آیا، شاید سپن مہرا نام بتایا تھا اس نے۔ ایک ہی ملاقات میں کلیجے میں لاتعداد چبھن کا انبار لگا کر چلا گیا تھا۔ ہر پل، ہر لمحہ اس کی چنتا۔ اس کی کھوج۔ کیا ہوا تھا —— یہی ہوا تھا نہ کہ میں اور وہ ریل کے ایک ہی کمپارٹمنٹ میں ہم سفر تھے۔ وہ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھا تھا۔ ٹرین کی کپکپاہٹ کا نشہ جب اس کے رگ و ریشے میں سمانے لگا تو اس نے پناما سگریٹ کو داہنے ہاتھ کی انگلیوں میں دبایا اور بائیں ہاتھ سے اپنی جیب ٹٹولنے لگا۔ میں سمجھ گیا۔ ماچس نہیں تھی شاید اس کے پاس۔ میں نے اپنی جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی اور ایک تیلی جلائی۔ تیلی کی فاسفوری لَو کے گرد دونوں ہاتھ کی ہتھیلیوں کا کٹورا بنایا اور اس کے آگے بڑھا دیا۔ اس نے ایک پھونک ماری اور تیلی پھک سے بجھ گئی۔ میں نے ہاتھ کی ہتھیلیوں کا کٹورا توڑ کر ہاتھ پیچھے کی اور کھینچ لیا۔ میرے گالوں پر جیسے دو موٹے موٹے کیچوے رینگنے لگے۔ شاید میری یہ حرکت اسے ناگوار لگی تھی۔ میرے چہرے پر افسردگی کی ہلکی سی پرت کو اس نے تاڑ لیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے اندر کا نیکل اس کے ہونٹوں پر چڑھ آیا۔ وہ متبسم تھا۔ اس کے لبوں کا رشتہ ٹوٹا "میں ہمیشہ معصوم اور مخلص دلوں کی ٹوہ میں رہتا ہوں۔ اگر کہیں مل جائے تو اسے بڑی متانت اور سنجیدگی سے مجروح کر دیتا ہوں۔ کیونکہ اس فعل سے میری شریانوں میں گردش کرنے والے تیزابی لہو کو بڑی شکتی ملتی ہے۔ ویسے عادتاً مانگے کی

آگ سے سگریٹ نہیں سلگاتا" پھر یہ ہوا کہ اس نے پناما کا پورا ڈبہ نچا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور اس کے ہونٹوں پر ان گنت لمحوں کی موٹی سی بھدی سی چپ لگ گئی۔ اس کی بھدی سی چُپ میں، سفر کے بے شمار لمحے غیر محسوس طور پر نکل گئے۔ یک لخت پورا کمپارٹمنٹ انجن کے خارج شدہ دھوئیں سے بھر گیا۔ دم گھٹنے لگا۔ شاید انجن بریک سے رہا تھا۔ جب دھواں ختم ہوا تو دیکھا سپین مہرا سامنے کی نشست سے غائب تھا۔ گاڑی میرے جانے پہچانے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ یہاں میں کئی سال ویلفیر آفیسر کی حیثیت سے گذار چکا تھا۔ سپین مہرا کی انوکھی ریل کی پٹریوں پر پھیلتی ہوئی شخصیت سے گہری دلچسپی نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ میں وہاں کے انچل ادھیکاری سے اس کے متعلق خط و کتابت کروں۔ انچل ادھیکاری کے خطوط سے جو کچھ بھی معلوم ہوا وہ کچھ یوں ہے۔

آج کئی دنوں سے سپین مہرا بند کمرے میں تنہا دیمک زدہ آسمانی وعدوں کی کتاب کا وہ صفحہ کھولے پڑا ہے جس پر کئی خداؤں کی نیم برہنہ مخلوقات اپنے گناہوں کے دستاویز سروں پر سجائے بھیانک سزا کی چاہت میں کربلائی کوڑے ایک دوسرے کی پشتوں پر ثبت کرنے میں مصروف ہیں۔ ان ہی مخلوقات میں شامل ہو کر سپین مہرا بھی اچانک اپنے وجود کی تصدیق و تائید خداؤں سے طلب کر رہا ہے۔ (ان گنت مہا پرشوں نے اپنی بھری عدالت میں خداؤں کے پاس جو کچھ تھا اسے چھین لیا ہے)۔ سپین مہرا کے اس غیر نظری رویئے سے اس کے عملوں کو سخت پریشانی ہے۔ وہ اسی طرح کئی کئی دن کمرے میں محصور ہو جاتا ہے۔ اگر وہ بند کمرے سے بھی ہدایت جاری کرتا رہے تو کوئی بات نہیں۔

اب نئی پریشانی یہ ہے کہ بند کمرے سے نکل کر بھی وہ زیادہ اوقات خاموشی کی زنراش دُنیا میں گذارتا ہے۔ کبھی کبھی خاموشی کی دُنیا آشاؤں کا امٹ بھید بھی کھولتی ہے مگر سپین مہرا کی یہ دُنیا گھٹا ٹوپ اندھیرے کے سوا کچھ بھی ثابت نہ ہوئی۔

پچھلے دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ سپن مہرا اپنی چالیس سالہ بھید بھاؤ والی زندگی کو ایک چیلنج دے کر گاؤں سے شہر کی اور نکل گیا ہے۔ شہر سے اس کے متعلق چونکا دینے والی خبریں مل رہی ہیں۔

سب سے پہلی خبر یہ ہے کہ اب اس کی شناخت مشکل ہے۔ دوسری خبر یہ ہے کہ اس کے شہر کے روزناموں میں اشتہار میں یہ باتیں درج ہیں! "سپن مہرا۔ اس شخص کے گھر میں ایک کوٹھری ہے۔ اس کوٹھری میں ایک نعش پڑی ہے۔ اسے ایک آدمی کی تلاش ہے جو اس لاش کو اٹھا کر بہت دور پھینک آئے معاوضہ خاطر خواہ۔ پتہ ——" اس اشتہار کی اشاعت کے بعد ہی مقامی پولس چوکی سے ایک داروغہ نے آکر اس کے مکان کی کوٹھری کا معائنہ کیا ہے۔ کوٹھری ادھ کھلی پائی گئی ہے۔ مگر لاش کہیں موجود نہیں۔ اس کے گھر کے لوگوں پر سکتہ طاری ہے۔ گھر کا کونہ کونہ جھاڑ کر دیکھ لیا گیا ہے۔ مگر لاش ندارد۔

تیسری خبر یہ ہے کہ وہ شہر کے کسی عظیم پیشوا کے گھر پر کئی روز سے مقیم تھا۔ وہ سماجی پیشوا کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ پیشوا کئی روز سے دورے پر تھا۔ اسے یقین تھا کہ پیشوا ہی وہ شخص ہے جو اس کی کوٹھری سے لاش کو اُٹھا کر دور پھینک آئے گا۔ پیشوا دورے سے واپس آیا۔ اس سے قبل کہ وہ اپنا سوال دُہرائے وہ پیشوا کی خبر تضحیک آمیز جملوں سے لیتا ہے، قریب تھا کہ وہ پیشوا کا گلا ہی گھونٹ دے کہ لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ جب وہ پیشوا کے گھر سے نکل رہا تھا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس نے اپنی ناک پر موٹا سا کھدر کا رومال دبا رکھا ہے۔

چوتھی خبر یہ آئی کہ وہ Holy Mother کے اس کیمپ میں زبردستی گھس گیا ہے جہاں کوڑھ کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ شاید اس نے مقدس ماں کی جھلک اس وقت دیکھی تھی جب وہ Unicef کی جیپ میں بیٹھ کر camp کا معائنہ کر رہی تھی۔ مقدس ماں اسے گاؤں کے بوڑھے پیپل سے بھی کہیں زیادہ مقدس لگی تھی۔ بگلے کے پروں کی سی اجلی اجلی کالے کالے فیتوں میں لپٹی فرشتہ صفت۔ مقدس

ماں۔یہی ماں اس لاش کا قصہ تمام کر سکتی ہے۔ وہ ہولی مدر کی غیر موجودگی میں وہاں کی نرسوں اور میٹروں سے اُلجھتا رہا۔ نرسوں کی مسیحائی اس کے سوال کی بے سرو پائی پر خندہ زن تھی۔ اور مسٹر فادر کی عمر والے سبن مہرا کے لئے تسبیح کے دانوں پر دُعاؤں کو Computerise کر رہی تھیں۔ پھر اچانک یہ ہوا کہ ہولی مدر معائنہ سے واپس آئی۔ سبین مہرا ہولی مدر کی آنکھوں سے بالکل قریب ہوگیا۔ اور پھر دیکھا گیا کہ وہ سرپٹ کیمپ سے باہر کی جانب بھاگ رہا تھا۔ ناک پر کھدر کا وہی رومال دبا ہوا تھا۔

پھر یہ خبر ملی کہ شہر کی گلیوں میں بھیک کی طرح اس سوال کو دُہرانے کا پیشہ اُس نے اختیار کر لیا ہے۔ اس کے بعد بہت دنوں تک انچل ادھیکاری کا کوئی خط موصول نہ ہوا۔

اچانک ایک دن خبر ملی کہ وہ گاؤں واپس آچکا ہے اور شمشان گھاٹ کے پاگل اگھوری سے ملنے کی کوشش کر رہا ہے جسے گاؤں کے لوگ ہر موسم میں بھیانک تصور کرتے ہیں، اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں اور دن کے سناٹے میں لاشوں کی بوٹیاں تراش تراش کر کھا لیتا ہے۔ اور اس فعل کے ارتکاب سے پہلے وہ اپنے آپ کو مادر زاد ننگا کر لیتا ہے۔ گاؤں کے چیل کوّوں کو بھی یاد نہیں کہ اس نے اگھوری کے مُنھ میں دانے کا ایک نوالہ بھی کبھی دیکھا ہو۔ سبین مہرا اس اگھوری سے ان لمحوں میں ملا جب وہ مادر زاد ننگا تھا اور گھناؤنے فعل کا مرتکب ہو رہا تھا۔ سبین مہرا نے اس پاگل سے بھی یہی سوال کیا ــــ میرے گھر کی کوٹھری میں ایک لاش پڑی ہے کیا تم اسے اُٹھا کر کہیں دور پھینک آسکتے ہو؟ وہ پاگل سوال سُن کر کئی پل خاموش رہا۔ پھر آہستہ آہستہ سبین مہرا کے قریب گیا اور بولا "تم خود ہی اس لاش کو اُٹھا کر دور بہت دور کیوں نہیں پھینک آتے۔ ہیں تو خود ہی ــــ تمھارے پاس کوئی رومال ہے" سبین مہرا نے جواباً جیب سے وہی کھدر کا رومال اسے پیش کیا۔ اگھوری کی اندر کو دھنسی ہوئی پیپلی سی

آنکھیں بھبھک کر باہر نکل آئیں۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے گھور کر سیپن مہرا کو تاکا اور پیش کردہ رومال کو اپنی ناک پر کس کے دبایا اور بڑی سُرعت سے بے پناہ مچھلیوں والی دریا میں کود گیا اور سیپن مہرا چند لاتعلقی خلائی لمحوں کو جھیل کر بڑی آسانی سے اس فیصلے پر پہنچ گیا ـــــ وہ جسم کو بے لباس کرنے میں مصروف ہو چکا ہے اس واقعہ کے بعد انچل ادھیکاری نے خطوط کا سلسلہ بند کر دیا۔

ـــــــــ
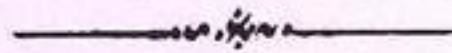
مسدود راہوں کے مُسافر

(رضوان احمد)

بہار کا موسم آتے ہی بابا کو خُدا جانے کیا ہو جاتا ہے ؟ ؟

طاق پر رکھی ہوئی کتاب اُٹھا لاتے ہیں۔ اس کا غلاف اُتارتے ہیں۔ اور بڑی عقیدت سے بوسہ دے کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پڑھ کر رونے لگتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر سہم جاتا ہوں۔

یہ بہار کا موسم چمن کو کئی بار لالہ زار بنا چکا ہے مگر مجھے تو یہ موسم سخت ناپسند ہے کوئی چمن کا جوبن دیکھے ہی کیسے ؟ اس وقت تو گھروں کے اندر گھُس کر بیٹھ جانا پڑتا ہے۔ دروازے، کھڑکیاں، شگاف سب بند کر دینے پڑتے ہیں۔ مقفل اور محبوس چار دیواری کے اندر بہار کا کیا لطف آسکتا ہے۔ ؟

مگر بابا کو تو بس کہانی قصوں کی پڑی رہتی ہے۔

--- ایک عورت کے کئی بیٹے تھے۔

——— بابا یہ کہانی اب بہت بوسیدہ ہو چکی ہے۔ میرے کان کے پردے اب اسے برداشت نہیں کر پاتے ذہن پر مزید بوجھ مت ڈالئے۔

"بیٹا یہ تو حقیقت ہے تم اسے صرف کہانی کیوں سمجھتے ہو"۔ ؟

——— کہانیاں حقیقت بھی ہو سکتی ہیں۔

اور حقیقت کہانی بھی ہو سکتی ہے۔

"بابا یہ سفر لمبا ہے اور ہمیں بہت دور تک جانا ہے"۔

اس لمبے سفر میں نہ جانے کون راستے میں چھوٹ جائے۔ راستہ بھی تو بہت دشوار گذار ہے۔ ریتیلے میدان ہیں تاریک جنگل ہیں۔ گہری گھاٹیاں ہیں، تاریک گھاٹیاں ہیں، اندھی

گھٹائیں ہیں۔ خار دار جھاڑیاں ہیں اور پُل صراط ہے۔ ان سب سے تو ہر ایک کو گذرنا ہے لیکن ان تمام خطرات کے باوجود ہمیں یہ سفر طے کرنا ہی ہے۔

وقت کم ہے اور ہماری رفتار سُست ہے۔ منزل تک جلد پہنچنے کے لئے رفتار میں تیزی لائی بھی کیسے جائے جب کہ بہار بھی راستے میں رخنہ انداز ہو جاتی ہے۔

اندھیرے کو پیر سے ڈھکیلنے والا نور ہی کہیں ہماری آنکھوں کی روشنی نہ نگل جائے۔ اس لئے مجھے ان سب سے ہمیشہ خطرے کا احساس ہوتا ہے ـــــ آخر ہم آدمی ہیں۔

کمین بابا تو کسی کی سُنتے ہی نہیں۔ وہ بس کہانیاں سُناتے ہیں۔

ـــــ 'ایک دن ایسا آئے گا جب سب لوگ مر جائیں گے۔ اس روئے زمین پر ایک بھی جاندار باقی نہ بچ پائے گا۔ پھر ایسا ہوگا کہ آسمان شق ہو جائے گا۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔ دُنیا میں جنم لینے والے افراد پھر سے زندہ کر دیئے جائیں گے۔ لوگ قبریں پھاڑ کر نکل آئیں گے۔ اس وقت سورج سوا نیزے پہ چمک رہا ہوگا ـــــ وہ دُنیا کا سب سے بڑا دن ہوگا ـــــ وہ قیامت کا دن ہوگا۔'

بابا کو کچھ نہیں معلوم انھیں تو گرد و پیش کی بھی خبر نہیں وہ بالکل ـــــ ہیں ـــــ کتنی قیامتیں آئیں اور گذر گئیں۔ آج کا دن بھی قیامت ہے۔ کل کا بھی ہو سکتا ہے۔ پل میں پرلے ہو جاتی ہے۔ مگر بابا جانے کس قیامت کی بات کرتے ہیں۔

مر جاؤ ـــــ پھر زندہ ہو جاؤ۔ یہی ہمارا سوال ہے۔

جینا تو کوئی نہیں چاہتا لیکن زندگی سے فرار بھی تو ممکن نہیں ہے۔ زندگی ایک بوجھ ہے جسے ہم زبردستی ڈھوئے جا رہے ہیں۔

سفر کی دُشواریاں معلوم ہیں پھر بھی ہمیں بہت دور تک جانا ہے۔

ـــــ نیچے نالی کے پاس کُتیا نے ایک جھول بچے دیئے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ہی جھول کے جھول بچے جنتی رہتی ہے۔ کچھ دنوں تک پلے پیں پیں کرتے رہتے ہیں۔ پھر ذرا بڑے ہو کر کُتیا کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ اتنے بچے جننے پر

بھی وہ تنہا ہے۔ ایسا ہمیشہ ہی ہوا ہے ۔ آئندہ بھی ہوگا۔ بچوّں کو یہ نالی پسند نہیں ہے اور کُتیا اس نالی سے دور نہیں جا سکتی ہے۔ یہاں سے نہ جانا اس کی مجبوری ہے۔ نالی اور بچوّں میں فرق بھی تو بہت ہے۔ بچوّں اور نالی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتے وقت اسے شدید ذہنی کرب سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ آج تک اپنے فیصلے پر اٹل ہے۔

سامنے ہوٹل کا چھوکرا روزانہ مُرغ ذبح کرتا ہے۔ اسے مُرغ ذبح کرنے میں مزا آتا ہے۔ کیوں کہ چُھری پھراتے وقت میں نے اسے ہمیشہ مسکراتے دیکھا ہے۔ چُھری گُند ہو تو چھٹپٹاہٹ میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے لیکن میں نے اس کے ہونٹوں کی ہنسی کبھی گُند نہیں دیکھی۔

ڈربے کے اندر مُرغ اسے دیکھتے ہی سہم جاتے ہیں۔ موت کا تصور کرتے ہیں اور وہ چھوکرا موت بن کر ان کے اوپر چھا جاتا ہے۔ کتنا شاطر ہو گیا ہے وہ مرغ ذبح کرنے میں۔ پٹھے مُرغ بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ میں نے کسی کے حلق سے کبھی ذرا سی آواز بھی نکلتے نہیں سُنی۔ بس چھٹپٹاہٹ اور پیر پٹکنے کی ہلکی ہلکی آواز۔

دیکھو میں نے اُجلی دُم اور سُرخ کلغی والے مُرغ کو پکڑ لیا۔ وہ کیسا مست ہو کر اس اصیل مرغی کے گرد ناچ رہا تھا۔ اب چھوکرے کے چنگل میں آ گیا ابھی وہ اسے ذبح کر دے گا۔ مُرغ تھوڑا سا چھٹپٹائے گا۔ کچھ خون بہے گا اور ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اس کے بس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ مقابلہ تو برابر والوں سے کیا جاتا ہے۔

بابا کا کہنا ہے کہ قیامت بہت نزدیک ہے ــــ

ــــ بابا میں کہانی نہیں لکھ سکتا۔ میرے قلم کی روشنائی خشک ہو چکی ہے اور وقت بہت تیزی سے بھاگ رہا ہے۔ میرا قلم اس قدر تیز رفتار نہیں ہے اس کی نب بھی زنگ آلود ہے۔ ذرا سا دباؤ پڑنے پر ٹوٹ سکتی ہے۔

مشین کے پہیئے جب تیزی سے نہیں گھومتے ہیں تو انھیں زنگ پکڑ لیتا ہے پھر کوئی بھی سینڈ پیپر اس زنگ کو نہیں چھڑا سکتا۔ سینڈ پیپر کا رگڑنا تو سُست

رفتار عمل ہے۔ ردِ عمل اس سے کہیں تیز ہے پر مقابلہ بھلا کیسے ہو ـــــ مقابلہ تو برابر والوں سے کیا جاتا ہے۔

۲۵ سال کی عمر بلوغت کے لئے کافی ہوتی ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں کے لوگ بچپنے کی حد سے آگے نہیں بڑھتے ہیں۔ ہر طرف بچوں جیسی دھما چوکڑی پلتے ہیں اور ساری چیزیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں۔

ہوا بھی بہت تیز ہے۔ بیکار راستے میں رخنہ اندازی ہو جاتی ہے۔ سفر کٹھن اور بہت دور تک جاتی ہے۔

''ابھی تو تم نے سفر کا آغاز ہی نہیں کیا ہے۔ اس لئے تو طوالت اور مشکلات سے ناواقف ہو تم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ محض اندازے سے۔ یہ بھی نہیں دوسروں سے ملے ہیں۔ دوسروں کے پاس بھی وہ انداز استعار رہیں۔ حقیقت سوچ سے پرے بھی ہو سکتی ہے۔

''بابا آپ اپنا سفر ختم کر چکے ہیں۔ آپ نے اپنا سفر اتنی آہستہ خرامی سے طے کیا ہے کہ اندازے سے زیادہ دور ہی نہیں جا سکے ہیں۔ آپ کو خود بھی نہیں معلوم کہ کتنا سفر طے کیا کیونکہ راستے میں اندھیرا تھا اور آپ نے روشنی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مگر میں سفر شروع کرنے سے قبل سارے دروازے، کھڑکیاں ..... کے کھول دینا چاہتا ہوں کیونکہ پھیپھڑوں کو تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔ پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھر لوں تو پٹریاں بدلنا بھی آسان ہو جائے گا۔

حالانکہ شیتل نے کہا تھا۔ میرے ساتھ چلو ..... لیکن رؤف کو ایک شارٹ کٹ معلوم تھا۔ لیکن میں تو اس موڑ پر کھڑا دونوں کو تکتا رہا تھا۔ بس میں تھا اور بابا، شیتل اور رؤف کی راہیں تو متعین تھیں۔ بابا میں اب وہ جوش اور ولولہ نہیں تھا۔ وہ لٹے لٹے تھے۔ ان کے پاس ایک کتاب تھی اور اس میں پرانی کہانیاں۔ میرے لئے تو ہر راستہ نیا تھا۔ اس لئے میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکا۔

شیتل تو جو تینوں لوگوں کو ناپنے کی قدرت رکھتا تھا۔ میری رفتار بھی تیز کر سکتا

تھا۔ لیکن رؤف کا شارٹ کٹ بھی اس سے گذر کر جاتا تھا اور مجھے تثلیل کے ترشول سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ اس کی تینوں چھریاں میرے اندر اتر سکتی تھیں۔ تینوں لوگوں کی سیر کرنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی میں اس کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ حالانکہ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے میں سما چکے تھے مگر پھر بھی راستے الگ الگ تھے۔ کیونکہ ایک پٹری پر دو ریلیں بیک وقت نہیں چل سکتیں ——— رؤف نے الگ ایک شارٹ کٹ بنا لیا تھا۔

پادری نے قربان گاہ پر کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جو دُنیا کا سب سے بڑا دن ہوگا۔ اس دن نہ یہ زمین رہے گی اور نہ آسمان — بابا کی کہانی پادری بھی دُہرا رہا تھا۔

مگر میں کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے کہ میرے قلم کی روشنائی خشک ہو چکی ہے اور نب زنگ آلود ہے۔

شمع پگھلتی رہتی ہے اور پادری قربان گاہ پر کھڑا ہو کر کہانی سُناتا ہے۔ وہی بابا والی بوسیدہ کہانی۔ لیکن بابا کی بانسری کا راگ تو ہر بار اور بھی پُرانا ہو جاتا ہے اور میں اسے سمجھنے میں بھی دقت محسوس کرتا ہوں۔

وہ کتاب پڑھتے جاتے ہیں ——— اور تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۔۔۔۔۔۔۔؟

سمے سمے کی بات ہے ——— شیتل تینوں لوگوں کو ناپ سکتا ہے۔ رؤف اپنے شارٹ کٹ سے ہو کر گذر جاتا ہے اور پادری قربان گاہ پر کھڑا ہو کر وعظ بیان کرتا رہتا ہے۔ خاتمہ پر بڑی عقیدت سے سینے پر کراس بناتا ہے مگر بابا کو کتاب کے علاوہ کسی چیز سے مطلب نہیں۔ میں اپنی جگہ پر ٹنگا ہوا ہوں آخر کہ مر جاؤں ۔۔۔؟

میں عیسیٰ کے مصلوب جسم کو دیکھتا ہوں۔ ہاتھ پیروں میں کیلیں ٹھونکی ہوئی ہیں۔ خون ٹپک رہا ہے۔

سبھی مصلوب ہیں۔ پادری سینے پر کراس بنا کر خود کو مصلوب کرتا ہے کہ اس میں دُنیا کی نجات ہے۔

'قیامت ایک دن آئے گی اور وہ دن سب سے بڑا ہوگا۔

یہ بات بابا بھی کہتے ہیں اور پادری بھی۔

پر قیامت روز سر سے کیوں لڑ رہی ہے؟

اس کا جواب نہ بابا کے پاس ہے اور نہ پادری کے پاس۔ شتیل اور رؤف بھی کچھ نہیں بتا سکتے ہیں۔

کتنے بے خبر ہیں سب لوگ۔؟

بابا گھر سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتے۔ جب کہ سامنے اصطبل میں گھوڑے بندھے ہیں۔ برق رفتار گھوڑے۔ اصطبل میرا نہیں ہے تو کیا ہوا، گھوڑے کی باگ تو میرے ہاتھ میں آ سکتی ہے۔ اور جب گھوڑے کی باگ ہاتھ میں آجائے تو اسے دوڑانا کون سا مشکل کام ہے۔ تینوں لوک پیروں تلے روندے جا سکتے ہیں۔ پر نہ شتیل کو ساتھ لینے کی ضرورت ہے اور نہ رؤف کا شارٹ کٹ جاننے کی۔

کا کیا ہے وہ تو کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔

جانے کو تم جا سکتے ہو۔ میں منع نہیں کر سکتا۔ لیکن پیچھے مُڑ کر دیکھتے جانا۔ وقت گذرنے پر تمھیں احساس ہوگا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں موجود ہو۔ بتاؤ کیا یہ کرب تم جھیل لوگے۔ تمھارے قدموں کے نشانات بھی مٹ چکے ہوں گے۔ پر بتاؤ تم کس کے سہارے واپس آؤ گے؟ تمھارے لئے اس سے بڑا المیہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

"بابا یہ سفر میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

وجہ سے کام لو۔ اگر تم چاہو تو منزل تمھارے پاس بھی آ سکتی ہے۔ انتظار کر کے دیکھو۔ ابھی تو کچھ ہی بہاریں دیکھی ہیں۔ یہاں تو لوگ اتنے برسوں میں بھی سمجھدار نہیں ہو پاتے۔ اس قدر دھما چوکڑی مچاتے ہیں کہ ساری چیزیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں۔

گتھیاں اس قدر اُلجھ جائیں گی میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک ہی راستہ جو دوسروں کو منزل تک پہنچا سکتا ہے وہی کسی کو بھٹکا بھی سکتا ہے۔ ایک ہی راستہ ٹیڑھا سیدھا دونوں ہو سکتا ہے ـــــ افسوس ہے میرے قلم کی روشنائی خشک ہو چکی ہے اور زنگ آلود نب کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے۔

"بیٹا دیکھو اس اندھیرے کمرے میں بھی روشنی پھیل گئی ہے۔ شاید باہر آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔ لوگ باہر کا استقبال کر رہے ہیں۔ یہ بہار کی آمد کا جشن ہے۔ کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

یہ بہار ہی ہوگی۔

بہار گھر گھر جا کر دستک دے رہی ہے۔

"بیٹا چھت پر چڑھ کر بہار کا نظارہ دیکھو۔

بہار پورے جوبن پر ہے۔ سارا بازار لالہ زار بن چکا ہے سُرخ سُرخ پھول ڈامر کی سیاہ سڑک پر کھل گئے ہیں۔ ہر مکان سے آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔ ایک ہجوم دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

شاندار میرے مکان سے بھی آتش بازی داغنا چاہتے ہیں۔ یا پھر ہمیں بہار کو ٹھہرانا چاہتے ہیں؟

بابا ہم لوگ کس قدر خوش قسمت ہیں جو اس موسم میں پیدا ہوئے ـــــ

"دیکھو بابا منزل خود ہمارے پاس آگئی حالانکہ ہم نے ابھی سفر کا آغاز ہی نہیں کیا ہے۔

مگر بابا کسی کی نہیں سنتے۔ بس اپنی ہی سناتے ہیں ـــــ "اے ایمان والو تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟؟"

چیونٹیاں اور ٹیڑھے میڑھے راستے

(نسیم اختر)

دن بہ دن چیونٹیوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اندر کا کمرہ اب بہت چھوٹا ہوگیا تھا۔ مجھے ڈر تھا، اگر چیونٹیوں کو باہر نہ نکالوں تو شاید وہ خود باہر آنا چاہیں، اور یہ خطرناک ہوسکتا تھا۔ اور ایک دن میں نے فیصلہ کرلیا اور کمرے کے دروازے کا تالا، جو برسوں سے بند تھا، کھول دیا۔ اور چیونٹیوں کو اجازت دے دی کہ وہ باہر آجائیں۔ چیونٹیوں کو میری رہنمائی بھی ضروری تھی۔ میں نے اُن کی کئی قطاریں بنائیں اور دائیں سے بائیں انھیں چلانا شروع کر دیا عمل صاف اور واضح تھا۔ میں نے چیونٹیوں کی سیکڑوں اور ہزاروں قطاریں بنائیں۔ لیکن جیسے جیسے اندر کی چیونٹیاں باہر آتی جاتی تھیں۔ اندر کے کمرے میں پتہ نہیں کہاں سے دوسری چیونٹیاں اُن کی جگہ لے لیتیں۔ میں پھر بھی پریشان نہ تھا۔ میں اس عمل میں دلچسپی لینے لگا تھا اور مجھے گہری طمانیت اور مسرت محسوس ہونے لگی تھی۔ اندر کے کمرے سے چیونٹیوں کا باہر کے کمرے میں آنا اور پھر وہاں سے سامنے کے لمبے چوڑے میدان میں جانا بہرحال ایک پیچیدہ عمل تھا اور مجھے اس کے لئے محنت بھی بہت کرنی پڑتی تھی۔ ایک طویل عرصے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مگر میدان کے مکینوں نے چیونٹیوں کے اس عمل پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کچھ لوگ اتنے اونچے ٹیلوں پر بیٹھے تھے کہ چیونٹیاں انھیں نظر ہی نہیں آتی تھیں کچھ لوگ دیکھ کر نظرانداز کر دیتے تھے کہ انھیں رنگ برنگی دل افروز چیونٹیوں کی تمنا تھی اپنی انتھک محنت اور جاں فشانی کا یہ انجام مجھے رُلا گیا۔ اور ایک عرصہ کے لئے میں نے یہ عمل بند کر دیا۔ میں نے غور کیا اور محسوس کیا کہ میری ہی طرح کچھ اور لوگ بھی ہیں جو اس عمل کے شکار ہیں مگر ان کی چیونٹیوں کی قطار بائیں سے دائیں جاتی تھیں۔ میدان

میں اُن کے جاننے والے بہت تھے جو ان کی تعریف کرتے نہ تھکتے۔ پھر میں نے ایک اور فیصلہ کیا۔ میں اپنی چیونٹیوں کو دائیں سے بائیں کی، بجائے، بائیں سے دائیں لے جاؤں گا کہ میں عمل کے اس رُخ سے بھی واقف تھا۔ میں نے ویسا ہی کیا۔ بہت سے لوگ ٹیلوں سے اُترنے لگے۔ کچھ نے تعجب سے دیکھا۔ کچھ نے تعریف کی۔ کچھ غور وفکر میں ڈوب سے گئے۔ میں خوش تھا۔ اتنے سارے لوگوں کی توجہ جو مجھ پر تھی۔ پھر یہ عمل بے فائدہ بھی نہ تھا دائیں سے بائیں جب تک میں چیونٹیوں کو چلانے کا عمل کرتا رہا تھا۔ ایک آدھ آدمی کی تعریف کے علاوہ اور کچھ فائدہ نہ ہوا تھا کسی نے کوئی انعام نہ دیا تھا۔ مگر میری چیونٹیوں کا بائیں سے دائیں چلنا میرے لئے فائدہ کا باعث ہوا۔ مگر بائیں سے دائیں والے قبیلے کے کچھ افراد ایک قبیلے کے فرد کی موجودگی برداشت نہ کر سکے اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ اس قبیلے میں اکثریت انھیں کی تھی اس لئے میں دل برداشتہ ہو کر واپس اپنے قبیلے کی طرف ہو گیا۔ ابھی میں سوچ میں ڈوبا ہی تھا کہ عمل کہاں سے اور کیسے شروع کروں کہ میری نظر دائیں سے بائیں چلنے والی چیونٹیوں کی بے شمار قطاروں پر پڑی۔ یہ میرے ہی قبیلے کے لوگوں کے عمل کا نتیجہ تھا۔ مگر چیونٹیوں کے عمل کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بہت غور کیا تو ایک آدھ قطار کی بات سمجھ میں کچھ کچھ آ گئی۔ مگر باقی کا وہی حال تھا۔ اگرچہ وہ دائیں سے بائیں ہی جا رہی تھیں مگر لگتا تھا جیسے کبھی کبھی وہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر بھی جاتی ہوں۔ صرف میں ہی نہیں، میدان کے تقریباً سبھی لوگ اس عمل پر حیران ہو اُٹھے اور سبھوں نے ان پر توجہ دینی شروع کر دی۔ کچھ نے اہمیت تو نہ دی، مگر ذکر ضرور کرتے رہے۔ خواہ وہ انھیں کنڈم کرنے کی نیت سے ہی کیوں نہ ہو۔ اس نئے عمل نے ایک تہلکہ برپا کر دیا۔ جدھر دیکھو جس کو دیکھو اسی کے چرچے کر رہا ہے۔ مخالفت اور موافقت کے اس دو رُخے طوفان میں یہ عمل پرورش پاتا رہا۔ اس طرح ایک مختصر عرصہ گذر گیا۔ اب چیونٹیوں کے اس ٹیڑھے عمل کا مفہوم کچھ لوگوں کی سمجھ میں آنے لگا تھا جن میں میں بھی ایک تھا۔ سمجھنے والوں کی تعداد بہرحال آٹے میں نمک کی طرح مختصر تھی۔ اکثریت نے اتنی مخالفت کی کہ میدان کے

سارے لوگ انھیں چیونٹیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ اور تب میں نے سوچا۔ چیونٹیوں کا یہ عمل ہی آج کے لئے مناسب ہے اور میں نے بھی اپنی چیونٹیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے پُرانے عمل کو نئے میں ضم کر دیں۔ اور ـــ میری چیونٹیوں پر بھی لوگوں نے توجہ دی اور اُن کے چرچے کئے۔ کچھ لوگوں نے طنز بھی کیا کہ چیونٹیوں کا خالق خود اُن کے عمل کے مفہوم سے ناواقف ہے۔ میدان کے لوگ بھلا کیا سمجھ پائیں گے۔ چیونٹیوں کے اس عمل میں دلچسپی لینے والوں کی اب اچھی خاصی تعداد ہو چکی تھی۔ پھر بھی انھیں اکثریت نہ مل سکی تھی۔ میرے ملنے والے دوست، پڑوسی اور دوسرے لوگ میری اس تبدیلی کو تنزّلی سے تعبیر کر رہے تھے اور مجھے بار بار یہ تلقین کرتے کہ میں اپنی یہ نئی ڈگر چھوڑ دوں اور پُرانی راہ اپنا لوں کہ پُرانی راہ کے ہم سفر اب بھی اکثریت میں ہیں۔ میں نے سوچا، کیا وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ کیا واقعی یہ ڈگر ان دیکھی اور نامعلوم ہے۔ کیا اس کی کوئی منزل نہیں۔ میں اکثریت کا ساتھ دوں یا اقلیت کا ـــ میں سوچتا رہا۔ مسلسل سوچتا رہا۔ اور تب میں نے فیصلہ کر لیا۔ میرے اندر کے کمرے میں جو شخص چھپا بیٹھا ہے، وہ تو مطمئن ہے۔ میں نے دیکھا وہ بہت خوش ہے۔ چیونٹیوں کے نئے عمل نے اس میں زندگی کی ایک نئی لہر سی پھونک دی ہے۔ کبھی نہ کبھی تو میدان کے لاکھوں لوگوں کو چیونٹیوں کے نئے عمل میں حالات کی صحیح عکاسی ملے گی ہی! اور میں مُسکرانے لگا۔ میں نے ایک ساتھ اندر کے کمرے میں بند ساری چیونٹیوں کو آواز دی، انھیں حکم دیا کہ وہ اپنا نیا عمل ایک نئی لگن اور اُمنگ سے جاری رکھیں۔ اور میرے اندر کے کمرے میں کھلبلی مچ گئی۔

باہر کا کمرہ

(نشاط قیصر)

اور پھر ایسا ہوا کہ میں نے رنگوں کی قید سے آزاد ہونے کے لئے اپنی ماں کا قتل کر دیا......... جس لمحے میں نے اپنی ماں کا قتل کیا تھا ٹھیک اسی لمحے (اور قتل کرنے کے کچھ لمحے پہلے بھی) مجھے ایک لازوال سی مسرت کا احساس ہوا تھا۔

لیکن کچھ لمحوں کے بعد ہی رنگوں نے مجھے پھر آدبوچا پتہ نہیں کس قوت کی تحریک ہے .... لیکن غنیمت یہ ہوا کہ میں نے ان چند لمحوں کو اپنی مٹھی میں دبوچ لیا تھا... اور مٹھی اپنی پوری قوت سے بند کئے تھا۔ میں نے رنگوں سے بڑی منت و سماجت کی ــــ چیخا ــــ چلایا لیکن میری ایک نہ چلی۔ اور اُلٹے انھوں نے مجھ پر یہ ظلم ڈھایا کہ میری آواز کو پکڑ کر قتل کر ڈالا ــــ جس طرح انھوں نے میری آواز کو قتل کرنا چاہا، ٹھیک اسی لمحے میرے ہاتھ رنگوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے آگے بڑھے۔ میری بند مٹھی کھُل گئی ــــ اور وہ لمحے ــــ لازوال صورت سے بھرپور لمحے ــــ جنھیں میں نے اپنی مٹھی میں جکڑ رکھے تھے نکل بھاگے ــــ میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ رُک گئے ــــ میں نہ آگے بڑھا ــــ اور نہ پیچھے ہٹا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

گڈ مڈ کرتی نا آشنا ذائقوں کی چڑھتی ندی نے انجان سنسان ساحل پر لا پٹکا۔ میں لمحوں کو راکی ــــ ہمالہ اور انڈیز کے پہاڑی سلسلوں میں تبدیل کر دینا چاہتا تھا ــــ مگر وہ لمحے ــــ میں نے یہ واقعہ اپنے ایک دوست کو سُنایا تو اس نے اس واقعہ کو بڑے غور سے سُننے کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ ــــ ایسے ہی بہت سے لمحوں نے مل کر دُنیا کے سات بڑے سمندروں کی شکلیں اختیار کر لی ہیں اور یہ کہ دُنیا کے

ایک بڑے حصّہ کو اپنی حفاظت میں کر رکھا ہے۔

اور یہی وہ باہر کا کمرہ ہے جہاں میں نے قتل کیا تھا۔ اس سے پہلے اس کمرے میں اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا ــــــ یہ کمرہ ایک سجا سجایا خوشنما کمرہ تھا ــــــ اندر کے سب کمروں سے الگ تھلگ ــــــ لیکن میں نے اس کمرے میں اپنی ماں کا قتل کر دیا ــــــ ماں جو عزیز ترین خواہش تھی ــــــ اور اب کمرے کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ میں نے اپنے کمرے سے آرائش کا تمام سامان اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینک دیا ہے، جس مکان میں باہر والا کمرہ ہے۔ اس میں اور کئی بھی چھوٹے بڑے کمرے ہیں اب میں نے اپنے باہر والے کمرے میں ایک بڑا سا تالا لگا دیا ہے اور میں اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا ہی گوارا نہیں کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک سنگین واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ ایک شخص نے مجھ پر بھری دوپہر میں کلھاڑے سے وار کرتے ہوئے اعتراض کیا کہ میں نے اپنے باہر والے کمرے کو کیوں بند کر رکھا ہے اور پھر قدرے نرم لہجے میں مجھ سے کہا کہ تم نے اپنے مکان کا سارا show ختم کر لیا ہے!"

"اس کے پہلے وار کو ہنس کر میں سہہ گیا۔ اور میں نے اس سے انسانی ہمدردی کے ناتے کہا کہ تم بھی اپنے باہر والے کمرے میں تالا لگا دو۔"

سُننا تھا کہ اس نے پھر مجھ پر اپنا وہی کلھاڑا (جس کا پھل اور دستہ دونوں پتھر کا تھا) تان لیا۔ میرے جسم سے خون پھر تیزی سے بہہ نکلا۔ میں زمین پر گر پڑا لیکن پھر بھی میں نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے تھے کہ میری آنکھوں کے سامنے وہ شخص مختلف رنگوں میں تبدیل ہو کر بہہ گیا۔

پریشان پریشان سا تھا ــــــ

میرے کالے شعور کی سیاہی نے میرے لاشعور کی سفیدی پر اپنا رنگ آہستہ آہستہ جمانا شروع کر دیا تھا۔ اور ان لمحوں کی تلاش۔ جنھیں رنگوں نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ میرا بس چلے تو ایک ایک کر کے تمام رنگوں کا گلا گھونٹ دوں ــــــ لیکن رنگوں کی قوت کا بھی بھرپور احساس ہے۔

"یا کہ میں رنگوں سے خائف ہوں۔"

"دُنیا کی تباہی میں رنگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔"

اب میں زیادہ تر اندر والے کمرے میں بند رہتا ہوں۔

رنگوں نے اب ان سات بڑے سمندروں پر بھی اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا تھا اور یہ کہ اپنی قوت سے ان میں بڑی ابتری پھیلا رکھی ہے۔

"سمندروں نے اب اپنے مُنھ سے خون تھوکنا شروع کر دیا تھا۔"

ہیلو ——

واٹ اباٹ یو؟

اوہ، یس، ناٹ ٹو بیڈ۔!

(اس شخص کے مکان کا باہر والا کمرہ بڑا شاندار ہے)

میں نے اس سے جب اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو اس نے میری بات سُن کر ایک زبردست دل ہلا دینے والا قہقہہ لگایا (جیسے بہت زمانے سے یہ قہقہہ اس کے سینے میں محفوظ ہو) اور کچھ دیر بعد اس طرح گویا ہوا —— "اگر رنگوں کی قید سے آزاد ہونا چاہتے ہو اور کھوئے ہوئے لمحوں کو پھر سے پانا چاہتے ہو تو —— اپنے اندر والے کمرے سے ہوشیار رہو۔"

مجھے اس کی بات پر یقین تو نہیں آیا۔ لیکن کچھ خائف ضرور ہو گیا۔ اور پھر ایسا ہونے لگا۔ میں اکثر اپنے اندر والے کمرے میں بیٹھا کسی حادثے کا منتظر رہتا۔ اور اس خدشے نے ایک دن حقیقت کا روپ دھار ہی لیا۔

ایک دن جب میں گہری نیند سویا تھا کہ کسی نے مجھے اُٹھا کر اتنی زور سے زمین پر دے مارا کہ میری ہڈیاں چٹخ سی گئیں۔ میرا سارا وجود دہل سا گیا۔ میری آنکھیں بند سی ہونے لگیں۔ میں نے انھیں بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھا تو میری رہی سہی قوت بھی تقریباً جاتی رہی۔ مجھ سے کچھ ہی دور پر ایک نہایت خوفناک

شکل والا شخص کھڑا تھا۔ میں نے ایسی کسی شکل و شباہت کا تصور بھی آج تک نہیں کیا تھا۔ مجھ میں اس سے کچھ پوچھنے کی صلاحیت تک نہیں رہ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھے کھلونے کی طرح اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔ اور مجھے لئے ہوئے مکان سے باہر چلا آیا۔ اور پھر مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک تنگ و تاریک گلی میں مڑ گیا۔ اور پھر اس نے مجھے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر کی طرف ڈھکیل دیا۔ رنگ میرے منتظر تھے۔ رنگوں نے مجھے دیکھ کر زبردست قہقہہ لگایا۔ میں بالکل بے قابو ہو گیا۔ جب واپس لوٹا تو میں نے خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ یہیں ایک کونے میں بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ میں نے خوف سے ایک جھرجھری سی لی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں جتنا بھی اس سے متعلق سوچتا وہ اتنا ہی میرے ذہن پر مسلط ہوتا جاتا

دوسرے دن جب رات کی تاریکی پھیلی تو اس شخص نے مجھے ایک ریوالور دیا اور کہا کہ میں فلاں شخص کا قتل کر دوں۔ یہ سن کر میں سخت گھبرایا۔ اور سوچا کہ کیسے اس شخص سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ میرے اس خیال کا اسے پتہ چل گیا۔ اس لئے اس نے مجھے سختی سے کہا کہ میں قتل ہی کر دوں۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے میری گردن پکڑ کر کہا کہ چلو۔ میں بالکل بے بس چل پڑا۔ جب میں نے اس شخص کا قتل کر دیا تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کسی طرح بچتا بچاتا نکل بھاگا۔ ساتھ میں وہ بھی تھا۔ اس کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے خوب خوب قہقہے لگائے۔ وہ ہر وقت میرے سر پر سوار رہتا۔ جس طرح چاہتا کام لیتا۔ لیکن میں کوشش برابر کرتا تاکہ اسے ذہن سے جھٹکتا رہوں۔ (لیکن شاید میں خود اس کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا)

ایک بار جب میں باہر والے کمرے کے متعلق سوچ رہا تھا جسے میں نے بند کر رکھا تھا۔ اور اس وقت یہ شخص میرے ذہن سے بالکل الگ تھا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشاں پریشاں سا ہے۔ یہ دیکھ کر میں کچھ متحیر سا ہوا۔ اور پھر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

"تب مجھے یہ گمان ہوا ـــــ اور میں نے آہستہ آہستہ اس کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا جس کا نتیجہ حیرت انگیز طور پر یہ ہوا کہ وہ شخص کوشش کرتا تو میں اسے دھکا دے کر گرا دیتا۔ کیونکہ اب وہ ایسا ہی تھا۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ دن دن بھر ایک کونے میں بالکل بے بس پڑا رہتا۔ اور اب میں بلا روک ٹوک کہیں بھی آجا سکتا تھا ـــــ اور ایک دن میں نے موقع مناسب جان کر اسے زنجیروں میں قید کر دیا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ کیونکہ اب وہ اس قابل ہی نہ تھا۔

جب میں نے اسے قید کر لیا تب میں نے اپنے آپ کو بالکل آزاد پایا۔ اور میں نے ایک نہایت لطیف سانس کھینچی۔ اس کے قید ہوتے ہی باہر والے کمرے سے جس میں میں نے تالا لگا رکھا تھا۔ ملی جلی کراہنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے باہر والے کمرے کو کھولا۔ یہاں سے وہاں تک سر جھکائے تمام رنگ کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ اور ان کے منہ سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ میں نے انھیں بے دردی سے باہر نکالا اور ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔

تب میں نے باہر والے کمرے کو پھر سے خوب سجایا۔ میرے شعور کی سیاہی بھی چھٹ چکی تھی۔ اور وہ لمحے جنھیں رنگوں نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ میری ہتھیلی پر موجود تھے۔
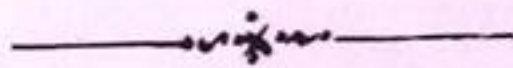
بے گور و کفن

(عابدہ قمر)

میں کمرے سے باہر نکلنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک سایہ کی مانند میرے پیچھے آکر چپ چاپ کھڑا ہو گیا ہے۔

میں نے بال سنوارنے کے لئے آئینہ اُٹھایا۔ دو پتھریلی پتھریلی بے نور آنکھیں مجھے گھورنے لگیں۔ اس کے سراپا کی ساری بے بسی ان دو آنکھوں میں ڈھل گئی ہے۔ جیسے کسی کی موت پر لاکھ کوشش کے باوجود یہ آنکھیں آنسو بہانے سے قاصر رہی ہوں۔

"یا خدا ان گھورتی آنکھوں سے مجھے نجات دلا۔" میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔

"ہوں" تو اب آپ اپنے چہرے پر ایک نیا خول چڑھا رہے ہیں؟" وہ بڑبڑایا

"خدا کے لئے، تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔ یا الٰہی میں آخر یہ کس آسیب کے چکر میں پھنس گیا ہوں۔"

میرے ان جملوں نے اس پر ذرا بھی اثر نہ کیا۔ ایک تضحیک آمیز ہنسی اس کے لبوں پر پھیلتی گئی۔ اور جب میں کمرے سے باہر نکلا تو وہ سایہ کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ حالانکہ میں نے کافی لعنت ملامت کے بعد اپنی دانست میں اسے کمرے ہی میں مقفل کر دیا تھا۔ لیکن توبہ کیجیے۔ بھلا کوئی آسیب بھی کہیں قید کیا جا سکا ہے؟

مجھے اس کی ساری حرکات و سکنات بے جان نظر آتی ہیں۔ میرے لئے اس پراگندہ روح کا ہر عمل قابل معافی ہے۔ لیکن اس کے لہجہ کی بے باکی سے مجھے بڑا خوف آتا ہے۔ اور پھر وہ اس کا منہ پھٹ انداز! میں دلجمعی سے کسی کام میں منہمک رہوں یا کسی سے محو گفتگو۔ وہ میری پشت پر آکر اپنا منہ میرے کان کے قریب لے آتا ہے۔ اور نہایت ہی تمسخرانہ لہجہ میں گویا ہوتا ہے۔

"دیکھو یہ نری نقالی ہے پیارے - اور تم تو اس میں بھی کامیاب نہیں ہو پا رہے ہو۔۔"

اور تب میری قوت برداشت جواب دے جاتی ہے - میں جھنجھلا اٹھتا ہوں۔
"بھئی آخر تم کون ہوتے ہو میرے معاملات میں دخل دینے والے - تم خاموش رہو - ورنہ میں مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دوں گا۔"

لیکن لاکھ چاہنے پر بھی میں اس پر ہاتھ نہ اٹھا سکا ہوں - بس وہی، اس کی صورت دیکھتے ہی میرا سارا غصہ ماچس کی گیلی تیلی کی مانند پھڑپھڑا کر رہ جاتا ہے۔
بے نمک سا چہرہ - بے جان و مضمحل قویٰ - بے نور سی ماتم گسار آنکھیں۔
اس کا سارا وجود ایک ایسا لاشہ تھا جس کی روح نہ جانے کب کی سلب کی جا چکی تھی -

میں چوراہے پر آ کر رک گیا ہوں - اس کے قدموں کی آہٹ بھی تھم گئی ہے - بغل سے گذرتے شناسا نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا ہے - انشاء سے خیریت دریافت کی ہے - میرے ہاتھ بھی مشینی انداز میں اٹھ گئے ہیں - میں نے کہا ہے -"جی ہاں سب خیریت ہے !"

'ایکدم بکواس - بالکل غلط !' وہ چڑچڑا اٹھا — تم کہنا تو یہ چاہ رہے تھے کہ — ارے جناب بی خیریت تو کب کی انتقال کر چکی ہیں - اب ان کی مزاج پرسی کیا معنی رکھتی ہے !' اور میں تلملا کر رہ گیا ہوں -

میں وہاں سے چل پڑا - لوگوں کے ازدہام میں اس کے قدموں کی آہٹ گم ہو چکی تھی - مجھے یک گونہ سکون حاصل ہوا - اس کی موجودگی کے احساس سے ہی مجھ پر اضطراری کیفیت طاری ہو جاتی ہے - میں نے اپنے دونوں ہاتھ پینٹ کے جیبوں میں ڈال لئے ہیں - میرے چہرے پر طمانیت کی ایک جھالرسی جھلملانے لگی ہے - میں اس بھیڑ میں لوگوں پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوا ایک شانِ بے نیازی سے آگے بڑھ رہا ہوں۔

ساری رات بادو باراں کی یورش کے بعد نیا سورج جیسے مژدہ جانفزا لے کر آیا ہو۔ موسم بڑا خوشگوار ہو گیا ہے ۔ میرے لب گنگنانے لگے ہیں۔

وہ یکایک میری پشت سے آلگا اور یوں گویا ہوا۔

"اُفوہ ! تم نے پھر ایک نیا پوز اپنے اوپر طاری کر لیا نا ؟ اس بھیڑ میں ہر فرد انتہائی کرب کے عالم میں نئے سورج پر نظریں جمائے۔ ٹھنڈی ہوا دل سے اپنے آپ کو ترو تازہ بنانے کی کوشش میں مصروف۔ تنہائی کی لاٹھی تھامے اپنے وجود کو گھسیٹ رہا ہے۔

اور تم اس کیفیت کو جھیلنے سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہو۔ یہی نا ؟

لیکن یہ ناممکن ہے ـــــ تم سب کب کے مرچکے ـــــ بس اپنا اپنا بے جان لاشہ ڈھوتے پھر رہے ہو۔"

میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ان جملوں نے مجھے سر سے پیر تک یخ زدہ بیڑی سے جکڑ دیا ہے۔

اب میں لب سکوڑے، آنکھیں صفر پر جمائے سراسیمہ سا کھڑا ہوں۔

"کہو بھئی آفس چل رہے ہو ؟"

"جی ہاں سر !"

"تو پھر آؤ نا" ـــــ بڑے بابو نے رکشہ رکوا دیا۔

میرے بوجھل قدموں میں ایک تیزی آگئی ہے۔ میں جا کر ان کی بغل میں بیٹھ گیا ہوں۔ اور وہ جیسے مٹھیاں بھینچا دانت پیستا دہیں کھڑا رہ گیا ہے ـــــ میرے لبوں پر مسکراہٹ بسورنے لگی ہے۔

بڑے بابو نے مجھ سے کچھ کہا ہے۔ اور میں نے صرف 'جی ہاں جی ہاں' کی رٹ لگا رکھی ہے۔

"کیا بات ہے تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو ؟"

جی میں آیا ان سے ساری روداد بیان کر دوں ۔ کہوں کہ وہ کمبخت میرے

پیچھے پڑا ہوا ہے - اس کا کہنا ہے کہ میں مر چکا ہوں - اور خواہ مخواہ جینے کی نقالی کیے جا رہا ہوں -

اب آپ ہی بتائیے نا بڑے بابو، کہ اگر ایسا ہے تو پھر لوگ مجھے —— ہاں ہاں لوگ آخر لوگ اتنے بے حس کیوں ہو گئے رہیں ؟

لیکن میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا ہے - اپنے آپ سے بھی نہیں - اوہ، شاید میں اس سے مخاطب ہو گیا تھا - وہ جو پیچھے چھوٹ گیا ہے !

رکشہ رک گیا - میں جیسے غنودگی سے چونک پڑا ہوں - مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے رکشہ والے کو پیسے دے رہا ہوں کہ کانوں میں اس کا قہقہہ گونجنے لگا -

" ہا ہا ہا - تمہاری مسکراہٹ اتنی بے جان کیوں ہے - بھئی وہ بھی تو کب کی مر چکی !"

" کیا کچھ پیسے گھٹ رہے ہیں - رہنے دو میں دے دیتا ہوں -" بڑے بابو نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا - "جی نہیں، دے تو رہا ہوں -" میں گھگھیانے لگا -

جب ہم آفس میں داخل ہوئے، تو میری جان میں جان آئی - اب بھلا وہ کیسے آپائے گا -

گیٹ پر تو باوردی دربان کھڑا ہے -

میرے ٹیبل پر ڈھیر ساری فائلیں منتظر تھیں - میں اپنے کام میں منہمک ہو گیا ہوں - تھوڑی ہی دیر میں طبیعت جیسے اوب سی گئی ہے - روز مرہ کے معمول نے مجھے مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا ہے - اور مشین بھی تو بے جان ہوتی ہے —— یہ سوچتے ہوئے، میری نظریں سامنے کھڑکی سے دہکتے سورج پر مرکوز ہو گئی ہیں -

"تمہیں کسی نئے، سورج کی تلاش ہے نا ؟ تو بھئی اس کا سامنا اب روز حشر ہی میں ہو گا -"

اُس کے لہجہ کی سفاکی نے مجھ پر ہیبت طاری کر دی ہے -

وہ یہاں بھی آپہنچا تھا - اس سے بچاؤ کی مجھے کوئی تدبیر نہ سوجھی - میں نے

بے بسی کے عالم میں ٹیبل پہ سر رکھ کر اپنے اوپر غنودگی کی کیفیت طاری کر لی ہے۔

اور اب میں آفس سے واپس پیدل لوٹ رہا ہوں۔ تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

ہمیشہ کی طرح خرید و فروخت کا بازار گرم ہے۔ ہر طرف چہل پہل اور ہنگامہ آرائی کا ایک طویل سلسلہ ! لیکن میں جیسے ایک عجیب سے اچاٹ پن کا شکار ہو گیا ہوں۔ جیسے بے کیفی کی ایک لہر میرے رگ و پے میں سرایت کر دی گئی ہے۔ ہمیشہ کی طرح میں سوچ رہا ہوں ــــــــ نشی میری آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوگی۔ اور میرے بڑھتے قدم میں تیزی آگئی ہے۔

نشی کے گھر پہنچتے ہی اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا ہے۔ میں اسے باہوں میں بھر کر پیار کرنے لگا ہوں۔

"دھت ہٹئے بھی۔ آپ تو یوں تیزی دکھا رہے ہیں۔ جیسے جذبہ کی کمی کو چھپانے کے لئے کوئی تصنع سے کام لے۔"

"نہیں نشی، تم ایسا نہیں کہہ سکتیں۔ کیا سچ مچ تمہیں . . . . ."

"چلئے ہٹئے بھی۔ میں چائے لے کر ابھی آئی۔" نشی کے ڈوبتے قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی اُس کے قدموں کی آہٹ اُبھرنے لگی ہے۔ اور میں بے دم ہو کر بستر پہ گر پڑا ہوں۔ وہ سرہانے کھڑا ایک بھیانک قہقہہ بلند کرتے ہوئے بولا ــــــــ

"میں کہہ رہا ہوں نا کہ تم تو کب کے مر چکے۔ بھلا کٹھ پتلی میں بھی روح ہوتی ہے۔ اب یہ زندہ رہنے کا ناٹک بند کرو۔"

"ہاں ہاں ! میں مر چکا ہوں۔ لیکن آخر لوگ اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں۔ لوگ آخری رسوم کا انتظام کیوں نہیں کرتے۔ مجھے کیوں دفن کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ بولو کیوں ؟ آخر کیوں۔ ؟؟"

میں نے ہیجانی کیفیت میں اُس کے گلے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

میری گردن کی نسیں پھولنے لگیں۔ آنکھیں ابلی آرہی تھیں۔ میری گردن اپنے ہی ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑی تھی !

ــــــــ

سبز نقش

(نزہت نوری)

میرے سامنے زمین پر چاول کے برابر ایک ننھا سا سبز رنگت والا کیڑا رینگ رہا ہے۔ اس کے چلبلے سے سبز جسم پر اُٹھنے والی چھوٹی لہریں میرے اندر تجسس اور خوف کے ملے جُلے جذبے بیدار کر رہی ہیں۔ یہ کیڑا ابھی ابھی مٹر کی پھلی کے اندر سے باہر نکل کر زمین کے سینے پر چلنے لگا ہے۔ گویا یہ اپنے ازلی قید خانے سے فرار حاصل کر کے ایک انجانے ماحول کی پُر اُمید آب و ہوا میں سانس لینے کو باہر نکل آیا ہے۔ اس کا سبز سبز ماحول جس نے اس کی شخصیت کو بھی سبز رنگت عطا کی ہے اور جسم میں بھی لال پانی کے عوض سبز پانی کی پیدائش کی ہے اب اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ مٹر کی پھلی ادھ کھلی سی، زمین پر پڑی ہے اور یہ کیڑا اس سبز خول سے اس طرح بھاگ آیا ہے کہ جیسے اس نے اپنی نسل سے بغاوت کر دی ہو۔ اب اس کا مکان وہ نہیں جو پہلے تھا۔ اب وہ لامکاں ہے۔ اب وہ واپس اس خول میں کبھی نہیں جائے گا۔ کیڑا اسی عزم کے ساتھ آگے سرکتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا ننھا سا نرم جسم زمین کی سخت سطح سے ٹکراتا ہے پھر ایک مد و جزر کی سی کیفیت پیدا کرتا ہوا ہوئے ہوئے لہروں میں تحلیل ہوتا ہوا آہستہ آہستہ آگے سرکنے پر آمادہ ہے۔ لحظہ بہ لحظہ —— یہ سفر نیا ہے اور زمین سخت ہے اور ماحول دُشمن ہے۔

میں کیڑے کے آگے ایک چھوٹی سی رُکاوٹ کھڑی کر دیتی ہوں۔ اس کی چال میں جو اعتماد آ رہا تھا وہ اس روک سے ٹکرا کر اچانک لرز گیا ہے اور کیڑا ایک لمحے کے لئے بے حس و حرکت اس روک سے کھڑا رہتا ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کی ادا میں ایک فلسفی کے ارادے جھلک رہے ہیں۔ جیسے سوچ رہا ہو —— "ٹھہرو ذرا

سوچ لوں کہ اب "کیا کرنا ہے"! کیڑے میں اچانک حرکت ہوتی ہے اور اب وہ دوسری سمت کو چل پڑتا ہے۔ میں آہستہ سے ایک اور روک کھڑی کر دیتی ہوں۔ وہ سمت بھی بند ہو گئی ہے ــــــ کیڑا جیسے حالات سے مقابلہ کرنے کو تیار ہے اس لئے وہ تیسری سمت پھر چوتھی سمت، پھر پانچویں اور چھٹی سمتوں کی طرف مڑتا چلا جا رہا ہے اور میں یہ راہ کو روکتی چلی جا رہی ہوں یہاں تک کہ تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں اور وہ کیڑا انسانی ہاتھ سے بنائی ہوئی خوفناک دیوار کے درمیان محصور ہو کر بڑی اُلجھن و پریشانی میں زمین کی محدود وسعت میں چکّر لگا رہا ہے۔ مجھے اس کی اس حرکت پر ہنسی آ رہی ہے۔ کیڑا ایک بے بس قیدی کی طرح ان دیواروں کے چاروں طرف گھوم گھوم کر راہیں ڈھونڈھ رہا ہے۔ پھر یکایک وہ اپنے چھوٹے سے جسم کے آدھے حصّے کو زمین سے بلند کر کے اپنے بے حد ننھے ننھے ہاتھوں کو فضا میں لہرا لہرا کر خُدائی مدد طلب کرتا ہے۔ مجھے اس کی اس ادا پر اب پیار آ رہا ہے۔ اپنی بساط سے زیادہ جو کوئی بھی کچھ کرے تو اس پر پیار آتا ہی ہے۔ میں غور سے اس کو دیکھ رہی ہوں۔ نہیں یہ دُعا نہیں مانگ رہا ہے بلکہ اپنی نا معلوم خطاؤں کی بڑی لجاجت سے معافی مانگ رہا ہے ــــــ میں غور سے دیکھتی ہوں۔ نہیں یہ تو کوئی اور ہی بات ہے۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ وہ کیڑا دراصل نہ دُعائیں مانگ رہا ہے اور نہ معافی بلکہ انتہائی غُصّے میں اپنے ناتواں ہاتھوں کو لہرا لہرا کر کوئی طوفانی لکچر دے رہا ہے ظلم و بربریت کے خلاف ــــ مجھے اس کی یہ حرکت اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ وہ اپنی اوقات بھول رہا ہے کیڑا اچانک زمین کے بل لیٹ جاتا ہے اب وہ ہمّت کر کے روک کی ان دیواروں کو سر کرنے کی مہم شروع کر دیتا ہے مگر اس کا کمزور پلپلا جسم ہر دفعہ نیچے گر پڑتا ہے اور وہ دیواریں نہیں عبور کر پاتا۔ مجھے اس کی اس جرأت پر حیرت سے زیادہ غصّہ آ رہا ہے اور اب میں کیڑے کو اس کی گستاخی کی سزا دینے کو سوچ رہی ہوں۔ ایک چھوٹی سی سفید اور شفاف شیشی میں کیڑے کو آہستہ سے ڈال کر اس کا

ڈھکن بند کر دیتی ہوں ــــ اب وہ کیڑا میری مٹھی میں آچکا ہے اور میں اس کو سفاک مسکراہٹ سے دیکھ رہی ہوں۔ کیڑا شیشے کے ماحول سے ایک دم بوکھلا گیا ہے اور بار بار تیز تیز رفتار سے اِدھر اُدھر گھوم گھوم کر راستہ تلاش کر رہا ہے۔ میں کان لگا کر سُن رہی ہوں وہ مجھ سے کچھ کہہ بھی رہا ہے۔ میری تنگ دلی اور میری کج ظرفی پر گالیاں دے رہا ہے شاید ــــ کیونکہ اُسے مجھ سے اس کی اُمید ہرگز نہ تھی کہ یوں ایک عظیم انسان ایک حقیر کیڑے سے قدرت کی کسی بے انصافی کا بدلہ لے ــــ

"کیڑے چپ ہو جاؤ۔!" مجھے اس کی ٹائیں ٹائیں اب اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ مگر وہ نہیں رُکتا اور اپنی زبان میں مجھے بے تحاشا گالیاں دیتا جاتا ہے اور اب نیم پاگل پن کی حالت میں شیشی کے تنگ کمرے میں اُچھل کود شروع کرنے لگا ہے۔

"مجھے باہر نکالو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے!

"تم نے مجھے گالی کیوں دی؟"

"تم نے مجھے قید کیوں کیا؟"

"تم کیڑے ہو۔ اپنی بساط سمجھے؟"

"اور تم ذلیل انسان ہو؟"

اس کے لہجے میں بے انتہا حقارت ہے جو مجھے آگ بگولہ بنا دیتی ہے اور میں کیڑے کی اس بدتمیزی پر اس کی بساط سے بہت زیادہ اور انسانیت سے بہت ہی نیچی سزا دینے کا فیصلہ کرتی ہوں۔ میں کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کر شیشی کا مُنھ کھول کر شیشی کو اُلٹ دیتی ہوں۔ کیڑا ہوا سے لہراتا ہوا ہولے ہولے نیچے چلا جا رہا ہے ــــ اور اب وہ گلی کی تنگ گندی اور مصروف سڑک پر جا گرا ہے۔ وہ ایک دم ساکت پڑا ہے جیسے ان تمام انقلابات کے لئے بالکل تیار نہ تھا اور اب ان حالات سے ٹکرانے کے بعد اپنے اندر ایک نئی ہستی کو جگانے کی ادھیڑ بن میں مبتلا ہو۔ آہستہ آہستہ اس کے بدن میں کپکپاہٹ ہوتی ہے اور وہ زمین پر رینگنے لگتا ہے ــــ میں مُڑ کر کمرے کے اندر دیکھتی ہوں۔ مٹر کی پھلی ادھ کھلی سی اب تک پڑی ہے۔ اس بھیڑ بھاڑ کی دُنیا میں اتنے حقیر کیڑے کا یوں بے گھر بار کھلی

سڑک پر رینگتے رہنا خطرے سے خالی نہیں ــــ

مجھے اب اپنی اس کم ظرفی پر ندامت ہو رہی ہے کہ میں نے طاقت کے زعم میں خواہ مخواہ ایک بے دست و پا اور بے زبان انتہائی کمزور شے سے مقابلہ کیا ــــ ایک انسان اور ایک کیڑے میں تو بہت فرق ہے بہت فرق۔ مگر مجھے یہ فرق کیوں نہیں محسوس ہوا جو میں اس حقیر کیڑے سے اُلجھ بیٹھی۔ کیا دونوں کے وجود کی بنیادیں الگ الگ نہیں؟ کیا کیڑا محض کیڑا نہیں اور انسان محض انسان نہیں ــــ پھر کیا بات ہے جو میں ایسا کرنے پر مجبور ہو گئی ؟؟

میں مٹر کی پھلی کو جلدی سے باہر گلی میں پھینک دیتی ہوں تاکہ کیڑا واپس اپنے خول میں چلا جائے اور ہمیشہ کے لئے اپنے سبز ماحول کا حصہ بن جائے ــــ مگر کیڑا اس کو بھی ایک رکاوٹ سمجھ کر اپنی سمت جلدی سے بدل کر دوسری طرف کو چل پڑا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کو کسی قیمت پر کھونے کو تیار نہیں اور اب وہ اس اندھیرے سبز ماحول سے دور بھاگ کر کسی بہت ہی روشن دُنیا کی کھوج لگانے چلا جا رہا ہے ــــ میں چاہتی ہوں کہ میں جاکر اس سے اپنی حرکت کی معافی مانگ لوں اور اس کی عظمت کے نعرے لگا کر اس کو کسی بہت ہی محفوظ مقام پر پہنچا دوں، جہاں سے وہ اپنی شخصیت کی از سرِ نو تشکیل کرے مگر یہ کیا؟ ــــ ایک مضبوط انسانی قدم اس ننھے سے بے بس کیڑے کو روندتا ہوا آگے نکل گیا ہے ــــ یہ قدم اتنا غیر ارادی اور اتنا بے غرض تھا کہ میں ایک لمحہ کو بھونچکا رہ گئی۔ روکتے روکتے بھی وہ قدم کیڑے کو مسلتا ہوا نکل گیا اور آدمی کے اژدہام میں کھو گیا۔ کیڑے کے جسم سے سبز پانی نکل کر سڑک کی سیمنٹ پر کچھ اور جوتے کے تلے میں پھیل کر رہ گیا ــــ

اب سبز رنگ کا یہ دھبہ میرے دماغ میں بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ جیسے دماغ کے کسی گوشے میں کوئی سبز نقش چپک کر مجھے دیمک کی طرح چاٹ جائے گا۔

میں کھڑکی کے پٹ بند کر دیتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب میں مٹر کی پھلی میں مقید ہو چکی ہوں اور میرے کمرے کی رنگت سبزی مائل ہوتی چلی جا رہی ہے۔

دُھند کی دیوار

شمیم صادقہ

میرے شعور نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں وہ عجیب سا گھر تھا۔ ویسے تو اسے بہت خوبصورت بنگلہ کہا جاسکتا تھا جس کے پورٹیکو میں امپورٹیڈ کار کھڑی رہا کرتی، اور ڈیڈی کی آہٹ سُن کر ہی ڈرائیور پچھلا گیٹ کھول کر مہذب انداز سے سر کو جُھکا دیا کرتا۔ سیڑھیوں تک یہ دبیز قالین، قیمتی پینٹنگز اور ساری دُنیا کی نادر چیزوں سے آراستہ ڈرائنگ روم، بیڈ روم، ڈائننگ روم، گیسٹ روم، مشینری سے چلنے والا کچن، گیس کی بہتات، کپڑے دُھلنے، صفائی کرنے، مسالہ پیسنے تک کی مشین۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن یہ شاید گھر نہیں تھا۔ کیونکہ یہاں کچھ ایسا سوفوکیشن تھا کہ دَم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ اسی لئے جہاں جا کے میری نگاہیں سوالیہ نشان کی طرح آویزاں ہوجاتیں وہ تھے امّی اور ابّا کے چہرے۔

گھر کی آسائشوں کی تہ میں عجیب سا کرب چُھپا تھا جیسے کسی نے ادھیڑ عمری کو چھپانے کے لئے گہرا میک اپ کر رکھا ہو۔ اسی لمبے گھیر کی شلوار اور ڈھیلے جمپر پہنتیں۔ اس کے باوجود جب وہ مارکٹنگ کرنے جاتیں ایک قیمتی ساری ضرور خرید لاتیں۔ اسے سارے گھر کو دکھاتی پھرتیں، پھر بہت احتیاط سے تہ کر کے بکس میں ڈال دیتیں تو پھر کبھی نہیں پہنتیں۔ شلوار جمپر ہی ان کا لباس تھا۔ لیکن اس سلسلے میں بھی ان کا حافظہ یا رویہ عجیب سا تھا۔ وہ اپنی بے حد قیمتی شلوار قمیض کو بھی اکثر کہیں رکھ کر یوں بھول جاتیں کہ ان کے کپڑے چوہوں کی خوراک بن جاتے، ایک طرف فضول خرچی کے ساتھ وہ حفاظت، تو دوسری طرف ایسی بے توجہی۔ جیسے یہ پہنے جانے والا لباس اس دُشمن کی طرح ہو جس سے سامنے سامنے سے انتقام لینا ان کے بس کا نہ ہو۔

ابا بھی کم و بیش ایسے ہی Complicated تھے۔ خود تو بہت ہی دیندار اور با اصول تھے لیکن مجھے انھوں نے بہت آزادی دے رکھی تھی۔ تعلیم و تربیت اور سخت نگہ داری کے باوجود مجھے ایسی آسائشی زندگی دی تھی جو انھیں کے مطابق اور طالب علمی کے لئے غلط تھا۔ دیگر بھائی بہنوں کے ساتھ بھی ان کا رویّہ کم و بیش یہی تھا۔ وہ بیحد کم گو اور کم آمیز تھے۔ امّی کے ساتھ بھی ان کی برائے نام باتیں ہوتیں۔ بس وہ تھے، ان کے دفتر کے کام اور ان کا پڑھنے یا عبادت کرنے کا معمول۔ ہاں اگر کسی موضوع پہ کبھی مہینوں بعد ان کی کھل کر بات چیت ہوتی تھی تو وہ تھا ہندوستان!

ہند کی سرزمین پتہ نہیں کیسی تھی، لیکن وہاں کی فصلوں کی ہریالی میں ان دونوں کی مقدس آنکھوں میں دیکھا کرتا۔ کسانوں کے گیت ان کے لبوں پہ، بغیر الفاظ کے تھرتھرایا کرتے۔ کچے آنگن میں کھجور کی چٹائی پر ایک ساتھ مل کر کھائی جانے والی بینی روٹی کا ذکر، شام کو مکئی کے بھونے کا سوندھاپن، گنّے کے دنوں کا رسیا دل، نئے مٹر کی قبولی، دالان کی گپ شپ سے ہوتے ہوئے یہ ذکر شہر کے اُجالوں تک جا پہنچتا۔ وہ معیاری اسکول جہاں مختلف قوم و مذہب کے بچے بھائیوں کی طرح پڑھتے۔ ہوم ورک میں ایک دوسرے کی مدد کرتے، چھپ چھپ کر درختوں سے پکے جامُن گراتے، ریزلٹ کے دن بھاگ کر چھ آنے میں سنیما دیکھتے اور چپکے سے آنگن کی دہلیز پار کر کے برآمدے کی جھلنگی چارپائی پہ ایک چادر لپیٹ کر سو رہتے۔ کالج کا وہ ہنگامی دور جلسوں میں شریک ہونا۔ اشتعال آمیز تقریریں کرنا، ریلوے لائنیں اُکھاڑنا، مشعل جلوس کے ساتھ میلوں پیدل چلنا۔ مَیں یہ سارا ذکر بڑی دل چسپی اور غور سے سُنا کرتا جیسے کسی مقدس تذکرے پر تاریخی چہار دیواریاں کھڑی کر دی گئی ہوں۔ ابا اور امّی کے چہرے فخر اور غرور سے تمتما اُٹھتے۔ اُداس اور سنجیدہ چہروں کے سانولے پن میں خون کی تیز روی کی سُرخی مل کر عجیب سا رنگ بھر دیتی اور میں اس چو رُخے چولھے کا تصور کرنے لگتا جس کے اوپر دھان اُبالنے کے مٹکے رکھے ہوں اور کام والیاں ادھر کے کھڑ جھونک رہی ہوں۔ اس گہری سُرخ آگ کی ہلکی ہلکی لپٹ اور رفیوجر کی جگمگاہٹ سے لبریز چہرے ایسے ہی ہوا کرتے ہوں گے۔

میرے والدین کے پاس یہی ایک موضوع تھا جو شاید مشترک، قابل ذکر اور حال کی حد بندیوں کو توڑ کر بہت دور بہا لے جانے والا تھا۔ دور۔ دور تک حال کی مخملی زندگی کی نرمی کا پتہ نہ ہوتا۔ بلکہ بیتے دنوں کی ہری ہری گھانس پہ ان کا ذہن دوڑتا رہتا۔ ایک ایک لمحے کا ذکر وہ اس قدر تقدس سے کرتے کہ جیسے دلوں کے لئے سجدہ گاہ ہو وہ سب کچھ ایک ایک فرد کو انھوں نے اپنے اندر اس طرح محفوظ رکھا تھا کہ میں انھیں باطنی طور پر پہچاننے لگا تھا۔ افطار کی رکابی لئے۔ کلی دار پیوند لگے پاجامے اور گہرے رنگ مغزی والی کُرتی پہنے۔ ململ کا پاٹ دار دوپٹہ اوڑھے، بستی کی بواؤں اور خالاؤں کی ہر شام کی قطاریں۔ عید کی گہما گہمی۔ ہر گھر کی دہلیز کے اندر عورتوں کا مل کر کپڑے چھاپنا۔ سریس لگانے کی جلدی اور گُل دستہ بٹھانے کی ٹھپ ٹھپ۔ دوپٹے میں چمکے اور چمکیاں ٹانکنے کی مہم، عید سے پہلے باری باری سے ابا کا دوستوں سے مل کر سوئیوں کا کل چلانا۔ بیل کی کڑھائی پسند کرنے کے لئے دوکان دوکان گھومنا، خوبصورت کارڈ خرید کر دوستوں کو پوسٹ کرنا، یہ ساری باتیں ہوا کرتیں اور میں سُنا کرتا بچپن سے ہی یہ سب کچھ میں نے اتنی مرتبہ اور ایسے انہماک سے سُنا تھا کہ میں اب خود کو بھی اس پس منظر میں شریک محسوس کرنے لگتا۔ پھر جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا، میں نے محسوس کیا جیسے یہ ذکر کرتے کرتے وہ لوگ اچانک چُپ ہو جاتے ہیں۔ جیسے ڈر گئے ہوں، جیسے ماضی کے گلزار میں کسی نے آگ لگا دی ہو۔ ان کے چہروں کی ہولناک خاموشی مجھے بچپن سے ہی بہت بے چین کر دیا کرتی ۔ اور میں پوچھ بیٹھتا۔

"پھر ابا۔ ادھر کو کیوں آ گئے؟"

ابا میرے لہجے پر یوں چونکتے جیسے انھیں کرنٹ چھو گیا ہو۔ شاید میرا لب و لہجہ، میرا انداز۔ ان سے، ان کے بچپن سے، ان کے ماضی سے الگ تھا۔ میرا سوال شاید گہرے نشتر یہ دار کی طرح انھیں کاٹ جاتا —— دیٹ ڈیز آر گون، اینڈ گون فار ایور

(That days are gone and gone for ever)

وہ یک لخت خاموش ہو جاتے اور پائپ بھرنے لگتے ــــ امی کچھ جذباتی ہو کر آبدیدہ ہو جاتیں اور بھرائی ہوئی آواز میں رک رک کر بولتیں۔

"لوگوں نے ہمارے گھروں کو جلا دیا جیسے ہم جان بچا کر بھاگے بھاگے آئے، تمہارے آنے والے دنوں کے لئے۔"

"پھر امی؟"

"یہاں اپنا کچھ بھی نہیں تھا ــــ کچھ بھی نہیں رہا۔ زندگی نے ہمیں اتنی فراوانی اور اتنی آسائش دی کہ میں گھر بھول جاؤں، مگر کون بھولتا ہے۔ آنگن میں کوؤں کے بولنے کی معنویت۔ مرغی کے ڈربے سے صبح سویرے سب سے زیادہ انڈے نکالنے کی فکر، ــــ اور دیر سے آنے کے بعد ابا کی نظریں بچا کر وضو کرنا، ــــ کوئی بھول سکا ہے؟"

ان کی آواز دھیرے دھیرے ڈوبنے لگتی جیسے خواب میں باتیں کر رہی ہوں۔ کہ ابا گھبرا کے ٹوک دیتے۔

"اے چپ بھی کرنا ــــ کیا فضول لگا رکھی ہے۔ سو جاؤ" ــــ پھر مجھے کہتے۔

"چلو ــــ سو جاؤ ــــ ورنہ صبح ایکس کرش ٹرپ مس کر دو گے ــــ چلو۔"

اور جیسے وہ دونوں حال کی ان مخملوں پر بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگتے، جس پر کانٹے ہی کانٹے ہوں ــــ اسی لئے مخمل کی اس تہہ سے کانٹے چن دینے کا ارادہ میرے شعور میں پلتا رہا زندگی نے ــــ حالات نے اور آبا کی فراخدلی نے مجھے بے حد موڈرنائز کر دیا تھا۔ ویسے بھی وہ طبقہ جو میرا تھا، وہ تھا بھی بہت ہی امریکنائز۔ امریکی وضع کا لباس، موسیقی کی دھن پر رقص ــــ امریکی اسٹائل گفتگو ــــ ٹی۔ وی پر پروگرس دینا ــــ ان گنت گرلس فرینڈ کو تحفے بھیجنا۔ ان کے ساتھ شامیں گذارنا اور چوری چھپے کسی کے ساتھ رات کے چند گھنٹے گزار لینا عام سی بات تھی۔ بہت ہی عام ــــ جیسے میرے طبقے کے میری عمر کے دیگر افراد تھے، ویسا ہی میں بھی تھا ــــ یوں بھی میں نے تعلیم کی اتنی سیڑھیاں طے کر لی تھیں کہ جب چاہتا بغیر گھنٹی دبائے، محض آواز دے کر اچھی خاصی ملازمت کو خوش آمدید کہنے کے لئے پکار سکتا تھا ــــ لیکن میں شاید

اتنا اسٹریٹ فارورڈ Straight forward اور پلین اینڈ سمپل نہیں۔ یہ مجھے پتہ تھا دراصل میرے اندر گرہ سی تھی ـــ ابا جو اس قدر مذہبی اور ریزرو تھے وہ مجھے ٹوکتے کیوں نہیں میں ان کے پیارے ماضی سے کس قدر دور ہو چکا ہوں، کیا اپنے ذہن کی وراثت کے تحفظ کا جذبہ انھوں نے مٹا ڈالا ہے؟ وہ سرزمین جسے وہ اتنے برس تک نہیں بھول سکے، انھیں پکارتے کیوں نہیں؟ اتنے سارے ان کے عزیز وہاں جو ہیں۔ کیا وہ ان سے ملنے کے لئے بھی پاسپورٹ نہیں بنوا سکتے، کیا انھیں نہیں پتہ آج کل ویزا کی کتنی آسانیاں ہیں۔ میں نے ایک دفعہ کہا بھی۔

"ابا ـــ ایک بار انڈیا چلیں ـــ میں اپنا آبائی گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مگر انھوں نے بڑی بے رخی سے جواب دیا تھا ـــ "تم پاسپورٹ بنوا لو ـــ مجھے نہیں جانا ہے۔"

میں حیرت سے پھٹی ہوئی نظریں لئے ان کے اور امی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ امی، دراصل سہم کے چپ ہو گئی تھیں، لیکن ـــ ان کے چہرے پہ ان کہے الفاظ کا جال سا ابھر آیا تھا۔ کئی روز عجیب سی خاموشی رہی۔ پھر میں نے دیکھا، امی بار بار مجھ کو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں ـــ اپنے رشتہ داروں کے خطوط کے آداب لفظوں کا واسطہ دے رہی ہیں مگر ابا کے چہرے پہ کرختگی اور خاموشی اتنی نمایاں ہو گئی ہے کہ ان کا کوئی بھی لفظ ابا تک پہنچ نہیں پاتا۔ مقفل چہار دیواری کے پتھروں سے ٹکرا کر امی کے ملائم دل پہ ابابیل کنکریوں کی بارش سی کر رہا تھا۔ اور میں نے گھبرا کر پاسپورٹ کی دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ سال بھر کے اندر ویزا بھی مل گیا۔

میں نے سمجھا تھا، ویزا مل جانے کے بعد ابا کے اندر کا یہ سناٹا ضرور ٹوٹ جائے گا۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے تحفے اور یادوں کے لمبے لمبے کے بوجھ سے مجھے لدا پھندا کر دیں گے ـــ نہ جانے کیا کچھ؟ ـــ مگر جیسے جیسے میری روانگی قریب آتی گئی ـــ حیرت کا اندھیرا مجھ پر یلغار کرتا گیا ـــ ابا ویسے ہی تھے ـــ روٹینسٹ اور با اصول، جیسے میں کراچی جا رہا ہوں ـــ جیسے یہ لاہور کا ایجوکیشنل ٹرپ ہو۔

بے حد عام سی بات — ہاں! امّی بد حواس بد حواس سی ہوئی جا رہی تھیں — فلاں آپا کی لڑکیوں کے کپڑے فلاں کی بھانجی کے لئے چوڑیاں — فلاں کے بچّوں کے کھوتے — فلاں اور فلاں ....

وہ میری روانگی کے ایک دن پہلے کی رات تھی۔ میں اپنی نئی دوست دیپا کا خط پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے تحت الشعور کا چھپا ہوا چور اچانک سامنے آگیا ہو! ہندوستانی لڑکیاں۔

بچپن کی سُنی ساری باتیں میرے ذہن پر دھندلی تصویروں کی طرح متحرک ہونے لگیں۔ اور ان دُھندلکوں سے ان کی شبیہ جھانک کر مجھے انہ حد بے چین کرنے لگی۔ سادہ لوح اور خراب ناک لبے گھنیرا بالوں میں بیلے کے گجرے لگانے والی وہ حسینائیں جن کے کانوں کی لویں بھی بیلے کے پھولوں سے مہکا کرتی ہیں۔ ساون کی گھٹائیں دیکھ کر دوپٹے رنگنے، ہری چوڑیاں پہننے اور مہندی سے ہتھیلی پہ نقش و نگار بنانے والی شہزادیاں کیسی ہوں گی — میں نے کہانیوں میں پڑھا تھا، — دوستوں سے سُنا تھا، ان لڑکیوں کی شادی میں بڑی دُشواریاں ہوتی ہیں۔ لڑکے بکتے ہیں — لڑکیاں انتظار کے دریچے کے پٹ تھامے آتی جاتی بہاروں کو دیکھ کر بڑے دردناک نغمے الاپتی ہیں۔ اپنے رشتہ کے بھائیوں سے انھیں ایک پیدائشی رومانی لگاؤ ہوتا ہے۔ حالات کی تیز دھوپ ان کے خوابوں کو لامحالہ اسی سائبان تلے پناہ دینے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ بعض تو اکثر بغیر جان پہچان کے ہی، ایسے بھائیوں کے لئے رومال اور تکیے کے غلاف بنا بنا کر تحفے بھیجا کرتی ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی غزل کی روایتی قاصد ہوا کرتے ہیں۔ اور میں بڑی حیرت آمیز خوشی کے ساتھ اس سرزمین کے لئے بے چین بے چین سا تھا — "لیکن کیوں" اس کا اعتراف میرے اندر نہ تھا — کیونکہ میں بہرحال ابّا کی شرافت اور دلدہی کردار کا امین خود کو سمجھنے پہ مجبور تھا۔ ویسے تو میری بہت سی لڑکیاں دوست تھیں۔ میں جنھیں بے تکلفی سے مخاطب کیا کرتا۔ ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے ان کے ہاتھ دبا دیتا۔ کاندھے پہ ہاتھ رکھنا اور چہل قدمی کرتے ہوئے کمر میں ہاتھ ڈال دیتا، — اور کبھی

..... واقعی میرے لئے انجانا کیا تھا؟ — مگر پھر بھی میں شدت سے منتظر تھا۔ دوسرے دن میں سامان سے لدا پھندا — لاہور سے سوار ہوا — مکنی اسٹیشن پہ گاڑی بدلی۔ پھر بارڈر کراس کیا۔ میں کھڑکی کے باہر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے میں اس خوابناک سرزمین کا نقش نقش اپنے اندر محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ کیا یہی ہندوستان ہے؟ سب کچھ تو ویسا ہی تھا۔ ویسی ہی دھرتی، ویسے ہی لوگ صرف پگڑ والے سکھوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ کئی ایک میرے ہی ڈبے میں سوار ہوئے — میں حیرت اور پوشیدہ خوف کے تحت ان سے گفتگو کرنے لگا۔ لیکن وہ سب کے سب بہت ہی سادہ دل اور مخلص تھے۔ میں حیرت زدہ تھا۔ ابا کے خوابوں کا ملک یہی ہے؟۔ لوگ تیزی کے ساتھ کھڑکیوں سے سامان اندر پھینک رہے تھے — میں اس طوفانی کیفیت کو بغور دیکھ رہا تھا — اگر یہ بدتمیزی ہے تو جلد بازی بھی — اگر یہ سادگی ہے تو سچائی بھی' — ٹرین آگے بڑھتی رہی۔ فاصلہ طے ہوتا رہا۔ دھیرے دھیرے میں بھی دھوتی اور ساری کا' اس طرز حیات کا عادی ہو چلا تھا۔ جیسے میں بھی انھیں میں سے ہوں۔ اور ایک خیال میرے اندر ابھرا۔ "گویا انڈیا میں اپنا لینے کی بہت بڑی قوت پوشیدہ ہے۔" اور مجھے ریحانہ کے الفاظ یاد آئے جس نے میرے جانے کا ذکر سن کر کہا تھا۔

"انڈیا سے ٹھیک طریقے سے لوٹ آنا — وہاں کی لڑکیاں ساحرہ ہوتی ہیں۔ سنتے ہیں، بغیر کچھ کہے سنے، محض نظروں کے سحر سے بس میں کر لیتی ہیں۔"

"کیا واقعی؟" — دل کے اندر چھپے ہوئے احساس نے سر ابھارا اور میں بظاہر باہر کے نظارے دیکھتا رہا۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا — ہرے بھرے درخت، کنوئیں سے پانی بھرنے والی عورتیں۔ ہل چلاتے ہوئے کسان۔ تالاب میں بنسی ڈالے ہوئے کنارے کنارے بیٹھے ننگ دھڑنگے کالے کالے بچے۔

"سچ! انتظار یہاں کی مٹی میں ہے! یہاں سبھی انتظار کرتے ہیں۔ مرد، عورت، بچے اور لڑکیاں۔ اسی لئے ان کا انتظار اتنا جان لیوا ہوتا ہے۔

کئی اسٹیشن آئے۔ گاڑی بدلی گئی۔ اور دیکھتے دیکھتے دوسری ہی صبح میں اپنی خالہ

کے دروازے پہ تھا۔ ایک عمر رسیدہ شفیق چہرے نے مجھے خوش آمدید کہا۔ بلکہ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھیں چھلک آئیں۔ انھوں نے بڑی شفقت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ رکھا مجھے منہ ہاتھ دھونے کو کہا اور ساتھ ہی پکارا۔

"شنو — پاکستان سے آپا کا بیٹا آیا ہے غسل خانہ ٹھیک کر دو!"

شیشے کی چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ ہی مجھے مدھم سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں متجسس نظروں سے کھادی کے موٹے پردے کو دیکھنے لگا جس کے پیچھے ایک پرچھائیں کے ہلنے اور دھب دھب چلنے کی آواز تھی۔ میں نے غسل کیا اور میرے کنگھی کرتے کرتے پیلے رنگ کا چھپا ہوا دسترخوان بچھا دیا گیا جس کے چاروں طرف تُک بندی کے اشعار پرنٹ کئے ہوئے تھے۔ رکابیاں اور پیالے بنے ہوئے تھے۔ پھر شنو نے ناشتہ لگانا شروع کیا۔ میرے سامنے تلے ہوئے پراٹھے، گرم کیا ہوا حلوہ اور تلے ہوئے کباب کے ٹکڑے تھے۔ لیکن میری نظریں شنو کے نفیس ہاتھوں کو بغور دیکھ رہی تھیں جن پر محنت کی تھکن، آٹے کی خشکی کے باوجود ایک عجیب سی دلکشی تھی۔ وہ گلابی جارجیٹ کے دوپٹے سے سر ڈھکے ہوئے تھی اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں مسلسل نیچے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود اس کے رخسار تمتما رہے تھے اور ہونٹوں پہ بڑی ہی شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ خالہ امی نے تعارف کرایا۔

"یہ شنو ہے — اسی سال میٹرک پاس کیا ہے، داخلہ لینے کو کہہ رہی ہے۔"

"ہیلو!" میں نے قصداً بے تکلفی سے کہا اور وہ میری طرف دیکھ کر بُری طرح جھینپ گئی۔

"معاملہ چل سکتا ہے۔" اس کے مخصوص ماحول کے پروردہ، اس اجنبی نوجوان نے مجھ سے کہا جسے میں خود بھی یہاں کے مقدس اُجالوں میں پہچاننے سے قاصر تھا!

یہاں کی ایک ایک چیز کو میں نے غور سے دیکھا چولھا جلا کر گھنٹوں دھوئیں بھرے کمرے میں بیٹھ کر پنکھا جھلنا۔ اور کہاں گیس کی وہ الکٹرک جیسی وال فٹنگ۔ صبح سویرے اُٹھ کر سارے گھر کی صفائی اور کہاں کا مشینی جھاڑو۔ لکڑی کے پٹرے پہ بیٹھ کر گھنٹوں عجیب سی محویت کے ساتھ باورچی خانے کے کام کرنا۔ پیٹ پیٹ کر کپڑے دھونا۔ بستر کی

ایک ایک شکن برابر کرنا — اور دوپہر کے وقت گھنٹوں بیٹھ کر پوری فراخ دلی کے ساتھ دُنیا جہان کی باتیں کرنا — پھر شام سے ہی باورچی خانے میں یوں مصروف ہو جانا کہ محسوس بھی نہ ہو سکے کب شام ڈھلی اور بتیاں جل گئیں۔ رات گئے فارغ ہونا اور تھک کر سو جانے کی بجائے سبھوں کے بستروں کو پھر سے چک کرنا۔

گویا یہ ہے امّی اور ابّا کے خوابوں کا کھویا ہوا جزیرہ۔ جس کے چاروں طرف ایسے کالے سمندر کا پانی پھیلا ہے کہ وہ یہاں آنے تک خوف محسوس کرتے ہیں۔ اندر سے بھی، اور باہر سے بھی!۔

"شنّو!" — میری دلچسپی کا مرکز اس کی تہ دار شخصیت بھی تھی۔ اسے دیکھ کر میری دوست لڑکیاں مجھے یاد آئیں۔ میں شنّو سے گفتگو بھی کرتا۔ اور بے تکلف ہونے کی کوشش بھی، لیکن دوست بنانے کے اپنے تمام گر مجھے اتنے گھٹیا لگے کہ اپنے آپ سے ہی مجھے نفرت محسوس ہوئی۔ پھر بھی میں شنّو سے دوستی کرنا چاہتا تھا، — میرے اندر عجیب بے کلی سی تھی!

"کیا، مجھے روایتی عشق ہو گیا ہے؟" — میں اپنے آپ سے پوچھتا اور میرا ذہن چُپ تھا۔ 'واقعی ہندوستان میں سحر ہے' میں نے اعتراف کیا۔ مجھے کئی لوگوں سے مختلف شہروں میں ملنا تھا۔ رشتہ داروں اور عزیزوں سے۔ دوستوں کے چچاؤں سے — مگر میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ میں گھر سے باہر شہر دیکھنے بھی جاؤں۔ ایک گھریلو پن میرے اندر آ گیا تھا۔ گھر کے اندر مجھے ایک عجیب سی طمانیت آمیز ٹھنڈک کا احساس ہوتا۔ پناہ گاہ کا گرم اور محفوظ تصور میں نے پہلی مرتبہ پہچانا تھا۔ حالانکہ یہاں میرے شہر جیسا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کلب گھر کی رنگینیاں نہ سنیما کی گھما گھمی۔ نہ وی۔ سی۔ آر پر اسمگل شدہ فلمیں دیکھنا۔ نہ نت نیا اسٹائل۔ نہ راہ چلتی لڑکیوں کو ہیلو! کہہ کر چھیڑنا۔ نہ مختلف بہانوں سے تحفے دے کر براہ راست اپوائنٹمنٹ سلیپ بھیجنا۔ کچھ بھی تو ویسا نہیں — عجیب مدھم، آہستہ رو اور نرم سی زندگی۔ نہ منجمد نہ فاسٹ — پھر بھی اس زندگی میں کیسی مقناطیسیت ہے۔ میں سمجھ نہیں پاتا۔ اور ویزا کے دن ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے کہ نیا سال آ گیا۔ ہمارے یہاں تو امریکی ڈھنگ سے مبارک بادیاں دی جاتی ہیں۔ مگر یہاں سال نَو کی صبح بھی عام صبح جیسی تھی۔ یہاں

بہت ہی ماڈرن اور وسٹرنائز ہوئے تو 'ہیپی نیو ائر' کہدیا۔ اور جواب میں گھسی گھسائی "سیم ٹو یو" سن لیا۔ تحفہ دینا یا جشن منانا۔ اور کھو کھلی خوشیاں لٹانا، اس طبقے میں معیوب تھا جہاں میں مہمان بنا تھا۔ عجیب بات تھی، جو یہاں کا طبقہ اعلیٰ تھا۔ وہ وہاں کا درمیانہ طبقہ تھا۔ اور وہاں کا طبقۂ اعلیٰ یہاں کا درمیانہ سہما ہوا اور سمٹا ہوا طبقہ تھا۔ ہندوستان کے اس متوسط طبقے کا جو سحر ہے اس کا توڑ کیا ہے؟ وہ کون سا راز ہے؟ ماورائی طاقت کہاں ہے، کس شئے میں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

میں نے بھی شنو کو صبح ہی نئے سال مبارکباد دی۔ مگر اس نے "سیم ٹو یو" کہنے کی بجائے زیر لب شکریہ کہا۔ اور پُراسراری سی شرمیلی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ رینگ گئی۔ میں اپورٹیونسٹ (Opportunist) تھا۔ میں شعوری طور پر شنو کو تحفہ دینا چاہتا تھا — مگر کیا؟ یہی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا اگر وہ میری دیگر دوستوں کی طرح ہوتی تو کاسمیٹکس سے لے کر رسٹ واچ تک کچھ بھی دے سکتا تھا۔ مگر یہاں تحفہ صرف تحفہ نہ تھا۔ ایک سمبل تھا — بہت کچھ کہدینے کا — ایک واسطہ تھا، بغیر الفاظ کی وضاحت کا۔ اس کے حُسن کی جذب کر لینے والی کیفیت کا احساس میں اسے دینا چاہتا تھا — بہت سوچ کر میں نے ایک آئینہ خریدا۔ اور اس کے نیچے اپنی ایک انلارج تصویر فریم میں لگوادی۔ اور اسے قیمتی گفٹ باکس میں پیک کروا کے اسے تھما دیا۔ یہ کہہ کر۔

"نیا سال ہر سال آیا کرے گا شنو — مگر میں کہاں — تم کہاں — یہ تحفہ ازلی اور ابدی ہے قبول کر لو۔"

پہلے تو اس نے وحشی ہرنی کی طرح مجھے دیکھا پھر میرے الفاظ نے دو دھاری نشتر کی طرح اس کے اندر بہت گہرا وار کر دیا۔ اس نے تحفہ لے لیا اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اس کا ردعمل جاننا چاہتا تھا۔ مگر وہ سمندر کی طرح شانت اور گہری تھی۔ ہر دن کی طرح اپنے معمولات میں مصروف ہو گئی۔ جیسے گہرے پانی کی سطح پر کنکری گری اور ڈوب گئی۔ میرا دل اور بھی تیزی کے ساتھ اس کی طرف کھنچنے لگا۔ اب ویزا کا صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا — کہ ایک شام میں نے دیکھا۔ شنو اپنے کمرے میں اکیلی ہے۔ خالہ بھی کہیں

گئی ہوئی تھیں۔ اور وہی آئینہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ مگر اُلٹا ــــ مجھے محسوس ہوا جیسے قارون کی دولت مجھے مل گئی ہو ــــ ایک اضطراری بے چینی کے تحت میں اس کے پاس گیا۔ اور اسے بازوؤں سے تھام کر کس کر لیا۔ وہ کچھ یوں گھبرا گئی جیسے کسی نے پُروا رُخ کے جلتے ہوئے چولھے کو مارچ کے مہینے میں ہوا دے دی ہو۔ ایسی آگ سے کون بچ سکا ہے ــ یوں تو میرے لئے کچھ بھی انجانا۔ ان دیکھا اور خطرناک نہیں تھا۔ میں سمجھ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر رو دے گی۔ اس کی دودھیا پیشانی پر کچھ ایسے قطرے اُبھر آئیں گے جنھیں خشک کرتے کرتے وہ کانپ کانپ اُٹھے گی۔ خوف۔ ڈر۔ احساسِ گناہ اور ندامت کے بوجھ سے دبی ہوئی شنو، میری تمنا کا انٹی کلائمکس ہوگی۔ مگر یہ جو شنو میرے سامنے تھی، وہ شاید کوئی اور ہستی تھی ــ اس کے چہرے پہ ندامت اور دکھ کی بجائے ایسا سکون اور یقین سا تھا جیسے وہ چاہت کے فلسفے کی مکمل تفسیر ہو۔ اور میں ایک اجنبی لفظ کی طرح، جس کے معنے حاشیے میں لکھے جاتے ہیں، ــــ محسوس ہو رہا تھا، وہ اپنی پُراسرار اور پُرسکون شخصیت سے مجھے اتنی بڑی نظر آئی جیسے وہ میری دھوپ کی پرچھائیں ہو اور میں بونا سا ایک وجود ــ میں خود ہی ڈر کر اور سہم کر رہ گیا۔ میں نے اس سے ہر ہوس پرست کی طرح شادی وغیرہ کا وعدہ کرنا چاہا۔ مگر اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"من تو شدی کا احساس انمول ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی جھوٹ کی میزان ضروری نہیں ہوتی" ــــ

اور میں خاموش رہ گیا ــ لیکن میرا ذہن عجیب طرح کے احساسِ گناہ کی جکڑ بندیوں میں اُلجھ کے رہ گیا تھا ــ میں جانتا تھا، ــ میری حرکت قطعی اضطراری اور جذبۂ اقتدار کے تحت تھی۔ جسے وہ عشق کی انتہا کا مرتبہ دے رہی ہے۔ اور ہوس کا دوسرا رُخ ہے۔ مجھے یہاں سے واپس جانا ہے۔ اس جلدی میں یا اس کے بعد کبھی بھی میں واپس اس دیس میں اس کی دُنیا آباد کرنے نہیں آسکتا۔ یہ داغ ہوس ہے جسے وہ زندگی بھر درد کی غیر فانی ٹیس جیسی امانت سمجھتی رہے گی۔ یا ممکن ہے یہی زخم ناسور بن کر پھوٹ نکلے

اور کئی نسلیں تعفن اور گھٹن کے مارے بے موت مرجائیں۔ میں کوئی اثباتی قدم اُٹھانا چاہتا تھا Constractive ڈھنگ سے کچھ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن کیسے! اور جب ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میری طاقتیں مفلوج ہو چکی ہیں۔ ابا کی تربیت اور اسکی دولت احساس کے باوجود میرے اندر کچھ اب دھواں سا ہے کہ میں اپنے علاوہ باہر کی کسی بھی شئے کو دیکھنے سے قاصر ہوں۔ جیسے مجھے شنو سے جو بھی لگاؤ ہے اس کے مبہم معنی کے بوجھ سے میرا دم تو گُھٹتا جا رہا ہو۔ لیکن اس گھٹن سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ جیسے میں اس سڑی ہوئی مچھلی کی طرح ہوں جس نے اس شفاف تالاب کو ناپاک کر دیا ہو۔

اچانک خیالات کے اس موڑ پر پہنچ کر مجھے ایک انتقامی آسودگی کا احساس ہوا۔ جیسے امی کی بے چینی اور ابا کے جمود کا خراج ہو!

دوسری صبح ہی میں نے اچانک تھانے سے اپنا ٹرپیاچر لے لیا۔ اور رکشے پر سوار ہو گیا یہ دیکھے بغیر کہ شنو کی آنکھوں سے ایسے قطرے ٹپک رہے ہیں جو کبھی سیپ تک پہنچ کر موتی نہیں بن سکتے۔

یہی میری طمانیت کی انتہا تھی۔
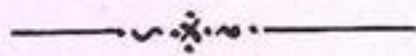
آئینہ

اعجاز شاہین

کون جانتا تھا دیوار پر لگا قدآدم آئینہ ہاتھ کی ذراسی جنبش سے پھسل کر فرش پر آگرے گا اور دل دہلا دینے والی جھنکار کی آواز دو دلوں کے امٹ بندھن کو ایک جھٹکے سے الگ کر دے گی۔

سارا قصور تو اس آئینہ کا تھا۔

مشترکہ ڈرائنگ روم کی نیلی دیوار پر یہ آئینہ مضبوط کانٹوں کے درمیان اٹکا ہوا تھا ذرا اور سیدھا کرنے کی کوشش میں کاظمی خاندان کی سب سے چھوٹی بہو کا ہاتھ کانپا اور آئینہ ہاتھ سے پھسل کر دھڑام سے نیچے آگرا۔

گھبراہٹ میں زینت کاظمی کو کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو جھک کر فرش پر بکھری کرچیوں کو مٹھی میں کس لیا۔ بڑی نند اور ساس اماں صحن میں چھالیاں کتر رہی تھیں۔ آواز سُن کر دونوں نے ہاتھوں سے دل دبا لیا۔ اللہ خیر کیجیو، کہاں کی چھت گری۔

منجھلی بہو اپنے کمرے میں اپنے مُنّے کو سُلا رہی تھیں۔ آواز سُن کر بدحواس ساس کے کمرے میں بھاگیں...... ذراسی دیر میں آئینہ ٹوٹنے کی خبر گھر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔

چند منٹ بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ گھر کے افراد ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے۔ بیس بائیس آدمیوں کے درمیان گھری زینت دُلھن نظر چُرائے سٹپٹا رہی تھیں جیسے بیچ صحرا میں تیز رفتار ہرنی شکاریوں کے درمیان اسیر ہو چکی ہو۔ اور فرار کا دوسرا راستہ نہ پاکر سپردگی کے عالم میں کھڑی رہ جائے۔

پہلے تو ساس اماں نے تیز گھورتی نظر ڈالی، پھر بولیں "جب تم ہوش و حواس میں

نہیں رہتی ہو تو آئینہ چھونے کی کیا ضرورت تھی۔ آج تم نے اس گھر کی زینت کو ہی توڑ ڈالا۔
منجھلی بہو نے موقع پا کر ساس کو اور بھڑکا دیا" دیورانی جی جہیز کے بکس میں بھر بھر کر اپنے سلیقہ کا ثبوت لائی تھیں، اسے بھلا کون یقین کرے گا۔ وہ سب ان کے ہاتھ کا ہنر تھا۔ یہاں تو جب سے آئی ہیں ہر چیز کو توڑ کر ہی دم لیتی ہیں۔" پھر سانس کو یکجا کیا اور ساری کا پلّو سمیٹ نند کے پیچھے آ کھڑی ہوئیں۔

نند تو زینت سے یوں بھی خوش نہ تھیں۔ اپنے گول گول دیدے نچا کر پھوہڑپنے کا یوں انکشاف کیا" بھلا توڑنے کی کوئی حد بھی ہو۔ کل ٹی سٹ کا دودھ دان توڑ دیا۔ پرسوں جہیز کا گلدان توڑ چکی ہیں اور آج ...... وہ کہتے کہتے اچانک رُک گئیں اور زینت کی طرف بے انتہا ناراضگی سے دیکھا۔

ان الزامات کو زینت دُلھن خاموشی سے سُنتی رہیں اور بند مُٹھی سے خون ٹپک کر نیچے گرتا رہا۔

خوبصورت شیشے کے لئے ماتم کرنے والے دل میں خون کی کوئی قیمت نہ تھی۔ ہاں اپنوں میں ماسٹر کی حیثیت سے گھر کے ایک فرد ہونے کا حق شمیم میاں نے ادا کرنا چاہا۔ آگے بڑھے، زینت کا ہاتھ پکڑا اور بولے "کھولئے مُٹھی، ان شیشوں کو پھینکئے"۔ پھر تقریباً گھسیٹتے ہوئے بیسن کے پاس لائے۔ ہاتھ دھویا، پٹی باندھی اور اماں کے پاس اجازت لینے آئے تاکہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیں۔

اماں کا موڈ پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ وہ بے فکری سے بولیں" چلو چلو جی یہ نئی بات میں نہیں ہونے دوں گی۔ ذرا سی کھرونچ کے لئے اتنی رات گئے اسپتال جانے کی ضرورت نہیں۔ اسد میاں آئیں گے تو چاہے اپنی مرضی سے نچایا کریں، میری جوتی کو غرض نہیں ...."

شمیم خاموش ہو کر رہ گئے۔ ساری ہتھیلی کٹ کر چھلنی ہو چکی تھی اور اماں فرماتی ہیں ذرا سی کھرونچ ..... خیر وہ کرتے بھی کیا۔ کوئی سگی سمبندھی بھی تو نہ تھے جو کچھ اختیار ہوتا۔ اُلٹے پاؤں اپنے کمرے میں واپس ہو گئے۔

زینت اپنی لمبی اور دبیز گدّے والی مسہری پر لیٹی ہاتھ کی تکلیف سے پریشان ہو رہی تھی شوہر کے ہوتے ہوئے وہ کتنی بے آسرا تھی عجیب بات ہوئی وہ خود سوچ کر یعنی شادی سے قبل میری بے اطمینان اور سدا کی کھوجی فطرت کو دیکھ کر ابا جان! اماں سے کہا کرتے تھے " میری بیٹی ایک پُرسکون زندگی گذارے گی۔ وہ دُنیا سے زبردستی اپنی خوشی کا حصّہ چھین لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مجھے اس کی طرف سے بالکل اطمینان ہے"

"کاش ابا میاں یہ دیکھنے کو زندہ ہوتے کہ ان کی پیشین گوئی کے خلاف سسرال میں ظاہری حُسن کے پرستاروں اور نمائشی رکھ رکھاؤ کے بازار میں، میں نے اپنے حصہ کی خوشی اور سکون تک نیلام کر دیا۔"

بڑے دُکھ سے زینت نے کروٹ بدلی اور ایک لمبی آہ بھر کر خاموش ہو گئیں۔

بات بھی سچ تھی۔ مائیکہ سے آنچل بھر بھر کر محبت بانٹنے کو لائی تھیں مگر قدرداں سسرال ملی نہ شوہر۔ یوں تو اسد کاظمی ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ گھر میں باپ دادا کے وقتوں کی بچی بچائی دولت کام آ رہی تھی۔ وہ خود قبول صورت تھے مگر جو خوبی ازدواجی زندگی کو کامیاب بناتی ہے وہ نہ تھی۔ اور جب وہ نہ تھی تو زینت کے لئے کچھ نہ تھا۔ اسد نے نہ کبھی دلجوئی کی اور نہ زینت سے اس کی خواہش کی یہی ایک خلش تھی جس نے زینت کی زندگی کو تباہ کر ڈالا۔

دل تو اس کا اسی وقت ٹوٹا تھا، جب اسے سیم و زر کے توسط سے بیاہا گیا۔ اس کے بعد اس ہاری بازی کو جیتنے کی جتنی کوشش کی وہ بُری طرح شکست کھاتی رہی کسے سمجھاتی۔ ہاتھوں کی لرزش اسی زبردست شکست کا نتیجہ تھی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا۔ پہلی بار جب وہ آنکھوں میں اَن گنت سپنے سجائے سُرخ کپڑوں میں لپٹی سسرال کی دہلیز پر بڑے وثوق سے قدم رکھ رہی تھی.... کہ کہیں قریب سے اسد میاں کی آواز آئی.... وہ اپنی ماں پر بگڑ رہے تھے "کیا میری قسمت میں یہ بے شکل سی بیوی تھی۔ آپ نے مجھ سے کب کا انتقام لیا اماں؟ نہ گھر مقابلہ کا اور نہ شکل اس گھر کے لائق......"

زینت کی غیرت کو زور کا جھٹکا لگا.... سارا جسم جھن جھنا سا گیا.... ہاتھ جو کانپا گود کے سارے لڈو زمین پر بکھر گئے۔

".....آں.... ہاں.... دُلھن کو سنبھالو.... وہ ڈگمگا رہی ہے.... پاس سے کسی عورت نے ہاتھ پکڑنے والی عورت کو ٹوکا ـــــ مگر اس درمیانی وقفہ میں ایک دُنیا بسی بھی، ایک دُنیا لُٹی بھی ـــــ چاہے زینت بیگم اب ادھر اُدھر سے جتنی خوشی بھی بٹوریں اصل خوشی سے دامن خالی کا خالی رہا۔

اسد کا رویہ شادی کی پہلی رات میں اتنا سرد رہا کہ زینت کے سارے خواب کرچی کرچی ہوکر بکھر گئے۔

جب شوہر نے قدر نہ کی تو شوہر کے گھر والوں سے شکایت ہی فضول تھی۔ اسے ایک بے ضرورت ہستی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے ہر کام میں کیڑے نکالے جانے لگے۔ ایسے تنقیدی ماحول نے سلیقہ مند سمجھ دار زینت سے ایک ڈری سہمی زینت کو جنم دیا۔ چھوٹے سے چھوٹا ٹانکہ اُٹھانے والی محتاط انگلی موٹی موٹی چیزوں کا بار نہ سنبھال سکی۔ ہاتھ کانپا اور وہ چیز گری۔ وہ خود حیران تھی کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے۔

رات کی سیاہ زُلفیں دم بدم کُھلتی جا رہی تھیں مگر اب تک اسد کا پتہ نہ تھا ..... ہاتھ کی تکلیف سے وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ ساس کے پاس جانے کی ہمت نہ تھی شوہر کو بُلانے کی عادت نہ تھی۔ وہ ضبط کئے لیٹی رہی۔

کوئی بارہ بجے کے درمیان اسد دندناتے ہوئے کمرے میں آئے۔ رُخ دیکھ کر ہی زینت سمجھ گئی کہ اماں کے پاس سے ہوکر آئے ہیں۔ خوف سے چہرہ زرد ہو گیا۔

تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک اسد نے باتوں سے زینت کے دل کو اس قدر دکھایا کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ عورت میں ہر خفت کو ڈھونڈھنے والی نظر کتنی محدود ہے جس کی رسائی عورت کے دل تک کبھی نہ ہو سکی۔

وہ اسد کی بے بنیاد باتوں سے اُکتا کر اُٹھ بیٹھی۔ درد تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا اور ادھر اسد خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ بے بس ہو کر وہ رونے لگی۔

زینت کے آنسوؤں نے اسد کے غصّے کو اور بھڑکا دیا۔

رُخ بدل کر بولے "روتی ہے اگر میرا اختیار ہوتا تو اس بد سلیقگی کا مزہ چکھا دیتا تاعمر رونے کو چھوڑ دیتا۔" جیسے کسی نے زینت کے دل کے چٹکے شیشے پر پیر رکھ دیا ہو

نازک سی کمزور بیل پاس کے تناور درخت سے لپٹ کر بڑھتی ہے تاکہ تیز و تُند ہوا سے محفوظ رہ سکے۔ جب اس کو ایسا مضبوط سہارا نہیں ملتا تو وہ اپنی حفاظت کی خاطر خود سر اور لاپرواہ ہو ہی جاتی ہے۔ زینت کی حالت اس وقت ایسی ہی تھی۔ وہ غصّہ سے بھری بستر سے کودی اور دل میں اُتر جانے والے طنز سے بولی "کیوں اختیار تو آپ ہی کا ہے اس کو استعمال کیجئے۔"

پہلے تو اسد کو یہ جملہ اجنبی سا معلوم ہوا۔ پھر جو اس کی تہ تک پہنچے تو چونکے اور بے انتہا غصّے کے عالم میں مٹھی بھینچ لی اور گرجے "بے غیرت عورت دماغ ٹھکانے ہے کہ نہیں ... یاد رکھ زینت یہ فیصلہ اگر ہو گیا تو ....."

زینت کی غیرت نے سر اُبھارا، بڑے وثوق سے جواب دیا "تو آپ بھی سُن لیجئے میں آپ کے فیصلے کے بعد کبھی پچھتاؤں گی نہیں —— آپ اسی وقت مجھے گھر پہنچوا دیں۔"

اسد یکایک سناٹے میں آ گئے۔ ساری تنا تنی ہی بھول گئے بوکھلاہٹ میں وہ حکم دے بیٹھے.....

"میں اجازت نہیں دیتا ..... اس گھر سے تم قدم نہیں نکال سکتی ہو ....."

نہ جانے اُس وقت زینت میں کون سی غیبی قوت آ گئی تھی۔ قبل سے زیادہ بے رُخی سے بولی، "اب مجھ پر کوئی پابندی نہیں کہ آپ کا حکم مان ہی لوں،" وہ اُٹھی اور سامان اکٹھا کرنے لگی۔

اسد نے پھول دیکھا تھا، کانٹے کی چُبھن سے واقف نہ تھے۔ بات بگڑتے دیکھی تو اماں، بھابی کو بلا لائے۔ زینت کا یہ روپ سب کے لئے اجنبی تھا۔

اماں نے گھر کی شرافت کا واسطہ دے کر سمجھانا چاہا مگر زینت کا یہ آخری جواب تھا "جب انھوں نے کہا ہے تو میں بھی فیصلہ کر چکی ہوں، وہ اپنا آخری اختیار

استعمال کریں۔ اب مجھے کسی گھر کی شرافت اور بدنامی سے کیا تعلق؟"

یہ سن کر سارے لوگ سناٹے میں آگئے۔ زینت بے پرواہ اپنا سامان باندھنے میں منہمک تھی۔ سارے لوگ اپنے اپنے طور پر سمجھا کر ہار چکے تھے۔ کمرے میں ایک تکلیف دہ خاموشی مسلط تھی۔

اسی چند لمحوں میں ایک ہاتھ سے آنچل تھامے، ادھر اُدھر جاتی اجنبی زینت میں وہ کون سی کشش تھی کہ اسد بے اختیار ہو کر اُٹھے اور چاہا کہ جاتی ہوئی زینت کو روک لیں مگر تیور دیکھ کر ہمت نہ ہوئی۔ خاموش اُداس صرف دیکھتے رہے۔ سامان موٹر پر رکھا جا چکا ...... آخر میں زینت نے ایک سرسری نظر کمرے کے افراد پر ڈالی اور کار میں جا بیٹھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایسا سکون تھا جیسے جج اپنے صحیح فیصلے کے بعد مطمئن ہو۔

زینت کار کا دروازہ بند کرنے والی تھی کہ اسد آئے اور کہا۔

"سب کچھ لے لیا زینت؟"

زینت نے جواب دیا "ہاں لے چکی۔"

"نہیں تم ابھی ایک چیز یہاں چھوڑے جا رہی ہو!"

زینت نے حیرت سے کہا "کون سی چیز؟"

اسد نے بڑی اپنائیت، بڑے خلوص سے زینت کو دیکھا اور مسکرا کر بولے۔

"میں"

زینت کی پلکیں آنسوؤں کا بار نہ سنبھال سکیں، نیچے جھک گئیں ..... اور نہ جانے اس سلوک سے وہ کیوں سسک سسک کر رو پڑی۔

اسد نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا ...... اندر بیٹھے اور زینت کے سر پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔ "روتی کیوں ہو۔ اب تو تمہارے شامل سب کچھ ہے۔"

پھر ڈرائیور کو اسپتال چلنے کا حکم دیا۔

زنجیریں

مشتاق احمد نوری

کچھ یادیں بڑی ڈھیٹ ہوتی ہیں جو زبان خاموشی سے پکارے جاتی ———

ہمیں یاد کئے جاؤ ——— یاد کئے جاؤ

آج میں بھی انہیں منتشر یادوں کے درمیان گھری ہوئی ماضی کے نرم و گداز باہوں میں جھول رہی ہوں، ماضی جو صرف تم ہو، ہاں صرف تم، ماضی کی ایک یاد صرف تم سے منسوب ہے۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ صرف تم سے وابستہ ہے۔ تم جو میری کائنات ہو، میری زندگی ہو، تم جو میری سانسوں کا ترنم ہو، میرے ہونٹوں کا تبسم ہو، ماضی کی یہ شریر چنچل یادیں مجھے گدگدا رہی ہیں اور مجھ پر بے خودی کا عالم طاری ہوتا جا رہا ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آج میں تمہیں اتنی شدّت سے کیوں یاد کر رہی ہوں۔ تم مجھ سے دور بھی تو نہیں ہو، پھر ———؟

شاید صرف اس لیے کہ آج مجھے ابی کو زندگی کا سب سے اہم فیصلہ سنانا ہے کل ہی کی تو بات ہے، انہوں نے کہا تھا۔

"بیٹی، میرے سفید بال بڑھاپے کی چغلی کھا رہے ہیں، اس لیے سوچتا ہوں کہ تمہارے فرض سے اب....."

بات ادھوری چھوڑ کر وہ مسکرانے لگتے ہیں اور میرے سامنے رشتوں کی

ایک طویل فہرست رکھ دی تھی۔

شہاب (ڈاکٹر)، شکیل (انجینئر)، انور (پروفیسر)، جاوید (آفیسر) اور نہ جانے کون کون.....

پھر انہوں نے کہا تھا، کل شام تک اپنی پسند بتا دینا۔ اور میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔ رشتوں کی اس بھیڑ میں تمہارا نام کہیں نہیں تھا۔ ہاں ہوتا بھی کیسے۔ تم تو ان کے سکریٹری تھے۔ ایک تنخواہ پانے والا ملازم۔ بھلا ایک ملازم بھی گھر کا داماد ہو سکتا ہے اس سے کیا ہوا کہ تم ان کے مرحوم جگری دوست کے لڑکے تھے۔ تمہارے آنے سے قبل وہ ہر لمحہ فکرمند رہا کرتے تھے۔ نہ جانے کتنے سکریٹریز آئے اور چلے گئے مگر کوئی بھی ان کا اعتماد حاصل نہیں کر سکا۔ ایک تم ہو جس پر انہوں نے لاکھوں کا کاروبار چھوڑ رکھا ہے۔

تم جب پہلے پہل آئے تھے تو میں نے سمجھا تھا کہ شاید اس عمر میں تم سے یہ ذمہ داری نہ نبھ سکے گی مگر تمہاری مستقل مزاجی کوئی اور کہانی سُنا رہی تھی، تمہاری پوری شخصیت تمہاری آنکھوں میں مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ تمہارے لب جتنے ہی خاموش تھے آنکھیں اتنی ہی باتونی۔ ایسی باتونی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھی تھیں۔ تمہاری آنکھوں میں ہر لمحہ ایک عجیب سی بے قراری کروٹ بدلتی رہتی تھی۔ میں نے ایک بار ان آنکھوں کی گہرائی ناپنا چاہی تھی، صرف ایک بار ـــــــ اور پھر ان آنکھوں کی گہرائی میں اس طرح ڈوبی کہ آج تک ابھر ہی نہ سکی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میرا آئی۔ ایس۔ سی کا امتحان سر پر تھا صرف ایک ماہ باقی تھا۔ میری تیاری نام برابر تھی، ابی سے بار بار کہنے پر بھی جب انہوں نے کسی اچھے ٹیوٹر کا انتظام نہ کیا تو میں نے امتحان نہ دینے کی دھمکی دی تب انہوں نے تم سے پڑھنے کو کہا۔ میں یہ سُن کر ہنس پڑی تھی۔

''بھلا ابا کا سکریٹری کیا خاک پڑھائے گا۔''

میں نے سوچا تھا کہ تم ایک معمولی گریجویٹ ہو گے مگر ابی نے کچھ اور ہی بتایا تھا۔ تم ذہین طالب علم تھے۔ ایم۔ ایس۔ سی کا امتحان صرف اس لئے نہ دے سکے تھے کہ امتحان کی

فیس کی رقم سے تم نے اپنی بیمار ماں کی دوا خرید لی تھی۔ گھر کی ساری ذمہ داریاں صرف تمہارے سر پر تھیں۔ اور صرف ٹیوشن سے یہ ذمہ داری کیوں کر نبھتی ـــــ غربت و افلاس کی زنجیروں نے تمہیں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ تمہیں اپنی تعلیم ترک کر دینی پڑی۔ اور تم ابی کے یہاں صرف چار سو روپے پر ملازم ہو گئے۔ ابی تمہاری صلاحیتوں کے قائل تھے اسی لئے انہوں نے تم سے پڑھنے کو کہا تھا۔

تم نے مجھے پڑھانا شروع کر دیا اور میں نے ایک ہی دن میں اندازہ کر لیا تھا کہ تم واقعی خدا داد صلاحیتوں کے مالک ہو۔ مشکل سے مشکل سوالات بھی تم اس طرح حل کرتے کہ وہ سہل ترین لگتے۔ تمہارے سمجھانے کا انداز اتنا دلکش ہوتا کہ باتیں ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتیں۔ تم نے مجھے بڑی محنت سے پڑھایا جس کے نتیجہ میں میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئی۔

تم گرچہ ہر وقت خود کو لئے دیئے رہتے تھے مگر میری کامیابی نے تمہاری شخصیت سے سنجیدگی اور کم گوئی کا خول اتار پھینکا تھا۔ تم ایک کھلنڈرے لڑکے کی طرح تالی بجانے لگے تھے اور اسی وقت بہت ساری مٹھائیاں منگوائی تھیں۔ تم نے مسکراتے ہوئے برفی کا ایک ٹکڑا ابی کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ پھر تم میری طرف بڑھے، میں ہاتھ میں لینا چاہتی تھی لیکن تم منہ میں دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مجھے ابی کی موجودگی میں شرم آ رہی تھی لیکن تم بچوں کی طرح ضد کر رہے تھے۔ "لیجیے بھی"

مگر میں تمہاری ضد میں منہ نہ کھول سکی تھی اور تم نے اچانک غصہ میں آکر ساری مٹھائیاں صحن میں پھینک دی تھیں اور لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔ میں تو حیرت زدہ رہ گئی تھی اور تمہاری اس جذباتی ادا میں، میں نے وہی لذت محسوس کی تھی جو غالب نے تیر نیم کش . . . . . . کی خلش میں محسوس کی ہوگی۔ اسی دن مجھے تمہاری طوفانی جذباتیت کا پتہ چلا تھا۔ واقعی تم حد سے زیادہ جذباتی تھے۔ اتنی سی بات پر یوں خفا ہو گئے۔

(پگلے کہیں کے ـــــ) مگر تمہارے اس غصہ میں کتنا پیار تھا، کتنا اختیار تھا۔
اپنی غلطی کی تلافی کے لئے میں اسی شام مٹھائی پلیٹ میں لے کر تمہارے پاس گئی

تم اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ آنکھیں بند کئے، نہ جانے کس خیال میں گم تھے۔ میں نے تھوڑی دیر تک تمہارے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت کو کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی اور جب میں نے پلیٹ تمہارے سامنے رکھی تو چونک پڑے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی تم نے باہر نکلنا چاہا۔ میں نے بے اختیار تمہاری کلائی تھام لی۔

"پلیز! مجھے معاف کر دیجئے۔" میں نے بڑی ہمت سے کہا مگر تم یک ٹک مجھے دیکھتے رہے۔ تمہاری آنکھوں سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ میں تمہاری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بولی۔

"لیجئے جتنی مٹھائی کھلانی ہو، اب کھلا دیجئے، مگر مجھے معاف کر دیجئے۔"

تم پھر خاموش رہے اور مجھے گھورتے ہوئے۔ میں نے تمہارے ہاتھوں کو زور سے جھنجھوڑا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ اتنی دیر سے میں تمہارے ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے تمہارا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"بس اتنی ہی دیر کے لئے تھاما تھا؟"

تم نے بیحد سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی۔ جی میں تو آیا کہہ دوں، نہیں، زندگی بھر کے لئے — "مگر میری خاموش — رہی اور نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ میں نے ہمت کرکے مٹھائی تمہارے منھ تک بڑھائی۔ تم نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور ڈرتے ڈرتے جب میں نے تمہاری آنکھوں میں جھانکا تو کھو سی گئی۔ میں تو اس وقت چونکی جب تم نے میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ تھام کر مٹھائی کھالی تھی اور ساتھ ہی میری انگلیاں بھی اپنے منھ میں دبالی تھیں۔

"بہت ہی شیریں ہیں۔"

پتہ نہیں تم نے مٹھائیوں کے بارے میں کہا تھا یا میری انگلیوں کے متعلق۔ میں تو مارے شرم کے زمین میں گڑ گئی۔ مجھ میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ اپنا ہاتھ بھی چھڑا سکتی۔ اور جب تم نے میرے منھ میں مٹھائی ٹھونس دی تو میں وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ میری

سانسیں اتنی تیز چلنے لگی تھیں گویا میں میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں ۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے بکھرے وجود کو سمیٹا تھا اور دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں پر قابو پایا تھا ۔ اور تب سے آج تک چاہنے کے باوجود بھی میں ان آنکھوں کو نہیں بھول سکی ہوں ۔ جنہوں نے میرے وجود کو پگھلا کر رکھ دیا ہے ــــــ بلکہ لمحہ بہ لمحہ ان میں ڈوبتی جا رہی ہوں ۔ اس واقعہ کو پورے دو سال گذر چکے ہیں ۔ اس طویل عرصے میں تمہاری نگاہوں نے مجھ سے بہت کچھ کہہ دیا ہے اور میں تم سے بہ خوبی واقف ہو گئی ہوں ۔

تم بڑے جذباتی ہو ، انتہائی حساس ۔ معمولی معمولی باتوں سے بھی تمہارے جذبات کے آبگینے ٹوٹ جاتے ہیں ۔ تم محبوباؤں کی طرح روٹھتے ہو اور پل بھر میں من بھی جاتے ہو ۔ اب میں تمہاری ہر پسند کا خیال رکھنے لگی ہوں ۔ اور تمہاری نگاہوں کو سمجھنے کی عادی ہو گئی ہوں ۔

ایک دن ہم دونوں سینما جا رہے تھے ۔ عام لڑکی کی طرح میں بھی کافی سج دھج کر تمہارے سامنے آئی ۔ کون کم بخت ہوتا جو آہیں نہ بھرتا اور پھر ہر لڑکی میں خودنمائی کا جذبہ ہوتا ہے ۔ وہ چاہتی ہے کہ ہر کوئی اس کی تعریف کرے ۔ اس کے حسن کو سراہے ۔ اس سے محبت کرے اور وہ جدھر سے بھی گزر جائے اپنے پیچھے آہوں کا غبار سا چھوڑ جائے اس طرح اس کے خودنمائی کے جذبے کی تسکین ہوتی ہے ۔ میں نے بھی داد طلب نگاہوں سے تمہاری طرف دیکھا لیکن تمہاری نگاہوں میں ناپسندیدگی کی جھلک نمایاں تھی ۔ میں الٹے پاؤں واپس ہوئی اور جب تمہارا من پسند لباس فیروزی رنگ کا شرارہ سوٹ پہن کر آئی تو تمہاری نگاہوں سے پیار چھلکنے لگا ۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا شریکِ سفر منتخب کر لیا ہے ۔ میں صرف وقت کی منتظر ہوں ۔ میرا بی ۔ ایس ۔ سی کا فائنل امتحان ہونے جا رہا ہے ۔ امتحان کے بعد ہی ابّی میری شادی کر دینا چاہتے ہیں ۔ اس لئے انہوں نے میرا فیصلہ مانگا ہے ۔ ابی کی سب سے بڑی کمزوری ہے جھوٹی شہرت اور دولت ــــــ انسانی شرافت اگر ان صفتوں سے

محروم ہے تو ان کے نزدیک اس کی کوئی قدر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے میرے رشتے کے سلسلے میں بھی انہیں چیزوں کو فوقیت دی ہے۔ انہیں اس کی فکر نہیں کہ پروفیسر انور جھکی ہیں اور میری دوگنی عمر کے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب کو اپنے پیشے سے فرصت نہیں۔ اور اگر رات کی تنہائی میں چند لمحے ملتے ہیں بھی تو وہ انہیں شراب و شباب کے پیچھے برباد کر دیتے ہیں۔ اور انجینئر شکیل انتہائی خشک طبیعت کا مالک ہے۔ وہ اپنے ہی خول میں بند رہنے والا ہے انتہائی بور آدمی ہے اور اس کے خیالات مجھ سے قطعاً جدا ہے۔

مگر ابّی کو اس سے کیا مطلب۔ وہ تو دیکھ رہے ہیں کہ ان سب کے پاس دولت ہے اور سماج میں ایک اہم مقام ہے۔ انہوں نے تم سے بھی مشورہ مانگا تھا۔ تم نے صرف اتنا کہا تھا:

"میرے خیال میں شادی کے لئے ذہنی ہم آہنگی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ نام و نمود اور دولت کے سہارے مادی عیش و عشرت کو تو خریدا جا سکتا ہے مگر سکون بھرا ایک لمحہ بھی خریدا نہیں جا سکتا — اس لئے رشتہ طے کرتے وقت اس پوائنٹ کو بھی سامنے رکھیں۔"

مگر ابّی نے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ انہیں میری خوشی سے زیادہ اپنی شہرت اور جھوٹی انا کی تسکین مقصود ہے۔ وہ تو کوئی ایسا داماد چاہتے ہیں جس کے نام کے ساتھ لفظ "بڑا" لگا ہو اور تم تو اس "بڑے پن" کی صفت سے محروم ہو۔ اس سے کیا ہوا کہ ہم دونوں کے خیالات ہم آہنگ ہیں اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے خیر کچھ بھی ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود بھی میں مطمئن ہوں کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ اس سلسلے میں میری بھی رائے لی جائے گی اور میرا فیصلہ ہی قطعی اور آخری ہوگا۔

میں نے ایک دن تم سے بھی تفصیل سے بات چیت کی تھی تم صرف خاموشی سے سنتے رہے تھے اور سر جھکا کر کاغذ پر آڑی ترچھی لکیروں کا جال بناتے رہے

تھے ۔ میرے مشورہ مانگنے پر تم نے صرف اتنا کہا تھا ۔

" پگلی ــــ تیری خوشی میں ہی میری خوشی ہے ۔ اگر میری بربادی میں ہی تمہاری خوشی پوشیدہ ہے تو یقین جانو میں ہزار جنم لے کر خود کو برباد کرتا رہوں گا کیوں کہ مجھے صرف اور صرف تمہاری خوشی چاہئے ۔ بس اور کچھ نہیں "

اور میں جانتی ہوں کہ میری خوشی صرف تم ہو، تم جسے پاکر میں دنیا کی ساری خوشی پا سکتی ہوں ، تم جسے پانے کے لئے میں دنیا کی ساری نعمتیں ٹھکرا سکتی ہوں ۔ میرے محبوب ، میں اپنی پاکیزہ محبت ابّی کی جھوٹی شان اور وقار کے لئے قربان نہیں کرسکتی ۔ زندگی کے کھوکھلے عسر وعشرت کے لئے میں اپنے پیار کی بازی نہیں لگا سکتی ۔ میرے سینے میں بھی دل ہے جس میں سینکڑوں تمنّائیں مچل رہی ہیں ، آرزوئیں کروٹ بدل رہی ہیں اور میں اپنے ارمانوں کی مالا سے آشا کا پنڈال سجائے ، سپنوں کی دہلیز پر بیٹھی کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں ۔ اور جب انتظار کی یہ میٹھی گھڑی ختم ہی ہونے والی ہیں تو ابّی ہمارے درمیان چاندی کی موٹی اور اونچی دیوار کھڑی کر دینا چاہتے ہیں ۔

نہیں ! ــــ نہیں میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی ۔ جانتی ہوں ابّی مرتے دم تک میرے فیصلے سے متفق نہ ہوں گے ۔ مگر اس سے کیا ۔ شادی مجھے کرنی ہے ، انہیں نہیں ــــ زندگی مجھے نبھانی ہے انہیں نہیں ، اس لئے میرا فیصلہ ہی قطعی اور آخری ہوگا ۔

کچھ بھی ہو، چاہے زمین کی گردش رک جائے یا آسمان ٹوٹ پڑے ۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی ، ہرگز نہیں ، کبھی نہیں ــــــ

اور تھوڑی دیر قبل میں نے ابّی کو فیصلہ سُنا دیا ہے ۔ وہ بہت خوش

ہوئے ہیں۔ انہوں نے میری ہوشمندی کی تعریف کی ہے ـــــ مگر ـــــ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے، آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا ہے۔ زندگی کی روشنی معدوم ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ اور میں روایتوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اپنے کمرے کی طرف اس طرح قدم بڑھا رہی ہوں ـــــــ جیسے آگے گڈھے ہوں۔

خندق ہوں ـــــــ
گہری اور عمیق کھائیاں ہوں ـــــــ
پُرشور عظیم سمندر ہو ـــــــ!!

بارش

فاروق راہب

رات بڑی بھیانک تھی !

گھپ اندھیرا

پر ہول سناٹا۔

صرف بارش کا شور تھا۔

بادل گرج رہے تھے، بجلی چمک رہی تھی، شعلے لپک رہے تھے۔ خوف ناک آندھی کے پاگل جھونکوں سے دل لرز رہے تھے ــــ رات ــــ کی آغوش میں پڑی سسک رہی تھی۔

کیا یہ ظلم کی شب کبھی ختم ہو گی ؟

فضا کے سینہ پر ایک سوال کانپ رہا تھا۔

چھپ، چھپ، چھپ......

برق کوندی۔ کئی دل دوز چیخیں ابھریں۔ پھر وہی خاموشی وہی سکوت ــــ

صرف بارش کا شور جاگ رہا تھا !

بوندوں کے ٹپکنے کی صدائیں دل کو کچوکے لگا رہی تھیں۔

طوفان کی گود میں ایک آواز بازگشت کر رہی تھی۔

" آج رات مریم آوارہ بازوؤں کے گھیرے سے نہ نکل سکے گی۔"

یہ بلند ہوتے ہوئے شعلے جب سرد ہو جائیں گے تو صرف راکھ کے ڈھیر ہوں گے، لیکن یہ بھی بہہ جائیں گے ۔ کچھ بھی تو نہ بچے گا!

"صدیوں کی پیاس ایک پل میں بجھ سکتی ہے"؟

مدتوں سے سلگتی ہوئی آگ چند لمحوں میں ٹھنڈی ہو سکتی ہے؟؟

نہیں، نہیں، نہیں! ۔۔

ایک پردرد آواز ابھری تھی، پھر ڈوب گئی ۔

حد نگاہ تک پھیلی ہوئی تاریکی کو روشنی کی ضرورت ہے ۔،

لیکن روشنی کہاں ہے؟

ہزار ہا سال سے چمکتا ہوا آفتاب اندھیرے میں گم ہے ۔ سہمی سہمی سی آنکھوں میں روشنی کی تمنّا ہے ۔

روشنی! روشنی!!

نہیں!!

کئی ارمان بھرے پیچ رات کی سیاہی میں مل گئے ۔

اور بارش تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی ۔

کون ہے جو موت کو زندگی کے حوالے کر دے ۔؟

موت کے بھنور میں ڈوبتی ہوئی زندگی کو سہارا کون دیتا ہے؟

موت اور زندگی کے درمیان کھڑے انسان کے ذہن میں ہزاروں ہونے والے متعدد خیالات دل میں بے شمار خواہشوں کو جنم دیتے ہیں، اور ان گنت لمحوں سے گزرتا ہوا وہ اپنی حسرتوں کے پامال ہونے کا تماشہ دیکھتا ہے ـــــ آنکھوں سے صرف غم کے سوتے پھوٹتے ہیں ۔

رات کی بے بسی، ماحول کی بے کسی کا فسانہ سنا رہی تھی ۔

ہوائیں بے چین روحوں کی طرح چکر کاٹ رہی تھیں اور بارش کا زور مسلسل بڑھتا

جا رہا تھا۔ بجلی کے لپکتے ہوئے شعلوں میں ڈری ڈری سی چیخ بلند ہوئیں۔ لیکن بادلوں کی گرج کے نیچے گھٹ کر رہ جاتیں تھیں۔

ہر طرف اندھیرا۔

ہر طرف خاموشی۔

صرف تلخیوں کا تکلیف دہ احساس تھا!

اور سحر جب قریب تھی، بارش بھی تھم گئی۔

آخر کب تک بارش ہوتی؟

پیاس کبھی نہ کبھی بجھے گی ہی!

آگ کبھی نہ کبھی سرد ہوئی ہی!!

صبح رات کی کرب ناک سسکیوں کی داستان کہہ رہی تھی۔

درخت ننگے کھڑے تھے۔

شاخیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

پتے بکھرے پڑے تھے۔

سڑکوں پر خون منجمد تھا۔

رات بھر خون کی بارش ہوئی تھی۔

رات بھر مریم لٹی تھی۔

رات بھر انسانیت کراہی تھی۔

منزل کہاں ہے تیری

(شمیم افزا قمر)

رفعت معظم کے آئی۔اے۔ایس میں کامیاب ہوتے ہی ان کی قدروں میں اچانک کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ ہر جوان لڑکی کے والدین نے اس خبر کو نہایت شوق سے سُنا اور سُن کر بھی انجان بن گئے۔ ظاہراً اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی لیکن مختلف گھرانوں میں وقتاً فوقتاً رفعت معظم کا نام سُنا جانے لگا۔ رفعت معظم میں تھیں بھی کچھ ایسی ہی خصوصیات جو وہ والدین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ماں باپ بچپن ہی میں سدھار گئے تھے۔ ایک خالہ تھیں اور ان کی مختصر سی جائداد جس کے سہارے آج اُن کے دن پھرے تھے اور اس بھاگتی سرکتی دُنیا میں انھوں نے اپنے قدم ذرا مضبوطی سے جمادے تھے۔ گورا گورا رنگ، بھرا بھرا چہرہ، لمبا قد، چھریرا جسم اوسط درجہ کی آنکھیں ذرا موٹی سی ناک کے باوجود اگر وہ اعلیٰ درجہ کے ہیرو نہیں تو اچھے بھلے نوجوان ضرور تھے۔ دراصل رفعت معظم میں کوئی ایسی کمی نہ تھی جو انھیں آج کل کے خوش پوش ہیرو بننے میں مانع ہوتی۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ صرف ان کا تصوّراتی بُت تھا جو اب تک انھیں ہیرو سے زیادہ آدمی بنائے ہوئے تھا۔ نہ اُنھیں بے حد تنگ لباس سے دلچسپی تھی اور نہ پیشانی پر جھولتے ہوئے بالوں سے، نہ جاڑے کے دنوں میں چاک گریباں میں رنگین اسکارف کی جھلک نظر آتی۔ شوخ مردانہ رنگ کے پینٹ، سفید کھلے آستینوں کی قمیص، عجلت میں بنائے ہوئے بال، چہرے پر اُبھرتی ہوئی سنجیدگی کا ہلکا سا عکس اور وجیہ جسم کے سحر میں کبھی کبھی رفعت معظم خود ہی مسحور ہونے لگتے۔ اس پر طرّہ یہ کہ انھوں نے موجودہ روش کے مطابق نہ شادی کچھ عرصہ بعد کرنے کا اعلان کیا اور نہ جہیز اور مانگ ہی کی فہرست اپنی سروس کے سائن بورڈ کے ساتھ لگائی۔ بہرحال رفعت معظم آج کل کے

نوجوانوں کے ہجوم میں خود کو ملانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کا ایک سہانا خواب دیکھ رہے تھے جہاں سکون زیادہ تھا اور انتشار کم۔ سادگی اور سپردگی زیادہ تھی۔ بناوٹ اور کش مکش کم۔

جوان لڑکیوں کے والدین کے لئے رفعت معظم ایک سہانا خواب بن گئے۔

"بھلا اس سے اچھا اور سلجھا ہوا لڑکا کہاں مل سکتا ہے پھر ساس و نند کا بھی جھگڑا نہیں۔ گھر کا اکیلا ہے۔" امین منزل کے صحن میں تخت پر بیٹھے ہوئے ابراہیم صاحب نے سفید بچھی ہوئی چاندنی پر نظر جمائے ہوئے اپنے منجھلے داماد سے کہا۔ میرا خیال ہے کہ رفعت تو شاید تم لوگوں کے دوستوں ہی میں ہوں گے۔"

آس اور نراش کی کش مکش نے اُن کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیا اور دل میں متمنّی ہوئے کہ ان کے داماد کا جواب اقرار ہی میں ہو۔ اگر رفعت دوست ہوئے تو منسوب طے کرنا بہرحال آسان ہی ہوگا۔ لیکن اسد نے کہا۔

"رفعت سے میری ملاقات تو نہیں پھر بھی میں اُن سے بات کروں گا۔ ویسے تو اُنھیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ سیدہ اُن کے خیال کے عین موافق ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔ وہ ایک اچھی بیوی بن سکتی ہے۔"

ابراہیم صاحب نے ایک لمبی سی ہونہہ کہی اور خاموش ہو گئے اسد دل ہی دل میں ملاقات کی تدبیریں سوچتے اُٹھ کھڑے ہوئے انھیں کوئی دقّت طلب بات بھی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ رفعت نے جن خوبصورت خیالوں سے اپنے کردار کو سجایا تھا۔ سیدہ اُس خواب کی تعبیر بن سکتی تھی ——— لیکن بات بگڑ گئی۔ ابھی اسد میاں رفعت سے ملنے کا پروگرام ہی بنا رہے تھے کہ دوسری شام دور سے انھوں نے عرفان بھائی کو آتے دیکھا۔ ان کے ساتھ رفعت معظم بھی تھے اور دونوں "بلو برڈ" ریستوران سے نکل رہے تھے۔ عرفان لپک کر اسد کے پاس پہنچے۔ بڑی پُرتپاک ملاقات کی اور چلتے چلاتے رفعت سے بھی تعارف کرا دیا۔ لیکن ان کے جاتے ہی اسد نے رفعت معظم والے معاملہ کو تو تہ کر کے رکھ دیا اور اپنے سسر سے عرض کر آئے کہ وہ رفعت کا خیال دل

سے نکال دیں۔ سیدہ کے لئے کوئی اور رشتہ تلاش کیا جائے گا۔ اب عرفان بھائی سے ٹکر لینے کی ہمت تو اسد میں نہ تھی۔ عرفان بھائی تو اتنے داؤں پیچ جانتے تھے کہ کوئی کمبخت ان کے دام میں ایک بار پھنس کر پھر نہیں نکل سکتا۔ انھوں نے اپنے خاندان کی اکثر لڑکیوں کو پار لگایا تھا۔ اور اس کے مختلف حربے اُنھیں اچھی طرح معلوم تھے۔ کبھی تعریفوں کے دفتر کھول کر، کبھی مختلف بڑے رُسوخ والوں کا نام لے کر کبھی مارل سپورٹ کا واسطہ دے کر اور کبھی اپنی مختصر سی کار پر بے تحاشا سیر و تفریح کے ذریعہ وہ شئے مطلوبہ کو اس طرح مسحور کرتے کہ وہ طرح طرح کی بولیاں بولنے لگتا۔ بہرحال اب تو معاملہ طے ہی تھا کہ رفعت معظم شاہین کے لئے چُن لئے گئے تھے۔ پھر شاہین تھی بھی تو ایسی ہی خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں، کُھلتا رنگ، ہونٹوں پر ناچتی پھڑکتی مسکراہٹ، فرنچ کٹ بال، چُست پائجامہ، ڈھیلا کُرتا پہنے، پردہ والے ماحول میں چلمن کے پیچھے سے اپنے ہیروکٹ بھیا کے دوستوں کو ناشتہ اور چائے اس طرح بھجواتی کہ ہر انداز میں اس کی نفاست جھلکتی ہوتی۔ شاہین کی ہلکی ہلکی سی جھلک باہر بیٹھنے والوں کو نظر آتی تو دل ہی دل میں شعر گنگنا کے رہ جاتے۔

شاہین عرفان بھائی کی سب سے چھوٹی سالی تھی اور سب سے چہیتی بھی عرفان بھائی ہمیشہ ہی اُسے چڑھایا کرتے تھے کہ اس کے لئے تو میں کوئی نہایت شاندار بندر را باندھ لاؤں گا لیکن مجھے شک ہے کہ یہ لڑکی اُسے دیوانہ نہ کر دے۔ بہرحال عرفان بھائی کامیاب ہوئے اور شہر میں شاہین اور رفعت کی منسوب طے پانے کی خبر گشت کرنے لگی۔ بیگم نعیم نے جو اچانک ہی رفعت معظم اور شاہین کا قصہ سُنا تو سُنتی ہی رہ گئیں۔ اُنھیں یہ بات کچھ جچی نہیں۔ ہئے ہئے کتنا اچھا لڑکا ہاتھ سے نکل گیا اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی انھوں نے بڑے تاسف سے سوچا۔ یہ نعیم صاحب بھی عجیب نامعقول آدمی ہیں۔ آج تک انھوں نے کوئی کام بھی ڈھنگ کے نہ کئے۔ خُدا بھلا مردوں کو ایسی اُلٹی عقل ہی کیوں دیتا ہے۔ اگر کچھ بھی قبل انھوں نے رفعت معظم کا نام سُنا ہوتا تو آج اُن کی روشنی ہی سے رفعت معظم کی منسوب طے ہوتی۔ لیکن اُنھیں تو اب بھی رفعت معظم کا صحیح پتہ معلوم نہ تھا وہ گھنٹوں دل ہی دل میں سوچتیں اور افسوس کرتی رہیں اور جب بے حد اُکتا گئیں تو اُٹھ کر سنگار میز کے پاس پہنچیں۔ قد آدم

آئینہ میں دیکھ کر اپنے بالوں کو درست کیا۔ ہونٹوں پر بڑی بد دلی سے لپ اسٹک لگائی
ٹکی دلی ساری کے آنچل کو درست کیا۔ قریب ہی رکھی گاڈریج کی الماری سے ایک ڈبیہ
نکال کر پرس میں ڈالی اور پورٹیکو میں کھڑی کار میں جا بیٹھیں۔ اچانک ہی انھیں کچھ
خیال آیا تو دوبارہ اتر کر روشی کو بلانے چلی گئیں۔ روشی اپنے کسی دوست کے یہاں
جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بیگم نعیم کا فرمان سن کر کوفت کھانے لگی۔

"ممی! مجھے تو بخشئے! مجھے کل کے سیمنار کی تیاری کرنی ہے۔ اب میرا آخری سال ہے
اب بھی وقت ضائع کرتی رہی تو ریزلٹ خراب ہو جائے گا۔" روشی نے اکتا کر کہا۔

"لیکن بیٹی بات بہت بڑی ہے۔ کسی آئی۔ اے۔ ایس لڑکے سے تیری شادی ہو گی
تو زندگی بھر آرام کرے گی اور میں بھی چین کی سانس لوں گی۔ امتحان وغیرہ کی تیاری
تو پھر کر لینا۔"

"توبہ امی آپ پر تو خواہ مخواہ ہی شادی کا دورہ پڑتا رہتا ہے۔ صوبی آپا کے
پیچھے لگی لگی آخر ان کو جھنجھٹ میں پھنسایا اور اب میں اس چکر میں پڑ گئی۔ آخر آپ لوگ
چین سے جینے کیوں نہیں دیتی ہیں۔

روشی نے اور بھی منہ پھلا لیا اور بڑبڑاتی ہوئی ممی کے بازو میں بیٹھ گئی۔ کار
مختلف راستوں پر دوڑتی، چکر کھاتی آخر رفعت معظم کے مکان پر پہنچ گئی۔

معمولی سے مکان کے برآمدے میں کرتا پاجامہ پہنے رفعت معظم اخبار پڑھ رہے
تھے۔ بیگم نعیم اور روشی کو کار سے اترتے دیکھ کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ بڑے ادب سے
انھیں ڈرائنگ روم میں لا کر بیٹھایا۔

"مجھے رفعت معظم آئی۔ اے۔ ایس سے ملنا ہے انھیں مطلع کر دیجئے۔" بیگم نعیم
نے بیٹھتے ہوئے کہا ـــــ "جی، فرمائیے! میں ہی تو رفعت ہوں۔"

"ایں تم ہی رفعت معظم ہو۔ اچھا اچھا۔ بہت خوب۔" بیگم نے اپنے جاتے ہوئے
ہوش کو سمیٹا۔

"بیٹا میں مسز نعیم ہوں۔ نام تو تم نے سنا ہی ہو گا۔ ابھی ریٹائر ہوئے ہیں۔ ڈی۔ ایم

کی پوسٹ سے۔ مجھے تم سے ضروری کام تھا۔ میں نے سوچا۔ چلو تم سے خود ہی مل لوں۔ اب تو تم بھی بڑے آدمی ہو۔ ماشاءاللہ ہونہار نکلے ہو۔"

"جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

رفعت ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"اے نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہارے والدین کہاں ہیں؟"

"ان کا انتقال تو میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"او ہو ہو ہو..... بیچارہ ..... بیچارہ .... اور بہنیں؟"

"جی بس میں تنہا ہی ہوں۔"

"او ہو ہو .... بیچارہ ..... لیکن نہیں نہیں ..... ایسی کوئی بات نہیں تم ہم لوگ کو ہی اپنا سمجھو۔ یہ میری بیٹی ہے روشی۔ ایم۔اے کے آخری سال میں ہے۔"

"جی بہت خوب!" رفعت دھیرے سے بولے۔

"ڈولٹ" روشی دل ہی دل میں بڑبڑائی اُسے اپنی ماں اور رفعت دونوں ہی پر بیک وقت غصہ آ رہا تھا۔ کیا بے تُکی ملاقات ہے۔ کیسی احمقانہ باتیں ہو رہی ہیں۔ اُس کا شعور یافتہ ذہن جھنجھلایا جا رہا تھا۔ وہ اس طرح انجان بن کر بیٹھ رہی۔ جیسے وہ بھی کمرے میں سجے ہوئے ٹیبل کرسی اور صوفہ سیٹ وغیرہ کا کوئی حصہ ہو یا دیوار پر آویزاں کوئی تصویر ہو۔ رفعت کی نظریں اُسے غیر حاضر پا کر آہستہ آہستہ اُٹھیں اور روشی کے چہرے سے پھسلتی، سرکتی پیروں پر آ کر جم گئیں۔ خوبصورت سے پیروں میں نازک سی اونچی ایڑی کی سفید سینڈل، سیاہ چُست پائجامہ، سیاہ اور سُرخ چھوٹے چھوٹے پھولوں کا پھنسا پھنسا جمپر، سیاہ ہی دوپٹہ، کھلے بازو، اُلجھے اُلجھے بال، آنکھوں کے خانے میں موٹے موٹے کاجل، ہونٹوں کے خم کو اُبھارتے ہوئے پھیکے رنگ کی لپ اسٹک اور یہ روٹھا روٹھا انداز، اچانک ہی رفعت کا دل چاہا کہ وہ ان رس بھرے ہونٹوں کو بس کچا کچ چبا ہی جائے اُسے چیری، انگور، امرود، سیب اور نہ جانے کون کون سے الّم غلّم پھل یاد آنے لگے دھیرے سے اُس نے اپنا ہی ہونٹ کاٹ لیا۔

"آپ کس سبجکٹ میں ایم اے کر رہی ہیں؟" رفعت نے اپنے ہوش مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ لمبی لمبی پلکوں کو ہلکی سی جُنبش ہوئی آنکھوں کے گڈھے میں دیدوں کے گھومنے کا احساس ہوا، نظریں کونوں سے جھانکنے لگیں۔ جسم اور کاندھے میں ایک لچک پیدا ہوئی اور ایک بے حد منمناتی آواز پیدا ہوتے ہی ڈوب گئی۔

"جی! معاف فرمائیے گا میں نے سُنا نہیں۔" رفعت پوری توجہ سے سامنے جُھک آئے۔

"میں سائیکلوجی میں ایم۔اے کر رہی ہوں۔" نہایت دھیمی آواز میں دوبارہ جواب ملا۔ رفعت کو چائے کی پیالی میں قند کی ڈلیاں گُھلتی معلوم ہوئیں۔

"اوہو سبجکٹ تو آپ نے نہایت دلچسپ چُنا ہے۔" انھوں نے خوش اخلاق بننے کی کوشش کی۔ خمیدہ پلکوں کو ہلکی سی جُنبش ہوئی اور ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ لہرائی رفعت معظم کے ہوش دوبارہ جانے لگے۔ نوکر چائے کی ٹرے اور پلیٹ میں بسکٹ اور سیب کی قاشیں لے آیا۔ رفعت آگے بڑھے۔

"ارے رے رے .... تم بیٹھو رفعت۔ روشی بیٹا تم چائے بناؤ نا۔" بیگم نعیم نے نہایت خلوص اور بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ ایک فتنہ خیز انداز میں روشی اُٹھی اور ٹیبل کے قریب آگئی۔ رفعت کی آنکھیں ایک بار پھر روشی کے جسم پر گڑ گئیں۔ دراز قد، بیحد سڈول جسم، پتلی لچکتی کمر، بغیر آستین کے جمپر میں چکنے بازو، کُھلے گریباں سے جھانکتی ہوئی خوبصورت گردن اور پوشیدہ اُبھار نے اُس کی توبہ پھر توڑ ڈالی۔ اُسے اچانک ہی وہ مچھلی جیسی کوئی مخلوق معلوم ہونے لگی۔ جو کہیں سے پھسل کر اُس کے ڈرائنگ روم میں آگری ہو۔ رفعت نے سوچا ایسی چکنی پھسلتی ہوئی چیز کو وہ اپنے بازوؤں میں اس طرح جکڑے کہ اس کے پھسل کر گرنے کا خدشہ ہی نہ رہے۔

روشی نے بڑی نزاکت سے چائے بنائی اور پیالی میں شکر ڈال کر ملانے لگی۔ ایک لطیف سی آواز کمرے کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کرنے لگی۔ اور رفعت پھر بکھرنے لگے۔ اُسے اپنی خالہ زاد بہن سکینہ کا چائے بنانا یاد آیا۔ کتنا تضاد تھا دونوں میں لسڑ پھسڑ کپڑے پہنے چائے کی ٹرے میں چائے دانی سے چھلکتی چائے لئے۔ بکھرے بالوں کو بار بار

پسیٹے ہوئے چائے پیالی میں انڈیل کر دھواں دھار پٹاخہ کی سی آواز میں کھکھلانے لگتی۔

"ہاں بیٹا! میں نے کہا تھا نا کہ تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔"

بیگم نعیم کی آواز نے رفعت کو جیتے جاگتے خواب سے بیدار کیا۔

"جی ہاں! فرمائیے۔ میں حاضر ہوں۔"

"بیٹا بات دراصل یہ ہے کہ میں بیسویں صدی میں بھی زیادہ دقیانوسیت کی قائل نہیں۔ اور پچھلے رسم و رواج کو جائز نہیں سمجھتی۔ خاص کر لڑکے لڑکیوں کی شادی کا معاملہ تو ایسا ہے کہ جب تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی پسند کا اظہار نہ کریں غیر دانستگی کی شادی تو بس ظلم ہی سمجھتی ہوں۔ اور اب شادی بھی کچھ اتنی کم سنی میں نہیں ہوتی جیسی گزشتہ دنوں ہوا کرتی تھی۔ لڑکے لڑکیاں خود ہی سمجھ دار ہو جاتے ہیں۔"

"جی ہاں! درست فرمایا آپ نے۔"

"تو بیٹا میں نے بھی سوچا کہ تمہاری اور روشی کی ملاقات کرا دوں۔ تمہاری تعریفیں تو میں نے بہت سُنی ہیں۔ اگر تم دونوں کو میرا مشورہ پسند آجائے تو ماشاء اللہ جوڑا بہت اچھا ہوگا۔ میری روشی بھی اللہ کے فضل سے بڑی ہونہار اور سمارٹ بچّی ہے۔"

"جی جی جی جی ہاں! بجا فرمایا آپ نے۔ روشی صاحبہ بہت اچھی ہیں۔" رفعت کو اپنے کان کی لویں جلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ روشی کی سانولی رنگت پر کسی قسم کا رنگ نہیں آیا۔ وہ بڑی بے تعلقی سے بیٹھی اپنے گلابی رنگے ناخنوں کو کھرچتی رہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے بیٹا؟ کیا یہ رشتہ تمہیں پسند ہے؟ ویسے تو یہ بڑی ہنسوڑ لڑکی ہے لیکن ابھی خواہ مخواہ ہی شرمائی جا رہی ہے۔"

"لیکن صرف میری ہی پسند اور ناپسند پر کیا منحصر ہے آخر روشی صاحبہ کو بھی تو اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔" رفعت نے کسی قدر ڈھیٹ بننے کی کوشش کی۔

"ارے وہ تو میں اپنی بٹیا سے پوچھ ہی چکی ہوں لیکن آخر تم سیانے ہو۔ ہوشیار ہو تم بھی تو کچھ کہو۔"

"جی! ...... وہ ..... وہ ایسا ہے نا کہ میں ذرا اپنی خالہ جی سے پوچھ ....."

"بیٹے! اب تم بھی کمال کرتے ہو۔ اس عمر میں بھی کیا ابھی پوچھ تاچھ کی ضرورت ہے۔

پھر شادی تمھیں کرنی ہے یا تمھاری خالہ جی کو۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ دل سے تمھیں روشنی پسند ہی ہے بس ذرا اظہار کرتے جھجھک رہے ہو۔"

"جی نہیں! بات دراصل یہ ہے کہ ......

"نہیں بیٹا! کوئی جھجھک نہ رکھو۔ دیکھو میں تمھارے لئے ایک چیز لائی ہوں اور اُمید ہے کہ یہ تمھیں ضرور پسند آئے گی۔" بیگم نعیم نے پرس کھول کر بڑی احتیاط سے ایک ڈبیہ نکالی۔ اور ڈبیہ کھول کر ایک یاقوتی نگ کی جگ مگ کرتی انگوٹھی اپنی انگلیوں میں پکڑ کر رفعت کے سامنے کر دی۔ رفعت بالکل ہی بوکھلا گئے۔ گھبرا کر انھوں نے روشنی کی طرف دیکھا لیکن وہ سارے جہاں سے بے نیاز بیٹھی ٹیبل کرسی اور کمرے کی مختلف چیزوں کو بے تحاشا گھورے جا رہی تھی۔

"کیوں کیا یہ تمھیں پسند نہیں ہے؟"

رفعت خاموش رہے۔ وہ سوال کی نوعیت ہی نہ سمجھے۔ بیگم نعیم کیا پوچھ رہی تھیں۔ اُسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ انگوٹھی پسند ہے یا مچھلیوں جیسی چکنی ہر موضوع سے بے تعلق بیٹھی روشنی؟

رفعت معظم جھنجھلا گئے۔ نہ جانے بیگم نعیم کی چابک دستی پر یا روشنی کی بے تعلقی پر یا اپنی بے بسی پر۔ اپنی اہمیت کے احساس نے رفعت معظم کو روشنی پر غالب آنے کی خواہش اچانک ہی کئی گنا زیادہ بیدار کر دی۔

وہ روشنی کی بے تعلقی پر مسکرائے اور بڑے اطمینان سے بولے۔

"مجھے دونوں ہی پسند ہے۔ آپ کی لائی ہوئی یہ انگوٹھی بھی اور روشنی بھی۔

بیگم نعیم کے چہرے پر ایک فتح مندانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن روشنی ابھی تک ہینڈلوم کاریگری کا بہترین نمونہ بنی، ویسی ہی بے تعلق بیٹھی رہی۔ انگوٹھی رفعت کی انگلیوں میں کانپ رہی تھی۔ اور اس کے نگینہ میں بکھرے بالوں کی ایک لمبی چوٹی کے 'سادہ چہرہ' مسکراتی آنکھیں، ساری کے آنچل کو کمر میں کھونستی، چائے کی کشتی سنبھالتی ہوئی لڑکی کی تصویر جھلک جھلک کرتی رفعت کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پرائے چہرے

ذکیہ مشہدی

سارے گھر میں ایک بار پھر وہی سناٹا چھا گیا تھا جو اکثر ایسے موقعوں پر چھاتا رہتا ہے۔ بھابی خاموشی سے سر جھکائے چاول چُن رہی تھیں۔ ماں خلا میں کچھ دیکھتی دانتوں میں پھنسی چھالیہ کا ٹکڑا زبان سے کریدنے میں مصروف تھیں۔ باہر بیٹھک میں بابوجی نے اخبار کے پیچھے سر چھپا رکھا تھا۔ بھیا گھر میں تھے ہی نہیں۔ وہ عموماً راہ فرار پسند کیا کرتے تھے۔ سنیتا دیدی مشین پر جھکی بھیا کی بچّی کا فراک تیار کر رہی تھیں۔ مشین کی آواز یکسانیت سر پر قطرہ قطرہ ٹپکتے پانی کی طرح اعصاب میں ایک عجیب سا تکلیف دہ احساس پیدا کر رہی تھی گھر میں اس سخت اونگھتی اُداس فضا میں اُردن کا دم جیسے گھٹا جا رہا تھا۔ ویسے بھی یہاں آکر اس کا دم بلا وجہ بھی گھٹتا رہتا تھا۔ انتہائی بیزاری کے عالم میں اس نے کچے آنگن سے ایک کنکری اُٹھائی اور سامنے درخت پر چڑھتی گلہری پر پھینکی۔

حرامزادے ـــــ ماں نے دانت کریدتے ہوئے اپنا محبوب لفظ دُہرایا۔

کون ہے ماں ؟ اُردن چونک پڑا۔ پل بھر کو وہ بھول گیا کہ ماں اس وقت کسے گالی دے سکتی ہیں۔

ارے وہی اور کون۔ ناشتہ کھانا ٹھونس ٹھانس کر چلے گئے اور جواب تک نہیں دیا۔ آج دوبارہ آدمی بھیجا تو کہتے ہیں لڑکی پسند نہیں ہے۔ ان کی لڑکیوں کی جوانی مٹّی میں ملے۔

ارے نرون کی بہو! چولہا سُلگایا یا دن بھر چاول چُنتی رہو گی ؟ انھوں نے بیچ سے پان کی پیک پھینکی۔ اُردن بجلی کی سی تیزی سے ہٹ گیا ورنہ اس کا کرتا گلنار ہو جاتا۔ کچھ آگے پیچھے دیکھا تو کردیاں۔

ارے تو کیوں نہیں دیکھتا آگا پیچھا۔ سامنے دھنس کے بیٹھا ہوا ہے یہ بڑا

جاٹ کا جاٹ۔

ارون کو شدید کوفت کا احساس ہوا۔ ماں کی سمجھ میں اس کی عمر کبھی نہیں آئے گی۔ جو منہ میں آتا ہے بک جاتی ہیں۔ وہ ۲۸ واں پار کر چکا ہے شادی بیاہ کی عمر آئی بلکہ باپ بننے کی۔

ماں! ارون کہہ رہا تھا تلی ہوئی مچھلی کھانے کے لئے۔ پرتیبھا نے دھیرے سے آکر ماں سے کہا۔ ارون نے نظریں اٹھائیں تو پرتیبھا کی صورت دیکھ کر اس کا جی جل گیا۔ تیل سے چپڑے ہوئے بال، شکل پر خاک اڑتی ہوئی، پیروں میں ہوائی چپل، ایک چپل کا اسٹریپ سیفٹی پن سے اٹکایا ہوا تھا، مریل سے رنگ کی ساڑی جو نئی ہونے کے باوجود پرانی لگ رہی تھی۔ کتنی بار کہا کہ چہرے پر ذرا اچھ رنگ و روغن کیا کرو اور رنگ ذرا ڈھنگ کے پہنو کہ کچھ تو صورت نکلے لیکن اس کا حلیہ ہمیشہ یہی رہا کرتا تھا۔ لیپ پوت کر تو مٹی کے مکان کی صورت بدل جاتی ہے تو یہ تو لڑکی ٹھہری۔ کیا ہوا جو عمر زیادہ ہوگئی تھی۔ ماں ہمیشہ روپیوں کا رونا روتی رہتی تھیں۔ جو آتا ہے جھاڑو پھرا اسی لئے لوٹ جاتا ہے کہ اس گھر کی صورت اسے روپئے اگلنے والی نہیں نظر آتی۔ نہ ڈائننگ ٹیبل، نہ صوفہ نہ فرج نہ قالین۔ بے رنگ مکان، اکھڑا پلاسٹر۔ وہ سب تو خیر تھا ہی لیکن پرتیبھا کی اکھڑے پلاسٹر والے مکان جیسی بے رونق صورت دیکھ کر بھی لوگ بھاگ سکتے ہیں یہ ماں کی سمجھ میں آتا تھا نہ بابوجی کی۔

مچھلی کھانے کو کہہ رہا تھا تو لے آئے جاکر۔ وہ پلو کھول کر پیسے نکالنے لگیں یہاں لانے والا کون ہے۔ تمہارے بابوجی کھانا نہ کھائیں دو وقت وہ گوارا ہے لیکن بازار جانا گوارا نہیں۔ تھیلا اٹھاتے عزت گھٹتی ہے۔ اور وہ ڈھینگ کا ڈھینگ ورُدن۔ اس کا حال یہ ہے کہ بازار جائے گا تو گر دکاندار نے سڑی چیز دے دی تو سڑی لے آیا اور اچھی دے دی تو اچھی لے آیا۔ ماں کو بہانہ ملنا چاہیئے بس ٹیپ ریکارڈ چالو ہو جاتا ہے۔ ارون جھنجھلا گیا۔

لے آؤں گا ماں مگر پیسے رکھو۔ ہیں میرے پاس۔ میں نے آج ہی تھوڑی کہا تھا مچھلی کھانے کو۔ پھر وہ جلدی سے جان بچا کر بھاگا باہر کی طرف۔ کون ماں کا مزید

لکچر سُننے۔ وہ اب وِ رون سے درون کی بہو کی طرف آ گئی تھیں اور قصیدہ جاری تھا۔

راستے میں بھیّا کے بچّے نے پیشاب کر رکھا تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر بھابی نے چُھننے ہوئے چاولوں کی تھالی رکھ دی تھی۔ سنیتا دیدی نے فراک سیتے سیتے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ان کے کھچڑی بالوں کی لٹ پیشانی پر جُھک آئی۔ ارون کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ دیدی اس سے سات برس بڑی تھیں۔ بڑی تو پرتیبھا بھی تھی لیکن صرف ڈیڑھ برس اور سب کی ڈانٹ سُننے کے باوجود ارون نے اسے کبھی دیدی نہیں کہا۔ بال کھینچ کر لڑتے لڑتے سارا بچپن بیت گیا اور اب ہر وقت بھنا بھنی۔ پرتیبھا تھی بھی بڑی کٹھ حجت۔

دراصل آدے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں جب لڑکی کے اندر چھپی عورت انگڑائی لے کر جاگتی ہے تو ماں کے قبیل کی عورتیں ہی اسے پتھرے کر سنگسار کر دیتی ہیں۔

یہ ہر وقت آئینے میں مُنہ کیوں تاکا جا رہا ہے؟

خبردار جو لپ اسٹک چھوئی۔ شریف گھرانے کی لڑکی ہے یا طوائف؟ ساری عمر پڑی ہے دولھے کے گھر کرنا سنگھار پٹار۔

اری حکمو نہی اتنی زور سے چلّا کر کیوں ہنستی ہے؟

نا۔ کہیں نہیں جانا ہے کیمپ ویمپ۔ یہ اسکول والے مرے ایسے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ کنواری لڑکیاں گھر والوں کے بغیر کہیں نہیں جاتیں۔

پرتیبھا کے سارے شوق ماں کے مُنہ سے جھڑتے پتھروں نے سنگسار کر دیئے تھے اور وہ خود بھی پتھر ہو گئی تھی۔ گر بجویٹ ہونے کے باوجود دبّو، جھینپو غیر ضروری شرافت اور حیا اس کے اوپر کیچڑ بن کر چپک گئی تھی۔ کسی کے سامنے جاتی تو چہرہ لال ہو جاتا۔ مُنہ سے بات نہ نکلتی۔ وہ درگا بابو رشتہ لائے تھے۔ ان کا کہنا تھا لڑکے کو جہیز نہیں چاہیئے بس لڑکی ذرا اسمارٹ ہو۔ لڑکے والوں کے آنے کی خبر بھی چار دن پہلے مل گئی تھی۔ ارون نے کہا دیدی پرتیبھا کے لئے ایک نیا بلوز سلوا دیجئے۔ ذرا نئی تراش کا اور سُن ری۔ وہ پرتیبھا

سے مخاطب ہوا۔کوئی لپ اسٹک وغیرہ ہے تیرے پاس جیجی یا لادوں ـــ ماں پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں۔کیوں رے بہن کو نچائے گا کیا ان لوگوں کے سامنے؟ اور ارون غصّے اور شرم دونوں سے لال ہو اُٹھا۔

پرتبھا سامنے گئی تو پورے وقت مُنہ نیچا کئے ساڑی کا پلّو مروڑتی رہی۔لڑکے نے کچھ پوچھا تو چہرہ سُرخ ہو اُٹھا۔آنکھیں چپلوں پر گڑ گئیں۔ہو گئی چھٹی۔اب اماں صبح سے بیٹھی لڑکے کی بہنوں کی جوانی مٹّی میں ملا رہی تھیں۔دیدی کی عمر تو نکل گئی گھر کا خرچہ ڈھوتے اور اپنے جہیز کے پیسے جوڑتے۔جس رفتار سے پیسے جُڑے، عمر اس سے دوگنی رفتار سے آگے بھاگی۔اب وہ وہاں تھیں جہاں دُلھن بننے کی، شادی بیاہ کی بات مذاق معلوم ہوتی ہے۔اب سب لوگ پرتبھا کا دولھا ڈھونڈھ رہے تھے۔جہیز اس کے لئے اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ورون بھیّا نے کچھ پیسے جوڑے تھے۔بابوجی کا پراویڈنٹ فنڈ مل گیا تھا۔دیدی نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ اپنے سارے پیسے وہ پربتی کو دے دیں گی۔

ـــ مچھلی خریدتے ہوئے ارون کے مُنہ میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔بھابی مچھلی بہت اچھی پکاتی ہیں اس لئے وہ فرمائش کر بیٹھا۔مگر دھواں بھرے کچن میں بیٹھ کر کھانے سے سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔اور کوئی جگہ ہے ہی نہیں۔جگہ جگہ پوتڑے، پیشاب۔یہ گھر کبھی اور لوگوں کے گھروں جیسا کیوں نہیں ہو سکا؟ ماں کو کبھی عقل کیوں نہ آئی۔محبت تو خیر کرتی ہیں ماں ہی ٹھہریں۔مگر ہر وقت بک بک، پہ چولھا چکّی، ورون بھیّا، بھابی اور ان کے بچوں کی ڈانٹ ڈپٹ، سنیتا دیدی سے جھک جھک۔اچھا ہوا جو وہ وہاں سے بھاگ نکلا اور دور دراز بمبئی میں جا کے نوکری ڈھونڈی۔اس نے مچھلیاں خرید کر ٹوکری میں بھریں۔ماں سے، گھر سے دور بھاگ جانے کی خوشی اس میں ہمیشہ احساس گناہ پیدا کرتی تھی۔اس وقت بھی وہ دل ہی دل میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔اچھا اس بار طویل چھٹّی لے کر آؤں گا تو پرتبھا کیلئے خود لڑکا ڈھونڈوں گا۔بابوجی بیٹھ کر حقّہ گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ورون بھیّا اپنے جیسے اول جلول لوگ پکڑ لاتے ہیں۔بات کہیں بنتی نہیں۔بے چارے بابوجی۔بے چاری ماں۔مگر ایسا وہ ہر بار سوچتا تھا۔جب بھی یہاں آتا اور چاروں طرف مسائل کے ٹھاٹھیں مارتے

سمندر میں ہاتھ پیر مارتے لوگوں کو دیکھتا تو احساسِ جُرم سے بھر اُٹھتا تھا۔ نوکری کرتے یہ چوتھا سال تھا لیکن ابھی تک وہ ان لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ یہ سب جو اس کے اپنے تھے اور اکیلے اپنی اپنی جگہ زندگی سے نبرد آزما تھے۔ وہ ان کا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ شاید وہ ان سب سے زیادہ خوش قسمت تھا اس لئے کہ اس نے ان سے، ان کے مسائل سے فرار پانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پرتیبھا اور دیدی، دونوں کے لئے اپنے طور پر لڑکا ڈھونڈنے کی بات اس نے کئی بار سوچی لیکن بمبئی میں اس کا ایک کمرے اور ننھے سے کچن والا جو گھونسلا تھا، وہاں پہونچتے ہی وہ جیسے ایک ککون (cacoon) میں بند ہو جاتا تھا۔ وہاں کی دُنیا بڑی حسین تھی اور یہاں کے بدصورت مسائل میں اُلجھنے کے لئے اپنا خون جلانے کی ضرورت تھی۔ یہاں کا اُبلتا لہو وہاں پہونچ کر جھٹ ٹھنڈا ہو جاتا۔ ایک موہوم سے درد کا احساس، ایک تکلیف دہ گھاؤ، ایک بے نام سی جھنجھلاہٹ، باقی رہ جاتے تو بس یہی ــ

ـــــ وہ گھر کی دہلیز پر ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔ باہر بلب نہیں جل رہا تھا۔ ماں ہمیشہ کہتی تھیں کہ اسٹریٹ لائٹ کافی ہے دروازے پہ بتّی جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے جھنجھلاہٹ میں مچھلیوں کی ٹوکری ذرا زور سے ٹپکی تو ماں نے دور ہی سے للکارا" اسی لئے تو کہہ رہی تھی کہ میں دے دوں پیسے ـــ چیز خرید کے لاتا ہے تو تیہا دکھانے لگتا ہے۔

ارون شرمندگی کے شدید احساس سے بھر اُٹھا۔ اس لئے نہیں کہ اس نے ٹوکری پٹکی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ ماں اس کے بارے میں اتنی گھٹیا بات سوچ سکتی ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں تھا۔ زندگی نے قطرہ قطرہ کر کے ان میں اتنی کڑواہٹ بھری تھی کہ وہ سراپا زہر بن گئی تھیں۔ ویسے بھی جب سے ارون نے مکان کی مرمت کے لئے پیسے دینے کو منع کیا تھا، ماں اس سے کچھ بھی لینا نہیں چاہتی تھیں اور ایسے ہی گھٹیا طعنے دیتی رہتی تھیں۔

نوکری کے پہلے سال تو ارون نے خوب تحفے تحائف دیئے۔ بھیّا بے چارے تو کسی کو کچھ لینے دینے سے پہلے ہی بندھ گئے تھے۔ کتنے دن بابوجی نے ان کا بھی کُنبہ سنبھالا تھا۔ ارون نے ماں کے لئے ساڑیاں خریدیں، بابوجی اور پرتیبھا کے لئے چھوٹی چھوٹی بہت ساری چیزیں۔ مگر پھر اس نے پیسے بچانے شروع کئے۔ تین سال میں آٹھ نو ہزار روپئے

ہو گئے تھے۔ ان کے سہارے اس نے بہت سے خواب بُنے تھے۔ ایک وارڈروب، ایک ڈائننگ ٹیبل، ایک لانبے شیشے والی ڈریسنگ ٹیبل، کچھ سجاوٹ کا سامان۔ سب ملا جلا کر مُنہ سے بولتا ننھا سا فلیٹ اور فلیٹ میں اٹھلاتی، ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگاتی، ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر سنگار کرتی ارچنا۔ دُبلی پتلی سانولی سلونی لانبی چوٹی والی ارچنا جس کی ساری کا لہراتا ہوا پلو آس پاس رنگ بکھیرتا رہتا تھا۔ کبھی سُرخ، کبھی زرد، کبھی سبز اور کبھی دھنک کے ساتوں رنگ اٹھے۔ وہ ماں اور بابوجی، بھیا اور بھابی اور دیدی کی طرح زندگی کے جُوے میں بیل نہیں بننا چاہتا تھا۔ اسی لئے جب ماں نے یہ کہتے ہوئے مکان کی مرمت کے لئے اس سے پیسے مانگے کہ ورون جو کماتا ہے وہ تو اس کے بال بچوں میں لگ جاتا ہے اور بابوجی کا پراویڈنٹ فنڈ پرتیبھا کی شادی کے لئے رکھ دیا گیا ہے تو اروِن صاف مکر گیا۔ ماں کا دل توڑتے ہوئے گو اس کا دل کئی بار ٹوٹا لیکن پھر اس نے سوچا کہ ماں کی ساری زندگی اس ٹوٹے پھوٹے کائی لگے مکان میں گذر چکی تھی۔ جو بچی تھی وہ بھی گذر ہی جائے گی۔ لیکن وہ خود ـــــ وہ محنت سے کمائے اور دانت سے پکڑ کر جمع کئے ہوئے یہ چند سکّے ماں کے شوق پر کیوں خرچ کرے اسے کچھ غصّہ بھی آیا تھا۔ ماں آخر سمجھتی کیوں نہیں اپنی جیسے تیسے گذار دی اب بچّوں کو تو چین سے جینے دیں اور چین سے جی بھی کون رہا ہے ورون بھیا؟ جو وقت سے پہلے جُوے میں جوت دیئے گئے؟ ۳۰ سالہ بھابی جو ۴۰ کی نظر آتی ہیں؟ جلے ارمانوں کی راکھ چہرے پر لگائے سنیتا دیدی اور پرتیبھا؟ نہیں! نہیں! وہ اس ٹوٹی ہوئی ناؤ کو چھوڑ کر بھاگ چکا ہے اور اب اس کا ساجھے دار نہیں بنے گا۔ کبھی کبھی ضمیر منھ بھرائی مانگتا تو وہ دل ہی دل میں عہد کرتا۔ اچھا اپنے سارے سپنے پورے ہو جائیں تب ماں کو کچھ ضرور دوں گا۔ ماں۔ پیاری ماں۔

رسوئی سے دھوئیں کے ساتھ ساتھ بھابی کی پکائی مچھلی کی خوشبو آرہی تھی۔ اس نے ارچنا کو خط لکھنا شروع کیا۔ چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ پرسوں لوٹ رہا ہوں ـــــ اس بار بھی ماں کو تمھارے بارے میں نہیں بتا سکا۔ ہمّت نہیں ہوئی۔ فکر نہ کرنا اگلی

بار ضرور بتاؤں گا۔

——— اس نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ فلیٹ کیا۔ یہ دراصل ایک فلیٹ کا چھوٹا سا حصّہ تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا ملحقہ باتھ روم کے ساتھ۔ سامنے پتلے سے کاری ڈور کو گھیر کر ننھے سے کچن میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کنارے صاف سُتھرا اور آرام دہ بستر تھا اور دوسری طرف ایک کُرسی اور رائٹنگ ٹیبل۔ کمرہ تازہ تازہ صاف کیا ہوا تھا۔ ٹیبل پر پھولوں کا گچھا تھا۔ اس بار بھی وہ حسب معمول ارچنا کو چابی دے گیا تھا۔ اس کی خوشبو بند کمرے میں سمائی ہوئی تھی۔ اب وہ آتی ہی ہوگی دوڑی ہوئی، اس سے ملنے۔ اُسے خط ضرور مل گیا ہوگا۔ یہ ننھا سا کمرہ جنّت تھا۔ وہ گنگناتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔ برش کرتے ہوئے اس کی نگاہ واش بیسن میں لگے آئینے پر پڑی۔ وہ بابو جی سے کتنا ملتا ہوا ہے۔ اچانک وہ سارے چہرے نظر کے سامنے پھر تیرنے لگے۔ ارون کے دل میں ٹیس اُٹھی۔ کسی نے زور سے پھٹکارا۔ تمھیں کیا حق ہے اتنا خوش ہونے کا جبکہ ان سارے، اپنے پیارے لوگوں میں سے کوئی بھی سُکھی نہیں ہے۔ ارون کے شانے جُھک گئے۔ گردن کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ڈوب مگر ڈوب کر پھر اُبھرا۔" جس مرض کا علاج نہ ہو اسے جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ میں اپنے محدود ذرائع سے صرف اپنے آپ کو خوش رکھ سکتا ہوں۔ ان کے دُکھوں کا مداوا میرے پاس نہیں ہے۔ وہ سب اپنی اپنی زندگی جی رہے ہیں۔ مجھے اپنی زندگی جینی ہے۔ اب اس کا میرے پاس کیا علاج کہ میری قسمت میں مٹھی بھر مسرّت زیادہ ہے اور ان کی قسمت میں مٹھی بھر غم زیادہ۔" برش ہاتھ میں لئے وہ پل بھر کو پتھر بنا کھڑا رہا۔ دُنیا میں اتنے دُکھ کیوں ہیں؟ ایسے دُکھ جنھیں اُگلتے بنے نہ نگلتے۔ اسے گلے میں کچھ پھنسنے کا احساس ہوا اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ جانی پہچانی دستک۔ ارچنا آگئی تھی۔ ہنس مکھ ارچنا، محبت کرنے والی ارچنا۔ ارون اپنی ذات سے باہر کود پڑا ارچنا اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ ایک بار پھر سب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے خول میں بند ہو گیا تھا۔ ریشم کے کیڑے کی طرح۔ یہاں کسی کا گذر نہیں تھا۔ وہ سب باہر کی دُنیا کے باسی تھے۔ ایک دم الگ تھلگ۔

•••

فاصلہ قریب کا

سیّد احمد قادری

کولتار کی چکنی و شفاف سڑک پر جیپ دوڑی جا رہی تھی اور میری انگلیاں پچھلی سیٹ پر بیٹھی نصرت کی مخروطی انگلیوں سے الجھ رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا اس لیے میری اس حرکت سے صرف نصرت ہی واقف تھی۔ بقیہ تمام لوگ اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

یہ دلچسپ سفر ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ختم ہوا۔ گاڑی سے اتر کر سبھی اپنے اپنے کمرے میں جا گھسے۔ رات کافی ہو چکی تھی، اس لیے سبھوں کو نیند نے پریشان کر رکھا تھا۔ میں بھی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ لحاف کی گرمی سکون بخشنے لگی۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ طرح طرح کے خوب صورت خیالات میرے دل کو گدگدا رہے تھے۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں لیٹی نصرت بھی میری ہی طرح خوابوں اور خیالوں میں گم ہوگی۔

نصرت کو ڈھاکہ سے آئے ہوئے ابھی کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ وہاں کے حالات نے نصرت اور اس کے خاندان والوں کو ڈھاکہ چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ وہاں یہ لوگ آرام و آسائش کی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن وقت کی تیز آندھی ان لوگوں کے سارے سکھ و چین کو کسی تنکے کی مانند اڑا لے گئی اور پھر لٹ پٹ کر آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ ہندوستان اپنے عزیز و اقارب کے یہاں چلے آئے۔

بربادی کا غم سبھوں کے چہرے سے عیاں تھا۔ نصرت کے چہرے پر بھی اس کا گہرا اثر تھا لیکن ہندوستان آنے کے بعد ہم لوگوں کی محبت اور خلوص نے اس اثر کو کسی حد تک کم کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ میری کسی بات پر ایسا فلک شگاف قہقہہ بلند کرتی کہ میں اسے تعجب بھری نظروں سے دیکھنے لگتا اور سوچتا کیا یہ وہی نٹ کھٹ اور شریر نصرت ہے جو کبھی مجھ سے بات بات پر جھگڑا کیا کرتی تھی اور غصے کے عالم میں میری کتابیں اور سلیٹ پھینک دیتی اور کہتی ——— دیکھو انول بھائی مجھ سے نہ کلو، دلنہ ٹھیک نہ ہوگا۔" اور میں اس کے جواب میں اس کے چھوٹے چھوٹے سنہرے بالوں میں لگے ربن کو کھینچ کر باہر بھاگ جاتا۔ اور جب واپس آتا تو دیکھتا میرے بکس کی ساری چیزیں بکھری پڑی ہیں۔ میں اسے مارنے دوڑتا لیکن لوگوں کے بیچ بچاؤ سے معاملہ سرد پڑ جاتا۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب ہند وپاک کی تقسیم کے بعد چھوٹی سی نصرت اپنے خاندان والوں کے ساتھ پاکستان جا رہی تھی۔ اسے جاتے ہوئے دیکھ کر میں بہت رویا تھا اور اس کے ساتھ جانے کو بضد تھا، نصرت بھی بار بار مجھے پکار رہی تھی "آؤ انول بھائی چلو نہ تم بھی میرے ساتھ، ہم دونوں وہاں خوب کھیلیں گے "نصرت کے بلاوے پر میں اپنی امی کا ہاتھ چھڑا کر اس کے قریب جانا چاہا تھا، لیکن گیٹ تک پہونچتے پہونچتے گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی ......"

اور آج وہی نصرت کتنی بدل گئی ہے۔

ڈھاکہ سے آنے کے بعد شروع میں ہمارے درمیان کئی دنوں تک شرم وحیا کا پردہ رہا، لیکن جلد ہی وہ مجھ سے بے تکلف ہو گئی اور میرے کمرے میں آکر مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتی ...... کافی رات گئے تک میں نصرت کے بارے میں سوچتا رہا۔ بچپن کی یاد اور جوانی کے جذبات نے ایک عجیب سی لذت پیدا کر دی۔ جسے میں اپنے دل کے نہاں خانے میں محسوس کر رہا تھا۔ رات کے تین بجے کہیں جاکر مجھے نیند

آئی۔ خوابوں کی دنیا میں بھی وہی نصرت اور بھاگتی ہوئی جیپ میرا پیچھا کرتی رہی۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی، چائے لے کر ڈرائنگ روم میں اخبار دیکھنے داخل ہوا تو نصرت وہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ پیالی تپائی پر رکھ کر اس کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ اخبار دیکھنے میں ایسا گم تھی کہ اسے میری آمد کا احساس تک نہ ہوا۔ بیٹھتے ہی میں نے اس کی اس لاپرواہی سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کے حسن کو اپنی آنکھوں میں سمونے لگا ـــــ نازک نازک متناسب سراپا، اجلا اجلا چاندنی کا رنگ، جھیل کی موجوں، اور لہراتے ہوئے آبشار کی طرح کاندھوں پر بکھرے ہوئے لانبے بال معصومیت اور پاکیزگی سے آراستہ بڑی بڑی پرکشش سیاہ آنکھیں، جن میں شرم و حیا کے سرخ ڈورے ایسے محسوس ہو رہے تھے جیسے کسی نے شراب کو بلوریں جام میں بھر دیا ہو .... میں ایک ٹک اسے گھور رہا تھا کہ اچانک اسے چھینک آ گئی۔ چھینکنے کے لئے اس نے گردن اٹھائی تو سامنے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس وقت اس کی عجیب کیفیت تھی...... ایک طرف چھینک کا زور اور دوسری جانب موجودگی کا احساس۔ آ...... آ...... جی......

آپ...... آ...... آچھیں!

مجھے اس کی اس حرکت پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ کافی دیر تک میں ہنستا رہا تو میری ہنسی پر وہ جھنجھلا گئی۔

"آپ عجیب آدمی ہیں؟ آ کر یہاں بیٹھ گئے اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا؟"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"اچھا چھوڑیئے! دیکھئے یہ خبر آپ نے دیکھی؟"

کون سی خبر؟"

اس نے اخبار کی ایک سرخی پر انگلی رکھ کر اخبار میرے ہاتھوں میں تھما دیا

ڈھاکہ سے ہجرت کئے ہوئے لوگوں کے متعلق خبر تھی کہ جلد ہی ایسے لوگوں کو حکومت پاکستان اپنی پناہ میں لے لے گی۔

خبر پڑھ کر میں نے اس کا چہرہ دیکھا، بالکل سپاٹ تھا۔

"کیوں کیا خیال ہے؟" میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟"

"یہی پاکستان میں پناہ لینے کے بارے میں؟"

"نہیں اب نہیں، اف یا خدا! کیسی کیسی مصیبتیں جھیلی ہیں ہم لوگوں نے اور اب تو اس ہندوستان سے مجھے پیار ہو گیا ہے۔ میری مادرِ وطن.....!"

"صرف ہندوستان سے یا ہندوستانیوں سے بھی؟" میں نے بیچ ہی میں سوال کر دیا۔ اور میرے اس سوال پر پہلے تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر مطلب سمجھ کر نظریں جھکا لیں اور میں اس کی اس ادا کی سحر میں کھو گیا۔

نصرت میں واقعی مقناطیسی کشش تھی، دن بدن میں اس کی جانب کھنچتا چلا گیا اور کچھ اسی قسم کی کیفیت نصرت کی بھی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ایک دوسرے کو شدّت سے چاہنے لگے۔

ایک رات دودھیا چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم دونوں لان میں چہل قدمی کر رہے تھے اور ساتھ ہی مستقبل کے بلند و بالا گھروندے بنانے میں مصروف تھے۔ اس نم آلود خوشبو والی رات کو زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں۔ جیون ساتھی بننے کا عہد کیا۔

وقت دھیمی دھیمی چال سے بڑھتا گیا اور ہم دونوں کی محبت کا نازک پودا بڑھتے بڑھتے تناور درخت میں تبدیل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ نصرت کا اصرار بڑھتا گیا کہ میں جا کر اس کے والد سے ملوں اور شادی کی بات طے کر لوں، میں نے اسے سمجھانا چاہا کہ یہ تو بڑھے بوڑھوں کا کام ہے۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اس کی ضد برقرار رہی تو مجبوراً ایک دن اس کے والد سے ملنے جانا پڑا۔

اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا میں جیسے ہی کمرے میں اندر داخل ہوا نصرت کے

والد نے کہا۔ "آؤ بیٹا انور! کہو کیسے ہو؟"

"جی ٹھیک ہوں"

دل دھڑک رہا تھا کہ پتا نہیں نصرت کے والد میری بات مانیں گے بھی یا نہیں، لیکن پھر فوراً ہی دل کہتا نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے، تم کہو تو سہی، وہ بھلا انکار کیوں کرنے لگے۔ تم دونوں کی محبت پانی کا بلبلہ تھوڑے ہی ہے جو پل بھر میں ٹوٹ کر بکھر جائے۔ تم دونوں کی محبت تو ایک چٹان ہے۔ جسے بڑی سے بڑی موج بھی ہلا نہیں سکتی۔ دل کی آواز نے میرے ارادے کو مضبوط کیا اور میں نے آخر کہہ ہی دیا

"چچا جان، اس وقت میں ایک اہم موضوع پر آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں۔"

"ہاں ہاں! کہو بیٹا، کیا بات ہے؟ لیکن ارے ہاں، تمہیں ایک خوشخبری تو سنایا ہی نہیں میں نے۔ ابھی ابھی پاکستان کی حکومت نے ہم تمام لوگوں کے لئے پاسپورٹ اور ویزا بھیجا ہے، یہ دیکھو جہاز کے ٹکٹ ....."

یہ کہہ کر انہوں نے تمام کاغذات اور ٹکٹ میری جانب بڑھا دیا اور اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب پاسپورٹ اور ٹکٹ نہیں بلکہ کئی زہریلے سانپ ہوں، میں کانپ اٹھا۔

"ارے انور تمہیں کیا ہو گا۔"

"جی، کچھ نہیں، ذرا یونہی طبیعت پریشان ہو گئی ہے"۔ اور یہ کہہ کر وہ خاموشی سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آکر اپنے بستر پر گر گیا اور اپنے غموں کو تکیہ میں جذب کرنے لگا۔

ٹھیک تیسرے دن نصرت اور اس کے خاندان کے تمام افراد پھر پاکستان جا رہے تھے۔ شاید خوش آئند زندگی گزارنے .... لیکن کسے خبر تھی کہ کسی کی زندگی میں غم کا زہر گھل رہا ہے اور یہ بٹوارہ نہ جانے کتنے دھڑکتے ہوئے دلوں کو چکنا چور کر چکا تھا اور اب ایک بار پھر یہ موقع کسی کے نصیب میں آ رہا ہے۔

ایئرپورٹ پر کسی عفریت کی مانند جہاز کھڑا تھا۔ اس میں بہت سارے لوگ سما رہے تھے، اور آخر میں نصرت بھی سوار ہو گئی۔ جس کی آنکھوں میں میری محبت آنسو بن کر جم گئی تھی .... اور پھر جہاز نے جیسے ہی اڑان بھرا میں بے اختیار سسک پڑا۔

جہاز بہت آگے بڑھ چکا تھا اور بیچ میں صرف خلا ہی خلا تھا!!!

آج کی عورت

قمر جہاں

اس نے دونوں بچوں کو ٹفن دے کر اسکولی بس پر سوار کیا اور پھر جلدی سے آکر منا کے لئے دودھ تیار کرنے لگی۔ دودھ کو پاٹ میں ڈال کر جلدی جلدی ٹھنڈا کیا۔ پھر دودھ کی بوتل بچّہ کے ننھے مُنّے ہاتھوں میں تھما کر خود باتھ روم میں گھُس گئی۔ دو ہی منٹ میں باتھ روم سے نکل کر بیڈ روم میں آئی اور ہینگر پر ٹنگی ہوئی ساڑی اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جلدی جلدی ہلکا سا میک اپ کیا۔ بچّہ کے قریب آئی۔ ایک پیار بھرا بوسہ اس کی پیشانی پر دیا اور تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگی۔

چلتے چلتے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ گھڑی کی سوئی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے وہ بھی گھڑی کی سوئی کی ہی رفتار سے بھاگنے لگی۔ یہ روز روز کی بھاگ دوڑ بھی کیسی عجیب ہوتی ہے۔ وہ ہر روز سوچتی ہے کہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو کر گھر سے نکل جائے گی۔ لیکن ہر روز کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ اور اس وقت اسے احساس ہوتا ہے کہ نوکری کرنے والوں کے لئے کبھی کبھی پانچ منٹ بھی کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔

خواہ مخواہ باس کے سامنے شرمسار ہونا اسے پسند نہیں تھا۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر وہی کچھ ہوتا تھا جو وہ نہیں چاہتی تھی، کالج پہنچ کر لائبریری روم کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دو منٹ یہ سوچنے میں لگا کہ آج وہ اپنے باس سے کیا بہانہ بنائے گی۔ کاش اس کے روم میں جانے کے لئے الگ سے دروازہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس طرح باس کے روم سے ہو کر گذرنے میں اسے بڑی کوفت ہوئی تھی۔ خاص کر جب تھوڑی بھی تاخیر ہو جائے تو

تو معاملہ اور بھی پریشان کن ہو جاتا تھا۔

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی باس ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوئیں
لیٹ آنا آپ کی عادت بن چکی ہے مسز صادق۔ اب مجھے پرنسپل میں complain
دینا ہوگا۔

''نہیں میڈم۔ ایکسکیوز می'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں
آیا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ اس لئے وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور تیزی سے
اپنے کام میں لگ گئی۔

دن بھر ایک انداز میں بیٹھی بیٹھی وہ بالکل بور ہو جاتی تھی۔ اسے اپنا کمرہ ایک
چھوٹا قید خانہ لگتا تھا۔ اس قید خانہ میں اس کی کرسی کے سامنے کی طرف ایک چھوٹی سی
کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی کی سلاخیں اس انداز میں کٹی ہوئی تھیں جس سے لڑکیاں دن بھر
لائبریری کارڈ لینے کے لئے اپنے ہاتھ اندر بڑھایا کرتی تھیں اور اسی راستہ سے وہ کتاب
بھی لیتی دیتی تھیں۔۔ دن بھر طرح طرح کی لڑکیاں، کوئی الٹرا ماڈرن، کوئی سیدھی سادی
کوئی خوب صورت، کوئی بدصورت، کوئی بُش شرٹ پتلون میں ملبوس، کوئی شلوار جمپر میں،
کوئی ساڑی میں ملبوس۔۔ اس دریچہ کے اس پار چھوٹے سے کمرے میں آکر کھڑی ہو جاتیں
اور اپنے شور و غل سے اس کے ذہن کو پراگندہ کرتی رہتیں۔

''دیدی، ابھی میرا کلاس ہے پہلے مجھے دے دیجیے'' اور کوئی کہتی۔

''نہیں دیدی پہلے مجھے دیجیے۔ میں پہلے سے کھڑی ہوں'' پھر تیسری آواز اُبھرتی۔

''دیدی جلدی دیجیے نا''

اور وہ گھبرا کر کہتی ہے '' تم لوگ کیو میں کیوں نہیں رہتی ہو، جاؤ، میں کسی کو نہیں
دوں گی۔

لڑکیاں وقتی طور سے ''کیو'' میں ہو جاتیں، لیکن پھر وہی ہنگامے اور شوخیاں۔

روز روز کے اس ہنگامے اور شور و شرابے سے اکثر اس کے سر میں درد ہو جاتا
اور وہ سوچتی '' یہ نوکری ہے یا دردسری''

اکثر دل چاہتا اس دردسری سے وہ ریزائن کرکے اپنے شوہر کے پاس مع بچوں کے چلی جائے۔ یہاں اسے زندگی کی وہ کون سی خوشیاں نصیب ہیں؟

گھر جاتی ہے تو کسی کو بھی تو اس سے ہمدردی نہیں ہوتی، ساس صاحبہ یہ سوچتی ہیں کہ وہ دن بھر اس کے بچہ کی کھلائی رہی ہیں اس لئے اب انھیں آرام سے سونا چاہئے بچے سوچتے ہیں کہ ممی دن بھر غائب رہی ہیں اس لئے اب انھیں خوب تنگ کرنا چاہئے کبھی کبھی اسے اپنے شوہر کی کمی کا احساس ہوتا ہے، لیکن پھر سوچتی وہ رہتے بھی ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ وہ تو اسے اور بھی اُلجھا دیتے ہیں۔ دوست پر دوست آرہے ہیں۔ رات گئے تک بیٹھک جمی ہوئی ہے۔ چائے پر چائے بن رہی ہے۔ شرٹ کے بٹن ٹوٹ گئے ہیں ذرا لگا دو، کنگھی کہاں ہے؟ رومال کہاں ہے؟؟ وغیرہ وغیرہ ـــــ غرض ایک عجیب ہنگامہ رہتا ہے ان کے رہنے سے۔ لیکن اس ہنگامے میں بھی وہ خوش رہتی تھی، کیونکہ شوہر کی قربت ایک بہت بڑی قوت تھی۔ لیکن اب تو وہ کبھی کبھی بڑی بے سہارا محسوس کرتی ہے خود کو۔

آج سے دس سال پہلے کیسی دل کشی تھی اس نوکری میں۔ جب وہ نوکری میں آئی تھی اسی وقت اس کی شادی ہوئی تھی۔ گھر میں بھی کوئی کام دھام نہیں تھا۔ اس کے شوہر اکثر اسے پہنچانے کالج آتے تھے اور پھر شام کو اس کے انتظار میں بے قرار رہتے تھے۔ اس وقت ان کی بے قراری اسے کتنی اچھی لگتی تھی۔ لیکن اب تو جیسے وہ بھی عادی ہو چکے ہیں جبھی تو دوسرے شہر میں بھی اس کے بغیر کتنے مزے میں رہ رہے ہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ وہاں جاکر اس کی کمی بیحد محسوس کریں گے اور بہت جلد اس سے استدعا کریں گے کہ تم نوکری چھوڑ کر میرے ساتھ چلی چلو، مجھے ایسی نوکری نہیں چاہئے۔ لیکن یہ تو محض اس کے تصور کا بھرم نکلا۔ اب تو وہ کبھی ان سے نوکری چھوڑنے کا تذکرہ بھی کرتی ہے تو وہ گھبرا کر کہتے ہیں۔ "یہ حماقت ہے شہناز، آج کے دور میں نوکری ملنی آسان نہیں ہے۔ لگی ہوئی روزی کو چھوڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بعد کو تمھیں بھگتنا پڑے گا۔"

اور وہ سوچتی ہے عورت کی قسمت میں تو ہمیشہ پچھتانا ہی ہے، وہ ابھی بھی پچھتا

رہی ہے اور بعد کو بھی پچھتائے گی۔ اس نے تو خود کو ایک ایسے مایا جال میں پھنسا لیا ہے کہ اب خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

لیکن آج کے واقعہ نے تو اسے تلملا ہی دیا ہے اس کا سب سے چھوٹا بچہ تیز بخار سے بھُن رہا ہے، اس کی خواہش کالج جانے کی نہیں ہو رہی ہے لیکن اس کے پاس ایک بھی کیزوئل لیو (casual leave) نہیں ہے۔ اگر وہ چھٹی لے گی تو تنخواہ کٹ جائے گی۔ اس نے سوچا کہ وہ جا کر اپنے باس کو اپنے حالات بتائے گی اور تھوڑی دیر کام کرنے کے بعد باس کی اجازت لے کر گھر چلی آئے گی۔ اس طرح تنخواہ کٹنے سے بچ جائے گی۔ وہ ساس سے کہہ گئی ــ "اماں، میں بارہ بجے تک آجاؤں گی۔ جب تک آپ بابو کو بہلائیں گی۔" جاتے وقت بچہ اس کی ساڑی کا آنچل نہیں چھوڑتا ہے، وہ بڑے پیار سے اس کی معصوم پیشانی کو چومتی ہے اور گردن اور ہونٹ پر بوسہ دیتے ہوئے کہتی ہے ــ "میرے مُنّا ــ میں ابھی آجاتی ہوں ــ تمہارے لئے دوا اور بسکٹ بھی تو لانا ہے۔ پاپا تو نہیں ہیں نا بیٹے، اس لئے دوا اور بسکٹ کون لائے گا میرے مُنّا کے لئے۔"

"اور ٹافی بھی ممی ــ لیکن جلدی آنا ممی۔ جلدی آنا ممی۔ بچے کی گڑگڑاتی ہوئی آواز اس کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی، وہ تیزی سے نکل کر رکشا پر بیٹھ گئی کالج پہنچ کر کام کرنے میں اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن مجبوراً وہ کام میں خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

باس ابھی تک نہیں آئی تھیں، اسے بیقراری سے ان کا انتظار تھا۔ گیارہ بجے کے قریب باس آئیں۔ وہ لپک کر ان کے روم میں گئی لیکن باس کا مزاج ہی آج برہم تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اُلجھ پڑیں۔ "آپ لوگوں کو کام سے بالکل مطلب نہیں ہے، دیکھئے ان کتابوں کو آئے ہوئے کتنے دن ہوگئے ہیں، ابھی تک ان کی انٹری نہیں ہوئی ہے۔ کل پرنسپل صاحبہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں اگر میں خود ان چھوٹے چھوٹے کاموں کو کرتی رہوں تو آپ لوگ کس مرض کی دوا ہیں؟

اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس وقت اگر وہ گھر جانے کی بات کرتی ہے تب وہ اور

برہم ہو جائیں گی۔ اس لئے تھوڑی دیر ان کے مزاج کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنا چاہیے یہ سوچ کر وہ اپنے روم میں واپس آگئی اور انٹری کا کام شروع کرنا چاہا۔ لیکن آج اس کی طبیعت کام کرنے میں بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ رہ رہ کر بچّہ کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی "ممی جلدی آنا" اس کا قلم بے خیالی میں رجسٹر پر چل رہا تھا اور ذہن گھر کی طرف۔ اتنے میں باس آکر کھڑی ہوگئیں اور رجسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے گرجیں۔ "مسز صادق، میں محسوس کر رہی ہوں کہ اب آپ کا دل کام کرنے میں بالکل نہیں لگ رہا ہے۔ دیکھئے آپ نے کیا غلطی کی ہے؟" رجسٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ سر جھکا کر کھڑی ہوگئی اور ہمت کر کے بولی "معاف کریں گی میڈم۔ آج میں بیحد پریشان ہوں — میرا بچہ بیمار ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ آج ...."

وہ اپنی بات پوری بھی نہ کر سکی کہ باس برس پڑیں۔ "آپ کے ساتھ تو روز یہی دھندا لگا رہتا ہے۔ کبھی بچّہ بیمار ہے، کبھی خود بیمار ہیں، اگر آپ کو چھٹی لینی ہے تو چاہیئے پرنسپل سے کہئے میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ لوگوں کو جس قدر چھوٹ دی جاتی ہے اتنا ہی آپ لوگ آرام چاہتی ہیں۔" یہ کہہ کر باس چلی گئیں اور وہ سوچتی رہی کہ اگر وہ پرنسپل آفس میں جائے اور وہ بھی چھٹی نہ دیں تو وہ کیا کرے گی۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے آج کی چھٹی کے لئے ایک درخواست لکھی۔ آدھا سے زیادہ دن وہ کام کر چکی تھی لیکن اب اس سے مزید کام نہیں ہو سکتا تھا۔ چھٹی ملنے کی اُمید نہیں اس لئے without pay ہونا اس نے منظور کر لیا، لیکن اپنے بچّہ کو وہ اب زیادہ دیر تک نہیں چھوڑ سکتی تھی، اس کی آواز اس کی ممتا کو للکار رہی تھی — "ممی جلدی آنا —"

ایک بجنے والا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے دو بج جائیں گے۔ بیکار ہی اس نے اتنا وقت برباد کیا۔ کاش وہ آنے کے ساتھ ہی چھٹی لے لیتی۔ اس افسوس کے ساتھ وہ باس کے کمرے میں داخل ہوئی ٹیبل پر پیپر ویٹ کے نیچے درخواست ڈال کر وہ جانے کے لئے مُڑی تو باس نے حیرت سے اس کی جرأت رندانہ کو مارک کیا، لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ غم و غصہ سے نڈھال آگے بڑھ گئی۔ رکشا کر کے وہ تیزی سے گھر پہنچنا چاہتی تھی لیکن آج راستہ کی دوری اسے ہر دن سے زیادہ کھل رہی تھی۔ پونے دو کے قریب وہ گھر پہنچی۔ دروازے پر ساس بچّہ کو لئے بہلا رہی تھیں، اسے دیکھتے ہی اُبل پڑیں۔ "آج کی عورتوں کے پاس دل نہیں ہے، پتھر ہے پتھر۔ بچّہ بیمار ہے اور میم صاحب کو نوکری کی ہی فکر ہے۔"

•••

کپل وستو

(عشرت ظہیر)

ایک رات دھیرے سے میں اپنے کپل وستو سے نکل پڑا۔

میں نے اپنی نو سالہ بچی صبا کی پیشانی چومی، نزہت کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈال کر ہی رہ گیا، کیونکہ وہ ہمیشہ کچی نیند سوتی تھی، میرے جسم کی خوشبو پاتے ہی جاگ پڑتی اور میرے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کو جکڑ دیتی —— میں نے اپنی بچی اور بیوی دونوں کے لئے اپنی بہترین دعائیں چھوڑیں، ان پر الوداعی نگاہ ڈالی اور گھر سے باہر آگیا —— اپنی گلی سے نکل کر غیر پختہ اور ناہموار سڑک پر آیا تو میری راہ میں عمران کا مکان حائل ہوا۔ ایسا لگا عمران اپنے باہوں کے مضبوط حلقے میں مجھے جکڑ لینا چاہتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے میں نرم پڑ گیا، مجھے میرے ارادے متزلزل سے ہوتے دکھائی پڑے، لیکن دوسرے ہی پل میں نے خود کو سنبھالا اور اپنی کمزوری دور کرنے کے لئے سوچنے لگا، میرا یہ دوست اب تک حیات کی ہر منزل پر محض اپنی برتری، خود نمائی اور خوش نامی کی خاطر مجھے فریب دیتا رہا ہے، آج میں اسے جُل دے کر نکل جاؤں کہ یہ اپنی بقیہ ساری زندگی رو رو کر اپنی اور میری محبت کا حساب برابر کرتا رہے۔

نیم تاریک سڑک کو پیچھے چھوڑ کر اسٹیشن جانے والی سمنٹیڈ لمبی چوڑی روشن سڑک پر جب میں آیا تو میں نے خود کو بے حد ہلکا محسوس کیا۔ میرے اندر کا سارا گرد و غبار، ساری غلاظت، کچرا اور آخور یکلخت معدوم ہو چکے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ سالہا سال گھونٹ گھونٹ جس زہر کو پیتا رہا ہوں، وہ یوں، بس ایک لمحہ میں میرے وجود سے دور ہو سکتا ہے۔ اس زہر نے میرے وجود کو اس طرح

گھیر رکھا تھا کہ ہر ساعت میں خود سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ صبا کو پیار کرتے کرتے اکثر خیال آجاتا، میرے مسموم ہونٹوں کا زہر کہیں اس بھولی بھالی معصوم بچی کے جسم میں نہ سرایت کر جائے! ایسی ساعتیں مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹتیں اور مَیں کانپ کانپ جاتا۔ پھر میرا سارا وجود غصہ اور نفرت کی لہروں کی آماجگاہ بن جاتا۔ سانپ کی طرح لمبی لمبی زبان نکالتی، لپکتی دہکتی اُن لہروں سے، میں نے بارہا سوچا، سلطان کو جلا کر راکھ کر ڈالوں کہ زہر کا پہلا گھونٹ اسی کے توسط سے میری شریانوں میں شامل ہوا تھا —— غصہ اور نفرت کی ان لہروں میں مَیں خود تو جلتا جھلستا رہتا لیکن ان کی لپیٹ سے سلطان ہمیشہ محفوظ رہا کہ وہ لہریں اس تک جاتے جاتے منتشر ہو جاتیں۔

سلطان ہمارے دفتر کا ہیڈ کلرک تھا۔ وہ باتیں کرتا تو لگتا جیسے کانوں میں شہد ٹپکا رہا ہو۔ پیالہ کا پیالہ زہر پی کر بھی نجانے اس شخص میں اتنا میٹھا پن کہاں سے آجاتا ہے؟ اپنی ان ہی میٹھی اور شیریں آواز کو کمند بنا کر اس نے مجھے اسیر کیا تھا۔

"زندگی ناکردہ گناہوں کی سزا ہے، میرے دوست!" چبا چبا کر باتیں کرنے کا وہ عادی تھا —— "تم نے زندگی کا زہر پی لیا، پھر ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کب تک دامن بچاتے رہو گے؟ زندگی کے جھیلنے کے لئے تمھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہو گا —— اپنے پروموشن کے لئے تم نے کیا کیا؟ نگیندر بابو کو تھوڑی سی رشوت دے دو —— ارے ہاں میرے یار، ادھر لیا اُدھر دیا یہی زندگی کے جھیلنے کا فن ہے —— تم اسے زہر سمجھتے ہو؟ چھوڑو بھی اپنے اس اصول کو، یہ تو کسی کام میں تمھاری خاص Activity کا صلہ ہے۔

میں نے سلطان کی طرف دیکھا، پھر اس دُبلے پتلے اجنبی کی طرف، جس کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ پھر یہ گھونٹ میرے لئے غیر مانوس نہ رہ گیا۔ لیکن میں اپنے سے غیر مانوس ہوتا گیا،

اپنی بیوی اور بچّی سے غیر مانوس ہوتا چلا گیا ـــــ غیر محسوس طور پر ایک انجانا اور اندیکھا خوف میرے وجود کو جکڑنے لگا، پھر میں اپنے آپ کو سراسیمگی سے کسی طرح نہ بچا سکا۔ اپنے متوحش چہرے کو دھونے کی فکر میں اور بھی متوحش ہوتا چلا گیا۔

ایک شام میں اپنے مسموم جسم کو آرام کرسی پر سمیٹے اپنی اگلی پچھلی زندگی کا حساب کر رہا تھا کہ صبا کی آواز میرے کانوں کی راہ سے دل میں اُترتی چلی گئی۔ وہ کلاس نوٹ زور زور سے پڑھ رہی تھی

"...... سدارتھ نے دُنیا کو تیاگ دیا تھا۔ کئی برسوں تک سنیاسی کی طرح گھومتے رہے۔ اس کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ انھیں علم حقیقی حاصل ہو گیا ہے۔ ان کا قول تھا اس دُنیا میں دُکھ ہی دُکھ ہیں اور اس کی وجہ دُنیاوی چیزوں کی ترشنا ہے۔ ترشنا سے انسان کی نجات اشٹانگک مارگ پر عمل پیرا ہونے سے ہو سکتی ہے ...."

صبا پڑھتی رہی، لیکن اس کے پڑھے ہوئے بعض جملے نے مجھے جکڑ لیا اور میرے دل و دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے ـــــ میں نے سوچا، ہوس نے مجھے قیدی بنا لیا ہے، اس قید سے مجھے نجات چاہئے، مجھے نجات چاہئے ـــــ کئی دن تک میں اس احساس کی آگ میں جلتا رہا۔ آخر ایک رات میں نے سوچا، شہزادہ سدارتھ نے کپل وستو تیاگ دیا تھا، انھیں علم حقیقی حاصل ہوئی اور سکون بھی میسّر آیا ـــــ مجھے بھی سکون چاہئے، ترشنا سے نجات چاہئے۔"

اپنے کپل وستو سے نکلنے کے بعد میں گلیوں گلیوں، سڑکوں سڑکوں بھٹکتا رہا۔ ایسے میں میرے وجود نے میری ہمّت بندھائی اور آمادہ کیا کہ اس سفر کو جاری رکھوں کہ اس سفر کی ابتدا ہی میں میرا مسموم جسم پاک ہو گیا تھا۔ اس لئے اس رحمت کا دامن مجھے نہیں چھوڑنا چاہئے اور راست بازی اور صالح عمل کی طرف اپنے قدم کو بڑھاتے جانا چاہئے تاکہ پُروجنم کے بُرے اعمال کے اثرات زائل ہوں اور موجودہ زندگی میں پھر کبھی زہر کا گھونٹ نہ لینا پڑے، روح پاک ہو جائے اور نجات کامل حاصل ہو کر پھر دوبارہ جنم لینے کی صعوبت سے چھٹکارا ملے۔

اور یوں بھٹکنا میرا مقدر بن گیا۔

میں بھٹکتا رہا۔ میری بیوی نزہت، میری بچی صبا اور میرا پیارا دوست عمران برابر میرا تعاقب کرتا رہا ——— آخران سبھوں نے ہار مان لی اور میرا پیچھا چھوڑ کر لوٹ گئے۔ تب میں نے ایک سرسبز و شاداب جنگل کو اپنا مسکن بنا لیا ——— اور پیپل کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر میں نے سوچا، اب خُدا سے لَو لگانا چاہیے ———

میں آنکھیں بند کر کے اپنے اندر اُترنے لگا۔ میں نے سوچا تھا، ساری راہ اپنے اندر کے ہجوم کو نکال نکال کر پھینکتا آیا ہوں، اب میرا دل بالکل خالی ہوگا ...... اور اس میں ڈُبکی لگا کر میں اپنے خُدا کو آسانی سے پا لوں گا ——— لیکن ——— لیکن میری پہلی ہی ڈُبکی نے مجھے مبہوت کر دیا۔

میرے سامنے عمران اپنی مخصوص مسکراہٹ کا جال لئے کھڑا تھا۔ میں نے سوچا کیا کروں۔ آخر سلطان کی طرح لہجہ میں میٹھا پن اور شیرینی پیدا کر کے درد انگیز الفاظ کو ترتیب دینے لگا ———

"مجھے معاف کر دو میرے دوست! میں نے اپنی زندگی کے بہاؤ کا رُخ موڑ دیا ہے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ——— مجھے تنہا چھوڑ دو ———"

عمران چلا گیا۔ میں نے دور تک اس کے اُداس قدموں کی چاپ سُنی اور میری نظروں نے سیکڑوں میل دور اسے مغموم اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا پایا۔ اس کے چاروں طرف میری یادوں کی مدھم مدھم سی روشنی بکھری تھی اور وہ میری تحریروں سے اپنی آنکھیں دھو رہا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اس کا نام لیا جو نہایت مہربان ہے، رحم کرنے والا ہے ———

دوسری دفعہ جب میں اپنے اندر اُترنے کی کوشش کر رہا تھا، تو میری نظریں نزہت سے ٹکرائیں، وہ صبا کا ہاتھ تھامے یاس و حسرت کی تصویر بنی کھڑی تھی، اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کی آنکھیں، اُف میرے مولا ——— ! ان آنکھوں میں بے بضاعتی

وحرماں نصیبی کی کئی داستانیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ میرے پورے جسم میں ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی ـــــ میرے قدم اسی پل ڈگمگانے لگے اور میں سوچنے لگا، لوٹ جاؤں ـــــ لیکن اس پیپل کی پُرسکون ٹھنڈی چھاؤں نے، اس زہر کی وادی میں واپس جانے سے مجھے روک لیا۔ میں نے نزہت کی تصویر اپنے دل کے تہ خانے سے نکال پھینکی ـــــ لیکن نہیں ـــــ نزہت کی تصویر تو ہر لمحہ بن رہی تھی، میں کہاں تک پھینکتا ـــــ؟ اس کی بے پناہ اُداسی کا جال لمحہ بہ لمحہ میرے وجود کو جکڑنے لگا ـــ

وہ سارا دن بڑی بے کلی میں گذرا۔ ایک ایک کرکے نزہت کی سیکڑوں تصویریں، مختلف پس منظر میں بنتی بگڑتی رہیں اور اپنے آپ میں اُترنے کی میری ساری کدوکاوش رائیگاں گئی ـــ

دوسرے دن مجھے ایسا لگا۔ جیسے کئی سال بیت گئے ہوں اور میں سب کچھ بھلانے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ میں ہوں اور میرے دل کا اتھاہ سناٹا۔!

میں نے اس کا نام لیا جو نہایت مہربان ہے، رحم کرنے والا ہے۔ اور اپنے آپ میں اُترنے لگا ـــــ میں نے محسوس کیا، میں بے حد کمزور ہوگیا ہوں اور میرے اُترنے کے عمل میں وہ تندہی نہیں رہی۔ دراصل میں ڈر رہا تھا کہ پھر کوئی کسی گوشے میں چھپا بیٹھا نہ ہو، میں نے سوچا، نزہت نے اب تک خود کو ایڈجسٹ کرلیا ہوگا۔ اور صبا ـــــ؟

معاً میرے ذہن کے کسی گوشے سے نزہت کا پیکر اُبھرا ـــ اور میں خوف سے لرز گیا۔ نزہت کے چہرے پر اتنی ساری لکیریں کہاں سے آئیں ـــــ؟ ان لکیروں میں نزہت کا اپنا چہرہ یوں ڈوب گیا تھا، جیسے کبھی گھونٹ گھونٹ زہر میں میرا وجود!

میں نے محسوس کیا ان لکیروں کو میں پڑھ سکتا ہوں ـــــ ان میں ایک قید تنہائی کی لکیر ہے، ایک بے بضاعتی کی علامت، ایک لکیر صبا کی تعلیم اور مستقبل کی فکر بن کر اُبھری ہے، ایک صبا کی شادی کی فکر کی نشانی ہے ـــ ایک گہری لکیر ـــ؟

صبا ۔۔ ؟؟ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا ـــــ مگر یہ گہری لکیر ۔ ؟ یہ صبا کے گھر سے بھاگ جانے کی لکیر ہے ۔ ؟

مَیں نے آنکھیں کھول دیں۔

سورج کی سُرخ ٹکیہ آدھی سے زیادہ افق کی کوکھ میں سما چکی تھی اور شام کی تاریکی اپنے پَر پھیلائے کائنات کو اپنے آغوش میں سمیٹ رہی تھی ـــ

میں نے سوچا 'مَیں انجانے میں اپنے جسم کا سارا زہر نزہت کے جسم میں محلول کر آیا ہوں۔ اور نزہت اس زہر کو ..... نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہوگا، ہرگز نہیں۔

اپنے کپل وستو کی طرف لوٹتے ہوئے میں سوچ رہا تھا ـــ

نزہت ... صبا .... جسم کا زہر اور نروان ـــــ پھر پیپل کا درخت اُبھرا اور اس کے گرد نزہت، صبا اور مَیں دائرہ بن کر گردش کرنے لگا۔ ہم گردش کرتے ہوئے دائرے کی شکل میں دور ہوتے گئے اور پیپل کا درخت چھوٹا ..... بہت چھوٹا، یہاں تک کہ جب مَیں کپل وستو پہنچا تو پیپل کا درخت ایک نقطہ تھا ۔ !

ــــــــ ۔۔۔٭۔۔۔ ــــــــ

اندھیرے کا سفر

(نزہت پروین)

شہلا کا تقاضا بڑھتا جا رہا تھا کہ شاہد اسے پچھوڑ دے۔ گیلے وجود کا بوجھ ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ لیکن شاہد کی آنکھیں رانوں سے متصل پیڑو کی لکیروں پر مرکوز تھیں کہ ان کے سفید پیٹ سے پھوٹتی نیلی روشنی میں دیوار کے کلنڈر کا مُنّا چمک رہا تھا —— ہر چیز اپنی جگہ تھی، کہیں کوئی گڑبڑ نہیں تھا۔ روشنی منجمد، کھڑکیاں بند، کمرہ میں سناٹا۔ لیکن شاہد بکھر چکا تھا اور شہلا شاہد کے بکھرے وجود کو سمیٹنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔

چند سال قبل ارشد نے کہا تھا کہ شاہدہ میری ہے۔ لاٹری کا نتیجہ سامنے تھا۔ نشاط فاطمہ پر صدر عالم کا حق ثابت ہو چکا تھا اور شاہد کے حصہ میں شہلا آئی تھی۔ اس کے بعد آگہی اور ادراک کے دائرے جوں جوں پھیلتے گئے۔ لمحوں کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ وجود پھیلتے اور بکھرتے رہے لیکن ۱۹۶۶ء کی لاٹری کا فیصلہ برقرار تھا۔ .... پھر ایسا ہوا کہ لمحوں کی آندھی نے شہلا کو شاہد سے دور کر دیا۔ شاہد لکیریں پیٹتا رہا۔ زندگی کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اصول ٹوٹتے ہیں۔ زندگی بکھرتی ہے زندگی پگھلتی ہے، اصول میں تبدیلی آتی ہے۔ زندگی اور اصول ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے ——

ایک دن ایسا ہوا کہ شاہد لمحوں کے چٹان سے ٹکرا کر مُنھ کے بل گر گیا تو زہرہ نے آگے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔ لمحوں کے وجود کا بوجھ ہر کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ شاہد چیختا رہا۔ شہلا کو آوازیں دیتا رہا۔ آوازوں کا بھی وجود ہوتا ہے۔ آوازیں فضا میں پھیلتی اور سکڑتی رہیں۔ بے شکلی بھی ایک شکل ہے جس سے شناخت ہوتی ہے۔ آوازوں کے وجود کا

دباؤ بڑھتا رہا اور شاہد ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا رہا۔ کلاس روم میں لکچر دینے کے دوران
بھی شاہد شہلا کے وجود سے بے خبر نہیں رہتا۔ وہ سڑکوں پہ ورق ورق چہروں کو پڑھتا
ادبی جلسوں میں گل افشانیاں کرتا اور جب لمحوں پہ قابو پاتا تو اس کو اپنا وجود تار تار نظر
آتا اور وہ لمحوں کے سیلاب میں بہہ جاتا۔ سورج سوا نیزے پر آتا اور جب کھڑکی کے پردے
گر جاتے تو وہ سکون کی وادی میں سپنے دیکھنے لگتا۔ سپنے جن کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے
صبح کے اُجالے میں شاہد خود کو زہرہ کے قریب دیکھ کر بکھر جاتا اور سنسان وادیوں کا
چکر کاٹنے لگتا کہ ہر نقش پا پر شہلا کا گمان گذرتا۔ زہرہ اُجالے پر پھٹکار بھیجتی اور از سر نو
اندھیرے کی تلاش شروع کر دیتی کہ اندھیرے میں اس کو قدروں کے امر ہونے کا یقین ہوتا

شاہد لمحوں کے پیچھے دوڑتا رہا۔ مسلسل تعاقب کا نتیجہ یہ ہوا کہ لمحوں نے مڑکر دیکھا
اور شاہد پر لرزہ طاری ہو گیا۔ بڑی دقتوں کے بعد اس نے خود کو سمیٹا اور سرپٹ
بھاگنے لگا۔ لمحے سرکتے گئے۔ تین گھنٹے بعد ٹرین پٹنہ جنکشن پر آکر رکی اس وقت جنوری
کی آخری رات کے آٹھ بج رہے تھے ——— ہر طرف روشن شعاعیں دودھیا
رنگوں میں سُرخ غازے پیوست کر رہی تھیں۔ دودھیا اور سُرخ رنگوں کی آمیزش
راہ میں روڑے اٹکا رہی تھی۔ نرم اور گرم فضا میں شاہد نے خود کو تنہا محسوس کیا
اور قدرے تذبذب کے بعد ایک رکشہ پر لد گیا ... ہر نشان اپنی پہچان کھو چکا تھا۔
تین سال بعد وہ اس شہر میں داخل ہو رہا تھا جہاں اس نے مکمل دس سال گذارے
تھے۔ کچھ کھونے کا غم تھا، کچھ پانے کی خوشی بھی۔ آباد اور ویران سڑکوں سے گذر کر
رکشہ ایک پارک کے پاس رُک گیا، جس کا ہر گوشہ عمر رفتہ کو آواز دے رہا تھا۔ اس
پارک کے آس پاس کبھی ایک بڑا گہرا تالاب تھا جہاں اب انسانی آبادی کا ایک ہجوم
ہے ---- کال بیل پر انگلی کا دباؤ بڑھتے ہی خوشبوؤں نے آگے بڑھ کر استقبال
کیا۔ جس کمرہ میں شاہد نے صبح کا انتظار کیا، وہاں کی ہر چیز اجنبی تھی وہ اپنے آپ
میں سمٹا اجنبی چہروں میں اپنا چہرہ ڈھونڈھنے لگا۔ صبح کے بعد شام آتی رہی اور
وہ صبح کے انتظار میں پگھلتا رہا..... پھر بھیانک رات کی ایک صبح کو اس نے دیکھا کہ

بالائی کھڑکی کی پھانک سے خوشبوؤں کا ریلا کمرہ میں داخل ہو رہا ہے۔ پہلے اس نے اپنے وجود کے ذرّوں کو بٹورا، اس کے بعد اس نے خود کو خوشبوؤں کے ریلے کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ بادِ صبا سُرخ دوپٹہ فضا میں اُچھال رہی تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ شاہد تاروں کی بارات رُخصت ہونے کا منتظر رہنے لگا۔ بارات رخصت ہوتی۔ بالائی کھڑکی کھلتی اور اس کا سارا وجود خوشبوؤں کے سمندروں میں ڈوب جاتا۔

دن ہفتے بنے اور ہفتے مہینے میں تبدیل ہوئے تو ایک صبح اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا تھا اور شہلا سامنے تھی۔ اس نے پلکوں کو بار بار جھپکایا کہ آنکھوں نے اپنا اعتبار کھو دیا تھا اور تب انگلیوں نے شہلا کے وجود کا گیان پراپت کیا کہ سامنے جو کچھ تھا، نیا نہیں تھا۔ وہ آٹھ سال سے اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں تھا لیکن منزل نے کبھی اپنے راہی کو آواز نہیں دی کہ منزل کا کوئی ایک راہی نہیں ہوتا۔ بس کی خوشبو نے جب اس کو منزل سے قریب تر کر دیا تو شکایتوں کا دفتر کھُل گیا کہ گذرا ہوا ایک ایک لمحہ شاہد کے وجود پر بھاری تھا اور جب اس نے لمحوں کے بھاری وجود سے نجات حاصل کرنے کے لئے شہلا کے اندر قطرہ قطرہ اُترنا چاہا تو پیڑو کی لکیروں نے خبردار کیا کہ یہ تمھاری منزل نہیں، تم سے پہلے یہاں دوسرے پڑاؤ ڈال چکے ہیں!!
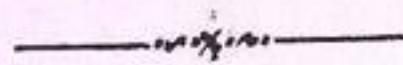
کان بند ہے

مشرف عالم ذوقی

پتہ نہیں یہ ہنگامے کب سے ہو رہے تھے۔ ماسٹر رام چندر نے شروع شروع میں تو ان ہنگاموں سے خود کو بے خبر رکھا۔ جان بوجھ کر کان بند کئے رہے کہ بیکار کے معاملوں میں پڑنے سے فائدہ کیا ہے۔ جو معاملہ بآسانی بات چیت سے نبٹ جائے اس میں جھنجھٹ جھگڑے کا کیا کام۔ یوں بھی وہ ماسٹر تھے اور ان کا پیشہ اصول اور قانون کی بات کرنا تھا۔ بچوں کو قاعدے اور قانون کی تربیت دینا تھا۔ بچوں کے ساتھ ساتھ یہ تربیت وہ خود کو بھی دیتے آئے تھے کہ ہنس کر مسکرا کر بات چیت کرو۔ کوئی گالی بھی دے تو نرم رویہ اپناؤ۔ سادگی اور محبت سے سب کا دل جیت لو۔ مگر ماسٹر رام چندر نے یہ بات کافی دیر میں جانی کہ ہر معاملہ قاعدے اور قانون کی کتابوں سے نبٹتا نہیں ہے اور ہر معاملے میں کان کو بند بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ آتے جاتے ومل بابو جب قانون اور فوجداری کی بات کرنے لگے تو ماسٹر کو بھی اپنی نرمی میں تھوڑی سی سختی لانی پڑی۔ وہ ہر بات سہہ سکتے تھے۔ مگر یہ نہیں کہ انہیں ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کے سامنے شرمندہ کیا جائے۔ انہیں پڑھاتے وقت پریشان کیا جائے۔ انہیں پڑھاتے وقت تختے پر بیٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچوں کو وہ پڑھا رہے تھے کہ جانے کہاں سے ومل بابو نکل کر آ گئے۔ ماسٹر نے ہمیشہ کی طرح ان کے آگے ہاتھ جوڑ کے نمستے کیا۔ بچوں کو نمستے یاد کرایا پھر ومل بابو کو دیکھا جو آنکھیں لال لال کیے کہہ رہے تھے

”تو اب تم نے میرے مکان کو بچوں کا اسکول بھی بنا دیا ماسٹر۔ بہت من مانی کرنے لگے ہو۔ یہ سب نہیں چلے گا۔

"کیسی من مانی ومل بابو؟"

"منھ مت لگو ماسٹر" ——— ومل بابو غصے میں تھے۔ باپ دادا گھر کی جوٹھن چاٹا کرتے تھے۔ لڑکا ماسٹر بن گیا تو برابری اور اوقات پر اتر آیا۔"

"وہ کل کی باتیں تھیں ومل بابو۔ اور فرق کہاں نہیں آیا۔ خود اپنے ملک میں دیکھیے

ماسٹر نے ایک بار پھر نرمی کا سہارا لیا۔

"تو اب تم مجھے قانون بھی پڑھانے لگے ہو ماسٹر" ومل بابو گرجے۔"یہ بتاؤ مکان کب خالی کر رہے ہو یا ہمیں قانون کا سہارا لینے کے لیے مجبور ہونا ہوگا۔"

"مکان خالی نہیں ہوگا ومل بابو" اس بار ماسٹر بڑے اطمینان سے بولے۔"اس لیے کہ اب میں اسے اپنا مکان سمجھتا ہوں۔ اپنے مکان میں جیسے چاہوں میں رہ سکتا ہوں۔"

ومل بابو گالیاں دیتے ہوئے واپس لوٹ گئے تھے۔ یہ مکان ومل بابو کے حصے میں تھا۔ اس پاس کی زمین بھی ومل بابو کی ہی تھی۔ اور بغل والی کوٹھی میں وہ آج تک خاندان در خاندان رہتے آئے تھے۔ اور ماسٹر رام چندر نے بچوں کی طرف دیکھا جو ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے انداز میں جاتے ہوئے ومل بابو کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دو بچے تو مارے خوف کے رونے بھی لگے تھے۔

"تم لوگ پڑھو بچو۔ یا چھوڑ دو۔ آج رہنے دو۔ کل سے آنا۔"

ماسٹر نے بچوں کو چھٹی تو دے دی۔ مگر دل میں چبھے ہوئے کانٹے کو الگ نہ کرسکے۔ جو برابر انہیں پریشان کیے جا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ماسٹر کی بیٹی سیتا دیوی بہت سے گندے میلے کپڑوں کی تھال لیے کوٹھی کے گیٹ سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ دیکھتے ہی ماسٹر کا پارہ چڑھ گیا۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟"

سیتا نے سر جھکا لیا "کپڑے دھونے گئی تھی۔ کوٹھی سے بلاوا آیا تھا۔"

"جانتی ہو۔ تم ایک ماسٹر کی بیٹی ہو۔" ماسٹر رام چندر نے تقریباً چیختے ہوئے بولے...

"مگر یہ کام تو......"

"اب تمہیں کوٹھی جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ماسٹر رام چندر غصے سے بولے۔

ہم نے کوئی قرض کھایا ہے ان کا۔ نوکری ہمارے باپ دادا نے کی تھی۔ ہم نے تو نہیں۔ انہوں
زندگی نمک کا قرض اتارنے اتارتے ختم کر دی۔ اور کیا دیا ان لوگوں نے۔ یہ چھوٹا سا جھونپڑی نما
مکان۔ کیا یہ بھی نہیں دیتے اور اب دل بابو کہتے ہیں کہ یہ مکان بھی انہی کی ملکیت ہے۔

"تو تم جھگڑا کرو گے؟" سیتا نے دبی زبان میں پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ مگر جو حق بنتا ہے اسے چھیننے نہیں دوں گا۔ اور ہاں سن لو۔ کل سے تم
وہاں کام کرنے نہیں جاؤ گی۔"

ماسٹر رام چندر اندر چلے آئے۔ صبح کے سات بج گئے تھے۔ ہلکی ہلکی دھوپ نکھر گئی تھی۔
ان کے دو چھوٹے لڑکے تھے اور ایک لڑکی تھی۔ سب سے بڑا لڑکا سات سال کا تھا۔ اس پر
سے ایک لڑکی تھی اور اس کے بعد چھوٹا والا۔ اس وقت تینوں مٹی مٹی کا کھیل کھیلے جا رہے تھے۔
ماسٹر رام چندر نے غصے میں آکر تینوں کو زور کی چپت لگائی۔ تین پائے کے اسٹول کے پاس
پڑی ہوئی پرانی کتابوں میں سے مہینوں پرانا اخبار نکال کر اسے پڑھنے بیٹھ گئے۔ مگر پڑھنے میں
دل نہیں لگا۔ سوال رہی تھا۔ اگر دل بابو واقعی اپنی بات پر جم گئے تو؟ اور مکان خالی کرانے کی
نوبت آگئی تو؟ اس پورے خاندان کو لے کر کہاں جائیں گے وہ۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا
ہوگا۔ سیتا کا کیا ہوگا۔ مڑے تڑے اخبار کو لے کر وہ دونوں کمروں میں گھوم گئے۔ چھوٹا چھوٹا کمرہ
ایک کٹھے سے بھی کم میں پھیلا ہوا گھر۔ باہر تھوڑا سا برآمدہ۔ جہاں صبح سویرے انہوں نے چھوٹے
چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا کام شروع کیا تھا۔ پرائمری اسکول کے ٹیچر کو ملتا ہی کیا ہے
تین بچوں کے دودھ میں ہی کتنا خرچ ہو جاتا ہے۔ ابھی سے پیسے نہیں جڑیں گے تو بڑی ہونے
پر لڑکی کی شادی کیسے ہوگی؟ ماسٹر رام چندر کو برے دنوں کی ایک ایک گھڑیاں یاد تھیں
یہی تو صحن تھا جہاں ان کی دو پیڑھیوں نے زندگی گزاری تھی۔ بابو کی ہلکی ہلکی جھلک ذہن میں
اب بھی موجود تھی۔ سب کچھ یاد تھا۔ وہ اسکول میں پڑھنے لگا تھا۔ مگر پتا جی کو بابو اور
ماں کو مائی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔ اپنے خاندان میں پڑھنے والا وہ پہلا آدمی تھا۔ بابو دن بھر
کوٹھی میں جھاڑو لگاتے۔ کھانا پکاتے۔ پیر دبانے میں لگے رہتے۔ تو مائی کا "پوچارہ" لگانے،

کپڑے دھونے اور دوسرے دوسرے کام میں مصروف رہتی۔ تھوڑا بہت کام تو بابو کے ساتھ مل کر بھی کرتا رہتا۔ جیسے بازار جانا، سبزی ترکاری لانا۔ اسکول سے وقت نکال کر، دوڑ دوڑ کر وہ ڈھیر سارا کام کر دیا کرتا۔ بابو نے اس کو پڑھانے پر بہت زور دیا تھا۔ وقت نے سیاہ دنوں کی شروعات کر دی۔ پہلے مائی مری اور پھر بابو بھی رخصت ہو گئے۔ اور اس کے بعد مکان کا یہ جھگڑا شروع ہو گیا۔

وہ تو اچھا ہوا کہ بابو کی زندگی میں ہی اسے نوکری مل گئی تھی۔ نوکری ملنے کے بعد پتہ نہیں کیوں یہ سب اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے کئی بار بابو کو سمجھانا بھی چاہا تھا اور ہر بار بابو ہنس کر ٹال گئے تھے۔ یہی کہتے رہے۔ انہی کے دروازے پر ساری عمر کٹی ہے۔ انہی کے چھت کے نیچے سہارا ملا ہے۔ ان کا نہیں تو کس کا کام کروں۔ بابو کے اس جواب کے آگے وہ کیا کہتا۔ کہ بابو ریٹائر تو ایک نہ ایک دن ہر آدمی ہوتا ہے۔ گورنمنٹ بھی بڑھاپے کا لحاظ کر کے پنشن دے دیتی ہے — تم پنشن نہیں لوگے بابو؟ مگر بابو جی نے پنشن نہیں لی۔ مرنے کو مر گئے۔ مگر وہ مل بابو کے خاندان کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری اسے سونپ گئے۔ کہ اپنی ماسٹری پر ناز نہیں کرنا۔ تیرے پروج بھی کوٹھی کے ملازم رہے ہیں۔ تھوڑا بہت کام کر دینے سے آدمی چھوٹا نہیں ہو جاتا ہے۔ خود نہیں تو پتنی کو بھیج دیا کرنا۔ بابو کے وقت سے ہی سیتا بھی کام پر جانے لگی تھی۔ شروع شروع میں تو ماسٹر کو یہ سب بُرا ضرور لگا۔ پھر عادت بن گئی۔ اور پھر اس نے خود سے سمجھوتہ بھی کر لیا۔ کہ آخر ایک عمر گزری ہے یہاں۔ انہی کے سائے تلے پڑھا لکھا ہے۔ بڑا ہوا ہے کوٹھی کا نمک کھایا ہے۔ تو ساتھ بھی دے گا۔ اس لیے اس نے سیتا کو بھی کبھی منع نہیں کیا۔ جب بھی بلایا گیا اس نے سیتا کو بھیج دیا۔ شادی بیاہ جیسی تقریب میں تو وہ خود ہی بڑھ چڑھ کر سارا کام سنبھال لیتا۔ یہ سب کچھ تھا مگر پھر بھی۔ کبھی کبھی برا ضرور لگتا۔ اس لیے کہ اب وہ ایک ماسٹر تھا۔ اس کے بھی یار دوست تھے۔ سب کے سب کسی نہ کسی اچھے پیشے یا نوکری سے جڑے ہوئے تھے۔ ان سے ملتے ہوئے کچھ نہ کچھ اٹ پٹا ضرور لگتا۔ یا پھر جب یہ گھر آتے اور سیتا گھر میں نہ ہو کر کوٹھی میں ہوئی۔ یا پھر اسی وقت کوٹھی سے کام پر آنے کا بلاوہ آتا۔ غصہ تو ضرور آتا۔ مگر سیتا لوٹنے کے بعد اس درد کو ہلکا ضرور کر دیتی۔ جو سچ ہے اس سے انکار کیوں کرتے ہو؟ کیا ہے یہ سچ — کتنا کڑوا۔ کتنا زہر بھرا۔ پھر ماسٹر کو سب کچھ یاد آ جاتا۔ ان کے سہارے گزرا ہوا بچپن — تا چینی کے برتن میں پروسا ہوا کھانا۔ کبھی کبھی جوٹھن بھی۔ بچپن سے اس نے یہی سب

دیکھا ہے۔ اور بابو جی نہیں پڑھاتے تو اس کڑوے سچ کو محسوس کرنے کے وہ لائق بھی نہیں ہوتا۔ بابو جی نے سچ مچ بہت بڑا تیاگ کیا ہے۔ اور یہ تیاگ کی نئی پریبھاشاؤں نے اسے اچانک دنیا داری، قانون اور سچ سے آگاہ کر دیا تھا۔ جیسے اب وہ یہ سوچنے لگا تھا —— کہ ماسٹر اگر یہ گھر تمہارا نہیں ہے تو یہ ملک بھی تمہارا نہیں ہے۔ دو پشتوں سے رہتے چلے آنے کے باوجود بھی اگر اس گھر پر تمہارا حق نہیں بنتا ہے تو پھر اس ملک کے جغرافیہ میں بھی تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ ملک تمہارا نہیں ہے اور کیا ہے تمہارا اتہاس؟ کب آئے تم یہاں؟ کب بسے؟ کچھ معلوم ہے..... نہیں تو پھر.....؟

ماسٹر کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس دن وکیل صاحب کے یہاں بھی اس نے اسی سوال کو اٹھایا۔ آنند تریپاٹھی جی محلے کے مشہور وکیل تھے۔ شام میں اسکول سے آنے کے بعد وہ آنند جی کے بچوں کو پڑھانے جایا کرتے تھا۔ وکیل صاحب بھی کافی تیز آدمی تھے۔ دنیا بھر کی باتوں کی خبر رہتی۔ گھر کے اس مسئلے پر وہ بھی چونک گئے۔

''ہاں یہ بات تو ہے۔ وہ گھر تو تمہارا نہیں ہے، ومل بابو کے دادا نے وہ زمین تمہارے دادا کو رہنے کے لیے دی تھی کیونکہ پشت ہا پشت سے وہ لوگ ان کے یہاں کام کرتے آ رہے تھے یعنی کئی پشتوں کی خدمت کی تھی۔ اور یہ گھر اس وقت ایک طرح سے سرونٹ کوارٹر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔''

پھر آنند بابو نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ ماسٹر کہ ومل بابو کے دادا نے وہ مکان دیتے وقت کچھ لکھا پڑھی بھی کی تھی یا یونہی دے دیا تھا۔''

''لکھا پڑھی؟''

ہاں جیسے ان کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا کاغذ کہ وہ زمین تمہارے دادا کے نام کرتے ہیں۔ اس طرح اس کاغذ کی قانونی حیثیت ہو جاتی۔

ماسٹر رام چندر کو ہنسی آگئی —— آپ بھی کمال کرتے ہیں آنند بابو۔ اس زمانے میں لوگ اتنا سوچتے کب تھے۔ فوجداری اور مقدمے کی باتیں تو اب شروع ہوئی ہیں۔ اس

زمانے میں بھروسہ کیا اور زبان دے دی۔ خوش ہوئے اور مکان دے دیا۔ میں سوچتا ہوں۔ یہ بھی تو ایک طرح کا پنشن ہی تھا۔ ایک مشت رُپے کی جگہ مکان ہی دے دیا۔ جیسے گورنمنٹ اپنے ملازموں کے مستقبل کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے ویسے ہی میں سمجھتا ہوں کہ پرانے زمانے کے یہ رُوسا بھی اپنے ملازموں پر کبھی کبھی بہت مہربان ہو جایا کرتے تھے۔۔۔؟

"کاغذ نہیں تو کچھ بھی نہیں" آنند بابو نے یہ اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ مقدمے میں ان لوگوں نے الجھا دیا تو کیا کرو گے ماسٹر۔ کنگال کر دیں گے تمہیں۔ آج ہر کام لکھا پڑھی سے ہوتا ہے تمہیں وہ مکان تو۔۔۔۔۔

وہ میرا مکان ہے۔" ماسٹر رام چندر مضبوط آواز میں بولے: "دو پشت سے ہم یہاں رہتے آئے ہیں۔ مجھے ملا کر تین پشت ہو جاتی ہے کیا تین پشتیں کافی نہیں ہیں ایک مکان میں حق دلانے کے لیے۔ تین پشتوں سے یہ مکان ہمارے حصّے میں رہا ہے اب اسے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ماسٹر رام چندر اس دن گھر تو لوٹ آئے مگر تھکان حاوی رہی۔ پرانی تہذیب سے اب تک نہیں کٹ سکے تھے وہ۔۔۔۔۔ آتے ہی بچوں کو دھون دیا۔ کس کے پٹائی کر دی۔ اندر تکلیف ہو تو درد نکالنے کا آسان طریقہ ہے یہ۔ برسوں سے یہی دیکھتے آئے تھے۔ باپو جی وغیرہ بھی تو یہی کیا کرتے تھے۔ اور اب۔ وہ بھی اس پرمپرا و روایت سے نہیں کٹ سکے تھے۔ بچوں کو مارنے پیٹنے کے بعد باہر نکلے۔ سامنے ہی کوٹھی تھی۔ آس پاس کتنے ہی نئے مکان اٹھ گئے تھے۔ پرانے مکان ایک ایک کر کے شہر سے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ جو بچے کھچے مکان تھے وہ بھی لائبریری، بینک یا گورنمنٹ آفس میں تبدیل ہو چکے تھے۔ باقی مارکٹ بن گئے تھے۔ اور ومل بابو بھی یہی چاہ رہے تھے کہ وہ حصہ جس میں رام چندر کا خاندان رہتا تھا۔ باہر کا حصہ تھا۔ وہ باہر کے اس حصہ کو توڑ کر مارکیٹ بنا دینے کے حق میں تھے۔ آخر سب لوگ یہی کر رہے تھے اور فائدے کا سودا ابھی یہی تھا۔ مگر ماسٹر رام چندر کو کسی بھی طور پر یہ بات پسند نہیں تھی۔ وہ اس مکان کو اب ومل بابو کا مکان ماننے کو تیار تیار ہی نہ تھے۔

دوسرے دن کوٹھی سے خبر آئی ــــ سیتا کام کرنے کیوں نہیں آئی۔ بہت ضروری کام ہے۔"

یہ خبر ومل بابو کا چھوٹا لڑکا چندر لایا تھا۔ چندر کو غور سے دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر بڑی مٹھاس سے بولے۔

"بغل سے سگریٹ لے آؤ گے چندر؟"

"نہیں ــــ" چندر رعب سے بولا۔

ماسٹر بھانپ گئے۔ اس چھوٹے سے لڑکے میں بھی خاندانی پن پورا پورا موجود ہے۔ خود کو جوڑتے ہوئے رام چندر غصے سے بولے۔

"تو پھر جاؤ۔ سیتا بھی نہیں جائے گی تمہارے گھر۔ اور کہہ دینا۔ اب کام بھی نہیں کرے گی۔"

چندر حیران حیران سا ماسٹر کو گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سیتا نے باہر نکل کر پوچھا۔

"ایسا کیوں کیا۔ مجھے جانے دیا ہوتا۔"

"نہیں ــــ ماسٹر کے ہونٹ مسکرا اٹھے۔ تم نہیں جانتی۔ برسوں بعد مجھے سکون ملا ہے آج۔"

"بچے کو ڈانٹ کر۔ ومل بابو آ گئے تو؟"

"آنے دو۔" ماسٹر کو اطمینان تھا ــــ انہیں بھی یہی جواب ملے گا۔"

اور اس دن دوپہر ہوئی۔ شام ہوئی۔ مگر ومل بابو نہیں آئے۔ ہاں بلاوا کئی بار آیا۔ جب تک وہ گھر میں موجود رہے ہر بار انکار کروا دیا۔ آج اسکول بھی نہیں گئے تھے۔ سر کے درد کا بہانا بنا دیا تھا۔ پھر شام ہوتے ہی آنند بابو کے گھر ان کے لڑکے کو پڑھانے چل دیئے۔ آنند بابو باہر ہی تھے۔ لان میں کرسی نکلی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں اخبار دبا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی بولے۔

"آؤ ماسٹر آؤ۔ بیٹھو۔ ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں؟ رام چندر کو حیرت ہوئی۔

"ہاں تمہارے بارے میں۔ اب دیکھو نا۔ شری لنکا کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ تاملیوں

کے خلاف جس طرح وہاں ہنگامے ہو رہے ہیں اسے تم کیا نام دوگے۔ بنگلہ دیش میں ہزاروں بہاری آج تک مہاجر بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ پاکستان نے اپنا وعدہ آج تک پورا نبھایا۔ اور پھر آسام کا مسئلہ لو۔ میں سوچتا ہوں باہر سے آئے ہوئے لوگ پشت در پشت بس تو گئے مگر کتنے لوگوں کو شہریت کے حقوق ملے۔ ہنگاموں، فساد، دنگوں سے بھاگا ہوا ایک شخص کسی غیر ملک میں آتا ہے۔ پناہ لیتا ہے۔ بستا ہے۔ ایک خاندان بناتا ہے اور اپنی پوری زندگی ختم کر دیتا ہے۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے، اسے اور اس کے بچوں کو شہریت کے حقوق دلانے کے لئے۔ کتنے لوگ ہیں جنہیں ووٹ ڈالنے کی آزادی ملی۔ سچ پوچھو تو یہ مسئلہ بھی تمہارے چھوٹے سے گھر کے پیدا ہوئے مسئلہ سے کہیں نہ کہیں سے ضرور جڑا ہوا ہے۔"

آنند بابو نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "اس لیے میں سوچتا ہوں کہ کوئی شخص اگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آگیا۔ بس گیا تو اسے گھر ملنا چاہئے۔ وہ ملک ملنا چاہئے۔ اب یہی دیکھو نا .... آج کی اوسط عمر کیا ہے؟ پچاس برس زیادہ سے زیادہ ساٹھ برس۔ اگر بیس سال رہنے کے بعد بھی اسے شہری یا مالک مکان نہیں کہا جا رہا ہے۔ تو یہ خوش نصیبی کیا اسے ساری زندگی حاصل نہیں ہوگی"۔

"یہی تو میں کہتا ہوں۔ اب چوتھی پشت آگئی ہے میری۔ کیا چار پشتیں کافی نہیں ہیں"۔

"یہ رہی سوچ وچار کی بات"۔ آنند بابو اچانک پلٹ گئے تھے۔ "اور سچ پوچھو تو چار پشتیں کیا دس پشتیں بھی کافی نہیں ہیں۔ بات قانون کی ہے اور قانون لکھا پڑھی کے کاغذ کو مانگتا ہے اور تمہارے پاس سب کچھ زبانی ہے"۔

"اس کا مطلب ہم ابھی سے ہار گئے ہیں"۔

"نہیں ہارے نہیں... قاعدے کے لحاظ سے تو وہ مکان تمہارا ہی ہے۔ مگر قانونی پیچیدگی بھی تو کوئی چیز ہے"۔

نظر جھکائی تھی آنند بابو نے۔ اور آنند بابو کے بچوں کو پڑھاتے وقت ماسٹر رام خیدر اتنا ضرور سوچ رہے تھے کہ آنند بابو محض اخبار ہی اخبار ہیں جو جھوٹی سچی ہر طرح کی خبریں

شائع کرتا ہے مگر جو اپنی سطح پر ایماندار بہت کم ہوتا ہے۔ آنند بابو اخبار سے زیادہ نہیں ہیں بچوں کو پڑھا کر گھر لوٹے۔ معلوم ہوا سیتا ابھی تک کوٹھی سے لوٹی نہیں۔ مالکن خود آئی تھیں اسے بلانے کیلئے سیتا نے اسے دیکھتے ہی آنکھیں جھکا لی تھیں۔

ماسٹر کو اچانک غصہ آگیا........ح........رام..... جا...... دی...'

"ان لوگوں نے کئی بار بلوا بھیجا۔ مالکن خود بھی آئی تھیں۔"

"ملکینی کی نوکرانی ہے تو۔" پرانی پرمپرا کا آدمی پھر اتر آیا تھا ماسٹر کے اندر —

"کچھ شرم نہیں آتی۔ اسکول ٹیچر کی بیٹی ہو کر پرائے گھر میں کام کرنے جاتی ہے؟"

"وہ مالک ہیں۔"

"چوپ...... ح..... رام...."

ماسٹر رام چندر غصے میں آگ بگولا ہو گئے تھے۔ بچے ڈر کے مارے کواڑ کے پیچھے چھپ گئے۔ بیٹی کو مار پیٹ کر کمرے میں آکر چپ چاپ کھاٹ پر لیٹ گئے ماسٹر۔ سانس لمبی لمبی چل رہی تھی کیا کر دیا اس نے؟ شاید ایک بار پھر پرانی تہذیب سے جڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہانپ رہے تھے ماسٹر۔ پوری طرح سے اب تک شانت نہیں ہو سکے تھے۔ پھر سب کچھ صاف ہو گیا۔ آنند بابو کی دورخی باتیں۔ معاملے کی پیچیدگی۔ بچوں کو پڑھا کر لوٹتے اس نے ایک جھٹکے سے دیکھا تھا۔ ول بابو، آنند بابو کے احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔ کیا وہ یہ بازی ہار جائے گا؟ شاید یہی چڑچڑا پن تھا جو بیٹی پر غصہ بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ کیا سچ مچ یہ گھر خالی کرنا ہوگا؟ کیا خود سے سمجھوتہ کرنا ہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ سیتا کو کام پر جانے دیا ہوتا۔ ول بابو سے ٹکر نہیں لی ہوتی۔ مگر نہیں۔

رام چندر اچانک بستر سے اٹھ کھڑے ہو گئے تھے۔ اب وہ مطمئن نہیں تھے۔ یہ بازی انہیں کوئی نہیں ہرا سکتا۔ وہ یہ بازی جیت چکے تھے

دوسرے دن صبح میں جب ول بابو کے زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی تو ماسٹر کو کچھ بھی عجیب نہیں لگا۔ وہ جانتے تھے۔ ول بابو کو تو آنا ہی تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے۔ ماسٹر۔

"کیا بات ہے؟"

ول بابو دہاڑتے ہوئے بولے۔ "تو بڑا بننے لگا ہے ماسٹر۔ تپنی کو کام پر نہیں بھیجے گا۔ حیثیت اور اوقات کی بات کرنے لگا ہے۔"

"میری تپنی اب کسی کے بلاوے پر کبھی کام کرنے نہیں جائے گی۔ ماسٹر نے بھی اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ ول بابو کو بھی تاؤ آگیا۔" پرانے دن بھول گیا ماسٹر۔ بیوی کام نہیں کرے گی۔ بچے بوجھ نہیں ڈھوئیں گے اور سانپ کی طرح تو میرے گھر پر قبضہ جمائے گا؟"

"میں کہتا ہوں یہ مکان میرا ہے۔ ماسٹر رام چندر کو بھی غصّہ آگیا تھا۔ میں پھر کہتا ہوں ول بابو۔ دوبارہ مکان کے بارے میں کچھ بھی بولنے سے پہلے سوچ لیجیے گا۔ ہزار بار کہہ چکا ہوں۔ آپ کے دل میں جو آئے کیجیے۔ مگر یہ مکان میرا ہی رہے گا۔"

"تو آگئے اپنی اوقات پر"۔ ول بابو نے گہری سانس بھری۔ "تو سنو ماسٹر۔ وکیل سے میری بات ہو چکی ہے۔ سمجھ لو میں نے تم پر مقدمہ کر دیا ہے۔ اس مکان کے خلاف۔"

اور پھر وہ ہوا کہ ول بابو بھی چونک گئے۔

ماسٹر جیسے اسی جواب کی توقع کئے بیٹھے تھے۔ زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ تو ول بابو آپ جانتے ہیں۔ مقدمہ بھی ایک طرح کی جنگ ہے۔ جو برابری والوں سے ہی لڑی جاتی ہے۔ اب میں بھی آپ کی برابری میں ....."

ماسٹر ہنسے جارہے تھے۔ برسوں سے ان کے باپ دادا ول بابو کے گھر کی ملازمت کرتے آئے تھے۔ اب اس معاملے نے اچانک انہیں ول بابو کی برابری میں لا کھڑا کیا تھا۔

سائمن بارسکی

قاسم خورشید

جلوس ختم کیا

چاروں طرف عجیب سی خاموشی چھا گئی ۔ ہوا میں لہراتے ہوئے ہاتھ پیر پتھر ہو گئے ۔ سب کی نگاہیں مشکوک چہروں کی لکیروں میں سوالات ابھرتے اور پھر وہیں ڈوب جاتے ۔ خوف کی پرچھائیوں نے اپنا دائرہ وسیع کیا ۔ رات کی تاریکی میں مشعل کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ آگے بارود کا ڈھیر کوئی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا ۔ ایک شخص بھی اگر اس لکیر کو پار کر جاتا تو دیکھتے ہی دیکھتے کتنی زندگیاں تباہ ہو جاتیں ۔ اس جلوس میں عورتیں، معصوم بچے، بوڑھے اور جوان سبھی تھے ۔ انہیں اپنا حق چاہیے تھا ۔ ان سبھوں نے اس لڑائی میں اپنا سبھی کچھ کھویا تھا ۔ اب آگے کچھ بھی کھونے کو تیار نہیں تھے ۔ یہ سلسلہ تو صدیوں سے قائم ہے ۔ ان کے لبوں پر کچھ دیر کے لئے مسکراہٹیں بکھریں اور اس کے بعد پھر سے بوجھل پلکوں میں کام کرنا پڑتا تھا ۔ سبھی ایک بڑی ندی پر پل بنانے کے لئے رکھے گئے تھے ۔ ان کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی ۔ پل کی تعمیر کا کام پچھلے آٹھ برسوں سے تیزی کے ساتھ چل رہا تھا ۔ اس عرصے میں کئی بار موسم بدلا، حالات کے نقشے میں معمولی تبدیلی ہوئی مزدوروں کے کئی بے نام چہرے دھوپ کی تپش سے جھلسا گئے ۔ ان میں سے اکثر حادثے کے شکار بھی ہوئے لیکن کام یوں ہی چلتا رہا ۔ ایک مزدور آواز اٹھاتا تو دوسرا اسے دبانے کی کوشش کرتا ۔ کوئی ایک دوسرے کا دشمن نہیں تھا ۔ لیکن بھوک کا مسئلہ بہر حال اہم رہا ۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موت پر کوئی سوگ منائے ۔ ماحول کچھ ایسا تھا کہ تقریباً سبھی حادثے کی ذمہ داری خود پر ہی لینے کو تیار رہتے ۔

کئی آوازیں ابھریں تقریریں کی گئیں۔ لیکن ان سب کا حاصل کیا تھا۔ پھر سفر اسی جگہ سے شروع کرنا پڑتا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ حالات کو بدل دینے کا جذبہ اپنے اندر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ظلم اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ گیا۔ تو ان میں سے ہی ایک لیڈر ابھر کر سامنے آیا۔ سائمن باسکی، وہ پڑھا لکھا تھا، لیکن بہت زیادہ جذباتی غلط جگہ پر سمجھوتہ کرنے سے گریز کرتا۔ لیکن اکثر حالات کے آگے مجبور بھی ہوتا مزدوروں کی اکثریت نے اس کا ساتھ دینا شروع کیا۔ لیکن کچھ لوگ ہمیشہ اس کی آواز پر لبیک نہیں کہتے، کبھی کبھی ان میں اختلاف رائے بھی پیدا ہو جاتا۔ سائمن باسکی کو جو لوگ صحیح معنوں میں اپنا سچا لیڈر مانتے تھے، انہیں زیادہ پریشان کیا جاتا تھا۔

سائمن اپنی بیوی، دو جوان بیٹیوں، اور ایک دس سالہ بچے کے ساتھ پل کی تعمیر میں جٹا رہتا، جب کہیں کسی کے چیخنے کی آواز ابھرتی تو دوڑتا ہوا اس جگہ پر پہنچ جاتا۔ ٹھیکہ دار حسب معمول ان پر وار کر رہا ہوتا۔ سائمن کے آتے ہی دوسرے مزدور بولنے لگتے۔ ٹھیکہ دار کچھ سہم جاتا۔ اور اپنے آپ کو چھپانے کے لئے سائمن سے مخاطب ہوتا۔

ہونہہ تم مزدوروں کے لیڈر بنتے ہو۔ کہتے ہو کہ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ ہمیں اتنی مزدوری نہیں ملتی، جتنا ہم کام کرتے ہیں۔ کیا اسی کو محنت کہتے ہیں کہ دو گھنٹے سے چھاؤں میں سو رہا تھا۔ ہم کہاں تک برداشت کریں گے۔ تمہیں بھی تو سمجھنا چاہیئے۔

ٹھیکہ دار بولتا جا رہا تھا اور سائمن مزدوروں کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش میں رہتا۔ پھر کچھ دیر بعد سبھی اپنے کام میں لگ جاتے۔ وہ بھی اپنی جگہ پر لوٹ آتا۔ پھر دیر تک اسے ذہنی پریشانی میں مبتلا رہنا پڑتا۔ آخر ہم ان لوگوں کو کس طرح سمجھائیں جو بالکل محنت نہیں چاہتے۔ ہم اس جگہ پر کمزور ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسے مزدور تو ہیں ہی جو ہم سب کو بدنام کر رہے ہیں۔ انہیں آخر کس طرح سدھارا جا سکتا ہے، ٹھیک ہے اگر ان میں محنت کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ تو مالک انہیں نکال کیوں نہیں دیتا۔ ہم تو نہیں کہہ سکتے کہ انہیں ہٹا دیا جائے۔ اس لئے کہ ان پر جو ذمہ داریاں ہیں۔ انہیں کون پورا کرے گا۔ مالک سب کچھ جانتا ہے اسے کچھ بھی بتانے کی ضرورت

نہیں ہے ۔ ہم کیوں بدنام ہوں گے ؟ ان کی یہ سازش کبھی رنگ نہیں لائے گی ۔ کچھ ایسے بھی مزدور ہیں یہاں جو صرف غنڈہ گردی میں دلچسپی رکھتے ہیں ۔ یہ سب مالک کے خاص آدمی ہیں ۔ یہ کسی وقت بھی خطرہ پیدا کر سکتے ہیں ۔

سائمن چھٹی کا سائرن بجتے ہی بیوی بچوں کے ساتھ اپنے بیرک میں لوٹ آتا ۔ یہاں بھی دھوپ کی تپش ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ چھت گرم ہو جانے کی وجہ سے رات گئے تک انہیں نیند آتی ۔ رات کے کسی حصے میں پاس کے بیرکوں میں ہنگامہ شروع ہو جاتا کبھی اسے جانا پڑتا اور کبھی جان بوجھ کر نہیں جاتا ۔ جب کبھی نہیں جاتا تو اکثر ایسا بھی ہوا کہ صبح اٹھتے ہی کسی مزدور کی نعش پائی گئی ۔ قتل کا الزام بھی کسی مزدور پر ہی ہوتا ۔ کچھ دنوں تک سائمن باسکی کے خلاف بھی آوازیں بلند کی جاتیں ۔ اور جب دھیرے دھیرے حالات لوگوں کے سمجھ میں آجاتے ، تو سائمن اور عظیم بن جاتا ۔ اکثر ٹھیکہ دار رات گئے اس کے بیرک میں آتا ، اور سائمن کو مالک کے پاس لے جاتا ۔ مالک مزدوروں کے احوال دریافت کرتا ، اسے چائے پلائی جاتی ۔ اور جب وہ لوٹتا تو کچھ لوگ اس کے منتظر ہوتے ۔ پھر بہت دیر تک سائمن کو ان سے الجھنا پڑتا ۔ بیٹیاں دروازے پر اپنے باپ کی باتوں کو دھیان سے سنا کرتیں ۔ ان دونوں کو اکثر اس ماحول سے خوف سا لگتا ۔ چاروں طرف سے اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کرتیں ۔ تھکن کے باوجود ــــــ میں کبھی گہری نیندمیں نہیں ڈوب پائی تھیں ۔ ٹھیکہ دار کی آواز پر صرف چونکتی ہی نہیں ۔ بلکہ بابا کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیتیں ۔ ماں سے اکثر گالیاں بھی سننے کو ملتیں ۔ جب بابا جاگ جاتا تو کسی حد تک دونوں خود کو محفوظ سمجھتیں ۔ ٹھیکہ دار انہیں گھورتا رہتا اور سائمن نیند میں ان کے سوالوں کا جواب دیتا رہتا ــــــــــ ایک دن سائمن کی بڑی لڑکی کو کام کرنے کے لئے بیچ ندی میں بھیج دیا گیا ــــــــ وہ حادثے کا شکار ہو گئی ــــــــ اس کی نعش ندی میں کہیں کھو گئی ــــــــ پھر کچھ دنوں بعد موت سے بھاگتی ہوئی رات کے پچھلے پہر وہ اپنے بیرک میں پہونچی ، جیسے ہی دروازہ کھولا گیا ۔ وہ سائمن پر جھول گئی ۔ اس کا سارا جسم لہولہان ہو رہا تھا ۔ سائمن چیختا رہا ، بھیڑ جمع ہوتی رہی ۔ اور اس بیچ اس کی بیٹی نے سچ مچ موت کو گلے لگا لیا اس کے ۔ کچھ دنوں بعد سائمن نے چندہ کر کے اخبار نکالنا شروع کیا ۔ مزدوروں کے

اس اخبار کو پڑھنے والوں کی تعداد کم تھی۔ لیکن جب باہر کی دنیا میں اس کے اخبار کو پڑھا جاتا تو کچھ لوگ اس سے ملنے آتے، انہیں مکمل طور پر حالات سے آگاہ کیا جاتا۔ ان کے وعدے مزدوروں میں کئی خوب صورت خواب بن کر ابھرتے۔ یہ سلسلہ کچھ دنوں تک چلتا رہا بیداری بڑھتی رہی۔ لیکن ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ان کے دکھ درد کو سمجھنے والے اپنی شہرت کے پیچھے بھاگتے رہے۔ ان کی ہمدردی حاصل کرنے والوں کا مستقبل تابناک ہوا۔ لیکن انہیں اندھیرے سے کون نکالتا، کسی میں حوصلہ نہیں تھا۔ سب کچھ دکھاوا ـــــ بے بنیاد باتیں۔ آخر کب تک ان کے سہارے زندہ رہا جا سکتا تھا۔ کچھ دنوں بعد سائمن باسکی کی آخری بیٹی بھی حادثے کا شکار ہوگئی۔ اسے بھی ندی نے اپنے بانہوں میں جکڑ لیا۔ موجیں اس کے جسم سے کھیلتی رہیں۔ پھر خون کے دھبے ساحل پر دور دور تک پھیل گئے۔ سائمن باسکی نے تحریک اور تیز کر دی۔ اب اسے ان سے لڑنا تھا۔ ان کے خلاف ثبوت حاصل کرنا تھا۔ لیکن یہ کس طرح ممکن تھا۔ ان کی تعداد محدود تھی۔ لیکن ذرائع بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے بھی تھک کر بیٹھ جانا ہوگا۔ جب کبھی وہ اپنے بیچ کے لوگوں سے ہی مایوس ہو جاتا تو اچانک اس کا لڑکا جھنجھوڑ دیتا۔ لڑائی تیز ہوتی گئی۔ مزدوروں کی ایک بڑی تعداد ابھر کر سامنے آئی ـــــ دن بھر مختلف راستوں سے گذرتا ہوا یہ جلوس رات کے کسی حصے میں اس مقام پر پہونچا جہاں انہیں انصاف ملنے کی امید تھی ـــــ سائمن باسکی ہی ان کا لیڈر تھا۔ اس کے ایک اشارے پر سارے لوگ خاموش ہوگئے۔ سبھی اپنے لیڈر کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اجتماعی طور پر یہ سوال سامنے آیا کہ اس جگہ پر ہم بھی خاموش کیوں ہوگئے۔ جہاں سبھی احتراماً خاموش رہتے ہیں۔ آگے بارود کی ڈھیر تھی۔ اس ڈھیر سے انہیں گزرنا ہی تھا۔ سائمن کا سر جھک چکا تھا۔ پھر اس نے مشعل کی روشنی کو خون آلود نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ چہرہ بالکل سرخ ہو چلا تھا۔ وہ بہت کچھ بولنا چاہ رہا تھا۔ لیکن بولنے سے کیا فائدہ۔ خاموش احتجاج کی ضرورت ہے۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب تک بول کر ہم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ انہیں ہماری کمزوریوں کا علم ہو چکا ہے۔ اب جو آواز ابھری تو پھر کوئی ایسا راستہ ضرور سامنے آجائے گا۔ جہاں سے ہم آگے نہیں

بڑھ سکتے ہیں۔ اس لکیر سے آگے بڑھا ہوگا جسے چھوڑ کر اکثر لوٹنا پڑا ہے۔ سائمن بارود کے ڈھیر کی طرف بڑھنا ہی چاہ رہا تھا کہ اس کی بیوی سامنے آگئی۔ اور اس کے پاؤں پر گرگئی۔ چند لمحے بعد اس نے سائمن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

ہم لڑائی میں کئی بار ہار چکے ہیں۔ بہت کچھ مٹ چکا ہے۔ اب جو آگے قدم بڑھایا تو چاروں طرف آگ پھیل جائے گی۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ یہیں دم توڑ دیں گے۔ یہ سلسلہ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو سکتا جو کچھ بھی ہمارے پاس بچا ہے کیا اس کی ہی حفاظت نہیں کر سکتے۔؟ ایسا لگتا ہے کہ ہم کمزور ہیں۔ بہت کمزور ہیں ہم۔ ہمارے پاس صرف ایک بیٹا ہے۔ اور وہ بھی مزدور ہے سائمن باسکی کی طرح۔ سائمن اسے بڑھاتے وقت بھی ظلم کے خلاف احتجاج پر زیادہ زور دیتا تھا۔ ایسے کئی بچے ہیں ہمارے بیچ جو آگے چل کر اس بھیڑ کی شکل میں ابھریں گے۔ اور پھر ہم سب کی طرح انہیں بھی پیش آنا پڑے گا لیکن اس کا حاصل کیا ہے۔ ہماری جوان بیٹیوں اور بیٹوں کی بھی۔ نہیں اب ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کچھ تو تھک گئے ہیں ہم لوگ۔ عالات جیسے ہیں ویسے ہی رہنے دو۔ سب کچھ اسی طرح چلتا رہے گا۔ ہم اب کوئی تبدیلی نہیں چاہتے ہیں۔ ہمیں اب کوئی تبدیلی نہیں چاہئے۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہم بھی سکھی ہیں ..... اب کوئی تبدیلی نہیں۔

اور پھر بھیڑ میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ تمام ہاتھ دھیرے دھیرے جھکنے لگے۔ لوگ تھک کر بیٹھنا ہی چاہ رہے تھے کہ سائمن باسکی کا اکلوتا لڑکا بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ چلا رہا تھا لیکن اس کی آواز سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پھر خود بخود لوگ آگے بڑھنے کے لئے اسے راستہ دینے لگے۔ اس نے سائمن باسکی کے ہاتھ سے مشعل لی اور تیزی سے اس لکیر کے آگے بڑھ گیا۔

سُلگتے خیموں کا شہر

(فخرالدین عارفی)

میں جس شہر میں رہتا ہوں، عجیب و غریب شہر ہے۔ ایک چتا ہے جو اس شہر میں صدیوں سے سلگ رہی ہے۔ آگ کا ایک سمندر ہے جو سارے شہر میں لہرا رہا ہے۔ شہر کی کوئی بھی جگہ "جائے اماں" نہیں۔ سارا کا سارا شہر بھیانک آگ کی زد میں ہے، اور انسانوں کے رہنے کے خیمے سلگ چکے ہیں۔ لیکن اسے اہل شہر کی بے حسی کا طوفان کہیئے کہ آج تک کسی نے اس شہر میں لگی ہوئی آگ اور دہکتی ہوئی چتا کو سرد کرنے کی بات نہیں سوچی ہے۔

اور شاید کہ میں پہلا اور واحد آدمی ہوں جو اس آگ پر قابو پانے کی بات کر رہا ہوں۔ میرے دل میں اس بھیانک اور تباہ کن آگ سے اس کی زندگی چھین لینے کا پختہ عزم بھی ہے۔ اس لیے کہ نہ جانے اب تک کتنی کارآمد زندگیوں کو اس نے جلا کر تباہ کر دیا ہے۔

فکر و فن کے کتنے خوبصورت محل اس کی زد میں آکر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ عقل و خرد کے کتنے چشمے اس کی تپش کا شکار ہو کر خشک ہو چکے ہیں۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ تنہا میری بساط ہی کیا ہے؟ آگ کے لپکتے ہوئے شعلے کسی دم بھی مجھے اپنا لقمہ بنا کر موت کی ابدی نیند سُلا سکتے ہیں۔ تاہم میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ اور میرے دل میں عزم و حوصلے کا ایک امنڈتا ہوا سمندر موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے مشن میں کامیاب رہوں گا۔ اور ایک دن اس شہر کی آگ ہمیشہ کے لیے سرد ہو جائے گی۔ مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے کہ اس شہر میں کوئی میرا ساتھی نہیں ہے۔ اور میں اپنے اس مشن میں تنہا اور واحد ہوں۔ مجھے اپنے اوپر کامل اعتماد اور مکمل بھروسہ ہے اور اپنے بازو کی طاقت پر ناز ہے۔ اور میں

یہ بات پورے یقین کے ساتھ اپنے شہر کے لوگوں سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ۔

"مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے بُرے وقتوں میں بھی کبھی تم سے مدد کی درخواست نہیں کروں گا۔ میری آنکھیں تمہاری طرف کبھی رحم کی امید کے لئے نہیں اٹھیں گی۔ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ تم میں سے کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔ میری درد بھری پکار تمہارے کانوں تک پہنچ تو سکتی ہے، لیکن تمہارے دل میں کبھی نہیں اتر سکتی۔ اس لئے کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم موم سے بنے لوگوں کا دل پتھر سا ہے۔ پتھر جو نرا پتھر ہوتا ہے۔ کہ جسے تراش خراش کر خوبصورت اور دیدہ زیب تو بنایا جا سکتا ہے مگر اس میں جان نہیں پیدا کی جا سکتی"۔

میرے شہر کی یہ عام روش ہے کہ یہاں کے لوگ چڑھتے سورج میں اپنے سائے کو چھوٹا دیکھ کر اپنے بونا قد ہونے کا گمان کرتے ہیں اور پھر ان پر جیسے کہ کوئی پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ پاگل ہو جاتے ہیں اور اپنی دیوانگی میں آکر قتل و خون کا ہر طرف ایک بازار گرم کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے ایک ہاتھ میں اگر سفید پرچم ہوتا ہے تو دوسرے میں ننگی تلوار —— اور وہ سفید پرچم کی پناہ میں ہر آنے والے کا استقبال اپنی اس ننگی تلوار سے کرتے ہیں۔ اور اسطرح ایک مسلسل چکر چل پڑتا ہے۔ ان کے ارد گرد لاشوں کا ایک ڈھیر جمع ہو جاتا ہے اور تب وہ ان لاشوں پر کھڑے ہو کر دیوانہ وار چیخنے چلّانے لگتے ہیں۔

"میں بونا قد نہیں ہوں، میں بونا قد ہرگز نہیں ہو سکتا ہوں۔ دیکھو میرے قد کی اونچائی تو آسمان سے بات کر رہی ہے۔ تم سب جھوٹے ہو جو مجھے میرے بونا قد ہونے کا ہمیشہ احساس دلاتے رہتے ہو۔ اس شہر میں پست قد ہی لوگ ہوتے ہیں جو کمزور اور مجبور ہوتے ہیں۔ میرے اندر تو بڑی طاقت ہے۔ اور میں توانا ہوں۔ میرے ہاتھ میں تلوار بھی ہے۔ میں اگر پیاسا ہوں تو تم سب کا سر قلم کر سکتا ہوں اور تمہاری لاشوں کے ڈھیر پر کھڑا ہو کر آسمان پر اپنی فتح و نصرت کا جھنڈا گاڑ دوں"۔

اس شہر کا ہر باپ قاتل اور خونی ہے جو موقع ملتے ہی اپنی اولاد کی شہ رگ

یں اپنے نوکیلے، گندے اور بدبودار دانتوں کو بڑی بے دردی اور بے باکی سے پیوست کر دیتا ہے اور خون کا قطرہ قطرہ چوس جاتا ہے ـــــ اس شہر کی مائیں بھی کچھ کم درندہ صفت اور بھیڑیا خصلت نہیں ہیں۔

اپنی اولاد کو قدم قدم پر بھینٹ چڑھا دینا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اور وہ اپنی اس صفت میں حد درجہ کا کمال رکھتی ہیں ـــــ لیکن بھلا ان کو اپنی اس شرمناک درندگی کا صدقہ ملتا بھی کیا ہے؟ صرف چند گھونٹ پانی، جس کو پی کر ان کی پیاس اور بڑھ جاتی ہے کہ سمندر کا پانی پی کر کس نے اپنی پیاس پر قابو پایا ہے؟ یہ تو دیوانگی ہے کہ کوئی پیاس سے نڈھال دم توڑتا ہوا سمندر کا رُخ کرے اور اپنے گھر میں میٹھے پانی کے چشمے کو یکسر بھول جائے۔

میں تو سخت مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ میری جان عذاب میں ہے۔ ہر پل اپنے سر پر خطرات کے سیاہ و خوفناک بادل کو منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اپنی ڈوبتی، اُبھرتی سانسوں کا خود تماشائی بن گیا ہوں۔ جب کبھی سانسوں پر قابو پانے کا قصد کرتا ہوں تو کوئی میرے پھیپھڑے میں ایک نوکیلا، زنگ آلود خنجر بڑی بے دردی اور سفاکی سے اتار دیتا ہے۔ جیسے کہ میرا وجود کسی بھیانک خطرے اور بڑے دن کا امین ہو۔ لیکن کون ہے جو میرے ساتھ اس ہوتی ہوئی زیادتی اور ناروا سلوک کو شرم کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اور اس کے خلاف آواز بلند کرے گا؟ شاید کوئی نہیں ـــــ اس لیے کہ ہر شخص یہاں مجرم ہے، خونی ہے۔

میں نے بھی تو یہاں رہ کر ان گنت خون کیے ہیں۔ اور پاپ کی ایک بھاری اور گھناونی گٹھری میرے سر پر بھی موجود ہے۔ میرے دامن بھی تو داغدار ہیں کہ یہاں صاف دامن کا چلن ہی کب ہے؟ اور ریت، رواج، رہم و روش سے فرار بھی ممکن نہیں ـــــ لیکن میں نے بغاوت کا فیصلہ کیا ہے۔ میں بہر صورت باغی بنوں گا۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ بغاوت کے انجام میں مجھ سے میری

زندگی چھین لی جائے گی۔ میری حیات کا چراغ گل کر دیا جائے گا۔ ایسا بھی تو ممکن ہے کہ میری بغاوت کامیاب ہو جائے گی اور تب اس شہر کی آگ ہمیشہ کے لیے سرد ہو جائے گی اور سارا شہر ایک گلستان میں بدل جائے گا۔

سنتے ہیں کہ اس شہر میں کوئی عہد ایسا بھی تھا کہ جب لوگ آپس میں بھائی بھائی تھے۔ انہیں ایک دوسرے کی خواہشات و جذبات کا پورا پورا احترام تھا۔ چھوٹا بھائی اگر بڑے بھائی اور اپنے باپ کے سر پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو اسے فوراً سہارا دیکر نیچے اتار دیا جاتا تھا۔ انگلی پکڑ کر چلنا سکھانے کی رسم تو عام تھی۔ کہ پھر ایسا ہوا کہ نوجوانوں نے اپنے باپ داداؤں کو للکارا اور ان کے خیموں میں گھس کر ان کا خون کر دیا۔ اور سارے شہر میں آگ لگادی۔ زمانے نے ان نوجوانوں کو ایک خطاب عطا کیا۔ اور وہ اپنی بہادری، جوانمردی اور دلیری کے لیے ساری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ لوگوں نے ان کو جانا اور پہچانا کہ یہ "اہل خرد" ہیں۔

عقل و دانش اور فکر و فن کے ٹھیکیدار ...... اور یہ اپنے مفاد اور اپنی ترقی سے پرے دوسروں کے فروغ کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ ان کی اپنی مجبوری تھی اور وہ مجبور تھے ..... اور تب اس وقت کے تمام بچوں نے بھی اپنے بھیانک صورت اور لبڑے باپ داداؤں کو نفرت بھری نگاہ سے دیکھا تھا۔ پھر وقت آیا کہ وہ بچے جوان ہوئے اور انھوں نے بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اُن بزرگوں نے اپنے پرکھوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔

آج بھی ان اوراق پارینہ کے نقش و نگار تازہ بہ تازہ ہیں —— اور شب خون کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔

اسی قافلے کا مسافر

اختر واصف

ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ بھاگی جا رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں کو نیم وا کرکے ارد گرد نظر دوڑائی۔ ڈبے کے تمام مسافر اونگھ رہے تھے۔ چند ایک تو خراٹے بھی بھر رہے تھے۔ دفعتاً بتی بجھ گئی۔ اور چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جانے کیوں جب بھی میں ٹرین پر سفر کرتا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس پٹری پر یہ ریل چل رہی ہے وہ جا بہ جا زمین سے اکھڑی ہوئی ہے اور ہم سب کسی لمحہ بھی ......

میں نے خوف کی شدّت کو کم کرنے کے لئے ایک سگریٹ سُلگایا۔ ماچس کی روشنی میں، میں نے اپنے بغل والے مُسافر کے چہرے کا جائزہ بھی لیا تھا۔ لیکن وہ بڑے مطمئن انداز میں سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے خوف کی وہ پرچھائیں کہیں بھی نظر نہ آئی جو مجھے اکثر دہلاتی رہتی ہے۔

میں نے اسی ڈراؤنے خیال کو دل سے نکالنے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں سوچنی شروع کر دیں اور اس سلسلے میں مجھے بڑے بھیا کے اس تار کی یاد آئی جو آج ہی مجھے ملا تھا۔ انہوں نے لکھا۔ اگر بابا کا آخری دیدار کرنا چاہتے ہو تو فوراً چلے آؤ۔

اس TELEGRAM سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ بابا کی حالت بہت خراب ہے۔ بابا سے ملے مجھے کوئی پانچ سال ہو گئے اور اس درمیان میں نے ان کی نہ کوئی کھوج خبر لی ہے اور نہ خط ہی لکھا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ہم سب ساتھ ہی رہتے تھے۔ میں، بڑے بھیا، منجھلے بھیا چھوٹے بھیا۔ لیکن آج سب لوگ الگ ہو گئے، اس زمانہ کی کچھ دھندلی سی یادیں باقی ہیں۔ بڑے بھیا کو پڑھنے لکھنے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ اس لئے وہ بابا کے ساتھ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ منجھلے بھیا کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ زیادہ تر اپنی کتابوں میں ہی ڈوبے رہتے تھے۔ رہی بات چھوٹے بھیا کی تو وہ اس وقت نہ بچے ہی تھے اور نہ جوان ہی۔ اور بقول بابا یہ تو ان کے کھانے کھیلنے کے دن تھے۔ اس لئے وہ صرف کھیلتے تھے اور کھاتے تھے۔ میں اس وقت بمشکل گیارہ برس کا ہوں گا اور شاید ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا۔

اسی زمانے میں ٹھیک چوک پر ایک Jewellary shop کھولا گیا تھا۔ جسے بھیا سنبھالتے تھے کیوں کہ بابا کہا کرتے تھے کہ بڑے بھیا اب کاروبار میں پکے ہو چکے ہیں واقعی بڑے بھیا اپنے کاروبار میں بڑے پکے نکلے۔ انہیں جتنے روپیوں کی ضرورت ہوتی تجوری سے نکال لے جاتے بابا انہیں کچھ نہ کہتے۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ ان کا بیٹا ان کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔

بھیا کی شادی کے ایک سال بعد تک تو سب کچھ ٹھیک چلتا رہا لیکن دوسرے سال سے گڑبڑ شروع ہو گئی پھر اختلافات اتنے بڑھ گئے کہ بھیا ہم سب سے الگ ہو گئے ساتھ ہی بھیا وہ سب کچھ لیتے گئے جو بابا نے انہیں بیٹا سمجھ کر دیا تھا۔ اور ابھی یہ زخم بھرا بھی نہ تھا کہ ایک دن منجھلے بھیا ایک کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے بابا کے پاس آکر بولے "مجھے سرکاری نوکری مل گئی ہے۔ میں مدراس جا رہا ہوں۔"

بابا کچھ نہ بولے۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ میں نے بابا کو اس رات چپکے چپکے روتے دیکھا تھا۔ جس رات منجھلے بھیا مدراس جا رہے تھے۔ پھر دو ہی سال کے بعد چھوٹے بھیا بھی الگ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے حصے کا پچیس ہزار روپیہ بابا سے لیا اور بڑے بھیا کے ساتھ بزنس میں شریک ہو گئے اب گھر میں میرے علاوہ میرے دو سوتیلے بھائی اور ایک سوتیلی ماں

رہ گئی۔ ان دنوں باپا کے چہرے پر ہر وقت افسردگی چھائی رہتی تھی اور جب بھی بڑے بھیا وغیرہ کی باتیں چلتیں باپا جھنجھلا کر کہتے ——— اچھا ہوا منحوس اس گھر سے چلے گئے۔ منحوس تو سچ مچ گھر سے چلے گئے تھے لیکن اپنی منحوسیت چھوڑ گئے۔ کیوں کہ اسی سال باپا کو نقصان اٹھانا پڑا اور وہ تقریباً دیوالیہ ہی ہو گئے۔ تب زندگی کی گاڑی جو پہلے سبک روی سے چل رہی تھی ایسے چلنے لگی جیسے کوئی بیل گاڑی کراہتی چرمراتی چلی جا رہی ہو پھر باپا کے کاروبار کی حالت دن پر دن گرتی ہی چلی گئی۔

جن دنوں میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا، بھیا ایک دن آئے اور مجھے ایک کارآمد چیز سمجھ کر اٹھا لے گئے۔ تب سے میں بڑے بھیا کے گھر کی چیز بن گیا۔ مجھے باپا کے گھر کیا تکلیف تھی یہ تو میں نہیں جانتا لیکن بھیا اور بھابھی نے مجھے بتایا کہ باپا کے گھر مجھے بہت تکلیف دی جاتی تھی۔ سوتیلی ماں مجھے کھانا کم دیتی تھی اور باپا غیروں سا سلوک کرتے تھے۔ میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا تھا یا نہیں یہ کہنا بڑا مشکل ہے لیکن بھیا اور بھابی یہ ساری باتیں اتنے تیقن کے ساتھ کہتے تھے جیسے میرے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہوں۔

شروع شروع میں تو بڑے بھیا کا برتاؤ میرے ساتھ کافی اچھا رہا۔ لیکن بعد میں وہ سخت سے سخت تر ہوتے گئے۔ میرے سامنے حالات کی دیوار انہوں نے کچھ اس طرح سے کھڑی کی کہ میرے سارے کام روٹین کی شکل میں ڈھل گئے۔ میں روزانہ صبح سویرے نہا دھو کر بھیا کی دکان پر پہونچ جاتا۔ اسے کھولتا، جھاڑتا پونچھتا اور پھر نو بجے تک بھیا کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ جب بھیا ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر پہونچتے تو میں کسی کتے کی مانند وہاں سے دھتکار دیا جاتا۔ اور میں چپ چاپ سر جھکائے گھر کی طرف چلا جاتا۔ گھر پہونچنے پر بھابی میرے سامنے رات کی بچی ہوئی روٹیاں اور بھاجی رکھ دیتی۔ لیکن یہ سوکھی باسی روٹیاں میرے لئے گرم پراٹھے اور ٹھنڈی بھاجی، بھنی ہوئی گرم کلیجی سے کم نہ تھی۔

ناشتہ کے بعد میں اپنی پرانی سائیکل، جس پر کبھی بھیا سواری کرتے تھے، اٹھا کر کالج چل دیتا اور راستے میں خیالات کے ہجوم مجھے گھیر لیتے تھے۔ کالج جاتے وقت میں اکثر بھیا کے

بارے میں ہی سوچا کرتا تھا۔ نہ جانے کیوں ان دنوں میری یہ عادت سی بن گئی تھی۔ بڑے بھیا کے بارے میں بہت سے خیالات میرے ذہن میں گڈمڈ ہوتے رہتے۔ لیکن میں کبھی فیصلہ نہ کرسکا کہ میں بھیا کی عزت کرتا ہوں یا ان سے نفرت۔

یوں تو بھیا دیکھنے میں قابلِ نفرت بالکل نہیں لگتے۔ وہ ہمیشہ کھادی کا سفید کرتا اور سفید پاجامہ پہنتے ہیں۔ سفید کرتے پر کالی سی جیکیٹ، سر پر مخملی سی ٹوپی، بھرا ہوا سانولا چہرہ، باریک مونچھیں، اور پتلی سی داڑھی۔ بھلا اب صرف شکل دیکھ کر کسی سے نفرت کیسے کی جاسکتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ لاکھوں کا بزنس کرتے ہیں ہزاروں میں کھیلتے ہیں اور یہ بات قابلِ رشک ہو سکتی ہے نہ قابلِ نفرت نہیں۔

کالج سے لوٹنے کے بعد پھر وہی ٹھنڈا باسی کھانا جسے کھا کر میں بھیا کی دوکان چلا گیا تھا۔ وہاں سیکڑوں کام میرے انتظار میں رکے رہتے تھے جن سے نپٹتے نپٹتے تو ساڑھے نو بج ہی جاتے اور گھر آتے آتے دس۔ دس بجے وہی ٹھنڈا باسی کھانا۔ کھانا کھانے کے بعد بارہ ایک بجے تک جاگ کر پڑھنا۔ پھر صبح صبح وہی دوکان۔ اور نو بجے تک بھیا کا انتظار۔ رات میں جاگنے کے سبب جھپکی لگ جائے تو بھیا کی ڈانٹ پھٹکار۔

یہ سارے کام میری زیست کے اعضا بن گئے تھے۔ جس طرح جسم کے کسی حصے کو کاٹا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح میں بھی اپنی زندگی کے ان اعضا کو کاٹ نہ سکتا تھا۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ مجھے بھیا کا گھر چھوڑ دینا چاہئے اور بابا کے گھر جاکر رہنا چاہئے۔ لیکن یہ خیال بھی صرف خیال ہی تھا عمل کی نوبت کبھی نہ آئی۔ اور آ بھی کیسے سکتی تھی۔ اس ضعیفی میں بابا کے کاندھوں پر چار جانوں کا بوجھ تھا۔ یعنی میرے دو سوتیلے بھائی۔ سوتیلی ماں اور ایک وہ خود۔ ان چار جسموں کو زندگی سے جوڑے رکھنے کے لئے ان کے پاس صرف ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ اس کے بھی دروازے کب بند ہو جائیں کچھ کہنا مشکل تھا۔

جن دنوں میں بی۔ اے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔ جانے کیوں بھیا مجھ پر بہت مہربان ہو گئے۔ مجھ سے نرمی سے باتیں کرنے لگے اور میرے سر سے تمام "بیگاروں" کا بوجھ اٹھا لیا گیا۔

پہلے میرا کھانا میرے روم میں پہونچا دیا جاتا تھا لیکن اب بھیا اپنے ساتھ دسترخوان پر بیٹھانے لگے۔ پہلے کوئی پوچھتا تک نہ تھا لیکن اب ہمیشہ ہدائیتں دیتے رہتے ——
"دیکھو رات میں زیادہ دیر تک نہ پڑھا کرو۔ اس سے صحت خراب ہوجاتی ہے۔"

کبھی پوچھتے —— "ارے سلیم! تم نے اپنے کمرے میں کتنے پاور کا بلب لگا رکھا ہے؟ کیا کہا...... پچیس؟

ارے نہیں نہیں، اسے فوراً نکال پھینکو اور ساٹھ کا بلب لگاؤ۔ کم روشنی میں پڑھنے سے آنکھوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔"

لیکن نہ جانے کیوں مجھے بھیا کی مہربانی اور شفقت بھری باتیں صرف ایک رنگین دھوکا لگتیں ان کی باتوں سے بناوٹ اور تضع کی بو آتی —— لیکن کیوں؟ اس کا میرے پاس نہ کوئی جواب تھا نہ جواز۔

بھیا کے کمرے میں ایک ایسا کمرہ بھی تھا۔ جس میں بھابھی اور بھیا کے علاوہ اور کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ کیوں کہ بزنس کے راز اسی کمرے میں رکھے جاتے تھے۔ انہیں دنوں بھیا، مجھے ایک دن اسی کمرے میں لے گئے۔ مجھے سخت تعجب ہوا تھا۔ اور بھیا نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا تھا جیسے کہہ رہے ہوں، دیکھو میں نے تمہیں کتنی عزت بخشی؟

اس کمرے میں لے جاکر بھیا نے مجھے اپنے سامنے بیٹھا دیا اور بولے —— "تم نے کبھی اپنے بارے میں کچھ سوچا ہے سلیم؟"

میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ بھیا کیا کہنا چاہتے تھے۔ تب بھیا بولے ——
"بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ کچھ دنوں میں تم اپنی پڑھائی ختم کر لوگے، پھر تم کہاں رہوگے؟ کیا کروگے؟؟

ہمیشہ تو تم میرے ساتھ رہ نہیں سکتے۔"

بڑے بھیا کی بات مجھے عجیب سی لگی تھی۔ واقعی اس پر تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا لیکن سوچ کر کرتا بھی کیا۔ کوئی ذریعہ تو تھا نہیں۔ میں نے چپ چاپ اپنا سر

جھکالیا تب بھیا بولے۔ "ہاں!"

تم باپا سے اپنا حصہ کیوں نہیں مانگ لیتے۔ ہم دونوں بھائیوں کو تو انہوں نے ۲۵۔۲۵ ہزار روپے دیئے تھے۔ تمہیں تو وہ پڑھا بھی نہ سکے۔ اب کیا تمہارا حصہ بھی نہ دیں گے آخر تمہارا بھی تو کوئی حق ہے۔"

حق!

یہ لفظ میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گیا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ ہر انسان کے چند حقوق ہوتے ہیں۔ یکن واقعی ہوتے ہیں اس کا مجھے گمان تک نہ تھا۔ اسے تو میں صرف کتابوں کی چیز سمجھتا تھا جو امتحان دینے کے لئے رٹ لئے جاتے ہیں۔ اس روز بھیا نے احساس دلایا تو مجھے محسوس ہوا کہ واقعی میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ مجھے اپنے حقوق کی خاطر لڑنا چاہیئے اور اسی دن میں باپا سے ملنے گیا۔

میں باپا سے ملا بھی اور واپس بھی چلا آیا۔ لیکن دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت نہ کرسکا۔ باپا کی حالت نے میرے تمام خیالات کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ میری زبان تھام لی تھی میں باپا کے پاس پہونچا تھا تو وہ ایک میلی کچیلی پرانی سی دھوتی اور کرتا پہنے تھے جس کا دامن جھڑ چکا تھا۔ ان کے چہرے پر مجھے لکیروں کا جال بری طرح پھیلا نظر آیا تھا اور بات کرتے کرتے ان کی پیلی پیلی آنکھیں سیاہ حلقوں کے درمیان تھرتھرا کر ایک دم اس طرح ساکت ہو جاتی تھیں جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔

میں باپا کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر واپس چلا آیا۔ اس روز پہلی بار میرے دل میں اپنے بھائیوں کے خلاف نفرت کی چنگاریاں اڑی تھیں۔ بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا ہزاروں میں کھیل رہے ہیں۔ منجھلے بھیا اچھی سرکاری نوکری پر ہیں۔ اس کے باوجود باپا کی یہ حالت؟ مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ میرے تینوں بڑے بھائی یہ کیسے بھول گئے کہ جو پھل ان کے ہاتھوں میں ہے وہ اسی غریب باپ کا دیا ہوا ہے پھر بھی بڑے بھیا باپا کی جانب بھوکی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن جس کے پاس نہانے کو نہ ہو وہ نچوڑے گا

کیا؟

اسی روز بھیا نے مجھے بلا کر پوچھا تھا۔

" تم باپا کے پاس گئے تھے؟ کیا کہا انہوں نے؟؟ "

میں نے صرف " ہاں " کہا اور میری دبی دبی بغاوت بھری آواز نے بھیا پر سب کچھ ظاہر کر دیا۔

بھیا کچھ دیر تک کچھ سوچتے رہے پھر بولے " سلیم! تم لوگوں کو نہیں جانتے؟ "

وہ سب ناٹک ہے ناٹک۔ صرف دکھلاتے ہیں کہ بہت غریب ہیں۔ ابھی تجوری میں ہزاروں کے زیورات پڑے ہیں، گاؤں ہے کھیت ہے، مکان ہے۔ لیکن تم ابھی بچے ہو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے دراصل اس وقت تمہاری سوتیلی ماں کا جادو باپا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

میں بھیا سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ جانے کیوں بھیا کے سامنے میری آواز ہی بیٹھ جاتی ہے۔ اس دن کے بعد سے بھیا مجھے برابر ٹوکنے لگے۔ لیکن میں بہانے بنا دیتا۔ اسی زمانے میں ایک ایسا حادثہ پیش ہوا جس نے مجھے اور بھی چوکنا کر دیا۔ بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا میں کچھ کھٹ پٹ ہو گئی۔ بڑے بھیا نے چھوٹے بھیا کو بزنس سے الگ کر دیا اور جب حساب کتاب ہوا تو چھوٹے بھیا کو ایک نہایت قلیل سی رقم ملی۔ دراصل حساب کتاب میں ادھر ادھر کر دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بی۔ اے کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں تھا۔ دوسری طرف بڑے بھیا مجھ پر برابر دباؤ ڈال رہے تھے کہ باپا سے اپنا حصّہ لے کر انکے ساتھ بزنس کروں۔ لیکن چھوٹے بھیا والا واقعہ سامنے تھا اور باپا کے پاس روپے بھی نہ تھے ایسی صورت میں یہی بہتر تھا کہ نوکری تلاش کی جائے۔ یہ بھی ایک اتفاق کی بات تھی کہ مجھے نوکری مل گئی۔ ورنہ آج کل آسانی سے نوکری کہاں ملتی ہے۔ اب اس خبر کو بڑے بھیا تک پہونچانا بھی جوکھم کا کام تھا۔ کیونکہ یہ خبر ایسی تھی کہ جو بھیا کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیتی۔

بڑے بھیا کی سخت مخالفت کے باوجود میں نے سروس جوائن کرلی اور دوسرے شہر چلا گیا۔ شروع شروع میں پاپا کو میں نے پچاس روپے بھیجنے شروع کئے۔ میں جانتا تھا کہ پچاس روپیوں کی کچھ حقیقت نہیں۔ لیکن اتنے میں پاپا کم از کم اپنی صحت کا خیال تو رکھ ہی سکتے تھے۔

یہ سلسلہ دو سال تک چلتا رہا لیکن جب میں ایک سے دو ہو گیا تو اخراجات ایک دم سے بہت بڑھ گئے۔ پہلے ڈھائی سو میں کام چل جاتا تھا۔ لیکن اب چار سو خرچ ہونے لگے۔ کبھی کبھی تو میں جھنجلا اٹھتا ——— آخر پاپا کے اور بھی تو بیٹے ہیں وہ کیوں ان کی مدد نہیں کرتے؟

صرف میں ہی کیوں؟

لیکن جیسے ہی میں ان خیالات کے دائرے سے باہر آتا، چونک پڑتا کیا یہ سب میں سوچ رہا تھا..... میں!"

آخر بہت کھینچ تان کرنے کے بعد مجھے پاپا کو ہی بھیجے جانے والے روپیوں میں کٹوتی کرنی پڑی۔ کیوں کہ کوئی دوسرا فاضل خرچ مجھے ایسا نظر نہ آیا جسے چھوڑ دیتا۔ تب سے پاپا کو صرف پچیس روپے ہی جانے لگے۔ لیکن جب بات فرحت ہی تک محدود نہ رہ کر منا تک جا پہونچی تو وہ پچیس روپے بھی بوجھ سے لگنے لگے۔ اور آخر میں وہ پچیس روپے بھی بند ہو گئے۔

آج اس بات کو پانچ سال ہو گئے۔ میں دور دراز کا سفر طے کر کے تین روز میں پاپا کے پاس پہونچا ہوں۔ اور اس وقت میں پاپا کے تقریباً نیم مردہ جسم کو دیکھ رہا ہوں تو نہ جانے میرے دل میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔

لیکن ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا ہے کر رہا ہوں۔ اچھے ڈاکٹر، دوائیوں کا انبار اور تمام ضروری چیزیں موجود ہیں۔ بڑے بھیا اور منجھلے بھیا بھی ہر قسم کی مدد کر رہے ہیں۔

لیکن — ؟

کیا یہ سب میں باپا کے لئے کر رہا ہوں ؟

میرے دل میں جانے کیسے یہ خیال در آیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں، بڑے بھیا، منجھلے بھیا، اور چھوٹے بھیا ایک ہی خلا کے انسان ہیں۔ ہم لوگ تو یہ سب کچھ دکھانے کو کر رہے ہیں کہ لوگ بعد میں یہ نہ کہیں کہ بیٹوں نے مرتے باپ کو پانی کے لئے بھی نہ پوچھا۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ باپا اب پہلے سے ٹھیک ہیں۔

میرے دونوں سوتیلے بھائی بہت خوش ہیں۔ باپا کی سُدھرتی حالت دیکھ کر بڑے بھیا اور منجھلے بھیا بھی خوش ہیں۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں خوشی نہیں بلکہ تفکر کے سائے ڈول رہے ہیں۔

اور میں ..... کیا خوش ہوں ؟

میں اپنے دل میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ لیکن وہاں خوشی کی کرن نہیں۔ بلکہ جیسے جیسے باپا کی طبیعت سُدھرتی جا رہی ہے۔ میرے دل میں خوف سما رہا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ باپا اب فوراً اٹھ بیٹھیں گے اور کہیں گے —

"ارے سلیم !"

میرے بیٹے .....

تم میرے بیٹے ہو کر بھی میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔"

مانا کہ آج کل میں آٹھ سو روپے کما رہا ہوں پھر بھی باپا کو دینے کے لئے ہر ماہ سو روپے کہاں سے آئیں گے ؟

لیکن ویسا کچھ نہ ہوا۔ باپا ٹھیک ہو گئے۔ اس بارے میں انہوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔

صرف فرحت کی خیریت پوچھی، منا کے بارے میں پوچھا اور خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔

پھر بھی خدشہ تو لگا ہی رہتا ہے جانے کب باپا پیسوں کا ذکر چھیڑ دیں۔

لیکن بابا نے ویسا کچھ بھی نہ کہا۔ یہاں تک کہ میں جانے کے لئے تیار ہو گیا کیوں کہ میری چھٹیاں ختم ہو گئیں تھیں۔ جاتے وقت میں نے سوچا کہ مجھے بھیا سے مل لینا چاہئے اور میرے قدم ان کے گھر کی جانب اٹھ گئے۔ جب میں بھیا کے گھر پہونچا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں گھر میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ اندر سے بھیا کے بولنے کی آواز سُنائی دی اور میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ بھیا کسی سے کہہ رہے تھے۔

"اسی بات کا تو افسوس ہے کہ بڈھا بچ گیا۔ میرے ایک ہزار روپئے مفت میں برباد ہوئے اس وقت ایک ہزار بزنس میں ڈالتا تو پانچ ہزار بن جاتے۔"

"اب کون جانتا تھا کہ وہ بچ ہی جائیں گے۔"

یہ منجھلے بھیا کی آواز تھی۔

اچانک ہی میرے سامنے لال پیلی چنگاریاں سی اڑیں اور میں بڑے بھیا سے ملے بغیر ہی واپس ہو گیا۔ لوٹتے وقت میں نے سوچا کہ مجھے بھیا جیسے انسان سے نفرت کرنی چاہئے لیکن بہت دور تک جانے کے باوجود مجھے اپنے اندر بھیا کے لئے نفرت کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

ریت کے نیچے بہتا دریا

رحمان شاہی

سانولی چولہا جلا رہی تھی، اور مانس کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا...... آسمان پر کالی گھٹا چھائی تھیں۔ رِم جِھم پھوار صبح کے آنچل کو دھیرے دھیرے بھیگا رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ـــــ شوخ کی کاجل بھری آنکھیں پانی سے دھل رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ ...... ہلکے ... ہلکے ...... کتنا دلفریب منظر تھا۔

دفعتاً اس نے مڑ کر سانولی کو دیکھا۔ وہ منہ سے چولہا پھونک رہی تھی۔ شاید لکڑی گیلی تھی لپک کر نہیں جل رہی تھی۔ بہت سارا دھواں اگل رہی تھی، اور اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی گر رہا تھا ـــــ وہ بار بار اپنے ریشمی دوپٹے سے خشک کرتی تھی پھر پہلے کی طرح چولہا پھونکنے لگتی تھی۔

مانس کو بہت اچھا لگا اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی کا گرنا، اور ریشمی دوپٹے سے خشک کرنا، پھر چولہے کا پھونکنا...... بہت اچھی لگ رہی تھی ایسے میں وہ بے حد پیاری۔ من میں ایک عجیب سی گدگدی جگانے والی پیاری

وہ کھڑکی کے باہر کا دلفریب منظر بھول گیا، اور دلچسپی سے دیکھنے لگا اس کو......

جبھی اسے زور کی کھانسی اٹھی۔ شاید ڈھیر سارا دھواں حلق کے اندر چلا گیا تھا۔ وہ چھاتی کو پکڑے بے تحاشہ کھانستی ہوئی کھڑکی کے پاس آ گئی، اور زور زور سے تازہ

ہوا پھیپھڑے میں لینے لگی۔ پھر ہنستی ہوئی بولی ...." بابوجی، یہ سالی لکڑی ایکدم میرے سمان ہے۔ بھک کر جلتی ہے اور نہ بجھتی ہے کیول دھواں اگلتی ہے۔۔ ے ...... لیکن...."

وہ کچھ کہتے کہتے اچانک چپ ہو گئی۔ پھر فوراً بولی ...... لیکن بابوجی، میں اسے جلا کر رہوں گی۔"

اور وہ ایک بار پھر چولہا پھونکنے لگی۔ پوری لگن اور اعتماد کے ساتھ، اور وہ سوچنے لگا..... کتنی ضدی ہے یہ لڑکی۔ ٹوٹ پھوٹ کر بھی مایوس نہیں ہوتی پھر بھی لکڑی سمجھتی ہے خود کو...... دھواں اگلتے جل کر راکھ ہو جانے والی گیلی لکڑی......

سال بھر پہلے کی بات ہے۔ وہ بس سے سفر کر رہا تھا۔ بس چلتے چلتے ایک جگہ رکی تھی تو کچھ لوگ اترے تھے۔ کچھ نئے لوگ چڑھے بھی تھے۔ ان میں سانولی بھی تھی، وہ مالنس کے بغل میں خالی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی، اور مالنس نے چونک کر اس کو دیکھا تھا، اور بہت دیر تک ٹک ٹک دیکھتا ہی رہا تھا۔ سانولی کا چہرہ ہی کچھ ایسا تھا۔ بالکل اس کی ہونے والی پتنی جیسا۔ کوئی فرق نہیں۔ ویسی ہی خوب صورت بڑی بڑی آنکھیں، کھڑی ناک، شہد میں ڈوبے ہوئے سے میٹھے میٹھے ہونٹ اور گلاب کی سُرخی لئے بھرے بھرے گال۔ کسا ہوا سڈول شریر اور رنگ ایکدم سانولا۔

وہ جیسے سانولی میں کھو سا گیا تھا۔ سانولی نے کوئی دھیان نہ دیا تھا، گم سم بیٹھی رہی تھی وہ لیکن جب مالنس دیکھتا ہی رہا تھا تو وہ پوچھ بیٹھی تھی ...."کیا بات ہے بابو.....؟"

اور وہ چونک پڑا تھا اس اچانک سوال پر، اور ایسے نروس ہو گیا تھا جیسے کچھ چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ وہ گھبرا کر جلدی سے بولا تھا۔" کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔"

وہ پھر کچھ نہیں بولی تھی۔ لیکن میٹھی سی ایک مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر یوں ٹنگ گئی تھی، جیسے اس نے مالنس کے مابھیتر کی بات جان لی ہو.....

کچھ دیر بعد بس اپنی منزل کے لئے روانہ ہو گئی تھی، اور سانولی نے خود گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تھا پھر راستہ بھر دونوں اس طرح باتیں کرتے رہے تھے جیسے ایک دوجے

کے لئے اجنبی نہ رہے ہوں، بلکہ برسوں کے آشنائی ہو۔

سفر ختم ہوا تو اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ گیارہ بجے مالنی کو انٹرویو کیلئے جانا تھا۔ یہ بات اس نے سانولی کو بتادی تھی، اور سانولی نے باقی وقت گذارنے کے لئے اپنے گھر چلنے کو کہا تھا۔ وہ گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس کو جانتا نہیں تھا۔ اور اس کے بارے میں کوئی بھی بات نہیں معلوم تھی۔ قلیل سی ملاقات تھی۔ خوف محسوس ہوا تھا اس کو۔ لیکن سانولی نے بہت ضد کی تھی۔ اس کی ضد میں بے پناہ خلوص تھا، پیار اور اپنا پن بھی، اور وہ مجبور ہو گیا تھا جانے کے لئے۔

گھر پہونچ کر معلوم ہوا تھا اس کو، کہ سانولی اسی شہر کی ہے، اور اس بھری دنیا میں اس کا کوئی اپنا نہیں ہے، تنہا زندگی گذار رہی ہے۔ ایک اپنا تھا، جس سے اس نے پریم کیا تھا، اور سب کچھ گنوا بیٹھی تھی۔ تب سے پریم اور پریم شبد سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے من میں آتا تھا کہ کوئی اس سے ٹوٹ کر پیار کرے...... سچا پیار۔ لیکن اب تک کوئی ایسا نہیں ملا تھا، اور وہ بے آب مچھلی کی طرح چھٹپٹا رہی تھی۔

اور ایسی حالت میں اس کی ملاقات کسی ایسے شخص سے ہوتی، جس کے دل میں وہ اپنے لئے اپنائیت محسوس کرتی تو اس کی طرف کھنچی چلی جاتی تھی، اور مسرت کے قلیل لمحات کو پاکر اپنی زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں کو بھول جاتی تھی، اور یوں محسوس کرتی تھی جیسے اس کے وجود کا سوکھا پن دور ہو گیا ہو، بہار آگئی ہو اس میں۔

مالنی سے اس کی مختصر سی ملاقات تھی لیکن مالنی کے سراپا میں اس نے اپنے لئے بے پناہ کشش اور اپنا پن محسوس کیا تھا۔ اور من ہی من میں بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔ زندگی کی اذیت ناک تنہائیوں سے نجات بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ پھر بھی مالنی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ جانتی تھی کہ وہ بھی ایک مرد ہے۔ عام مردوں جیسا نہ ہو، پھر بھی مرد ہے۔ شاید اسی لئے جب مالنی اس سے کچھ پوچھتا تو وہ اپنے وجود کے بکھراؤ کو سمیٹ کر صرف مسکرا

دیتی تھی۔ کبھی مسکرا کر ہنستی بھی اور کبھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی تھی۔ مالنس اس الجھی سی شخصیت کو دیکھ کر اور محسوس کر کے بہت ساری باتیں سوچنے لگتا تھا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہونچ پایا تھا۔

اس طرح بہت وقت گذر گیا تھا۔ پھر جب گیارہ بجے تو وہ انٹرویو دینے چلا گیا تھا۔ انٹرویو دینے کے بعد پھر اس سے نہیں مل سکا تھا۔ اپنے شہر لوٹ گیا تھا۔ لیکن اس کو بھولا نہیں تھا۔ وہ مالنس کے ذہن کے کسی حصے میں چپک کر رہ گئی تھی۔

ایک سال کے بعد اسے دوبارہ اسی شہر میں آنا پڑا۔ اس بار بھی انٹرویو دینے کے لئے ہی آیا تھا۔ چار بجے صبح میں بس اسٹینڈ پر اترا تھا۔ گیارہ بجے انٹرویو کے لئے حاضر ہونا تھا لہٰذا باقی وقت گذارنے کے خیال سے سیدھا سانولی کے گھر پہونچ گیا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دھیرے سے کھٹکھٹایا تھا۔ ایک بار نہیں کئی بار کھٹکھٹایا تھا۔ تب جاکر دروازہ کھلا تھا سانولی نے ہی کھولا تھا۔ اور چونک پڑی تھی۔ کچھ گھبرائی بھی تھی وہ تیزی سے مڑی تھی اور بستر پر لیٹے ہوئے ادھ ننگے ادھیڑ عمر کے ایک بدشکل آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تھا۔ اور کھینچتی ہوئی دروازے پر لائی تھی۔ پھر زور سے دھکا دے کر باہر کر دیا تھا۔ مالنس سب کچھ حیرت سے دیکھتا رہا تھا، سانولی اور اجنبی کو بھی۔ اجنبی ...... وہ ادھیڑ عمر کا بدشکل آدمی بہت بدمعاش لگ رہا تھا، سانولی کو بھدی اور گندی گالیاں بکنے لگا تھا۔ تب سانولی نے دس دس کے پانچ نوٹ اس کے منہ پر پھونک دیئے تھے، اور مالنس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا تھا۔ پھر دروازہ بند کر دیا تھا پھر .... پھر بند کمرے میں مالنس اور سانولی .... دونوں ...... بہت دیر تک اک ٹک ایک دوجے کو دیکھتے رہے تھے .... بن بولے، اپنی اپنی آنکھوں سے بہت کچھ کہتے بھی رہے تھے۔ پھر بھی ادھوری ہی رہی تھی ان کی باتیں ...... اور ڈھیر سارے سوالات ڈستے رہے تھے دونوں کو ناگ بن کر .....

بہت دیر بعد سانولی نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔ پھر بولی تھی۔

"بابوجی، اب تو تم سب کچھ جان ہی گئے....."

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چپ چاپ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا ہی رہا تھا۔ تب وہ چھٹپٹا کر بولی تھی۔

"ایسے مت دیکھو بابوجی، مت دیکھو...... میرے بھیتر بہت اندھیرا ہے....."

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ سینے میں زور کا درد ہونے لگا تھا، اور وہ........

مانس گم سم دیکھتا رہا تھا اس کو۔ بن بولے بہت کچھ بولتا رہا تھا اس کو۔ پھر بہت دیر کے بعد اس کے سینے کا درد کم ہوا تھا تو نہ معلوم کیا سوچ کر ہنسنے لگی تھی۔ دیر تک ہنستی رہی تھی۔ پھر بے تحاشہ ہنستے ہنستے رونے لگی تھی۔..... پھر اچانک چپ ہو گئی تھی۔ ایکدم شانت اور چائے بنانے کے لئے چولہا جلانے لگی تھی، اور مانس سوچنے لگا تھا..... "یہ لڑکی ہے یا ٹھہری ہوئی ندی۔ ہوا چلی تو ندی کا بدن کانپنے لگے، اور ہوا رکے تو شانت ہو جائے...."

"دیکھو بابوجی دیکھو، کیسے لہک اٹھی سالی...."

دفعتاً وہ خوشی سے چلائی، اور مانس کے ہنسی آ گئی اس کی اس ادا پر۔

وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا اور وہ چونک کر عجیب نظروں سے اسکو دیکھتی رہی تھی۔ جب ہنستے ہنستے تھک کر چپ ہو گیا تو وہ فوراً بولی۔

"بابوجی تم اس طرح مت ہنسا کرو، برے لگتے ہو، بہت برے....."

مانس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس گہری نظروں سے دیکھنے لگا اس کو۔ وہ چولہے پر چائے دانی چڑھاتے ہوئے بولی۔

برا مت مانو گے بابوجی، تم بھلے آدمی ہو اور بھلا آدمی اس طرح ہنستا ہے تو برا لگتا ہے بہت برا...... اور مجھ کو دکھ ہوتا ہے۔"

وہ خاموش ہو کر سوچنے لگی۔ مانس بھی چپ تھا۔ شائد وہ بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر بولی تھی۔

"بابوجی، ناری ذاتی پریم کی ماری ہوتی، کیول پریم۔ ہر روپ میں پریم کرتی ہے

وہ، اور مرد ذات کو جیون کی ان لذتوں سے آشنا کراتی ہے جس کا کوئی بدل نہیں، کوئی مول بھی نہیں، پھر بھی تم مرد ذات ناری کو کیول شریر سمجھتے ہو۔ شریر...... اس شریر میں ایک دل بھی ہے...... جو دھڑکتا ہے۔ تڑپتا ہے۔ لیکن اس کا احساس نہیں ہے کسی کو......"

وہ چپ ہوئی تو مالنس کو کوئی بات یاد آگئی۔ وہ فوراً بولا۔۔

"تم نے کسی سے پریم کیا تھا نا......؟"

"ہاں بابوجی......" وہ کھوئی کھوئی سی بولی "میں نے پریم کیا تھا اور جیون کی وہ مٹھاس دینے کا وچن بھی دیا تھا، جو کسی مرد کو ایک عورت ہی دے سکتی ہے۔"

وہ چپ ہوگئی۔ پھر فوراً بولی "لیکن بابوجی، پہلے میں نے وشواش کیا تھا۔ پھر پریم۔ اور وشواش ہی تو پریم کا جنم ہوتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا......؟" وہ چپ ہوئی تو مالنس نے پوچھا۔ وہ کچھ اور گہری نظروں سے سانولی کو دیکھنے لگا تھا۔

"پھر......" اس کے ہونٹ بہت دھیرے سے پھڑپھڑائے۔ اس نے اپنی خوب صورت پلکیں اٹھا کر مالنس کو دیکھا۔ پھر دھیرے دھیرے بولی "پھر وشواش کی کوکھ سے وشواش گھات نے جنم لیا اور سب کچھ پل میں ختم ہوگیا۔"

وہ چپ ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ مالنس نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔ اس کا من بہت دکھی ہوگیا تھا۔

بہت دیر کے بعد پھر بولی۔

"بابوجی، ایک بات بتاؤ گے......"

"پوچھو......" مالنس نے دھیرے سے کہا اور اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں

وہ بولی۔

"سال بھر پہلے تم بس پر ملے تھے تو ایک ٹک مجھے دیکھتے رہے تھے......"

"یوں ہی ....." مالنس نے جھوٹ بول دیا۔ وہ پھر بولی۔

"نہ بابو جی، کچھ تو ایسی بات ہے، جس کارن تم مجھے بار بار دیکھتے رہے تھے اور اس وقت میرے پاس بھی ہو۔

"صرف اس لئے کہ تم سانولی ہو اور میری ہونے والی پتنی جیسی لگتی ہو۔ وہی رنگ، وہی روپ۔" مالنس نے کچھ سوچ کر سچ بات بتادی اور وہ عجیب نظروں سے اس کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر بہت سارا پیار تھا، اور آنکھوں میں آشاؤں کی کرنیں۔ وہ بولی ــــــ

وہ بالکل مجھ جیسی ......؟"

"ہاں! ایک دم تمہارے جیسی سانولی۔ بہت بھولی بھالی، بے حد پیاری۔ میں اسے پیار سے سانولی کہتا ہوں ....." وہ کچی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم اسے کتنا چاہتے ہو بابو جی.....؟"

سانولی نے دھیرے سے پوچھا، اور مالنس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی، اور آنکھوں میں بے پناہ پیار ــــــ

مالنس کو محسوس ہوا جیسے یہ سوال سانولی نے اپنے لئے کیا ہے۔ اپنے بارے میں پوچھ رہی ہے وہ۔

وہ چپ رہا سانولی بولی۔

"بتاؤ نا بابو جی، چپ کیوں ہو.....؟"

"میں اسے بہت چاہتا ہوں ....." مالنس بولا ــــــ "بہت، اتنا کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم ...."

"سچ بابو جی ....." مارے خوشی کے چیخ پڑی، ایسے جیسے یہ بات اس کے لئے کہی گئی ہو مالنس کو کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ وہ جلدی سے بولا ــــــ

"وہ میری پتنی ہے نا..... میری ہونے والی جیون ساتھی....."

سانولی ایک دم بجھ سی گئی۔ دل میں کہیں پر گھونسا سا لگا تھا۔ اس کی آنکھیں مالنس

پر اٹکی ہوئی تھیں۔ بہت دھیرے سے وہ بولی ـــــــ

"دھینہ ہے وہ، جس کے تم سہاگ ہو...."

مالنس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اس کو دیکھتا رہا۔ وہ مرجھائی ہوئی بیٹھی تھی۔ چہرے پر بے پناہ کرب کے سائے ابھر آئے تھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ وہ چولہے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جہاں گیلی لکڑی سلگ سلگ کر راکھ بن رہی تھی۔ اور چائے دانی میں پانی کھول رہا تھا۔ اس میں سے بھانپ نکل رہی تھی۔

وہ آہستہ سے اٹھی اور چائے دانی نیچے اتار دی۔ پھر ڈھکن ہٹا کر اس میں چائے پتی اور چینی ڈالی اور چولہے پر رکھ دی۔ آنچ بہت دھیمی ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے چائے دانی پھر اتار دی اور پاس رکھی دونوں پیالی میں چائے انڈیل دی۔ ایک پیالی خود لی اور دوسری مالنس کو بڑھاتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"دودھ نہیں ہے ایسے ہی پی لو...."

مالنس نے پیالی لے کر اس کو دیکھا۔ وہ چپ چاپ چائے پی رہی تھی۔ شاید کچھ سوچ بھی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں غور و فکر میں ڈوبی تھیں۔

مالنس نے پھر چائے کو دیکھا۔ اسے چائے کا رنگ اور سانولی کا رنگ ایک سا لگا سانولا.... اور سانولا رنگ اس کی کمزوری تھی اور پیار بھی۔

اس نے پیالی اپنے ہونٹوں سے لگا لی اور چسکی لے کر پینے لگا۔ بہت اچھی تھی چائے ایک عجیب سا سرور اس پر چھاتا چلا گیا۔ پھر.... پھر جب چائے ختم ہوئی تو اس نے چونک کر گھڑی دیکھی گیارہ بجنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا ـــــــ

"انٹرویو کا سمے ہونے جا رہا ہے۔ اب میں جاؤں گا...."

بیگ اٹھا کر وہ دروازہ کی طرف بڑھا۔ سانولی نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مالنس دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ ایک نظر سانولی کو دیکھا، اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبھی سانولی بولی۔

"بابوجی، جاتے جاتے ایک وچن دوگے .....؟"

مانس کے آگے بڑھتے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر سانولی کو دیکھا، عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کے چہرے پر۔ اس نے کچھ سوچا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

"ہاں! لیکن کوئی ایسا وچن مت مانگنا جو میں تمہیں نہ دوں، اور مجھے دکھ ہو۔ کوئی ایسی چیز بھی مت مانگنا جو صرف میری پتنی کے لئے ہو۔ اس کی چیزوں میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتا....."

"اچھا بابوجی، اب جاؤ، تمہیں دیر ہو رہی ہے....."

سانولی نے دھیرے سے کہا۔ وہ بولا.....

"لیکن تمہارا وچن.....؟"

"وہ تو مجھے مل گیا....." وہ آہستہ ہنس کر بولی۔ اس کے ہونٹوں پر بے نام سی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

مانس بولا —

"لیکن.....؟"

"ہاں بابوجی....." سانولی بولی

"سچ کہتی ہوں، تم نے مجھے وہ سب کچھ دے دیا، جو میں مانگنا چاہتی تھی۔ اب جاؤ....."

ور اس نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔

طوفان سے پہلے او طوفان کے بعد

خورشید حیات

باہر کے سارے دروازے بند تھے۔ اور اندر ایک ہیجان سا برپا تھا۔ سکون کی تلاش جاری تھی۔ اور ہر ایک کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ گھبرایا گھبرایا سا۔ شاید کہ وہ کسی بڑے خطرے کے انتظار میں تھے۔ اچانک باہر کے دروازے پر دستک ہوئی، اور سب لوگ سراسیمہ سے ہو کر خاموش ہو گئے۔

دستک ہوتی رہی اور لوگ سنتے رہے۔ کیوں کہ وہ ڈرے ہوئے تھے۔ باہر کا دروازہ کھلنے پر کہیں طوفان نہ نازل ہو جائے۔

مگر طوفان کا راستہ کب روکا جا سکتا ہے۔ طوفان کو جب نازل ہونا ہوتا ہے تو نازل ہو کر رہتا ہے۔ طوفان کا راستہ بدلا جا سکتا ہے طوفان کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ مگر طوفان کو روک لینا اب تک ممکن نہیں ہو سکا

دروازہ پر دستک تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور محسوس ہوتا تھا کہ دروازہ ٹوٹ جائے گا، سارے لوگ خوف و ہراس کے مارے ہوئے اوپر کی منزل پر جانے لگے۔ اور باہر دستک کی آواز شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔ لوگوں کو محسوس ہوا کہ وہ غلطی کر رہے ہیں۔ دروازہ کھول ہی دینا چاہئے۔ مگر دروازہ کھلنے پر مدافعت کی کیا صورت ہو گی اس پر کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ گھبراہٹ میں غور کرنے کی فرصت بھی کسے تھی۔

اندر کے ایک جیالے نے دروازہ پر آکر پوچھا ـــــ کون ہے؟

دستک رک گئی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ کیوں کہ دروازہ پر دستک دینے والا اجنبی تھا۔

اور اجنبی کے پاس شناخت کے لئے کچھ نہ تھا۔ کہ وہ اندر والے کو تبلا سکتا کہ وہ کون ہے۔

خاموشی نے تجسس، تحیر، اور خوف میں اضافہ کیا۔ مگر اس جیالے کے آگے بڑھنے سے اتنا ہوا تھا کہ اندر کے سارے لوگوں کو طاقت مل گئی تھی۔ اور وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آکر دروازہ کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔

ایک نے کہا ـــــ دروازہ کھول دو

دوسرے نے کہا ـــــ سالا کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔

تیسرے نے کہا ـــــ وہ تنہا لگتا ہے۔ ہم لوگ اتنے ہیں وہ کیا کرے گا؟ کھول دروازہ۔

چوتھے نے کہا ـــــ ذرا غور کرلو، کوئی آفت نازل نہ ہوجائے۔

پانچویں نے کہا ـــــ کیا ہم سب مل کر آفت کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتے۔ کھول دو دروازہ کیا کرے گا۔ موت برحق ہے۔ موت پر ایمان ہے۔ تو وقت پر آئے گی۔"

چھٹے نے کہا ـــــ مصلحت بھی کوئی چیز ہے۔ میاں مصلحت سے کام لو۔

ابھی یہ سرگوشیاں ہو ہی رہی تھیں کہ دستک پھر شروع ہوگئی۔ اور اندر والوں میں سے اس جیالے نے دروازہ کھول دیا۔

باہر کھڑا فقیر اپنا اجنبی چہرہ لئے ہوئے ہاتھ پھیلاتا ہوا اندر کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ اور اندر کے لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ فقیر کچھ عجیب شکل و شباہت کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ عجب قسم کی کشش تھی۔ وہ بڑا باوقار اور رعب دار تھا لوگ پیچھے ہٹے اور اس نے انہیں تسلی دی۔

گھبراؤ نہیں میں بھی انسان ہوں تمہارے ہی جیسا۔ میں تمہارا کچھ لینے نہیں آیا ہوں۔ کچھ دینے آیا ہوں۔ تم بے چین تھے سکون کے لئے راستہ تلاش رہے تھے۔ اندر کی دنیا کے سمٹے سمٹائے لوگ تمہیں باہر کی دنیا کی دعوت دینے آیا ہوں۔ چلو میرے ساتھ آگے قدم بڑھاؤ، گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری قیادت کروں گا۔

سارے کے سارے لوگ جو گھبرائے ہوئے تھے ۔ ایک سکون کا احساس کرنے لگے ۔ مگر تشکیک کی منزل ابھی بھی اپنا کام کر رہی تھی ۔ مشکوک نگاہیں ابھی بھی انہیں گھور رہی تھیں ۔

اس کے پیچھے چلنا کہاں تک مناسب ہوگا ۔ یہ سکون کہاں سے دے پائے گا ۔ اس کے پاس ہے کیا ؟ چہرہ بھی ہے تو عام انسانوں سے الگ ۔ وضع قطع بھی ہے تو ہم سبھوں سے جدا ، نہ جانے کہاں لے جائے گا یہ ؟ کس منزل پرلے جا کر چھوڑے گا ہمیں ؟ مجھے کچھ نہیں چاہیے ۔ تم واپس جا سکتے ہو ۔ ایک نے ہمت کر کے کہا ۔

دوسرے نے کہا ــــــــــ نہیں ، نہیں تم جا سکتے ہو ! تم کیوں چلے آئے ۔ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ ہم سکون کی تلاش میں ہیں ۔

تیسرے نے کہا ــــــــــ یہ کوئی بہت بڑا جادوگر لگتا ہے ۔ ہماری باتوں کو جان چکا ہے اور اب کسی گمراہی کے راستے پر لے جانا چاہتا ہے ۔ نہیں ، ہم نہیں جائیں گے ، تم تنہا جاؤ ۔

نووارد کو کوئی ذریعہ اب تک حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ ان کا اعتماد حاصل کر سکتا اس نے کہا ۔ شک مت کرو ۔ دیکھو میری طرف دیکھو ، میں تمہارا کچھ لینے نہیں آیا ہوں ۔ میں تم کو غلط راستے پر بھی لے جانے نہیں آیا ۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارے سکون کی خاطر آیا ہوں ۔

ایک نے پھر دریافت کیا ــــــــــ سائے تم کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم سب اضطراب میں ہیں ۔ اور سکون کی تلاش میں ہیں ۔ نہیں بھائی ۔ اپنا راستہ لو ، ہم دروازہ بند کریں گے ۔

نووارد نے کہا ــــــــــ دروازہ بند نہیں ہوتا ، میرے عزیز ، دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا ۔ دروازہ بند کرنے سے کئی دروازے کھل جائیں گے ۔ اور ہر دروازہ تمہیں نئی آواز دے گا ۔ اور اس وقت فیصلہ تمہارے بس میں نہیں ہوگا ۔ تم پاگل ہو جاؤ گے ، تمہاری قوت فکر تمہیں جواب دے جائے گی ۔ ایک ہی راستہ ہے دروازہ کھلا رہنے دو ۔ اور پھر دیکھو کہ فطرت کیا چاہتی ہے ؟ ہم کیا چاہتے ہیں ؟ تم کیا چاہتے ہو ــــــــ ؟

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مغرب کی جانب سے آسمان میں بادل امنڈ آئے ،

اور تاریکی چھاگئی۔ زناٹے دار ہواؤں نے دروازے کے پٹ توڑ ڈالے، اور بڑے زوروں کی گرج آسمان میں پیدا ہوئی۔

طوفان آگیا، طوفان آگیا!!

ہر طرف آندھیاں ہی آندھیاں ہیں۔ کس کمرے میں جاؤ گے نووارد نے کہا۔ کس دروازے کو بند کرو گے؟ نووارد نے سوال کیا۔ کہاں پناہ لوگے میرے عزیز؟ طوفان بڑھتا جا رہا ہے۔ جلدی فیصلہ کرو۔ اب تو دیواریں ہلنے لگی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا گھر منہدم ہو جائے اور تم .....

کہو! کہاں ہے سکون؟ کس کس دروازے کو بند کرو گے؟ اب تو صحرائے بسیط میں طوفان کا سامنا کرنا تمہاری قسمت ہو چکا ہے۔ چلو میدان کی جانب ہم بھی نکلیں، تم بھی نکلو، دھرتی ڈول رہی ہے۔ ہیبت ناک آواز اٹھ رہی ہے۔ "پل میں پرے ہونے کو ہے۔ بادلوں کی گرج، ہواؤں کے زناٹے داری کی آواز۔ انتشار، انتشار ـــــ انہدام، انہدام ـــــ تخریب، تخریب ـــــ اور سکون کی تلاش میں تمہارا ذہن اب مفلوج ہو جائے گا عزیزم! چلو چلو، وہ دیکھو عقب کی دیوار گر پڑی ـــــ آگے کا راستہ ابھی کھلا ہے بند نہیں

سب لوگ نووارد کے پیچھے پیچھے خاموشی کے ساتھ چلنے لگے۔ کہ اس وقت بچاؤ کا بس یہی ایک راستہ تھا۔

نووارد انہیں لے کر آگے بڑھتا رہا۔ اور طوفان کے اس سرحد پر لا کھڑا کر دیا۔ جہاں شعلے برس رہے تھے۔ دماغ جل رہا تھا۔ انسان، انسان نہ رہنے پر مجبور تھا۔ کوئی صورت نہ تھی کہ حالات کو سازگار بنایا جاسکتا۔

طوفان کب رکے گا؟ کون جانتا ہے؟ طوفان کی اپنی فطرت ہے یہ کس فطرت کے تحت آتا ہے۔ یہ تحقیق نہیں کہا جاسکتا۔ انسان طوفان سے نبرد آزمائی کرتا رہتا ہے۔ اور کوئی اجنبی رہبر مداوائے دردِ جگر کے لئے کوئی کتاب لے کر نازل ہوتا ہے۔ پھر طوفان رک جاتا ہے۔ نئی روشنی پھیلتی ہے۔ بجھی ہوئی انسانیت پھر فروغ پاتی ہے۔ اور زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ نووارد

اب بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ مگر ہمارے دروازے بند ہیں۔ دستک ہو رہی ہے۔ لیکن ہم نووارد سے مشکوک ہیں۔ نووارد کی مشکل یہ ہے کہ وہ ہمارا اعتماد حاصل نہیں کر پاتا۔

کش مکش اور اضطراب، اضطراب اور کش مکش سکون کا پیش خیمہ، اور سکون اضطراب کا پیش خیمہ ۔ ۔۔۔ فطرت مسکراتی رہتی ہے، اور کارخانۂ حیات چلتا رہتا ہے۔

سمجھوتہ

ابوالکلام عزیزی

سیمنٹ فیکٹری کی چمنی سے اُبلتا ہوا گاڑھا گاڑھا دھواں فضا کو اکثر گدلائے رہتا ہے۔ فیکٹری سے کافی پرے کواٹروں کی سیدھی سیدھی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ شہر کی بکھری ہوئی بے ترتیب بستیاں یہاں سے کافی دور نظر آتی ہیں فیکٹری کے احاطے کے اندر اور رہائشی کوارٹروں کی ایک اپنی ہی دنیا آباد ہے جہاں ملازموں کی روزمرہ کی زندگی کی ساری سہولتیں موجود ہیں۔ بچوں کے لئے کھیلنے کا میدان، پارک، دکانیں جہاں ضروریات کے سارے سامان مل جاتے ہیں۔ فیکٹری میں کام کرنے والے ملازمین تفریحاً ہی کبھی کبھار شہر چلے جاتے ہیں۔ مگر بے چارے مختار کو اس کی مہلت بھی شاید ہی کبھی نصیب ہوتی ہو۔ چھوٹی سی خالدہ کو تنہائی کا کرب ستاتا تھا۔ ایک خالدہ اور ایک وہ خود ــــ یہ دو نفری فیملی :

اسے یہاں اس فیکٹری میں آئے پانچ سال ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن خالدہ بھی ہے، تب وہ اور بھی چھوٹی سی تھی۔ اب تو اس نے کچھ قد بھی نکالا ہے۔ گاؤں میں اب اس کا کوئی نہیں رہ گیا ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو والد چل بسے، پھر جب اس کی ملازمت اس فیکٹری میں ہوئی تو والدہ بھی رخصت ہوگئیں۔ ایک بڑا بھائی تھا وہ بھی ملازمت کے سلسلے میں غیر ملک جا بسا۔ وہ اس ننھی سی جان کو کس کے سہارے چھوڑتا اس لئے اس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اب یہی اس کی مسرتوں کا مرکز ہے جسے وہ پلکوں پہ بٹھائے

رکھتا ہے ۔ خالدہ سے اس کو آرام بھی بہت ہے ۔ چولھا چکّی اور صفائی سے لے کر
کپڑے دھونے تک سب کچھ وہی کرتی ہے ۔ ورنہ فیکٹری سے آنے کے بعد اس میں کوئی سکت
باقی نہیں رہ جاتی ۔ فرصت کے اوقات میں وہ اس کی مدد بھی کر دیا کرتا ہے ۔ اس کا جی
بہلانے کے جتن کرتا رہتا ہے ۔ کبھی کبھی چھٹی کے دن اس کو شہر گھمانے لے جاتا ہے اور اس
کی پسند کی چھوٹی موٹی چیزیں خرید دیا کرتا ہے ۔ اس کی بغل کے پڑوسی ارشد کے ساتھ بیوی
بچّے بھی ہیں ۔ ارشد جب فیکٹری جاتا ہے تو اسے بھی پکار لیتا ہے ۔ روزانہ کا یہی معمول ہے ۔

آج بھی ارشد نے پکارا ۔ کوئی جواب نہ پاکر اندر بڑھ گیا ۔ دیکھا تو مختار اپنی بہن کے
ساتھ چولھا پھونکنے میں پریشان ہے پورا کوارٹر دھوئیں سے بھر گیا ہے ۔ اور مختار آنکھیں
ملتا ہوا باہر آرہا ہے ۔ ارشد پوچھتا ہے ـــــ کیا ہوا بھائی ؟ بھونپو بج چکا ہے اور تم
فیکٹری جانے کے لئے اب تک تیار نہیں ہوئے ؟

" کیا کروں کم بخت گیلے کوئلے نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے ۔ ناشتہ تو در کنار ایسا
لگتا ہے کہ آج لنچ بھی نصیب نہیں ہوگا ۔ خالدہ کب سے چولھا سلگانے میں پریشان ہے ۔ ابھی
ذرا سی بچی ہے یہ جنجال اس کے بس کا نہیں ۔ " آنکھیں ملنے سے مختار کی آنکھوں میں سُرخی
آگئی ہے ۔

" چھوڑ و ناشتے واشتے کا چکّر ، فیکٹری ہی میں کچھ منگوا لینا ۔ لنچ میرے ساتھ کر لوگے
میں نے کتنی بار کہا ہے کہ بھئی اب شادی کر ڈالو ۔ خالدہ بھی کچھ گھر گرہستی سیکھ جائے گی ۔ ماں
نہیں تو بھابی ہی سہی ۔ "

بات خالدہ کے دل کو بھی لگتی ہے ۔ " ہاں ارشد بھائی ، بھابی آجائے تو بڑا
اچھا ہو ۔ میرا اکیلے دل نہیں لگتا ۔ اگر بغل کے کوارٹر میں آپ لوگ نہ ہوتے ، بھابی نہ ہوتیں ، تو نہ
جانے کیا ہوتا ۔ "

" ٹھیک کہتی ہو ۔ تمہارے ہی لئے تو میں بھی کہہ رہا ہوں ۔ "

ارشد گھڑی دیکھتا ہے ۔ " اچھا تو یار اب جلد تیار ہو جاؤ ۔ دیر ہو رہی ہے ۔ "

"ٹھیک ہے چلتا ہوں۔ اے خلّو اب تم کسی طرح پھونک پھانک کر اپنا کھانا پکالو، میں چلا۔"

مختار جھٹ پٹ تیار ہو کر باہر نکل پڑا ہے۔ ارشد پھر اس کو شادی کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔ مختار چپ چاپ چل رہا ہے۔ آج اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ اسے واقعی شادی کر لینی چاہئے۔ ویسے بھی ہر جوان مرد کو شادی کا ارمان ہوتا ہی ہے۔

اس دن کے بعد شادی کا خیال اس کے ذہن سے چپک گیا۔ ایک نہایت اہم اور سنجیدہ سوال۔ اس سوال کے کتنے ہی پہلو اس کے سامنے آئے۔ وہ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

اس سوچ میں دو ڈھائی سال اور گذر چکے ہیں۔

آج وہ زیادہ ہی سنجیدگی کے ساتھ کوارٹر آیا ہے۔ کواڑ کھٹکھٹانے پر کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہے تو چارپائی پر خالدہ بے خبر سو رہی ہے۔ دوپٹہ بے ترتیبی سے بغل میں پڑا ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں۔ وہ اچانک جیسے خواب سے چونک اٹھا ہے۔ پائنتی سے سرہانے تک۔ پوری کی پوری خالدہ! وہ چپکے چپکے اتنی بڑی ہو گئی! ایک چھت تلے رہتے ہوئے بھی وہ اتنے بڑے انقلاب سے بے خبر رہا اس منظر سے اس کے ذہن پر فکر کی ایک لکیر کھنچ گئی ہے۔ کوئی پرندہ پھر سے اس کے دماغ سے اڑا اور دوسرا پرندہ اس کی جگہ آبیٹھا ہے۔ دو تین بار آواز دینے پر خالدہ کے ہاتھ خود بہ خود دوپٹہ ٹٹول کر کھینچتے ہیں اور اس کا سراپا آج ٹھیک ٹھیک اس کی نگاہ میں اتر آیا ہے۔ امر بیل کی طرح بڑھتی ہوئی خالدہ اب اس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں ایک کلی غنچہ بن کر خوشبو کا راز فاش کر دیتی ہے۔ مختار کا ذہن ایک نئی سوچ کی دلدل میں پھنس گیا۔

وقت اپنا پر پھیلائے پرواز کرتا رہتا ہے۔ جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں، مختار

کی فکر گہری ہوتی جاتی ہے۔ یہ فکر اور پریشانی محض اس لئے نہیں کہ خالدہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہے۔ بلکہ وہ اس خدشے سے بھی بے چین ہے کہ جہاں گڑ ہوتا ہے وہاں چیونٹے منڈلانے لگتے ہیں۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ بازار سے لوٹتے ہوئے اس نے خالدہ کو کھڑکی سے لگ کر کھڑی دیکھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ نہ جانے کیوں جھینپ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ ایسے جیسے کسی نے چوری کرتے پکڑا پایا ہو۔ مختار نے اس کے ہونٹوں پر پان کی لالی بھی دیکھی۔ سوچا پڑوس کے یہاں پان کھا لیا ہوگا۔ عمر کا تقاضا بھی کچھ ہوتا ہے۔ اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ اس دن تو اس نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ مگر جب دوسرے دن بھی ایک اور منظر دیکھا تو اسے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ ایک نوجوان سامنے والے کوارٹر کی چھت پر کھڑا تھا۔ مختار پر نظر پڑتے ہی وہ بھی جھٹ سے اسی طرح جھینپ گیا۔ مختار کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے اپنی کھڑکی میں بھی ایک سایہ سا جھلملا کر غائب ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر اس کی نگاہ کھڑکی کے نیچے پڑے کیلے کے پتے میں لپٹے پان کے بیڑے پر پڑی۔ شک کچھ اور گہرا ہو گیا۔ اندر گیا تو خالدہ کو کچھ شرمائی اور گھبرائی گھبرائی سی محسوس کیا۔ وہ آنکھیں چرانے کی بھی کوشش کرتی رہی۔

بات کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ کچھ کہہ سکا نہ پوچھ سکا۔ دل میں تو کیا کیا نہ اتھل پتھل ہوئی مگر وہ کچھ ایسا بن گیا جیسے نہ کچھ دیکھا ہو نہ سمجھا ہو۔

اس واقعے کے بعد مختار سخت الجھن کا شکار ہو گیا۔ جتنی دیر وہ کارخانے میں ہوتا اس کا دھیان گھر ہی پر لگا رہتا۔ اب اس نے باہر گھومنا پھرنا بند کر دیا تھا۔ خالدہ کی آنکھ مچولی کھیلنے والی جوانی اس کے لئے دردِ سر بن گئی۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے احساسات میں چبھن پیدا کرتے رہے۔ خالدہ اس کے لئے جیسے کلیجے کا بوجھ بن گئی تھی۔ سینے پر سے اس پتھر کو کھسکانے کی اس کو جلدی ہو گئی۔ اور اس نے چپکے چپکے خالدہ کے لئے رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ مگر یہ مہم اس کو اپنے بس کی نظر نہ آئی۔ ایک پسندیدہ نوجوان تھا اس کی نظر میں جمیل۔ جو اسی فیکٹری میں کلرک تھا۔ ہونہار اور نیک نام۔ ہاں اپنی اچھی بہن کے لئے اس کو

ایسے ہی اچھے لڑکے کی ضرورت تھی ارشد بیچ میں پڑتا تو بات بن سکتی تھی۔ کیوں کہ ارشد اور جمیل کی گاڑھی چھنتی تھی۔

مگر جمیل کا مسئلہ کچھ زیادہ ہی سنگین تھا۔ وہ بھی کلیجے پر ایک بھاری چٹان لئے بیٹھا تھا۔ بڑی بہن کا مسئلہ۔ طلاق یافتہ اور بدنام! پھر بھی جمیل کو تو اپنا گھر بسانا ہی تھا۔

اور جب مختار نے ارشد کے سامنے اپنی تجویز رکھی تو اس کو بڑی حیرت ہوئی ــــ

"ارے یار ابھی تو وہ بچّی ہے، اس کی عمر ہی کیا ہے؟ ذرا لمبی ہو گئی ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ پہلے تم خود تو گھر بسانے کی فکر کرو"

"نہیں بھئی، بے ماں باپ کی بچّی ہے۔ بڑی ذمہ داری کی بات ہے پہلے یہ بوجھ سر سے اتار لوں تو اپنی فکر کروں۔"

ارشد کو یقین تھا کہ جمیل اس رشتے کو ضرور پسند کرے گا۔ کیونکہ خالدہ صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے پسندیدہ تھی۔ مختار گھر خاندان کا بھی اچھا ہی تھا۔ ارشد کے دل میں بھی آیا کہ یہ نیک کام ہو جائے تو اچھا ہے۔ اسی شام اس نے جمیل سے گفت گو کی۔ جمیل نے اس کو مایوس تو نہیں کیا مگر اپنا بھی ایک مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ مسئلہ قابلِ فہم تھا۔

اور جب ارشد نے مختار کو بتایا کہ جمیل نے اس رشتے کو پسند کر لیا ہے تو مختار کا چہرہ کھل اٹھا۔ مگر جمیل نے اس پسند کے ساتھ جو شرط منسلک کر دی تھی اس کو سن کر مختار کا چہرہ مرجھا گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ بھلا کون اس کی بدنام اور داغدار بہن کو اپنا سکتا تھا۔ آنکھوں دیکھی مکھی کہیں نگلی جاتی ہے۔ اس کڑی شرط نے مختار کو پست کر دیا۔ مگر ایک کام کی بات اس کو سوجھ گئی۔ گو لٹ شادی! اس طرح کتنے ہی کنوارے بھائی ہوں گے جنھیں اپنی بہن کے لئے لڑکے کی تلاش ہو گی۔ اس طرح رشتہ آسانی سے مل سکے گا۔ اس نے ارشد کو بھی یہ نکتہ سمجھایا۔

مگر جس دلدل میں وہ پھنس گیا تھا۔ اس میں وہ اور دھنستا ہی جا رہا تھا۔ کبھی خالدہ کے چہرے پر نظر جم جاتی تو کبھی سامنے کوارٹر کے لڑکے کا چہرہ کچھ چغلی کھانے لگتا اور پھر جمیل کی بہن کا ماجرا اسے یاد آنے لگتا۔ اور اپنے سینے میں خنجر کی چبھن محسوس کر کے وہ

تڑپ اٹھتا۔

ایک دن اچانک مختار کو اپنا وجود بے معنی محسوس ہوا جیسے وہ فضا میں ناپید ہو گیا ہو۔

ہوائیوں کو طبیعت کی بدمزگی کے باعث اس نے فیکٹری سے دو تین گھنٹے پہلے ہی چھٹی کر لی۔ وہ کوارٹروں والے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا ہی تھا کہ کہیں سے ایک ڈھیلا اس کی کھڑکی سے ٹکرا کر نیچے گرا، جس پر کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ وہ چونک پڑا اور اس نے لپک کر ڈھیلا اٹھا لیا۔ کاغذ کے پڑھنے سے جیسے ایک شعلہ لپک کر اس کے سراپا میں سرایت کر گیا۔ لکھا تھا۔

"آخر آنکھ مچولی کب تک؟ ملن ہو گا یا نہیں؟"

مختار کے ذہن میں تیز تیز آندھیاں چلنے لگیں۔ پہلے اس کے قدم چوکھٹ کی طرف بڑھے، اندر ہانپتی ہوئی خالدہ ایک کونے میں دبکی تھرتھر کانپ رہی تھی۔ مختار آگے نہ بڑھ سکا اور الٹے پاؤں فیکٹری لوٹ گیا۔ وہ سیدھے ارشد کے پاس پہونچا اور اس کو الگ لے جا کر بڑی عجلت سے کہا۔

"مجھے جمیل کی شرط منظور ہے آج ہی بات کر لو۔"

ارشد نے اس کو حیرت سے دیکھا تو اس نے زور دے کر کہا۔ "ہاں آج ہی۔"

———— ————

ایک افسانہ اور

مٹّی کا مادھو

(وہاب اشرفی)

اور اس دن وہ سب کچھ نہ ہوا جو باندی نے سوچا تھا۔

ریاض صاحب نے باندی کے ہاتھ سے رُقعہ لیا، پڑھا اور جیب میں رکھ لیا۔ پھر جیب سے نکال کر اُسے اپنی بیگم کے حوالے کر دیا۔ بیگم نے رُقعہ کو بغور پڑھا۔ منو صاحب کی خیریت پوچھی اور کہا کہ اُسے بیس روپئے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ملا کریں گے اور جب باندی نے اپنی منظوری دے دی تو بیگم اسے کام سمجھانے لگیں گھر کی صفائی تمھارے ذمہ رہی، برتن تمھیں صاف کرنا پڑیں گے دھوبی کے ہاں کا حساب بھی تم رکھو گی۔ دستر خوان پر کھانا تم چنو گی، کھانا میں خود پکاؤں گی بیگم صاحبہ نے ایک ہی سانس میں باندی کو اس کی ڈیوٹی بتا دی۔ باندی کو ایک دم ایسا لگا کہ یہ گھر اور گھروں کی طرح نہیں ہے اور یہ کہ یہاں کے لوگ دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ہیں۔

باندی نے ہوش سنبھالا تو نوکرانی تھی۔ جب اس نے ہوش نہیں سنبھالا تھا تب بھی نوکرانی تھی۔ بچپن سے اب تک اس نے کتنے ہی گھر بدلے تھے اور اسے کتنے ہی صاحبوں اور بیگموں سے واسطہ پڑ چکا تھا اور اب اس کی عمر بیس کی ہو چکی تھی۔ باندی طبیعت کی ایسی نہیں تھی کہ ایک گھر میں اس کے پاؤں نہیں جمتے ہوں بلکہ بات ہی کچھ ایسی ہو جاتی تھی کہ اُسے لگی ہوئی نوکری چھوڑنا پڑتی تھی اور نئی تلاش کرنا پڑتی تھی مصیبت یہ تھی کہ باندی کا ناک نقشہ بڑا ہی جاذب نظر تھا۔ چھوٹی سی پیشانی کے نیچے اونچی سی ناک اور ناک کے اوپر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، پورا چہرہ لال بھبھوکا پھر قد کی بھی پوری اونچی، جسم کی اس مسافت پر جوانی نے کچھ اس طرح حملہ کیا تھا کہ باندی سرتاپا جوانی ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں کسی ایک گھر کی ہو کر رہ جانا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔

باندی کبھی کسی صاحب سے آلو کے مزے کے بارے میں گفتگو کرتی ہوتی اور کہیں
ان کی بیگم اس منظر کو دیکھ لیتیں تو پھر باندی کو چھٹی مل جاتی اور ہمیشہ کے لئے
کبھی کسی صاحب کے کوئی صاحبزادے باندی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیتے
ہوئے اس کا ہاتھ دبا دیتے تو باندی خود بغیر کسی کوئی وجہ بتائے وہ گھر چھوڑ دیتی
کبھی یہ ہوتا کہ کوئی صاحب اپنے اور بیگم کے لئے پکچر جانے کے لئے ٹکٹ منگواتے
لیکن ٹھیک شو کے وقت ان کے سر میں درد ہونے لگتا تو وہ اپنی بیگم کو نوکر کے
ساتھ سنیما ہاؤس بھیج دیتے اور خود اکیلے گھر میں رہ جاتے اور پھر ان کا درد اس قدر
بڑھ جاتا کہ وہ باندی کو آواز دے کر باورچی خانے سے بلانا چاہتے اور سر میں
تیل دینے کے لئے کہنا چاہتے تو باندی کمرے میں نہیں جاتی اور دروازے سے نکل جاتی
اور اس گھر میں پھر کبھی نہیں داخل ہوتی، اس قسم کے واقعات باندی کے ساتھ
ہمیشہ ہوتے اور باندی ہمیشہ ہی صاف نکل جاتی لیکن منو صاحب کے یہاں
یہ سب کچھ نہ ہوا۔ پھر بھی اسے نوکری ڈھونڈھنا ہی پڑی۔

منو صاحب پچاس کے ہو چکے تھے اور ان کی بیگم کے بال پکنے لگے تھے۔ ابھی
چند ہی سال ہوئے تھے ریلوے کی کلرکی سے ریٹائر ہوئے لیکن گھر کی مالی حالت دگرگوں
ہونے لگی تھی۔ بغیر اولاد اور بغیر ملازمت کے ضعیف جوڑے پر ایک نوکرانی کا بار
——— منو صاحب آدمی تھے ڈھنگ کے باندی کو انھوں نے کبھی یہ نہ کہا کہ ان کے
یہاں اب نوکرانی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بیگم صاحبہ بھی خیر سے وضعداری کی قائل
تھیں۔ انھیں باندی کو صرف مالی حالت خراب ہونے کی بنا پر الگ کرنے میں بڑی شرم
آتی تھی۔ باندی یہ سب کچھ سمجھ رہی تھی اور آخر ایک دن اسے ایسا لگا کہ وہ اس گھر میں
محض بیکار ہے، تو پھر وہ منو صاحب کے پاس گئی اور ان سے کہا حویلی میں اب کچھ زیادہ
کام نہیں رہتا ہے۔ اس لئے اب اس کی ضرورت غالباً نہیں رہی۔ منو صاحب باندی
کی شرافت کے قائل تو پہلے سے تھے ہی اب اور ہو گئے اور فوراً ریاض کے نام رقعہ لکھا
اور باندی کو رکھ لینے کی سفارش کی اب جب ریاض صاحب نے رقعہ ہاتھ سے لیا

اور پڑھ کر جیب میں رکھ لیا اور پھر اسے نکال کر اپنی بیگم کے حوالے کر دیا اور اسے ایک نظر دیکھا تک نہیں تو باندی کو کچھ عجیب سا لگا۔ پھر بیگم نے رقعہ پڑھتے ہی ایک دم سے اس کی تنخواہ مقرر کر دی یہاں تک کہ کام بھی سمجھا دیا تو اسے اور بھی تعجب ہوا۔

جوان شوہروں والی جوان بیویاں عموماً باندی کو اپنے یہاں نوکری دینے پر آمادہ نہیں ہوتی تھیں پتہ نہیں کیوں ۔۔۔؟ حالانکہ ان میں سے اکثر عورتیں ایسی تھیں جو اسے دیکھتے ہی کچھ مرعوب سی ہو جاتی تھیں اور معاً ان کے دل میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ باندی اگر ان کے یہاں کام کرے تو گھر میں خاصی رونق آجائے لیکن یکایک وہ اپنے آپ کو دیکھتیں، کچھ غور کرتیں پھر اپنے شوہروں کی طرف دیکھتیں اور انتہائی غیر معلق سی بات کہہ دیتیں کہ آخر ایسی کون سی ضرورت پڑ گئی ہے کہ نوکرانی رکھی جائے۔ اور ان کے شوہر کچھ ڈرتے ہوئے اور کچھ مسکراتے ہوئے کہتے کہ "لیکن تم نے ہی تو کہا تھا کہ ایک نوکرانی" اور بیویاں بات کاٹتے ہوئے کہتیں کہ وہ مذاق کی بات تھی۔ باندی کو چند لمحے کے لئے اپنا سراپا بہت بُرا لگتا پھر اس کے اندر کی کوئی چیز جاگ جاتی اور اس کی گردن تن جاتی اور ان بیویوں کے شوہر اس کے اُٹھتے ہوئے قدموں کو دیکھتے۔ اس کی پشت دیکھتے اور جب باندی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو کچھ جھنجھلاتے ہوئے انداز میں اپنی بیویوں سے پانی مانگتے اور پانی پی کر باہر نکل جاتے۔

ریاض صاحب جوان تھے اور حسین تھے ان کی بیگم جوان تھیں لیکن حسین نہیں تھیں۔ ریاض صاحب نے باندی کو رقعہ ہاتھ میں لیتے ہوئے دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، بیگم نے باندی کو دیکھا، صاحب نے رقعہ لیا، پڑھا اور اسے کام پر رکھ لیا۔ باندی کے لئے یہ سب کچھ انتہائی غیر متوقع طور پر ہوا تو اسے تعجب ہونا ہی چاہئے تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس تعجب کے ساتھ اس کے دل میں کچھ اور بھی ہوا۔ نہ جانے کیوں اُسے دل نے چاہا کہ ریاض صاحب اُسے ایک بار دیکھیں۔ بیگم اسے دیکھ کے اپنا آپ دیکھیں۔

باندی ریاض صاحب کے یہاں کی نوکرانی تھی اور صرف نوکرانی تھی جسے اپنے حصے

کے کام سے غرض تھی اور بس۔ ابتدا میں تو رشتہ یہیں تک رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ باندی بیگم سے قریب آنے لگی اس کی خاص وجہ تو یہی تھی کہ بیگم بے حد غریب نواز قسم کی عورت تھیں۔ یہ غریب نوازی بعد میں محبت کی حد کو پہنچی۔ ویسے گفتگو ہی کے دوران باندی یہ سوچ لیتی کہ وہ اپنی بیگم سے بات کر رہی ہے۔ اور کبھی بیگم کو خیال آجاتا کہ نوکرانی محض ہے۔ پھر دونوں ہی اپنے اپنے خیال کو اپنے دل سے نکال دیتیں اور تب دونوں صرف عورت ہو جاتیں فرق صرف اتنا ہوتا کہ ایک کرسی یا پلنگ پر بیٹھی ہوتی، دوسری زمین پر بھی۔ اس قدر قربت کے باوجود باندی بیگم کی بہت ساری باتیں نہیں سمجھ پاتی اور وہ باتیں اکثر اس کے ذہن کو پریشان کرنے کا باعث ہوتیں، کتنے ہی سوالیہ نشان اس کے دماغ میں اُبھرتے اور پھر بغیر جواب پائے ڈوب جاتے۔ باندی بعض باتوں کے بارے میں بیگم سے کچھ پوچھنا چاہتی لیکن وہ مجبور تھی آخر اسے بیگم کے ذاتی معاملات میں کیا دخل؟ اور دخل ہو بھی تو ہر بات پوچھنے کی نہیں ہوتی ——— بیگم ہر دوسرے روز غسل کرتیں جب کہ ریاض صاحب بغیر غسل کئے دفتر نہیں جاتے اور دفتر جانا روز ہی ہوتا تھا سوائے اتوار کے، گو اتوار کو ریاض صاحب نہیں نہاتے، غسل کا معمول تو یہ تھا لیکن ان کے پلنگ کی چادریں ہفتوں نہیں بدلی جاتیں۔ یہ بات تعجب کرنے کی ایسی خاص تو نہیں تھی لیکن باندی کے لئے حیرت کی بات یہاں سے شروع ہوتی تھی کہ ان کے پلنگ کی چادریں تقریباً اسی حالت میں ہفتوں ہوتیں جس حالت میں وہ بچھائی جاتیں جیسے رات کے وقت سو گیا ہو اور پھر اُٹھ گیا ہو، نہ اس کے آگے کچھ نہ اس کے پیچھے کچھ۔ باندی کو اس بات کی بھی حیرت تھی کہ ریاض صاحب آخر بیگم کے شوہر ہیں لیکن بیگم کا سلوک ان کے ساتھ کچھ عجیب ہی ہے۔ ریاض صاحب دفتر سے آئے بیگم نے ناشتہ سامنے کر دیا دیا اور قصہ ختم۔ پھر وہ رات کے ۹ بجے تک تنہا کمرے میں ہیں اور بیگم رات کے دس بجے تک باورچی خانہ میں۔ ادھر ریاض صاحب بھی عجیب ہی ہیں۔ ان کے لئے بیگم کی موجودگی یا عدم موجودگی شاید ایک ہی چیز ہے۔ باندی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ریاض صاحب اور بیگم کے بیچ لڑائی ہے، تعلقات خراب ہیں تب ہی تو......... لیکن

تعجب کی بات تو یہ تھی کہ ان کے درمیان تُو تُو میں میں کبھی نہیں ہوتی بعض اوقات ریاض صاحب کے لئے باندی کے دل میں کچھ ہمدردی سی ہوجاتی اس کی ایک وجہ تو خود بیگم تھیں دوسری وجہیں انگنت تھیں۔ سوائے منّو صاحب کے تمام صاحبوں نے باندی کی جوانی کو شدّت سے محسوس کیا تھا اور اپنے اس احساس کا کسی نے کسی طرح باندی سے اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن ریاض صاحب تو جیسے صاحب ہی نہیں تھے۔ بیگم کی موجودگی یا عدم موجودگی ان کے لئے برابر تو تھی ہی، باندی کی بھی موجودگی یا عدم موجودگی ان کے لئے برابر ہی تھی، اپنے تجربے کی روشنی میں باندی کو ریاض صاحب کا کردار بالکل نیا معلوم ہوا لیکن یہ کردار کچھ اچھا معلوم نہیں ہوا۔ نہ جانے کیوں اب وہ شدّت سے محسوس کرنے لگی تھی کہ ریاض صاحب اسے ایک نظر دیکھتے، ہنس کے بولتے، غصّے میں ڈانٹ دیتے۔ پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے وقت اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا دیتے لیکن ریاض صاحب یہ سب کچھ نہیں کرتے اور اس کے دماغ میں نئے سوالیہ نشانات اُبھرتے، پھر ڈوب جاتے۔

باندی کے معاملے میں ریاض صاحب کا رویّہ تو یہ تھا۔ بیگم نے بھی اسے کچھ کم حیرت میں نہیں ڈالا تھا۔ عموماً اتوار کے دنوں میں بیگم رکشا کسواتیں اور پکچر چلی جاتیں۔ ادھر ریاض صاحب اور وہ تنہا رہ جاتے۔ ان موقعوں پر باندی کو ایسے گھر یاد آتے جہاں کی بیگمیں اپنے شوہروں کے نزدیک کبھی تنہا نہیں چھوڑتیں۔ اور یکایک اس کے دماغ میں ریاض صاحب اور بیگم کے بارے میں سوالیہ نشانات اُبھرتے اور ڈوب جاتے۔ اور یہ سوالیہ نشانات زیادہ اُبھرنے اور ڈوبنے لگے۔ جب شدّو یہاں نوکر رکھ لیا گیا۔ جس ڈرامائی انداز میں باندی وہاں نوکرانی ہوئی تھی اسی انداز میں شدّو کو اچانک رکھ لیا گیا۔ حالانکہ باندی نے بیگم سے صرف اتنا کہا تھا کہ اسے تو کام مل بھی جاتا ہے لیکن اس کا بھائی شدّو بیکار ہی رہتا ہے اور اس بیکاری سے اس کی جوانی کو گھن لگتا جا رہا ہے۔ اتنا سُنتے ہی بیگم ایک دم غصّے کے سے انداز میں بولیں کہ شدّو کے بارے میں ان سے پہلے کیوں نہ بتایا گیا۔ اور دوسرے ہی دن وہ وہاں نوکر تھا۔ باندی کے لئے بیگم کا

دل کشادہ تھا ہی شدو کے لئے بھی ان کا دل اتنا ہی کشادہ رہا۔ اب وہ شدو سے ہنس بول لیتی تھیں۔ تو اس میں تعجب کی کیا بات تھی لیکن باندی کے لئے تعجب کی بات پھر شروع ہوئی۔ جب اس کے اور شدو کے کام کے اوقات یکایک تقسیم کر دیئے گئے۔ اب باندی کو دن کے تین گھنٹے آرام کے ضرور مل گئے لیکن باندی کے دماغ کو آرام نہ مل سکا ـــــ ریاض صاحب سے بیگم کا سلوک پھر شدو کے ساتھ ان کا برتاؤ اور یہ کام کے اوقات کی تقسیم ـــــ باندی کے دماغ میں کتنے ہی سوالات جنم لیتے رینگتے اور پھر ساکت ہو جاتے اور اس دن تو باندی کی حیرت کی انتہا نہ رہی یہ اور بات ہے کہ اس دن کے بعد اُسے پھر کبھی حیرت نہ ہوئی بات صرف اتنی سی تھی کہ ریاض صاحب نے بیگم سے مذاق کرنا چاہا تھا اور مصنوعی داڑھی ٹھڈی سے لگا کر نئے آدمی بن گئے تھے اب جب بیگم کمرے میں گئیں تو ان کے مُنھ سے چیخ ہی تو نکل گئی۔ باندی اور شدو دوڑتے ہوئے کمرے میں پہنچے۔ ریاض صاحب نے گڑبڑا کر جلدی سے داڑھی نوچ لی اور بیگم یکایک بول پڑیں ـــــ توبہ ہے میں تو سمجھی کہ کوئی مرد ہے ـــــ اور باندی کو بڑی حیرت ہوئی کہ آخر بیگم نے یہ کیا کہہ دیا ـــــ دوسرے لمحے باندی کی نظر شدو پر پڑی۔ شدو نہ جانے کیوں مسکرا رہا تھا یکایک بیگم نے سر پکڑ لیا ـــــ ادھر کئی دنوں سے ان کے سر میں اکثر چکر رہتا تھا اور متلی ہوتی تھی۔

باندی نے ایک بار پھر شدو کو دیکھا۔ پھر بیگم کو دیکھا۔ تب ریاض صاحب کو دیکھا اور نہ جانے کیوں سوچنے لگی کہ شدو کو یہاں نوکر ہوئے کتنے دن ہوئے

ماہنامہ "صنم" بہار نمبر ۵۹ء

ــــــ ۔۔۔×۔۔۔ ــــــ

बिहार उर्दू अकादमी
BIHAR URDU ACADEMY
ناشر
بہار اردو اکادمی پٹنہ